# عزم

تحریر : عبدلاحد

کیا ہوا اگر تم ہار رہی ہو۔۔،

کیا ہوا اگر تم ٹوٹ چکی ہو؟

یہ تو بس رنگ ہیں چند زندگی کے،

زندگی میں اور ہزاروں رنگ ہیں ابھی،

جو تم نے اب تک دیکھے ہی کہیں؟

کیا ہوا اگر تم کھوئی ہوئی ہو۔۔۔،

اس زندگی کے سفر میں الجھی ہوئی ہو؟

انجان اپنے مقصد سے پس تم ابھی ہو،

متحد اپنے عزم سے فی الوقت ہوئی نہیں ہو،

مگر کیا درخت کو اگانے کیلئے،

بیج کا زمین میں گڑنا ضروری نہیں؟

کیا چرند کو اڑان بھرنے کیلئے،

زمین پر اترنا ضروری نہیں؟

کیا روح کو آسمانوں میں پرواز کرنے کیلئے،

جسم کا قبر میں اترنا ضروری نہیں؟

پستی بھی یقینی ہے،

اور زوال ہے اٹل،

کیونکہ گرے گا نہیں انسان اگر،

تو وہ اٹھنا کیسے سیکھے گا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

اندھیری رات تھی۔۔۔بارش کی وجہ سے وہ سڑک گیلی تھی۔

سڑک صرف چاند کی روشنی کی وجہ سے نمایاں تھی۔۔۔نہ بندہ تھا نہ کوئی بندے کی ذات۔

بس وہ نیلی چھت والا گودام سڑک کے ایک جانب کھڑا نظر آرہا تھا۔

ورنہ وہ جگہ آبادی سے پاک تھی۔

دفعتاً ایک بڑا سا ٹرک نظر آیا جو کہ پوری رفتار سے چلے آرہا تھا۔ٹرک کی رفتار کی وجہ سے سڑک کے کنارے براجمان جھاریوں پہ پانی کا چھڑکاؤ ہوا۔جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے وہ دونوں بھیگ گئے۔۔۔وہ دس سے بارہ سال کے دو بھائی تھے۔۔۔

اِس جگہ کے رازوں سے انجان وہ کھیلتے کودتے ادھر آنکلے تھے۔۔گاڑی گودام کے پاس رکی۔۔کالے رین کوٹ پہنے مرد اس کے گرد اکھٹا ہو گئے۔۔بچے غور سے دیکھتے گئے۔۔ان مردوں کے ہاتھوں میں فلیش لائیٹس تھیں۔

وہ دیکھ پا رہے تھے کہ اُس ٹرک میں سے انسان اتر رہے تھے۔۔۔ان کے چہرے واضح نہ تھے۔۔۔

”ماما کہتی تھیں، یہ انسانوں کا گودام ہے۔اس سے دور رہا کرو۔“ ایک بچہ بولا۔

ٹرک خالی کردیا گیا تھا۔وہ جتنی تیزی میں آیا، اتنی ہی تیزی سے چلے بھی گیا۔فلیش لائیٹس پکڑے ہوئے کالے رین کوٹس میں ملبوس مرد منظر سے غائب ہوگئے..ایک بار پھر چاند کی روشنی منظر پے غالب ہونے لگی۔

”میرے ساتھ ایک دفعہ چلو نا۔مجھے دیکھنا ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”ماما نے منع کیا تھا۔“ دوسرے والے نے جواب دیا۔

”بس پانچ منٹ کے لیے۔ماما کو کوئی نہیں بتائے گا۔“بچے، مجبور اپنی متجسس فطرت سے اس گودام کی طرف چلنا شروع ہوئے۔

منظر سے غائب۔۔۔دیر ہو گئی وہ نہ لوٹے۔۔۔جانا تو پانچ منٹ کے لئے ہی تھا مگر دیر ہو گئی۔۔۔

اور ہم تم کو یہ بتاتے چلیں کہ ان بچوں کی تلاش،

آج تک جارہی ہے۔۔۔

مگر وہ بچے کسی کو نہ ملے۔۔

نہ ہی کبھی ملیں گے۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عبداللہ سلطان کا وسیع و عریض اور خوبصورت قصر اسلام آباد کے پوش علاقے میں واقع تھا۔یہ ایسا علاقہ تھا جہاں دیگر طاقتور امراء رہائش پزیر تھے۔ان میں سے اکثر مشہور و معروف بزنس مین یا سیاست دان تھے۔

قصر نہایت حسین اور پر تعیش تھا۔قصر کی بلند و بالا عمارت سے پہلے ایک دراز سبزہ زار تھا جو کے گھر کے چاروں اطراف میں پھیلا ہوا تھا۔قصر کی دیواروں پہ سنہرا اور سفید پینٹ تھا۔گھر کی بلندی پہ نایاب پتھر بھی لگے ہوئے تھے۔گھر کے داخلی دروازے سے کچھ ہی دور سومنگ پول تھا جو کہ نیلے شفاف پانی سے افروز تھا۔

گھر کے اندر آئیں تو ہر چیز ہشاش بشاش نظر آتی تھی۔فرنیچر بہت جدید اور چمکدار تھا۔گھر ملازمین سے بھرا پڑا تھا، اس وقت بھی ملازمین اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔گھر میں داخل

ہوتے ہی دائیں طرف گول سی دراز سیڑھیاں نظر آتی تھیں۔ان سیڑھیوں سے ہم اوپری منزل پہ جائیں تو وہاں کا منظر بھی نچلی منزل جیسا ہی نظر آئے گا۔

دوسری منزل کے لاؤنج میں، مخالف صوفوں پہ براجمان وہ دونوں نظر آتی تھیں۔۔۔ستائیس سالہ مہر، اور بتیس سالہ نیلوفر۔نیلوفر مہر کے والد، عبداللہ سلطان کی تیسری بیوی تھی۔

مہر گردن جھکائے صوفے پہ بیٹھی تھی جب کہ نیلوفر صوفے سے کمر ٹکائے نزاکت سے کافی کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"تمہیں پتا چلا آج وہ آرہا ہے۔" اس کی خوبصورت آواز میں پختگی جھلکتی تھی۔اس کا انداز مصروف سا لگتا تھا اور اس کا حلیہ اس بات کی نشاندہی کررہا تھا کہ وہ کہیں جانے والی تھی۔اس کے پرکشش نقوش میک اپ سے مزید نکھر رہے تھے۔گھنگرالے بالوں کو سلیقے سے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ کانوں میں نازک سی ہوپس (hoops) بالیاں لٹک رہی تھیں۔اس نے فیروزی رنگ کا لیڈیز کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی فلیئر (flare) پینٹس بھی۔(فلیئر پینٹس ٹخنوں کی طرف سے ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں)

مہر جو کے گردن جھکائے بیٹھی تھی نیلوفر کی بات پہ چونک کر سر اٹھایا۔آنکھوں میں سوال لیے وہ نیلوفر کو دیکھ رہی تھی۔

"کون؟" اس کی خوبصورت آواز میں تھکان تھی۔وہ سادہ سے گلابی کُرتے میں ملبوث،زندگی سے بیزار نظر آرہی تھی۔اُس کا خوبصورت چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔سچ بات تو یہ تھی کہ اس کے

خوبصورت نقوش کو کسی میک اپ کی ضرورت بھی نہ تھی۔اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی تھکان تھی۔اس نے اپنے لمبے بالوں کو لاپرواہی سے کیچر میں مقید کیا ہوا تھا جس کے باعث دو لٹیں ماتھے پہ بکھری ہوئی تھیں۔

"یعنی تمہیں نہیں معلوم۔" نیلوفر نے کافی کا گھونٹ بھرتے سنجیدگی سے کہا تو مہر کی الجھن میں اضافہ ہوا۔آخر کون آنے والا تھا؟

"خیر تم سب چھوڑو۔کچھ تھکی سی لگ رہی ہو،خیریت؟" نیلوفر نے موضوع بدلنا چاہا تھا۔

"نہیں بس عنایا کا اسپورٹس ڈے آنے والا ہے اور آج پریکٹس ہے،بس اسی کے لیے کچھ دیر میں نکلنا ہے۔" مہر نے اپنی گردن کو سٹریچ کرتے کہا۔اس کے انداز سے صاف واضح تھا کہ وہ جانا نہیں چاہ رہی۔

"پریکٹس میں کیوں؟ ڈائریکٹ اسپورٹس ڈے میں چلی جانا۔" نیلوفر نے بھنویں سکیڑتے کہا۔مہر نے لبوں کو بھینچ کر سر نفی میں ہلایا۔

"آپ عنایا کے اینگر ایشوز سے تو واقف ہیں نیلوفر۔میں انہیں ٹرِگر نہیں کرنا چاہتی۔کافی عرصے سے وہ پر سکون ہے۔کوئی بات نہیں اگر تھوڑی سی خواری برداشت کرنی پڑے، اس کے ذہنی سکون سے زیادہ مجھے کوئی شے عزیز نہیں ہے۔" مہر کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔نیلوفر کی آنکھوں میں اُداسی سی چھانے لگی۔دل کے ایک کونے میں اسے مہر کے لیے ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔

”مہر اب شاید وقت آگیا ہے کہ تم اپنی زندگی کو سنجیدگی سے لینا شروع کرو۔“ نیلوفر کی کافی ختم ہو چکی تھی۔اس نے جھک کر کپ سامنے پڑے میز پہ رکھ دیا۔مہر نے تھکی ہوئی سانس خارج کی اور نظر اٹھا کے نیلوفر کو دیکھا جو کہ نظروں میں فکرمندی لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”پلیز نیلوفر میرے سر میں بہت درد ہے۔میں ابھی کسی پیپ ٹاک کے موڈ میں نہیں ہوں۔“مہر نے بہت محتاط سا انداز اختیار کیا۔وہ اس طرح بولی کہ نیلوفر کو کچھ برا نہیں لگا۔

”مجھے تمہاری فکر ہے مہر۔تمہاری ایم بی اے کی ڈگری بھی ضائع ہو رہی ہے۔“ نیلوفر نے نرمی سے مہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ڈیڈ کے آفس جاتی تو ہوں۔“ مہر نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔یہ پہلی بار نہ تھا کہ وہ دونوں اس موضوع پہ بحث کر رہے تھے۔مگر جب بھی کرتے مہر کو اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی۔اس وقت بھی مہر کوفت کے عالم میں تھی۔

”اور کیا کرتی ہو وہاں جا کے؟ کچھ بھی نہیں۔“ نیلوفر نے اپنے ہی سوال کا جواب دیا۔”تم کیسی زندگی گزار رہی ہو مہر؟“

مہر بنت عبداللہ سلطان بالکل تھم گئی۔وہ سوچنے لگی کہ کیا واقعی وہ زندگی گزار رہی تھی؟ اس نے تو زندگی کو گزارنا اور جینا کب کا چھوڑ دیا تھا۔وہ تو محض اپنی زندگی کو کاٹ رہی تھی۔۔کسی سزا کی طرح۔

”ٹھیک ہے میں آج ہی آفس کا چکر لگاؤں گی۔“ مہر اب کی بار بولی تو انداز پہلے سے بھی زیادہ بجھا ہوا تھا۔نیلوفر نے بس سر کو مختصر سی جنبش دی۔

”مجھے امید ہے کہ تم ایک بار پھر سے جی اٹھو گی۔“ نیلوفر صوفے سے اٹھی۔مہر کو نرم مسکراہٹ لیے دیکھا تو مہر بھی جواباً مسکرادی۔”ہسپتال کے لئے دیر ہو رہی ہے۔“ اپنا بولینسیاگا کا بیگ اٹھاتے اس نے کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

قصر سے باہر ایک نیلی ویگن اس کا انتظار کررہی تھی۔وہ اس ویگن میں سوار ہو گئی۔ویگن کافی جدید تھی اور اس کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔شیشے ٹنٹڈ ہونے کے باعث کوئی بھی اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کالی لینڈکروزر ایئرپورٹ سے واپسی کے راستوں پہ چل رہی تھی۔پچھلی نشست پہ مرینا اپنے بیٹے حسام کے ساتھ بیٹھی تھیں۔مرینا پچاس سے پچپن برس کے درمیان کی عمر کی ایک بوڑھی سی خاتون تھیں۔بال تقریباً سفید ہوچکے تھے اور ان کے چہرے پہ جھریاں صاف نمایاں تھیں، جو کہ ان کی شخصیت پہ تمکنت کے ذرات چھوڑ جاتی تھیں۔

حسام ان کے برابر میں بیٹھا کچھ بوجھل سا نظر آرہا تھا۔وہ ایک عام سی شکل کا مرد تھا جس کے چہرے پہ موٹا چشمہ تھا۔اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے۔چہرہ بالکل سوکھ چکا تھا اور جسم بھی کافی کمزور تھا۔

”آخر کار تمہاری ریہیب مکمل ہوگئی حسام۔“ مرینا گردن ہلائے بغیر بولیں۔

(ریہیب ایک ایسا پراسس ہے جس سے ڈرگ ایڈیکٹس کی ایڈیکشن کو توڑا جاتا ہے۔اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ایک ڈی ٹاکسی فیکیشن اور دوسرا پراپر ریہیب۔ڈی ٹاکسی فیکیشن میں جسم میں موجود ڈرگز کے باعث پیدہ ہونے والے زہریلے مادے کو نکالا جاتا ہے۔ریہیب میں ایڈیکٹس کو پھر ٹرین کیا جاتا ہے کہ اپنی حسرتوں سے کیسے لڑا جائے۔حسام نے پانچ ماہ لندن کے ایک ریہیبلیٹیشن سنٹر میں صحتیاب ہونے کیلئے گزارے تھے)

"حسام اب تمہیں اپنی زندگی کی طرف واپس لوٹنا ہوگا۔میں جانتی ہوں ماضی تم پر بہت بھاری ہوگا۔ ماضی تمہارا اب بھی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا لیکن اگر اب بھی تم زندگی میں کچھ حاصل نہ کر سکے تو پھر جو سال ضائع ہوئے ہیں وہ بھی رائگاں جائیں گے۔" مرینا اطمینان بھرے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔حسام نے بس مختصر سا سر ہلایا۔

وہ اس وقت ایک الگ سی کیفیت میں مبتلا تھا۔اس کے دل میں خلش سی تھی۔۔دل میں ایک خالی پن سا تھا،جو کے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔

"اپارٹمنٹ میں جانے سے پہلے کہیں جانا تو نہیں چاہو گے؟میں نے تمہارے بنگلے سے سارا سامان منتقل کروا دیا تھا۔اب ہم صرف دو ہیں، اتنے بڑے بنگلے کی ضرورت نہیں۔" مرینا نے رخ موڑ کر نرمی سے پوچھا۔

"مجھے بس ایک دفعہ عنایا سے ملنا ہے امی۔" حسام کا حلق خشک تھا جس کے باعث آواز بہت کمزور سی لگی تھی۔۔مرینا کے سر پر ایک سایہ سا گزرا۔سر جھٹک کے وہ ڈرائیور کو کچھ ہدایات دینے لگیں۔

گاڑی اسلام آباد کی دھوپ میں نہاتی سڑکوں پہ چلنے لگی اور پھر ایک پوش علاقے میں جا پہنچی۔ عبداللہ سلطان کے قصر کے سامنے ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔

"تم یہیں رکو حسام! میں ذرا بات کر کے آتی ہوں۔" مرینا گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ حسام بے چینی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا۔ اُسے بس ایک دفعہ اپنی بیٹی کو دیکھنا تھا۔ آٹھ ماہ سے وہ اس سے نہیں ملا تھا اور اب اس کی آنکھیں بیٹی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھیں۔ اس کے اندر جیسے ایک آگ سی لگی ہوئی تھی جو کہ صرف عنایا کے دیدار سے ہی بجھ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد مرینا مایوس چہرہ لیے گاڑی کے اندر بیٹھی۔ حسام مضطرب نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں اسے عنایا نظر آجائے مگر عنایا ساتھ نہیں آئی تھی۔

"عنایا کے اسپورٹس ڈے کی پریکٹس ہے اس لیے وہ ابھی گھر میں نہیں ہے۔ ہم کسی اور وقت مل لیں گے ٹھیک؟" مرینا نے حسام کی دل جوئی کرنا چاہی۔ حسام کے چہرے پر جھلکتے اضطراب میں اضافہ ہوا۔ اس نے تکلیف کے مارے آنکھیں بند کر دیں۔ وہ پورے سفر میں کچھ بھی نہ بولا۔

وہ تو بس اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا تھا، اسے اپنے ہاتھوں میں محسوس کرنا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں یہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ عنایا کے اسکول کے بڑے سے میدان کا منظر ہے۔ تپتی دھوپ سے بچنے کے لیے پورے میدان پہ ہرا چھپرا لگایا ہوا تھا۔ عنایا باقی بچوں کے ساتھ اپنے ٹیچر کی نگرانی میں پریکٹس کر رہی تھی۔ ان سے ذرا

سے فاصلے پر والدین کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں، انھی میں سے ایک کرسی پہ مہر براجمان تھی۔وہ بالکل بیزار سی نظر آتی تھی۔اپنی نظریں ادھر ادھر دوڑانے لگی تو اس کی نظر دو بیڈ منٹن کھیلتے نوجوانوں پر پڑی۔ایک کی پشت اس کی جانب تھی لیکن دوسرے مرد کو وہ دیکھ سکتی تھی جو بہت پر جوش انداز میں بیڈمنٹن کھیل رہا تھا۔مہر اس نو جوان کو دیکھ کر اداسی سے مسکرائی۔

آہستہ آہستہ یہ میدان اس کی نظروں سے تحلیل ہونے لگا،ہرا چھپرا اس کے اوپر سے غائب ہوا۔

وہ ماضی کے ایک منظر میں جا چکی تھی۔اس منظر میں جس میں وہ نو سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔

آسمان پہ بادلوں کا بسیرا تھا۔نو سالہ مہر کے ہاتھ میں بیڈمنٹن کا ریکٹ اور شٹل کارک تھی۔وہ اپنے چہرے پر پُر جوش مسکراہٹ لیے شمائلہ کی طرف چلتی آرہی تھی، جو گنگناتے ہوئے پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔

”دل نہ امید تو نہیں۔۔۔نا کام ہی تو ہے۔۔۔لمبی ہے غم کی شام۔۔۔مگر شام ہی تو ہے۔“ شمائلہ اپنی سریلی آواز میں گنگنارہی تھی۔

”ماں آپ کون سا گانا گا رہی ہیں؟“ ہاتھ میں بیڈمنٹن کا ریکٹ پکڑے مہر نے پوچھا۔

”گانا نہیں ہے جان۔غزل ہے،فیض احمد فیض کی۔“وہ پیچھے مڑیں تو نظر مہر کے ہاتھ میں موجود بیڈمنٹن ریکٹ پر پڑی۔

”ارے واہ! آپ لے آئیں؟“ شمائلہ نے بیڈمنٹن ریکٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں ماں! آپ نے کہا تھا آپ مجھے سکھائیں گی ناں۔“ مہر نے نخریلے انداز میں کہا۔شمائلہ نے نرمی سے مہر کے ہاتھ سے ایک ریکٹ لیا۔وہ پھر اسے بغور دیکھنے لگیں۔

”آپ کو پتا ہے جب ہم چھوٹے تھے تو ہم اپنی بہنوں کے ساتھ ہر وقت بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ہم ایک بہترین کھلاڑی تھے۔ہم بچپن میں اپنے ملک کے لیے بیڈمنٹن کھیلنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔“ شمائلہ کی آنکھوں میں چمک تھی۔وہ ماضی کو یاد کرکے مدھم سا ہنس دی۔مہر تعجب سے انہیں سن رہی تھی۔

”تو ماں آپ مصنفہ کیوں بن گئیں؟“ چھوٹی مہر نے اپنی ماں سے پوچھا۔

”بس پھر ہم بڑے ہونے لگے۔گھر والوں نے ہم پر اور ہماری بہنوں پر سختیاں لگائیں کہ ہم باہر یوں نہ کھیلیں۔اور اس طرح سے ہمارا یہ ارمان کہیں دور رہ گیا۔بہت دور۔“ شمائلہ آسودہ سے انداز میں بولیں۔

”تو اس کا مطلب آپ اپنے کام سے خوش نہیں ہیں؟“ مہر نے آواز میں معصویت لیے پوچھا تو شمائلہ ہنس دیں۔

”نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔بس کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں، اگر ہم مصنفہ کے بجائے ایک بیڈمنٹن کے کھلاڑی ہوتے تو ہرگز زیادہ خوش نہ ہوتے۔اور ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔“ آخری فقرہ شمائلہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔مہر کو اپنی ماں سے یہ فقرہ سننے کی عادت تھی۔

”ویسے ماں آپ کو اپنا کام اتنا کیوں پسند ہے؟“ مہر کے سوال تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ مگر شمائلہ کو برا نہیں لگا۔ وہ بہت صابر خاتون تھیں اور مہر کے ہر سوال کا جواب ہمیشہ بڑے تحمل سے دیا کرتی تھیں۔

”کیونکہ کہانیاں ہمیں تلاش کرتی ہیں نہ کے ہم کہانیوں کو۔ ہمارے قلم میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھلے ہمیں نہیں دیکھا ہوتا، مگر وہ پھر بھی ہمارے لیے دعا کرتے ہیں۔ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہے نا خاص بات؟“ مہر کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر پھر بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں ماں بیٹی اس حسین سی شام میں بیڈمنٹن کھیلتی گئیں۔۔۔

اور یہیں مہر کی ان یادوں کا سلسلہ تمام ہوا تھا۔ یادیں خوبصورت تھیں۔ خوبصورت مگر تکلیف دہ۔ اور اگر مہر بنتِ عبداللہ سلطان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنی ماں سے منسلک تمام یادوں کو کب کا مٹا چکی ہوتی مگر یہ یادیں ہی تو ہیں جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔

وہ دونوں نوجوان اپنا کھیل ختم کر کے چلے گئے اور مہر واپس اردگرد کچھ دلچسپ تلاش کرنے لگی۔ اسے عنایا کی پریکٹس کے ختم ہونے کا بے صبری سے انتظار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر نے اپنی آلٹس اپنے ڈیڈ کے آفس کی عمارت کے سامنے پارک کی۔ وہ عنایا کو گھر چھوڑ کے سیدھا آفس آگئی۔ حالانکہ اس کا موڈ نہیں تھا مگر وہ جانتی تھی اگر وہ نہیں گئی تو نیلوفر نے رات میں اس سے ضرور کچھ نہ کچھ ملامتی کہنا تھا۔ آفس کی عمارت کے باہر کھڑے ہو کر اس نے اپنا کالا چشمہ اتارا اور

اوپر سے نیچے تک آفس کی عمارت کو دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کی۔وہ اپنے آپ کو کام کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

وہ آفس کے اندر ہاتھ میں چینل (chanel) کا بیگ پکڑے داخل ہوئی۔اس نے سفید کرتا پہنا تھا جس کے دامن کی طرف نیٹ کا نازک کام تھا۔وہ سیدھا چلتی جا رہی تھی۔اس کو دیکھتے ہی تمام ایمپلائیز چوکنا سے ہو گئے تھے۔وہ آتی تو کم ہی تھی مگر جب بھی آتی کسی نہ کسی کو ڈانٹ لگا کے ضرور جاتی تھی۔اس لیے مہر کی موجودگی میں ایمپلائیز زیادہ ہوشیار رہتے تھے۔وہ بغیر کسی کی پرواہ کیے اپنے ڈیڈ کے کمرے تک گئی اور سلائیڈنگ ڈور کھسکانے لگی۔اب اس کے سامنے وہ منظر واضح ہوا۔

عبداللہ سلطان اس کمرے میں بیٹھے کسی نوجوان سے مسکراتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔اس نوجوان نے سفید شرٹ پر گرے کوٹ پہنا ہوا تھا۔بالوں کو نفاست سے سیٹ کیا ہوا تھا۔ہاتھ میں اس کے مہنگی گھڑی تھی۔مہر کے آتے ہی دونوں تھم گئے اور پھر عبداللہ سلطان نے مہر کو نظر اٹھا کر دیکھا۔مہر کو دیکھتے ہی وہ نرمی سے مسکرائے۔مہر کے چہرے کی سختی اپنی جگہ پر برقرار رہی۔

"احمد، اس سے ملو۔یہ مہر ہے۔میری بیٹی۔" عبداللہ سلطان کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ تھی۔احمد نے مہر کی طرف دیکھا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنے سر کو خم دیا۔اب وہ اور بھی واضح طور پہ احمد کو دیکھ سکتی تھی۔وہ دکھنے میں کافی اچھا تھا، پرکشش سا۔

"اور مہر یہ ہیں احمد یوسف۔ہماری کمپنی کے سافٹ ویئرز انہوں نے ہی بنائیں ہیں۔اور ابھی یہ محافظت کے سلسلے میں آئے ہیں۔ویسے تو احمد یوسف کے اسٹوڈنٹس کی ایک ٹیم ہے جو اِن کے ساتھ کام کرتی ہے۔مگر سچ بولوں تو بڑے بڑے سوفٹ ویئر ہاؤسس بھی میری امیدوں پر پورا نہیں اترتے، مگر احمد

یوسف کا کام بہترین ہے۔" عبداللہ سلطان ہنس ہنس کے بتائے جا رہے تھے۔مہر نے ایک استعجاب آمیز نگاہ احمد پہ ڈالی جو کہ سر جھکائے اپنی تعریفیں سن رہا تھا۔

"اچھا لگا آپ سے مل کر۔" مہر کا انداز روکھا سا تھا۔"امید ہے آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"ضرور۔" اس نے بھی تکلفانہ انداز میں جواب دیا اور عبداللہ سلطان کی طرف رخ موڑ گیا۔مہر نے دروازہ بند کیا اور پھر باہر آگئی۔اب اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے موبائل پر کسی کی کال آنے لگی۔مرینا آنٹی کالنگ۔مہر نے فوراً سے کال اٹھا لی۔

"کیسی ہو مہر؟" مرینا نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔

"جی آنٹی میں ٹھیک ہوں۔" مہر نے عام انداز میں بتایا۔

"اچھا میں نے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" مہر نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"جی آنٹی،کہیے۔" مہر اب اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔آفس کا کمرہ اے سی کے باعث بہت ٹھنڈا اور پر سکون تھا۔

"مہر ایک دفعہ میری بات تحمل سے سننا۔دراصل حسام آج واپس آگیا ہے۔" یہ سنتے ہی مہر کے سخت تاثرات میں تکلیف نمایاں ہونے لگی۔اس کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑ لی۔ اس کا تنفس تیز ہونے لگا۔ ماتھے پر نا جانے کتنی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"میں جانتی ہوں ماضی بہترین نہیں تھا۔ مگر مہر حسام عنایا کو دیکھنے کیلئے تڑپ رہا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کیلئے اسے عنایا سے ملنے دے سکتی ہو؟" مرینا کا لہجہ بہت نرم تھا۔ مہر اپنے اعصاب کو بمشکل قابو کر پارہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کچھ الٹا سیدھا کہنے سے روکنا چاہ رہی تھی۔

"کبھی نہیں!" مہر نے اپنے غصے کے کڑوے گھونٹ پیتے کہا۔ "حسام عنایا کو ڈیزرو نہیں کرتا۔ اگر وہ تڑپ رہا ہے تو اسے تڑپنا ہی چاہیے!" مہر کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ وہ اپنے انداز میں حسام کے لیے نفرت لیے بولی تھی۔

"مگر مہر۔۔" مرینا کچھ بولنا چاہ رہی تھیں۔

"دیکھئے آنٹی میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں،" ایک آنسو مہر کی کالی گہری آنکھوں سے نکلا۔ "مگر مجھے وہ کرنے کیلئے نہ کہیں جو میں نہیں کر سکتی۔ میری عنایا، حسام سے کبھی نہیں ملے گی۔ پلیز مجھے فورس مت کریں۔" یہ کہہ کر مہر نے کال کاٹ دی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی کنپٹی مسل کر اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بے فیض۔ مہر کا سارا چین برباد ہو چکا تھا۔

تو آخر حسام آگیا تھا۔

"میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کرنے والی حسام۔ کبھی نہیں۔" زیر لب بڑبڑاتے اس نے خود سے تہیہ کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات نے اپنی کالی چادر پورے اسلام آباد پہ اوڑھا دی تھی۔ یہ عافیت زندگی نامی ہسپتال کا منظر ہے جہاں نیلوفر نے مینجر کی پوسٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ یہ ہسپتال کافی بلند و بالا اور پر تعیش تھا۔ باہر کی دیواروں پہ سفید پینٹ تھا۔ باہر لگی بتیوں کے باعث وہ اس وقت چمک رہا تھا۔

نیلوفر اپنے آفس کی نرم و ملائم کرسی پہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پہ تھکان تھی۔ وہ بس کچھ ہی دیر میں گھر جانے والی تھی۔ تب ہی اس کے کمرے میں آہٹ ہوئی اور ہسپتال کی ایک آیا اس کے کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔

"میم۔ آپ کے لیے کسی فلاحی تنظیم نے پارسل بھیجا ہے۔" نرس سر جھکا کے کہہ رہی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نیلوفر سے مرعوب تھی۔ نیلوفر کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔ اس نے نرس کو اشارہ کیا تو نرس نے وہ پارسل اس کے ڈیسک پر رکھ دیا اور وہاں سے چلتی بنی۔ وہ ایک پتلا سا ڈبا تھا جس پہ نیلا گفٹ پیپر چڑھایا گیا تھا۔ نیلوفر نے گفٹ ریپ پھاڑا تو ایک نوٹ اسے نظر آیا۔ اس نے مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ نوٹ پڑھا۔

"نیلوفر! ہم آپ کو فالو کرتے ہیں۔ آپ اس معاشرے کے لیے جو کر رہی ہیں اس پر ہماری تنظیم کو آپ پہ فخر ہے۔ یہ چھوٹا سا تحفہ آپ کے کاموں کے سامنے کچھ نہیں۔ اسے قبول کیجئے گا۔ امید ہے آپ انسانوں کی فلاح کیلئے ہمیشہ ایسے ہی محنت کرتی رہیں گی۔"

نیلوفر زیر لب ہنس دی۔ اس کا موڈ ایک دم سے تر و تازہ ہوگیا تھا۔ اس نے ڈیسک پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور تنظیم والوں کا انسٹا کھول کر ادھر میسج بھیجا:

”مجھے آپ لوگوں کا خلوص اور محبت بھرا تحفہ ملا۔سچ بولوں تو ایک انسان جو کوئی نیک کام کرتا ہے اسے کسی قسم کے تحائف کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ یہ سب صرف اور صرف معاشرے کے لئے کرتا ہے۔اسی لیے اس تحفے سے زیادہ یہ الفاظ تھے آپ کے جنھوں نے میرے دل کو چھوا۔آپ لوگ بھی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔امید ہے ہم اسی طرح سے اس معاشرے کے لئے اور بھی بہت کچھ کریں گے۔“

نیلوفر نے میسج ٹائپ کر کے موبائل پرے رکھ دیا۔اپنے ایکریلک نیلز کا استعمال کر کے وہ تحفے کا ریپ پھاڑنے لگی۔اندر ایک بہت ہی خوبصورت لال رنگ کا ڈبا تھا۔ڈبے کے اوپر ویلوٹ کے کپڑے کا کام تھا جس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔نیلوفر نے ڈبا کھولا تو اس میں ہیرے کا نہایت خوبصورت بریسلٹ تھا۔اس نے بریسلٹ کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور اسے اپنی نظروں کے قریب کیا۔وہ ہیرا آس پاس کی روشنی کی وجہ سے چمکتا تھا۔نیلوفر اس نازک سے بریسلٹ کو بے تاثر چہرے کے ساتھ بغور دیکھ رہی تھی اور تب ہی اس کے کمرے کے اندر ایک بھاری جسامت والا مرد داخل ہوا۔نیلوفر نے بس سر سری نظر اس مرد پر ڈالی۔وہ اسی طرح، اپنی جگہ پہ منجمد اس ہیرے کو دیکھتے گئی۔بھاری جسامت والا مرد نیلوفر کے سامنے والی کرسی پہ براجمان ہو گیا۔

”ہم کب جارہے ہیں شمس۔“ ہیرے پہ اسی طرح سے نظریں جمائے وہ بے تاثر سے انداز میں بولی تھی۔

”ٹھیک اٹھارہ دن بعد۔اس کے بیوی بچے گھر میں موجود نہیں ہوں گے۔میں نے سب چھان بین کر لی ہے نیلوفر۔“ نیلوفر کی آنکھوں میں چمک در آئی۔اس کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ بکھری۔

”اچھا! پکا اس کے گھر والے نہیں ہوں گے؟“ نیلوفر نے اس بریسلٹ کو ٹیبل پر رکھا۔اس کے چہرے پہ تشکر آمیز تاثر تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے برسوں پرانی آس تھی جو پوری ہونے والی تھی۔

”جی۔میں نے کال ٹریس کی تھی۔اس کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ سینیما جائے گی۔بچے بھی ساتھ جائیں گے۔مووی دو گھنٹے کی ہے۔ہمارے پاس کافی وقت ہو گا۔“ شمس نیلوفر کو بتاتے گیا۔نیلوفر اسے سنتے ہوئے سر اوپر نیچے ہلانے لگی۔ڈیسک پہ پڑے بریسلیٹ کے اوپر اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ رکھا اور پھر اسے شمس کی جانب کھسکانے لگی۔وہ ممنوع نگاہوں سے شمس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم یہ رکھ لو۔“

”مگر میں اس کا کیا کروں گا۔“ شمس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”بیچ دینا اور پیسے رکھ لینا۔تم میرا بہت بڑا کام کرنے جارہے ہو شمس۔“ نیلوفر نے تشکرانہ انداز میں کہا۔

”میں نے کچھ بھی پیسوں کیلئے نہیں کیا نیلوفر۔اور آپ یہ جانتی ہیں۔ ہم سب ایک ٹیم ہیں۔ہم سب ایک دوسرے کے گھر والوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ان چھوٹے موٹے کاموں میں مدد کریں۔“ نیلوفر اپنا سر دائیں بائیں ہلانے لگی۔

”نہیں شمس! تم ہمیشہ سے میری آگے سے آگے بڑھ کے مدد کرتے ہو۔میرے کتنے آدھے ادھورے کام تم کر دیتے ہو۔تم یہ ڈیزرو کرتے ہو۔انکار مت کرنا،بس۔“ نیلوفر کا انداز حتمی تھا۔شمس نے شکست خوردہ سا چہرہ بنایا اور بریسلیٹ اپنی مٹھی میں تھام کے کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔

"یہ پہلی اور آخری بار تھا۔آپ کے کام مجھ پر فرض ہیں۔" شمس نے نرمی سے کہااور پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔

نیلوفر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔آنکھوں میں نرم تاثر برقرار رہا۔

دروازہ ٹھپ سے بند ہوا اور وہاں نیلوفر کی وہ احسان مندانہ سی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔آنکھوں سے ممنوع سا تاثر فنا ہوا۔اب اس کی آنکھوں میں حقارت ٹپک رہی تھی اور چہرے پہ حقارت بھری مسکان تھی۔

"اف بیوقوف آدمی۔اِسے تو میں نے سستے میں نپٹا دیا!" نیلوفر آنکھیں گھماتے بولی۔

وہ اپنی کرسی پے پھر سے آنکھیں بند کرکے، ٹیک لگائے سکون سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ احمد اور اس کی بہن درِفشاں کے دو سو چالیس گز کے مکان کا منظر تھا۔

مکان کارنر کا تھا اور اس کے ارد گرد ایک حسین گرین بیلٹ تھی جس پر طرح طرح کے پودے لگے تھے۔سدابہار کے پھولوں کی ایک قطار اس گرین بیلٹ میں لگی ہوئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پام کو قطار میں لگایا ہوا تھا۔امرود کا درخت، انار کا درخت، تربوز کے پودے اس گرین بیلٹ کو اضافی خوب صورتی سے نوازتے تھے۔

مغرب قضاہوگئی تھی اور آسمان اب جامنی رنگ میں ڈھلنے لگا تھا۔گھر کے باہر لگی بتیاں روشن تھیں۔

بڑے دروازے سے داخل ہو تو اندر عقب میں ایک چھوٹا سا گارڈن بنا تھا جس میں دنیا جہاں کے

پودے سجائے ہوئے تھے۔کار پورچ میں ایک کلٹس اور بائیک کھڑی تھی۔گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اوپن لاؤنج تھا۔سامنے ایک میڈیا وال تھی جس پر بڑی سی ایل ای ڈی لگی تھی۔لاؤنج میں ایل شیپ کے خوبصورت صوفے تھے۔تھوڑا آگے گول سیڑھیاں تھیں۔سیڑھیوں سے تھوڑا پہلے ایک خوبصورت آئی لینڈ کچن بھی بنا ہوا تھا۔کچن کے سامنے ایک ایل شیپڈ کالے رنگ کی ٹیبل تھی جس کے ساتھ کرسیاں رکھ کر دونوں بیٹھے چیس کھیل رہے تھے۔

درِ فشاں تیس سال کی تھی۔اس کے اسٹریٹ بال ترتیب سے پونی میں بندھے ہوئے تھے۔اس کے نقوش عام، مگر پُر کشش تھے۔ماتھے پر اس کے عمر کی لکیر تھی جو کے اس کی شخصیت میں تمکنت بخشتی تھی۔آنکھوں میں اس کے ذہانت کا عکس تھا۔دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا تھا کہ درِفشاں ایک تجربہ کار اور سمجھدار لڑکی ہے۔

فی الحال تو وہ بہت پر جوش نظر آ رہی تھی۔اسے جیت کی خوشبو آ رہی تھی۔وہ عموماً اپنے بھائی سے ہار جایا کرتی تھی، مگر آج احمد کی تقریباً ہر گوٹی وہ گرا چکی تھی۔وہ چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ سجائے کچھ چال مزید چل دی۔

”یہ شہ۔“ احمد بولا اور اپنا سپاہی کا مہرا اٹھا کے درے کے کنگ کو مارنے لگا۔ ”یہ مات!“ درے کا چہرہ حیرانی میں بدلنے لگا۔

کچھ وقت لگا اس کے دماغ کو پراسس کرنے میں کہ آخر ہوا کیا تھا، اور جیسے ہی اسے سمجھ آئی وہ تالیاں پیٹنے لگی۔احمد کرسی پر ٹیک لگائے چہرے کو فاتحانہ مسکراہٹ میں ڈھالے حیران و پریشان درے کو تالیاں پیٹتے دیکھ رہا تھا۔

"واہ! مجھے حیران کر دیا تم نے احمد!" درے تعجب سے بولی۔

"ہاں، ان تعریفوں کے پیچھے تمہارے آنسو دیکھ سکتا ہوں آپا۔" احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ درے کا تعجب بھرا تاثر فنا ہوا۔ اس نے ایک ہاری ہوئی سانس ہوا میں خارج کی۔ وہ کیسے اپنے خطرناک بھائی کو ایسے نیچا دکھانے کا موقع دے سکتی تھی؟ ہونہہ۔

"خیر، سہی سہی بتاؤ، آخر کیسے جیت گئے تم؟ مجھے تو لگا تھا تم اپنے گھوڑے سے میرے گوٹ گرانے والے تھے۔۔" درے کھڑے ہو کر کچن سنک کی طرف بڑھی۔

"یہی تو، دشمن کو ہرانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے یہ تاثر دو کو وہ جیت رہا ہے اور پھر پوری کی پوری بساط ہی الٹ دو۔ میں نے بس تمہیں بھٹکایا تھا آپا، میں نے تمہیں یہ تاثر دیا کہ میں اپنا گھوڑا استعمال کرنے والا ہوں مگر میرا پلان کچھ اور تھا۔" درے برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اس کی پشت احمد کی جانب تھی۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے نہ جانے کتنی جنگیں لڑ رہے ہو احمد۔" اور درے بولتی گئی۔ وہ احمد کو نہیں دیکھ رہی تھی جس کے تاثرات آہستہ آہستہ بدل گئے تھے۔ اس کی فاتحانہ مسکراہٹ مدھم ہو گئی تھی اور اب چہرے پر سنجیدگی چھانے لگی تھی۔

وہ واقعی لاعلم تھی،

ان جنگوں سے جو اس کا بھائی لڑ رہا تھا،

اور درِ فشاں کی اس لاعلمی میں ہی،

اس کی خیر و عافیت تھی۔۔

”آج افشاں خالہ آئیں تھیں۔“ درے برتن دھو کر فارغ ہوئی تو دوبارہ سے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔احمد اس وقت موبائل میں مگن تھا۔اسے لگا کوئی خاندانی سیاست کی باتیں ہوں گی۔چونکہ اسے خاندانی سیاست میں دلچسپی نہ تھی اس لیے اس نے درے کی بات کو سننے کے بجائے موبائل پہ مگن رہنے کو ترجیح دی۔

”اور وہ کہہ رہیں تھیں کہ میں تمہارے رشتے کا کب سوچوں گی۔“ درے کا انداز شرارتی تھا۔اب یہ ایسی بات تھی جس میں احمد کو دلچسپی تھی، مگر وہ دلچسپی ظاہر کر کے اپنا مذاق نہیں اڑوانا چاہتا تھا اس لئے ہنوز موبائل میں مگن رہا۔

”تم نے کیا کہا پھر؟“ احمد نے جتنا ہو سکتا تھا اتنا سرسری سا انداز رکھا۔درے اپنے بھائی کے کمپوز رہنے کی کوششیں دیکھ کر محظوظ ہوئی۔

”میں نے کہہ دیا کہ بس، آپ کوئی اچھی سی لڑکی دکھا دیں تو ضرور سوچوں گی۔اور پتا ہے انہوں نے کہا وہ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ دکھائیں گی مجھے۔“ درِ فشاں پُرجوش نظر آ رہی تھی۔

”ہونہہ“احمد نے بظاہر لاپرواہ سا انداز رکھا مگر اس کے گال سرخ پڑنے لگے تھے۔

”اب بھئی تم ہو اٹھائیس کے، الحمد للہ تمہارا بزنس ہے۔جلد تم اپنی ورک پلیس میں شفٹ ہو جاؤ گے۔سب سیٹ ہو جائے گا۔اب پرفیکٹ ٹائم ہے تمہاری شادی کا۔“ احمد نے اپنا موبائل اب ایل شیپڈ ٹیبل پہ رکھا اور نظر اٹھا کے درے کو دیکھا۔اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔

”آپا ویسے تم شادی کیوں نہیں کر لیتی۔“ اس نے بہت اطمینان سے کہا۔درے ایک دم سے چونکی۔

”پہلے تم سیٹ ہو جاؤ پھر میرا بھی دیکھ لیں گے احمد۔“ درے نے تحمل سے کہا۔

”مگر مجھ سے پہلے کیوں نہیں؟“ درے نے ایک گہری سانس اندر کو لی۔

”دیکھو احمد!صرف ہم دونوں ہی اس دنیا میں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔جس طرح میں تمہاری ذمہ داری ہوں اسی طرح تم بھی میری ذمہ داری ہو اور فی الحال میں اس طرح سے تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“ درے نے بہت سکون سے کہا۔

”میں کوئی دودھ پیتا بچہ تھوڑی ہوں۔“ احمد نے منہ بناتے کہا۔

”احمد شادی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔تم جانتے ہی ہو۔میرے اوپر تمہاری ذمہ داری پہلے سے ہے۔اور اس ذمہ داری کے ہوتے ہوئے میں کسی رشتے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکوں گی۔ ایک دفعہ تم سیٹل ہو جاؤ پھر میں بھی ضرور سوچوں گی۔“ درے نے اپنا موقف پیش کیا تو احمد نے اپنا سر ہلایا۔ویسے بھی اسے درے کی خواہش کا احترام کرنا ہی تھا۔

”ویسے احمد، فیروز بھائی بھی ساتھ ہوتے آج تو وہ بھی کتنا خوش ہوتے۔“ درے کے اچانک اس ذکر پر احمد کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔

”آخر کیوں وہ اتنی جلدی چلے گئے احمد۔کیا ضرورت تھی انہیں جانے کی۔“ درے کی آواز میں تکلیف تھی اور انداز میں بے چینی۔

”کاش! وہ ہمیں چھوڑ کر استنبول نہ گئے ہوتے۔ کاش وہ ہماری خوشیاں دیکھتے۔ تمہاری شادی دیکھتے تمہارے بچے دیکھتے۔ ہماری زندگیوں کو مکمل ہوتے دیکھتے۔ مگر ہم ان سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔ آخر احسانات ہی اتنے ہیں۔ تم اٹھارہ کے تھے اور میں بیس کی جب ماما اور بابا کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ہمارا یہ گھر نیا نیا بنا تھا اور ہمارے اوپر کتنے قرضے تھے۔ ہمیں لگا تھا ہمیں گھر بیچنا پڑے گا، پڑھائی چھوڑنی پڑے گی۔ مگر نہیں۔ فیروز بھائی نے سب سنبھال لیا۔ آج میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں اور تم ایک سافٹ ویئر ڈیولپر، یہ صرف اور صرف ان کی وجہ سے ہے۔ مگر احمد کاش ایک دفعہ وہ آ جائیں۔ ایک دفعہ ہماری خوشیوں میں شامل ہو جائیں۔“ درے کی آنکھیں نم پڑیں۔ احمد بھی ڈسٹرب سا لگتا تھا مگر اس کے تاثرات عام تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے جذبات اور احساسات کو چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ احمد کھڑا ہو کر درے کی جانب بڑھا۔

”ایک دن خوشیاں ضرور لوٹیں گی آپا۔“ احمد نے بس اتنا کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

احمد کا کمرہ اوپر والی منزل میں تھا۔ کمرے کی دیواروں پر گریفائٹ پینٹ ہوا تھا۔ فرنیچر بھی گریفائٹ کے شیڈ کا تھا۔ بائیں طرف ایک چھوٹی سی بالکنی بنائی گئی تھی اور دائیں طرف والی دیوار پہ فرنیچ وال سے ڈیزائین بنا ہوا تھا۔ وہ سیدھا سیدھا اپنے بیڈ پہ لیٹ گیا اور چلتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا اور حال سے منقطع ہونے لگا اور پرانے وقتوں میں جانے لگا۔

یہ تین سال پہلے کا منظر تھا۔۔

وہ تینوں اپنے گھر کے لاؤنج کے صوفوں پہ براجمان تھے۔درِ فشاں ناراض سی نظر آ رہی تھی اور احمد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔فیروز تقریباً بتیس سال کا خوش شکل مرد تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر درِ فشاں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دیکھو درِ فشاں،بس کچھ عرصے کی بات ہے، ایک دفعہ میں سیٹل ہو جاؤں گا پھر میں تم سب کو بھی بلا لوں گا استنبول۔“ فیروز نے درے کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔درے منہ موڑے بیٹھی رہی۔اس کے انداز میں نروٹھا پن تھا۔

”بھائی ہم سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔اتنا خوبصورت گھر ہے۔میں کلینک میں کام کر رہی ہوں اور ماشاء اللہ سے احمد بھی اپنے اخراجات دیکھ رہا ہے۔ہمارا مستقبل تو محفوظ ہے پھر آپ کیوں جا رہے ہیں۔“ آنکھوں میں ناز و نخرہ لیے وہ فیروز سے بول رہی تھی۔

”کتنی بڑی ڈرامے باز ہے یہ۔“احمد نے سوچا۔

”دیکھو درے، زندگی کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرنے میں کوئی برائی نہیں۔“ درے کا نروٹھا پن ہنوز برقرار رہا۔

”یعنی آپ نہیں رکنے والے؟“ کچھ دیر بعد درے منہ موڑ کے بولی۔وہ بس اب ہار مان چکی تھی۔ویسے بھی اپنے محبوب بڑے بھائی سے زیادہ ناراض بھلا کون بہن رہ سکتی تھی؟ فیروز کے چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ در آئی۔

"ہاں درے۔" اب فیروز احمد کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں احمد؟" فیروز نے پوچھا۔وہ جانتا تھا احمد جذباتی نہیں تھا اور وہ کسی قسم کا اعتراض ظاہر نہیں کرے گا۔

"نہیں بھائی۔بس کوئی اسکیم وغیرہ نہ ہو۔" احمد نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔فیروز تیزی سے اپنا سر نفی میں ہلانے لگا۔اس نے اپنا موبائل نکالا اور انسٹاگرام کھول کر ایک پیج احمد کو دکھایا۔

"یہ دیکھو، سیٹل ان ترکی نام کا یہ پیج ہے۔ان کا آفس بھی ہے، میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔بے فکر رہو۔" فیروز نے احمد کو کہا تو وہ سرہلاتے پیچھے بیٹھ گیا پھر فیروز ان کو آفس کا ایڈریس سمجھانے لگا۔

"کب تک جانا ہے پھر بھائی؟" احمد نے سرسری سا پوچھا۔

"بس اگلے مہینے ہم نکل جائیں گے۔" احمد نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

آنے والے دو ہفتے تینوں بہن بھائی نے ایک ساتھ گزارے۔وہ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے۔روز رات کو گھومنے جاتے۔ساتھ ساتھ درِ فشاں فیروز بھائی کے لئے شاپنگ بھی کرتی رہی۔وہ استنبول کے موسم کے مطابق درست کپڑے لیتی رہی۔

یہ فیروز کے انہیں استنبول جانے کی اطلاع دینے کے دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔۔۔

فیروز کے چہرے پر اداس مسکراہٹ تھی۔وہ کسی گہری سوچ میں گم، اپنے گھر کے ٹیرس میں بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔پیچھے سے احمد اور درے بھی آئے اور کرسی لگا کر بیٹھ گئے۔درے کے ہاتھ میں چائے تھی اور احمد کے ہاتھ خالی تھے۔

”ویسے احمد چائے بھی پینا شروع کردو۔اف بہت بڑی نعمت سے محروم ہو تم۔“ درِ فشاں نے چائے کا گھونٹ بھرتے کہا۔احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

”بس تم دونوں ہی اس نعمت کے مزے لو۔میں یوں ہی خوش ہوں۔“ درِ فشاں نے ایسا منہ بنایا جیسے احمد کی اس بات کا اسے بہت برا لگا تھا۔

فیروز دوسری طرف کچھ کھویا کھویا تھا۔اس نے جیسے دونوں کی کوئی بات سنی ہی نہ تھی۔احمد اور درے نے ایک دوسرے پر پریشان نظر ڈالی۔

”بھائی کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے۔“ درے نے فکرمندانہ انداز میں پوچھا۔فیروز نے گردن تک نہ ہلائی۔ بس یوں ہی کھلے آسمان کو تکتا رہا۔

”تم دونوں بہت یاد آؤ گے مجھے۔“ فیروز نے سرد سے لہجے میں کہا۔احمد کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔کچھ تھا جو اسے کھٹک رہا تھا۔درِفشاں کا دوسری طرف رنگ مرجھا گیا تھا۔

”ابھی دو ہفتے ہیں بھائی۔ابھی وقت ہے۔“ درِفشاں اپنے دل میں چھائی اداسی کے باوجود بہت گرم جوشی سے بولی۔وہ ان دنوں ماحول کو کسی بھی قسم کی رنجش سے پاک رکھنا چاہتی تھی۔

”تم لوگ میرے بغیر رہ تو لو گے نا؟“اس بار جب فیروز نے کہا تو احمد کو یقین ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ تھی۔درِ فشاں اور احمد نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”بھائی سب ٹھیک تو ہے؟ آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔ہم مل کے کچھ حل نکال سکتے ہیں۔“ احمد نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"بھائی آپ ہمیشہ کیلئے تھوڑی جارہے ہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"فیروز نے ایک جھٹکا لیا۔وہ جذبات میں

آ کے کچھ زیادہ ہی بول گیا،شاید۔

"ارے میر امطلب وہ نہیں تھا۔" فیروز نے اپنے آپ کو نارمل کرتے کہا۔"اب تین چار ماہ لگیں گے مجھے تم لوگوں کو بلانے میں تب تک کیا کرو گے؟" فیروز نے کہاتو درے کی جان میں جان آنے لگی۔ مگر احمد کو ابھی بھی کچھ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔کچھ توضرور تھا جو فیروز ان دونوں سے چھپا رہا تھا۔

اگلی صبح جب درِ فشاں فیروز کو اٹھانے گئی تو وہ اپنے کمرے میں موجود نہ تھا۔اس نے گھر میں طوفان برپا کر دیا۔احمد بھی بہت پریشان ہوگیا تھا۔ مگر فیروز کا کچھ اَتا پتا نہ تھا۔ان کو فیروز کے کمرے میں زمین پہ پڑا ہوا ایک پیپر ملا۔ جس پر لکھا تھا:

"کاش کہ میں تم لوگوں کو بتا سکتا میں کتنا مجبور ہوں۔مگر فکر نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔میں تم دونوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور سب کچھ صرف تم دونوں کے لیے کر رہا ہوں۔ ہم جلد ملیں گے۔"

درے کے سینے پر تو جیسے سانپ لوٹ گئے۔ان دونوں نے بہت کوشش کی، ایئرپورٹ چیک کیے ہر جگہ چھان ماری مگر فیروز کہیں نہیں تھا۔پھر انہوں نے انسٹا گرام پر اس پیج کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اس نام کا پیج تو تھا ہی نہیں۔ان دونوں نے سیٹل ان ترکی کے آفس ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی مگر اس کا بھی نام و نشان نہ تھا۔یہ سب بہت عجیب تھا۔

ایک جھٹکا کھا کے احمد حال میں لوٹا۔پنکھا ہنوز اپنی عام رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔

سب بدل گیا تھا۔اب انہیں فیروز بھائی کے بغیر رہنے کی عادت ہوگئی تھی مگر۔مگر ان یادوں کا کیا، کیا جائے جو

اب تک باقی تھیں؟ وہ یادیں جو ان کو اب تک تکلیف دیتی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ رات حسام پر بہت بھاری تھی۔اس کا دل بہت بوجھل تھا۔بے چینی اور بے قراری اب شدت اختیار کر چکی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے دل کی اس کیفیت سے کیسے جان چھڑائے۔اسے بس اپنی بیٹی کو دیکھنا تھا، بس ایک مرتبہ اسے محسوس کرنا تھا۔وہ کتنا بدلی ہوگی؟ وہ کتنی بڑی ہوئی ہوگی؟ وہ اب کس طرح کی باتیں کرتی ہوگی؟ حسام بس جاننا چاہتا تھا۔

ڈرگز نے حسام کی زندگی تباہ کردی تھی۔وہ جو بچپن سے لے کر یونیورسٹی تک ٹاپ کرتا تھا۔لوگ اسے ایول جینئیس کہتے تھے، آج وہ اپنی زندگی ضائع کیے بیٹھا تھا۔ریہیب ختم ہونے سے قبل اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔وہ اب اپنی زندگی ضائع نہیں کرے گا۔وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔مگر یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔اور عنایا والے معاملے نے اسے بہت مضطرب چھوڑ دیا تھا۔

حسام سے پھر برداشت نہیں ہوا اور اس نے مہر کو کال ملانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا لیکن اس وقت وہ مجبور تھا۔شاید مہر اسے عنایا کی آواز ہی سنا دے۔

پہلی رنگ پر مہر نے کال کاٹ دی۔ حسام چونکا۔ آخر مہر ایسا کیوں کر رہی تھی؟ حسام نے دو مزید رنگ مہر کو دی لیکن جواب نہ ملا۔ مہر نے دونوں دفعہ کال کاٹ دی۔ چوتھی رنگ پر مہر نے بالآخر کال اٹھا لی۔

"کیا ہے؟" فون کے دوسری طرف سے بد لحاظ آواز گونجی تھی۔ حسام اس آواز کو پہچانتا تھا مگر وہ انداز؟ اس انداز سے وہ مانوس نہ تھا۔ اس نے موبائل اپنے کان سے جدا کیا اور فون پر نمبر کو دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ یہ مہر ہی تھی۔ وہ واقعی مہر کا نمبر تھا۔

"اب واپس آگئے ہو تو کیا یوں کال کر کر کے زندگی مشکل بناؤ گے؟ ہاں؟" مہر کی آواز بلند تھی مگر وہ چلا نہیں رہی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو کم چلایا کرتے تھے۔ دوسری طرف حسام دم سادھے کھڑا تھا۔ مہر کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایسے بات کب سے کرنے لگی تھی؟ وہ تو جس مہر کو جانتا تھا وہ تو انتہائی نرم مزاج تھی۔ ہر کسی کو آپ سے مخاطب کرتی تھی۔ وہ مہر آخر کہاں کھو گئی؟ اس وقت حسام فاروق کو احساس ہوا کہ اس کی ڈرگ ایڈکشن نے خود سے زیادہ نقصان تو اس مہر کو پہنچایا تھا۔ اور یہ احساس اسے شدید پچھتاوے میں مبتلا کر گیا تھا۔

"مہر بس۔۔" حسام شرمسار تھا۔ اس سے کچھ کہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنسوؤں کا پھندا حلق میں پھنسا تھا مگر وہ رو نہیں رہا تھا۔ "بس عنایا۔۔۔ ملوادو۔۔۔ تھوڑی دیر۔" حسام کی آنکھ سے پھر ایک آنسو نکلااور پھر آنسوؤں کی رسی کھل گئی۔ وہ اب زار و قطار رونے لگا۔

"کبھی نہیں" مہر غرائی تھی۔ "تمہیں کیا لگتا ہے میری زندگی ضائع کرنے کے بعد تم ایک دن آؤ گے اور تمہیں سب کچھ مل جائے گا؟ نہیں حسام، تم تڑپو گے۔ تم رات رات بھر عنایا کی یاد میں رو گے۔

تم سونا چاہو گے مگر تمہاری یہ بے چینی اور بے قراری تمہیں نیند سے بھی محروم کر دے گی حسام! تم۔۔۔تم۔۔۔تم" مہر کو جیسے حسام کی شان میں کہنے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔حسام کی گردن مزید جھک گئی۔

"بس ایک دفعہ۔" حسام نے ہمت کر کے کہا۔

"نہیں! جو چاہے کرلو۔اور ہاں اب کال نہ کرنا ورنہ ایف بی آئی میں کمپلین لانچ کردوں گی! دوبارہ جانا پھر جیل میں!" مہر نے تلخی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔حسام لاجواب سا وہیں کھڑا رہا۔آنسو اب بھی نہ رکے تھے۔وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔اپنی روح پہ وہ تکلیف لئے روئے جا رہا تھا۔اور یوں ہی ماضی کی کچھ یادیں اس کے سامنے لہرانے لگیں۔۔۔

یہ ایک سال پہلے کا منظر تھا۔

یہ حسام کے بنگلے کا منظر ہے۔شادی کے وقت وہ سب وہیں پہ رہا کرتے تھے۔حسام اپنے بنگلے کے لاؤنج کے صوفے پے، گردن جھکائے بیٹھا تھا۔اس کے چہرے پر شدید ندامت تھی۔مہر اس کے سامنے کھڑی اسے غصیلی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"حسام! کب سے چل رہا ہے یہ سب؟ آپ تو ٹھیک ہو گئے تھے نا؟" مہر کی آواز اونچی تھی۔اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔حسام کا چہرہ شرم کے مارے مزید جھک گیا۔

"ایک مہینہ۔" مہر کے سر پر پہاڑ آکر گر گیا۔اس نے بے یقینی کے عالم میں حسام کو دیکھا اور پھر تکلیف کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

"حسام یہ کیا کیا آپ نے؟ سب کچھ کتنا اچھا چل رہا تھا۔ایک سال سے آپ نے ڈرگز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ہم سب کتنے مکمل تھے حسام۔" مہر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔وہ اس وقت شاک اور صدمے میں تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں میں چھوڑ دوں گا سب۔" حسام کی آواز کمزور تھی۔مہر سر نفی میں ہلانے لگی۔

"وہی وعدے جو آپ پچھلے چار سالوں سے کر رہے ہیں؟ جس دن سے مجھے پتا چلا۔اس دن سے آج کا دن ہے حسام۔مجھے تو اب شک ہونے لگا ہے کہ آپ یہ چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔آپ کیوں بھول جاتے ہیں آپ کی بیٹی بھی ہے۔اف حسام۔" مہر کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ اسے اپنے ہاتھ سے سب کچھ پھسلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

"میرا یقین کرو۔میں اس بار واقعی سب کچھ چھوڑ دوں گا۔" حسام نے ایک نظر مہر پہ ڈالی۔اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ان میں غم سمایا ہوا تھا۔مہر ان آنکھوں کو دیکھ کر نرم پڑنے لگی۔اس نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"یہ آخری بار ہی ہونا چاہیے حسام۔آپ نہیں بھولیں کہ اب عنایا بڑی ہو رہی ہے۔وہ جیسے جیسے بڑی ہو گی اس کے دماغ میں طرح طرح کے سوال ابھریں گے۔اگر بات صرف مجھ تک ہوتی تو شاید میں برداشت کر لیتی۔مگر اب نقصان میں میری بیٹی ہے۔" مہر نے ایک سخت نگاہ حسام پر ڈالی جو کہ اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔میرا وعدہ ہے تم سے۔"

حال کا حسام سر جھکائے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔وہ آج تک کوئی وعدہ پورا نہ کر سکا۔اور مہر بھی ایک دن اسے چھوڑ کے چلی گئی۔اب اس کی بیٹی بھی اس سے کوسوں دور تھی۔وہ ہر طرف سے گھاٹے میں تھا۔

”حسام آ کر کھانا۔۔“ مرینا دروازہ کھول کر داخل ہوئیں تو روتے ہوئے حسام کو دیکھ کر رک گئیں۔ان کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا۔وہ تیزی سے حسام کی طرف لپکی تھیں۔

”حسام، کیا ہوا ہے۔بتاؤ۔“ مرینا نے حسام کا کندھا سہلاتے ہوئے پوچھا۔

”امی! مہر مجھے عنایا سے ملنے نہیں دے رہی۔آپ پلیز اس سے بات کریں۔“ حسام نے کہا۔مرینا کا چہرہ نرم پڑا۔

”میرے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔میں ایک دفعہ پہلے کر چکی ہوں۔مہر بہت بدل گئی ہے حسام۔ مگر اس میں اس کا بھی قصور نہیں۔خیر میرے پاس ایک حل ہے۔“ مرینا کے کہتے ہی حسام کی آنکھوں میں امید جھلکنے لگی۔

”میں اکرم صاحب سے کہہ کر مناج سے تمہارا اپوائمنٹ لے لوں گی۔“ مرینا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کون مناج؟“ حسام الجھ گیا۔اس نے پہلی دفعہ ہی مناج کا نام سنا تھا۔

”مناج ایک قابل وکیل ہے۔اب یہی طریقہ ہے عنایا سے ملنے کا۔“ حسام کی الجھن میں اضافہ ہوا۔ آخر ایک وکیل اس کی اس صورت میں کیسے مدد کر سکتی تھی؟

"مگر امی وہ ہماری مدد کیسے کرے گی؟" حسام نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"ہم کورٹ سے درخواست کریں گے کہ مہر تمہیں عنایا سے ملنے دے۔اور مناج سے زیادہ بھروسہ میں کسی پر نہیں کر سکتی۔وہ بہت ہوشیار ہے۔بہت تیز۔وہی یہ معاملہ سنبھال سکتی ہے۔" حسام کو جیسے اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگا۔

"وہ پکا کوئی حل نکال لے گی ناں؟" حسام کا دل اب بھی پوری طرح سے مطمئن نہیں تھا۔

"ہاں، میں پچھلے سال سے اس کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔وہ بہت پروفیشنل ہے۔وہ سب معاملات سنبھال لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ یہ سب بھی دیکھ لے گی۔" حسام اب تھوڑا ٹھنڈا پڑا۔وہ مناج کو بھی آزما کر ضرور دیکھے گا۔اس نے فیصلہ کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔آسمان پہ ہلکے پھلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور سورج اس وقت کسی بادل کے پیچھے بیٹھے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک چار سو گز کی زمین پر بنا حسین گھر تھا، جس کا بڑا سا لان تھا۔لان میں طرح طرح کے پھول نظر آرہے تھے۔لان کی گھاس ہری بھری تھی، یقیناً اس گھر کے مکین اس لان کا بہت دھیان رکھتے تھے۔وہ ایک منزلہ گھر تھا۔گھر کے باہر سفید پینٹ تھا اور باہر کی دیواروں پر اسٹون ورک تھا۔

اندر سب سے کونے والے کمرے میں وہ نظر آئے گی۔۔مناج!

وہ اپنے بستر پر ٹیک لگائے مدہوش سی بیٹھی تھی۔اس کے کھلے بال بکھرے ہوئے تھے اور کچھ لٹیں اس کی چہرے پر آتی تھیں۔وہ عام شکل کی تھی اور رنگ اس کا سانولا تھا، مگر عموماً لڑکیوں کے برعکس اس کی پلکیں بڑی بڑی تھیں۔

وہ کسی غبار میں بیٹھی مدہوش سی ہاتھ میں سگریٹ پکڑے کش بھرے جا رہی تھی۔

"مناج بیٹا، جاگ گئی ہو؟" مناج کی خالہ رضیہ دروازے کے اس پار سے بولی تھیں۔مناج اپنے بستر پر یوں ہی بت بنی بیٹھی رہی۔نہ وہ ہلی نہ ہی اس کے بے تاثر چہرے پر کوئی تبدیلی آئی۔

"جی خالہ۔"

اگر کوئی اس کی آواز سنیں تو کچھ لمحے سوچ میں پڑ جائے کہ کیا کوئی انسان بھی یوں بات کر سکتا تھا؟ اس کی آواز میں اس کے اندر بسا ہوا خالی پن جھلکتا تھا۔آواز ہر جذبے اور ہر احساس سے پاک تھی۔ انداز مشینی تھا۔۔۔آواز بھی مشینی۔

"تو بیٹا باہر آکر ناشتہ کرلیتی، خالو بھی ساتھ ہیں۔" رضیہ کا لہجہ التجا گو تھا۔مناج نے ایک تھکی ہوی سانس خارج کی۔اس نے اپنی آدھی جلتی سگریٹ سائڈ ٹیبل پر رکھی اور دروازے کی طرف چلتی بنی۔

"لیں میں آگئی۔" وہ مشینی انداز میں بولی۔رضیہ مناج کو دیکھ کر مسکرائی اور مناج ان کے پیچھے پیچھے کھانے کی میز تک پہنچی جہاں سربراہی کرسی پہ امجد براجمان تھے۔مناج کے بیٹھتے ہی سب نے ایک ساتھ کھانا شروع کیا۔وہ ان سب کا انداز دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ آج وہ کونسی بات کرنے والے تھے۔

مگراسے کونسا فرق پڑنا تھا؟

"مناج تمہارے خالو بہت ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔" رضیہ نے ناشتے کے دوران کہا۔مناج نے رخ موڑا اور اپنی بے جان آنکھوں سے اپنے خالو کو دیکھا۔امجد نرمی سے مسکرا رہے تھے۔

"دیکھئے مناج۔آپ کے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ہم چاہ رہے تھے کہ آپ کی رضا مندی ہو تو بات کو آگے بڑھائیں۔آپ اس بار کم سے کم اس لڑکے سے مل لیں۔" مناج کے خالو امجد کا لہجہ بہت پر خلوص اور نرم تھا۔کوئی اور لڑکی ہوتی تو ضرور اس بات پر کوئی نہ کوئی ردعمل دیتی مگر وہ مناج تھی، ہر جذبے اور احساس سے خالی۔

"خالو۔آپ جانتے ہیں میں نے شادی نہیں کرنی۔" مناج کا انداز اب بھی مشینی تھا۔وہ ہر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا کرتی تھی۔ہر ایک ایک لفظ کا تلفظ خالص تھا۔اس کے اندر کا خالی پن اس کے الفاظ میں جھلکتا تھا۔

"دیکھئے مناج، آپ میں کیا کمی ہے؟ آپ ایک ترقی کرتی ہوئی وکیل ہیں۔تعلیم یافتہ ہیں اورآپ نے اپنا کریئر بھی بنا لیا ہے پھر آپ کیوں شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"امجد کا لہجہ اب بھی بہت نرم تھا۔

"خالو! میرے اچھے کریئر اور میری اچھی تعلیم کے پیچھے آپ میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ بھول رہے ہیں، وہ بہت کچھ جس کے ہوتے ہوئے میں کسی کی نہیں ہو سکتی۔" اور مناج نے اتنی سنجیدہ بات، جو کہ عام انسان دیگر جذبات کے ملاپ سے کہے، یہ بات مناج نے بالکل سیدھی سیدھی کہی۔نہ کوئی تاثر تھا نہ کوئی جذبہ۔بس الفاظ۔سادہ اور خالی۔

”شاید آپ غلط سمجھ رہی ہوں۔شاید شادی کے بعد آپ ٹھیک ہوجائیں مناج۔“ امجد صاحب کی امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔

”نہیں خالو! یہ ایک جوئے سے کم نہیں ہو گا۔اور میں جوا نہیں کھیلتی۔“ مناج نے بس سرسری سا کہا، اپنے عام انداز میں۔امجد صاحب بھی بس اب چپ ہو گئے۔مناج جب کھانا کھا کر اٹھی تو رضیہ نے فکرمندی سے امجد سے کہا:

”میں بہت پریشان ہوں ہماری مناج کیلیئے۔وہ ستائیس کی ہوگئی ہے مگر وہ اب تک اپنی زندگی کے تلخ پہلو کو نہیں بھلا سکی امجد۔“

”دعا کیا کرو رضیہ، صرف دعائیں ہی مناج کو ٹھیک کر سکتی ہیں۔“امجد کی آواز میں تکلیف تھی۔

مناج جب اپنے کمرے میں لوٹی تو سائیڈ ٹیبل پہ پڑی سگریٹ پوری طرح سے جل کر راکھ ہو چکی تھی۔اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سگریٹ کے پیک سے ایک اور سگریٹ نکالی اور ایک کونا لائیٹر سے جلا کر آہستہ آہستہ اس کے کش بھرنے لگی۔تب ہی اس کے موبائل پر رنگ ہوئی۔چیپکو اکرم کالنگ۔مناج موبائل ہاتھ میں پکڑے اسکرین کو گھورتی رہی، پھر تھکی ہوئی سانس خارج کر کے کال اٹھائی۔

”ہیلو مس مناج۔کیسی ہیں آپ؟“ اکرم صاحب چہک کر بولے۔مناج کے چہرے کے تاثرات ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جی، بتایئے کیوں کال کی ہے۔" مناج نے اپنے مشینی انداز میں کہا۔ساتھ ہی سگریٹ ہونٹوں سے لگائی اور ایک اور کش بھرا۔دھواں اس کے لبوں کی سمت سے باہر آیا۔

"وہ مس مناج، دراصل مرینا میڈم کے بیٹے حسام کو آپ سے کسی سلسلے میں ملنا ہے۔" اکرم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"تھوڑا واضح کیجیے، کس سلسلے میں ملنا ہے۔" مناج نے ایک اور کش بھرا۔

"حسام صاحب کی ایکس انھیں ان کی بیٹی سے ملنے نہیں دے رہی ہے بس وہ اسی سلسلے میں ملنا چاہ رہے تھے۔" اکرم صاحب نے کہا۔

"کون؟ ایکس کون؟" مناج جو سگریٹ کا کش بھر ہی رہی تھی وہ کچھ دیر کو تھمی، مگر انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔مشینی۔

"جی مہر۔مہر بنتِ عبداللہ سلطان۔" اکرم صاحب نے ٹھہر کر بتایا۔

"بچی کی عمر کیا ہے؟" مناج نے سوال کیا۔

"شاید چار سال۔" مناج بے نیاز سا مسکرا دی۔تو اب یہ کیس کوئی تین سے پانچ سال کورٹ میں چلے گا، یعنی تین سے پانچ سال کی لگاتار فیس۔مناج نے سوچا۔یہ کیس اسے لینا ہی لینا تھا۔

"آج پانچ بجے حسام صاحب کو میرے آفس بھیج دیں۔مگر اکیلے۔" مناج نے اکیلے پر زور دیا۔

"جی ٹھیک ہے۔" اکرم صاحب نے فون رکھ دیا۔ مناج اپنے بستر پر اب آرام دہ ہو کر بیٹھ گئی اور باقی کی سگریٹ کے آہستہ آہستہ کش بھرنے لگی۔ اس کا سر ہلکا ہونے لگا۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر لیٹ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا اور سورج اپنی تپش اختیار کر چکا تھا۔ مگر اسلام آباد میں اس وقت بادلوں کا راج تھا جس کے باعث اسلام آباد اس وقت سورج کی تپش سے محفوظ تھا۔ احمد اپنے کمپیوٹر کے انسٹیٹیوٹ میں موجود تھا۔ یہ انسٹیٹیوٹ احمد اور درے نے مل کر کھولا تھا۔ یہاں پر دیگر کمپیوٹر سے منسلک اسکلز سکھائی جاتی تھیں جیسے کے پروگرامنگ، گرافک ڈیزائننگ، ویب ڈیولپمنٹ۔ احمد یہاں پر خود بھی پڑھاتا تھا۔ احمد ساتھ ساتھ ایک اسکول میں بھی او لیولز کے اسٹوڈنٹس کو کمپیوٹر سائنس پڑھاتا تھا۔ اسے ٹیچنگ کا خاص شوق تو نہ تھا مگر پھر بھی اس نے عارضی طور پر ٹیچنگ کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ یہ اس لیے، کیونکہ احمد جانتا تھا کہ اس میں ٹیچنگ کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی صلاحیت اور اپنی قدر سے بخوبی واقف تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ احمد نے جلد ہی اپنی کمپنی کا باقاعدگی سے آغاز کرنا تھا جس کیلئے اسے فنڈز اکٹھا کرنے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی ٹیم تھی جس میں اس کے اپنے اسٹوڈنٹس تھے۔

احمد اپنے انسٹیٹیوٹ کے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اے سی کی وجہ سے اندر کا ماحول کافی پرسکون تھا۔ تب ہی دروازے کے پاس کوئی آیا۔ یہ احمد کا پرانا اسٹوڈنٹ حماد تھا۔

"کیا میں اند آجاؤں سر؟" حماد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا بھی تھا۔ احمد کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ستائش ابھری۔

"آجاؤ حماد!" احمد خوشگواری سے کہتا ہوا اپنی کرسی سے کھڑا ہوا۔اس نے ہاتھ ملا کر حماد کو سلام کیا۔ اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے سر کو خم دیا۔یہ احمد کا انداز تھا۔وہ ہر کسی سے ایسے ہی ملا کرتا تھا۔

"سر یہ لیجیے۔" حماد نے مٹھائی کا ڈبا احمد کی طرف بڑھایا جسے احمد نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔اس نے حماد کے بولنے کا انتظار کیا۔

"سر آپ کا بہت شکریہ بالآخر آپ کے ریفرنس سے میری جاب لگ ہی گئی۔" حماد کے انداز میں خلوص تھا۔احمد نے اپنے سر کو اوپر نیچے جنبش دی۔

"چلو بہت بہت مبارک ہو۔لیکن صرف مٹھائی سے کام نہیں بنے گا۔ٹریٹ تو دینی پڑے گی۔"احمد کے انداز میں نیم سی شرارت تھی۔حماد زیر لب ہنس دیا۔

"وہ بھی ضرور سر۔بس آپ کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہو گا سر۔اس وقت مجھے جاب کی بہت ضرورت تھی۔" حماد ٹھہرا۔"سر ویسے آپ کے اتنے لنکس کیسے نکل آتے ہیں؟" احمد نے اس سوال پر اپنی بھنوؤں کو اوپر نیچے کیا۔

"فیروز بھائی کہا کرتے تھے کہ باہر کی دنیا میں رابطے بنانا بہت ضروری ہے۔ضرورت کے وقت یہی رابطے کام آتے ہیں۔اور اب دیکھو علاقے کا پولیس افسر ہو یا کسی بلڈنگ کا گارڈ،میرے سب سے

اچھے تعلقات ہیں۔" احمد کے چہرے پر مدھم مسکراہٹ تھی مگر اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔اس کا انداز ہر قسم کے شودے گری سے پاک تھا۔

"تو سر ہم آخر کانٹیکس کیسے بنائیں؟" حماد نے سوال کیا۔

"لوگوں سے گھل مل کر، ان سے بات چیت کر کے، ان پر احسانات کر کے۔بس کسی بھی طرح سے وہ تمہارے نام کو اور تمہاری شخصیت کو یاد کرلیں۔" احمد نے سرسری سا کہا۔حماد نے سر اثبات میں ہلایا۔

"سر ویسے آپ بھی اس سے پہلے جاب کرتے تھے۔وہ جاب آپ نے کیوں چھوڑی تھی؟" حماد نے ایک اور سوال کیا۔

"یہ جابز ساری کی ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔آپ ایک بندے کے انڈر کام کر رہے ہوتے ہیں اور آپ کا اپنا ذہن کم ہی استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔اور مجھے لگا کے جو جاب میں کر رہا تھا وہ میری سو فیصد صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر رہی تھی اس لیے میں نے وہ جاب چھوڑ دی۔" احمد نے آخر میں شانے اچکا دیے۔حماد نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

عام سی گفتگو کے بعد حماد بھی چلا گیا۔احمد بھی اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شام کے پانچ بج چکے تھے۔مناج اپنے آفس میں تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سفید پھولی ہوئی آستین والا کُرتا پہنا ہوا تھا جس پر کوئی کام نہ تھا۔اپنے کندھے پر اس نے ایک بھوری پیشمانہ شال

گرائی ہوئی تھی جو کے بہت پرانی لگتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی مناج اپنی پیشمانہ شال ہر جگہ پہن کر جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی حسام مناج کے آفس آگیا۔ اب اس نے شیو کر لی تھی۔ مگر اس کا چہرہ بہت سوکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی واضح تھی۔ مناج نے حسام کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حسام بھی سست روی سے آکر بیٹھ گیا۔

"جی حسام صاحب۔ اکرم نے تھوڑا بریف کیا تھا مگر ایک دفعہ آپ خود تفصیل سے بتائیں کہ بات کیا ہے۔" مناج نے اپنے مشینی انداز میں کہا۔ ہر ایک لفظ کا تلفظ بالکل خالص تھا۔ حسام کو جیسے کچھ عجیب محسوس ہوا۔ یہ اس کے لیے غیر معمولی سا تھا۔ اس انداز میں بھلا کوئی انسان کیسے بات کر سکتا ہے؟ مگر حسام نے سب کچھ نظر انداز کر کے مناج کے سوال کا جواب دینا شروع کیا۔

"مس مناج میری اور میری ایکس کی طلاق آٹھ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ میں نے طلاق کے بعد تین ماہ جیل میں کاٹے مگر پھر میری طبیعت اتنی بگڑی کہ مجھے رہا کر دیا گیا تھا۔ پھر پانچ ماہ علاج کہ سلسلے میں میں نے انگلینڈ میں قیام کیا۔ واپس آیا تو میں نے فوراً سے اپنی بیٹی سے ملنا چاہا مگر میری ایکس مجھے عنایا سے ملوانے پر راضی نہیں ہے۔" حسام کی آواز میں اس کے اندر بسی بے قراری جھلکتی تھی۔ مناج اندر ہی اندر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی حسام بہت سی تفصیل گول کر گیا تھا۔

"جیل کیوں گئے تھے؟ اور کونسی بیماری ہوئی تھی؟" مناج اب پیپر پر کچھ لکھ رہی تھی۔ حسام کچھ دیر کے لیے ٹھہرا، اسے ندامت نے ایک بار پھر گھیر لیا۔

"ڈرگ اسمگلنگ کے کیس میں پھنسا تھا۔جیل میں بھی ڈرگ کے وتھڈراولز(withdrawals) کی وجہ سے مجھے رہا کیا گیا تھا۔میں نے انگلینڈ میں پانچ ماہ ریہیب میں گزارے ہیں۔" نکل آئیں تفصیل۔ مناج پیپر پہ سب کچھ لکھتی جا رہی تھی۔

"طلاق ڈرگز کی وجہ سے ہوئی؟" مناج نے اپنے بے نیاز انداز میں پوچھا۔اس کے سامنے تصویر بن چکی تھی۔

"جی۔" حسام نے سر جھکا کر کہا۔

"اب ایک دفعہ آپ بتائیں، آپ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" مناج نے اپنی بے جان آنکھیں حسام کی ندامت بھری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں بس چاہتا ہوں کہ مہر مجھے میری عنایا سے ملنے دے، مجھے بس عنایا سے دور نہیں ہونا۔میں جانتا ہوں مہر کے مام اور ڈیڈ کی طلاق کے بعد بھی ان کا کیس چلا تھا،جس میں مہر کے ڈیڈ جیت گئے تھے۔" حسام نے مناج کو کہا۔

"اُف یہ تو بہت ہی بے وقوف ہے۔" مناج نے اندر ہی اندر سوچا۔

"وہ وقت الگ تھا۔عبداللہ سلطان صاحب اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس وقت یہ کیس جیت گئے ہوں گے، مگر اس وقت آپ اور مہر بالکل برابر ہیں بلکہ عبداللہ سلطان صاحب آپ لوگوں سے زیادہ ہی اثر و رسوخ والے ہیں۔اوپر سے آپ کا ماضی۔وہ آپ کے لیے بہت مسئلے کھڑے کرے گا حسام۔" مناج نے بڑے عام انداز میں بتایا۔حسام کے اوپر سے مایوسی کا گزر ہوا۔

”اوپر سے عنایا مائنر ہے، یعنی وہ بالغ نہیں ہوئی، اورمائنرز کی کسٹڈی ماں کو ہی دی جاتی ہے۔“ مناج نے ایک اور مایوسی بھرا پیغام حسام کو بڑے آرام سے دیا جیسے اسے حسام کی تکلیف سے کوئی غرض نہ ہو۔

”تو پھر کیا کیا جائے؟“ حسام امید ہارنے لگا تھا۔

”کیا تو بہت کچھ جا سکتا ہے۔ہم کسٹڈی کا کیس کورٹ میں دائر کر دیں گے۔کورٹ کی پروسیڈنگ ہر ماہ میں ایک بار ہو گی تب تب آپ اپنی بیٹی سی مل لیا کریئے گا۔“ اور ایک مرتبہ پھر مناج نے ایک تلخ حقائق حسام کے سامنے بڑے اطمینان سے عرض کیا۔حسام کی اس بار آنکھیں پھٹنے لگیں۔

”صرف ایک بار؟“ حسام نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔مناج نے مزے سے سر اوپر نیچے ہلایا۔ اسے واقعی حسام کے حال سے کوئی غرض نہ تھا۔

”کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟“ حسام ہمت ہارنے لگا تھا۔

”آوٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ!“ مناج نے کہا کچھ نہیں بس سوچا۔وہ بے وقوف نہیں تھی کہ آوٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کروا کر اپنی پانچ سے چھے سال کی فیس کو مٹی کر دیتی۔اس لئے مناج نے اپنا پتھریلا چہرہ نفی میں ہلایا۔

”تو پھر کیا میری بچی مجھے کبھی ملے گی؟“ حسام نے شکست خورانداز میں کہا۔

"ہم عدالت میں ہر حربہ استعمال کریں گے حسام۔ایسے بہت سے مواقع ہوتے ہیں جب مائنر کی کسٹڈی باپ کو دی جاتی ہے۔اس کے لیے ہمیں آپکی ایکس کو تھوڑا سا گندا کرنا پڑے گا۔" مناج بالکل پر سکون تھی۔

"مطلب؟" حسام زرا سا الجھا۔

"مطلب ہم مہر کی کردار کشی کر سکتے ہیں۔ماں کا کردار جب مشکوک ہو جائے تو بچی باپ کو دی جا سکتی ہے۔اور ایک امیر عورت کی کردار کشی کرنا تو بالکل بھی مشکل نہیں۔" حسام کو ایک دھچکا سا لگا۔

"پھر عدالت میں کسی طرح سے یہ ثابت کروا سکتے ہیں کہ مہر کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہے تب بھی بچی آپ کو دی جا سکتی ہے۔" حسام نے اب کی بار جھر جھری لی۔ آخر کیسے کوئی کسی کے بارے میں اس طرح کی باتیں گڑ سکتا تھا؟ کیا سارے وکیل ایسے ہی ہوتے ہیں؟

"پھر ہم مہر کو کورٹ میں ایک غیر ذمہ دار ماں ثابت کر سکتے ہیں۔ایسے بھی آپ کا کیس مضبوط بن سکتا ہے۔بس یہی کچھ طریقے ہیں جن سے بچی کی کسٹڈی آپ کو دی جا سکتی ہے۔" حسام نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔وہ مہر کے ساتھ یہ سب کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"نہیں۔یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔مہر ایسی بالکل نہیں ہے!" حسام جذبات میں آگیا تھا۔

"چلو شروع ہو گئے ایموشنل ڈرامے۔ابھی بس ایک فقرہ کہنا ہے میں نے اور سب اچھائی زائل ہو جانی اس

کی!۔" مناج نے سوچا۔

”تو پھر کیا آپ کو اپنی بیٹی نہیں چاہیئے؟“ مناج نے اپنے مشینی انداز میں ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

”چاہیئے مگر۔۔۔“ حسام سوچ میں پڑ گیا۔

”اگر چاہیئے تو پھر ویسا ہی کرنا ہوگا جیسے میں نے کہا۔“ اب کی بار حسام نے احتجاج نہیں کیا۔شاید اب اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔مناج دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔

”بدھ کو آکر مجھ سے مل لیجئے گا۔میرے لیے آپ کی شادی شدہ زندگی کی ہر ایک تفصیل کا جاننا ضروری ہے۔اٹارنی کلائنٹ پریولج کے تحت یہ سب بالکل راز رہے گا تو اس کی آپ نے فکر نہیں کرنی۔وہاں سے پھر ہم نے آگے کا لائحہ عمل بھی طے کرنا ہوگا۔ٹھیک؟“ مناج نے مصروف سے انداز میں کہا۔

”ٹھیک۔“ حسام بالکل بجھ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا اورمہر اپنے آفس میں اپنے روم میں بے مقصد بیٹھی تھی۔ وہ خاص کام نہیں کرتی تھی۔اسے بزنس میں کبھی دلچسپی نہ تھی۔بس وہ اپنا وقت گزارنے آتی تھی۔اس کی زندگی میں جیسے کچھ خاص کرنے کو نہیں رہا تھا۔عنایا کو اسکول چھوڑ کر وہ آفس آجایا کرتی تھی اور پھر اسے لے کے گھر چلی جاتی تھی۔وہ اپنے کمرے میں بے مقصد کمپیوٹرا سکرین کو گھور رہی تھی جب اس کا اسسٹنٹ پیٹر اندر آیا۔

"میم! آپ کیلئے ڈاک آئی ہے کورٹ سے۔" اور مہر کی آنکھیں یک دم کھلی۔اسے اندازہ ہو گیا کہ حسام نے کورٹ میں کیس کرلیا ہے۔یہ سب ٹھیک نہیں تھا۔ماضی میں ایک کورٹ کیس نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔اس کیس نے اس سے اس کی ماں کو چھینا تھا۔اوہ خدایا، کیا عنایا کو بھی وہی سب جھیلنا پڑے گا؟ مہر کا دل بھاری ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے پیٹر آپ جائیں۔" مہر نے سخت سے لہجے میں کہا۔لفافے میں سے اس نے ڈاک نکالا جس میں حسام کی طرف سے درخواست تھی۔حسام کی درخواست پڑھ کے اس کا خون کھولنے لگا۔اسے اگلے جمعرات بلوایا گیا تھا۔مہر اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔اضطراب کے عالم میں اس نے اپنے وکیل کو کال ملائی۔

"جی ولید صاحب ابھی اسی وقت میرے آفس آیئے۔میں انتظار کر رہی ہوں۔" مہر نے حکم صادر کیا اور کال کاٹ دی۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد ولید مہر کے آفس آئے۔وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھے۔مہر نے پریشانی کے عالم میں وہ ڈاکومنٹ ولید کو تھما دیئے۔ولید انہیں بغور کے پڑھنے لگے۔

"نو وے! مناج طارق! نارمل کسٹڈی کیس ہوتا تو ہمیں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔کیونکہ عدالت ماں کے حق میں ہوتی ہے، مگر یہ مناج۔میں نے اسے اچھے بھلے کیسز کی بساط الٹتے دیکھا ہے۔"ولید سومرو کی بات سن کے مہر کا موڈ مزید بگڑنے لگا۔

"آپ مناج کی شان میں قصیدے بعد میں پڑھ لیجئے گا۔ پہلے بتائیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔" مہر نے سخت لہجے میں کہا۔اسے ولید اس وقت زہر کی مانند لگ رہے تھے۔

"قصیدے؟ استغفراللہ! میرے اتنے برے دن نہیں آئے کہ۔۔۔" مگر پھر ولید نے مہر کی غصیلی آنکھیں دیکھ لی تو فوراً سے بات بدلی۔

"کرنا کیا ہے کورٹ میں بس مس مناج کے ہر وار کا جواب دینا ہوگا۔ساتھ ساتھ آپ کے ایکس کی کردار کشی کرنی ہوگی۔ جیسے وہ ڈرگ لیتا تھا؟ ہاں ہم اس بات کا بھرپور استعمال کریں گے۔ساتھ ساتھ ڈومیسٹک ابیوز کا بھی اقدام اس پر ڈال دیں گے۔" مہر کے دل پر پھندا سا لگا۔ ڈومیسٹک ابیوز؟

"ڈومیسٹک ابیوز۔۔۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہو جائے گا؟" مہر کے چہرے پر تشویش تھی۔اس کا دل یہ کرنے پر رضامند نہ تھا۔اور ولید نے وہی گھسا پٹا حربہ استعمال کیا جو اس صورتحال میں ہر وکیل کرتا تھا۔

"کیا آپ کو اپنی بیٹی اس حسام کے حوالے کرنی ہے؟" مہر خاموش پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اور ایک لمحے میں مہر رضامند ہو گئی۔"آپ نے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہ کیس کورٹ میں زیادہ دیر نہ چلے۔میں نہیں چاہتی میری عنایا کورٹ کچہری کے دھکے کھائے۔" مہر نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"اس بارے میں تو بے فکر ہو جائیں۔" ولید نے اطمینان سے مہر کو جھوٹی تسلی دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اسلام آباد کی سڑکوں پہ اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔جس منزل پہ وہ رواں تھا، وہاں وہ پہلی بار نہیں جارہا تھا۔بلکہ اکثر جاتا رہتا تھا۔

کسی سے ملنے۔

سورج غروب ہوچکا تھا اور اب آسمان پہ گہرا جامنی رنگ پھیلا ہوا تھا۔آسماں پر تیرتا چودھویں کا چاند اس منظر کو کافی زیادہ پر سکون مگر اداس بنا رہا تھا۔اور یہی اداسی اس کے چہرے پہ بھی جھلک رہی تھی۔

گاڑی اپنی عام رفتار میں چلاتے وہ سڑک عبور کرنے لگا جہاں اسٹریٹ لائیٹس کافی کم تھیں۔اس کے بائیں طرف اونچی پہاڑیاں تھیں جو کہ گھنے سبزہ زار سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی گاڑی روکی۔ گاڑی جہاں رکی تھی، وہ منظر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور اپنی گاڑی سے اترا۔اپنی ڈگی کا رخ کر کے اس نے ایک فلیش لائیٹ نکالی۔اسے جہاں جانا تھا وہ وہاں آنکھیں بند کر کے بھی جا سکتا تھا۔

وہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں بنے راستے عبور کرنے لگا۔جہاں رات کے وقت انسان ان پہاڑیوں پہ قدم رکھنے سے گریز کرتے تھے وہاں وہ، بے خوف، پہاڑیاں پھلانگ رہا تھا۔وہ واقعی پر سکون سا لگتا تھا اور اسے کسی بھی شے کا اس وقت خوف نہ تھا۔

رات کے اس پہر وہاں پہ جنگلی جانوروں کی مختلف آوازوں کے علاوہ، ہوا سے ٹکراتے پتوں کے جھلملانے کی گونج تھی۔ہوا ٹھنڈی سی تھی۔برفیلی سی۔دفعتاً ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی ایسے کے ہاتھ اور گردن کے بال کھڑے ہونے لگے۔

اس کی منزل آگئی تھی۔وہ ایک چپٹی سی زمین تھی جو کہ بنجر تھی۔آس پاس صرف چار ہی درخت تھے۔زمین کا ایک مختصر سا حصہ ابھرا ہوا تھا۔ابھرے ہوئے حصے کے ساتھ ہی ایک پتھر زمین میں گاڑا گیا تھا۔احمد وہاں کھڑے ہو کے اس پتھر کو گھورے جا رہا تھا۔دل میں جو عجیب سی کیفیت تھی وہ بڑھتی جا رہی تھی۔ٹھنڈی برفیلی ہوا نے اپنی رفتار پکڑ لی تھی اور اب اس کے بال اڑنے لگے تھے۔ بالوں کی سیٹنگ بھی خراب ہو چکی تھی مگر اسے کسی بھی چیز کا ہوش نہیں تھا۔وہ ہنوز اس ابھرے ہوئے حصے کو گھورے جا رہا تھا۔

وہ سست سست سے قدم بڑھانے لگااوراس ابھرے ہوئے حصے کے قریب ہوتا گیا۔اندھیری رات میں بے خوف، ہاتھ میں فلیش لائیٹ پکڑے، وہ دنیا سے منقطع سا لگ رہا تھا۔وہ اس پتھر کے بالکل پاس کھڑا ہوگیا اور اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔آنکھیں بند کر کے وہ ایک مرتبہ پھر ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اپنے اندر اتارنے لگا۔وہ تنہا تھا۔وہ جس سے ملنے آیا تھا وہ بھی تنہا تھا۔ اس نے اپنی فلیش لائیٹ زمین پہ رکھی۔اب وہ مدھم سی آواز میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کر رہا تھا۔جوں ہی تلاوت ختم ہوئی،اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔اندھیرے میں ڈوبا منظر جو کہ صرف اس کی فلیش لائیٹ کی وجہ سے جگمگا رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہونے لگا۔

"اللہ آپ کو جنت نصیب کرے۔۔فیروز بھائی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔اس راز کو چھپانے کا وہ اتنا عادی تھا کہ وہ اس تنہائی میں بھی اونچا نہ بولا۔

اپنی آنکھیں اس نے واپس بند کیں۔گویا اپنے آپ کو دلاسا دیتے ہوئے،مغموم مگر معنی خیز آواز میں احمد نے یہ آیت پڑھی:

"قُلْ إِن تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"

"تم فرمادو کہ اگر تم اپنے دلوں کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اوراللہ ہر چیز پر قادر ہے"

اب کی بار اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے چہرے کے تاثرات بھی نرم پڑے۔ملاقات ختم ہونے کا وقت تھا۔اس نے اپنی فلیش لائیٹ اپنے ہاتھوں میں تھامی اور جانے کے لیے کھڑا ہوا۔وہ قبر اس کے پیچھے اکیلی رہ گئی۔ایک دفعہ پھر سے وہ قبر اندھیرے میں ڈوبنے لگی تھی۔اس خوفناک اندھیرے میں جہاں زندہ انسان بھی ڈر جائیں۔

اور جوں ہی روشنی فنا ہوئی۔اندھیرا اِس منظر پہ غالب آگیا۔

وہ قبر اکیلی تھی۔وہ قبر اپنے ساتھ دفن ان اندھیر رازوں کے ساتھ آج بھی خاموش رہی۔

یہ وہی راز تھے جو عنقریب۔۔

سب کی زندگیوں کا کانٹا بننے والے تھے!

☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ۲: تلاشِ خود

میں سوچتا ہوں کہ آخر،

کچھ ایسا ہے دنیا میں جو باقی رہ جاتا ہے؟

محبت؟ مگر میں نے محبت کو مرتے دیکھا ہے،

خوبصورتی؟ میں نے خوبصورتی کو بھی ڈھلتے دیکھا ہے،

رشتے؟ مگر میں نے رشتوں کو بھی ٹوٹتے دیکھا ہے،

پھر کیا کچھ باقی نہیں رہتا؟

کیا سب کچھ تخلیق ہی اس لیے ہوتا کہ وہ ایک دن،

زمانوں کے ہاتھوں،

وقت کی لپیٹ میں آکر،

مسخ ہو جائے؟

اور کچھ باقی رہ بھی کیسے سکتا ہے،

جب انسان خود بھی باقی نہیں رہتا!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

موسم گرما اپنی کشش اختیار کرنے لگا تھا۔ آج کا دن بھی کافی گرم تھا۔ صبح سے ہی گرم گرم، نم سی ہوائیں اسلام آباد کے احاطے پر سوار تھیں۔ آسمان پہ بادلوں کی کثرت نہ تھی جس کے باعث سورج کو اپنی کرنوں سے زمین پہ وار کرنے کا بھرپور موقع ملا ہوا تھا۔ عبداللہ سلطان کا قصر دھوپ کی ان کرنوں میں نہایا ہوا تھا اور دن کے اس وقت سنہرا سا نظر آرہا تھا۔ قصر کی دیواریں سونے کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔

قصر کی دوسری منزل کے لاؤنج میں، کھانے کی میز کے گرد لگی کرسیوں پہ براجمان، وہ دونوں ناشتہ کرتی نظر آرہی تھیں۔ عبداللہ سلطان پہلے ہی اپنے آفس کے لیے نکل چکے تھے اور مہر عنایا کو اسکول بھیج چکی تھی۔

نیلوفر اور مہر آپس میں گفتگو کرنے میں مصروف تھیں۔

"مہر میری بات مانو، اور عنایا کو یوں کورٹ میں نہ گھسیٹو۔" نیلوفر کا انداز سمجھانے والا تھا۔ مہر، جو کہ چھری اور کانٹے سے ٹوسٹ کا ٹکڑا کاٹ رہی تھی، نیلوفر کی بات پہ تھم گئی۔

"پھر کیا کروں؟ عنایا کو حسام کے حوالے کر دوں؟" مہر کا انداز بد لحاظ نہ تھا۔ اس کی آواز کافی دھیمی تھی۔

”عنایا بہت چھوٹی ہے مہر۔ تم کیوں اسے کورٹ کے دھکے دلوانے پہ بضد ہو؟“ مہر کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلنے لگی۔

”مجھے امید ہے کہ یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔“ مہر اکتاتے ہوئے بولی۔ اس کا اب ناشتہ کرنا محال ہونے لگا تھا۔

”یقیناً تمہارے وکیل نے ہی تمہیں جھوٹی امیدیں دلائی ہوں گی؟“ نیلوفر طنزاً بولی۔ ”تم کتنی بھولی ہو مہر۔ یہ سارے وکیل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تمہاری ترجیح اس وقت عنایا کا ذہنی سکون، اس کی خوشحالی ہونی چاہئے۔ تمہیں اس معصوم بچی کو کورٹ میں دھکے کھانے کے لیے نہیں چھوڑنا چاہئے۔“ نیلوفر ہاتھ ہلا ہلا کے مہر کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مہر کے ہاتھ سے چھری اور کانٹا چھوٹا۔ وہ آنکھوں میں کرب اور شکوہ لیے نیلوفر کو یوں دیکھنے لگی جیسے اسے احساس دلانا چاہ رہی ہو کہ اسے نیلوفر سے اس طرح کی امید نہ تھی۔

”آخر سب لوگ حسام کی حمایت کیوں کر رہے ہیں؟“ مہر کی آنکھیں تکلیف سے لبریز تھیں۔ ”میں نہیں بھول سکتی کہ کس طرح سے اس نے میری زندگی برباد کی۔ بار بار نیلوفر۔ بار بار اس نے میرے بجائے ان ڈرگز کو ترجیح دی۔ میں اس کے ساتھ مخلص تھی۔ میں اسے بدلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ نہیں سدھر سکا۔“ مہر سانس لینے کو رکی تھی۔ اسے اس وقت جذبات نے گھیر لیا تھا۔ ”بلکہ اب تو مجھے لگتا ہے کہ وہ کبھی سدھرنا چاہتا ہی نہ تھا۔ اگر اتنی ہی محبت تھی عنایا سے تو اس وقت وہ کیوں ڈرگز نہ چھوڑ سکا؟ میں ایسے انسان کو اپنی بیٹی کیوں دوں؟“ مہر کا چہرہ غصے سے لال ہونے لگا تھا۔ مگر وہ چلا نہیں رہی تھی نہ ہی زیادہ اونچا بول رہی تھی۔ اس کے انداز میں ٹھہراؤ سا تھا۔

"تمہاری بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ہاں اس نے جو کیا غلط کیا۔مگر کیا عنایا یہ سب برداشت کر سکے گی؟" نیلوفر نے سوچتے سمجھتے کہا۔مہر نے اب اپنا ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔

"میں کبھی بھی اسے عنایا سے ملنے نہیں دے سکتی!" مہر ہر لفظ پہ زور دے کر حتمی انداز میں بولی۔ نیلوفر بھی سمجھ گئی تھی کہ مہر اب کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔اس نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"ٹھیک ہے۔میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتی ہوں۔" نیلوفر کا انداز ہر قسم کی تلخی سے پاک تھا۔وہ مہر کو دیکھ کر مسکرائی۔اور یہی وجہ تھی جس لیے مہر نیلوفر کو پسند کرتی تھی، چاہے کچھ بھی ہو جائے نیلوفر ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی تھی۔

کچھ لمحے اس لاؤنج میں خاموشی کا راج رہا۔وہ دونوں اس خاموشی کا فائدہ اٹھاتے اپنا ناشتہ کرنے لگیں۔

تب ہی یونیفارم میں ملبوس ملازمہ کھانے کی میز کی طرف چلی آئی۔اس کے ہاتھ میں ایک باکس تھا جس پہ سنہرا گفٹ ریپ چڑھا ہوا تھا۔کان میں قدموں کی چاپ پڑی تو مہر نے نظر اٹھا کے ملازمہ کو دیکھا۔اس کے چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ بکھری۔وہ جانتی تھی یہ پارسل کس کی طرف سے آیا تھا۔

"میم یہ آپ کی والدہ نے بھیجا ہے۔" ملازمہ نے وہ باکس ٹیبل پہ رکھا۔مہر نے وہ باکس اپنے ہاتھوں میں تھاما اور اسے اپنائیت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔اسے سنہرے ریپ پہ گلو سے چپکا ہوا کارڈ نظر آیا۔وہ کسی ترسے ہوئے کی طرح اس باکس کو دیکھ رہی تھی۔

"ماں نے کوئی خط نہیں بھیجا؟" اس نے آنکھوں میں آس لیے ملازمہ کو دیکھا جو کہ اپنا سر نفی میں ہلا گئی۔ مہر کا دل اچانک سے خالی خالی سا ہونے لگا۔ اس نے اپنے بوجھل دل کے ساتھ وہ کارڈ کھولا اور اس میں لکھا پیغام پڑھنے لگی۔

"اب تو جیسے ہمارے الفاظ کے یہ ذخائر بھی ختم ہونے لگے ہیں۔ آپ ہم سے ملنے نہیں آتی۔ اور ہم اب اپنی امیدیں ہارنے لگے ہیں۔ شاید خدا کو یہی منظور ہے۔ اور ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔ یہ تحفہ جو ہم نے بھیجا ہے، یہ اب تک کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ یہ تحفہ انمول ہے۔ بہت ہی زیادہ انمول۔ اس کی قدر کیجیے گا۔"

مہر کی آنکھ کے کونے میں ایک آنسو لڑکھڑایا۔ اپنی ہتھیلی کی پشت سے اس نے وہ آنسو رگڑا۔ نیلوفر خاموشی سے سارے منظر کو دیکھتے ہوئے ناشتہ کرتی رہی۔

"تمہیں ایک دفعہ اپنی ماں سے مل لینا چاہئے۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔" فرنچ املیٹ کا لقمہ حلق میں اتارتے ہوئے نیلوفر بولی۔

"مجھے بہت تکلیف ہو گی۔" مہر نے خواب سی کیفیت میں جواب دیا۔ دل کی گہرائیوں میں وہ بھی اپنی ماں سے ملنا ضرور چاہتی تھی۔

"تو ایک دفعہ یہ تکلیف برداشت کر لو۔ مجھے یقین ہے اس کے بعد تم بہتر محسوس کرو گی۔" نیلوفر نے نرمی سے کہا۔ مہر نے سست روی سے سر نفی میں ہلایا۔

"آپ نہیں سمجھیں گی نیلوفر۔ میں بس ان سے نہیں مل سکتی۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔" وہ دل پہ پتھر رکھتے ہوئے، دل میں تکلیف لیے یہ بولی تھی۔ اور اس تکلیف کی شدت سے صرف مہر ہی واقف تھی۔

مہر نے وہ باکس اٹھایا اور کھڑی ہوئی۔ اپنے کمرے میں جانے کے لیے وہ مڑنے لگی تھی۔

"آخر کیوں؟ کیا تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں؟" نیلوفر نے کہا تو مہر تھم گئی۔ اچانک اس کے جذبات کے سمندر میں لہریں ابھرنے لگیں۔

"بالکل ہے۔ حد سے زیادہ محبت ہے۔ اتنے سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ان کی یاد مجھے نہ ستائے۔ مگر ہمارے درمیان ایک دیوار سی آ چکی ہے۔ ایک فاصلہ نافذ ہو چکا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے ان سے ملنا، اب میرے اختیار میں نہیں رہا۔" مہر کی آواز گیلی تھی۔ اس وقت اس نے نہ جانے کتنے آنسو اپنے اندر اتارے تھے۔ بجھی ہوئی چال چلتے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ نیلوفر، اپنی آنکھوں میں غم لیے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ وہ لڑکی واقعی ٹوٹ چکی تھی اور نیلوفر کو اس کے اوپر بہت ترس آرہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں ہر چیز کافی نفاست سے سجائی گئی تھی۔ مہر نے آتے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنی سنگھار میز تک گئی۔ سنگھار میز پہ کارڈ رکھ کے وہ اپنے بیڈ کے کنارے

بیٹھ گئی۔اس نے باکس اپنی گود میں رکھا اور اسے نظر بھر کے دیکھنے لگی۔وہ باکس کافی وزنی محسوس ہوتا تھا۔نہ جانے اس میں کیا تھا؟

اپنے ناخن کی مدد سے اس نے وہ سنہرا پیپر چیر دیا۔اب تانبے کا وہ خوبصورت سا ڈبا نمایاں ہوا۔اس ڈبے کے کناروں پہ خوبصورت سے ڈیزائین کاشت کیے گئے تھے۔مہر کی آنکھوں کو وہ ڈبا بھایا تھا۔وہ مدھم سا مسکرا کے اس ڈبے کے اوپر ہاتھ پھیرنے لگی۔ڈبے پہ میگنیٹک لاک لگا تھا جسے مہر نے کھولا۔اندر اسے وہ کتاب نظر آئی۔کالے سرورق والی حسین سی کتاب جس پہ بڑا بڑا، سنہرے حروف میں "القرآن" لکھا تھا۔وہ آنکھیں چھوٹی کر کے اس کتاب کو تعجب سے دیکھنے لگی۔اس نے اس کے سرورق پہ ہاتھ پھیرا۔وہ بہت ہی نرم و ملائم سا تھا۔آخر اس کی ماں نے اسے یہ کیوں بھیجی تھی؟ اس نے سوچا۔

مہر نے تانبے کا وہ ڈبا اپنی سنگھار میز پہ رکھ دیا۔کارڈ اٹھاتے وہ کھڑی ہوئی اور اپنے کلازٹ کا رخ کیا۔کلازٹ میں بڑی بڑی الماریاں لگی ہوئیں تھی جن کی لکڑیوں پہ سفید پینٹ کیا ہوا تھا۔اس نے کونے پہ بنی الماری کا پٹ کھولا۔گھٹنوں کے بل بیٹھ کے وہ ایک لوہے کا ڈبا نکالنے لگی۔ڈبے کے اندر ڈھیر سارے خط موجود تھے۔یہ سارے خط مہر کی ماں کی طرف سے آئے تھے۔کچھ بہت پرانے لگتے تھے اور کچھ تھوڑے نئے۔مہر نے وہ کارڈ بھی ان ہی خطوط کے ساتھ رکھ دیا۔اس نے ڈبا بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔

یہ صرف ایک ڈبا نہیں تھا، اور نہ ہی اس میں موجود خط کوئی عام خط تھے۔وہ مہر کی یادوں کا ایک مخصوص حصہ تھا جو اس نے اس ڈبے میں قید کیا ہوا تھا۔یہ یادیں اسے بہت تکلیف دیتی تھیں، مگر

پھر بھی وہ انہیں اپنے آپ سے باندھے ہوئے تھی۔ان یادوں کو مسخ کرنا چاہتی ضرور تھی مگر اب تک کر نہ سکی۔اپنے کلازٹ میں اس کھلی الماری کے سامنے چوکڑی مار کے بیٹھے ہوئے وہ اس ڈبے کو دیکھے جارہی تھی۔

اسے یوں ہی پرانی مہر یاد آئی۔۔۔

جو مہربان ہوا کرتی تھی۔۔۔۔

جو ہمدردر ہوا کرتی تھی۔۔۔۔

نہ جانے وہ کہاں کھو گئی تھی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس طرح دن طویل ہوتا گیا سورج کی تپش میں اضافہ ہونے لگا تھا۔اسلام آباد کی سڑکیں، اور سڑکوں کے ساتھ ہی، ابھرتی عمارتیں دھوپ میں نہائی ہوئی تھیں۔آسمان اب بھی صاف تھا اور بادلوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔اسی تپش بھری دوپہر میں ہم ایک آڈیٹوریم کا رخ کرتے ہیں۔

آڈیٹوریم کافی لمبا چوڑا اور وسیع تھا۔داخلی دروازے سے داخل ہوتے ہی دائیں اور بائیں طرف ڈھیر ساری کرسیاں لگی ہوئیں نظر آتی تھیں۔آڈیٹوریم کے آخر میں دو سٹیپس اٹھا کے ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔اسٹیج کے پیچھے والی دیوار پہ بڑا سا بینر لگا ہوا تھا۔دفعتاً آڈیٹوریم سامعین سے بھرتا چلا گیا۔سامعین کا حلیہ اس بات کی عکاسی کرتا تھا کہ یہ سب کسی یونیورسٹی کے طلباء تھے۔آڈیٹوریم میں جگہ جگہ کولرز لگائے گئے تھے جس کے باعث ماحول کافی ٹھنڈا اور پر سکون تھا۔اسٹیج کے بیچ و بیچ اسٹینڈ لگا کے اس

میں مائیک کو مقید کیا ہوا تھا۔ جس طرح سے سامعین اپنی کرسیاں پکڑتے گئے آڈیٹوریم میں شور کی گونج بڑھتی چلے گئی۔

سفید لانگ ڈریس میں ملبوس ایک عمر رسیدہ سی خاتون مائیک کی طرف قدم بڑھانے لگیں۔ انہوں نے اپنے چہرے کو خوشگوار سی مسکراہٹ میں ڈھالا ہوا تھا۔ سٹینڈ کے ٹھیک پیچھے کھڑے ہو کے انہوں نے اپنی انگلی مائیک پہ تھپتھپائی۔ انگلی تھپتھپانے کی گونج پورے آڈیٹوریم میں پھیلی تو سامعین کا شور چھٹنے لگا۔ سب اب اسٹیج کی طرف متوجہ ہو کے اپنی یونیورسٹی کی پرنسپل کو دیکھنے لگے۔

”خوش آمدید اسٹوڈنٹس۔ آپ سب کا ہمارے سالانہ اسٹوڈنٹ انسپیریشن(inspiration) پروگرام میں تشریف لانے کا شکریہ۔ مجھے اچھا لگا یہ دیکھ کر کہ ہماری نوجوان نسل کچھ نیا سیکھنے کے لیے، کچھ نیا جاننے کے لیے اتنی پر جوش ہے۔ اسٹوڈنٹ انسپیریشن کی محفل میں ہم ہمارے ملک کی جانی مانی شخصیات کو بلاتے ہیں، تاکہ وہ ہمیں اپنے سفر کے بارے میں آگاہ کر سکیں۔ اور ہم ان کے سفر سے سیکھ حاصل کر سکیں۔ میں تو آج بہت ہی خوش ہوں کیونکہ آج ہماری اس محفل کو پاکستان کی سب سے بڑی میڈیکل آئکن زینت بخشنے والی ہیں۔ آپ لوگ بھی اندازے لگاتے رہیں کہ آخر ہمارا یہ مہمانِ خصوصی کون ہے، تب تک ہم اپنی محفل کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے کرتے ہیں۔“

پرنسپل صاحبہ پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئیں۔ ایک دبلا پتلا سا اسٹوڈنٹ اسٹیج کی طرف آیا اور مائیک کے پیچھے کھڑے ہو کے ہاتھ باندھے سورہ شمس کی تلاوت کرنے لگا۔ تلاوت ختم ہوئی تو پرنسپل صاحبہ مائیک کی طرف پھر سے بڑھیں۔ اس بار ان کے چہرے پہ پر جوش مسکراہٹ تھی۔ سامعین کا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر یہ مہمانِ خصوصی کون تھا؟

”میں آج، اس اسٹیج پہ جس شخصیت کو بلوانے لگی ہوں وہ میڈیکل کی دنیا کا ایک ستارہ ہیں۔انہوں نے میڈیکل کی دنیا میں ترقی کے جھنڈے اس طرح گاڑے کہ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ان کے کارناموں کا چرچہ ہے۔یہ ہر اسٹوڈنٹ کی ہی آئیڈیل ہوتی ہیں۔ہر میڈیکل اسٹوڈنٹ کا خواب ہوتا ہے کہ وہ ان کے ہسپتال میں کام کرے۔“

(بیک اسٹیج بنے کمرے میں وہ کرسی پہ کسی ملکہ کی طرح براجمان تھی۔ دیوار پہ لگے شیشے پہ وہ اپنے بوڑھے خوبصورت چہرے کو گھور رہی تھی۔چہرا جھری ذدہ تھا، ماتھے پہ موجود لکیریں اس کی شخصیت میں تمکنت کے آثار چھوڑ جاتی تھیں۔آنکھوں میں اس کے ایک الگ سا ناز و نخرہ تھا)

”وہ جنہیں ”بے خود طبیب“ بھی کہا جاتا ہے۔وہ جو اسلام آباد کے دو بڑے ہسپتال کی مالک ہیں،اور ملک بھر میں انہوں نے نہ جانے کتنے ہسپتال بنائے ہوئے ہیں۔یہ ہسپتال ہیں بھی بڑے جدید۔ان میں ایک سے بڑھ کے ایک مشینری ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔یہاں کے ڈاکٹرز بھی اعلیٰ ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی کسٹمر سروسز بہترین ہیں۔“

(نظریں اپنے عکس پہ گاڑے ہوئے وہ اپنے ہونٹوں پہ ہلکے رنگ کی لپ اسٹک لگا رہی تھی۔چہرے پہ بہت ہی ہلکا میک اپ کیا گیا تھا جو کہ اس کی خوبصورتی کو نکھارے ہوئے تھا۔اب اس نے میز پہ پڑا لوز پاؤڈر اٹھایا اور ایک برش سے پاؤڈر اپنی آنکھوں کے نیچے لگایا۔)

”یہ شخصیت سخی دل کی مالک ہے۔یہ چاہتیں تو اپنے ہسپتالوں کو امراء کے لیے مختص کر دیتیں، لیکن نہیں۔انہوں نے اپنے ہسپتال کے دروازے ملک بھر کے غرباء کے لیے کھول رکھیں ہیں۔یہاں جو لوگ اپنے علاج کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے ان کو مفت علاج فراہم کیا جاتا ہے۔“

(اس کمرے میں نیلوفر داخل ہوئی۔ نیلوفر نے پھولی ہوئی آستینوں والی شرٹ پہ گھٹنوں تک آتا، بغیر آستینوں والا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ نیلوفر کی آمد پہ اس نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔ وہ اپنی جگہ پہ ویسے ہی منجمد رہی۔ اس نے بس شیشے پہ نیلوفر کا عکس دیکھا اور مدھم سا مسکرائی۔ اس کا ہر انداز بہت شان و شوکت سے لبریز تھا اور مکرم بھی۔

"لیڈی اقتدار، آپ کو بلایا جا رہا ہے۔" نیلوفر نے کہا تو وہ آہستگی سے کھڑی ہوئی۔ بڑھاپے کے باوجود اس کی گردن پوری شان سے اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے شیشے میں نیلوفر کو دیکھ کر اپنے سر کو خم دیا تو نیلوفر اس کا اشارہ سمجھ کے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ لیڈی اقتدار نے کالی بنارسی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس کی آستینوں پہ سنہری بیل لگی ہوئی تھی۔ اپنے سفید بالوں کو اس نے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ کانوں میں سے اس کے باریک آویزے لٹک رہے تھے اور گردن پہ باریک سی مالا تھی۔ وہ اپنی ہیلز پہ پوری شان سے چلنا شروع ہوئی۔ اس کی چال گرجدار سی تھی جو کہ آس پاس کے لوگوں کو مرعوب کر جاتی۔)

"اب تک تو آپ سب لوگوں نے بھی انہیں پہچان لیا ہو گا۔ بھرپور تالیوں میں استقبال کیجیے لیڈی اقتدار کا۔" پرنسپل صاحبہ ایک بار پھر تالیاں پیٹتے اسٹیج کے پیچھے دیوار سے لگ کے کھڑی ہو گئیں۔ سامعین پرجوش ہو کے تالیاں بجانے لگے ساتھ ہی آڈیٹوریم میں شور و غل پھیلنے لگا۔ یہ خیال ہی ان سب کو دیوانہ کررہا تھا کہ لیڈی اقتدار ان کی یونیورسٹی کو زینت بخش رہی ہے۔ آج کا دن وہ سب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھنے والے تھے۔

لیڈی اقتدار تحکمانہ چال چلتے آئی اور جیسے ہی اس نے اسٹیج پہ پہلا قدم رکھا، تالیوں کی گونج اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔اس کی گردن تنی ہوئی تھی مگر اس کی سرد نگاہیں اسٹیج کے فرش پہ منجمد تھیں۔اس کی نگاہوں میں سے تکبر ٹپکتا تھا۔وہ تالیوں سے بے نیاز چلتی گئی اور مائیک کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔اب اس نے ایک نظر اٹھا کے پرجوش سامعین کو دیکھا۔اس کے چہرے پہ برفیلا سا تاثر تھا۔اس نے سست روی سے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔تالیوں کا شور اب چھٹنے لگا۔وہ اب جذبات سے گھیرے ہوئے جوان طلباء سے کلام کرنے کے لیے تیار تھی۔

"بڑے بزرگ کہا کرتے تھے کہ، جو نسل اپنے بزرگوں کو عظیم مانتی ہے، ان سے نصیحت لیتی ہے، اور ان کی موجودگی کو کسی تہوار کی طرح مناتی ہے، وہ نسلیں کامیاب ہوتی ہیں۔" آواز بالکل پرسکون تھی، انداز برفیلا تھا۔۔بالکل ٹھنڈا۔"اور آج اس محفل میں آپ سب کا جوش و جذبہ دیکھ کر، میں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ میں مستقبل کی فاتح نسل کے درمیان موجود ہوں۔" لیڈی اقتدار نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی مٹھی بنائی۔سامعین ایک بار پھر جوش میں آ کے تالیاں پیٹنے لگے۔کچھ دیر کے بعد لیڈی اقتدار نے ہاتھ کھڑا کیا تو تالیوں کی آواز ڈھل گئی۔

"میں نے زندگی سے ایک بات سیکھی ہے، انسان اس دنیا میں جتنا بھی اعلیٰ مقام حاصل کر لے۔جتنی بھی ترقی کر لے، اگر اس کی ترقی اور اس کی پرواز اس کے اپنے وطن کو ہی فائدہ نہ پہنچائے تو اس کی ساری ترقی بے کار ہے۔دنیا کے اس کارخانے میں کوئی چیز اگر اپنا کردار نہ ادا کرے تو وہ فالتو ہے، دنیا پر ایک بوجھ ہے۔اور میں اس آڈیٹوریم میں موجود طلباء سے کہنا چاہتی ہوں کہ آپ لوگ کبھی بھی اس دنیا پر بوجھ نہیں بنیے گا۔اس دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، لیکن اپنی جڑوں کو کبھی

نہ بھولیں۔" ایک بار پھر سماعت میں تالیاں گونجی جو کہ کچھ دیر میں خود ہی ڈھل گئیں۔اس بار لیڈی اقتدار کو اپنا ہاتھ کھڑا کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

"میں نے انگلینڈ میں اپنا بچپن گزارا اور جوانی بھی۔میں نے اپنی تعلیم وہیں سے حاصل کی ہے۔اگر میں چاہتی تو ایک بہترین سا پر سکون لائف اسٹائل گزار سکتی تھی۔مگر نہیں میں نے ایک پر سکون لائف اسٹائل کے اوپر اس جد وجہد کو ترجیح دی۔صرف اور صرف اپنے ملک کے لیے۔مجھے اپنے اس چناؤ پر بالکل بھی پچھتاوا نہیں۔جب اس ملک کے یہ بچے،یہ عورتیں یہ غربت میں جھلستی عوام مجھے مسکرا کے دیکھتی ہے، میرے ہاتھ چومتی ہے، مجھے دعائیں دیتی ہے، تب مجھے اپنے اس فیصلے پر فخر محسوس ہوتا ہے۔میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان تصور کرتی ہوں۔اور یہ تو حقیقت ہے کہ انسان دل سے مطمئن تب ہی ہوتا ہے جب اس کے ارد گرد موجود لوگ اس سے خوش ہوں۔" لیڈی اقتدار نے وقفہ لیا۔سامعین آنکھوں میں چمک، چہرے پہ پرجوش مسکراہٹ لیے اپنی آئیڈیل کو بات کرتے دیکھ رہے تھے،

"بس آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ، آپ لوگوں نے ہمیشہ اپنے آپ سے مخلص رہنا ہے، اور اپنے لوگوں سے مخلص رہنا ہے۔یہ جو غربا ہیں، یہ جو ضرورت مند ہیں یہ ہم سب کی ذمہ داری ہیں۔آپ لوگوں نے اس ذمہ داری کو بھرپور طریقے سے سر انجام دینا ہے۔اپنا خیال رکھیئے گا۔مستقبل کے قابل ڈاکٹرز سے بات کر کے مجھے بہت اچھا لگا۔"اپنی تقریر کو مکمل کر کے وہ اب ہلکا سا مسکرائی۔اس کی مسکراہٹ میں بھی اس کی گرجدار صحبت جھلکتی تھی۔آڈیٹوریم ایک بار پھر تالیوں کے شور سے بھر

گیا تھا۔ اپنے ازلی، شان و شوکت سے لبریز انداز سے چلتے ہوئے وہ اسٹیج سے رخصت ہو گئی۔ پرنسپل صاحبہ تالیاں پیٹتی اب مائیک کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔

”یہ ہوتے ہیں سچے محب الوطن!“ وہ پر جوش انداز میں بول کے تالیوں کے تھمنے کا انتظار کرنے لگیں۔

”اب میں بلانا چاہوں گی اس یونیورسٹی کی ایک الومنائی کو۔ وہ نو سال پہلے ہماری یونیورسٹی سے گریجوئیٹ ہوئی تھیں۔ سفر ان کا بھی آسان نہ تھا، مگر ان میں سچی لگن تھی۔ اور آج ہم سب انہیں ان کے فلاحی کاموں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ وہ ایک ہمدرد انسان ہیں جو کہ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فیلین تھروپسٹ (philanthropist) بھی ہیں۔ جنہوں نے بے غرض ہو کے انسانوں اور جانوروں کی فلاح کے لیے نہ جانے کیا کچھ نہیں کیا۔ بھرپور تالیوں کے ساتھ استقبال کیجیے ڈاکٹر نیلوفر کاشف کا!“ پرنسپل صاحبہ ایک مرتبہ پھر دیوار کے ساتھ جا کے کھڑی ہو گئیں۔ آڈیٹوریم میں تالیوں کا شور گونجا۔ تیز مگر شائستہ چال چلتے ہوئے نیلوفر اسٹیج میں نمودار ہوئی اور مائیک کے پیچھے جا کے کھڑی ہو گئی۔ چہرے پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ لیے وہ سامعین کو دیکھ رہی تھی۔

”ہا! کتنا اچھا لگ رہا ہے یہاں کھڑے ہو کر آپ سب کو دیکھنا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دن کل ہی گزرے تھے جب میں اسی آڈیٹوریم میں آپ لوگوں کی جگہ پر بیٹھا کرتی تھی اور پر جوش ہو کے تالیاں پیٹا کرتی تھی۔“ نیلوفر کا انداز اپنائیت سے لبریز تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی پرانے دوست سے بات کر رہی تھی۔

”اس یونیورسٹی سے میری بہت سی یادیں منسلک ہیں۔“ نیلوفر نے مائیک کو اسٹینڈ کی گرفت سے آزاد کیا اور ہاتھ میں پکڑ کے آگے بڑھی۔ ”کس طرح سے ہم اپنے پروفیسرس کی منتیں کرتے آگے پیچھے بھاگا کرتے تھے، سی آر سے سفارشیں لگوایا کرتے تھے، سینئرز سے تعلقات بنانے کی کوشش کرتے تھے، بوڑھی لائبریرین کو چکما دے کر کتابیں چرایا کرتے تھے۔“ نیلوفر نے ایک قہقہہ لگایا۔ آڈیٹوریم میں بھی مدھم سا قہقہہ گونجا۔

”مگر جو بھی تھا، آج اچھا لگ رہا ہے اپنی اس یونیورسٹی میں تقریر دے کر۔ گویا میں بھی اس قابل ہوگئی ہوں کہ لوگ میری پیروی کر رہے ہیں، مجھ سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سفر آسان نہ تھا۔ بیچ سڑک میں کئی مرتبہ گھائل کی گئی تھی۔ لیکن میں ڈٹی رہی۔ میں دنیا کے اس ہجوم میں اپنا نام بنانے آئی تھی۔ میں فاتح بننے آئی تھی۔ اور میں فاتح بن گئی!“ نیلوفر نے توقف لیا۔ ”ہاں میں مانتی ہوں میں نے اسے سفر میں کئی غلطیاں کی۔ میرے سالوں پہلے بہت اسکینڈلز بھی آ چکے ہیں۔ لیکن میں اپنی ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو تسلیم کرتی ہوں۔ کیونکہ ان ہی غلطیوں نے مجھے وہ بنایا جو میں آج ہوں!“ وہ انگلی اٹھا اٹھا کے پر جوش ہو کے بولے جارہی تھی۔ ہال میں ایک بار پھر شور و غل پھیل گیا۔ نیلوفر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ”غلطیاں ہم سب ہی کرتے ہیں لیکن فتح حاصل صرف وہی کر پاتے ہیں جو کہ اپنی غلطیوں سے سیکھ حاصل کرتے ہیں۔“

”میں نے دو سال پہلے جانوروں کی فلاح کے لیے ایک تنظیم بھی شروع کی۔ میں نے خود کو اس قابل بنایا کہ میں اس تنظیم کو بغیر کسی صدقہ و خیرات کے چلا سکوں۔ اور آج نیلوفر اینیمل پروٹیکشن پروگرام کی کامیابی سب اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی سکتے ہیں۔“

”اسی کے ساتھ میں اپنی پیپ ٹاک کو ختم کرتی ہوں۔“ چہرے کو مسکراہٹ میں ڈھالے وہ دوستانہ سے انداز میں بولی تھی۔

نیلوفر نے مائیک دوبارہ سٹینڈ پر لگایا اور ایک نظر تالیاں بجاتے طلباء کو دیکھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔۔۔یہ مسکراہٹ فاتحانہ سی تھی۔یک دم اس مسکراہٹ کی فطرت میں تبدیلی آئی۔وہ مسکراہٹ اب اداس سی مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی۔آنکھوں میں رنجش اترنے لگی۔نیلوفر دو قدم پیچھے گئی۔آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا مگر وہ اپنے آپ کو رونے سے روکے ہوئے تھی۔دل ایک دم سے خالی ہونے لگا تھا۔وہ تیز قدم بڑھاتے بیک اسٹیج چلی گئی۔

”کاش تم یہ تالیاں حقیقت میں ڈیزرو کرتی۔“ اپنی آنکھوں کو موندھتے ہوئے وہ زیر لب بڑ بڑائی۔وہ اچانک سے ڈسٹرب سی نظر آنے لگی تھی۔

اسے تو اس وقت خوش ہونا چاہئے تھا۔۔۔پھر وہ اتنی مضطرب کیوں ہونے لگی تھی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رفتہ رفتہ دن گزرتے گئے۔مون سون کے اثرات بھی پاکستان میں داخل ہونا شروع ہوئے۔اسلام آباد میں کچھ دنوں سے بادلوں کا قبضہ تھا۔یہ بدھ کا دن تھا اور آج بھی آسمان پہ کافی بادل تھے۔مگر ابھی ان کے برسنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

جیسا کہ طے ہوا تھا حسام ٹھیک پانچ بجے مناج کے آفس پہنچ گیا تھا۔وہ کافی گھبرایا ہوا تھا کیونکہ آج اسے اپنی شادی شدہ زندگی کی تفصیل مناج کو بتانی تھی۔اسے آج ایک اجنبی کے سامنے اپنے آپ کو

کھول دینا تھا۔وہ اپنے کمزور لمحات اسے بتانے والا تھا۔حسام صبح سے ہی اپنے آپ کو اس سب کے لیے تیار کر رہا تھا۔

وہ جب آفس میں داخل ہوا تو مناج اسی کی ہی منتظر نظر آرہی تھی۔اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔آج مناج نے بھورے رنگ کی پھولی ہوئی آستینوں والی کرتی پہنی ہوئی تھی۔پشمینہ شال آج بھی اس کے کندھے پہ گری ہوئی تھی۔پچھلی مرتبہ تو حسام نے غور نہیں کیا تھا مگر اس مرتبہ حسام سوچ میں پڑ گیا کہ اتنے حبس زدہ موسم میں بھی بھلا اس نے یہ شال کیوں پہنی تھی۔جو بھی تھا، وہ اپنے تمام خیالات کو جھٹک کے اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"جی حسام صاحب! آپ شروع سے مجھے سب کچھ بتائیے۔" نہ کوئی سلام دعا، نہ کوئی ابتدائی کلمات۔وہ سیدھا مدعے پر آگئی تھی۔حسام کو یہ بھی تھوڑا عجیب لگا مگر اس نے اس وقت اسے بھی نظر انداز کر دیا۔مناج اپنے ہاتھ میں نوٹ بک اور پین پکڑے لکھنے کو تیار لگتی تھی۔وہ اس کیس کے لئے مضبوط نقاط اکٹھا کرنا چاہتی تھی۔اس کو حسام کی ذاتی زندگی سے کوئی خاص غرض نہ تھا۔حسام نے ایک گہری سانس خارج کی۔وہ اب سب کچھ بتانے کے لیے تیار تھا۔

"مہر اور میری پہلی ملاقات سات سال پہلے ہوئی تھی۔" اور حسام اس سات سال پرانے منظر میں کھونے لگا۔"وہ بیس سال کی تھی۔اور میں تیئیس۔وہ بہت معصوم سی تھی۔بچگانہ سی۔مگر بہت خوش مزاج۔۔۔"وہ مناج کو بتاتے بتاتے سات سال پرانے اس حسین منظر میں کھونے لگا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ سات سال پہلے کا منظر ہے۔ مرینا حسام کو بازو سے پکڑتے ہوئے اسے پارٹی میں لیتے آ رہی ہے۔ ان کے چہرے پر ڈھیروں خوشی ہے۔ حسام دوسری طرف کچھ بیزار سا لگ رہا ہے۔ یقیناً اس کو ادھر زبردستی لایا گیا ہے۔

"آج عبداللہ سلطان سے ملواؤں گی، بہت اچھے سے ملنا تم، سمجھے؟" تیئیس سالہ حسام بری طرح سے الجھ جاتا ہے۔ اس کی ماں آخر کیا کھچڑی پکا رہی ہے؟ وہ سوچتا ہے۔

"ہیں؟ مگر کیوں؟" مرینا نے حسام کے اوپر "کیا کروں میں اس کا" والی نظر ڈالی تو وہ کچھ غیر آرام دہ سا ہو کے نظریں چرانے لگتا ہے۔

"میں نے تمہارے لیے لڑکی دیکھ لی ہے حسام۔ عبداللہ سلطان کی بیٹی، مہر۔ اس سے چند ہفتے پہلے میری بزنس ٹرپ پر ملاقات ہوئی تھی۔ اف بہت ہی پیاری اور معصوم سی بچی ہے۔" حسام کو جیسے دو سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگتا ہے۔ اس نے مڑ کے مرینا کو دیکھا جو کہ بھرپور مسکرا رہی ہیں۔ اس کو اپنی ماں پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کی ماں ایسی ہی ہے۔ مرینا عموماً امیر عورتوں کی طرح نہ تھیں۔ یہ اس لیے تھا کیونکہ مرینا خود ایک مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت تھیں جنہوں نے اپنی محنت کے بلبوتے پر ایلیٹ کلاس میں جگہ بنائی تھی۔

"امی میں صرف تیئیس سال کا ہوں!" حسام اپنا بازو مرینا کی گرفت سے آزاد کرتے کہتا ہے۔ وہ ایک دم سے چڑ جاتا ہے۔ مرینا حسام کے اوپر کھا جانے والی نظر ڈالتی ہیں۔

"تم چپ کرو۔ جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرتے رہنا۔ سمجھے۔" مرینا غصے سے تنبیہ کرتی ہیں اور حسام کا بازو تھام لیتی ہیں۔ اب وہ اسے عبداللہ سلطان کی طرف لے کر جا رہی ہیں۔

اس دن حسام پہلی دفعہ مہر سے ملتا ہے۔

مہر نے سفید شفون کا کرتا پہنا ہوا ہے۔ مہر پہ سفید رنگ بہت جچتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی حسام کو اپنا دل اپنی جگہ سے سرکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ تھی بھی ایسی۔ اپنے اخلاق اور مزاج سے ہر کسی کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

"آپ کا آگے کا کیا پلان ہے۔ آپ کی بی آرچ کی ڈگری تو آپ کو مل گئی ہے۔" مہر مسکرا کے حسام سے پوچھتی ہے۔ اس کے انداز میں حال کی مہر جیسے پختگی اور سختی نہیں ہے۔ وہ کافی بچگانہ سے انداز میں ماتھے پہ آتی لٹ کو انگلی میں لپیٹتے کہہ رہی ہے۔

"پتا نہیں۔ شاید ڈیڈ کی کمپنی جوائن کرلوں۔۔۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ دو سال میں آپ کی ڈگری بھی ختم ہو جائے گی۔" حسام نے پوچھا تو مہر کھلکھلاتی ہے۔

"ہاں بس تین سیمسٹر باقی ہیں۔ ڈیڈ کے کہنے پر میں نے ایم بی اے کر تو لیا، مگر مجھے نہیں پتا میں آگے کیا کروں گی۔ کیا ضروری ہے کہ ہم پڑھنے لکھنے کے بعد کچھ کریں؟ ہم آرام سے بیٹھ بھی تو سکتے ہیں ناں۔" مہر آواز میں تشویش لیے معصومانہ سے انداز میں کہتی ہے۔ حسام اس انداز پر زیر لب ہنس دیتا ہے۔

"ہاں آپ چاہیں تو آرام سے بیٹھ جائیں۔اس میں کوئی حرج تو نہیں۔" حسام ہاتھ میں موجود گلاس اپنے لب سے لگا کے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ اپنے حلق میں اتارتا ہے۔"مگر پھر بھی فارغ رہ کر شاید آپ کو زندگی بور لگے۔"

"مجھے نہیں پتا۔میرے ارد گرد سب لڑکیاں پتا نہیں زندگی سے منسلک کیا کیا باتیں کرتی ہیں، کہ وہ گریجوئیٹ کرنے کے بعد یہ کریں گی وہ کریں گی،اور مجھے تو جیسے پتا ہی نہیں میں نے کیا کرنا ہے۔" مہر کے چہرے پر تشویش بڑھتے جا رہی ہے۔

"کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔آپ فکر نہ کریں۔آگے چل کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔" حسام نے مہر کی دل جوئی کرنا چاہی۔مہر چہرے پہ ہنوز تشویش لیے سر اثبات میں ہلا دیتی ہے۔

"کیا آپ کو ہمیشہ سے معلوم تھا آپ نے کیا کرنا ہے؟" مہر نے پوچھا تو حسام سر اثبات میں ہلاتا ہے۔

"بچپن سے مجھے آرکیٹیکٹ بننے کا شوق تھا۔میں بچپن سے آرٹ میں بہت انوالوڈ ہوں۔میرا کینوس اور میرے برشز میری اولادوں جیسے ہیں۔" مہر حسام کی بات پہ اتنا زور سے ہنس دی جیسے نہ جانے اس نے دنیا کا سب سے مزاحیہ لطیفہ سنا دیا ہو۔لیکن حسام کو کچھ برا نہیں لگتا ہے۔اتنا پیارا سا انداز، بھلا کسے برا لگ سکتا تھا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"میں چوبیس سال کا تھا اور وہ اکیس کی جب ہماری شادی ہوئی۔" حال کا حسام مناج کو بتا کے رکا۔اس کے چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ تھی۔یہ یادیں اسے بہت تکلیف دے رہی تھیں۔

"اتنی چھوٹی عمر میں مہر کی شادی آپ سے کیوں کردی گئی؟" مناج نے پیپر پہ کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ مہر کے ڈیڈ کو ہمارا رشتہ مناسب لگا۔پھر مہر اور اس کے ڈیڈ کے تعلقات بھی ٹھیک نہیں تھے۔وہ ان سے ناراض رہتی تھی۔اور عموماً اداس بھی۔عبداللہ سلطان کو لگا کہ شاید شادی کر کے مہر ایک دفعہ پھر سے خوش ہو جائے۔" حسام نے ٹھہر ٹھہر کے صحیح الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بتایا۔ مناج کو شک ہوا کہ حسام کچھ چھپا رہا تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں ان کے تعلقات کیو ں خراب تھے؟" مناج نے پوچھا۔حسام جانتا تھا مگر وہ اتنی ذاتی بات مناج کو یوں نہیں بتانا چاہتا تھا۔اسے مہر کی ذاتیات کا بھرپور احترام کرتے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"ٹھیک ہے آگے بتائیے۔" مناج نے سرسری سا کہا۔

"ہماری شادی کے بعد مہر نے اپنی پڑھائی جاری رکھی۔وہ لاہور میں لمس میں پڑھتی تھی اور وہیں پہ ہاسٹل میں بھی رہتی تھی۔وہ وقت بہت خوبصورت تھا۔میں اس سے ہفتے میں کئی مرتبہ ملنے آتا تھا اور ویک اینڈز ہم ساتھ گزارتے تھے۔بھلے ہم دونوں کے بیچ ایک فاصلہ تھا مگر پھر بھی ہمارے دل ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔شادی کے بعد ہی مجھے مہر سے محبت ہوئی۔اور میں نے اسے در حقیقت

شادی کے بعد جانا۔وہ بہت معصوم تھی اپنی دنیا میں کھوئی کھوئی۔اس میں بچپنا بھی تھا جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑتا گیا۔"

"آپ نے اپنی ایڈکشن مہر سے کیسے چھپائی۔"

"جب وہ یونی میں تھی تب تو یہ مشکل نہ تھا۔مگر جب وہ گھر آئی تھی تب میں نے ڈرگ کی مقدار کم کر دی جس کی وجہ سے اسے شک نہیں ہوتا تھا۔اور پھر ایک دن میں نے بد احتیاتی کا مظاہرہ کیا اور ڈرگز کی کچھ زیادہ ہی مقدار لے لی۔۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ پانچ سال پہلے کا منظر ہے۔حسام کے بنگلے کی اوپر والی منزل میں اپنے کمرے میں بند مہر کسی سے فون پہ بات کرتی نظر آرہی ہے۔اس کی پیشانی پہ بل نمایاں تھے۔وہ اس وقت کافی برہم سی نظر آرہی ہے۔

"ڈیڈ اگر آپ نے تیسری شادی کر ہی لی ہے تو اب مجھے بتانے کا فائدہ؟ مجھے کون سا فرق پڑھنا تھا؟"مہر کا انداز دھیما مگر تلخ تھا۔

"مہرو مجھے دوبارہ شادی کرنی ہو تو میں کرسکتا ہوں۔مجھے پورا حق ہے۔اور مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔اور مجھے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا اگر میری بیوی مجھ سے عمر میں چھوٹی ہو۔" عبداللہ سلطان سختی سے تائید کرتے ہیں۔

"بالکل آپ کو پورا حق ہے۔" مہر کی آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں۔"اور میری ماں کے کیا حقوق تھے؟ ان پہ بات کرنا چاہیں گے آپ؟ اس وقت تو آپ کو میری ماں سے زیادہ فلم انڈسٹری کی اداکارہ اور ماڈلز میں دلچسپی تھی ناں ڈیڈ۔" مہر غصیلی آواز لیے بولتی ہے۔مگر اس کی آواز اونچی نہیں ہے۔اونچی آواز میں، یا چلا کے بات کرنا اس کے لیے غیر فطری ہے۔

"وہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔آخر تم اپنی ماں کو بھولتی کیوں نہیں؟ " عبداللہ سلطان کے پاس جیسے کہنے کو کچھ خاص نہیں بچا ہے۔

"پرانی بات ہے بھی تو کون سا آپ بدل گئے؟ ابھی بھی ویسے ہی ہیں۔اور جہاں تک ماں کو بھولنے کا سوال ہے، یہ میرے بس میں نہیں۔میں ان سے کوسوں دور ہوں لیکن انہیں آج تک نہیں بھلا سکی۔" اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے وہ کافی غمگین ہونے لگ جاتی ہے۔

"مہرو ٹھنڈے دماغ سے سوچو جو میں نے کیا وہ غلط نہیں ہے،اگر تمہیں پہلے بتاتا تو تمہارا تب بھی یہی رد عمل ہونا تھا۔" عبداللہ سلطان کوفت کے عالم میں کہتے ہیں۔

"جو بھی ہے ڈیڈ۔بس آپ کا بہت شکریہ، میری زندگی کو مزید دشوار بنانے کے لیے!" تلخی سے کہتے وہ کال کاٹ دیتی ہے۔وہ کسی بھی قسم کی بحث کے موڈ میں نہیں ہے۔غصہ اس کے اوپر بری طرح حاوی تھا۔مہر بہت دشواری کے ساتھ اپنے غصے کو قابو کرلیتی ہے۔کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے۔مہر "آجاؤ" کہتی ہے۔اور اندر پھر سہمی ہوئی ملازمہ داخل ہوتی ہے۔سہمی ہوئی ملازمہ کو دیکھ کے مہر پریشان سی ہونے لگتی ہے۔

”کیا ہوا ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟“ مہر اس وقت اپنے غصے کو پوری طرح دبا چکی تھی اس لیے قدرے نرمی سے بولتی ہے۔

”بی بی۔وہ حسام صاحب نیچے آئے اور گر۔۔۔۔“ ملازمہ نے بس اتنا ہی کہا کہ مہر کے پاؤں اس کی چپلوں میں چلے جاتے ہیں۔اگلے لمحے وہ سیڑھیاں پھلانگتی نظر آ رہی ہے۔حسام گھر کے داخلی ہال میں گرا ہوا تھا۔حسام کو یوں دیکھ کے مہر کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

”ناصرہ، ایمبولینس کو بلواؤ جلدی۔“ بے چینی کے عالم میں وہ اونچا بولتی ہے۔وہ حسام کی جانب بڑھنا شروع ہوتی ہے جو زمین پہ اوندھا پڑا ہے۔حسام کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے اور وہ تکلیف کے مارے بلک رہا ہے۔حسام کے عقب میں وہ پنجوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتی ہے۔اس کی آنکھوں کے گرد پانی اکٹھا ہونے لگ جاتا ہے۔

”آپ کو کچھ نہیں ہو گا حسام!“ وہ حسام سے زیادہ خود کو دلاسا دینے کی کوشش کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”ہسپتال گئے تو اسے بتایا گیا۔“ حسام کی گردن باعثِ ندامت جھکنے لگی۔چہرے پہ کرب واضح ہونے لگا۔”کہ مجھے ڈرگ اوور ڈوز ہوا تھا۔وہ مجھ سے ناراض رہی مگر پھر میرے وعدوں نے اسے مجھے معاف کرنے پر مجبور کر دیا۔“

اس لمحے حسام کو اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔یہ پچھتاوا وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔حسام کے لیے یہ ملاقات مشکل تر مشکل بنتی جا رہی تھی۔

"ایسا نہیں تھا کہ میں نے کوشش نہیں کی۔" حسام کے آنسوؤں نے بہنے کی ضد کی تو اس کی آواز گیلی ہونے لگی۔

"میں نے بہت کوشش کی تھی مس مناج۔ مہر کے لیے۔ اپنی بیٹی کے لیے۔ مگر میں کامیاب نہ ہو سکا۔" مناج جو کہ مصروف انداز میں لکھتے جا رہی تھی اس بات پہ ایک دم سے تھم گئی۔

"جب عنایا پیدا ہوئی تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے میں ڈرگز نہ لوں۔ لیکن مس مناج میں ایک کمزور انسان ہوں، ایک کمزور مرد۔ میں ہمیشہ سے آخری لمحات میں ہار جایا کرتا تھا۔ مجھے میری بیٹی تک اس شر سے نہ نکال سکی۔" مناج کے مردہ دل نے حرکت کی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اداسی چھانے لگی۔ مگر وہ تو ہر جذبے سے پاک تھی ناں؟ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے ماضی کے سمندر میں ڈوبنے لگی۔

"بابا آپ اپنی بیٹی کیلئے یہ سب چھوڑ دیں بس۔" مناج کے دماغ میں کسی چھوٹی بچی کی شکوہ انگیز آواز گونجی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور ماضی کے سمندر سے باہر نکلی۔ کچھ لمحے میں اپنے آپ کو نارمل کر کے وہ ایک بار پھر نوٹ بک پہ کچھ لکھنے لگی۔

"پھر ایک دن مہر نے تنگ آ کے اپنے ڈیڈ کو کال کر دی۔ یہ سب شادی کے تین سال بعد ہوا تھا۔ اس نے بہت برداشت کیا۔ بہت صبر کیا تھا۔ وہ مجھے صحتیاب ہوتا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور اس لیے وہ انتظار کرتی گئی، اس امید کے ساتھ کہ میں ایک دن اپنے وعدے پورے کر دوں گا۔ لیکن کاش وہ انتظار کر کے اپنا وقت ضائع نہ کرتی۔ کاش وہ پہلے دن ہی مجھے چھوڑ جاتی۔ اسے اپنی توانائی مجھ جیسے لوزر پر نہیں ضائع کرنی چاہئے تھی۔ اس کے ڈیڈ نے اسے طلاق کا مشورہ دیا مگر وہ اس وقت نہ مانی۔

اور پھر عبداللہ سلطان نے میری امی کو سب کچھ بتا دیا۔اور وہ دن۔۔۔" حسام کے چہرے پر خوف اترنے لگا۔

"وہ بھیانک دن مجھے آج تک یاد ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ دو سال پہلے کا منظر ہے۔حسام اپنے بنگلے کے حال میں کھڑا سر جھکائے رو رہا ہے اور مہر ادھر ہی سہمی سی سر جھکائے کھڑی ہے۔مرینا حسام کی طرف بڑھتی ہیں اور اسے ایک زور دار تھپڑ لگاتی ہیں۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ حسام کی روح کانپ اٹھتی ہے۔مرینا پھر حسام کو ایک اور تھپڑ لگاتی ہیں تو وہ زمین پہ ڈھیر ہو جاتا ہے۔وہ کسی بچے کی طرح بلکتے ہوئے رونے لگ جاتا ہے۔

"تم!" مرینا کی نظروں کا رخ اب مہر کی جانب بڑھتا ہے۔"کب سے جانتی ہو یہ سب تم؟" مرینا آگ بگولا ہو کے بولتی ہیں۔

"دو سال سے۔" مہر ہکلاتے ہوئے کہتی ہے۔اسے اپنے ڈیڈ کو یوں شکایت کر کے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔حسام کو یوں روتا دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔

"دو سال سے؟" مرینا کو زور دار جھٹکا لگتا ہے۔انہیں اس وقت اپنے حسام اور مہر کو یوں الگ کرنے کے فیصلے پر پچھتاوا ہونے لگ جاتا ہے۔وہ اپنا سر پکڑتے رہ جاتی ہیں۔ ایک دفعہ پھر سے ان پر شدت بھرا غصہ حاوی ہونے لگتا ہے مگر اس بار ان کے غصے کا مرکز مہر تھی۔

"میں اس نشئی کی ماں تھی مہر۔ میرا یہ سب، سب سے پہلے جاننے کا حق تھا۔ تم نے یہ سب مجھ سے اتنے سال کیسے چھپایا؟" مرینا چلائی تو مہر رونے لگ جاتی ہے۔ مرینا کا جب غصہ اترا تو انہیں اپنے رویے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ لڑکی ان کے بیٹے کی لت کو نہ جانے کب سے برداشت کر رہی ہے۔ انہیں اس پر اس طرح سے چلانا نہیں چاہئے تھا۔ مرینا یہ سوچ کر ٹھنڈی سانس خارج کرتی ہیں۔

"تم حسام۔" اب مرینا حسام کی طرف مڑی۔ "تمہاری اس لت کو میں فوراً نکالتی ہوں۔ مہر تم عنایا کے ساتھ اپنے گھر جاؤ گی۔ اور جب تک میں نہ بلاؤں تم واپس نہیں آؤ گی۔" مرینا نے بارعب انداز میں اپنا حکم سنایا۔

جب چھوٹے نادانیاں کرتے ہیں تو بڑوں کو چارج لینا پڑتا ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اس کے بعد مہر چلی گئی تھی۔" حال کے حسام نے بات جاری رکھی۔ "امی نے مجھے اسلام آباد کی ایک ریہیب میں داخلہ دلوایا۔ مگر پاکستان میں ریہیب اتنی معیاری نہ تھے۔ ڈیٹاکسی فکیشن کے بعد ہی میں ریہیب سے بھاگ گیا۔ مجھے لگا تھا کہ میں صحتیاب ہوگیا تھا مگر میں غلط تھا۔ صرف ڈیٹاکسی فکیشن کافی نہ تھی۔ ایک سال بعد میں نے اپنی حسرتوں کے آگے پھر گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ ایک سال میری اور مہر کی زندگی کا خوبصورت ترین وقت تھا۔ اور شاید اس لیے ہی جب میں دوبارہ سے نشہ کرنے لگ گیا تو مہر سے برداشت نہیں ہوا۔ مہر کی برداشت بس یہاں تک ہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے آخری حد تک کوشش کی۔ وہ ڈٹی رہی، مگر جیسے میں نے آپ کو بتایا میں ایک لوزر ہوں۔ میں ایک بار پھر اپنی حسرتوں کے آگے ہار گیا۔ اور تب مہر نے پہلی دفعہ مجھے طلاق کی دھمکی دی تھی۔ پہلی دفعہ۔ شادی کے

پانچ سال اور میری ایڈکشن کو سہتے ہوئے چار سال، یہاں پہ مہر کی بس ہونے لگی تھی۔اس نے مجھے ایک آخری موقع دیا۔جو کہ میں نے گنوا دیا۔اس کے بعد میں ڈرگ اسمگلنگ کے کیس میں پھنس گیا۔ اور مجھے تین سال کی سزا سنا دی گئی۔مگر میرے ڈرگز کے وتھڈراولز اتنے شدید تھے کہ مجھے رہا کر دیا گیا۔آپ خود سوچیے مناج،جو انسان دس سال سے نشہ کرتا آرہا ہو اس کو یہ نشہ اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ پھر امی مجھے ریہیب کے لیے انگلینڈ لے گئیں جہاں پانچ ماہ میں نے پراپر ریہیب کی اور اب میں بالکل صحتیاب ہوں۔" مناج اپنے نوٹ بک کے صفحے پر سب لکھتے گئی۔حسام کی کہانی، اس ڈھلتی شام کے ساتھ ساتھ اختتام کو پہنچنے لگی تھی۔

یہ پچھتاوا حسام کو کھانے لگا تھا۔وہ ماضی میں بہت کچھ کھو آیا تھا۔نہ جانے کتنا ہی رنج اسے کیوں نہ ہو، وہ کتنا ہی کیوں نہ رو لیتا، اب جو کھو گیا تھا وہ اسے نہیں ملنے والا تھا۔جو اس کا ہوا کرتا تھا اب اس کا نہیں رہا تھا۔یہ احساس حسام کو وقت کے ساتھ ساتھ دبائے جا رہا تھا۔اس ملاقات کے دوران حسام نے اپنے آپ کو اَن گنت مرتبہ رونے سے روکا۔اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگ گئی تھی۔اس کو اپنی توانائی ختم ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔

حسام نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات جاری رکھی۔

"مس مناج۔بس میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے در بدر کی ٹھوکرے نہیں کھانا چاہتا۔میں عنایا سے یہ دوری برداشت نہیں کر سکتا۔" حسام نے کہا تو مناج کا لکھتا ہاتھ ایک دفعہ پھر تھم گیا۔"ہاں میں نشئی تھا اور میں نے مہر اور عنایا کے ساتھ انصاف نہیں کیا، لیکن پھر بھی میں عنایا سے بہت محبت کرتا ہوں مس مناج۔مجھے نہیں معلوم وہ ان آٹھ ماہ میں کتنی بڑی ہوئی ہوگی، کیسی دکھتی ہوگی۔کیسا بولتی

ہو گی۔ مجھے تو اس بات کا بھی ڈر ہے کہ شاید وہ مجھے پہچانے ہی نہ۔ مجھے بس کسی طرح سے اپنی بیٹی سے ملوادیں میں آپ کا زندگی بھر کا ممنوع رہوں گا۔" حسام کا سر شرم سے جھکتا چلا گیا۔ وہ مناج کو نہیں دیکھ رہا تھا جو ایک دفعہ پھر سے کہیں کھو گئی تھی۔۔۔ وہ اس آفس میں اب موجود نہ تھی۔۔۔ وہ بہت دور آ گئی تھی۔۔۔ بہت ہی دور۔۔۔ ماضی میں۔۔۔

چھوٹی مناج اپنے چھوٹے سے گھر کے کچے صحن میں موجود تھی۔ اندر کی طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس کے معصوم چہرے پہ جہاں بھر کی خفگی تھی۔ وہ ناراض تھی اس شخص سے جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سامنے کھڑا شخص اب جھک کے مناج کے قریب آیا۔ اس کے پاس سے ایک عجیب سی بو آتی تھی۔ مناج نے نروٹھے سے انداز میں اپنا منہ موڑ لیا۔

"کیا ہوا میری ماہرانی کو؟" اس شخص کے انداز میں بھرپور شفقت تھی۔ مناج نے اپنے چہرے کا رخ اس شخص کی طرف موڑا۔ خفگی ہنوز بر قرار رہی۔

"امی آپ کی وجہ سے بہت روتی ہیں ابو!" چھوٹی بچی نے کہا۔ "آپ مجھے صرف ایک بات بتائیے۔ کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟" چھوٹی بچی کی معصوم آواز میں بے بسی تھی۔

اور حال کی مناج کے چہرے پہ کرب اترنے لگا۔ اس کے لب کھلے ہوئے تھے۔ ماضی کی یاد بدقت تازہ ہوئی تو اس کا وجود تکلیف میں تھر تھرانے لگا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کھوئے کھوئے سے انداز میں وہ بے اختیار بولی:

"کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟" وہ بہت ہی مدھم آواز میں بولی تھی۔حسام نے تعجب آمیز نگاہ مناج پہ ڈالی۔یہ پہلی بار تھا جب حسام کو مناج کی آواز میں کوئی جذبہ نظر آیا۔مناج کو جیسے ہی اندازہ ہوا وہ کچھ بول گئی تھی تو اس نے ایک جھٹکا لیا۔اور جوں ہی اس کی نظروں کے سامنے سے منظر چھٹنے لگا۔اب وہ حال میں واپس آگئی تھی۔

آج چودہ سال بعد مناج کو کسی جذبے نے گھیرا تھا۔یہ جذبہ آخری مرتبہ اس نے اپنی ماں کے لیے محسوس کیا تھا، اور یہ جذبہ ہمدردی کا تھا۔

"جی ہے۔" حسام نے مناج کو دیکھتے ہوئے کہا،جو اب اپنے آپ کو نارمل کر چکی تھی۔عام گفتگو کے بعد حسام وہاں سے چلا گیا۔لیکن مناج میں کچھ بدلنے لگا تھا۔اسے حسام میں اپنے ابو نظر آئے تھے۔ جس کے باعث اس کی اس کیس میں دلچسپی بڑھ چکی تھی۔آنکھوں میں ایک عزم لیے اس نے تہیہ کیا کہ وہ حسام کو عنایا سے ملوا کر ہی دم لے گی!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آسمان رفتہ رفتہ کالے رنگ میں ڈھلتا گیا۔اب آسمان پہ چھائے بادل گہرے ہونے لگے تھے اور کسی بھی وقت برسنے کے لیے تیار لگتے تھے۔چاند بھی ان ہی بادلوں کے پیچھے چھپا تھا۔اسلام آباد کی سڑکوں پہ رش رواں دواں تھا۔اسی میں ہم اپنا رخ حسام کے اپارٹمنٹ کی طرف موڑتے ہیں۔کھانے کی میز کے ارد گرد کرسیوں پہ براجمان، حسام اور مرینا رات کا کھانا کھانے میں مصروف نظر آرہے تھے۔

"کیسا گیا سب؟ مناج سب کچھ ٹھیک سے دیکھ رہی ہے ناں؟" مرینا نے کھانے کے دوران پوچھا۔

"مجھے مس مناج کی قابلیت پہ بھروسہ ہے۔وہ اس معاملے کو ضرور دیکھ لیں گی۔" حسام نے اپنے بوجھل سے لہجے میں کہا۔آج کی اس ملاقات نے اسے واقعی تھکا دیا تھا۔مرینا نے توقف لیا۔

"حسام میں نے آج تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔تمہیں ایک ایسا فیصلہ سنانا ہے جو میں پچھلے کئی سالوں سے سنانا چاہ رہی ہوں۔" مرینا نے کہا تو حسام، جو کہ کانٹے سے اسٹیک کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھنے ہی والا تھا، تھم کے مرینا کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی امی بتائیں۔" کانٹا نیچے رکھتے ہوئے حسام بولا۔وہ مرینا کا انداز دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ بات کافی اہم ہی ہوگی۔

"میں اب سب کچھ چھوڑ رہی ہوں۔بس اب میں آرام کرنا چاہتی ہوں حسام۔میں چاہتی ہوں اپنے ڈیڈ کی یہ ایمپائر اب تم سنبھالو۔" حسام چونکا۔

"نہیں امی میں یہ نہیں کر سکتا۔۔۔" حسام نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"دیکھو حسام۔یہ بزنس ایمپائر ہم نے تمہارے لیے ہی کھڑا کیا تھا۔والدین سب کچھ اپنی اولاد کے لیے کرتے ہیں۔بس اب تم ہی سب سنبھالو گے۔اگر تمہاری ایڈکشن بیچ میں نہ آتی تو میں کب کا سب کچھ تمہیں سونپ چکی ہوتی۔" مرینا کا انداز حتمی تھا۔

حسام سوچ میں پڑ گیا تھا۔لیکن اسے یہ اتنا بھی برا نہیں لگا۔ایک نہ ایک دن تو سب اس نے سنبھالنا ہی تھا تو اب کیوں نہیں؟ ویسے بھی ریہیب ختم ہونے سے قبل وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی زندگی ضائع نہیں کرے گا۔اس لیے حسام اس وقت مان گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس طرح سے رات طویل ہوتی گئی بادلوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔وقفتاً بادلوں کے ٹکرانے کا عمل جاری ہوا اور بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اسلام آباد کی سڑکیں اور عمارتیں بھیگنے لگیں۔

بارش کی بوندیں اس کے کمرے کی کھڑکی سے ٹکرائیں۔تیز تیز گرتی بارش کی بوندوں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل سے اٹھا۔کھڑکی کی جانب بڑھ کے اس نے کھڑکی کھولی۔اس گھر کی گرین بیلٹ بھی بارش میں بھیگنے لگی تھی۔اس کے چہرے پہ مختصر مسکراہٹ بکھری۔ماحول میں میٹھی سی خوشبو بھی تھی جس کے باعث اس کا موڈ تر و تازہ ہونے لگا۔اس نے کھڑکی بند کی اور اپنی اسٹڈی ٹیبل کا رخ کیا۔اسٹڈی پہ ترجمے والا قرآن مجید پہلے سے ہی رکھا ہوا تھا۔ احمد اب اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی پہ براجمان ہوگیا۔وہ اپنا مصحف کھولنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ اس نے موبائل پہ نظر ڈالی۔عثمان جونیئر کالنگ۔احمد کے چہرے پہ آسودہ سی مسکراہٹ بکھری۔اس نے وہ کال اٹھالی۔

”کیا حال ہے جمشید؟“ احمد کا انداز عام سا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے بھائی۔بھائی آپ کو کچھ بتانا تھا۔" جمشید فون کی دوسری طرف سے بولا۔وہ انیس بیس سال کا جوان لڑکا تھا۔احمد نے دلچسپی لیتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دی۔

"ہاں بولو۔"

"بھائی۔میرا ایم کیٹ کا امتحان ہوا تھا۔میرے بہت اچھے مارکس آئے تھے۔اور میرا راولپنڈی میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا بھائی۔" جمشید کے لہجے میں شکر گزاری سی تھی۔احمد اس بات پہ دل سے خوش ہوا تھا۔

"چلو یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔اب بھرپور محنت کرنا بس۔" احمد نے اپنا انداز مختصر ہی رکھا۔

"احمد بھائی۔میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔آپ کی وجہ سے میں آج اس مقام تک پہنچا ہوں۔" احمد کی مسکراہٹ تھوڑی مدھم پڑی۔آنکھوں میں نیم سی اداسی چھانے لگی۔

"چلو کوئی نہیں۔" احمد نے جیسے سب کچھ جھٹکنا چاہا۔

"بھائی میں نے بتانا تھا کہ اب میں اپنا خرچہ خود اٹھا لوں گا۔میں نے چھوٹا سا کام شروع کیا ہے۔میں اب خود سب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" جمشید نے کہا تو احمد نے سمجھتے ہوئے سر اوپر نیچے ہلایا۔وہ جانتا تھا کہ معاشی خود مختاری کی طرف قدم بڑھانے میں کوئی برائی نہیں تھی۔ایک زمانے میں اس نے بھی قدم بڑھائے تھے، تو جمشید کو بھلا کیوں روکتا؟

"ٹھیک ہے جمشید۔میں سمجھ سکتا ہوں۔مگر پھر بھی،کوئی بھی ضرورت ہو تو میں موجود ہوں۔"احمد نے سرسری سا کہا۔

"جی بھائی بہت شکریہ۔"جمشید نے کال کاٹ دی۔احمد نے ایک گہری سانس خارج کی۔

چہرے پہ ازلی سنجیدگی لیے اب اس نے اپنا رخ اپنے مصحف کی جانب موڑا۔مصحف بھی اس کا منتظر تھا۔اس نے جہاں سے آخری دفعہ چھوڑا تھا وہیں سے پڑھنا شروع کیا۔سامنے سورہ رعد کھلی ہوئی تھی۔اس نے سورہ رعد کی تلاوت کرنا شروع کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بارش کی رفتار میں اضافہ ہوا۔عبداللہ سلطان کا بنگلہ بھی بارش میں بھیگنے لگا تھا۔مہر کے کمرے کی اس وقت تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور مہر نے ان کے اوپر پردہ گرایا ہوا تھا۔بارش اسے پسند نہیں تھی۔بارش کی آمد اسے، اس کی ماں کی یاد دلاتی تھی۔اور ماں کی یادیں اسے تکلیف دیتی تھیں۔وہ دونوں ماں بیٹی، جب بھی بارش ہوتی تھی، خوب نہایا کرتی تھیں۔

چھوٹی عنایا اس وقت اپنی ماں کے کرب سے بے خبر، اپنی ماں کے اندر چلتی جنگوں سے بے خبر، بستر پہ لمبی تان کے سو رہی تھی۔اس وقت اسٹڈی ٹیبل کا لیمپ جل رہا تھا۔مہر اسٹڈی ٹیبل کے سرہانے کرسی رکھ کے بیٹھی تھی۔اس کے چہرے پہ کرب تھا اور آنکھوں میں تکلیف۔روح بے چینی کے مارے مچل رہی تھی۔مہر نے اپنے ہاتھ میں پین تھاما ہوا تھا۔ٹیبل پہ ایک کاغذ بچھا ہوا تھا جس پر وہ لکھنے کے لیے تیار تھی۔

"پیاری ماں،

پتا نہیں کہ یہ خط میں آپ کو پوسٹ کر بھی سکوں گی کہ نہیں۔ یا شاید یہ ان ہی خطوط میں سے ہو گا جو کہ میں نے لکھے تو تھے مگر بھیجنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میں بھی اسی چیز کی خواہش مند ہوں کہ آپ میرے ساتھ ہوتیں۔۔ میں کاش آپ کی گود میں سر رکھ کر رو سکتی، ویسے ہی جیسے میں بچپن میں کیا کرتی تھی۔ اور کاش میں آپ کو بتا سکتی ماں، کہ میں کس قدر بے سکون ہوں۔ میں کس قدر بے چین ہوں۔ مجھے اپنا آپ کسی لاش کے جیسا معلوم ہونے لگا ہے ماں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اور اس اندھیری رات میں جہاں مہر اپنی بے سکونی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں مگن تھی وہاں احمد اپنی اسٹڈی ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھا اپنے خوبصورت سے مصحف کو پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس کا دل آہستہ آہستہ ہلکا ہونے لگا تھا۔ سکون نے اس کی روح کو گھیر لیا تھا۔ قرآن کا ذکر ہی ایسا ہوتا ہے، جو دلوں کو سکون دیتا ہے۔ وہ اب اس صفحے کی تلاوت مکمل کر چکا تھا۔ وہ اگلے صفحے پہ لکھا ترجمہ پڑھنے لگا۔

"ایسے ہی لوگ ہیں جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"

احمد نے نظر اٹھا کر سامنے دیوار کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں متانت بھرا تاثر تھا۔

”اس آیت میں نطمعن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نطمعن جو کہ طمان سے نکلا ہے۔اس کا مطلب اطمینان ہوتا ہے۔مگر کوئی سادہ سا اطمینان نہیں بلکہ مکمل اطمینان۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے کہے جا رہا تھا۔”اور یہ آیت نہایت سبق آموز ہے۔جو اللہ کی طرف لوٹتا ہے اسے واقعی اطمینان ملتا ہے۔وہ اگر تنگی کا شکار ہو گا تب بھی وہ یہی سوچے گا کہ اسے یہ تنگی اللہ نے دی ہے۔وہ اس تنگی میں بھی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے گا۔اگر وہ بیماری میں ہو گا تو وہ اس وقت بھی دل سے مطمئن ہو گا کیونکہ وہ جانتا ہو گا کہ اسے یہ بیماری اللہ نے دی ہے۔اسلام اپنے آپ کو اللہ کے آگے جھکانے کے علاوہ آخر ہے ہی کیا؟ اللہ کے ہر احکام کے سامنے اپنے سر کو خم دینا اور اس کے ہر احکام کے اوپر بغیر کسی شکایت کے تسلیم کر لینے کے علاوہ ہے ہی کیا؟“

”اس آیت میں خاص کر نبی کی دعوت کو ماننے والوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اب یہ بات ہمیں ذرا ماضی میں جانے کی تلقین کرتی ہے۔اگر ہم ماضی میں جائیں تو ہمیں سمجھ آئے کہ آخر کیا وجہ تھی جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جو صحابہ اکرام تھے وہ اللہ کے اتنے قریب تھے؟

اگر ہم کچھ دیر سوچیں تو سمجھ آئے، کہ اس وقت تو قرآن بھی پورا نہیں اترا تھا۔حضور ﷺ پہ وحی نازل ہوئی اور سورہ مدثر کی آیت میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ اسلام کا پیغام پہنچانا شروع کریں۔اور تب جو لوگ اسلام کے احاطے میں آئے وہ جیسے ہی کوئی نیا احکام آتا اسے مان لیا کرتے۔ اللہ نے فرمایا جنت ہے، وہ مان گئے۔اللہ نے فرمایا دوزخ ہے وہ مان گئے۔اسی طرح کوئی بھی نیا احکام اترتا وہ لوگ بغیر کسی شکایت کے اس احکام کو مان لیتے۔اور اگر ہم اپنے حال کو دیکھیں تو ہم آخر کہاں کھڑے ہیں؟ ہمارے پاس تو پوری کی پوری کتاب بھی موجود ہے پھر بھی ہم اس پہ عمل کرنے

سے کتراتے ہیں۔اس میں لکھے احکامات کے دلائل تلاش کرتے ہیں۔دعوت حق تو ہم سب کے گھروں میں ہی موجود ہے، مگر پھر بھی ہم اسے نظر انداز کرکے اپنی زندگی گزر بسر کرنے میں لگے ہیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد کی سکون بھری روح سے مہر کی کرب میں جھلستی روح کی طرف واپس آتے ہیں۔وہ اب بھی اپنے دل کا حال اس خط میں بیان کرنے میں مصروف تھی۔

"یہ دل اتنا مرجھا کیوں گیا ہے ماں۔میں سکون کی تلاش میں ہوں ماں۔ میں چاہتی ہوں کہ بس کسی طرح سے اپنے تمام غم بھلا دوں۔ میرا دماغ دھواں دھواں ہو چکا ہے۔وہ ٹھیک سے حرکت نہیں کرتا ماں۔ آخر اس سب کا کیا حل ہے ماں؟ کیا میں ساری زندگی اس بوجھل دل کے ساتھ گزارنے والی ہوں؟ یا کبھی میرے اس دل کو بھی قرار آئے گا؟"

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔جہاں بادل برسے جارہے تھے وہاں مہر کی آنکھیں بھی برسنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

آسمان میں گرجدار آواز کے ساتھ بجلی چمکی، اورمہر کے آنسو کی رسی کھلی اور وہ بغیر آواز کے رونے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"خبر دار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے"

اس آیت کے دوسرے حصے پہ احمد ایک مرتبہ پھر سے غور کرنے لگا۔

"اس آیت کا دوسرا حصہ بہت دلچسپ ہے۔اللہ کی یاد اللہ کا ذکر اگر خلوص سے کیا جائے، اور صرف اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے کیا جائے تو اس سے زیادہ اطمینان بخش بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ انسان سب کچھ بھولنے لگتا ہے۔اس کے سامنے اس رب کی صرف پاک ذات ہوتی ہے جسے وہ پکار رہا ہوتا ہے۔دلوں کا سکون تو واقعی اللہ کی یاد میں ہے اور اس رب کی کتاب القرآن میں ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آنسو اس کی گال کی سمت سے ہوکے اس کاغذ میں جذب ہونے لگے تھے۔کاغذ بھی بھیگنے لگا تھا۔وقفتاً مہر نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے۔

"ماں۔مجھے اپنی زندگی اتنی خالی کیوں لگتی ہے؟ جیسے اس میں کچھ ہے ہی نہیں؟ بے مقصد سی زندگی جس میں کوئی عزم نہیں۔سچ بولوں تو اگر میری عنایا نہ ہوتی تو شاید میں خود کو کب کا ختم کر چکی ہوتی ماں۔مجھے الجھن ہوتی ہے ماں۔اس بے مقصد سی بے ضرر سی زندگی سے۔کیوں آخر میری زندگی اتنی بے معانی ہو گئی ہے؟"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بارش کی رفتار میں کمی آئی تھی۔احمد انجان آس پاس کے ماحول سے اب اگلی آیت کا ترجمہ پڑھنے لگ گیا۔

”پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کیے۔وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لیے اچھا انجام ہے۔“ اس نے ایک دفعہ پھر اپنے مصحف سے نظر اٹھا کر سامنے دیوار کو دیکھا۔

”اس آیت میں جو لفظ ان لوگوں کی خوش نصیبی بیان کر رہا ہے وہ لفظ طوبیٰ کا ہے۔مگر طوبیٰ کا مطلب صرف سادہ سی خوشی نہیں ہوتا۔مگر اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسا جذبہ جس میں انسان کی روح کا کونا کونا پرسکون ہو جائے۔مطلب جذبات سے لبریز خوشی اور مکمل اطمینان۔مطلب یہ ایک بہت زیادہ اونچے درجے کی خوشی کا نام ہے۔یہ کیفیت ان لوگوں پر طاری ہو گی جو کہ نیک اعمال کرتے ہیں۔ اللہ کے دین کو پوری استقامت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔اللہ کے دین اسلام کو ماننا یعنی اللہ کے واحد ہونے کے عقیدے کے ساتھ ساتھ اس کے ہر احکام کو بھی ماننا ہے۔اور ساتھ ساتھ نیک اعمال کرنا۔اب یہی تو انسان کا مقصد ہے بھلا۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنی الجھنوں کو یوں بیاں کر کے مہر کے دل سے بوجھ سرکنے لگا تھا۔وہ آہستہ آہستہ ہلکا پھلکا ہونے لگی تھی۔

”طلاق کے بعد جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ماں۔میں نے نہ جانے حسام کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔اس کے ساتھ ساتھ میں نے ہر تکلیف جھیلی۔میں نے کتنی کوشش کی تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔میں،وہ اور عنایا زندگی بھر ایک ساتھ خوش رہیں۔مگر اس کے جانے کے بعد ماں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ زندگی خالی ہو گئی ہے۔مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے پاس اب کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔میں کہاں

جاؤں ماں؟ میں کیا کروں؟ میں ایک دفعہ پھر سے جینا چاہتی ہوں ماں۔ مگر میں نہیں جانتی کہ میں کیسے جیوں۔"

مہر کے ہاتھ سے اس کا قلم چھوٹا۔وہ اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔ تھمتی ہوئی بارش کے ساتھ ساتھ ہی مہر کے آنسو بھی تھمنے لگے۔وہ اس خط کو ہنوز چھوڑ کے اپنے بستر کی طرف چلی گئی۔

وہ انجان تھی اس بات سے کہ اس کی تمام الجھنوں کا جواب تو اس کی سنگھار میز پر پڑے، تانبے کے ڈبے کے اندر مقید مصحف میں تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اس آسمانی مصحف کے خزانوں کو یوں ہی دریافت کرنے میں لگا تھا۔بارش کی بوندوں کی کھڑکی سے ٹکرار سے پیدا ہوتی آواز میں کمی آئی تھی۔

"صرف طوبیٰ کا جذبہ ہی ان نیک کاروں کو عطا نہیں کیا جائے گا بلکہ ایک اچھا انجام بھی۔اب ایک انسان کی ترجیح کیا ہونی چاہیئے؟ کہ وہ کسی بھی طرح سے دنیا میں ایسے اعمال کرے کہ اس کا رب راضی ہو۔جب رب راضی ہوگا تو اس کا انجام بھی اچھا ہوگا۔اور پھر روزِ حشر اس شخص کو جنت نصیب ہوگی۔یہ تو کتنا اچھا سودا ہے ناں؟ یعنی ہمیں بس اپنے رب کا حکم ماننا ہے۔زندگی میں نیک اعمال کرنے ہیں اور آخر میں ہمیں ایک بہترین سے بھی بہترین انجام ملے گا۔پھر ہم انسان کیوں دوسری چیزوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں؟ کیوں ہم اللہ کے حکم کو ماننے کے علاوہ ہر دوسرا کام کر رہے ہیں؟"

احمد کی آنکھوں میں الجھن ابھری تھی۔اس نے اپنا مصحف بند کیا اور سونے کے لیے بستر پہ لیٹ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد کے مضافات کو اگلے کچھ دن ایسے ہی بادلوں نے گھیرے رکھا۔ وقتاً فوقتاً، بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کا عمل جاری ہوتا تو وہ برس بھی جایا کرتے۔ان دنوں اسلام آباد میں کافی موسلا دھار بارشیں ہوئیں۔

بادلوں کا آسمان پہ راج اپنے زوال کو پہنچا تو سورج نے آسمان کو اپنی شان و شوکت سے نوازا۔ایک دفعہ پھر سے اسلام آباد میں دھوپ کی تپش سے بھرپور دن لوٹ آئے تھے۔

یہ کورٹ کی تاریخ والا دن تھا۔اور اس دن آسمان بادلوں سے پاک تھا۔دھوپ پورے جوش و خروش سے اسلام آباد کے بندے بندے کو پگھلانے میں لگی ہوئی تھا۔مناج اور حسام بھی کورٹ کے صحن میں موجود تھے۔وہ دونوں اس وقت مہر اور اس کے وکیل کے منتظر نظر آرہے تھے۔

"آخر اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے مس مناج؟" حسام شدید اضطراب میں مبتلا تھا۔حسام نے صحت پکڑنا شروع کر لی تھی اور اب اس کا چہرہ بھی بھرا بھرا لگ رہا تھا۔

"اب تو عادت ڈال لیجیے۔یہ پاکستان ہے اور یہ پاکستان کا کورٹ ہے۔یہاں کوئی چیز وقت پر نہیں ہوتی۔" مناج اپنے ازلی مشینی انداز میں بولی۔وہ ہمیشہ کی طرح ایک لاش کی طرح ہی نظر آرہی تھی۔ اس نے سفید کرتی پہ کالا کوٹ پہنا ہوا تھا۔آج اس نے پشمینہ شال کندھے پہ نہیں گرائی ہوئی تھی بس تہہ کر کے اپنے کچھ کاغذات کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔اس وقت حسام کی نظر مناج کے

دائیں ہاتھ پہ گئی۔اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک بڑا سا گول اور کالا نشان تھا۔حسام کچھ متجسس ہونے لگا۔

"یہ جو آپ کے ہاتھ میں نشان ہے، یہ کس چیز کا ہے؟" حسام کو یوں پوچھتے عجیب بھی لگ رہا تھا مگر وہ نشان کوئی اتنا عجیب سا تھا کہ اس سے رہا نہیں گیا۔مناج نے اپنا ہاتھ اٹھا کے دیکھا جیسے یاد کرنا چاہ رہی ہو۔اور پھر اسے یاد آیا۔

"یہ؟" مناج نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔حسام کی نظریں اب بھی اس نشان پہ تھی۔ "میں تیرہ سال کی تھی جب میرے سوتیلے باپ نے مجھے یہاں جلایا تھا، ایک موٹی سی لوہے کی تار سے۔تب سے یہ نشان میرے ساتھ ہے۔"مناج نے اپنے کندھے اچکائے۔وہ بڑے پرسکون سی ہوکے اپنے ماضی کی تکلیف دہ یاد حسام کو بتا رہی تھی۔

حسام نے بے اختیار جھرجھری لی۔کیا ایسا بھی ہوسکتا تھا؟ اس نے سوچا۔حسام نے اپنی نظریں اٹھائیں اور اپنے لب کچھ تسلی بخش کہنے کے لیے کھولے، مگر مناج کا انداز دیکھ کر وہ تھم گیا۔وہ بالکل پر سکون نظر آرہی تھی۔حسام اس وقت قدرے حیران تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر کوئی انسان اتنا جذبات اور احساسات سے عاری کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ غیر آرام دہ تو تھا ہی مگر اس میں تجسس بھی تھا۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر مناج کہ ساتھ ہوا کیا تھا۔

کچھ دیر بعد کورٹ کی کاروائی شروع کرنے کے لیے مناج اور حسام کو کورٹ روم میں بلوایا گیا۔مہر ولید کے ساتھ دیر سے آئی تھی۔عنایا کا کورٹ روم میں کوئی کام نہ تھا اس لیے اسے ملازمہ کے ساتھ صحن میں چھوڑا ہوا تھا۔گارڈین کورٹ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ویسا بالکل نہیں تھا جیسا عام ہائی کورٹ ہوتا

ہے۔کمرہ چھوٹا سا تھا۔کمرے کا فرنیچر بھورا تھا۔کمرے میں ایک بڑی سی ٹیبل تھی جس کے پیچھے جج بیٹھی ہوئی تھیں۔گارڈین کورٹ میں عموماً جج کا عہدہ عورتیں ہی سنبھالتی تھیں۔جج کی ٹیبل کے سامنے دو ٹیبل برابر برابر کچھ فاصلے سے رکھی گئی تھیں۔

ایک طرف استغاثہ (یعنی مقدمہ کورٹ میں دائر کرنے والے جنہیں انگریزی میں prosecution بھی کہا جاتا ہے) اور ایک طرف مدعاعلیہ (یعنی مقدمے کا دفاع کرنے والے جنہیں انگریزی میںdefendant کہا جاتا ہے) بیٹھتے تھے۔کورٹ روم میں کوئی بھی منہ اٹھا کے نہیں آسکتا تھا۔کورٹ کی کاروائی کو بہت رازداری میں کیا جاتا تھا۔گواہان بھی صرف گواہی دیتے اور چلے جاتے۔جج کے ساتھ ان کا اسسٹنٹ موجود ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ ٹائپوگرافر جو کہ کورٹ کی کاروائی کو لکھتا رہتا تھا۔

کورٹ کی کاروائی بالآخر شروع ہو گئی۔جج تمکنات اپنی روایتی تقریر دینے لگیں۔

”استغاثہ اپنا موقف پیش کریں۔“ جج اپنی تقریر مکمل کر کے بولی تھیں۔مناج اپنے چہرے پہ مشینی تاثر لیے کھڑی ہوئی۔ایک ہاتھ میں نوٹ بک پکڑے اور دوسرے میں پین، وہ بالکل تیار لگ رہی تھی۔

”یور آنر! میں معزز عدالت سے درخواست کروں گی کہ میرے موکل کی کہانی کو کسی مرد کی کہانی نہ سمجھا جائے، بلکہ ایک انسان کی کہانی سمجھا جائے۔“ مناج اپنے مشینی انداز میں بولنا شروع ہوئی تھی۔ اُس کے الفاظ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہر جذبے سے پاک تھے۔

"وہ انسان، جو غلطیاں کرتا ہے، وہ انسان جسے غلطیوں کا پتلا بھی کہا جاتا ہے۔اور میرے موکل سے بھی غلطیاں ہوئیں۔سنگین غلطیاں۔میرے موکل کے اوپر پچھلے سال ڈرگ سمگلنگ کا اقدام ثابت ہوا تھا۔جس کے بعد انہیں تین سال کی سزا سنائی گئی۔مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میرے موئکل کو تین ماہ کے اندر ہی اندر رہا کر دیا گیا۔پھر پانچ ماہ انہوں نے لندن میں اپنا علاج کروایا۔کل ملا کے ہوئے آٹھ ماہ۔میرے موکل نے پورے آٹھ ماہ اپنی بیٹی سے دور رہ کے گزارے ہیں۔یہ آٹھ ماہ میرے موکل کے لیے انتہائی کٹھن تھے کیونکہ وہ اپنی بیٹی سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔"

کورٹ روم میں مناج کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز نہیں تھی۔مناج جب خاموش ہوتی، یا وقفہ لیتی تو کچھ لمحے کاٹ دار خاموشی کورٹ روم میں پھیل جاتی۔مناج نے اب بھی ایک وقفہ لیا تھا۔وہ اپنی نوٹ بک کے صفحات پلٹتے نظر آرہی تھی۔

اب وہ بولنا شروع ہوئی۔

"بات صرف اتنی ہے کہ میرے موکل نے جو غلطی کی تھی اس کی سزا انہوں نے سہہ لی ہے۔ایک انسان جو کے ماضی میں کوئی جرم کرتا ہے اور اس جرم پر پکڑا جاتا ہے، تو جب وہ رہا ہوتا ہے تو قانوناً اس کے پاس حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی قانون کے دائرے میں رہ کر جیسے چاہے ویسے گزارے۔ مگر یور آنر یہ ظالم سماج ان مجرموں کو جینے کہاں دیتا ہے؟ کیا ایک سابقہ مجرم جو کہ اپنی سزا کاٹ کر رہا ہوتا ہے اسے یہ حق نہیں کے اسے وہی حقوق دیئے جائیں جو باقی عوام کو ملتے ہیں؟ کیا ایک انسان جو کہ غلطی کرتا ہے، تو کیا اس پر غلطی کی موہر لگانا لازمی ہے؟ میرا عدالت سے آج یہی سوال ہے یور آنر! کہ جب میرے موکل نے اپنی بیٹی سے ملنا چاہا، جبکہ وہ اپنے جرم سے آزاد تھے،ان کو اپنی

بیٹی سے ملنے کیوں نہیں دیا گیا؟" مناج ٹھہری۔ جس طرح سے مناج بولتے جارہی تھی مہر کے تن فن میں بھڑکتی آگ اپنا زور پکڑتے جارہی تھی۔

"مہر بنت عبداللہ سلطان۔" مناج نے آواز بلند کی تو مہر نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ "مہر بنتِ عبداللہ سلطان عنایا کو ڈیزرو نہیں کرتی یور آنر۔ میں یہ دعوہ کرتی ہوں کہ میرے موئکل کا کرمنل ریکارڈ ہونے کے باوجود، اس بچی کے حق میں میرے موئکل کا ساتھ ہی بہتر ہے۔ بھلا کیوں؟" مناج نے ایک چور نظر مہر پر ڈالی جو کہ آگ بگولا سی نظر آرہی تھی۔

"کیونکہ مہر بنت عبداللہ سلطان میرے موکل کے جیل جانے کے بعد عنایا کی پرورش کرنے میں بالکل بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ آپ ذرا پوچھیے گا مدعا علیہ سے کہ آخر طلاق کے بعد ہی عنایا کو کیا مسئلہ ہوا تھا جو کہ اسے ایک سائیکالاجسٹ کے پاس لے کر جانے کی نوبت آ گئی؟ صاف بات ہے، مہر بنت عبداللہ سلطان ایک لا پرواہ ماں ہے جس سے اپنی بچی نہیں سنبھل سکتی۔ جب حسام اور مہر ایک ساتھ تھے ہم تب کا عنایا کا میڈکل ریکارڈ دیکھیں تو ایسے مسئلے اُسے کبھی درپیش نہیں ہوئے۔ مگر یہ بھی نوٹ کیجیے یور آنر! طلاق کے بعد مہر بنتِ عبداللہ سلطان عنایا کو کل ملا کے پندرہ مرتبہ ڈاکٹر کے پاس لے کر جا چکی ہیں۔ تو کیا معزز عدالت ایسی ماں کو ایک معصوم بچی سونپے گی؟ ایسی ماں جو کہ شاید اپنا بھی خیال ٹھیک سے نہ رکھ پا رہی ہو۔" مناج نے بات مکمل کی اور بیٹھ گئی۔ مہر کا موڈ بری طرح سے بگڑ چکا تھا۔ یہ حملہ اس کے لیے بہت ذاتی تھا۔ غصے کے مارے اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

"آپ کو اس سب کیلئے تیار کر کے آیا تھا، پر سکون رہیئے۔" ولید سومرو نے مہر کے کان میں سرگوشی کی۔ مہر گہری گہری سانسیں لیتے اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”مدعا علیہ اپنا موقف پیش کریں۔“ جج تمکنت نے کچھ دیر بعد کہا۔ ولید سومرو کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ بکھری۔ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے وہ کھڑے ہوئے۔

”اور معزز عدالت کو گمراہ کرنا تو جیسے مس مناج کی پرانی عادت ہے۔“ ولید سومرو نے بھی بولنا شروع کیا۔ مناج کا مشینی تاثر ہنوز برقرار رہا۔ اسے ولید کے حملوں سے جیسے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔ ”یہ مظلوم بننے کی تکنیک، اُف یور آنر یہ بہت پرانی ہوگئی ہے۔ اب ظالم جب مظلوم بننے کی اداکاری کرتا ہے تو وہ خود سب سے بڑا بے وقوف واقف ہوتا ہے۔ اور آج استغاثہ نے ثابت کر دیا کہ ان سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں۔ یور آنر یہ کس طرح سے حسام فاروق جیسے درندے کو فرشتہ بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ جب کے حسام فاروق کسی قسم کی ہمدردی کے لائق نہیں۔ حسام فاروق وہ درندہ ہے جو کہ اپنی بیوی کو تشدد کا نشانا بنایا کرتا تھا۔ آئے دن اُسے دھمکیاں دیا کرتا تھا۔“ مہر کی گردن میں گلٹی سی بننے لگی۔ یہ سب غلط تھا۔ بہت غلط۔ مگر وہ ضبط کر کے سب سنتی رہی۔ حسام دوسری طرف مہر کو بے یقینی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ”آپ خود ہی سوچیے یور آنر، ایک پڑھی لکھی، امیر، باوقار لڑکی اپنی زندگی کے پانچ سال ایک ڈرگ ایڈکٹ کے ساتھ کیوں ضائع کرے گی؟ تب ہی جب اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نا چھوڑا گیا ہو۔ بالکل میری موئکل کو حسام فاروق دھمکیاں دیا کرتا تھا، قتل کی دھمکیاں جس کی وجہ سے میری موئکل ڈر گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو حسام جیسے درندے کے سپرد کر کے مرنا تک نہیں چاہتی تھی۔ اگر عنایا کی پیدائش نہ ہوتی تو میری موئکل بھی شاید ان ہی اخباروں والی خواتین جیسی ہوتی جن کے شوہر ان کو مسخ کردیتے ہیں۔ کیا عدالت واقع استغاثہ کے ہاتھوں گمراہ ہوگی یور آنر؟ اور کیا واقعی اس چھوٹی بچی کو حسام فاروق کو سونپ دے گی۔“ ولید سومرو نے اپنی تقریر

مکمل کر کے اپنے دانت سے اپنا نچلا ہونٹ دبایا۔مہر کا سر شرمندگی سے جھک چکا تھا۔ولید سومرو نے اس کی سوچ سے بھی زیادہ حسام کو برا بنا کر پیش کیا تھا۔

”عدالت اب استغاثہ اور مدعا علیہ میں ایک دفعہ صلح کی کوشش کرے گی۔“ جج تمکنت نے اپنی رعبدار آواز میں کہا۔”عدالت اب حسام فاروق سے مخاطب ہے۔آپ بتائیں، آپ عدالت سے کیا چاہتے ہیں۔“

”میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے میری بیٹی سے ملنے سے نہ روکا جائے۔کچھ ہی دیر کے لیے سہی مگر میں جب چاہوں اپنی بیٹی سے مل سکوں۔اس کے ساتھ وقت گزار سکوں۔“ حسام اب بھی مہر کی طرف سے لگنے والے اقدامات کو پراسس نہیں کر پارہا تھا اس لیے قدرے بوجھل سے انداز میں بولا۔

”اب عدالت مہر بنتِ عبداللہ سے مخاطب ہے۔کیا وہ صلح کرنے کے لیے تیار ہیں؟“حسام مہر کو امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔شاید وہ نرم پڑ جائے۔مہر کے چہرے پہ سرد سا تاثر تھا۔

”نہیں یور آنر۔میں صلح نہیں کرنا چاہتی۔“ مہر سپاٹ سے انداز میں بولی۔حسام کے چہرے پہ مایوسی پھر سے چھانے لگی۔

”عدالت کو آنے والے ہفتے میں گواہان کی لسٹ جمع کروائی جائے گی۔استغاثہ اور مدعا علیہ کورٹ کے اگلی سماعت کا انتظار کریں۔حسام فاروق کو اپنی بیٹی سے دو گھنٹے کے لیے ملنے دیا جائے۔“ اور جج تمکنت

ہتھوڑا بجا کر اٹھ گئیں۔وہ اپنی کرسی سے اٹھیں اور کورٹ روم کے پچھلے دروازے سے رخصت ہو ئیں۔حسام نے بے چینی کے عالم میں مناج کے کان میں سر گوشی کی۔

"یہ سب کیا تھا؟ انہوں نے مجھے کیا کچھ نہیں بنا دیا۔" حسام بہت حد تک ڈسٹرب تھا۔مناج پھیکا سا مسکرائی۔

"اور یہ تھی ان کی پہلی بڑی غلطی۔ایک سادے سے کیس کو مزید مشکل بنا دیا۔مائنر کے کیسز میں عدالت ماں کے ساتھ ہوتی ہے۔ان کو بس ہماری طرف سے اٹھائے جانے والے انکشاف کا مقابلہ کرنا چاہئے تھا۔اب انہوں نے اپنی توانائی دو چیزیں کرنے میں لگانی ہو گی۔پہلے ہمارے انکشافات کو غلط ثابت کرنے میں، دوسرا، جو انکشاف انہوں نے اٹھائے، انہیں درست ثابت کرنے میں۔اب تو مجھے جیسے یقین سا ہونے لگا ہے کہ یہ کیس ہمارا ہے۔" مناج کورٹ روم سے باہر نکلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔حسام بھی اب پر سکون ہونے لگا۔وہ واقعی مناج کے موؤدب سے انداز سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے اپنے کیس کے لیے مناج سے بہتر وکیل نہیں مل سکتی تھی۔

وہ دونوں پھر صحن کی جانب چلنے لگے۔کچھ ہی دیر میں حسام کی عنایا سے ملاقات تھی اور حسام سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس طرح دن نے اپنی کشش اختیار کی اسی طرح سے سورج کی تپش میں بھی اضافہ ہونے لگا۔کچھ وقت مزید گزرا تو سورج کا زور ایک مرتبہ پھر سے ٹوٹنے لگا۔یہی تو قدرت کا قانون ہے، ہر اُبھرتی شے ضرور ڈھلتی ہے۔

اسلام آباد پہ شام اترنے لگی تھی۔سورج کے غروب ہونے میں کچھ ہی گھنٹے باقی تھی۔جوں ہی ہمیں ہوا کے گیت پہ رقص کرتے درخت نظر آئیں گے۔شام کے وقت موسم کافی خوشگوار ہونے لگا تھا۔

اب ہم اپنا رخ اس بڑے سے قصر کی جانب موڑتے ہیں۔یہ عبداللہ سلطان کے قصر سے بھی زیادہ اونچا اور دراز تھا۔قصر کی باہری دیواروں پر سفید اور کالا پینٹ کیا ہوا تھا۔قصر کے چاروں اور گھنی سبزہ زار بچھی ہوئی تھی۔سبزہ زار کے بیچ میں سے ایک پتھر کا راستہ نکالا گیا تھا جو کہ اندر کی عمارت تک جاتا تھا۔نیلوفر اس وقت اس قصر میں داخل ہوئی تھی۔اس نے آج ایک آدھی آستین والی سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی ساتھ ہی جینز کی پینٹ بھی۔اسے گھر کے گارڈز نے اندر آنے سے نہیں روکا۔وہ اس پتھریلے راستے پہ چلتے جارہی تھی۔

داخلی دروازے پہ اسے لیڈی اقتدار نظر آئی۔اس کی گردن آج بھی اتنی ہی تنی ہوئی تھی۔اس نے گھٹنوں تک آتا سادہ سا لانگ ڈریس پہنا ہوا تھا۔آنکھوں میں اس کے مغرور سا تاثر تھا۔وہ نیلوفر کو اپنی طرف آتے دیکھتے ہوئے اپنی انگلی پہ لگی انگوٹھی گھمائے جارہی تھی۔نیلوفر اس کے قریب آئی تو اس کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔۔۔مدھم سی مغرور سی مسکراہٹ۔وہ آنکھ سے اشارہ کر کے اندر چل دی۔نیلوفر، اپنی نظروں میں اس کے لیے احترام لیے اندر چلنے لگی۔لیڈی اقتدار اسے اپنے شاندار سے لاؤنج میں لے کر آئی۔نیلوفر کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس لاؤنج میں پہلی دفعہ نہیں آئی تھی۔

کیونکہ لاؤنج اتنا شاندار تھا کہ کوئی پہلی دفعہ آتا تو نظر بھر کے ادھر ادھر کا جائزہ ضرور لیتا مگر نیلوفر کو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ یہاں آتے جاتے رہتی تھی۔لیڈی اقتدار نے ہاتھ سے اشارہ کرکے نیلوفر کو صوفے پہ بیٹھنے کا کہا اور خود مخالف صوفے پہ، کسی ملکہ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس کی گردن اب بھی پوری شان سے اکڑی ہوئی تھی۔

”نیلوفر!“ لیڈی اقتدار اپنی بھاری سی رعب دار آواز میں بولی۔”تم جانتی ہی ہو کہ تمہیں کیوں بلوایا گیا ہے۔“

”ہاں۔مجھے شمس نے بتایا تھا۔لیکن میں ایک دفعہ سب کچھ آپ سے سننا چاہوں گی۔“نیلوفر اپنے انداز میں متانت لیے بولی تھی۔

”تو ٹھیک ہے، میں بتاتی ہوں۔“لیڈی اقتدار نے تکبر آمیز نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔”تم جانتی ہو ہمیں بہت دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں۔میں، اور خاص طور پہ درانی چاہ رہے ہیں کہ اب آگے اس کو روکنے کے لیے کچھ کریں۔“

”اور آگے کیا کرنا چاہتے ہیں آپ سب؟“ نیلوفر نے پوچھا۔

کچھ لمحے سفاک سی خاموشی نے اس کمرے کو گھیر لیا۔

”اسے مار دینا چاہتے ہیں۔پارٹنر شپ اس طرح سے نہیں چلا کرتی نیلوفر۔“لیڈی اقتدار کا انداز سفاک تھا۔نیلوفر سوچ میں پڑ گئی۔

"لیکن، اسے قتل کرنے سے ہمارا مسئلہ ختم نہیں ہوگا۔یہ آپ جانتی ہی ہیں۔" نیلوفر نے خبردار کرنا چاہا۔

"مگر پھر بھی نیلوفر۔کم سے کم یہ دھمکیوں کا سلسلہ رک جائے گا۔اس کے بعد ہم اپنی امانت کسی نہ کسی طرح سے بازیاب کروا ہی لیں گے۔مجھے یقین ہے۔ویسے بھی، اس کے زندہ ہوتے ہوئے وہ ہمیں نہیں ملنے والی۔" لیڈی اقتدار اپنے ازلی رعب دار انداز میں بولے جارہی تھی۔

"پھر ٹھیک ہے۔جیسا آپ سب کو مناسب لگے۔" نیلوفر کی بات سنتے ہی لیڈی اقتدار کے لب "اوہ" میں ڈھل گئے۔اس کے چہرے پہ طنزیہ سی مسکراہٹ بکھری۔

"اس طرح کا جواب تو میں نے مانگا ہی نہیں تھا نیلوفر۔یا تو ہاں یا تو ناں۔اس سب میں تم بھی پوری پوری حصے دار ہو گی نیلوفر۔" لیڈی اقتدار سختی سے کہہ کر تنبیہ کرنے لگیں۔نیلوفر کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھری۔

"تو آپ کو لگتا ہے کہ میں پیچھے سے وار کروں گی؟" نیلوفر تلخ ضرور تھی مگر اس کے انداز میں اب بھی لیڈی اقتدار کے لیے احترام تھا۔

"ہرگز نہیں۔"لیڈی اقتدار کے چہرے پہ چھایا وہ پرسکون سا تاثر ہنوز برقرار رہا۔"ہم سب ایک ٹیم ہیں۔ہمارے بیوی بچے، والدین اور اولادیں بعد میں آتے ہیں۔ہم سب سے پہلے ایک دوسرے کا سوچتے ہیں۔ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔اور میں نہیں چاہتی کہ کبھی بھی ہماری یہ ٹیم ٹوٹے۔ جان لو نیلوفر جب تک ہم سب میں اتحاد ہے،تب تک ہمیں کوئی نہیں توڑ سکتا۔اور جس وقت ہمارے

درمیان ہلکی سی بھی دراڑ آئی، ہم اسی وقت برباد ہو جائیں گے۔اس لیے تم مجھے صاف صاف بتاؤ گی۔ ہاں یا ناں۔اگر تمہارا جواب ناں ہوا تو ہم کچھ اور سوچ سکتے ہیں، مگر یہ کام تمہاری مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔" حتمی انداز میں کہہ کر لیڈی اقتدار صوفے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ لیے وہ نیلوفر کو دیکھ رہی تھی جو گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔یک دم نیلوفر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھرنے لگی۔لیڈی اقتدار نیلوفر کی مسکراہٹ دیکھ کے کچھ الجھی تھی لیکن اس نے اپنی آنکھوں کا سرد تاثر بر قرار رکھا۔

"اور اگر میں اب بھی کہوں، کہ جیسا آپ سب مناسب سمجھیں ویسا ہی کریں۔تو آپ میرے اس جواب کا کیا مطلب لیں گی؟"نیلوفر کا انداز معنی خیز تھا۔

"تو میں اس جواب کو ناں سمجھوں گی۔"لیڈی اقتدار نے سرد نگاہ لیے نیلوفر کو دیکھا۔نیلوفر کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔اس شاندار سے لاؤنج میں بیٹھی، چھوٹی ملکہ نے بڑی ملکہ کو اپنا جواب سنایا۔دونوں کے لب شیطانی مسکراہٹوں میں ڈھل گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ۳:شناخت

میں نے ہر قانون کی پابندی کی

میں ہمیشہ سے اپنی حد میں رہی

میں نے کبھی بھی وہ نہیں مانگا جو میرا نہ تھا

میں نے اپنے وقت کا صبر کے ساتھ انتظار کیا

اور جب وہ وقت آیا،اس نے اس کا نام پکارا

اب میرے اوپر یہ شدت بھری تکلیف حاوی ہے

جو میری رگوں میں دوڑتی ہے

جو میرے دماغ پر سوار ہے

میرے خیالات ایک دائرے میں چکر کاٹ رہے، کسی ریل گاڑی کی طرح

میں ایک مکمل تصویر کی طرح ہو ں جس کا بس فریم ٹوٹا ہوا ہے

اور میں جانتی ہوں اس کا الزام کس کو جاتا ہے

میں نے کبھی اپنے آپ کو برا تصور نہیں کیا تھا

میں ہمیشہ سے سمجھتی تھی کہ میں ہی ملکہ بنوں گی

اور کوئی بیچ میں نہیں آئے گا

کیونکہ اگر مجھے وہ سب نہ ملا (جو میں چاہتی ہوں)

تو میں اندھیرے اور بدی کی ملکہ بن جاؤں گی

میرے کندھے پر اب ایک شیطان ہے

ٹھیک اس ہی جگہ پر جہاں فرشتہ ہوا کرتا تھا

اور وہ مجھے ملکہ پکار رہا ہے

(ڈیسینڈنٹ کی آڈری)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ایک انسان تھا، انسان جس نے غلطیاں کی۔ان غلطیوں کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہا تھا، اور نہ جانے کب تک بھگتنے والا تھا۔۔۔

کورٹ روم کے صحن میں کھڑا حسام، عنایا کا انتظار کرتے کرتے اپنے ماضی میں کی گئی ہر غلطی کو یاد کرنے لگا۔اس کی بے چینی وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتے جا رہی تھی۔آنکھوں میں ترسا ہوا سا تاثر تھا۔بس کسی طرح سے اس کی بیٹی اس کے سامنے آجائے۔۔۔

مناج اس کے عقب میں، بے تاثر سا چہرہ لیے کھڑی تھی۔تب ہی دونوں کی نظر اس پہ پڑی۔ملازمہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، وہ بھرپور مسکرا رہی تھی۔حسام کا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگا۔اسے اپنی آنکھوں پر جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔دل میں جو بھڑکتی آگ تھی وہ ساکن ہونے لگی، آنکھوں میں ٹھنڈ اترنے لگی۔اتنے طویل انتظار کے بعد، آخر کار وہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔کم سے کم دیکھ ہی رہا تھا۔

حیرت بھرے جذبات نے حسام کو گھیر لیا۔اسے اپنی محرومی اس لمحے یاد آئی۔شدت بھرے جذبات نے جوش لیا تو وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گیا۔عنایا کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ فنا ہو جائے گا۔

چھوٹی عنایا بالکل اس کے سامنے تھی۔وہ اپنے باپ کے چہرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ڈیڈ، آپ رو کیوں رہے ہیں؟“ چھوٹی عنایا انداز میں معصومیت لیے بولی۔اور تب ہی حسام کو احساس ہوا کہ ہاں۔۔وہ تو رو رہا تھا۔کچھ چیزوں پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔اور اس وقت حسام کے آنسو تو اس کے اختیار میں بالکل نہ تھے۔

مناج اب بھی حسام کے عقب میں کھڑی تھی۔مگر اب کی بار اس کا چہرہ بے تاثر نہ تھا۔اس کے چہرے پر بے چینی تھی۔اس کی آنکھوں میں شدت بھری تکلیف تھی۔ایک دفعہ پھر اسے حسام میں وہ نظر آیا۔۔اس کا باپ۔اور ایک دفعہ پھر اسے حسام کے لیے شدت سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔کورٹ کے صحن کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے فنا ہونے لگا۔۔اس کا جسم ہی اب کورٹ کے صحن میں موجود تھا۔در حقیقت تو وہ ماضی میں کھو گئی تھی۔۔۔ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں۔۔۔

ماضی کے اس کرب ناک منظر میں وہ دس سال کی تھی۔وہ ہسپتال کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑی تھی۔اس کے سامنے بستر پہ پڑا، اس کے باپ کا بے ہوش وجود تھا۔بستر کے عقب میں ہی ایک مانیٹر لگا ہوا تھا جس میں کچھ لکیریں اس کے باپ کی نبض کے بارے میں آگاہ کرتی تھی۔مشین سے باریک سی آواز وقفے وقفے سے جاری ہوتی تھی۔بستر کی دوسری طرف دو نرس بھی موجود تھیں، جو چہرے پہ افسوس لیے اس اداس منظر کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔دس سالہ مناج بلکتے ہوئے رو رہی تھی۔

"ابو نہ جائیں!" بلکتی ہوئی بچی کے الفاظ اٹک اٹک کے ادا ہوتے تھے۔وہ گہرے رنج میں تھی۔دل میں ایک خوف بھی سوار تھا، کہ کہیں اس کا باپ اسے چھوڑ کے نہ چلا جائے۔کہیں وہ اس دنیا میں اکیلی نہ رہ جائے۔کہیں اسے باقی کی زندگی اپنے باپ کی شفقت سے محروم رہ کے نہ گزارنی پڑے۔

"ابو نہ جائیں!" وہ ایک دفعہ پھر کہہ اٹھی۔آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے محبت لیے اس نے ان کے کمزور چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا

وقعتاً بے ہوش جسم تڑپنے لگا۔دس سالہ مناج کے چہرے پہ خوف اترنے لگا۔ سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔الوداع کہنے کا وقت ہوا جاتا تھا۔او ر اپنوں سے یوں الوداع کہنا بھلا کہاں آسان ہوتا ہے؟

"ابو آپ نہیں جا سکتے!" وہ اونچا سا بولی تھی۔وہ اتنی جلدی اپنے باپ سے بچھڑنا نہیں چاہتی تھی۔لیکن بھلا موت نے کون سا اس کی سن لینی تھی؟ موت بر حق ہے۔وہ نہ کسی بندے کا ماضی دیکھتی ہے نہ حال، جب وقت ہوتا ہے تو وہ جکڑ لیتی ہے۔اور مناج کے ابو کو بھی موت کے اس سنگین وار سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔خود مناج بھی نہیں۔

تڑپتے ہوئے جسم نے ہچکی لی۔ایک سانس اس نے باہر نکالی۔ جسم نے حرکت کرنا بند کی اور چہرا ساکن ہونے لگا۔بالکل پر سکون۔ مشین سے اب ایک باریک آواز مسلسل رواں تھی۔ مناج آنکھوں میں بے یقینی لیے اس برفیلے وجود کو دیکھنے لگی۔

"ابو، آپ نہیں جا سکتے۔۔۔ابو، آپ نہیں جا سکتے۔۔۔ابو آپ نہیں جا سکتے۔"

وہ پکارے جا رہی تھی۔ مگر روح اس سفر پہ روانہ ہو چکی تھی۔ اس سفر پہ جس میں؛ کسی کی پکار کا، کسی کی آہ کا اس پہ کوئی اثر نہ ہونا تھا۔۔۔

"ابو آپ نہیں جا سکتے۔" کورٹ کے صحن میں موجود مناج کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ آواز اس قدر مدھم تھی کہ کسی کو سنائی نہ دی۔ ایک جھٹکا کھا کر وہ دوبارہ سے حال میں لوٹی۔ دماغ سے وہ منظر تحلیل ہونے لگا۔ وہ مزید مضطرب ہونے لگی۔ اس کیس نے مناج میں کچھ بدل دیا تھا۔ اس کیس کی وجہ سے اس کے مردہ جذبات نے آخرکار جوش لے ہی لیا تھا اور مناج کو یہ بات اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ اسے اپنے ان مردہ جذبات کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ اب ان کی واپسی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ مناج کا تنفس پھولنے لگا تھا۔ اسے اپنا دم گھٹتے محسوس ہوا۔

اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔ آنکھوں میں بے یقینی لیے وہ حسام کو دیکھ رہی تھی جو کہ عنایا سے باتیں کرتا نظر آ رہا تھا۔

"نہیں!" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ آواز میں خوف تھا۔

تیز قدم بڑھاتے ہوئے وہ کورٹ سے باہر نکلی۔ اپنی گاڑی میں سوار ہو کے وہ وہاں سے نکل گئی۔ وہ اب ایک سیکنڈ بھی وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ تنے ہوئے اعصاب لے کر اپنے گھر لوٹی تھی۔ وہ سیدھا اپنے کمرے کی جانب گئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ اس نے زور سے بند کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شدید آگ بگولا تھی۔۔۔ وہ بھی خود سے۔ کمرے کی

فضا میں سگریٹ کی کڑوی مہک معدوم تھی۔ مناج اپنے سنگھار میز کی جانب گئی۔ آنکھوں میں آگ لیے وہ اپنے عکس کو دیکھنے لگی۔ اس کی سانسیں اب بھی بے ترتیب تھیں۔ اس کا وجود ان لوٹتے جذبات اور احساسات کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

"تم۔" مناج نے شہادت کی انگلی اپنے عکس کی طرف اٹھائی۔ "تم مر چکی ہو۔" وہ چبا چبا کے بولی تھی۔ وہ جیسے اپنے وجود کو یاد دلانا چاہ رہی تھی کہ وہ مر چکی ہے اور اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔۔۔

"تم مردہ ہو۔ ایک لاش ہو۔ تم اس دن ہی مر گئی تھی، جس دن تمہاری ماں نے اپنی جان لی تھی۔ یاد رکھو مناج۔ تم مردہ ہو۔" چبا چبا کے وہ کہے جا رہی تھی۔ آواز میں تکلیف کے ساتھ محرومی بھی جھلکتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ سر میں ٹیسیں ابھرنے لگیں۔ اس کا دماغ دھندلانے لگا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ اس نے اپنے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ آنکھیں بند کرکے وہ منہ کھولنے لگی۔ وہ جیسے زور سے چلانا چاہتی تھی۔ وہ چلا کے اپنے غبار کو نکالنا چاہتی تھی۔

یکدم اس نے ایک جھٹکا لیا۔ بالوں کو جکڑتا ہاتھ تھمنے لگا۔ اس نے اپنے بالوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ گردن اٹھا کے ایک مرتبہ پھر سے اس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں ایک لگن سی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ ان ابھرتے جذبات کو کیسے قابو کر سکتی تھی۔ وہ وہی کرنے والی تھی جو وہ پہلے کئی مرتبہ کر چکی تھی۔ مناج نے ایک گہری سانس لی۔ گہری، سرد سانس۔۔۔

اس نے اپنی آستینوں کو موڑنا شروع کیا۔اس کا پورا بازو نمایاں تھا۔سنگھار میز کی دراز کو کھنگالتے ہوئے اس نے اپنی سگریٹ نکالی۔لائٹر سے اس نے سگریٹ کے کونے کو جلایا۔سگریٹ دہک اٹھی، اور کڑوی مہک سماعت میں چھوڑ گئی۔لیکن اس نے سگریٹ کو لبوں سے لگا کے کش تو نہیں بھرا۔۔۔نہ جانے کیوں؟

وہ سگریٹ کو اپنی نظروں کے سامنے رکھ کے دیکھنے لگی۔شعلہ باز نگاہیں سگریٹ کے اوپر منجمد تھیں۔

"تم اسی کی حقدار ہو۔" آنکھوں میں عزم لیے، اس نے خود کلامی کی۔اور اس نے سگریٹ کے دہکتے کونے کو اپنے بازو پہ لگایا۔وہ اس کونے کو اپنے بازو پہ کسنے لگی۔بازو پہ مرچیں لگنے لگیں۔تکلیف کی شدت میں اضافہ ہوا،اس نے اپنی روح کے اندر اس تکلیف کو سمایا،روح کا گوشہ گوشہ تکلیف میں بلک رہا تھا۔وہ اس تکلیف سے اپنے ان خیالات سے آزادی چاہتی تھی۔۔۔وہ اس تکلیف سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی!

اور وہ یہی کرتی تھی۔ہمیشہ سے یہی کرتے آرہی تھی۔وہ اپنا احترام نہیں کرتی تھی۔وہ اپنے وجود سے محبت نہیں کرتی تھی۔وہ خود کی نظروں میں معتبر نہیں تھی۔

مناج کو ایک سفر پہ نکلنا تھا۔خود کی تلاش کا سفر، خود کی دریافت کا سفر۔۔۔

مناج نے مناج کو تلاش کرنا تھا۔مناج نے مناج کو فتح کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کی فجر قضا ہوئی تو سورج اپنے جلوہ افروز کے ساتھ طلوع ہونے لگا۔آسمان پہ ہلکے پھلکے بادلوں کا بسیرا تھا جس کے باعث صبح کا موسم کافی خوشگوار سا تھا۔اس خوشگواریت بھری صبح کا فائدہ اٹھاتے، بہت سے لوگ پارک وغیرہ میں چہل قدمی کرتے، جاگنگ کرتے نظر آرہے تھے۔کچھ امراء اپنے کتوں کو بھی ٹہلانے میں مصروف تھے۔

مگر یہ خوشگوار صبح ہر کسی کی زندگی میں خوشگواریت نہیں بخش رہی تھی، مہر کی زندگی میں تو بالکل بھی نہیں۔۔۔!

سورج کے طلوع ہونے کی دیر تھی کہ عبداللہ سلطان کے قصر پہ افرا تفری پھیلنے لگی۔

دوسری منزل کے لاؤنج میں عنایا سربراہی صوفے کے ساتھ کھڑی تھی۔مہر اس سے کچھ فاصلے پہ کھڑی تھی اور کافی پریشان سی نظر آرہی تھی۔نیلوفر لاؤنج کے داخلی دروازے پہ کھڑے،خاموشی سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

عنایا کا چہرہ تلملا رہا تھا۔وہ شدید آگ بگولا سی نظر آتی تھی۔مہر کے چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر تھا۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں عنایا۔" مہر نے نرم انداز اختیار کر کے عنایا کے ابلتے غصے کو قابو کرنا چاہا۔

"آپ نے مجھے ڈیڈ سے کیو ں نہیں ملنے دیا، مام!" عنایا حلق کے بل چلائی۔ مہر کے دل میں چبھن سی ابھرنے لگی تھی۔عنایا کے اینگر ایشوز واپس آرہے تھے، اور وہ اس سب کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھی۔

"عنایا میری جان۔" مہر نے ایک قدم آگے بڑھایا۔وہ اس کی بیٹی تھی، کسی نہ کسی طرح سے تو اسے قابو کرنا ہی تھا۔"اسکول کا وقت ہے، تیار ہو جائیں۔" جبراً مسکراتے ہوئے مہر بولی تھی۔لیکن عنایا کے اوپر مہر کے نرم انداز کا کوئی اثر نہ ہوا۔اس کا غصہ اور بھی زیادہ شدید ہونے لگا۔غصے کے اس سنگین آغوش میں ڈوبی عنایا نے اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھائے اور ان کی مٹھی بنائی۔اب اس کا وجود غصے کے مارے باقاعدہ لرز رہا تھا۔اس نے سائڈ ٹیبل پہ پڑا گلدان اٹھایا اور پوری قوت سے زمین پہ دے مارا۔ گلدان زور دار آواز کے ساتھ زمین پہ گرا اور کرچی کرچی ہو گیا۔اپنا غصہ اس طرح سے نکال کے اب اس کی سانسوں کو ترتیب ملنے لگی۔چہرے پر سے سرخی زائل ہونے لگی۔

مہر حواس باختہ سی ہو کے عنایا کی طرف دوڑی۔اس کے ننگے پیر گلدان کے نوکیلے ٹکروں سے ٹکرائے۔پاؤں میں تکلیف ابھرنے لگی، لیکن وہ ہر تکلیف برداشت کر کے عنایا کا معائنہ کرنے لگی۔جب اس نے تسلی کر لی کہ عنایا کو کوئی چوٹ نہیں لگی تو اس نے ایک سکون کی سانس باہر نکالی۔

"نادیہ، عنایا کو کمرے میں لے کر جائیں۔" مہر نے بلند آواز میں کہا۔آواز میں تکلیف اور تھکان تھی۔ ملازمہ اس کی طرف آئی اور عنایا کا ہاتھ تھام کر اسے لے گئی۔مہر اپنے خون آلودہ پاؤں کو لیے صوفے پہ ڈھیر ہو گئی۔اس کی توانائی ختم ہونے لگی تھی۔

"فکر نہ کرو، میں فرسٹ ایڈ لے کر آتی ہوں۔" نیلوفر مصروف انداز میں کہتے ہوئے لاؤنج سے باہر گئی اور کچھ دیر بعد فرسٹ ایڈ کے ساتھ واپس آئی۔وہ مہر کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ کے اس کے پاؤں پہ پٹی کرنے لگی۔کانچ کے پُرزے اس نے مہر کے پاؤں سے نکالے تو اس نے تکلیف دہ سسکی لی۔

”مجھے یقین ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نیلوفر نے پٹی کرتے ہوئے مہر سے کہا جو کہ اس وقت گہرے صدمے میں لگتی تھی۔

”عنایا کے اینگر ایشوز ٹرگر ہونے لگے ہیں۔“ مہر نے ایسے کہا جیسے وہ ہار ماننے لگی تھی۔”سب کتنا اچھا چل رہا تھا، لیکن پھر وہ آگیا۔“ مہر کی آنکھوں میں بے بسی اترنے لگی۔”وہ آخر کیوں آگیا نیلوفر؟“ نیلوفر نے نظریں جھکا لیں۔اس کا پٹی کرتا ہاتھ کچھ لمحے کے لیے تھم گیا۔سر جھٹکتے نیلوفر نے بات جاری رکھی۔

”فی الحال، تم عنایا کا اپوائنمنٹ لو مہر۔اینگر ایشوز کو شدت اختیار کرنے سے پہلے روک لو۔“نیلوفر نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔مہر نے کچھ سوچتے ہوے سر اثبات میں ہلایا۔اب اس کے پاس بس یہی راستہ بچا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ دو منزلہ کلینک ایک بہت ہی خوبصورت سے علاقے میں واقع تھا۔علاقہ غیر آباد سا تھا اور آس پاس گھنے سبزہ زار موجود تھے۔اس علاقے کی آب و ہوا بھی کافی تازہ دم تھی۔

ہم اس خوبصورت سے کلینک کی دوسری منزل میں بنے اس کمرے کا رخ کرتے ہیں، جس میں وہ شیشے کی دیوار کے پار کا منظر دیکھے جا رہی تھی۔شیشے کی دیوار کے پار کا منظر تھا بھی بہت خوبصورت۔ اس منظر کے اس پار خوبصورت اور گھنے سبزہ زار نظر آتے تھے اور دور ہی واقع پہاڑیاں بھی۔اس کی آنکھوں پہ موٹا چشمہ تھا۔چیک والی شرٹ کے نیچے اس نے جینز کی اسکرٹ پہنی تھی۔بالوں کو سلیقے

سے پونی میں باندھا تھا۔سورج کی روشنی اس شیشے کی دیوار سے چھنتے ہوئے اندر داخل ہوتی تھی۔اس کمرے میں اس کی ایک ڈیسک تھی جو کہ بہت نفاست سے سیٹ کر رکھی تھی۔ایک دیوار کے ساتھ کالا سا نرم صوفہ بھی رکھا گیا تھا۔کچھ لمحے، باہم اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے، وہ اس منظر کو تکتی رہی۔ڈیسک پہ موجود موبائل پہ رنگ ہوئی تو خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔اس نے نظر اٹھا کے ڈیسک پہ دیکھا۔مہر کالنگ۔چہرے کو مدھم سی مسکراہٹ میں ڈھالے اس نے وہ کال اٹھائی۔

”کیا حال ہے مہر۔کیسے کال کی تم نے؟“انداز نہایت خوشگوار تھا۔

”ڈاکٹر درِ فشاں،میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔“ مہر درِ فشاں کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی۔درِّ فشاں کی وہ مختصر سی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

”پر سکون ہو جاؤ مہر۔اور بتاؤ،کیا ہوا ہے؟“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی، تاکہ مہر تھوڑی پر سکون ہو جائے۔

”درِّ فشاں مجھے عنایا میں آج دوبارہ اینگر ایشوز نظر آئے۔وہ غصے سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے اپنے غصے سے

مجبور ہو کے گلدان بھی اٹھا کے پھینک دیا۔“مہر اسے پریشانی کے عالم میں سب بتاتے گئ اور درے غور سے سنتے گئی۔اب کی بار در فشاں کے چہرے پہ تشویش بکھری۔

”ٹھیک ہے۔تم نے کوئی سخت ردِ عمل تو نہیں دیا ناں؟“ درے نے بھنویں سکیڑ کے پوچھا۔

”نہیں۔میں نے کچھ بھی سخت نہیں کیا۔“ مہر جواباً بولی۔درے نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔مہر! ہمیں عنایا کے بدلتے رویے کو، فوراً سے جانچنا ہو گا۔ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ آخر ایسا کیا ہوا جو اس کے اینگر ایشوز یوں ٹرگر ہو گئے۔“ درے کچھ سوچتے سمجھتے اسپاٹ انداز میں بولی۔

”در اصل میں جانتی ہوں یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔“ مہر جیسے پوری بات بتاتے بتاتے رک گئی۔

”ہاں، تو پھر مجھے بھی بتاؤ۔“

”میرا ایکس واپس آ گیا ہے۔کل کورٹ میں ہیرنگ تھی جس میں مجھے عنایا کو اس سے ملنے دینا پڑا۔“ مہر تھکے ہوئے انداز میں سب بتانے لگی تھی۔اور ایک جھٹکے میں جیسے درفشاں کو سب سمجھ آنے لگا۔ اس طرح کے کیسز وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی، درے کے دماغ میں تصویر بن چکی تھی۔

”اور تم اپنے ایکس سے عنایا کو ملنے نہیں دے سکتی۔۔۔ صحیح؟“ درے نے بہت محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے اندازوں کی تصدیق کرنی چاہی۔

”جی بالکل۔میں کل بھی نہ ملواتی مگر کورٹ کی طرف سے آرڈر تھا۔“ درے نے آنکھیں اوپر نیچے ہلائی۔وہ آگے کی ترکیب سوچنے لگی تھی۔

”تم عنایا کو کل چھے بجے لے آؤ۔ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔“درے کے کہتے ہی مہر نے ایک پر سکون سی سانس خارج کی۔درے کا بس اتنا ہی کہنا اس کے لیے کافی تھا۔

”آپ کا بہت شکریہ درے۔آپ واقعی میری لائف سیور ہے۔“ درے اس بات پر بھرپور مسکرادی۔

”نہیں نہیں اب ایسا بھی نہیں۔“ چہرے پہ خوشگوار تاثر لیے وہ بولی تھی۔”ویسے بھی مہینے ہو گئے، میں نے چھوٹی عنایا کے ساتھ لڈو نہیں کھیلا۔“ مسرت سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔

وہ درِّ فشاں تھی، اسے اسی طرح سے لوگوں کے مسئلے حل کرنا اچھا لگتا تھا۔ان کی زہر بھری زندگیوں میں شہد گھولنا اسے اچھا لگتا تھا۔اس کی خود کی زندگی میں خالی پن سا تھا، اور دوسروں کی زندگیوں کو مکمل کر کے اسے اپنی زندگی بھری بھری محسوس ہوتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

یہ اگلے دن کی صبح کا منظر ہے۔اپنے کمرے میں مناج بے خبر سی سو رہی تھی۔کمرے میں پردے گرائے ہوئے تھے جو کہ سورج کی روشنی کا راستہ روکے ہوئے تھے۔وفعتاً الارم کلاک کی آواز کمرے میں گونجی تو مناج کی آنکھ کھلی۔

غیر حاضر طور پہ اس نے اپنا ہاتھ سائڈ ٹیبل پہ مارا۔موبائل ہاتھ سے ٹکرایا تو اس نے موبائل اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔صبح کے نو بج رہے تھے۔مناج اپنی آنکھوں کو موندتے اٹھ کے بیٹھی۔بازو پہ اب بھی مرچیں سی لگتی تھی۔مگر اپنے آپ کو یوں تکلیف دینے کا اس بار کوئی فائدہ نہ ہوا۔وہ اب بھی بے چین تھی۔کورٹ کے صحن کا وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار لہرارہا تھا۔وہ چاہ کر بھی اس سب کو نہیں بھلا پا رہی تھی۔

گہری سانسیں لے کر اس نے ایک دفعہ پھر سے سب کچھ بھلانے کی ناکام کوشش کی۔اس کا دماغ اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کر پارہا تھا کہ وہ بھی اداس ہوسکتی تھی۔وہ بھی کسی کے لیے ہمدردی محسوس کرتی تھی۔وہ بس کسی بھی انسان سے لو لگانا نہیں چاہتی تھی۔

تھک ہار کے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ حسام کا کیس آگے نہیں لے گی۔وہ فوراً ہی اسے انکار کر دے گی اور کوئی دوسرا وکیل ریفر کر دے گی۔اس وقت مناج کو یہ کرنا بہت آسان لگا۔

اگلے لمحے مناج اپنے موبائل پہ حسام کا نمبر ملاتی نظر آرہی تھی۔حسام نے کال اٹھائی تو وہ بولی:

"حسام صاحب میں نے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" انداز مشینی تھا۔اس فعہ بھی اس نے کوئی سلام دعا، کوئی ابتدائی کلمات نہیں کہے۔سیدھا مدعے پہ آگئی تھی۔ حسام اپنے اپارٹمنٹ میں بیٹھاناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔

"جی مس مناج! میں نے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔اس دن آپ اچانک سے ہی چلے گئیں۔" حسام کا انداز تشکر آمیز تھا۔مناج کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔کچھ لمحے پہلے جو کام بہت آسان لگ رہا تھا وہ اب مناج کو دنیا کا مشکل ترین کام لگنے لگا۔

"آج اتنے مہینوں بعد میری اس بے چینی کو راحت آئی۔اور مجھے امید ہے آپ اس کیس کو آگے بھی سنبھال لیں گی۔امی نے درست کہا تھا، کہ آپ بہت بھروسہ مند وکیل ہیں۔"مناج پتھر کے مجسمے کی طرح حسام کی بات سن رہی تھی۔اس کے الفاظ جیسے اچانک دب سے گئے۔وہ حسام کو انکار کر دینا چاہتی تھی مگر اس سے الفاظ ادا ہی نہ ہوئے۔اسے بے اختیار اپنے باپ کی یاد آئی۔وہ دونوں بھی ایک وقت میں الگ ہوئے تھے۔اور اگر کوئی اور وکیل اس کیس کو لے گا، تو کیا وہ اس کیس کو اتنی ہی سنجیدگی سے لے گا جتنا وہ لیگی؟ مناج نے سوچا۔

"جی آپ بتایئے کیا بات کرنی تھی آپ کو؟" حسام نے منہ میں ٹوسٹ کا ٹکڑا رکھتے ہوئے پوچھا۔ مناج نے ایک گہری سانس لی۔ اسے ایک دفعہ پھر اپنے آپ پہ غصہ آنے لگا۔ وہ آخر انکار کیوں نہیں کر پا رہی تھی؟ اس نے سوچا۔

"میں کہہ رہی تھی کہ۔" ایک سانس اندر کھینچی۔ اور ایک باہر۔ ارادہ کیا کہ اب انکار کر کے ہی دم لے گی۔

"ہم آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کر لیتے ہیں۔" مگر وہ ناکام تھی۔ وہ انکار نہ کر سکی۔ اس کے منہ سے بس یوں ہی نکل گیا۔ مناج نے بے بسی کے مارے آنکھیں میچ لیں۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہی اس صورت میں بہتر ہوگا۔ وہ آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کروا کے حسام کو عنایا سے ملوا دے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کیس سے دستبردار ہو جائے گی۔ اب کی بار مناج کو یہ کرنا زیادہ آسان لگا۔

حسام کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ چہرے پہ بے یقینی چھا گئی۔ اس نے تیزی سے ٹوسٹ کا ٹکڑا حلق میں اتارا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے؟" حسام کے انداز میں حیرت عیاں تھی۔ دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

"جی بالکل۔ میں مہر سے بات کرنے کی کوشش کروں گی۔ اسے آپ کے ساتھ ایک ٹیبل پہ بیٹھنے کے لیے راضی کروں گی۔ ہم کوئی درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" مناج نے اپنا انداز جتنا ہو سکتا تھا اتنا مشینی بنایا۔ حسام اس لمحے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

"مس مناج۔اگر یہ ہو جائے تو۔۔۔" حسام اپنے خوشی دباتے کہہ رہا تھا۔دل میں امید کی کرنیں ابھرنے لگی تھیں۔"تو کتنا ہی اچھا ہو جائے گا۔" آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

عام گفتگو کے بعد کال کٹ گئی۔مناج نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔وہ اپنے آپ سے کافی خفا تھی۔

اب کسی نہ کسی طرح سے اسے مہر کو حسام کے ساتھ ایک ٹیبل پہ بیٹھنے کے لیے راضی کرنا تھا۔یہ کام آسان نہ تھا، مگر مناج نے اس وقت ٹھان لیا تھا کہ وہ یہ کر کے ہی دم لے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چڑھتا سورج اپنے زوال کو پہنچ چکا تھا۔دن کا اجالا بھی ڈھل چکا تھا اور اب رات کا اندھیرا اسلام آباد کے آسمان پہ غالب تھا۔باریک سا ہلال بھی آسمان پہ نظر آتا تھا۔اس اندھیری رات میں عبداللہ سلطان کا قصر اپنے منظر پہ لگی بتیوں کے باعث بھرپور چمک رہا تھا۔دن کے مقابلے، قصر زیادہ خوبصورت اور پر تعیش نظر آرہا تھا۔

قصر کی دوسری منزل کے لاؤنج میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔خاموشی کے ساتھ ساتھ اداسی بھی ماحول میں گھلی ہوئی تھی۔مہر سربراہی صوفے پہ براجمان،عنایا کو اداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جو کہ زمین پہ کلرز پھیلائے کلرنگ کرنے میں مصروف تھی۔مہر کے پاؤں پہ پٹی ہنوز بندھی ہوئی تھی۔

"عنایا۔کیا آپ اب بھی اپنی مام سے ناراض ہیں؟" کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہی تھی۔اور اس وقت مہر نے پہل کرنے کی کوشش کی۔

یک دم عنایا کا کلرنگ کرتا ہاتھ تھم گیا۔چہرہ ایک بار پھر سے شدت بھرے غصے کی وجہ سے سرخ پڑنے لگا۔عنایا نے اپنے ہاتھوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔اپنی بچی کا یوں بگڑتا حال دیکھ کے مہر کا دل مزید ڈوبنے لگا۔

"آپ۔۔مجھ۔۔۔سے بات۔۔۔نہ کریں مام!" عنایا نے ہر ایک الفاظ چبا چبا کے ادا کیا۔مہر کے دل پہ پھندا سا لگ گیا۔

حسام کے جانے کے بعد بھی عنایا میں اینگر ایشوز نظر آئے تھے۔وہ وقت بھی مہر کے لیے بہت مشکل تھا۔اینگر ایشوز نے جہاں عنایا کی ذہنی صحت کو متاثر کیا تھا وہاں مہر بھی ان کے ساتھ بری طرح سے رل گئی تھی۔وہ اس لمحے اس وقت کو یاد کر رہی تھی۔دل میں طرح طرح کے خوف سمائے ہوئے تھے۔

"آپ کب تک اپنی مام سے ناراض رہیں گی؟ دیکھیں مام کا پاؤں بھی کتنا زخمی ہو گیا ہے۔" مہر کی آواز بھیگی

ہوئی تھی۔اس لمحے وہ سختی اختیار بالکل نہیں کر سکتی تھی۔اکثر بچوں میں جب والدین کو اس طرح کی چیزیں نظر آتی ہیں تو وہ بہت سخت ہو جاتے ہیں۔جو کہ غلط ہے۔اس طرح کے بچے عام بچوں سے قدرے حساس ہوتے ہیں اس لیے ان کو نرمی سے قائل کرنا چاہئے۔زیادہ سختی ان کی ذہنی صحت کو اور بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

عنایا نے مڑ کے مہر کے پاؤں کو دیکھا۔اس کے پاؤں پہ پٹی دیکھ کے عنایا کا دل میں کچھ ہونے لگا۔وہ اپنے کلرز چھوڑ کے کھڑی ہوئی اور مہر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔اب وہ بالکل مہر کے صوفے کے برابر میں کھڑی تھی۔چہرے پہ چھایا غصہ اب زائل ہو چکا تھا۔عنایا اپنے گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ گئی اور مہر کی گود میں سر رکھ کے رونے لگی۔مہر کو بے اختیار اپنی ماں یاد آئی۔وہ بھی بالکل اسی طرح سے، ان کی گود میں سر رکھ کے رویا کرتی تھی۔

"آپ مجھے ڈیڈ سے ملنے نہیں دیتی۔میں کیا کروں۔" آواز میں بے بسی لیے، وہ رو رو کے شکایت کر رہی تھی۔مگر اب وہ چلا نہیں رہی تھی۔وہ اب نرم پڑ گئی تھی۔مہر کو اس لمحے افسوس ہونے لگا۔اسے اپنی بچی پہ ترس بھی آرہا تھا۔مگر اپنی جگہ وہ بھی مجبور تھی۔

"آپ کے ڈیڈ ایک اچھے انسان نہیں ہیں۔اور مام آپ کو صرف بچا رہی ہیں۔" مہر نے عنایا کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔بالوں کو یوں شفقت سے سہلانا بھی اس نے اپنی ماں سے سیکھا تھا۔چھوٹی عنایا گود میں سر رکھے ہوئے ہی سر نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں۔آپ غلط سمجھتی ہیں، ڈیڈ برے نہیں ہیں۔" عنایا کی آواز میں گلہ تھا۔مہر کا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔کیا وہ اپنی بچی کے ساتھ ظلم کر رہی تھی؟ کیا واقعی وہ اس وقت انا پرست ہو کے سوچ رہی تھی؟ مہر اپنے افعال کے اوپر نظر ڈالتے ہوئے یہی سوچے جا رہی تھی۔

"اچھا بس اب سو جاتے ہیں۔" مہر نے دانستہ طور پہ موضوع بدلنا چاہا۔"اور ویسے بھی کل ہم ڈاکٹر درِ فشاں کے پاس بھی جائیں گے۔" مہر نے نرمی سے کہا تو عنایا نے اپنا سر مہر کی گود سے جدا کیا۔اس نے نظر اٹھا کے مہر کو دیکھا۔نظروں میں جوش و خروش بھرا ہوا تھا۔

"کل ہم ڈاکٹر درِّ فشاں کے پاس جا رہے ہیں؟" چھوٹی عنایا، اچانک سے ڈاکٹر در فشاں کا سن کے بہت خوش ہو گئی تھی۔وہ اونچی آواز میں کھکھلانے لگی تھی۔اتنے مشکل دن کے اختتام میں عنایا کو یوں ہنستا مسکراتا دیکھ کے مہر کے دل کو قرار آنے لگا۔اس کے پورے دن کی تھکان اس لمحے اس کے وجود سے سرکنے لگی۔

مہر عنایا کو سلانے لے گئی۔عنایا کو سلا کے وہ موبائل پہ لگ گئی۔موبائل استعمال کرنے کے دوران اسے ایک انجان نمبر سے کال آئی۔آنکھوں میں سوال لیے وہ اپنے بستر سے اٹھی اور کال اٹھائی۔ کمرے سے باہر جانے کے لیے اس نے اپنے قدم بڑھائے۔

"ہیلو مہر۔آپ کیسی ہیں؟"مہر کچھ الجھ گئی۔ یہ آواز جانی پہچانی تھی۔جوں ہی اسے یاد آیا۔اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی۔۔۔یہ آواز تو۔۔۔

مہر نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کی اور کمرے سے باہر نکلی۔اس کے ماتھے پہ ڈھیروں بل تھے۔ آنکھوں میں تپش تھی۔

"حسام کی وکیل؟ آپ کو میرا نمبر کیسے ملا؟"کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ بولی۔اس نے اس وقت اپنا غصہ دبانے کی ناکام کوشش کی۔اسے اب بھی، کورٹ روم میں، اپنے لیے کہے جانے والے حسین و جمیل الفاظ یاد تھے۔

"آپ کب فارغ ہوں گی؟ میں کب ملنے آؤں آپ سے۔" مہر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مشینی سے انداز میں بولی تھی۔انداز میں لاپرواہی سی جھلکتی تھی۔مہر کو مزید تپ چڑھنے لگی۔

"میں آخر آپ سے کیوں ملوں؟ اس کے بعد جو کورٹ میں آپ نے مجھے کہا۔" مہر کے اعصاب تن گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بمشکل کمپوزڈ رکھ پا رہی تھی۔

"گڈ۔ پھر میں خود کسی دن آجاؤں گی؟" مناج سرسری سا بولی۔ مہر کا غصہ اب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ لڑکی دنیا کی ڈھیٹ ترین لڑکی تھی۔

"جرات بھی مت کرنا۔" اب مہر سے برداشت نہ ہوا اور وہ برس پڑی۔ "جو اس دن کورٹ میں تم نے کہا اس کے بعد میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ زچ ہو چکی تھی۔

"وہ تو میری جاب کا حصہ ہے۔ جس طرح تمہارے وکیل نے میرے موئکل کو برا بھلا کہا۔ ٹھیک اسی طرح میں نے بھی کہہ دیا۔" مناج کندھے اچکاتے بولی۔ مہر کو اس کی ڈھٹائی دیکھ کر رہ رہ کے غصہ آرہا تھا۔

"مجھے ڈسٹرب نہیں کرو۔ میں تم سے ہرگز نہیں ملوں گی۔"

"مگر میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ ایک دفعہ تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ تمہاری بیٹی کی خوشی کے لیے یہ بات کرنا میرے لیے ضروری ہے۔" مہر نے غصے کے مارے آنکھیں میچ لیں۔ وہ اب مزید اس مناج سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

"بڑی ہی کوئی ڈھیٹ ہو تم۔" تلخی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔ وہ کچھ لمحے پہلے کتنا پر سکون تھی، اور اب، ایک جھٹکے میں سارا سکون، اور اطمینان کسی نے غارت کر دیا تھا۔ نا محسوس انداز میں پاؤں پٹختے وہ اپنے کمرے میں پھر سے بند ہو گئی۔

دوسری طرف مناج کے کمرے کی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں، کمرے میں بس کھڑکی سے ہلکی پھلکی روشنی آتی تھی۔وہ اپنے بستر کے کنارے پر سکون سی بیٹھی تھی۔کمرے میں دھواں سا تھا اور سگریٹ کی کڑوی مہک بھی فضا میں معدوم تھی۔اس نے اپنا لبوں سے سگریٹ کا کونا لگایا اور کش اندر لیا۔آنکھیں بند کر کے اس نے سگریٹ کا دھواں اپنے لبوں کی سمت سے باہر نکالا۔

"دیکھتے ہیں کیسے نہیں ملتی تم مجھ سے۔" اپنے مشینی انداز میں، وہ زیر لب بڑبڑائی۔

اس نے شانے اچکا کے ایک اور کش بھرا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کی شام،ٹھیک چھے بجے مہر اس خوبصورت سے غیر آباد علاقے پہنچ گئی جہاں درِّ فشاں کام کرتی تھی۔اس نے اپنی گاڑی کلینک کے سامنے پارک کی۔عنایا جب بھی یہاں آتی تھی تو تر و تازہ ہوجاتی تھی کیونکہ آبادی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا بہت تازہ تھی۔ مہر نے آج سلک کا جامنی جوڑا پہنا ہوا تھا۔آنکھوں پہ کالا چشمہ لگائے وہ کلینک داخل ہوئی۔ریسیپشن پہ اطلاع دے کے وہ سیدھا اوپر چلے گئی۔

در فشاں کے کمرے کے باہر ایک وٹینگ ایریا بنایا گیا تھا جہاں پہ نرم فوم والی کرسیاں رکھی تھیں۔ کلینک کو اس طرح سے بنایا گیا تھا کہ یہ ہر کسی کی آنکھوں کو بھائے۔ اس بات کا خاص دھیان رکھا گیا تھا کہ اس سے ہسپتال والی شناسائی نہ ہو۔اور بالکل ایسا ہی تھا۔یہ جگہ صرف عنایا کو ہی نہیں مہر کو بھی اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

ویٹنگ روم میں درفشاں کی اسسٹنٹ بیٹھی تھیں۔ان کا کام تھا پیشنٹز کی دیکھ بھال کرنا۔یہ ایک عمر رسیدہ سی پتلی سوکھی خاتون تھیں جن کا نام نورے تھا۔عنایا ان کو دیکھتے ہی بھاگی اور ان سے چپک گئی۔نورے آپا نے بھی عنایا کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔مہر مسکرا کے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔اور تب ہی نورے آپا نے ایک سنجیدہ نگاہ مہر پہ ڈالی۔

"ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولیں تو مہر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے درِّ فشاں کے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

مہر اندر داخل ہوئی تو درّ فشاں اپنی کرسی پر بیٹھی اس کی ہی منتظر لگتی تھی۔اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مہر کو بیٹھنے کو کہا۔اس کے چہرے کے تاثرات مہر کو یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ وہ کوئی ضروری بات کرنے والی تھی۔آج درفشاں نے بھوری بٹن ڈاؤن شرٹ پہنی تھی جس کی آستینیں مڑی ہوئی تھیں۔نیچے اس نے جینز کی اسکرٹ پہنی ہوئی تھی۔رسمی علیک سلیک کے بعد درفشاں نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"مہر۔" وہ بہت پروفیشنل سے انداز میں بات کرتی تھی۔"میں آج بالکل صاف بات کرنے والی ہوں۔" درے کی سنجیدگی مہر کو مضطرب کرتے جارہی تھی۔اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"کیا تم عنایا کو بالکل بھی اپنے ایکس سے ملنے نہیں دے سکتی؟یعنی اگر تمہیں ڈر ہے،کہ تمہارا ایکس عنایا کو کوئی نقصان پہنچائے گا،تو گارڈز کی موجودگی میں تم ملاقات کروا سکتی ہو۔" درے بات بہت ٹھہر ٹھہر کے آرام آرام سے بولی تھی۔ساتھ ساتھ وہ مہر کے چہرے پہ نظریں گاڑے اسے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔مہر اپنا سر نفی میں ہلانے لگی۔

”نہیں نہیں۔خطرہ تو ویسے کوئی نہیں ہے۔بس عنایا کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ حسام سے نہ ملے۔“ مہر کا انداز سرد تھا۔درّ فشاں نے مایوس سی سانس باہر نکالی۔

”پھر میں تمہیں اس سب کے نتائج سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔آگے تم عنایا کے لیے وہی کرنا جو تمہیں مناسب لگے۔لیکن آگاہ کرنا میرے لیے ضروری ہے۔“ درے کی آنکھوں میں چھائی چمک اپنا دم توڑنے لگی۔”میں نے ایسے بہت کیسز دیکھے ہیں۔ماں بچے کو باپ سے ملنے نہیں دیتی۔کبھی باپ بچے کو۔اکثر یہ صرف انا کا مسئلہ ہوتا ہے۔میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم یہ سب اپنے انا کے عوض کر رہی ہو۔ہو سکتا ہے تمہاری وجوہات بر حق ہوں۔مگر ایک بار تمہیں عنایا کی ذہنی حالت کو سمجھنا ہوگا۔“ در فشاں نے توقف لیا اور ایک نظر مہر پہ ڈالی۔مہر بری طرح سے الجھنے لگی تھی۔

”پی اے ایس، یعنی parent alienation syndrome ۔یہ طلاق یافتہ جوڑوں کے بچوں میں بہت عام ہوتا ہے۔“ یہاں پہ مہر کو ایک جھٹکا سا لگا۔چہرے پہ چھائی الجھن اپنا دم توڑنے لگی۔”اس کورٹ کے اسٹرکچر کو سمجھو ذرا۔تمہارا ایکس یہ کیس روکنے نہیں والا۔اور کم سے کم بھی ہر ماہ ایک ٹرائل ہونی ہے، جس میں دو گھنٹے کے لیے عنایا کو تمہارے ایکس سے ملنے دیا جائے گا۔یہ قانوناً تمہارے ایکس کا حق ہے۔دو گھنٹے کے لیے ملوانا تمہارے اوپر فرض ہے۔مگر یہ سب ایک چھوٹے بچے کے لیے اتنا بھی آسان نہیں ہوتا ہے مہر۔یہ عنایا کی ذہنی صحت کو بگاڑ کے رکھ دے گا۔“ مہر کو یہ سب سمجھنے کے لیے آگے کچھ بھی سننے کی ضرورت نہیں تھی۔وہ اپنے بچپن میں بھی اس کورٹ کے نظام کے ہاتھوں رلی تھی۔اس سے بہتر بھلا اس سب کو کون سمجھ سکتا تھا؟

"اب دیکھو۔ یہ ابھی صرف اینگر ایشوز سے شروع ہوا ہے۔ اور میں ابھی عنایا سے بات کر کے ان کا حل تلاش کر بھی لوں گی۔ مگر یہ مکمل حل تو نہیں مہر۔ یہ ٹرائل کم سے کم بھی تین سال چلیں گے۔ اس دوران میں ہر ماہ عنایا تمہارے ایکس سے ملے گی۔ وہ اسے بھولتے جائے گی مگر ٹھیک سے کبھی بھولے گی نہیں۔ پی اے ایس میں یہی ہوتا ہے۔ آپ اپنے اس کھوئے ہوئے پیرنٹ سے انجان ہونے لگتے ہو۔ مکمل بھولتے کبھی بھی نہیں نہ ہی محبت میں کمی آتی۔ اور ایک بہت ہی وسیع سا فاصلہ بچے اور پیرنٹ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یہ اینگر ایشوز اور انزائیٹی(anxiety) کی صورت میں بھی لوٹ سکتے ہیں اور خدا نخواستہ ڈیپریشن بھی۔۔ تم سمجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟" اور اس لمحے مہر بالکل کھو گئی تھی۔ درے کی باتیں اس کے ماضی کی یاد تازہ کر گئی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ سے بے اختیار آنسو پھوٹا تھا۔

"میں کیسے نہیں سمجھ سکتی۔" مہر نے خواب سی کیفیت میں کہا۔ درے ذرا چونکی۔ "میرے ساتھ بھی بالکل یہی ہوا تھا۔" آواز میں تکلیف لیے وہ بولی تھی۔ درے کچھ حیران ہوئی تھی۔ مگر اس سب میں اسے عنایا کے لیے امید بھی نظر آئی تھی۔

"اگر تم چاہو تو اپنا تجربہ مجھے بتا سکتی ہو۔ میں بغیر کسی جھجک کے سب سن سکتی ہوں۔" وہ اپنائیت سے لبریز انداز میں بولی تھی۔ درے کو یہی اچھا لگتا تھا۔ دوسروں کو سننا، ان کے روح پہ لگے زخموں کا مرحم بننا۔ وہ ایسا کر کے اپنے آپ کو مکمل محسوس کرتی تھی۔ اور ایک دفعہ پھر اسے قدرت نے موقع دیا تھا کہ وہ کسی کا بوجھ ہلکا کرے۔ کسی کی ہم راز بنے۔ کسی کی تکلیف کا ساتھی بنے۔ وہ یہ موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی تھی۔

مہر نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔وہ بھی در فشاں کو سب بتانے کے لیے تیار تھی۔

"میں دس سال کی تھی جب میری ماں اور میرے ڈیڈ کی طلاق ہوئی۔وہ مجھ سے بہت قریب تھیں۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ان سے باتیں کیا کرتی تھی۔وہ مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔بہت سے اسباق سکھایا کرتی تھیں۔" مہر کے چہرے پر اداس مسکراہٹ بکھری۔

"مگر ڈیڈ کا کردار اچھا نہ تھا۔میرے بچپن سے ہی ان کے انڈسٹری کی ایکٹرسز کے ساتھ افیئرز رہا کرتے تھے۔مگر اس سب کے باوجود میری ماں نے مجھے بہت سکون سے پالا۔انہوں نے کبھی مجھے ڈیڈ سے نفرت نہ کرنے دی۔مگر ایک دن ماں اور ڈیڈ کا بہت بڑا جھگڑا ہوا۔ماں تھک گئی تھیں۔انہیں ساتھ ساتھ میری بھی فکر تھی کہ میں ایسے ماحول میں کیسے بڑی ہو سکتی ہوں۔اور پھر ماں نے ڈیڈ سے طلاق مانگی تاکہ وہ مجھے لے کر چلی جائیں۔مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔طلاق ماں کو مل گئی مگر ڈیڈ نے مجھے ان کے ساتھ نہ جانے دیا۔اس سب کے بعد ماں نے کورٹ میں کیس دائر کیا۔" وہ ٹھہری تھی۔اس کے آنسو بہنے لگے۔سر جھکا کے اس نے اپنے آنسو پونچھے۔اب وہ اپنے بچپن کا سب سے مشکل ترین وقت در فشاں کو بتانے جا رہی تھی۔

"اور پھر چار سال میری کسٹڈی کا کیس کورٹ میں چلا۔" آنکھوں میں چھائی تکلیف بڑھنے لگی۔"ڈیڈ بہت طاقتور تھے۔انہوں نے کبھی بھی کیس ٹھیک سے نہ چلنے دیا۔چھ چھ ماہ بعد تاریخیں ملا کرتی تھیں۔اور اس انا کی جنگ میں، میں اپنی ماں سے دور ہوتے گئی۔مگر کبھی انہیں بھولی نہیں۔شروع کی ٹرائلز میں وہ مجھ سے ملتی تھیں تو میں ان سے ڈھیروں باتیں کرتی تھی۔لیکن کیا صرف دو گھنٹے کی

ملاقات کافی تھی؟ ایک بیٹی اور ماں کی دو گھنٹے کی ملاقات، جس میں بیٹی مہینوں کی داستان سنانا چاہتی ہو۔" ایک اور آنسوؤں کا پھندا مہر کے حلق میں اٹکا۔ در فشاں کی آنکھوں میں بھی اداسی تھی۔ وہ سرعت سے مہر کو سنتے گئی۔ اس کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ کوئی اس پہ اتنا بھروسہ کرتا تھا کہ اپنے گہرے راز اسے یوں ہی سنا رہا تھا۔

"اور پھر میں ان سے دور ہوتے گئی۔ میں ان سے باتیں کرنا بھولتی گئی۔ مجھے تکلیف ہوتی تھی جب میں ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ مجھے گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ میں بالغ ہو گئی تو کیس ختم ہو گیا۔ قانوناً میرے پاس اب اختیار تھا کہ میں جس کے پاس چاہتی رہ سکتی تھی۔ مگر میں نے خود اپنی ماں سے ملنا نہ چاہا۔ ایک دو مرتبہ کوشش کی بھی تھی کہ میں ان سے مل لوں۔ مگر ایک عجیب سا احساس دل میں ہوتا تھا۔ ان کو روتا ہوا دیکھ کر، ان کو مایوس دیکھ کر دل کٹنے لگتا تھا۔ ہمارے درمیان حائل کی ہوئی دوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہم دونوں کے دلوں میں محبت ہونے کے باوجود، ہم ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ اور پھر میں نے ماں سے ملنا مکمل چھوڑ دیا۔ اور آج تک شاید کوئی ایسا دن ہو جب مجھے ان کی یاد نہیں ستاتی۔" مہر کے آنسو جاری تھے۔ مگر وہ سادہ سے انداز میں در فشاں کو سب بتائے جا رہی تھی۔ درے نے مہر کو مسکرا کے دیکھا تھا۔ مہر کا دل بھی ہلکا پھلکا ہونے لگا۔ اور ہوتا بھی کیسے۔ کسی کو سننا ایک آرٹ ہوتا ہے اور درے سے بہتر اس آرٹ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ مہر بھی اپنی زندگی کے اس مقام پہ تھی جب اسے کسی قسم کی تجویز یا مشورے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے بس ایک سننے والا چاہئے تھا۔ اور اسے وہ سننے والا درّ فشاں کی صورت میں ملا تھا۔

"تم عنایا کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہو مہر۔میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اب آگے تمہاری مرضی ہے۔" درے نے مسکراتے ہوئے کہا تو مہر بھی جواباً مسکرا دی۔درے نے بھی اب مہر کے اوپر زیادہ دباؤ نہ ڈالا، اور ڈالنا بھی نہیں چاہئے تھا۔مہر نے مدھم سا مسکرا کے درے کو دیکھا اور اپنے آنسو پونچھے۔

"ٹھیک ہے۔میں اس بارے میں ضرور سوچوں گی۔" مہر نے سر اوپر نیچے ہلاتے کہا۔درے جواباً مسکرائی۔

درے نے مہر سے عنایا کو پانچ منٹ میں بھیجنے کا کہا۔مہر بھی وہاں سے رخصت ہو گئی۔اب در فشاں کے چہرے کی سنجیدگی زائل ہو گئی تھی۔اور چہرے پہ شوخ سا تاثر نمایاں تھا۔اس نے اپنی دراز سے میگنیٹک لڈو نکالا اور اسے اپنی ٹیبل پہ سیٹ کیا۔وہ اپنے آپ کو اور اس کمرے کو عنایا کے لیے تیار کر رہی تھی۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد چھوٹی عنایا دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ڈاکٹر!" کمرے میں آتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولی تھی۔درے نے بھی عنایا کو گرم جوش مسکراہٹ سے دیکھا اور گود میں اٹھا کے گلے سے لگایا۔درے کے آغوش میں عنایا اپنے آپ کو بہت پر سکون محسوس کر رہی تھی۔عنایا کو صوفے پہ بٹھا کے دونوں نے ڈھیروں باتیں کی۔کچھ دیر بعد درے لڈو کھیلنے کے لیے عنایا کو ڈیسک پہ لے کر آئی۔

اب چھوٹی عنایا اور ہماری درِّ فشاں لُڈو کھیلتے نظر آ رہے تھے۔

"عنایا آپ کل سکول گئیں؟" لڈو کھیلنے کے دوران ہی درے نے عنایا سے پوچھا۔ وہ عنایا کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی۔ عنایا کا سر کچھ جھک سا گیا تھا۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ عیاں تھی۔

"نہیں ڈاکٹر۔" عنایا نے شانے اچکا دیے۔

"اچھا؟ وہ کیوں؟" درے نے ایک اور سوال کیا۔ اب عنایا درے سے نظریں چرانے لگی۔

"وہ میرے سر میں درد تھا۔" چھوٹی عنایا کے منہ میں جو آیا وہ بول گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ درے نے عنایا کا چہرہ پڑھنا چاہا۔ درے جانتی تھی کہ تیر نشانے پہ لگا تھا۔ وہ مسکرادی۔

"اچھا؟ ٹھیک ہے۔ آپ میری بیسٹ فرینڈ ہیں اس لیے مجھے آپ کی ہر بات پر بھروسہ ہے۔ آپ یقیناً سر کے درد کی وجہ سے ہی سکول نہیں گئی ہوں گی۔" درے نے نرم کے انداز میں ہر لفظ پہ زور دے دے کر کہا۔ چھوٹی بچی کا حساس دل بوجھ ذدہ ہونے لگا تھا۔

"اصل میں ڈاکٹر۔ میری مام مجھے ڈیڈ سے ملنے نہیں دیتی۔ اس لیے میں ان سے ناراض تھی اور سکول نہیں گئی۔" عنایا نے اپنے دل سے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایک جھٹکے میں سچ اگل دیا۔ درّفشاں زیر لب ہنس دی۔

"اچھا، تو آپ اپنی مام سے ناراض تھی تو اس میں اسکول سے بھی ناراض ہو گئیں؟" عنایا درے کی بات پر اتنا زور سے ہنسی جیسے نہ جانے درے نے کتنی ہی کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

"اسکول سے کوئی کیسے ناراض ہو سکتا ہے ڈاکٹر۔" عنایا پیٹ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی جا رہی تھی۔ "اسکول کی فیلنگز تھوڑی ہوتی ہیں۔" درے بھی مدھم سا ہنس دی۔

”اچھا اگر اسکول کی فیلنگز ہوتیں اور ہماری عنایا اسکول سے ناراض ہو جاتی تو اسکول کو کیسا لگتا؟“ درِ نے عنایا کو مخاطب کرتے پوچھا۔ عنایا سوچ میں پڑ گئی۔

”اسکول کو یقیناً برا لگتا۔“ عنایا نے معصومانہ سے انداز میں بتایا۔

”تو سوچیے آپ کی مام کو کتنا برا لگا ہو گا جب آپ ان سے ناراض ہوئی ہوں گی۔ وہ تو آپ سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔“

”مگر ڈاکٹر وہ مجھے میرے ڈیڈ سے ملنے نہیں دیتی۔“ عنایا بضد سے انداز میں، منہ بناتے ہوئے بولی تھی۔

”تو پھر آپ ان سے پیار سے بات کرتیں۔ ان کو منانے کی کوشش کرتیں۔ آپ کی مام سے زیادہ آپ کو کوئی پیار نہیں کرتا عنایا۔ اگر پیار سے منائیں تو کیوں نہیں مانیں گی وہ۔“ درِ نے وقفہ لے کے عنایا کو دیکھا۔ عنایا کسی گہری سوچ میں لگتی تھی۔ درِ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا اگلا جملہ تیار کرنے لگی۔

”اور مجھے یقین ہے ہماری عنایا نے اپنی مام سے پیار سے ہی بات کی ہو گی۔ وہ ایک اچھی بچی ہے۔ ہے نا؟“ حساس سی عنایا کو ایک مرتبہ پھر سے شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ اس کا سر باعث ندامت جھکتا چلا گیا۔

”آپ عنایا کو غلط سمجھتی ہیں ڈاکٹر۔ میں نے گلدان اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مام کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ ان کے پاؤں پہ خون بھی تھا۔ میں نے مام کو بہت ہرٹ کیا ہے۔“ چھوٹی عنایا بہت زیادہ اداس ہو گئی تھی۔ درِ مسکرا دی۔ وہ جو عنایا کو سمجھانا چاہتی تھی اس میں وہ کامیاب ہوئی تھی۔

"نہیں۔میری عنایا بہت اچھی ہے۔اچھے لوگ وہ تھوڑی ہوتے ہیں جو کچھ بھی برا نہیں کرتے۔بلکے اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو برا کر بھی لیں تو اس کے بعد شرمندہ ہوتے ہیں۔اور میری عنایا کی شرمندگی یہ بتا رہی ہے کہ اس کا دل اب بھی بالکل اس ہی کی طرح خوبصورت اور شفاف ہے۔" درے نے گرم جوش انداز میں کہا۔عنایا نے چہرہ اٹھا کے درے کو دیکھا۔اس کے چہرے پہ ایک بار پھر سے چمک در آئی تھی۔

"سچ میں؟"

"ہاں بالکل۔آپ کی ڈاکٹر آپ سے جھوٹ تھوڑی بولیں گی۔" عنایا مسکرا کے تیزی سے سر اوپر نیچے ہلانے لگی۔"تو آپ اپنی مام سے معافی مانگ لیں گی نا؟" درے نے عنایا سے پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

چھوٹے بچے پھول کی طرح ہوتے ہیں۔خوبصورت اور نازک۔ایک پھول، جو کے ہوا کے رخ پہ اپنا رخ موڑ لیتا ہے۔چھوٹے بچے بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں، اگر آس پاس وہ سختی دیکھیں گے تو خود بھی سخت ہو جائیں گے۔لیکن اگر وہ آس پاس نرمی دیکھیں گے تو ان کی شخصیت میں بھی نرمی نمودار ہو گی۔ہم اکثر اپنے بچوں کو اچھی نصیحتیں دیتے ہیں۔مگر کبھی سوچا ہے کہ یہ نصیحتیں کیوں زیادہ دیر نہیں ٹکتی؟ کیونکہ ہم ان پہ خود بھی عمل نہیں کرتے۔اگر ہم اپنے بچوں میں کوئی اچھی چیز ڈالنا چاہ رہے ہیں تو سب سے پہلے وہ چیز ہمیں خود بھی اپنانی ہو گی۔

عنایا اپنے سیشن سے فارغ ہو کے جب باہر آئی تو مہر ویٹنگ روم کی نرم کرسی پہ بیٹھی سو رہی تھی۔ عنایا سیشن کے بعد کافی تر و تازہ سا محسوس کر رہی تھی۔وہ چہرے پہ معصومانہ مسکراہٹ لیے مہر کی جانب بڑھی اور اس کا ہاتھ ہلایا۔مہر بوکھلا کے اٹھی۔

"عنایا آپ کا سیشن ختم ہو گیا؟" مہر نے عنایا کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے کہا۔اس کی آنکھوں میں غنودگی بھری ہوئی تھی۔عنایا نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔پھر عنایا نے آنکھوں میں اداسی لیے مہر کو دیکھا۔

"مجھے معاف کر دیں مام۔آئندہ آپ کو ہرٹ نہیں کروں گی۔" وہ شرمسار سے انداز میں بولی۔مہر نے مسکرا کے اسے گلے سے لگایا۔اس کی بیٹی اب بہتر تھی۔اس کی جیسے تمام مصیبتیں حل ہو گئی تھیں۔وہ بھی اب ہلکا پھلکا اور تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔

"everyone deserves a Durre Fishan in their life" اپنے چہرے پہ پر سکون سی مسکان سجائے وہ مشکور ہو کے زیر لب بڑبڑائی۔اس کے دل میں درّ فشاں کے لیے شکر گزاری کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

اور یہ تو سچ ہی ہے۔ہر کسی کی زندگی میں ایک نہ ایک در فشاں تو ہونی ہی چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم اپنی کہانی کو اب ایک ہفتہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پچھلے دنوں پاکستان میں ایک اور مون سون سسٹم داخل ہوا تو اسلام آباد میں بھی اس کے اثرات داخل ہوئے۔لیکن یہ والا سسٹم اتنا نہیں برس رہا تھا جتنا پچھلے والا برسا تھا۔بس وقتاً فوقتاً بوندا باندی ہوجاتی۔ان دنوں اسلام آباد کا موسم بھی کافی خوش گوار سا تھا۔یہ خوش گوار موسم آنے والے خوش گوار وقتوں کا پیغام بھی دے رہا تھا۔

آج کا دن بھی بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ہلکی پھلکی بارش آسمان سے وقتاً فوقتاً برستی رہتی۔اس ہلکی پھلکی بارش کے چھڑکاؤ سے درخت اور پودے بھی کافی محظوظ ہوتے نظر آرہے تھے۔

اس سہانے سے موسم میں ہم اپنا رخ اس ہسپتال کی طرف موڑتے ہیں، جس کا نام سنابل تھا۔سنابل ہسپتال کی اونچی عمارت کافی پرانی تھی اور ٹوٹی پھوٹی بھی۔کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ باہر کی دیواروں پہ جگہ جگہ سیلن لگی ہوئی تھی۔اندر کا حال بھی بگڑا ہوا تھا۔فرش میلا سا تھا اور کائی بھی نظر آتی تھی جس کے باعث فرش ہرے سے رنگ کا لگتا تھا۔ماحول میں ایک عجیب سی بو بھی تھی۔

ہسپتال کی پہلی منزل کی راہداری پار کریں تو سیڑھیاں نظر آتی تھیں۔سیڑھیوں کے عقب میں ہی ہسپتال کے ناظم کا کمرہ تھا۔دروازے کے اس پار سفر کریں،تو گویا یہ ہسپتال کا حصہ ہی نہ لگتا تھا۔اس کمرے میں ہر چیز صفائی سے رکھی ہوئی تھی۔فرش اور دیواریں بھرپور چمک رہی تھیں۔ڈیسک پہ ہر چیز نفاست سے سیٹ کی گئی تھی۔سربراہی کرسی پہ اس ہسپتال کا ناظم بیٹھا تھا۔سخت، مگر پرکشش نقوش والا مرد، یہ تقریباً پینتیس سال کا تھا۔اس نے سر پہ کالی ہیٹ ترچھی کر کے پہنی ہوئی تھی۔گلے

میں زنجیر کے ڈیزائن کی ایک چین تھی۔ آدھی آستین کی شرٹ پہنے ہوئے،اس کے کسرتی بازو نمایاں ہوتے تھے۔ مخالف کرسی پہ بیٹھی لیڈی اقتدار سے وہ مسکرا مسکرا کے کلام کرتا نظر آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ہو جائے گا۔" لیڈی اقتدار ہسپتال کے ناظم سے شانے اچکاتے بولی۔ ہسپتال کا یہ ناظم اس کا دائیاں ہاتھ تھا۔اس لیے اس کا برتاؤ بھی اس سے کافی دوستانہ سا تھا۔

"اور کچھ؟ کوئی کیڑا تو تنگ نہیں کر رہا ناں درانی؟" ہسپتال کے ناظم، درانی نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"رہا نہیں۔رہی۔" درانی نے ابرو اچکائے۔"آپ تو جانتی ہیں ان جذباتی جرنلسٹ کو۔آئے دن کوئی نیا ڈراما کھڑا کرتے رہتے ہیں۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ پہلے تو مسکراہٹ بکھری۔اور پھر وہ زور دار قہقہہ لگانے لگی۔ درانی بھی ساتھ ساتھ ہنسنے لگا۔اس کی نگاہوں میں اپنی مالکن کے لیے بے انتہاء احترام تھا۔

"بس اتنی سی بات؟ چینل کا نام بتاؤ؟" ڈیسک سے اپنا آئی فون اٹھاتے ہوئے وہ شان بے نیازی سے بولی تھی۔ساتھ ساتھ جتانے والی نگاہ درانی پہ بھی ڈالی۔

"آواز نیوز۔" درانی جواباً بولا۔

"کون سی بلڈنگ میں ہے ہیڈ کوارٹر؟" لیڈی اقتدار نے یادھیانی چاہی۔

"ارشد صاحب کی بلڈنگ، سن ٹاپ ٹاور کی دوسری منزل پہ۔"درانی نے سر کو خم دے کے جواب دیا۔لیڈی اقتدار آنکھوں میں حقارت لیے کال ملانے لگی۔چہرے پہ مصنوعی سا نخرہ بھی تھا۔

"آواز نیوز کے سی ای او۔مراد؟" لیڈی اقتدار نے اپنی مغرور ناک سکیڑی۔

”جی لیڈی۔ آپ نے کیسے یاد کیا مجھے؟“ مراد نے آواز میں متانت بھری ہوئی تھی۔

”زیادہ لمبی بات نہیں کروں گی، بس اتنا کہوں گی کہ تمہیں اپنا بوریا بستر باندھ کے اپنے آفس سے نکلنا ہوگا۔“ لیڈی اقتدار کا انداز لا پرواہ سا تھا۔ درانی اپنے لبوں کو بھینچ کر اپنی ہنسی قابو کرتا نظر آرہا تھا۔

”لیڈی اقتدار۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کوئی خطا ہوئی ہے ہم سے؟“ مراد ہکلاتے ہوئے بولا تھا۔

”میں نے تمہاری بک بک نہیں سنی۔ اور ویسے بھی میں نے بلڈنگ کی انتظامیہ سے بات کر لی ہے۔ وہ تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے اگر تم خود نہ گئے۔ اور میں اس بات کو یقینی بناؤں گی کہ تمہارا آفس کہیں آباد نہ ہو سکے۔ تمہارے چینل کی بربادی اب میری ذمہ داری۔ خوش رہو۔“ لیڈی اقتدار نے ممتاز سے انداز میں اپنے ہاتھ پہ پہنی انگوٹھی کے اوپر نظر ڈالی۔ درانی سے اپنی ہنسی قابو نہیں ہو پائی اور وہ بغیر آواز کے ہنسنا شروع ہو گیا۔ لیڈی اقتدار نے ایک ستائشی نگاہ درانی پہ ڈالی۔

”ہم نے کچھ غلط کیا ہے، تو ہمیں بتائیں بھی تو لیڈی؟“ لیڈی اقتدار نے اپنا موبائل کان سے جدا کیا۔ چہرے پہ بے رحم سا تاثر لیے اس نے کال کاٹ دی۔ لبوں کو مغرور مسکراہٹ میں ڈھالے وہ اب درانی کی طرف متوجہ ہوئی۔ درانی اب دل کھول کے ہنس رہا تھا۔ لیڈی اقتدار نے بھی نازک سے انداز میں، لبوں کے اوپر ہاتھ رکھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

”اور اب دیکھتے جاؤ۔ یہ کالز پہ کالز کرے گا۔ بہت تڑپانے کے بعد میں اس کی کال اٹھا لوں گی۔ یہ مجھ سے بھیک مانگے گا کہ بتا دیں ہم نے کیا کیا لیڈی۔“ لیڈی اقتدار کے چہرے پر معانی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ درانی کو دیکھنے لگی جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ آگے کا جملہ وہ مکمل کرے۔

"اور پھر جب آپ بتائیں گی کی اس کی ایک جرنلسٹ کیسے ہمیں تنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔تو وہ نہ صرف اسے کام سے نکالے گا۔" درانی نے بات مکمل کی۔معانی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"بلکہ۔" اب کی بار لیڈی اقتدار نے بات جاری رکھی۔"اس بات کو یقینی بھی بنائے گا کہ وہ آئندہ ایسا کچھ نہ کرے۔" ایک اور شیطانی قہقہہ اس کمرے میں گونجا۔

لیڈی اقتدار نے میز پہ پڑا مگ اٹھایا۔ہاتھ میں اسے گھماتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی۔

"یہ سب چیونٹیاں ہیں درانی۔" وہ بے درد سے انداز میں، تنی ہوئی مسکراہٹ لیے بولی تھی۔"کمزور سی چیونٹیاں، جن کو اپنی جوتی کی نوک پہ کچلنا میرا فرض ہے۔جو بھی میرے اس کاروبار کے بیچ میں آنے کی کوشش کرے گا۔میں اسے اسی طرح سے مار گراؤں گی۔" بے رحم سے بے درد انداز میں بولی تھی۔آنکھیں اس کی تکبر سے بھری ہوئی تھیں۔گردن اب بھی پوری شان سے اکڑی ہوئی۔درانی کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔اس نے سرعت سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد پہ رات اتر چکی تھی۔عبداللہ سلطان کا قصر بھی اپنے منظر پہ لگی بتیوں کی وجہ سے روشن تھا۔قصر کی باہری دیواروں پہ نیا پینٹ کیا جارہا تھا جو کہ بارش کے اس سلسلے کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا۔مہر گھر کے لاؤنج پہ سربراہی صوفے پہ بیٹھی موبائل پہ مگن تھی۔لاؤنج کے داخلی دروازے سے عنایا چلتے ہوئے آرہی تھی۔اس کے چہرے پہ شرمیلی سی مسکان تھی۔وہ مہر کے قریب آئی اور اس کی گود میں ایک لفافہ رکھ دیا۔مہر الجھ کے اس لفافے کو دیکھنے لگی۔

"یہ کیا ہے عنایا؟" مہر نے عنایا کے اوپر جواب طلب نگاہ ڈالی۔

"مام ہمارے پورے اسکول کا میلاد ہو رہا ہے۔اور اس میں ہماری کلاس کے سارے بچے نعت پڑھیں گے۔آپ بھی چلیں گی نا؟" عنایا نے آنکھوں میں امید لیے مہر سے پوچھا۔مہر نے اپنا سر جھٹکا۔

"نہیں عنایا۔میرے پاس بہت کام ہیں۔" لا تعلق سے انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنے موبائل پہ پھر سے مگن ہو گئی۔دوسری طرف عنایا کا دل بہت دکھا۔عنایا کے اوپر ایک مرتبہ پھر سے غصہ سوار ہونے لگا۔وہ پوری قوت سے چلانا چاہتی تھی۔

"تو پھر آپ ان سے پیار سے بات کرتیں۔ان کو منانے کی کوشش کرتیں۔آپ کی مام سے زیادہ آپ کو کوئی پیار نہیں کرتا عنایا۔اگر پیار سے منائیں تو کیوں نہیں مانیں گی وہ۔" یکدم عنایا کے دماغ میں درے کا یہ قول گردش کرنے لگا تو وہ ٹھنڈی پڑنے لگی۔اس نے ایک گہری سانس لی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے مہر کی گود میں اپنا سر رکھا۔

"پلیز چلے ناں مام۔ہم کتنے وقت سے کہیں ساتھ نہیں گئے۔" چھوٹی عنایا درفشاں کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے نہایت نرمی سے بولی تھی۔مہر نے موبائل سائڈ پہ رکھا اور لب بھینچ کے عنایا کو دیکھنے لگی۔اب وہ اس کے نرم و ملائم بالوں پہ ہاتھ پھیرتی نظر آرہی تھی۔

"میں بھلا جا کے کیا کروں گی عنایا۔" اب کی بار مہر کے انداز میں شفقت نمایاں تھی۔

"پلیز مام۔پلیز۔بس میرے لیے۔" مہر نے ایک ہاری ہوئی سانس خارج کی۔اب اس سے انکار نہیں ہو سکا۔

”ٹھیک ہے۔جیت گئیں آپ۔“ مہر نے شوخ سے انداز میں کہا تو عنایا بھی جیت کا رقص کرنے لگی۔

”میلاد کب ہے پھر؟“

”کل۔“مہر نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

”صرف آپ کی کلاس کا ہے؟“مہر نے پوچھا۔

”نہیں مام۔پورے اسکول کا ہے۔بڑی کلاس کے بچے بھی ہوں گے۔اور ہماری کلاس کے سارے بچے ایک ساتھ نعت پڑھیں گے۔“ مہر نے اپنے سر کو مختصر سی جنبش دی۔

وہ انجان تھی اس بات سے کہ یہ میلاد اس کے لیے غیر معمولی ثابت نہیں ہونے والا تھا۔اس میلاد میں اس کی زندگی ایک بہت بڑا موڑ لینے والی تھی۔۔۔ایک بہت ہی بڑا، خوشگوار موڑ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عنایا کے اسکول کا آڈیٹوریم بہت کشادہ تھا۔آج کی تقریب کے لیے اسے بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔آڈیٹوریم کی دیواروں پر ہرا گونبد بنا ہوا تھا۔اے سی کے باعث آڈیٹوریم میں بہت سکون تھا۔مہر نے آتے ساتھ ہی آڈیٹوریم کے پیچھے والی کرسی پکڑ لی تھی۔وہ بالکل بیزار سی نظر آرہی تھی۔اسے اس محفل میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، بس عنایا کی وجہ سے جبراً اسے بھی آنا پڑا۔کچھ دیر میں آڈیٹوریم بہت سے پیرنٹس اورا سٹوڈنٹس سے بھر گیا۔دفعتاً اسکول کا ایک طالب علم، سفید کُرتا شلوار پہنے اسٹیج پہ آیا۔اس کے ہاتھ میں مائیک تھا۔

”میں آج کی محفل میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ سب اس محفل میں حضور ﷺ کو یاد کریں گے اور ان پہ بے شمار درود بھیجیں گے۔ ہم اپنی محفل کا آغاز قرآن کی تلاوت سے کرتے ہیں۔ اس کے لیے میں اسٹیج میں دعوت دیتا ہوں ہمارے اسکول کے کمپیوٹر ٹیچر، حافظ احمد یوسف کو۔“

مہر بری طرح سے چونکی۔ اس نے تیزی سے اپنا موبائل اپنے پرس میں گھسیڑا۔ احمد یوسف؟ سافٹ ویئر ڈیولپر احمد یوسف؟ نہیں وہ کیسے ہو سکتا تھا۔ مہر نے اپنا منہ اٹھا کے اسٹیج پہ نظریں دوڑائی۔ وہ بالکل حیران رہ گئی۔ یہ وہی تھا۔۔۔ احمد۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر کیا حافظین کی ناف تک داڑھی نہیں ہوا کرتی تھی؟ وہ سروں کے اوپر پگڑی باندھ کر نہیں گھوما کرتے؟ احمد تو شاید دکھنے سے دینی بھی نہ معلوم ہو۔ وہ اس لمحے شاق میں تھی۔

اب مہر کی توجہ اسٹیج کی طرف مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ دماغ میں ڈھیروں سوال لیے اسٹیج پہ کھڑے احمد کو دیکھ رہی تھی۔

وہ آج بھی اتنا ہی پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں سادگی سی تھی۔ آپس میں جڑی ہوئی بھنووں والے، خوبرو سے احمد نے سفید شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ مہر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ اس کے لئے ایک حیرت انگیز انکشاف ثابت ہوا تھا۔ احمد نے اپنے ہاتھ میں مائیک تھاما اور سورہ فجر کی تلاوت شروع کی:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے)

وَالْفَجْرِ

(قسم ہے فجر کی)

وَلَيَالٍ عَشْرٍ

(اور دس راتوں کی)

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ

(اور جفت اور طاق کی)

وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ

(اور رات کی جب وہ چلنے لگے)

هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ

(کیا ان میں عقلمند کے واسطے کافی قسم ہے؟)

وہ آنکھیں بند کر کے سر جھکائے سورہ فجر کی تلاوت کر رہا تھا۔اس کی آواز نرم صحبت کی تھی اور بے حد خوبصورت بھی۔اس کی خوبصورت آواز مہر کے کانوں میں پڑی۔اس کا دل ہلکا پھلکا ہونے لگا۔اس کے دماغ پہ چھایا ہر خیال تحلیل ہونے لگا۔قرآن کی تلاوت نے مہر میں ایک الگ سی کیفیت چھوڑ دی تھی۔کیا واقعی قرآن کی تلاوت اتنی تسلی بخش ہوتی ہے؟ مہر کو اس لمحے عجب ہونے لگا تھا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ

(کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا؟)

إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ

(ستونوں والے ارم کے ساتھ)

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ

(جس کی مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی)

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ

(اور ثمودیوں سے جنہوں نے وادیوں میں بڑے بڑے پتھر تراشے تھے)

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ

(اور فرعون کے ساتھ جو مینخوں والا تھا)

الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ

(ان سبھوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا)

صرف اس کی آواز ہی نہیں تھی جو خوبصورت تھی۔انداز تلاوت بھی اتنا ہی حسین تھا۔ہر الفاظ جیسے دل سے ادا ہوتا تھا۔مہر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس دنیا سے غائب ہو گئی تھی۔وہ آنکھیں بند کر کے

تلاوت سنے جارہی تھی۔اسے آس پاس کے ماحول سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔اسے لگ رہا تھا اس آڈیٹوریم میں صرف وہ ہے اور احمد کی خوبصورت آواز ہے۔

فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ

(اور بہت فساد مچا رکھا تھا۔)

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ

(اور تیرے رب نے ان سب پر عذاب کا کوڑا برسایا)

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ

(یقیناً تیرا رب گھات میں ہے)

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ

(انسان (کا یہ حال ہے کہ)جب اسے اس کا رب اسے آزماتا ہے اور عزت دیتا و نعمت دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنایا)

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ

(اور جب وہ اسے آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کردیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے میری اہانت کی)

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ

"ایسا ہر گز نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے)

وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

(اور مسکینوں کو کھلانے کے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے)

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا

(اور میراث سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو)

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا

(اور مال جی بھر کر عزیز رکھتے ہو)

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا

(یقیناً جس وقت زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی)

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا

(تیرا رب آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر)

وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ

(اور جس دن جہنم بھی لائی جائے گی اس دن انسان کو سمجھ آلے گی مگر آج اس کے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟)

يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي

(وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا)

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ

(پس آج اللہ کے عذاب جیسا عذاب کسی کا نہ ہوگا)

وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ

(نہ اس کی قید و بند جیسی کسی کی قید ہوگی)

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

(اے اطمینان والی روح)

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش)

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي

(پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا)

وَادْخُلِي جَنَّتِي

(اور میری جنت میں چلی جا)

احمد کے چہرے پہ اطمینان تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس نے بہترین تلاوت کی تھی۔وہ مطمئن سے انداز میں اسٹیج پر سے رخصت ہوگیا۔مہر نے ایک جھٹکا لیا جیسے وہ کسی خواب سے جاگی ہو۔تلاوت اتنی جلدی

کیوں ختم ہوگئی؟ مہر نے ہڑبڑا کے ادھر ادھر دیکھا۔وہ کہاں چلا گیا؟ کیا قرآن کی تلاوت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ وہ انسان کو سب کچھ بھولنے پر مجبور کر سکتی ہے؟مہر اس لمحے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

اور یہ تھا مہر بنت عبداللہ سلطان کا القران سے پہلا تعارف۔اور یہ تعارف اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا موڑ ثابت ہونے والا تھا۔

اس کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی اسے اس حال میں دیکھ نہ لے۔ یہ سب اس کے لیے غیر معمولی تھا۔جو بے قراری اور بے چینی اس کے وجود پر آٹھ ماہ سے سوار تھی وہ صرف کچھ دیر کی تلاوت کیسے ختم کر سکتی تھی؟مہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔اس نے آنکھ کی سطح پہ جھلکتے آنسو اپنے ہاتھوں کی پشت سے پونچھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلی ویگن اسلام آباد کی کشادہ سی سڑکوں پر سفر کرتی نظر آرہی تھی۔ویگن کافی جدید تھی۔ٹنٹڈ گلاسز کی وجہ سے کوئی بھی اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ پہ شمس براجمان ڈرائیونگ کررہا تھا۔ریئر مرر کے تحت وہ وقتاً فوقتاً پیچھے بیٹھی نیلوفر پہ بھی نظریں ڈالتا رہتا۔

نیلوفر کسی خواب سی کیفیت میں لگتی تھی۔اس کا دل ایک الگ سی کیفیت میں مبتلا تھا۔وہ اپنی گردن موڑے شیشے سے باہر کا منظر دیکھے جارہی تھی۔ویگن میں موت سی خاموشی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" شمس نے خاموشی کے اس تسلسل کو توڑنا چاہا۔"آپ نے لیڈی اقتدار کو کیا جواب سنایا؟" نیلوفر ہنوز شیشے کے باہر دیکھتے گئی۔چہرے پہ اس کے سختی تھی۔

"میں مان گئی۔" وہ بس اتنا ہی بولی۔صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ سفر خاموشی سے کاٹنا چاہتی تھی۔شمس ذرا سا چونکا۔مگر اس نے آگے سے نیلوفر سے کوئی سوال نہ کیا کیونکہ وہ بھی جان گیا تھا کہ نیلوفر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔وہ چپ چاپ اپنی گاڑی چلاتا گیا۔

وہ نیلی ویگن ایک سوسائیٹی میں داخل ہوئی،جہاں کافی اچھے اور بڑے بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔موسمی بارش کی وجہ سے سڑکیں ہلکی پھلکی گیلی تھیں۔چھے سو گز کے سفید گھر سے تھوڑا دور شمس نے اپنی گاڑی پارک کی۔نیلوفر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔وہ آنکھوں میں تپش لیے اس گھر کو دیکھ رہی تھی۔آج سالوں پرانی آس پوری ہونے والی تھی۔دل میں لگی آگ،بالآخر آج بجھنے والی تھی۔

"گاڑی گھر کے باہر ہے۔یعنی اس کے بیوی بچے ابھی نہیں نکلے ہیں۔میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نے کال ٹریس کی تھی اور وہ کچھ دیر میں جاتے ہی ہوں گے۔" شمس نے نیلوفر کو احوال بتایا۔نیلوفر نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔بولی کچھ نہیں۔وہ خاموشی سے انتظار کرنا چاہتی تھی۔

"ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔" اس دفعہ شمس نے نیلوفر کے خاموش رہنے کی آرزو کا احترام نہ کیا اور بولنا شروع ہوا۔"آپ کے مہر بنت عبداللہ سلطان سے کیسے تعلق تھے؟ یعنی اس کو آپ پر شک تو نہیں ہو گا؟" نیلوفر کی نگاہیں اب بھی کھڑکی سے باہر اس گھر میں منجمد تھیں۔

کبھی شک نہ ہو، اس لیے میں نے ہمیشہ سے اس سے اچھے تعلق رکھے تھے۔اس قتل کے بعد وہ ہمارے بہت زیادہ کام آنے والی ہے۔" نیلوفر کا انداز بیزار سا تھا۔وہ واقعی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

شمس نے سر کو مختصر سا خم دیا۔اس کے چہرے پہ اب ایک کمینی سی مسکراہٹ تھی۔اس کا شیطانی دماغ آگے کی چال بننے لگا تھا۔مہر بنت عبداللہ سلطان واقعی ان سب کے لیے بہت اہم تھی۔وہ ان سب کی زندگیوں میں، اپنی اہمیت سے فی الوقت خود بھی واقف نہ تھی۔

کچھ لمحے مزید اس خاموشی میں کٹے۔اور پھر گھر میں سے ایک عمر رسیدہ عورت نکلی۔اس کے ساتھ، تقریباً تیرہ سال کا لڑکا اور سولہ سال کی لڑکی بھی تھی۔عمر رسیدہ عورت گاڑی پہ سوار ہو گئی ساتھ ہی بچے بھی بیٹھ گئے۔اور پھر وہ اس گھر سے چلے گئے۔نیلوفر کا دل برق رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔انتظار کی گھڑی ختم ہونے والی تھی۔انتقام کی آگ بجھنے والی تھی۔

"میں جاتا ہوں۔جب آپ کو میسج کروں تو آجایئے گا۔" شمس کہتے ہوئے گاڑی سے اترا۔محتاط انداز میں چلتے ہوئے وہ اس گھر کی طرف بڑھا۔گھر کے گارڈز نے اسے اندر قدم رکھنے سے نہ روکا۔صاف ظاہر تھا، کہ وہ لوگ گھر کے گارڈز کو خرید چکے تھے۔وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔اور جو کرنے آئے تھے وہ کر کے ہی دم لینے والے تھے۔

شمس نیلوفر کی نظروں سے غائب ہوا۔کچھ لمحے مزید اس کاٹ دار خاموشی میں کٹے۔اور پھر نیلوفر کا موبائل تھرتھرایا۔نیلوفر کی آنکھوں میں چمک در آئی۔اس نے موبائل کھول کے میسج پڑھا:

”ہم اوپر والی منزل میں آپ کے منتظر ہیں۔“ نیلوفر زیر لب ہنس دی۔ آخر کار، سالوں پہلے کیا وعدہ وہ آج پورا کرنے والی تھی۔ اس کے برابر میں ایک لکڑی کا ڈبہ تھا۔ اس نے وہ اپنے ہاتھ میں تھاما اور گاڑی سے باہر نکلی۔

اس نے زیبرا اسٹریپس والی پینٹ پہ کالی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گھنگرالے بال بینڈ سے پیچھے کسے ہوئے تھے۔ چہرے پہ ہلکا پھلکا میک اپ بھی تھا۔ شاہانہ سی چال چلتے وہ گھر میں داخل ہوئی۔ اسے بھی گارڈز نے نہیں روکا تھا۔ گھر کی عمارت کے اندر وہ داخل ہوئی۔ وہ اس گھر میں پہلی مرتبہ آئی تھی تو اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ جس طرح سے وہ گھر کا جائزہ لیتے جا رہی تھی اس کے چہرے پہ پھیلی کڑوی مسکراہٹ گہری تر گہری ہوتی جا رہی تھی۔

آخر وہ سب جنھوں نے اسے تکلیف دی، اس کا حق مارا، اس سے اس کے اپنے چھینے، آخر وہ سب اتنا خوش کیوں تھے؟ آخر قدرت انہیں کیوں نہ کھا گئی۔ آخر کیوں اسے ہی اپنا انتقام لینے کے لیے قدم بڑھانے پڑے۔ گول سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ یہی سوچ جا رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آئی تو ایک پتلی سی راہداری تھی۔ راہداری کے دائیں طرح ایک دروازہ تھا جس کے باہر شمس ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ نیلوفر اس کی طرف بڑھی۔

”یہ آپ کا ہوا۔“ تابعدار سے انداز میں اس نے اپنے سر کو خم دیا اور پھر ہاتھ بڑھا کے نیلوفر کے لیے دروازہ کھولا۔ نیلوفر نے ایک گہری سانس اندر کھینچی اور ایک باہر۔ آنکھوں میں جنون لیے اس نے قدم اندر بڑھائے۔ شمس نے دروازہ پیچھے سے بند کر دیا۔

اس کے ہاتھ میں وہ ڈبا اب بھی موجود تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور کسی کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ کسی کے تڑپنے کی آواز۔ اور یہی آواز تو وہ سننا چاہتی تھی۔ یہی آواز سننے کے لیے تو وہ یہاں آئی تھی۔۔۔

اس نے کمرے کی بتیاں جلائیں تو کمرے کا حال اس کے سامنے نمایاں ہوا۔ وہ ایک دراز سا کمرہ تھا۔ ماسٹر بیڈ کے سامنے ایک کرسی پہ اس عمر رسیدہ شخص کو رسی سے باندھا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے باندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پہ رومال ٹھونسا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دے کے اپنے آپ کو رسی کی گرفت سے آزاد کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر پا رہا تھا۔ رسی بہت مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ نیلوفر کو دیکھ کے وہ کچھ دیر کے لیے تھم گیا۔ نیلوفر سے اسے شناسائی کا احساس ہوا۔ مگر اسے یاد نہ آیا کہ آخر اس نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

نیلوفر ہاتھ میں وہ ڈبا تھامے اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہوں میں طیش تھا۔ عمر رسیدھا شخص اپنی آنکھوں میں سوال لیے پھر سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دینے لگا۔ نیلوفر نے وہ ڈبا سنگھار میز پہ رکھا۔ اور سست قدم بڑھاتے وہ اس بوڑھے شخص کی طرف بڑھی۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھی۔ بوڑھا شخص اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ نیلوفر کے چہرے پہ مزید ناگواری ابھری۔

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس شخص کے منہ پہ زور دار تھپڑ لگایا۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ اس شخص کا وجود کپکپانے لگا تھا۔ وہ شخص مزید آگ بگولا ہوگیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا اور وہ شدید مزاحمت کرنے لگا۔ نیلوفر چہرے پہ سکوت طاری کیے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ اب اس سے کلام کرنے کے لیے تیار تھی۔

”ایسے ہی مارا تھا نہ تم نے میرے ماں کو۔یاد ہے؟ انسپیکٹر عادل۔“ یہ پہلا جملہ تھا جو وہ بولی تھی۔بوڑھے سے عادل کے چہرے پہ مزید سوال ابھرنے لگے۔

”تمہیں شاید یاد نہیں میں کون ہوں۔افسوس کہ تمہیں یاد نہیں لیکن تمہیں یاد ہونا چاہئے تھا۔میں وہ چودہ سالا لڑکی تھی جس کو اپنی ماں سمیت گھر سے نکالنے میں تم نے ان ظالموں کاساتھ دیا تھا۔“ اب اس کمرے میں صرف نیلوفر کی آواز تھی۔بوڑھا عادل بالکل تھم چکا تھا۔

فضا میں تناؤ بڑھنے لگا تھا۔فضا میں برے مستقبل کی پیشنگوئی اس بڑھتے تناؤ کے ساتھ معدوم تھی۔

”یاد کرو تم۔کیسے تم نے میرے چچاؤں کا ساتھ دیا تھا۔جو دولت، جو گھر مجھے ملنا تھا وہ انہوں نے چھینا۔اور تم نے ان کا ساتھ دیا۔ہم انصاف کے لیے بھٹکتے رہے۔اور تم نے ہمیں کبھی بھی انصاف نہ لینے دیا۔میری ماں نے احتجاج کیا تو تم نے اسے لاک اپ میں ڈال کے تشدد کا نشانہ بنایا۔میں وہ چودہ سالہ لڑکی تھی انسپیکٹر عادل۔میں وہ کمزور اور نادان چودہ سالہ لڑکی تھی جسے اپنا حق لینا نہیں آتا تھا۔“ نیلوفر نے توقف لیا۔شیطانی آنکھوں میں جوش و جنون کے ساتھ انتقام کی بھڑکتی آگ نمایاں تھی۔اس کے چہرے پہ حیوانگی پھیلی ہوئی تھی۔عادل تعجب سے اسے سنے جارہا تھا۔

”مگر اب دیکھو۔اٹھارہ سال گزر گئے۔میں بھی بدل گئی۔اب میں اس قابل ہوں کے اپنا انتقام لے سکوں۔“ وہ مدھم سا ہنس دی۔ہنسی بھی اس کی شخصیت کی طرح خوفناک تھی۔بوڑھے عادل کو یہ ہنسی

کانوں میں چبھ رہی تھی۔وہ اس رومال کے پیچھے بہت کچھ بڑبڑا رہا تھا مگر رومال اس کی آواز دبائے ہوئے تھا۔

"میں نے کہا تھا میں واپس آؤں گی۔میں نے کہا تھا کہ ایک دن تمہیں تمہارے زوال تک پہنچاؤں گی۔ کاش تم اس وقت میرے یہ دھمکی کو سنجیدگی سے لیتے۔اب دیکھو میں آگئی۔" نیلوفر کے چہرے پہ کمینہ سا تاثر تھا۔عادل کے چہرے پہ خوف دیکھ کے اس کی روح کو تسکین ملنے لگی۔اس نے عادل کے منہ میں ٹھونسا ہوا رومال کھینچ کے نکالا۔عادل تیز سانس لینے لگا۔وہ نیلوفر کو عجیب نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔

"تم میرے ساتھ کچھ نہیں کرو گی۔ سمجھی۔میں بتا رہا ہوں۔" عادل ہکلاتے ہوئے بولا۔مگر کوئی فائدہ نہ تھا۔نیلوفر کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔

"اور تڑپو۔تڑپتے رہو۔میں نے بھی تم سے اس وقت بھیک مانگی تھی۔کہ تم ہمیں انصاف دلواؤ۔تم ان ظالموں کا ساتھ نہ دو۔مگر تم نہ مانے۔تمہارے اس سخت دل پہ کوئی اثر نہ ہوا عادل۔اور اب دیکھو، میرا دل بھی سخت ہو گیا۔" وہ مزے لینے والے انداز میں بولے جارہی تھی۔

عادل کو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔اس کے سامنے اس کی موت کھڑی تھی۔وہ نہیں جانتا تھا اب اس صورت حال سے وہ فرار کیسے حاصل کرتا۔

"دیکھو۔بیٹی۔" بوڑھے عادل نے نرمی اختیار کی۔"ہم آرام سے بات کر سکتے ہیں۔"مگر نیلوفر کے اوپر اس نرمی کا کوئی اثر نہ ہوا۔اس کے چہرے پہ طنزیہ سی مسکراہٹ بکھری۔

"اب بہت دیر ہو گئی ہے۔تم تو انصاف کے نمائندے تھے۔ تمہارے نام میں ہی عدل تھا۔کاش تم نے اپنے عہدے کا احترام کیا ہوتا، تو یہ سب تمہارے ساتھ نہ ہوتا۔یہ انتقام صرف میرا نہیں، ان سب کا ہے جن کے ساتھ تم نے ظلم کیا ہو گا۔میں تمہیں اس دنیا سے ختم کر کے بہت سے اور لوگوں کو انصاف دلوا رہی ہوں۔تم جیسے بھیڑیے اس ہی طرح کے انجام کے مستحق ہیں۔"" عادل کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔اس کی نسیں پھڑکنے لگی تھیں۔چہرہ خوف کے مارے مزید سرخ ہو گیا۔عادل کی سانسیں اتنی اونچی تھی کی نیلوفر تک کو سنائی دیتی تھیں۔

"تم سب کی وجہ سے ہی میں ایسی ہوں۔تم سب ہو نیلوفر کے مجرم۔" وہ جذبات میں آ کے چلائی تھی۔"تم سب نے مجھے برا بنایا۔یہ میرا معاشرے سے انتقام ہے۔" وہ سینہ تان کے اونچی آواز میں بولی تھی۔"اس معاشرے سے جس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔مجھے وہ حق نہیں دیا جس کی میں مستحق تھی۔تم سب نے کیا میرے ساتھ ایسا۔" وہ ہاتھوں کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے چلا چلا کے بول رہی تھی۔وہ اس وقت غیر انسانی لگ رہی تھی۔گھنگرالے بال ماتھے پہ بکھرنے لگے تھے۔وہ واقعی بہت خوفناک لگ رہی تھی، المناک بھی۔چہرے پہ جو وقار ہوا کرتا تھا وہ جنون کی اس کیفیت کے باعث فنا ہو گیا تھا۔

وہ سنگھار میز کی طرف بڑھی۔اور اس نے وہ ڈبا کھولا۔اندر ایک سرنج تھی جس میں کچھ مادہ تھا اور ساتھ ہی ایک کاٹن پیڈ۔عادل الجھتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔نیلوفر ایک ہاتھ میں سرنج اور ایک میں کاٹن پیڈ تھامے عادل کو دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہیں ماروں گی نہیں۔ میں اتنی بھی ہمدرد نہیں اب۔" نیلوفر اس طرح سے مسکرا رہی تھی کہ دانتوں کے ساتھ ساتھ اس کا جبڑا تک نظر آ رہا تھا۔ وہ جنون کے گہرے آغوش میں لگتی تھی۔ عادل کا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں بس تمہیں یہ انجیکشن لگاؤں گی۔ تمہیں ایک اسٹروک آئے گا۔ اور تمہارے اعضاء مفلوج ہو جائیں گے۔ تم اپنی باقی کی زندگی اس محرومی میں گزارو گے۔ جب بھی تمہیں تکلیف ہوگی تو تمہیں میں یاد آؤں گی۔" نیلوفر نے انگلی سے اپنے سینے پہ دستک دی۔ "نیلوفر یاد آئے گی تمہیں۔" ایک اور شیطانی قہقہہ اس کمرے میں گونجا۔ عادل کا اضطراب بڑھنے لگا۔ وہ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

"دیکھو مجھے چھوڑ دو۔" وہ گڑگڑانے لگا تھا۔ نیلوفر آہستہ آہستہ قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ جارحیت تھی۔

"پلیز مجھے چھوڑ دو۔" وہ اب باقاعدہ رو رہا تھا۔ اور یہی تو وہ چاہتی تھی۔ اسے رلانا۔ وہ رویا تو جیسے نیلوفر کا کونا کونا خوش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے ارد گرد سرخی در آئی تھی۔ کنپٹی پہ موجود نس بھڑکنے لگی تھی۔

"دیکھو مجھے معاف کردو۔" وہ چہرہ اوپر کرکے بولا۔ نیلوفر کا وحشت ناک چہرہ اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔ نیلوفر نے عادل کو گردن سے دبوچا۔ اور انجیکشن اس کی گردن کی پشت میں لگایا۔ وہ سرنج میں موجود زہریلا مادہ عادل کے اندر اتارنے لگی۔ عادل چلانے لگا تھا۔ نیلوفر نے سرنج نکالی اور اس جگہ پہ اب کاٹن پیڈ رکھا۔ خون جذب ہونا شروع ہوگیا۔ عادل تکلیف کے مارے بلک رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ مگر اس کی چیخ و پکار، سنی ان سنی ہونے والی تھی۔

نیلوفر نے آگے بڑھ کے اس کی رسی کھول دی۔عادل کرسی سے کھڑا ہوا۔دروازے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر تکلیف کی زور دار لہر اس کے جسم میں ابھری تو وہ زمین پر گر گیا۔وہ بلک رہا تھا۔تکلیف کے مارے تڑپ رہا تھا۔اس کی تکلیف دہ "آہ"اس کے لبوں کی سمت سے باہر آتی تھی۔ نیلوفر چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔تڑپتا وجود ساکن پڑا۔نیلوفر نے اس کے بے ہوش وجود پہ زور دار لات ماری۔

وہ جنون کے آغوش سے باہر آچکی تھی۔وہ اپنا انتقام لے چکی تھی۔اس کے چہرے پہ چھایا وہ المناک سا تاثر فنا ہوا۔اس نے اپنے بالوں کو اپنی آنکھ کے رستے سے ہٹایا۔سر پہ بینڈ ایک دفعہ پھر سے درست کیا۔چہرے پہ اطمینان تھا۔وہ عادل کے بے ہوش وجود کو اس کمرے میں چھوڑ کے باہر نکل آئی۔

باہر دیوار سے ٹیک لگائے شمس بے نیاز سا کھڑا تھا۔نیلوفر کے آتے ہی وہ چوکنا ہو گیا۔

"میں جا رہی ہوں۔سب کام صفائی سے ہو جانا چاہیے۔جس ہسپتال میں بھی جائے اس کی انتظامیہ کو خرید لینا۔یہ صرف ایک اسٹروک ہی لگنا چاہیے۔" حکم جاری کر کے وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔اس کی چال اور بھی شاہانہ ہو گئی تھی۔گردن مزید اکڑنے لگی تھی۔

اس گھر کے گارڈز اسے دیکھ رہے تھے۔وہ سب بھی یہی سوچ رہے تھے کہ، کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ ایک انسان اور اس کے بیوی بچوں کی زندگی تباہ و برباد کر کے آئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محفل ختم ہو چکی تھی اور مہر اب عنایا کے اسکول کے صحن میں کھڑی تھی۔ وہ عنایا کا انتظار کر رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں اب چمک سی آگئی تھی۔جہاں اس کا وجود بے جان لگتا تھا، اب جیسے اس میں ایک نئی روح پھونک دی گئی ہو۔مہر اب بھی ہونے والے واقعے کو پراسس نہیں کر پا رہی تھی۔وہ اب بھی سوچ میں تھی کہ وہ الفاظ، وہ الفاظ جو اسے سمجھ بھی نہیں آئے تھے وہ اتنے سکون بخش کیسے ہو سکتے تھے۔

وہ اسی سوچ میں گم تھی جب اسے احمد نظر آیا۔وہ چلتے ہوئے گردن جھکائے اپنا موبائل استعمال کر رہا تھا۔

"مسٹر احمد یوسف؟" مہر سے احمد کو یوں پکارے بغیر رہا نہیں گیا۔احمد نے موبائل نیچے کیا اور مڑ کے مہر کو دیکھا جو چہرے پہ نرم مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔اس نے آج پہلی مرتبہ اسے اتنے قریب سے اور غور سے دیکھا تھا۔وہ قریب سے دیکھنے میں کافی ہینڈسم نظر آتا تھا۔کالی چمکدار آنکھوں کے اوپر آپس میں جڑی ہوئی بھنویں پھیلی ہوئی تھیں۔پیشانی روشن اور کشادہ تھی۔مہر کے چہرے پہ جو ازلی سختی ہوا کرتی تھی وہ اچانک سے زائل ہو گئی تھی۔اس کی آنکھوں میں شکرگزاری تھی۔

"آپ یہاں پر بھی کام کرتے ہیں؟"مہر کا انداز نہایت نرم تھا۔مہر کو بھی اچانک سے احساس ہوا کہ اس کے اندر کچھ نرم پڑنے لگا تھا۔نہ جانے یہ کیسی تبدیلی تھی جو اس میں اچانک سے نمودار ہو گئی تھی۔احمد کو بھی یاد آگیا تھا کہ یہ مہر تھی، عبداللہ سلطان کی بیٹی، مہر۔

"جی، صبح سے دوپہر ادھر ہوتا ہوں۔لیکن جلد یہ جاب چھوڑنے والا ہوں۔" احمد نے انداز بے حد مختصر سا رکھا تھا۔

”وہ کیوں؟“ مہر اب بھی بھرپور مسکرا رہی تھی۔

”جلد اپنی خود کی ورک پلیس پہ شفٹ ہونے والے ہیں ہم۔اس لیے۔“ وہ آنکھیں جھپکاتے سادگی سے بولا۔مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”اللہ آپ کو کامیاب کرے۔“ یہ دعا اس نے احمد کو دل سے دی تھی۔وہ پھر تھم گئی۔مزید کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے۔

”مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔“ مہر کی مسکراہٹ دھیمی پڑی۔آنکھیں نم ہونے لگی۔

”وہ کیوں؟“ احمد الجھا۔

”آپ کی تلاوت نے۔آپ نہیں جانتے اس نے میرے دل پر کیا اثر کیا ہے۔میں بہت برے حال میں تھی اور اچانک جیسے سب بدلنے لگا۔“یہ سن کے احمد کے چہرے پہ ایک مدھم سی مسکراہٹ بکھری۔ آنکھوں میں چمک در آئی۔اس کا مسکرانا بھی۔۔۔دل پہ خوشگوار گزرتا تھا۔

”مجھے سن کے اچھا لگا۔“ نظریں جھکائے بولتے ہوئے وہ مڑ گیا۔

”سنیں!“ وہ جانے لگا تو مہر نے اسے پیچھے سے پکارا۔وہ جیسے اتنا جلدی اس ملاقات کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔احمد اس کی پکار سن کے مڑ گیا۔

”میں آج سے آپ کے مقروض ہوں۔آپ کو کوئی بھی مدد چاہیئے ہو۔کوئی بھی کام نکالنا ہو۔میں حاضر ہوں۔“ مہر نے اپنے چہرے پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ سجائی۔احمد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور اپنے

سر کو خم دیا۔اس کے چہرے پہ بھی گرم جوش مسکراہٹ تھی۔وہ اسکول سے باہر نکل کے اپنی بائیک کی طرف بڑھا۔اپنی بائیک پہ سوار ہو کے اس نے اس آیت کی تلاوت کی:

رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ

**(یا اللہ! میں محتاج ہوں ہر اس اچھائی کا جو تو نے مجھ پر نازل کی)**

سورہ قصص آیت ۲۴

دوسری طرف مہر بنت عبداللہ سلطان کو اپنا آپ بدلتا محسوس ہوا۔اسے یوں محسوس ہوا کہ پرانی مہر واپس آنے لگی تھی۔

وہ جو مہربان ہوا کرتی تھی۔۔۔

وہ جو ہمدرد ہوا کرتی تھی۔۔۔

وہ شاید ایک دفعہ پھر سے لوٹنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا وقت تھا۔مہر کے کمرے کی تمام بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔چھوٹی عنایا بستر پہ لمبی تان کے سو رہی تھی۔مہر اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ کرسی رکھ کے بیٹھی ہوئی تھی۔اسٹڈی ٹیبل کا لیمپ جل رہا تھا۔اس کے

سامنے تانبے کا وہ خوبصورت ڈبہ رکھا ہوا تھا۔وہ آنکھوں میں الجھن لیے نہ جانے کب سے اس ڈبے کو دیکھے جارہی تھی۔جوں ہی اس نے اس ڈبے کو کھولنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے اپنا ہاتھ اس ڈبے کی سطح پہ رکھا۔اس کی سطح بہت خوبصورت تھی۔مہر نے پھر میگنیٹک لاک کو کھولا۔اندر وہ کالے سرورق والی خوبصورت کتاب رکھی ہوئی تھی۔وہ کتاب اس وقت چمک رہی تھی۔مہر کی آنکھیں اس کتاب کو دیکھ کے ٹھنڈی پڑنے لگیں۔مہر کی دھڑکنوں نے بھی اپنی رفتار پکڑ لی تھی۔وہ کتنے عرصے بعد اس کتاب کو کھولنے جارہی تھی۔آخری دفعہ اس نے اس کتاب کو کب پڑھا تھا، وہ تو یہ تک ٹھیک سے نہ جانتی تھی۔بچپن میں اس کی ماں ہی اسے پڑھایا کرتی تھی۔ماں سے دور ہوئی تو اس کتاب سے بھی اس نے دوری اختیار کر لی۔مہر نے اس باکس میں سے وہ کتاب نکالی اور اپنی ٹیبل پہ رکھ دی۔اس نے شروع سے اسے کھولا۔ہر سطر کے نیچے آیت کا ترجمہ بھی تحریر تھا۔مہر نے پڑھنا شروع کیا۔

”الم“ اس کے لیے پڑھنا تھوڑا مشکل تھا۔وہ بہت طویل عرصے بعد القرآن کی تلاوت کر رہی تھی اس لیے انداز میں روانگی نہ تھی۔

”ذٰلِکَ۔“ مہر کی زبان لڑکھڑائی۔وہ اٹک اٹک کے پڑھ رہی تھی۔

”ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیبَ۔“ وہ اسی طرح سے اٹک اٹک کے پڑھ رہی تھی جس طرح سے کوئی بچہ پڑھتا ہے۔

"ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔" مہر مسکرائی۔ اس نے آخر کار، ایک آیت پڑھ ہی لی تھی۔ یہ خوشی بھی بالکل الگ سی تھی۔

اب اس نے اس آیت کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

"وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے متقین کو۔" مہر نے بھنویں اکٹھا کی۔

"متقین کو؟ مگر یہ متقین کیسے ہوتے ہوں گے؟" مہر نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور وہ آگے پڑھنا شروع ہوئی۔ بھلے سے اسے پڑھنے میں بہت دقت ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی وہ تلاوت جاری رکھنا چاہتی تھی۔ اس جد و جہد کا بھی اپنا الگ ہی مزہ تھا۔

"الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ۔" اس بار پہلے سے کم مشکل درپیش ہوئی۔ مہر نے دوسری آیت بھی پڑھ ہی لی۔ اس نے اب ترجمہ پڑھا۔

"جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" مہر کے لب "اوہ" میں ڈھل گئے۔ اس کو جواب بھی مل گیا تھا۔

"تو یہ ہوتے ہیں متقین۔" اس نے دل ہی دل میں خود کلامی کی۔ وہ اب آگے بھی پڑھنے لگی۔

رات گہری ہوتے گئی۔ اور مہر نہ جانے کتنی ہی دیر اس کتاب کو پڑھتے گئی اور دنیا کے تمام غم بھلاتے گئی۔ وہ اپنی ہر تکلیف سے آزاد ہوتی گئی۔ اس کا دل بالآخر مطمئن ہونے لگا تھا اور روح پر سکون۔ اللہ کی اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اسے ایک الگ قسم کی خوشی مل رہی تھی۔

اور آخر کار پرانی مہر بنت عبداللہ سلطان بھی واپس آ ہی گئی تھی۔۔۔

وہ جو مہربان ہوا کرتی تھی۔۔۔

وہ جو ہمدرد ہوا کرتی تھی!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ۴: اٹل اور یقینی

وہ لوگوں سے تو چھپ جاتے ہیں

(لیکن) اللہ سے نہیں چھپ سکتے

وہ راتوں کے وقت جب اللہ کی نا پسندیدہ باتوں

کے خفیہ مشورے کرتے ہیں

اس وقت بھی اللہ ان کے پاس ہوتا ہے،

ان کے تمام اعمال کو وہ

گھیرے ہوئے ہے۔

(سورہ نساء آیت ۱۰۸)

☆☆☆☆☆☆☆☆

جہاں رات کے وقت زیادہ تر آبادی اپنی خواب گاہوں میں نیند کے آغوش میں ڈوبی ہوئی تھی، کچھ تھے جو رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس آبادی کی نیند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے شیطانی منصوبے بنانے میں لگے ہوئے تھے۔یہ وہ تھے جو کہ اس آبادی کی لا علمی کی وجہ سے، لا شعوری کی وجہ سے اب تک زندہ سلامت بیٹھے تھے۔یہ وہ تھے جو اپنے آپ کو کامل طاقت سمجھ بیٹھے تھے۔تکبر کی بھینٹ چڑھنے والے، انسانوں کے روپ میں بھیڑیے تھے۔یہ لوگ سیاہ تھے، ان کی روح سیاہ تھیں۔

آئیں رات کے اس وقت ہم عافیت زندگی کے ہسپتال کا رخ کرتے ہیں، جہاں وہ چاروں اپنے اندر بسے شیاطین کی پیروی کرتے ہوئے اپنے منصوبے بنانے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے۔

لفٹ اس سفید سے چمکتے دمکتے ہال میں اتر رہی تھی۔لفٹ کا دروازہ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ کھلا تو اس کی گرجدار شخصیت نمایاں ہوئی۔کالا لانگ ڈریس اور کالی ہیلز، چہرے پہ ملکہ جیسا تاثر لیے، وہ اس حال میں تحکمانہ چال چلنے لگی۔ہال بالکل خالی تھا، بس سامنے والی سفید دیوار پہ تین دروازے تھے۔تینوں دروازے اپنے اندر ایک تاریک راز چھپائے ہوئے تھے۔

حال چھت پہ لگی تیز بتیوں کی وجہ سے بھرپور چمک رہا تھا۔سینٹرل کولنگ سسٹم کی وجہ سے اس حال میں کافی سکون تھا۔وہ دیوار کے دائیں جانب جو دروازہ بنا تھا اس کی طرف چل رہی تھی۔اس نے اپنے چہرے پہ نیم سی برہمی طاری کر رکھی تھی۔اس نے دروازے کے سرد ناب پہ اپنا جھری زدہ ہاتھ جمایا۔اب وہ ہاتھ ناب کو گھماتا نظر آرہا تھا۔

دروازہ اپنی مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور اس نے قدم اس کمرے کے سفید فرش میں رکھا۔ اس کے آتے ہی وہ سب چوکنا سے ہو گئے۔ ہوتے بھی کیوں نہیں، ملکہ بالآخر آگئی تھی!

اس کمرے میں چار کرسیاں گول دائرے کی صورت میں لگائی گئی تھیں۔ دیوار سے ایک میز لگا کے رکھی گئی تھی جس پہ پانی کی ایک بوتل موجود تھی۔ لیڈی اقتدار نے آتے ساتھ ہی پہلے تو سب کو سرد سی گھوری سے نوازا۔ پھر بے نیاز سی چال چلتے وہ ایک کرسی پہ براجمان ہو گئی، جو اسی کے لیے چھوڑی گئی تھی۔ گردن اب بھی پوری شان سے اکڑی ہوئی تھی۔ سب اپنی مالکن کو چہرے پہ سنجیدگی لیے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

اندھیرے اور بدی کی ملکہ نے بالآخر اپنے چیلوں سے کلام کرنا شروع کیا۔

"یہ ملاقات بھی ہو ہی گئی۔" لیڈی اقتدار کی بھاری گرجدار آواز اس کمرے میں گونجی۔ اس کے انداز میں کچھ مصنوعی سا تھا۔ "میں کتنا چاہتی تھی کہ یہ ملاقات نہ ہو۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس کے قتل کا منصوبہ بنانے کے لیے یہاں اکٹھے ہوں۔ مگر خیر۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ قتل اب ہماری ضرورت ہے۔ یہ قتل اٹل ہے اور یقینی بھی۔" لیڈی اقتدار نے ایک مختصر سی تقریر دی۔ سب غور سے اسے سن رہے تھے۔ درانی کے چہرے پہ کچھ الجھن سی تھی۔ آنکھوں پہ ناگواری۔ یقیناً اسے قتل کی ترغیب خاص بھا نہیں رہی تھی۔

"نیلوفر! سب سے پہلے تم اس بات کی تصدیق کرو، کہ اس قتل میں تمہاری بھی شراکت ہے۔" لیڈی اقتدار نے اپنی تکبر آمیز نگاہ نیلوفر پہ ڈالی جو کہ نظریں جھکائے سب سن رہی تھی۔

"جی۔اس سب میں میری پوری مرضی شامل ہے۔" نیلوفر سادگی سے سر اوپر نیچے ہلاتے بولی۔

درانی کے چہرے پہ چھائی الجھن میں مزید اضافہ ہونے لگا۔کچھ تھا جو اسے بری طرح سے ٹھٹک رہا تھا۔

"لیڈی اقتدار۔وہ مر گیا تو ہم اپنے ہیرے کیسے حاصل کریں گے؟"درانی نے بالآخر اپنی الجھن کا اظہار کر ہی ڈالا۔پہلے تو لیڈی اقتدار نے ستائش انگیز نگاہ درانی پہ مرکوز کی۔پھر اپنی نگاہوں کو نارمل کرتے وہ جواب دینا شروع ہوئی۔

"اس کے زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہیرے حاصل کرنا ناممکن ہے۔ہم کب تک اس کے ہاتھ سے یوں ہی بلیک میل ہوتے رہیں گے درانی؟" لیڈی اقتدار نے ٹھہر ٹھہر کے کہتے ہوئے ایک سرد سی نگاہ درانی پہ ڈالی۔درانی کے چہرے پہ الجھن ہنوز برقرار تھی۔اب اس نے اپنی نگاہ درانی پر سے ہٹائی۔ آنکھوں میں اس کے بے دردی پھیلنے لگی۔

"یاد رکھو درانی۔وہ بے وفا ہو گیا ہے۔" وہ کسی بھی طرح سے درانی کو قائل کرنا چاہ رہی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنے بڑے فیصلے میں اس کا دائیاں ہاتھ اس کی یوں مخالفت کرے۔"بے وفائی کرنے والوں کی سزا صرف ایک ہے، موت۔" لیڈی اقتدار کی سفاک آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"صرف اور صرف موت!"وہ ایک دفعہ پھر سے بولی لیکن اب کی بار اپنے لفظوں پہ زور دیا۔اس کے انداز میں دھمکی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔اب کی بار جب اس نے اپنا رخ درانی کی طرف موڑا تو اس کے چہرے پہ چھائی الجھن قدرے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔مگر پوری طرح سے ختم نہ ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے لیڈی۔میں جانتا ہوں وہ ہمارے راز سے واقف ہے اور اس بات کا وہ نا جائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔لیکن اگر ہم بھی اس کے بارے میں کوئی بھیانک راز کھوج نکالیں۔یوں ہی اسے بلیک میل کریں۔کیا یہ کام نہیں کرے گا؟“ وہ پر سکون سے انداز میں اپنی تجویز لیڈی اقتدار کے سامنے پیش کرنے لگا۔لیڈی اقتدار نے سست روی سے گردن نفی میں ہلائی۔

”نہیں۔کوئی فائدہ نہیں ہو گا درانی۔وہ جو ہمارے بارے میں جانتا ہے اگر اس نے وہ اس جذباتی عوام میں پھیلا دیا تو ہمارا پورا کا پورا کاروبار ڈھے جائے گا۔لا علمی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ہمیں اس لا علمی کو بر قرار رکھنا ہو گا۔“ درانی نے آگے سے کچھ نہ کہا۔اس کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”لیکن وہ ہیرے لیڈی۔ہم انہیں کیسے بازیاب کر وائیں گے؟“ اس بار بولنے والا شمس تھا۔

لیڈی اقتدار کے چہرے پہ گہری مسکراہٹ در آئی۔ساتھ ساتھ نیلوفر بھی مسکرا دی۔

”اس کے لیے تو ہمارے پاس۔۔۔وہ ہے۔“

مسکراتی نیلوفر اور مسکراتی لیڈی اقتدار کی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔اس کمرے میں صرف وہی دونوں تھے جو جانتے تھے کہ یہ ”وہ“ کون ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اللہُ اکبر اللہُ اکبر

اس کے کمرے کی کھڑکیوں کے ذریعے آذان کی آواز داخل ہوئی اور اس کے کانوں کی زینت بنی۔مہر، جو نیم دراز ہو کے کمرے میں سو رہی تھی، اس نے اپنی پلکیں کھولیں۔آنکھوں میں غنودگی بھری تھی۔اس نے کروٹ بدلی اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔وہ دوبارہ سونے لگی۔

اللہُ اکبر اللہُ اکبر

کروٹ لے کر لیٹی مہر کی ایک مرتبہ پھر سے آنکھ کھلی۔اردگرد کا جائزہ لیتی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے بیٹھی۔چہرے پہ تھکان اور آنکھوں میں غنودگیت ہنوز پھیلی ہوئی تھی۔

اشھدُان لا الہ الا اللہ اشھدُان لا الہ الا اللہ

آنکھیں بند کیے وہ ایک دفعہ پھر سے نیند کے آغوش میں جانے ہی والی تھی کہ آذان کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔اس کا دماغ اب ہلکا پھلکا سا جاگنے لگا تھا۔وہ سمجھ گئی تھی کہ آذان ہو رہی تھی۔فجر کی آذان۔مگر آنکھوں میں چھائی غنودگی اتنی شدید تھی کہ اس نے سر جھٹک کے سونے کا فیصلہ کیا۔

”جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“

رات میں جس آیت کا ترجمہ پڑھا تھا وہ اب اس کے دماغ میں گردش کرنے لگی۔ وہ نیند کے آغوش سے ایک مرتبہ پھر باہر آئی۔ پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے اپنا کمبل اپنے جسم سے جدا کیا۔یہ کرنا ہی

صرف اس کے لیے کتنا مشکل تھا، صرف وہی جانتی تھی۔بار بار دماغ سے پکار آتی کہ وہ سو جائے۔نرم و ملائم بستر جیسے بضد تھا مہر کو اپنا مہمان بنانے کے لیے۔مگر اب کی بار اس نے ہر پکار نظر انداز کی۔

آذان کی آواز اب بھی کمرے میں گونج رہی تھی۔

اس نے اپنے پیر چپلوں میں گھسیڑے۔وہ اب غسل خانے کی طرف جانے لگی۔نیند کے مارے اس کا سر چکرا رہا تھا۔مگر اب وہ غفلت کی نیند نہیں سو سکتی تھی۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اس کا نفس جاگ چکا تھا۔اس نے اپنے غسل خانے کی تیز بتیاں جلائیں تو اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔آنکھوں کو موندتے اس نے پانی کا نل کھولا اور وضو کرنا شروع کیا۔

جس طرح ٹھنڈا پانی اس کے چہرے سے ٹکرایا اس کی نیند کم تر کم ہوتے گئی۔دماغ اب جاگنے لگا۔سر پہ چھائی دھند ہوا ہونے لگی۔وضو کر کے وہ باہر آئی۔اس نے اپنے سر پہ ڈوپٹہ اسکارف کی صورت میں باندھا۔جائے نماز قبلہ کی جانب بچھا کے اس نے نماز پڑھنا شروع کی۔

وہ ایک طویل عرصے بعد نماز پڑھ رہی تھی۔وہ ایک طویل عرصے بعد اپنے رب کی طرف لوٹی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد وہ غفلت کی نیند سے جاگی تھی۔اس نماز کے دوران اس کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھ سے آنسو بھی پھوٹ پڑے۔وہ اس وقت حیران بھی تھی کہ آخر وہ رب اس پہ اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ اتنے لمبی زندگی غفلت میں کاٹنے کے باوجود اس کا رب اس پہ اتنا مہربان تھا کہ اسے اپنے سامنے حاضر کر رکھا تھا۔اس کا رب اس پہ اتنا مہربان تھا کہ اسے یوں سجدہ کرنے کی توفیق دے رہا تھا۔اس کا رب واقعی بڑا مہربان تھا۔

وہ اللہ ہے، ہمارا پروردگار۔ رحمٰن و رحیم۔ بس ایک قدم بڑھانے کی دیر ہوتی ہے اور وہ ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ ہمارا رب ہے، ہم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ایک قدم بڑھانے کی دیر ہوتی ہے اور وہ ہماری ہر غفلت اور ہر کوتاہی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

وہ رب واقعی بہت مہربان ہے۔

نماز ختم کر کے اس نے دعا مانگی۔ اپنا اسکارف اتار کے وہ ایک مرتبہ پھر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کی روح اب مکمل محسوس کر رہی تھی۔ اس کے زخم اب بھرنے لگے تھے۔

یہ مہر کے لیے کوئی عام فجر نہیں تھی، بلکہ یہ مہر کی زندگی کی بھی فجر تھی۔ مہر کی زندگی کی تاریکی کو ایک نا دیدہ روشنی چیر رہی تھی۔ یہ روشنی اسے ایک نئی زندگی بخش رہی تھی۔

یہاں سے مہر کی زندگی کی نئی شروعات کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں سے اس کی زندگی بدلنے والی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی بے معنی نہیں لگتی تھی۔ لگتی بھی کیسے، وہ یہ حقیقت تسلیم کر چکی تھی کہ اس کا رب اللہ ہے۔ اور جن کا رب اللہ ہوتا ہے ان کی زندگی بے معنی ہو ہی نہیں سکتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جہاں مہر کی زندگی کی ایک نئی شروعات ہوئی، وہاں ایک نئی شروعات حسام کے لیے بھی منتظر تھی۔

ہم اپنی کہانی کو کچھ دن آگے بڑھاتے ہیں۔

اس دن حسام کی طبیعت کچھ ناساز تھی جس کے باعث وہ آفس نہیں گیا۔ دن کے اس پہر وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ نارنجی شرٹ اور بلو پجامے میں ملبوس وہ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت اس کے گھر کی بیل بجی۔ حسام نے ٹی وی ریموٹ سے بند کیا اور صوفے سے اٹھا۔ کمزوری کے باعث چال تھوڑی بجھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے کے پار سے آواز سن لی تھی اور وہ جانتا تھا کہ جمعدار آیا ہے۔ اس نے اپارٹمنٹ کے جدید اوپن کچن کا رخ کیا اور وہاں سے کچرا اکٹھا کیا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس نے گھر کا کچرا جمعدار کے حوالے کیا۔

"صاحب! پانی دے دیں۔" جمعدار تیز تنفس کے ساتھ بولا تھا۔ اس کا منہ ایک طرف سے پھولا ہوا تھا۔ اور اس کی آواز بھی پھنس پھنس کے ادا ہوتی تھی۔ دانت اس کے بالکل بھورے تھے، جیسے لوہے پر زنگ لگا ہو۔ حسام کی نظر اس جمعدار پہ پڑی تو اسے نہ جانے کیوں اس پہ ترس آیا۔

سر جھٹکتے ہوئے وہ اندر گیا اور پانی کا بھرا ہوا گلاس لے کر آیا۔ جمعدار نے ایک جھٹکے میں پانی نگل لیا۔

"صاحب تھوڑا اور۔" وہ پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے بولا۔ حسام دوبارہ اندر گیا اور ایک اور پانی کا بھرا ہوا گلاس لے کر آیا۔ جمعدار نے ایک جھٹکے میں پانی اپنے اندر اتارا اور دوبارہ سے مانگا۔ حسام دوبارہ سے گیا اور پانی لے کر آیا۔ اب کی بار جمعدار کی آنکھوں میں شرمندگی اترنے لگی۔ اس کی پیاس اب تک نہیں بجھی تھی۔

"صاحب میری کڈنیز خراب ہو رہی ہیں۔ بہت پیاس لگتی ہے، منہ بالکل خشک ہو رہا ہے، اس لیے بار بار پانی مانگ رہا ہوں، آپ ایک دفعہ پوری بوتل بھر کے لے آئیں۔" جمعدار شرمسار سے انداز میں بولا۔ حسام نے ستائشی نگاہ جمعدار پہ ڈالتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ وہ جوان سا لگتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ بھی پینتیس سال کا۔ پھر اتنا برا حال کیسے؟ اس نے سوچا۔

حسام بہر حال پانی کی بوتل بھر کے لے آیا۔اس نے بوتل جمعدار کو تھما دی۔

”ہوا کیا ہے ویسے؟ اتنی سی عمر میں اتنے مسائل؟“ حسام کے انداز میں ہچکچاہٹ سی تھی۔

”صاحب گٹکے کی وجہ سے ہوا ہے۔گٹکے نے اندر سے سب کچھ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔“ جمعدار نے آہیں بھرتے ہوئے کہا۔حسام کے چہرے پہ جمعدار کے لیے افسوس نمایاں ہونے لگا۔اس نے اپنی گردن مایوسی سے دائیں بائیں ہلائی۔

”چھوڑ کیوں نہیں دیتے سب۔“ حسام کی آواز میں ناگواری سی تھی۔مگر یہ ناگواری جمعدار کے لیے نہ تھی، اس کی لت کے لیے تھی۔وہ بھی ایک زمانے میں کسی لت کا شکار تھا۔وہ جانتا تھا کہ یہ لت انسان کو کتنا مجبور کر دیا کرتی تھیں۔

”نہیں چھوڑ سکتا صاحب۔بس اب جو ہے وہ ہے۔“ حسام کو اب بے چارے جمعدار پر مزید ترس آیا۔اسے اپنا پرانا وقت بھی شدت سے یاد آیا۔

”کیوں بھائی؟ بیوی بچے نہیں تمہارے؟“ حسام تڑپ کے بولا۔

”جی دو بچے ہیں۔“ حسام چچ چچ کرتے رہ گیا۔اس کا دل اب بھاری ہونے لگا۔

”تو بھائی کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔اپنے بیوی بچوں کے لیے ہی سہی،لیکن سب کچھ چھوڑ دو۔“ حسام سے جیسے اس جمعدار کا یہ حال برداشت نہیں ہو رہا تھا۔وہ ویسے تو زیادہ بات چیت کرنے والا انسان نہ تھا، اور یوں کسی کو لیکچر پلانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر حسام بھی بس بے بس تھا۔اس سے جمعدار کی یہ حالت جیسے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں چھوڑ سکتا۔کوشش کی تھی میں نے۔" جمعدار کے انداز میں لاچارگی تھی۔

"تمہیں پتا ہے تمہارا کتنا برا حال ہوگا۔ تمہیں لگ رہا ہے آسانی سے موت آجائے گی۔ایسے معاملات میں موت بھی اذیت ناک آتی ہے۔ تمہیں منہ کا کینسر ہوسکتا ہے۔تمہارے گردے اور تمہارا جگر نا کارہ ہو سکتا ہے۔تم سمجھ بھی رہے ہو؟" حسام نے اب نتائج سے ڈرا کے جمعدار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔اس کے انداز میں بے بسی سی تھی۔

"صاحب میں نہیں چھوڑ سکتا۔"جمعدار ڈھٹائی سے اپنی گردن ہلاتا رہ گیا۔حسام کا چہرہ اور بھی تن گیا۔

"کوئی ریہیب ہی چلے جاؤ۔" لیکن حسام نے ہار نہ مانی۔وہ بس اب اس جمعدار کو تڑپتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میں نے کوشش کی تھی۔مگر یہ ریہیب بہت مہنگے ہوتے ہیں۔" جمعدار بے چارہ بھی اپنی جگہ پہ بے بس تھا۔

"کیا واقعی؟" حسام خاموش پڑا۔جمعدار نے مایوسی سے سر ہاں میں ہلایا۔

ہم نے معاشرے میں ڈرگز، تمباکو نوشی اور بہت سی ایڈکشنز کو تو عام کر دیا ہے مگر ان کو ترک کرنے کی جد و جہد کو ابھی تک ہم عام نہ کر سکے۔زمانہ اس قدر بگڑتا جا رہا ہے کہ اگر کوئی اسموکنگ کو غلط قرار دے تو اسے دقیانوس تک قرار دے دیا جاتا ہے۔اس سب کے باعث جو لوگ اپنی ایڈکشنز کو چھوڑنا چاہتے ہیں ان کے لیے چیزیں اور بھی مشکل ہو جاتی ہیں۔ان میں سے کچھ معاشی تنگی کا شکار

ہوتے ہیں اور کچھ کے اوپر معاشرتی دباؤ ہوتا ہے۔اب آپ خود سوچیں جب ایک نو عمر بالغ لڑکا آس پاس ہر کسی کو سگریٹ پیتے دیکھے گا تو کیا اس کا دل نہیں للچائے گا؟

یہی سب سوچ کے حسام کافی ڈسٹرب سا ہونے لگا تھا۔

"تم کل صبح آجانا۔میں تمہیں ریہیب سینٹر میں داخلہ دلوادوں گا۔" حسام کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"صاحب میرے بیوی بچے کیا کریں گے پھر؟"

"تم مجھے اپنا پتا بتا دینا۔بس تمہیں اب صحیح طرح سے ریہیب مکمل کرنی ہوگی۔بیچ میں بھاگ نہ جانا، ٹھیک؟" حسام کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔جمعدار بھی خوش نظر آرہا تھا۔

"کیا میں واقعی میں صحت مند ہو سکتا ہوں صاحب؟"اور ہر ایڈکٹ کی طرح یہ جمعدار بھی دل ہی دل میں کہیں نہ کہیں خواہش مند ضرور تھا کہ وہ صحتیاب ہو جائے۔

"ہاں بالکل۔مجھے دیکھو۔میں نو سال تک نشہ کرتا رہا ہوں۔اور اب ایسا لگتا ہے کیاکہ میں نے زندگی میں کبھی نشہ کیا ہے؟" جمعدار نے اوپر سے نیچے تک حسام پہ نظر دوڑائی،جو اس وقت کافی صحت مند نظر آتا تھا۔اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"بس پھر تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" حسام نے پر اعتماد سے انداز میں کہا۔جمعدار حسام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔حسام کے دل سے بوجھ سرک گیا۔مگر اب بھی اس کے دل میں کہیں نہ کہیں چبھن سی تھی۔وہ لاؤنج میں صوفے پہ پھر سے بیٹھ گیا۔وہ یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس جمعدار کی

طرح اور بھی کتنے لوگ ہوں گے جو کہ اپنی ان ایڈکشنز کا توڑ تلاش کر رہے ہوں گے، مگر بار بار ناکام ہو جاتے ہوں گے۔نہ جانے ایڈکشنز کی اور بھی کتنی اشکال تھیں؟ اور کتنی اقسام تھیں؟

ٹھیک اسی وقت حسام کے دماغ میں ایک خواب نے جنم لیا۔اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔اسے جیسے گھر بیٹھے بیٹھے کرنے کو کچھ عظیم مل گیا تھا۔چہرے پہ بے یقینی لیے وہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا۔وہ اپنی سوچ پہ اس وقت خود بھی حیران تھا۔

"میں بھی ایک ریہیب کھولوں گا۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے تہیہ کیا۔

ہم انسانوں کو بس ایک ٹرگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک ٹرگر جو ہمارے دل میں آگ سی بھڑکا دے۔ایک ٹرگر جو کہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دے۔ایک ٹرگر جو ہمیں اپنی زندگی کے اوپر نظر ڈالنے پہ اکسائے۔مہر بنت عبداللہ سلطان کو وہ ٹرگر احمد کی تلاوت کے روپ میں ملا۔اور حسام کو یہ ٹرگر جمعدار سے اس ملاقات کے بعد ملا۔

مناج کو اپنا ٹرگر اب تک نہیں ملا تھا۔عنقریب قدرت اس پہ بھی بہت مہربان ہونے والی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد کی کالی کلٹس اسلام آباد کی دھوپ میں نہاتی سڑکوں پہ رواں تھی۔وہ اپنی کلٹس چلاتے ہوئے ایک سو بیس گز کے کمرشل مکان کے باہر رکا۔اپنی کلٹس سے اتر کے وہ کمر پہ ہاتھ باندھے اس ایک سو بیس گز کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ بھی تھی۔آج کا دن احمد کی

زندگی کے اہم ترین دنوں میں سے ایک تھا۔ آج احمد کا ایک خواب پورا ہونے جارہا تھا، وہ خواب جس کے لیے وہ سالوں سے محنت کر رہا تھا۔

احمد نے اس وقت ایک بے شکن کالا کوٹ پہنا ہوا تھا۔کوٹ کے بٹن کھولے ہوئے تھے اور سفید شرٹ نمایاں تھی۔ بالوں کو اس نے بھرپور نفاست سے سیٹ کیا ہوا تھا۔اس نے ہاتھ میں مہنگی واچ پہنی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں کالا چشمہ تھا۔کالے جوتے پالش کے باعث بھرپور چمک رہے تھے۔

عمارت کے دروازے سے اندر آئیں تو ایک پتلی سی راہداری تھی جو سیدھا واشروم تک جاتی تھی۔ راہداری کے دائیں جانب دیوار کو کھلا چھوڑا گیا تھا جہاں سے آفس کا اصل حصہ شروع ہوتا تھا۔آفس کی دیواروں کے ساتھ ہی ڈیسک لگائی گئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی نرم و ملائم کرسیاں بھی تھیں۔ ایک دیوار پہ دروازہ بنا تھا جو کہ احمد کے کمرے میں کھلتا تھا۔

آفس کے بیچ و بیچ کل ملا کے بارہ لوگ ہنستے مسکراتے باتیں کرتے نظر آرہے تھے۔سب ہی کافی خوش اور پر جوش نظر آرہے تھے۔یہ سب احمد کے اسٹوڈنٹ ہوا کرتے تھے، جن کو احمد نے اپنی ٹیم میں شامل کیا تھا۔کچھ سال پہلے احمد نے اپنے نام کمپنی ریجسٹر کروائی تھی۔یہ کمپنی سوا دو سال سے ریموٹلی آپریٹ کر رہی تھی۔یہ اسٹوڈنٹس شروع سے اس کے ساتھ تھے۔احمد نے پھر فنڈز اکٹھا کیے تاکہ وہ اپنی خود کی ورک پلیس بنا سکے۔اور آخر کار، اس کی ورک پلیس بن گئی تھی۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو سارے ایمپلائیز چوکنا سے ہو کے دروازے کی جانب متوجہ ہوئے۔وہ سب جان گئے تھے کہ ان کا باس آگیا تھا۔

احمد گردن جھکائے اندر داخل ہوا۔اس نے اپنا کالا چشمہ اتارا تو کالی چمکدار آنکھیں نمایاں ہوئیں۔اس نے اب ایک سرسری سی نگاہ اپنے ایمپلائیز پہ ڈالی۔اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے سالوں کا خواب اس کا آج پورا ہو رہا ہو۔جیسے اس کا جنون آج اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہو۔آفس کی ٹھنڈی اور پر سکون فضا میں اس نے ایک سانس اندر نکالی اور ایک باہر۔

یہ آفس، یہ سب اس کا تھا۔یہ احساس اسے طاقت بخش رہا تھا۔

"السلام و علیکم!" احمد نے چہرے پہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔ہر کسی نے اس کے سلام کا جواب دیا۔احمد نے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔

"آج کا دن، میرے لیے اور آپ سب کے لیے بہت اہم ہے۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کے بات کرتا تھا۔ ہر ایک الفاظ سننے والے کو صاف صاف سمجھ آتا تھا۔"آج کے دن ہمارا ایک خواب پورا ہوا ہے۔آج ہمارے رب کے کرم سے ہم اپنی ورک پلیس میں موجود ہیں اور آئندہ ہم یہیں سے کام کیا کریں گے۔کچھ سال پہلے تک کیا آپ سب نے سوچا تھا کہ ہماری بارہ لوگوں کی ٹیم بھی ایک ورک پلیس میں کام کرے گی؟ مگر دیکھیں ہم سب یہاں موجود ہیں۔اس لیے آپ سب نے اللہ کا بے پناہ شکر ادا کرنا ہے۔"احمد نے گردن جھکائی اور کچھ قدم آگے بڑھائے۔پھر سے گردن اٹھا کے اپنی بات جاری رکھی۔

"آج ہم سب کے لیے ایک نیا آغاز ہے۔اور میں آپ سب سے یہی چاہتا ہوں کہ آپ نے آئندہ، آنے والے وقتوں میں اس سے بھی زیادہ محنت کرنی ہے۔یہ سب ہم سب کی ملی بھگت تھی، ہم سب کی محنت تھی۔اب ہم آگے اتنی محنت کرنے والے ہیں کہ ایک دن اس سے بھی بڑی ورک پلیس میں

کام کریں۔" احمد کے سارے ایمپلائیز مسکرا کے اسے دیکھنے لگے۔اس نے کوئی بہت بڑی تقریر نہ دی تھی۔بس مختصر سے انداز میں اپنا پیغام ان تک پہنچایا۔وہی ان سب کی حوصلہ افزائی کے لیے کافی تھا۔ وہ لوگ بھی اپنے باس کی شخصیت اور اس کے ہر انداز سے بخوبی واقف تھے۔

احمد نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھانا شروع کیے۔اس کے ایمپلائیز بھی اب اپنی کرسیاں پکڑنے لگے۔احمد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔کمرہ درمیانہ سا تھا۔زیادہ بڑا بھی نہیں نہ زیادہ چھوٹا۔لیکن کافی نفاست سے بنایا گیا تھا۔ایک دیوار شیشے کی تھی جس کے ساتھ پردے بھی لگائے گئے تھے کہ اگر شیشے کی اس دیوار کے پار کا منظر نہ دیکھنا ہو تو پردے گرائے جا سکتے تھے۔ساتھ ہی ڈیسک تھی جو کہ فی الحال سیٹ نہیں ہوئی تھی۔احمد سست سے قدم اٹھاتے اپنی کرسی کی جانب آگیا۔اور پھر اس نرم و ملائم کرسی پہ بیٹھ گیا۔

اس وقت اسے اپنی کندھے بھاری سے محسوس ہونے لگے تھے۔یہ چھوٹی سی کمپنی، اور اس کے اندر کام کرنے والے بارہ ایمپلائیز، یہ سب اس کی ذمہ داری تھے۔احمد کو اس ذمہ داری کا اس وقت شدت سے احساس ہوا۔

ہم جس طرح سے اڑان بھرتے ہوئے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک کا سفر کرتے ہیں۔ہماری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی ہر مرحلے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔احمد کو بھی اس وقت اس بڑھتے بوجھ کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر بنت عبداللہ سلطان اب وقتاً فوقتاً اپنے آفس کا چکر لگا لیا کرتی تھی۔اسے اب بھی کام کرنے کا خاص شوق نہ تھا لیکن پھر بھی کچھ دیر کے لیے وہ آفس آجایا کرتی تھی۔ اس وقت مہر اپنے آفس کے کمرے میں بیٹھی اسکرین کو بے مقصد گھورے جا رہی تھی۔ٹھیک اسی وقت عبداللہ سلطان نے دروازے پہ دستک دی۔

"کیا میں اندر آجاؤں مہرو؟" وہ مسکرا کے گرم جوش انداز میں بولے۔مہر بھی مسکرا دی۔اللہ کی کتاب سے تعلق قائم کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہوا تھا کہ اس کا دل اپنے کے ڈیڈ کے لیے صاف ہو گیا تھا۔ وہ اب ان سے نرمی سے بات کیا کرتی تھی۔وہ اب ان سے تلخ ہو کے کلام نہیں کرتی تھی۔اس نے آخر کار اپنے ڈیڈ کو معاف کر ہی دیا تھا۔

"ارے!" وہ اچنبھے سے بولی۔"پوچھنے کی کیا ضرورت تھی ڈیڈ؟" وہ بھی خوشگوار سے انداز میں بولی۔ عبداللہ سلطان اندر آئے۔چہرے پہ فخریہ مسکراہٹ لیے وہ اپنی مہرو کو دیکھنے لگے۔انہیں بھی مہر میں یہ تبدیلی نظر آئی تھی۔اور وہ بھی اس تبدیلی سے کافی مطمئن تھے۔

عبداللہ سلطان مہر کے سامنے والی کرسی پہ براجمان ہو گئے۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ تمہیں اس طرح سے مطمئن دیکھ کے میں کتنا پر سکون ہو مہرو۔" وہ آسودہ سے انداز میں بولے تھے۔مہر زیر لب ہنس دی۔

"اچھا؟ کیا میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی؟" وہ شوخ سے انداز میں بولی تھی۔

"نہیں۔ تم ایک دم سے بجھ گئی تھی۔ اور اب تمہارے چہرے پہ، تمہاری شخصیت میں جیسے رونق آ گئی ہے مہرو۔" ان کا ہر الفاظ شفقت سے بھرپور تھا۔ وہ جیسے بھی تھے، اس کے والد تھے۔ وہ اپنی مہرو سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اگر انہوں نے کورٹ کے کیس میں مہر کو اس کی ماں سے جدا کیا تو وہ بھی اپنی محبت سے مجبور ہو کے کیا تھا۔ غلط کیا تھا، مگر صرف اور صرف مہر کی محبت کے خاطر کیا تھا۔

مہر کی مسکراہٹ دھیمی پڑی۔

"میں بس اپنے طلاق کے غم سے نکلنے لگی ہوں ڈیڈ۔" وہ گہری سانس لیتے بولی تھی۔ وہ اپنے کندھوں سے جیسے بہت کچھ جھٹکتے ہوئے یہ سب کہہ رہی تھی۔ "جب وہ میری زندگی سے گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی ختم ہو گئی ہو۔ مگر اب مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا ہے کہ کسی کے آنے یا جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی ڈیڈ۔ وہ گیا تب ہی تو مجھے پتا چلا کہ آخر زندگی ہے کیا۔ زندگی صرف رشتوں کا نام تھوڑی ہے۔ زندگی صرف محبت کے مکمل ہونے کا نام نہیں ہے۔ زندگی اس سب سے بڑھ کر ہے۔ زندگی بہت معتبر ہے ڈیڈ، اور اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں اب تک اپنی زندگی ضائع کر رہی تھی۔" اس کی آنکھوں میں تمانت تھی۔ وہ دل سے مطمئن تھی۔

مہر سادگی سے، چہرے پہ آسودہ سا تاثر لیے اپنے ڈیڈ کو سب بتاتے چلی گئی۔ اور وہ اسے تعجب سے دیکھتے گئے۔ وہ اس وقت حیران تھے کہ آخر ان کی بیٹی انہیں اپنے دل کی بات کیسے بتا رہی تھی؟ ایک وقت تھا جب وہ ان سے ٹھیک سے بات تک نہیں کرتی تھی۔ اور آج یوں ہی وہ انہیں اپنے دل کی باتیں بتا رہی تھی۔ یہ کیسا معجزہ تھا آخر؟ عبداللہ سلطان نے سوچا۔

عبداللہ سلطان کے چہرے پہ اس وقت رنج اترنے لگا۔دل میں وہ بھی کہیں نہ کہیں جانتے تھے کہ انہوں نے مہر کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔انہیں اپنی محرومی یاد آرہی تھی۔ کیسے وہ اسے وقت نہیں دیا کرتے تھے۔وہ وقت مانگتی تھی تو اسے جھڑک دیا کرتے تھے۔پھر ایک وقت آیا جب انہیں احساس ہوگیا تھا کہ ان کی بیٹی ان سے کوسوں دور جاچکی تھی تب انہوں نے جب مہر سے وقت مانگا تو وہ ہی ان سے تلخ ہو جایا کرتی تھی۔اتنے سالوں تک وہ انتظار کرتے رہے کہ مہر انہیں معاف کردے، کہ مہر کا دل ان کے لیے بھی نرم پڑ جائے۔اور اب آخر کار ان کی یہ آس بھی پوری ہونے لگی تھی۔

"تم واقعی مجھ سے ناراض نہیں ہو مہرو؟" چہرے پہ اداس مسکراہٹ لیے، وہ دکھی سے انداز میں بولے۔مہر کی مسکراہٹ اب پوری کی پوری سمٹ چکی تھی۔وہ بھی فضامیں گھلی ہوئی اداسی کے زیر اثر اداس ہونے لگی تھی۔اسے اس لمحے اپنا بچپن یاد آیا۔

"شاید میں آپ سے ناراض تھی ہی نہیں۔میرے اندر بسی تلخی شاید اس چھوٹی بچی کی وجہ سے تھی جس کے ساتھ آپ انصاف نہ کر سکے۔" آواز میں لڑکھڑاہٹ لیے وہ بولی تھی۔وہ اس وقت یہ بھی بولنا چاہتی تھی کہ اس کی تلخی اس لیے بھی تھی کیونکہ انہوں نے اس کی ماں کے ساتھ انصاف نہ کیا مگر وہ اپنے الفاظ دبا گئی۔عبداللہ سلطان نے خاموشی اختیار کی۔ان کی گردن جھکتی چلی گئی۔وہ اس وقت شرمندہ تھے۔

"کیا اس سب کے بعد بھی میں معافی کا حقدار ہوں؟" آواز میں گہرا رنج اور پچھتاوا لیے وہ پوچھ رہے تھے اور پھر انہوں نے اپنی گردن اٹھائی۔مہر کو ان کا ہلکان سا چہرہ نظر آیا۔ان کی آنکھوں کے گرد پانی اکٹھا تھا۔مہر نے پہلی مرتبہ انہیں اس قدر جذبات میں مبتلا پایا تھا۔یہ اس کے لیے غیر معمولی

تھا اور حیرت انگیز بھی۔ان کو اس حال میں دیکھ کے اس کے دل پہ خنجر چلنے لگے۔اسے اپنے کچھ دیر پہلے کہے گئے جملے پہ شرمندگی بھی ہوئی۔وہ جیسے ان کو یوں دیکھ کے تڑپ اٹھی تھی۔وہ جیسے بھی تھے، تھے تو اس کے اپنے ڈیڈ ہی ناں۔

"ارے ڈیڈ، کیا ہو گیا ہے۔" وہ دل جوئی کرنے والے انداز میں کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھی۔اور عبداللہ سلطان کے عقب میں جا کے کھڑی ہو گئی۔ان کے کندھے کو سہلاتے ہوئے اس نے ان پہ شفقت بھری نگاہ ڈالی۔

"آپ سب بھول جائیں۔مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔" عبداللہ سلطان اس شفقت بھرے انداز پہ مدھم سا مسکرا دیے۔آخر کار ان کے اور ان کی بیٹی کے تعلقات بہتر ہونے لگے تھے۔دونوں کے درمیان جو فاصلہ نافذ تھا وہ منظر عام سے تحلیل ہونے لگا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم باپ بیٹی آئندہ بھی اچھے ٹرمز میں رہنے والے ہیں؟" اداسی کو جھڑکتے ہوئے،عبداللہ سلطان مدھم سا مسکرائے۔مہر بھی ماحول میں چھٹتے تناؤ کے باعث زیر لب ہنس دی۔

"بالکل!" وہ چہک کے بولی اور اپنی کرسی پہ پھر سے آ کے بیٹھ گئی۔عبداللہ سلطان اب کھڑے ہوئے۔

"اپنا خیال رکھنا مہرو۔" عبداللہ سلطان نے تو یہ یوں ہی کہہ دیا مگر نہ جانے کیوں مہر کو ان کا یہ کہنا عجیب سا لگا۔ان کا یہ کہنا اسے مضطرب کر گیا تھا۔اسے اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔وہ الفاظ نہ جانے کیوں دل میں ایک چبھن سی پیدا کر گئے تھے۔

کچھ دیر آفس میں گزار کے وہ آفس سے چلی گئی۔وہ کافی ڈسٹرب سے عالم میں تھی۔اس کے دل میں گھبراہٹ چھانے لگی تھی۔عجیب سا احساس اس کی روح پہ سوار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آسمان پہ چاند کا نام و نشاں نہ تھا جس کے باعث یہ رات اتنی تاریک تھی۔اسلام آباد کے احاطے پہ ٹھنڈی ہوائیں سوار تھیں۔درختوں کے پتے بھی اس ٹھنڈی ہوا کے رخ پہ رقص کرتے دکھائی دے رہے تھے۔فضا میں وحشت گھلی ہوئی تھی، جو کہ مستقبل کے برے وقتوں کی پیشنگوئی بھی کر رہی تھی۔

عبداللہ سلطان کام ختم کرکے اپنے آفس سے نکلے۔ٹھنڈی ہوا ان سے ٹکرائی تو ان کے گردن کے بال کھڑے ہونے لگے۔ڈرائیور گاڑی سے باہر کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔وہ موبائل استعمال کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں گاڑی کی پچھلی سیٹ میں سوار ہو گئے۔

ڈرائیور نے گاڑی چلانا شروع کی۔عبداللہ سلطان موبائل میں ہنوز مصروف رہے۔ٹھیک اسی وقت انہیں کال آئی۔کال کرنے والے کا نام پڑھتے ہی آنکھوں میں معنی خیز سا تاثر اترنے لگا۔ہونٹ دباتے ہوئے وہ کھسیانا سا مسکرائے۔

"اسی جگہ پہ آؤں لینے، جہاں آتا رہتا ہوں؟" مزے لینے والے انداز میں انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔وہ شام کے جذباتی عبداللہ سے قدرے مختلف نظر آرہے تھے۔اب ان کے چہرے پہ ایک سخت سا تاثر تھا۔ان کی شخصیت میں اب کچھ سفاک سا نمایاں تھا۔

"عبداللہ۔ تمہیں ہماری سالوں کی پارٹنرشپ کا کوئی لحاظ نہیں رہا۔ آخر تم ہمیں ہمارے ہیرے کیوں نہیں واپس کر دیتے؟" فون کے دوسری طرف سے درانی کی خشک اور پر سکون آواز گونجی تھی۔

عبداللہ سلطان نے یہ سنتے ہی ہنسنا شروع کر دیا۔

"یہ سب بہت ہی اِم پریکٹیکل اور فضول باتیں ہوتی ہیں درانی۔ بکواس۔" ان کی آواز میں سختی تھی۔ آنکھوں میں تمسخرانہ سا تاثر تھا۔ "تم بھی جانتے ہو اور میں بھی، کہ ہمارا ساتھ صرف مطلب کا تھا۔ میں تمہارے کام آتا تھا اور تم لوگ میرے۔ اس لیے یہ پارٹنرشپ والا ڈراما بند کرو اور چپ چاپ میرا پیٹ بھرتے رہو۔ تم لوگوں کی بہتری اسی میں ہے درانی۔" درانی نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔ ہر گزرتا لمحہ عبداللہ سلطان کو ان کی موت سے قریب تر کرتا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ شمس اس ہی جگہ پہ تمہارا انتظار کر رہا ہے عبداللہ۔" آواز میں ناگواری لیے کہتے ہوئے درانی نے کال کاٹ دی۔

وہ سنابل میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پہ برہمی عیاں تھی۔ اس کے سامنے والی کرسی پہ شمس براجمان تھا۔ سوچتی نگاہیں اس نے شمس پہ ڈالیں۔ شمس بھی بس درانی کے حکم کا منتظر تھا۔ بس ایک اشارے کی دیر تھی، اور اس نے بھی اپنے کام میں لگ جانا تھا۔

ہسپتال کے اس کمرے میں بھیانک سی خاموشی سوار رہی۔ فضا کا تناؤ بڑھتا چلا گیا۔ درانی کے انداز میں جھجک سی تھی۔ وہ یہ حکم جاری کرنے سے اب بھی کچھ کترا رہا تھا۔

"آج کی رات۔" درانی نے نظریں شمس میں گاڑی۔وہ قتل کا حکم جاری کرنے ہی والا تھا۔"آج کی رات اس کی آخری رات ہونی چاہیے۔" سرد سا انداز اختیار کرتے وہ بولا تھا۔شمس، سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کھڑا ہوا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شمس اپنی نیلی ویگن میں سوار ایک سنسان سی سو سائیٹی میں داخل ہوا۔ویرانیت اس سوسائیٹی کے چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔اس وقت صرف شمس کی ویگن کے پہیوں کی سڑک سے رگڑ کی آواز ہی اس سوسائیٹی میں گونج رہی تھی۔

سوسائیٹی میں قطار در قطار زیرِ تعمیر گھر تھے جو کچے پکے بنے ہوئے تھے۔اس نے اپنی نیلی ویگن ایک ایسے ہی کچے پکے گھر کے باہر روکی۔گھر کے اندر گپت اندھیرا تھا، خوفناک سا گپت اندھیرا۔اس نے اپنے موبائل کی فلیش لائیٹ جلائی اور گھر میں داخل ہوا۔چھت سے ایک تار لٹک رہی تھی جس پر ایک سوئچ لگا ہوا تھا۔شمس نے وہ سوئچ دبایا تو چھت سے لٹکتا ایک گول سا زرد بلب روشن ہو گیا۔ اب وہ کچا پکا گھر نیم زرد روشنی میں نمایاں ہوا۔اب ضرورت نہ تھی اس لیے شمس نے اپنے موبائل کی فلیش بند کر دی۔وہ ایک کچی دیوار کے پیچھے جا کے چھپ گیا۔اس نے اپنی جیب سے پستول نکالی اور مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لی۔اب بس اسے خاموشی سے عبداللہ سلطان کا انتظار کرنا تھا۔

کچھ وقت بیت گیا تو عبداللہ سلطان کی گاڑی اس سنسان سوسائیٹی میں داخل ہوئی۔وہ اپنے ڈرائیور کو بیچ راہ میں ہی اتار چکے تھے اور اب خود گاڑی چلا کے ادھر آئے تھے۔انہوں نے اپنی گاڑی شمس کی نیلی ویگن سے پیچھے کھڑی کی۔تفاخر بھری مسکان سجائے وہ اپنی گاڑی سے اترے اور اس عمارت کو

دیکھنے لگے۔وہ عمارت میں موت کے پہرے سے بے خبر تھے۔موت بھی خاموشی سے انہیں عمارت کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی۔

عمارت میں زرد بتی جل رہی تھی۔ساتھ ہی ساتھ باہر گاڑی بھی تھی یعنی شمس اندر ہی تھا۔عبداللہ سلطان اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پر سکون سی چال چلتے اندر داخل ہوئے۔وہ بے خبر اور پر سکون تھے۔ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ان کے وجود سے ٹکرایا۔ان کے بال اڑنے لگے۔وہ زرد بتی کے نیچے کھڑے ہو کے شمس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

ٹھیک اسی وقت، انہیں کچھ احساس ہوا۔جیسے ان کی گردن کی پشت کو کوئی ٹھنڈی شے چھو گئی ہو۔۔۔ٹھنڈی

مگر سخت شے۔۔۔وہ بھی لوہے کی بنی ہوئی۔عبداللہ سلطان کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار پکڑ لی۔

"ہاتھ اوپر۔"شمس کی بھاری آواز ان کے کان میں گونجی۔یہ بھاری آواز سن کر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔یہ بھاری آواز ان کی روح پہ کسی خنجر کی طرح وار کر گئی تھی۔"پیچھے مڑنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔زیادہ ہوشیاری کی تو میں گولی چلا دوں گا۔" شمس عبداللہ سلطان کی کھوپڑی پہ پستول تانے کھڑا تھا۔اس کے چہرے پہ جنونیت سوار تھی۔

اور یہ وہ وقت تھا جب عبداللہ سلطان کو احساس ہوا کہ ان کو ٹریپ کر لیا گیا ہے۔ان کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹی ہوئی تھیں۔ان کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ دل میں کالے بادل چھانے

لگے۔ان کا وجود لرزنے لگا تھا۔ہاتھ کپکپا رہے تھے۔وہ خوف اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھے۔

"میں نے کہا ہاتھ اوپر۔" وہ ہر لفظ پہ زور دے دے کے چلا رہا تھا۔عبداللہ سلطان نے کرنٹ کھا کے ہاتھ اوپر کیے۔انہیں اس وقت صرف اپنی جان کی فکر تھی۔کسی نہ کسی طرح سے بس وہ اس دلدل سے نکل جائیں۔کاش کوئی انہیں بچانے آجائے۔وہ یہی سوچ جا رہے تھے۔

"میری جان چھوڑ دو۔" اپنے اعصاب پہ قابو پاتے ہوئے وہ بولے تھے۔وہ جیسے کچھ مہلت مانگنا چاہ رہے تھے۔

"تم نے ہمارے ساتھ بہت گیمز کھیل لیں عبداللہ۔" وہ پھولتے ہوئے تنفس کے ساتھ کہہ رہا تھا۔"اب ہم تمہیں زندہ رہنے نہیں دے سکتے۔تم نے ہماری برداشت ختم کر دی ہے۔" عبداللہ سلطان کو پستول کی گرفت اپنی کھوپڑی پہ سخت ہوتی محسوس ہوئی تو ان کا دل بری طرح سے ڈگمگانے لگا۔

"میں تمہیں بتا سکتا ہوں وہ ہیرے کدھر ہیں۔" عبداللہ سلطان کو فرار حاصل کرنے کا صرف یہی راستہ نظر آیا۔وہ مرنے کے لیے تیار نہ تھے۔وہ موت کی تکلیف سہنے کے لیے تیار نہ تھے۔اتنے سالوں بعد تو ان کے مہر سے آپسی تعلقات درست ہوئے تھے۔اتنے سالوں بعد تو مہر کا دل ان کی طرف سے نرم ہوا تھا۔وہ اس وقت بھی صرف مہر کا ہی سوچ جارہے تھے۔وہ کچھ اور لمحے ہی سہی، مگر جینا چاہتے تھے۔

مگر موت ہے اٹل، اور موت ہے یقینی۔ جس وقت حکم ہوتا ہے وہ نازل ہو جاتی ہے۔ انسان کے گڑگڑانے کا ان لمحات میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کا چاہنا یا نہ چاہنا اس لمحے بے معنی ہو جاتا ہے۔

"میں سن رہا ہوں۔" شمس کی چہرے پہ حیوانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے عبداللہ سلطان کو تڑپتا دیکھ کے محظوظ ہو رہا تھا۔

"میرے آفس کے شیلوز میں ہیں۔ انہیں صرف اور صرف میں ہی کھول سکتا ہوں۔ اب بندوق نیچے کرو اور مجھے جانے دو۔" عبداللہ سلطان ہمت اکٹھا کرتے بولے تھے۔ انہیں امید کی کرنیں نظر آئیں۔ شمس کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ عبداللہ سلطان پستول کا اپنی کھوپڑی سے منقطع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر۔۔ مگر وہ نیچے نہ ہوئی۔ عبداللہ سلطان کے اوپر ایک دفعہ پھر سے کالے بادل چھانے لگے۔ امید کی کرنیں دم توڑنے لگیں۔ ان کا چلایا گیا تیر نشانے پہ نہیں لگا تھا۔

"آخری خواہش؟" شمس غرایا تو عبداللہ سلطان کی سانسیں ایک بار پھر سے بے ترتیب ہونے لگیں۔

"دیکھو۔ تم لوگوں کو اپنے کاروبار میں میری ضرورت ہے۔ تم مجھے یوں ختم نہیں کر سکتے۔" اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے وہ بولے تھے۔ وہ بھی اتنی جلدی ہار نہیں مان سکتے تھے۔

"عبداللہ اب ہم تمہاری ان چالوں میں نہیں پھنسنے والے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، ہم یقین کر لیں گے کہ وہ ہیرے واقعی تمہارے شیلوز میں ہے؟ چچ چچ۔" شمس زور سے ہنسنے لگا۔ عبداللہ سلطان کی آنکھیں بے یقینی کے باعث پھٹنے لگیں۔ وہ جان گئے تھے کہ اب فرار ناممکن تھی۔ شمس کی درندگی بھری ہنسی

ان کے کانوں میں چبھ رہی تھی۔وہ ان کے دل کو خوف میں مبتلا کر گئی تھی۔ان کی روح بے چینی کے مارے مچل رہی تھی۔

"تم مرتے مرتے اپنی بیٹی کو قربان کر گئے ہو۔ہمارے کاروبار میں تمہارا کردار اب تمہاری پیاری سی نازک بیٹی ادا کرے گی۔تمہاری کمی اب وہ پوری کرے گی عبداللہ۔" شمس ٹھہر ٹھہر کے مزے لینے والے انداز میں بولا۔

"مہرو!" وہ بے ساختہ بولے۔ان کے سر پہ جیسے ہتھوڑے برسا دیئے گئے ہوں۔اس وقت عبداللہ سلطان اپنی تمام تکلیفیں بھلا گئے۔سر پہ اب صرف فکر سوار تھی، اپنی مہرو کی۔اپنی اکلوتی بیٹی کی۔وہ ان درندوں کو آخر کیسے مقابلہ کر سکتی تھی۔۔۔کیسے؟

وہ کیسے اپنی بیٹی کو ان درندوں کے ہاتھ چھوڑ کے جا سکتے تھے؟ مگر اب وہ وقت تھا جب کسی بھی طرح کی ملامت بھی کام نہیں آنے تھی۔

"مہر کو کچھ نہیں کرنا، پلیز۔" آواز میں بے بسی لیے وہ بھیک مانگ رہے تھے۔وہ مہر کے لیے گڑگڑا رہے تھے۔شمس زیرلب ہنس دیا۔

"یعنی تمہاری کوئی بھی آخری خواہش نہیں ہے۔" شمس بھی بس ٹرگر دبانے کے لیے تیار تھا۔۔۔

اور شمس کی اس درندگی میں۔۔۔،

عبداللہ سلطان کے سر پہ ابلتے خوف میں،

جہاں مہر کی بربادی کے بیج بو دیئے گئے تھے۔۔۔،

اس رات کی تاریکی میں۔۔۔،

اس عمارت پہ چھائی ٹھنڈی ہوا کے آغوش میں۔۔۔،

جہاں خواب ٹوٹنے والے تھے،

آواز کی گونج اس عمارت سے ابھری،

جو کہ کانوں میں چبھتی تھی،

جو کہ دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیتی تھی۔

روح۔۔۔جو جسم میں کبھی قید ہوا کرتی تھی،

بالآخر وہ جسم کے اس پنجرے سے آزاد ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مناج نے اپنی گاڑی عبداللہ سلطان کے قصر سے تھوڑا دور پارک کی۔ گاڑی سے اتر کے وہ عبداللہ سلطان کے قصر کو اوپر سے نیچے دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں میں لگن سی تھی۔وہ یہاں مہر سے بات کرنے آئی تھی۔اور بات کرے بغیر وہ جانے والی نہیں تھی۔

گھر کے دروازے پہ گارڈز نے اسے تفتیش کے لیے روکا۔

"میرا نام مناج ہے اور میں مہر بنت عبداللہ سلطان سے ملنے آئی ہوں۔" مناج نے اپنے ازلی انداز میں اپنا تعارف کروایا۔گارڈز نے اسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا۔

لاؤنج کے صوفے پہ براجمان مہر قرآن کی تلاوت کر رہی تھی ٹھیک اسی وقت انٹرکام بجا۔ آس پاس کوئی ملازمہ نہ تھی، یعنی یہ کال اسے ہی اٹھانی تھی۔ تھکی ہوئی سانس خارج کرتے وہ اٹھی۔ قرآن کو سائڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ انٹرکام تک گئی اور اسے اٹھایا۔

"جی۔" وہ عام سے انداز میں بولی تھی۔

"میم آپ سے مناج ملنے آئیں ہیں۔" مہر کے چہرے پہ شدید ناگواری ابھری۔ تو وہ ڈھیٹ لڑکی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے سوچا۔

اس نے تھکی ہوئی سانس خارج کر کے بات جاری رکھی۔

"ٹھیک ہے، آنے دیں۔ مہر کی آواز نیم غصیلی تھی۔ وہ بھی متجسس تھی کہ آخر مناج کون سی بات کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے اسے آنے دیا۔

وہ قصر کے ڈراونگ روم میں چلی گئی۔ اس نے گھر کی ملازمہ کو بتا دیا کہ اندر آنے والی لڑکی کو ڈراونگ روم میں بھیج دو اور خود وہ ڈراونگ روم کے صوفے پہ بیٹھ کے مناج کا انتظار کرنے لگی۔

تبھی مناج اپنے مشینی سے بے جان انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ کوئی اور ہوتا تو اتنے شاندار گھر کا آنکھ بھر کے جائزہ ضرور لیتا، مگر وہ مناج تھی، اسے کسی چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف وہاں مہر سے بات کرنے آئی تھی۔

مہر اسے تپتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مناج کو مخالف صوفے پہ بیٹھنے کا کہا۔ مناج بھی چپ چاپ بیٹھ گئی۔ مہر کے چہرے پہ مناج کے لیے شدید ناگواری تھی۔

"آپ تو کافی ڈھیٹ نکلی۔" مناج جیسے ہی صوفے پہ آرام دہ سی ہوئی تو مہر نے کہنا شروع کیا۔"میں نے کہا تھا مجھے آپ سے نہیں ملنا لیکن پھر بھی آپ آ ہی گئیں؟"مہر کے انداز میں تنفر بھرا ہوا تھا۔ اسے اب بھی کورٹ میں ہونے والی اپنی تذلیل یاد تھی۔

"میں جذباتی نہیں ہوں۔مجھے جو کام کرنا ہوتا ہے وہ میں کر کے ہی دم لیتی ہوں۔" مناج نے اپنے مشینی انداز میں کہا۔مہر کو اس لمحے کچھ عجیب لگنے لگا۔پہلے اس نے غور نہیں کیا تھا مگر اب اسے وہ صاف نظر آرہا تھا۔مناج کچھ عجیب سی تھی۔۔۔روبوٹک سی۔اس کی چال بھی بالکل مرجھائی ہوئی تھی۔ اس کا ہر انداز بجھا ہوا تھا۔چہرے پہ خالی پن سا تھا۔وہ اندر سے بھی خالی خالی لگتی تھی۔۔۔کھوکھلی۔ وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ مناج کو کچھ سخت ضرور کہے گی مگر اس کا یوں حال دیکھ کے وہ چاہ کر بھی سخت نہ ہو سکی۔

"خیر۔"مہر سر جھٹکتے بولی۔"اب آ ہی گئی ہیں تو بات بھی کر لیں۔"

"میں جو کہوں، پلیز آپ اسے تحمل سے سنیں۔جو میں سمجھانا چاہ رہی ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔" مناج نے کہا تو مہر نے شانے اچکا دیے۔

"آپ سیدھا مدعے پہ آسکتی ہیں۔" وہ لاپرواہ سے انداز میں بولی تھی۔مہر کا چہرہ بے تاثر تھا۔وہ جیسے اس ملاقات سے جتنا جلدی ہو سکتا تھا جان چھڑانا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" مناج ٹھہری۔"میں آپ کو آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کرنے کی تلقین کرنے کی نیت سے آئی ہوں۔آپ اپنے وکیل کی موجودگی میں ہمارے ساتھ ٹیبل پہ بیٹھ جائیں۔ہم مل کے درمیانی

راہ نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" مہر کا چہرہ اب بھی بے تاثر سا تھا۔ اس کے چہرے پہ مناج کی بات کا کوئی رد عمل نمایاں نہ تھا۔ مناج نے بات جاری رکھی۔

"کورٹ کا جھمیلا ایک چھوٹے بچے کے لیے بہت غیر معمولی ہوتا ہے۔ میں نے ان گنت مرتبہ کورٹ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو پستے دیکھا ہے۔ یہ سب ان چھوٹے بچوں کو بگاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بچہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کا بچپنا جیسے چھن جاتا ہے۔ مہر، آپ خود یہ طے کریں، کہ آپ کو عنایا کا ذہنی سکون زیادہ عزیز ہے یا اپنی انا؟" مناج نے اپنی بات مکمل کی۔ مہر نے ایک سرد سی سانس خارج کی اور مناج پہ استہزائیہ نظر ڈالی۔

"اور حسام؟ اس کو سزا نہیں ملنی چاہئے کیا مناج؟ کیا آپ مجھے نہیں سمجھ سکتی؟ اس نے میری زندگی تباہ کی تھی۔ اس نے میری نا قدری کی تھی۔ میں اپنی بیٹی آخر ایسے شخص کے حوالے کیوں کروں؟" مہر کا چہرہ اب بھی پر اطمینان تھا۔ اس کے مطابق یہ ایک بہت مضبوط دلیل تھا۔

"میں بطور ایک عورت آپ کو سمجھ سکتی ہوں۔ اور میں خوش ہوں کہ آپ نے ایک ایسے رشتے کو چھوڑا جس میں ایک فریق آپ کے آگے نشے کو ترجیح دیتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک عورت کو ایسے رشتے میں پستے دیکھا ہے۔" مہر کو احساس ہوا کہ مناج کی آواز یہ کہتے ہوئے لڑکھڑائی تھی۔ "مگر بد قسمتی سے اس عورت کے پاس اس رشتے کو چھوڑنے کا آپشن ہی موجود نہ تھا۔ مگر یہاں ہم آپ کی بات ہی کہاں کر رہے ہیں مہر؟ یہاں پر ہماری گفتگو کا مرکز عنایا ہے۔ اس کے لیے کیا بہتر ہے اور اس کے لیے کیا بہتر نہیں ہے۔ کیا واقعی آپ کو ایسا لگتا ہے کہ باپ کے بغیر وہ خوش رہ سکے گی؟" مہر کے تاثرات اب کی بار نرم پڑے۔ اس کا دل ویسے ہی اس معاملے کو لے کر بے چین تھا۔

درے سے ملاقات کے بعد وہ کب سے اس معاملے کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر ایک حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"مگر۔" مہر جیسے مزید کچھ دلیل کھوجنے لگی۔ مناج نے اس کے بولنے کا انتظار کیا مگر وہ کچھ نہ بولی۔

"دیکھئے۔ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا ہے۔" جب مہر کچھ نہ بولی تو مناج نے آگے کہنا شروع کیا۔

"فیصلہ آسان ہے۔ ہم مل کے درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوچیے مہر کہ عنایا کتنی خوش ہو گی۔ وہ جب بڑی ہو گی تو آپ کے اس فیصلے پہ فخر محسوس کرے گی۔ اس کے نزدیک آپ ایک مثالی ماں ہوں گی۔ وہ یاد کیا کرے گی کہ کیسے آپ نے صرف اس کے خاطر اتنا مشکل فیصلہ لیا تھا۔ اور اگر یہ سب نہ ہو مہر، تو چیزیں بالکل اس کے بر عکس بھی ہو سکتی ہیں۔ آنے والے وقتوں میں یوں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی بیٹی آپ کو ہی ملامت کرنے لگے۔ ابھی کیے جانے والے فیصلے آپ کا مستقبل لکھیں گے مہر۔" مناج نے مہر کے چہرے پہ نظریں گاڑیں۔ وہ جانتی تھی کہ تیر بالکل نشانے پہ لگا تھا۔ مہر بھی اس وقت کافی گہری سوچ میں گم سم لگتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔" کافی دیر سوچنے کے بعد وہ بالآخر بولی۔ مناج نے ایک فاتحانہ سی سانس خارج کی۔ "ہم آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کر لیں گے۔" وہ بھی بس مان گئی تھی۔ اسے اب کوئی حتمی دلیل نظر نہ آئی۔ مناج کے دل سے جیسے ایک بوجھ سرکنے لگا۔ آدھا کام ہو گیا تھا۔ اب بس کسی طرح سے عنایا کا معاملہ مکمل حل ہو جائے۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کیس سے دستبردار ہو سکتی تھی۔

"جب بھی آپ تیار ہوں، میرے آفس آجائیں اپنے وکیل کے ساتھ۔ہم ایک میٹنگ کر لیں گے۔" مناج یہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔مہر بھی اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔اب کی بار اسے مناج اتنی بری نہیں لگی تھی۔مناج میں کچھ عجیب سا

پر اسرار سا تھا۔اس سے الگ سی شنا سائی ہوتی تھی۔

ٹھیک اسی وقت یونیفارم میں ملبوس ملازمہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ملازمہ کچھ پریشان سی تھی اور ہانپ بھی رہی تھی۔مہر نے سوالیہ نگاہیں ملازمہ پہ ڈالیں، لیکن اس نے اپنے چہرے کو پر اطمینان رکھا۔

"میم باہر پولیس آئی ہے۔" مہر نے ایک جھٹکا سا لیا۔مناج پوری کی پوری پیچھے مڑی اور تیز قدم بڑھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔اب مہر اور ملازمہ کمرے میں اکیلے تھے۔مہر کے دماغ میں طرح طرح کے سوال تھے۔نہ جانے اس وقت پولیس کا اس کے گھر کیا کام تھا؟ اس نے سوچا۔

"کیا پولیس نے آپ کو بتایا کہ وہ کیوں آئی ہے؟" بھلے سے اندر سے وہ کافی بے چین تھی لیکن وہ اپنی بے چینی چھپاتے پر سکون ہو کے بولی۔

"نہیں میم۔" مہر کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔ملازمہ کو اکیلا چھوڑ کے وہ اب ڈراونگ روم سے نکلی۔

وہ قصر کے کشادہ لان میں آئی تو مناج پویس افسر سے باتیں کرتے نظر آرہی تھی۔مناج کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔اس کا چہرہ زرد سے رنگ میں جھلسنے لگا۔اس سب نے مہر کی تشویش اور بھی بڑھادی۔اس نے بے ساختہ طور پہ اپنے قدموں کی رفتار سست کی۔وہ جانتی تھی کہ پولیس اپنے ساتھ کوئی بری خبر لائی تھی۔مگر آخر کیا؟

وہ پولیس افسر سے تھوڑا دور آ کے رکی۔پولیس افسر نے جیسے ہی اسے دیکھا تو اپنا رخ اس کی طرف موڑا۔مہر

کی آنکھوں میں گہری الجھن تھی۔وہ بس یہی سوچ جا رہی تھی کہ آخر خبر کتنی سنگین ہو سکتی تھی؟

”مس مہر۔ہمیں آپ کو ایک خبر سنانی ہے۔“ نیلی وردی میں ملبوس پولیس افسر نے مہر سے کہا جو کہ پر اطمینان چہرہ لیے اسے گھور رہی تھی۔

”جی۔میں سن رہی ہوں۔“ اندر سے اس کا دل کتنا ہی مچل رہا تھا، لیکن پھر بھی اس نے اپنے اندر چلتے اس طوفان کو دبایا۔وہ اب بھی پر اطمینان سی لگتی تھی۔

”ہمیں یہاں سے کچھ دور ایک سو سائیٹی میں ڈیڈ باڈی ملی ہے جو کہ آپ کے والد عبداللہ سلطان کی ہے۔شناخت اور تفتیش کے سلسلے میں آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

اور یہ وہ وقت تھا جب مہر کو اپنے سامنے سے دنیا فنا ہوتی نظر آئی۔مہر جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔اسے لگا کہ وہ چکرا کہ گر جائے گی اور وہیں پہ دفن بھی ہو جائے گی۔اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی مگر مہر نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔

”کے۔۔کیسے؟“ اس کے حلق سے بس اتنا ہی ادا ہو سکا۔اس کی آنکھوں میں تکلیف عیاں تھی۔ آنکھوں کے گرد نمی اکٹھا ہونے لگی تھی۔اس کا دل برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔وہ اس لمحے اپنے آپ کو کتنی مشکل سے قابو کیے ہوئے تھی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔مناج آنکھوں میں اداسی لیے سارا منظر دیکھ ری تھی۔

”عبداللہ سلطان کا قتل ہوا ہے۔“ مہر کا سانس بے ربط ہونے لگا۔ دل ڈوبنے لگا۔ اس نے حواس باختہ سے عالم میں اپنا سر اوپر نیچے ہلایا۔ وہ پولیس والوں کے ساتھ جانے لگی۔

مناج آنکھوں میں تکلیف لیے یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ مہر کی کوئی دوست نہیں تھی، نہ ہی دونوں کا کوئی خونی رشتہ تھا لیکن پھر بھی وہ اس کی تکلیف کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ بھی اس تکلیف سے گزر چکی تھی۔ ان دونوں کا تعلق انسیت کا تھا، دونوں مشترکہ تکلیف کے ساتھی تھے۔ مناج کو اس وقت مہر کے غم کے ساتھ غم محسوس ہو رہا تھا۔

”میں بھی ساتھ آ رہی ہوں۔“ وہ فوراً بولی اور ان سب کے ساتھ چلنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**"(ابو جا رہے ہیں!)"**

مہر اور مناج سرد خانے کی پتلی سی راہداری عبور کر رہے تھے۔ مہر کے بال ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے کی رنگت اڑ چکی تھی۔ چہرے پہ روندھا ہوا سا تاثر تھا۔ آنکھوں کی چمک اتر چکی تھی لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔۔۔ فی الحال وہ رو نہیں رہی تھی۔

**"(ابو نہ جائیں۔)"**

وہ بے جان سی چال چلتے ہوئے ایک ایک قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ پوری طرح سے اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ وہ اس قدر غیر حاضر تھی کہ اسے اپنے قدم تک زمین پہ محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

**"(ابو نہ جائیں۔)"**

وہ ایک دروازے کے پاس آ کے رک گئی۔یہ وہی دروازہ تھا جس کے پار وہ المناک منظر اس کا منتظر تھا۔اس نے دروازے کے ناب کو تھاما تو اسے یوں لگا جیسے وہ اسے گھما ہی نہیں سکتی۔کچھ لمحے اس کا جسم بالکل ساکن ہو گیا۔ڈھیروں جد و جہد کر کے اس نے ناب گھمایا اور اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

**"(ابو آپ نہیں جا سکتے۔)"**

سرد خانے کی راہداری میں چبھتی ہوئی خاموشی تھی۔مناج کمرے کے باہر بے چین سی کھڑی تھی۔اس کے ذہن میں ماضی میں ہونے والا وہ کرب ناک منظر گھوم رہا تھا۔وہی منظر جس میں وہ اپنے باپ سے بچھڑ گئی تھی۔اس کا دل بوجھ ذدہ سا تھا۔وہ بھی غمگین تھی۔

دفعتاً مہر کمرے سے باہر آئی۔اس کا حال بے حال تھا۔وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر اونچی اونچی سانسیں لے رہی تھی۔

**"(ابو آپ نہیں جا سکتے۔)"**

"ڈے۔۔ڈ" اس کی آواز لڑکھڑائی۔مناج نے مہر کو کندھے سے تھام لیا۔مگر وہ کچھ بولی نہیں۔وہ تو خود جانتی ہی نہیں تھی کہ ایسے وقتوں میں آخر بولا کیا جاتا ہے۔۔

"ڈیڈ۔۔۔نہیں رہے۔" مہر کا دل نازک سے پتے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔وہ گہرے رنج میں تھی، گہری تکلیف میں۔گہرے صدمے میں۔

اس کمرے کے اندر اس نے اپنے ڈیڈ کا بے جان وجود دیکھا تھا۔وہ جو کسی زمانے میں اس کی نظروں کے سامنے ہوا کرتے تھے۔ہنس ہنس کے باتیں کیا کرتے تھے۔پیار سے اسے مہرو مہرو پکارا کرتے تھے، وہ اس کمرے میں مفلوج سے پڑے تھے۔۔۔بے جان۔۔۔ساکن۔

مہر نے اس کمرے میں موت دیکھی تھی۔موت کا وہ بھیانک منظر دیکھا تھا۔

اور موت دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا۔یہ وہ وقت تھا جب رات سب سے زیادہ تاریک ہو چکی تھی۔ احمد اپنے کمرے میں بستر کے کنارے پہ بیٹھا ہوا تھا۔اپنا چہرہ ہاتھوں میں ٹکائے وہ کسی گہرے غبار میں مغوم تھا۔

اس وقت عموماً وہ سو جایا کرتا تھا مگر آج، وہ نہیں سو سکتا تھا۔عبداللہ سلطان کے قتل کی خبر اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔مگر آخر اسے اس قتل میں اتنی کیا دلچسپی تھی۔

احمد کی آنکھیں شعلہ باز تھیں۔چہرے پہ سخت سا تاثر تھا۔وہ اپنا پاؤں زمین پہ تھپتھپائے جا رہا تھا جس کے باعث ایک آواز مسلسل پیدا ہورہی تھی۔اس کی روح اس وقت قدرے بے چین و بے قرار تھی۔

احمد سیدھا ہو کے بیٹھا۔چہرے پہ چھائی سختی زائل ہونے لگی۔اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو منظر اندھیرے میں ڈوب گیا۔اس نے ایک گہری سانس اندر لی، اور ایک گہری سانس باہر نکالی۔

پیر تھپتھپانے کی آواز تھم گئی تھی۔کمرہ خاموشی میں ڈوبتا چلا گیا۔

”مجھے اس قتل کا پچھلے ڈھائی سال سے انتظار تھا۔“ آنکھیں بند کیے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اس نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔کالی چمکتی آنکھوں میں سے تپش فنا ہو چکی تھی۔وہ اپنے بستر کو چھوڑ کے اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا۔سائڈ ٹیبل سے اس نے اپنا موبائل اٹھایا۔وہ رات کے اس پہر اپنے جرمنی میں بیٹھے ایک دوست کو کال ملا رہا تھا۔کچھ دیر رنگ ہوئی اور پھر آخر کار کال اٹھا لی گئی۔

”کون؟“ وہ جو بھی تھا، نیند کے گہرے آغوش میں لگتا تھا۔احمد کے چہرے پہ ناگواری ابھری۔

”میں ہوں،احمد۔جاگ جاؤ۔“ وہ لا تعلق سے انداز میں بولا۔اپنے اپارٹمنٹ میں لیٹے اس کے دوست کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔وہ احمد سے کچھ خفا ہونے لگا تھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ اتنی رات کو کون کال کرتا ہے۔تم اب تک کیوں جاگ رہے ہو؟ وہاں پر تو وقت تین گھنٹے آگے ہے۔“ احمد کا دوست خفگی کے عالم میں اس پہ برس پڑا۔احمد کے چہرے پہ چھائی ناگواری اور بھی شدید ہونے لگی۔

”بک بک بند کرو علی۔اور جاگ جاؤ۔میری بات تمہاری نیند سے کئی گنا زیادہ ضروری ہے۔“ وہ سختی سے بولتے اپنے بستر پہ پھر سے بیٹھ گیا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں لیٹا علی اپنی آنکھیں موندتے سنگل بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے۔جاگ گیا۔اب بولو۔“ علی جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"عبداللہ سلطان کا قتل ہو گیا ہے۔" احمد نے چھوٹتے ہی کہا۔علی کے ماتھے پہ چھائی شکنوں میں اضافہ ہوا۔وہ تو کسی عبداللہ سلطان کو جانتا بھی نہیں تھا۔اسے اس لمحے شک ہونے لگا کہ احمد کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔

"کون۔عبداللہ سم تھنگ "(something)وہ بری طرح سے الجھتے ہوئے بولا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے ان کا قتل ان ہی لوگوں نے کروایا ہے۔" احمد نے جو کہنا تھا کہہ دیا تھا۔اس نے علی کے سوال کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔اس کی نگاہیں جواب طلب تھیں۔وہ بس علی کے جواب کا منتظر تھا۔علی کا یہ جواب اس کے آگے کا لائحہ عمل طے کرنے والا تھا۔

بیڈ پہ بیٹھے علی کو پہلے تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔اور پھر اسے یک دم سب سمجھ آگیا۔۔۔سب کچھ۔۔۔اس کی نیند صحیح معنی میں تو اب خراب ہوئی تھی۔نیند اس طرح سے خراب ہوئی تھی کہ وہ اب پوری رات سو ہی نہیں سکتا تھا۔صرف یہ رات ہی نہیں، وہ آنے والی راتوں میں بھی اب نیند سے محروم رہنے والا تھا۔معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔۔۔

وہ بے چینی کے مارے کمبل اپنے جسم سے جدا کرتے اٹھا۔روح اس کی مچلنے لگی تھی۔وہ اپارٹمنٹ میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

"تم وہ سب کرنے کا نہیں سوچ رہے ہو!" وہ انداز میں بے چینی لیے تائید کرنے لگا۔دوسری طرف احمد بالکل

پر سکون تھا۔پر اطمینان۔

"اگر سوچ رہا ہوں تو، کیا اس دفعہ تم میری مدد کرو گے؟ کیا ایجنٹ عبدالحمید کی واپسی ممکن ہے؟" احمد کی نگاہیں جواب طلب تھیں۔ علی کو یوں لگا جیسے اس کے سر پہ ہتھوڑا آ کے برس گیا ہو۔ جیسے کوئی بھیانک خواب آج حقیقت اختیار کر رہا ہو۔

"تم ایسا کرنے کا سوچو بھی مت احمد۔ نہ بھولو احمد، ڈھائی سال پہلے کیا ہوا تھا۔ ڈھائی سال پہلے ہم سب نے کیا کھویا تھا۔" علی سختی سے کہتے ہوئے احمد کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ احمد نے پہلے سے طے کر لیا تھا کہ اگر علی اس کی مدد نہیں کرے گا تو وہ اکیلے ہی کچھ کر لے گا۔ وہ اب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پچھلے ڈھائی سال سے وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے پہلے سے ہی بیٹھا تھا۔ اب اس کا نفس اسے اجازت نہیں دینے والا تھا۔ اپنی جگہ وہ مجبور تھا۔

"تم سے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ مدد کرو گے کہ نہیں؟" وہ اب بھی بالکل پر سکون تھا۔ اپارٹمنٹ میں ٹہلتے علی نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔ وہ جانتا تھا احمد کو اب کوئی شے نہیں روک سکتی۔

"مجھے فکر ہے تمہاری۔ تم کیوں بھول گئے ہو کہ ڈھائی سال پہلے کیا ہوا تھا احمد؟ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ تم ہر دفعہ نہیں بچ سکتے۔" وہ ٹھنڈے انداز میں بولا تھا۔

"یعنی تم میری مدد نہیں کرنے والے ہو۔ ہے نا؟" احمد کو جیسے علی کی جذباتی تقریر سے کوئی غرض نہ تھا۔

"ہاں۔میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔یہ موت کا کنواں ہے۔میں تمہیں چھلانگ لگانے نہیں دے سکتا۔" علی نے صاف صاف انکار کر دیا۔احمد نے نا محسوس سے انداز میں پاؤں پٹخا۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" تلخی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی او ر موبائل سائڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔علی کی کال آنے لگی تو احمد نے موبائل سائیلنٹ پہ لگا دیا۔وہ چاہتا تو علی کی کالز سے جان چھڑانے کے لیے موبائل بھی بند کر سکتا تھا لیکن جان بوجھ کے اس نے موبائل بند نہیں کیا۔اچھا ہی تھا علی بار بار اسے کال کرے اور تڑپتا رہے۔اس نے سوچا۔

اب کمرے میں خاموشی تھی۔خطرناک وقتوں کی آگاہی دیتی خاموشی۔احمد سست سست قدم بڑھاتے اپنی کھڑکی تک گیا۔اس نے کھڑکی کھولی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے کمرے کا مہمان بنا۔آنکھ بند کر کے اس نے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کو اپنے اندر اتارا۔

"میں نے کہا تھا میں واپس آؤں گا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔اب کی بار اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں تپش ایک بار پھر در آئی۔

اس تپش کے ساتھ ساتھ ان میں گہرا کرب بھی تھا اور رنج بھی۔

شکایت بھی تھی اور کسی محرومی کا احساس بھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ عبداللہ سلطان کے وسیع و عریض قصر کا منظر ہے، جس کے وہ ایک وقت میں مالک ہوا کرتے تھے۔

عبداللہ سلطان کا جنازہ ظہر کے بعد ادا کروا دیا گیا تھا۔گھر کے سبزہ زار میں اس وقت مرد حضرات موجود تھے۔گھر کے اندر آئیں تو لاؤنج میں مہر سربراہی صوفے پہ براجمان تھی۔وہ بھورے کُرتے میں ملبوس بے جان سے انداز میں صوفے پہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔بھورا نیٹ کا ڈوپٹہ گردن پہ پھندے کی طرح سے اڑا ہوا تھا۔وہ بے مقصد لاؤنج کی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔

مہر کا خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا اس لیے گھر میں موجود خواتین زیادہ تر آفس کی ایمپلائیز تھیں یا دور کی کوئی رشتہ دار۔اس پورے ہجوم میں سب سے زیادہ خوش چھوٹی عنایا تھی۔اسے موت کی سنجیدگی کا اس عمر میں احساس نہ تھا۔اس کے علاوہ حسام بھی آیا تھا جس کے باعث اس کی خوشی کا تو جواز ہی نہ تھا۔وہ حسام کے ساتھ ہی گھر کے لان میں گھومے جا رہی تھی۔اسی وقت بے جان سی چال چلتے ہوئے مناج حسام کی طرف آئی۔اس وقت عنایا حسام کی گود میں تھی۔رسمی علیک سلیک کے بعد مناج نے بات کا آغاز کیا۔

”میں نے مہر سے آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کی بات کر لی تھی۔اور وہ مان گئی تھی۔“ مناج نے اپنے ازلی مشینی انداز میں فرمایا تو حسام کے چہرے پہ مسکراہٹ در آئی۔

”لیکن اسی وقت یہ خبر آگئی تھی۔پہلے ہم تھوڑی چیزیں ٹھنڈی ہونے دیتے ہیں۔اس کے بعد میں مہر سے ایک مرتبہ پھر سے بات کروں گی۔“حسام سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگا۔کچھ معمول کی باتوں کے بعد حسام عنایا کو گود میں پکڑے دوسری جانب بڑھ گیا۔مناج باہر جانے لگی مگر پھر اسے کسی کی کال آئی۔وہ سبزہ زار میں ہی کھڑے کھڑے کال ریسیو کرتے باتوں میں لگ گئی۔

دفعتاً درِّ فشاں قصر کی عمارت سے باہر نکلی۔جوں ہی اس کی نظر مناج پہ گئی جو فون پہ کسی سے باتیں کر رہی تھی۔مناج کو دیکھتے ہی اس کے قدم تھم گئے۔درفشاں اب باقاعدہ مناج کو گھور رہی تھی۔ اسے مناج کے انداز میں کچھ کھٹک رہا تھا۔درے کے چہرے پہ تشویش در آئی۔مناج کال کاٹتے ہوئے اب سبزہ زار سے جانے لگی۔درفشاں تیز قدم بڑھاتے اس کی طرف بڑھی۔

"ہیلو!" درے پیچھے سے پکارتے ہوئے اس کی طرف چلی آئی۔مناج نے چونک کر پیچھے دیکھا۔درِفشاں اس کے لیے اجنبی تھی۔اس نے بظاہر اپنا چہرہ نارمل رکھا مگر اس کے دماغ میں کافی سارے سوال تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" مناج کے قریب آکے درے نرمی سے بولی تھی۔مناج کے انداز میں واضح جھجک تھی۔اس سے پہلے کبھی کسی اجنبی نے اس سے بات کرنے میں پہل نہ کی تھی۔اس نے مشکوک نگاہ درفشاں پہ ڈالی۔

"مناج۔" مناج سرد سے انداز میں بولی۔درے مسکرائی۔اس کا انداز بہت گرم جوش سا تھا۔

"مناج، تم ٹھیک ہو ناں؟"درے کی آواز میں نزاکت تھی اور انداز میں اپنائیت۔مناج درے کو اوپر سے نیچے بغور دیکھنے لگی۔یہ لڑکی آخر کیا تھی؟

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ متذبذب سی ہو کے بے تاثر انداز میں اسے جواب دینے لگی۔درے نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"پکا؟" درفشاں نے آنکھیں بڑی کر کے پوچھا۔اگر کوئی اور ہوتا تو مناج کچھ کڑوا کسیلا کہہ کر اسے بھگا چکی ہوتی۔مگر درفشاں کا انداز اتنا خالص اور معتبر تھا کہ وہ چاہ کے بھی کچھ تلخ نہ کہہ سکی۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔" چہرے پہ تھکا ہوا سا تاثر لیے وہ بولی۔درفشاں کے چہرے پہ گہری مسکراہٹ بکھری۔

"میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں۔اور مجھے تم بالکل بھی ٹھیک نہیں لگی مناج۔" درے نے لہجہ سنجیدہ کر کے کہا۔مناج کو کچھ عجیب لگنے لگا تھا۔ایک انجان لڑکی اس کے لیے پریشان کیوں ہو رہی تھی بھلا؟ اس کے لیے تو صرف اس کی خالہ ہی پریشان ہوا کرتی تھیں۔اسے اپنے لیے کسی اور کا پریشان ہونا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"آپ کو کیا دلچسپی؟ کیا آپ میری مدد کرنا چاہتی ہیں؟" مناج کا لہجہ طنزیہ تھا۔درے آسودہ سی مسکراہٹ لیے اپنی گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں مناج۔میرے چاہنے سے بھلا کیا ہوگا؟ میں تمہاری مدد تب تک نہیں کر سکوں گی جب تک تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔" مناج درفشاں کو بس دیکھ کر رہ گئی۔کیا وہ اتنی ہی اچھی تھی یا صرف اچھا بننے کی اداکاری کر رہی تھی؟مناج سوچ میں پڑ گئی تھی۔درے نے اپنے پرس سے کارڈ نکالا اور مناج کے ہاتھ میں تھما دیا۔مناج کے دماغ میں اس لمحے درے کے لیے جتنے بھی اچھے خیالات آئے تھے تحلیل ہو گئے۔

”تم نے سوچا بھی کیسے کوئی تمہارے لیے مخلص ہو گا مناج۔ یہاں پر تو سب اپنی دکانیں چمکانے میں لگے ہوئے ہیں۔“ مناج نے بس سوچا۔ بولی کچھ نہیں۔ اس نے حقارت بھری نگاہ درفشاں پہ ڈالی۔ درے نے مناج کو دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا اور اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

”نہیں مناج تم غلط سمجھ رہی ہو!“ درے نے نرمی سے کہا تو مناج بری طرح سے چونک گئی۔ مگر اس نے تو اپنی سوچ کا اظہار کیا ہی نہ تھا۔۔۔ پھر؟

”یہ کارڈ میں نے تمہیں اس لیے دیا ہے کیونکہ اس میں میرا نمبر ہے۔ میں آٹھ بجے کے بعد اپنے گھر میں ہوتی ہوں۔ تم مجھے میرے گھر میں بھی مل سکتی ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ تم میں اپنے آپ کو بدلنے کی جست ہو۔“ مناج لاجواب سی وہیں کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجب تھا۔ درفشاں نے آخر اس کے دماغ میں آتے خیالات کیسے پڑھ لیے؟ وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔

”اپنا خیال رکھنا۔ میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔“ نرمی سے کہتے ہوئے درے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ مناج ہاتھ میں درے کا کارڈ تھامے مسحور سی کھڑی رہی۔ کیا واقعی اسے درفشاں کے روپ میں ایک مخلص دوست ملنے والا تھا؟ کیا واقعی وہ بھی ٹھیک ہو سکتی تھی؟ کیا واقعی وہ ایک دفعہ پھر سے جی سکتی تھی؟

مناج کے دماغ میں ایک بار پھر طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے۔ اس کا سر پھٹنے لگا۔ وہ تیز قدم بڑھاتے اپنی گاڑی تک گئی اور اس میں سوار ہو گئی۔ سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ اور مناج کو۔۔۔ ایک دفعہ پھر سے۔۔۔ تکلیف کی طلب ہونے لگی۔ اپنے ان خیالات سے آزادی پانے کا اسے صرف یہی راستہ نظر آیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عبداللہ سلطان کا قصر اس اداس سی رات میں بھی اپنے منظر پہ لگی بتیوں کی وجہ سے بھرپور چمکتا دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔قصر میں ویرانی کا بسیرا تھا۔قصر کی دیواریں بھی اپنے مالک کے چلے جانے سے غمگین لگتی تھیں۔

مہر اپنے کمرے میں کرسی پہ براجمان تھی۔وہ کھڑکی سے باہر کا تاریک منظر دیکھے جارہی تھی۔اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے لیکن وہ رو نہیں رہی تھی۔وہ گزرے ہوئے وقتوں میں اتنا رو چکی تھی کہ اب وہ رو رو کے عاجز آچکی تھی۔

اس کو اپنے ڈیڈ شدت سے یاد آتے تھے۔اب جا کے تو اس کا دل ان کے لیے نرم پڑا تھا۔ٹھیک اسی وقت جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔گھر کی ویرانی اسے کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ وہ اس ویرانی میں بالکل خالی خالی سا محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنے خیالات میں گم تھی جب اس کے کمرے میں ملازمہ داخل ہوئی۔

”میم۔عبداللہ سر کے دوست آئے ہیں۔“

مہر اسی طرح سے کرسی پہ بیٹھی رہی۔اس کے جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو۔“ مہر کی آواز بے تاثر سی تھی۔

ملازمہ مڑ کے کمرے سے جانے لگی۔

”نیلوفر چلی گئیں؟“ ملازمہ جانے لگی تو مہر بولی۔

"جی میم، وہ چلی گئیں۔" اب کی بار مہر نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ ملازمہ اب کمرے سے جا چکی تھی۔ مہر گہری سانسیں لیتے ہوئے کھڑے ہوئی۔ بھورا نیٹ کا ڈوپٹہ بستر پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ اپنے سر کے اوپر درست کیا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل گئی اور ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔

وہ بیٹھے بٹھائے اس پوری ایمپائر کی مالک بن گئی تھی۔ یہ جائداد، یہ کمپنی، اب سب کچھ اسی کا تھا۔ لیکن کیا وہ اس وسیع ایمپائر کو سنبھال بھی سکے گی؟ ڈرائنگ روم کا سفر طے کرتے ہوئے وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔

مہر اس وسیع اور دراز سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک شخص اس سے پشت کیے کھڑا تھا۔ مہر کو اس کا بھورا کرسپ کوٹ نظر آیا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ آخر انتقال والے گھر میں اتنا چمکیلا کوٹ پہن کے کون آئے گا؟ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

"السلام و علیکم!" وہ اس شخص سے کچھ فاصلے پہ آ کے کھڑی ہوئی اور اونچی آواز میں بولی۔ وہ شخص اس کی آواز سنتے ہی مڑا۔ وہ سخت اور کرخت نقوش والا مرد تھا۔ وہ خاصہ جوان بھی لگتا تھا پھر وہ عبداللہ سلطان کا دوست کیسے ہوا؟ مہر کو شدت سے احساس ہوا کہ کچھ غلط ہے۔

وہ شخص مہر کو گھورے جا رہا تھا جیسے اندر تک اس کا جائزہ لے رہا ہو۔ مہر کو اس لمحے خطرے کا اندیشہ ہوا۔ اس شخص سے بھی اسے برائی کا اندیشہ ہونے لگا۔ اسے دل ہی دل میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اپنی گھبراہٹ دباتے ہوئے اپنے چہرے کو پر سکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ شخص مہر کی گھبراہٹ کو بھانپ چکا تھا۔ اس کے چہرے پہ کمینی سی مسکراہٹ بکھری۔ اب مہر کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص بری نیت لے کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

ٹھیک اسی وقت ملازمہ ڈرائنگ روم کی اینٹرنس میں آ کے کھڑی ہو گئی۔وہ اس نیت سے کھڑی ہوئی تھی کہ اگر مہمان کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ اس کا بند و بست کر سکے۔ جہاں مہر کی جان میں جان آنے لگی وہاں اس شخص کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔چہرے پر اب ناگواری تھی، جیسے ملازمہ کا آنا اسے شدید ناگوار گزرا ہو۔

"تم ملازمہ کو بھیجو۔ہم سکون سے بات کرتے ہیں۔" اس شخص نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں اسے کہیں نہیں بھیج رہی۔آپ کو جو بھی کہنا ہے اس کے سامنے ہی کہنا ہو گا۔" مہر کا لہجہ سرد تھا۔ان دونوں کی گفتگو ملازمہ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔وہ دونوں پہلے ہی بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے اور پھر ڈرائنگ روم بہت وسیع تھا کہ آواز ملازمہ تک پہنچتے پہنچتے دب جاتی تھی۔

دفعتاً اس شخص کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔اس نے مہر پہ جتاتی نگاہ ڈالی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ "دیکھتے ہیں کیسے نہیں بھیجتی تم اسے۔" مہر اس مسکراہٹ کے باعث کچھ غیر آرام دہ سی ہونے لگی۔وہ شخص ایک قدم پیچھے گیااور دو قدم دائیں طرف بڑھائے۔اب اس کے کسرتی بازوؤں کے علاوہ اس ملازمہ کو کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔مہر عجب سے اس کی مشکوک سرگرمیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ یہ اجنبی آخر کرنا کیا چاہ رہا تھا۔

اس شخص نے اپنے کوٹ کا پٹ اوپر اٹھایا۔اور پھر مہر کو وہ نظر آئی۔۔۔کالی چمکدار سی وہ پستول۔جو کہ آس پاس کی روشنی کی وجہ سے چمک رہی تھی۔مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔دل کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار پکڑ لی۔وہ آنکھوں میں خوف لیے اس شخص کو دیکھنے لگی۔وہ شخص زیر لب ہنسا۔آنکھوں میں اس کے فتح ابھرنے لگی۔

”میرا نام شمس ہے۔اور میں بالکل سکون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔اس لیے تم اسی وقت اس ملازمہ کو بھیجو گی مہر بنت عبداللہ سلطان۔“ شمس چبا چبا کے اس طرح بولا کہ ملازمہ تک اس کی آواز نہ پہنچے۔ اور مہر وہیں ساکن سی کھڑی رہی۔خوف نے اسے اس قدر جکڑ لیا تھا کہ وہ اپنے قدم تک نہ ہلا سکی۔ نہ ہی وہ کچھ بول پا رہی تھی۔یہ پہلی دفعہ تھا کہ مہر نے اپنے آپ کو اس قدر بے بس پایا تھا۔۔۔

مہر بنت عبداللہ سلطان اس لمحے اپنے آپ سے جنگ کرنے لگی۔وہ آخر کیا کرتی؟ کیا وہ اس شخص کے سامنے گھٹنے ٹیک دے؟ وہ بھی اتنی آسانی سے۔لیکن یہاں پہ اس کی جان کو خطرہ تھا۔اوپر کمرے میں اس کی بیٹی سو رہی تھی، اس کی بھی جان کو خطرہ تھا۔وہ اپنا دماغ اس شدید دباؤ والی صورت میں بھی تیزی تیزی سے چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔نہیں بولو گی تو اسی وقت تمہیں اور تمہاری اس چیکو ملازمہ کو گولی سے اڑا دوں گا۔ سمجھی؟“ شمس تڑپتے ہوئے بولا۔ اسے مہر کی خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

مہر آنکھوں میں خوف لیے اسے دیکھنے لگی۔وہ کسی صورت میں بھی اس اجنبی کے ساتھ کمرے میں اکیلے نہیں رہ سکتی تھی۔اسے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی تھا۔

”صرف دس تک گنتی گنوں گا میں۔اس کے بعد انجام کی ذمہ دار تم ہوگی۔“ شمس کا پارا ہائی ہو رہا تھا۔لیکن وہ

اس بار بھی کافی دھیمے سے انداز میں بولا۔ملازمہ اب بھی ان کی گفتگو سے بے خبر تھی۔

تو مہر کے پاس صرف دس سیکنڈ تھے۔اسے جو بھی کرنا تھا ان ہی دس سیکنڈز میں کرنا تھا۔مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟ اس نے سرسری سی نظر پورے کمرے میں دوڑانا شروع کی۔وہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"ایک"!

(وہ آہستہ سے ہی گنتی گن رہا تھا کہ ملازمہ کو سنائی نہ دے)

مہر تیزی سے اپنی نظر ادھر ادھر گھمانے لگی۔وہ پورے ڈرائنگ روم کا سرسری سا جائزہ لینے لگی۔تب ہی اس کی نظر شمس پہ آکے ٹکی۔

"دو"!

وہ مہر سے دو تین قدم کے فاصلے پہ تھا۔پستول اس کی پینٹ میں کسی ہوئی تھی۔شمس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑے ہوئے تھے۔مہر ان باریکیوں کو نوٹ کرتے جا رہی تھی۔

"تین"!

وہ اس سخت صورت حال میں بھی اپنے دماغ کو تیزی سے چلانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔شمس کی پستول لوڈ تھی یا نہیں وہ نہیں جانتی تھی۔مگر وہ مہر کو فوراً نہیں اڑا سکتا تھا۔

"چار"!

اسے کم سے کم مہر کے سر پہ پستول تاننے میں ہی تین سیکنڈز لگ جانے تھے۔اتنی دیر میں اس کی ملازمہ بھی خوف کے مارے بھاگ جاتی۔گولی کی آواز سے باقی ملازم بھی چوکنا ہو جاتے۔

"پانچ"!

مہر کو احساس ہونے لگا کہ شمس اسے پستول سے مارنے کی غلطی کبھی نہیں کرے گا۔اس نے اگر کی تو وہ یہاں سے جائے گا کیسے؟

"چھے"!

باہر گارڈز تھے۔گھر میں ڈھیر سارے ملازمین۔اس نے اگر ایسا کچھ بھی کیا تو خود بری طرح سے پھنس جائے گا۔وہ مہر کو مارنے کی غلطی تب ہی کرتا اگر وہ بے وقوف ہوتا اور مہر کو وہ شخص بے وقوف نہیں لگ رہا تھا۔

"سات"!

مہر کا دماغ پر سکون ہونے لگا۔سر پہ چھائے بادل اب چھٹنے لگے تھے۔اس کے چہرے کی گھبراہٹ زائل ہونے لگی تھی۔اب اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔وہ جانتی تھی کہ کم سے کم اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

"آٹھ"!

آپشن اے: وہ ملازمہ کو جانے کا بولے گی۔شمس کو صوفے پہ بیٹھنے کا بولے گی۔شمس کے مڑتے ہی وہ میز پہ پڑا پانی کا جگ اس کے سر پے دے مارے گی۔وہ تکلیف سے بلبلائے گا تو وہ اس کی پستول نکال لے گی اور پھر اسے پولیس کے حوالے کر وادے گی۔

"نو"!

آپشن بی: وہ ملازمہ کو یہاں سے جانے کا بولے گی اور چپ چاپ سکون سے شمس کی بات سن لے گی۔کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ شمس کا اسے نقصان پہنچانا کچھ نا ممکن سا تھا۔

"دس"!

"صائمہ۔دروازہ بند کر کے چلی جاؤ۔" وہ مختصر سا پیچھے مڑ کے ملازمہ سے مخاطب ہو کے پر اعتماد سے انداز میں بولی۔"آپ چائے پینا پسند کریں گے ویسے؟" دس سیکنڈ میں ہی اس کا ہر انداز بدل گیا تھا۔ شمس نے بھی یہ تبدیلی نوٹس کر لی تھی۔اسے یہ تبدیلی دیکھ کے تعجب ہورہا تھا۔اسے رہ رہ کے غصہ بھی آرہا تھا۔وہ تو اس لڑکی کو دبانے آیا تھا، اسے ڈرانے آیا تھا، اور یہ لڑکی اس سے دبتی نظر نہیں آرہی تھی۔

"نہیں۔کیا ہم بیٹھ کے بات کر لیں؟" شمس کچھ متذبذب سا ہو کے بولا۔اسے دور دور تک اندازہ نہ تھا کہ مہر اس طرح کا رد عمل بھی دے سکتی تھی۔

"ترکش کہوہ؟" مہر مدھم سا مسکرائی۔یہ مسکراہٹ جلانے والی تھی۔شمس کو یہ مسکراہٹ دیکھ کے تپ چڑھنے لگی۔شمس کی آنکھوں میں سختی در آئی۔اس کا بس نہیں چل رہا کہ مہر کا حشر نشر خراب کر دے۔

"میں یہاں کھیلنے نہیں آیا ہوں مہر بنت عبداللہ سلطان۔ سمجھی تم۔" شمس مہر کے قریب بڑھ کے بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مہر کے بدلتے انداز دیکھ کے بری طرح جل گیا تھا۔

”صائمہ تم جا سکتی ہو۔ہمارے مہمان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔اور ہاں دروازہ بند کرتی جانا۔“

مہر بولی۔شمس اسے تعجب سے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ مہر تھی، وہ زندگی کی پستی بخوبی دیکھ چکی تھی۔

وہ اتنی جلدی ٹوٹنے والوں میں سے قطعاً نہیں تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## باب نمبر ۵:اے چاند یہاں نہ نکلا کر

اے چاند یہاں نہ نکلا کر

بے نام سے سپنے دیکھا کر

یہاں الٹی گنگا بہتی ہے

اس دیس میں اندھے حاکم ہیں

نہ ڈرتے ہیں نہ نادم ہیں

نہ لوگوں کے وہ خادم ہیں

ہے یہاں پر کاروبار بہت

اس دیس میں گردے بکتے ہیں

کچھ لوگ ہیں عالی شان بہت

اور کچھ کا مقصد روٹی ہے

وہ کہتے ہیں سب اچھا ہے

مغرب کا راج ہی سچا ہے

یہ دیس ہے اندھے لوگوں کا

اے چاند یہاں نہ نکلا کر

(حبیب جالب)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"صائمہ تم جا سکتی ہو۔ہمارے مہمان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔اور ہاں دروازہ بند کرتی جانا۔" مہر بولی۔ شمس اسے تعجب سے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ بری طرح سے تنک کے رہ گیا تھا۔اس کے چہرے پہ مہر کے لیے شدید ناگواری تھی۔مہر کا یوں برتاؤ کرنا اس کی چھوٹی سی انا کو زخم بھی دے گیا تھا۔شمس نے تہیہ کیا کہ وہ مہر کی اکڑ نکال کر ہی رہے گا۔ملازمہ بھی ڈرائنگ روم سے جا چکی تھی۔

شمس صوفے کی طرف بڑھا اور ایسی شان سے صوفے پہ بیٹھا جیسے یہ گھر اسی کی ملکیت ہو۔مہر اسے بیٹھتے دیکھتے گئی۔وہ بھی پر سکون سی ہو کے اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

آپشن اے میں واضح خطرہ تھا۔ ذرا سی نوک جھوک اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اس لیے مہر نے آپشن بی کو چنا۔ اس کی بیٹی بھی اوپر تھی، اس نے اس لیے سکون سے شمس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتی تھی یہ جو بھی تھا کوئی بڑا عزم لے کے اس کے پاس آیا تھا۔ یہ جو بھی تھا، اکیلا نہیں تھا، یقیناً کسی کا چیلا تھا۔ اس صورت میں اگر وہ اس وقت اس سے جان چھڑا بھی لیتی تب بھی وہ جو بھی تھے اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ اس لیے مہر نے آرام سے شمس سے بات کرنے کو ترجیح دی۔

"اب میں تمہیں جو بتاؤں گا، اسے سننے کے لیے بہت ہمت چاہیئے۔" صوفے پہ ٹیک لگائے، چہرے پہ مکروہ سا تاثر لیے وہ بولا تھا۔ "شاید تم چلاؤ گی، رو گی۔ میرے سامنے گڑگڑاؤ گی۔ میری منتیں سماجتیں کرو گی۔ جو بھی ہو، میں تمہیں تیار کر رہا ہوں۔" شمس زیر لب ہنس دیا۔ وہ ذو معنی سے انداز میں اپنی خواہشات کا اظہار کرنے لگا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا، کہ مہر اس کے سامنے گڑگڑائے، روئے، اس سے خوف کھائے۔ یہ سوچ ہی اس کی انا کو تسکین دے رہی تھی۔

یہ سنتے ہی مہر کے چہرے پہ جتاتی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات تن گئے۔ وہ اور اسے کے سامنے گڑگڑائے گی؟ اس نے دماغ میں ہی سوچا۔

"چلو شاباش۔ اب یہ جگ ہے ناں۔" شمس نے جگ کے اوپر انگلی سے اشارہ کیا۔ "اس میں سے پانی کا ایک گلاس نکالو۔ اور اسے پی لو۔" شمس بھنویں اکٹھا کرتے حکم دینے والا انداز اختیار کرتے بولا۔ مہر نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

مہر کو اس لمحے اس اجنبی سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شدید کوفت کے عالم میں تھی۔ اچھا ہی ہوتا اگر وہ اس کے سر پہ یہ جگ کھینچ کے مار ہی دیتی۔ اس نے سوچا۔

"شاباش!" شمس مہر کے اندر پیدا ہوتے تناؤ سے محظوظ ہوتا نظر آرہا تھا۔ مہر نے بھاری سانس خارج کرتے ہوئے جگ سے ایک گلاس پانی نکالا۔ پانی کے بھرے ہوئے گلاس کو وہ اپنے لبوں کی طرف لے کے جانے لگی۔

"اہاں!" شمس نے ہاتھ بڑھا کے مہر کے گلاس سے وہ پانی چھینا۔ پانی کے کچھ قطرے گلاس کی سرحد کو عبور کرتے مہر کے کُرتے میں جذب ہوئے۔ "یہ والا گلاس میرے لیے۔ تم اپنے لیے دوسرا گلاس نکالو گی۔" مہر نے اس وقت غصے کے کڑوے گھونٹ اپنے اندر اتارے۔ یہ گھونٹ اس کے لیے زہر کی مانند تھے۔ اسے شمس بھی زہر کی مانند لگ رہا تھا۔

مہر نے پانی کا گلاس نکالا اور اسے گٹا گٹ پی گئی۔ اب اس سے یہ شمس برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ڈرائنگ روم میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ شمس مہر کو یوں مضطرب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"پتا ہے ایک جانور کو بھر کے پانی کب پلایا جاتا ہے؟" شمس نے ٹیبل پہ پڑے پانی کے جگ کو اپنے ہاتھ میں اٹھایا۔ وہ جگ کو بغور دیکھنے لگا۔ مہر کے چہرے پہ چھائی ناگواری شدید ہونے لگی۔ چہرے پہ سخت سا تاثر لیے اس نے سر نفی میں ہلایا۔

ڈرائنگ روم کے احاطے میں کانٹ دار خاموشی کا بسیرا رہا۔

شمس زیرِ لب ہنسا، اور پھر اس نے آگے کہنا شروع کیا۔

"ایک جانور کو بھر کے پانی اسے قربان کرنے سے پہلے پلایا جاتا ہے۔ اور مہر بنت عبداللہ سلطان تم اس وقت قربان ہونے جارہی ہو۔" مہر کے جہاں رونگٹے کھڑے ہوئے وہاں شمس نے جگ کو زمین پہ

زور سے پٹخ دیا۔جگ کی زمین میں کرچی ہونے سے زوردار آواز پیدا ہوئی تو مہر بری طرح سے چونک گئی۔وہ شمس کو اچنبھے سے دیکھ رہی تھی جب کے شمس کی نگاہیں سرخ تھیں۔مہر سہم گئی تھی۔ شمس بھی اسے سہا ہوا ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ شمس سے بالکل بھی اس طرح کی امید نہیں کر رہی تھی۔مگر شمس، وہ انسان کے روپ میں حیوان تھا، درندے کی مانند تھا۔اس کا نفس مر چکا تھا۔

"تمہارے نخرے۔تمہارا یہ ایٹیٹیوڈ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔" اپنے ہاتھوں کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے وہ بے بسی بھرا غصہ لیے بولا تھا۔مہر کے دل پہ ضرب سا آکے لگ گیا۔اعتماد کے بادل آہستہ آہستہ چھٹنے لگے تھے۔"اگر تم اتنی پیاری سی نازک سی نہ دکھتی تو اب تک تو میں تمہارا وہ حشر کر چکا ہوتا کہ تمہاری بیٹی بھی تمہیں نہ پہچانتی۔"

مہر کے دل پہ خوف بسنے لگا تھا۔اسے سامنے بیٹھے اس بھیڑیے کی مانند شخص سے خوف آرہا تھا۔اور آنا بھی چاہئے تھا۔وہ اس وقت جنون کی کیفیت میں لگتا تھا۔طیش سی، پھٹی پھٹی آنکھیں، گردن اور ماتھے پہ بھڑکتی رگیں اور پھولتا تنفس اسے مزید خوفناک بنا رہا تھا۔

"اب تم چپ چاپ میری بات سنو گی۔اور سچ کہہ رہا ہوں میں مہر،اگر تم نے کوئی ایٹیٹیوڈ دکھایا، تو تمہیں نوچ کھاؤں گا۔" شمس نے سانسیں پھلا پھلا کے چبا چبا کے کہا۔

مہر کا اعتماد اب پوری طرح سے سمٹ چکا تھا۔وہ آنکھوں میں خوف اور بے چینی لیے شمس کو دیکھ رہی تھی۔وہ اپنے آپ کو اس طاقتور سے دکھنے والے مرد کے سامنے بے بس محسوس کر رہی تھی۔

شمس کا پھولتا تنفس تھم گیا تھا۔مہر بھی اب سیدھی ہو کے بیٹھ گئی تھی۔وہ پھر سے ٹیک لگا کے آرام دہ سا ہو کے بیٹھا۔

شمس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”تم نے اندازہ کر ہی لیا ہو گا کہ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔“ شمس عام سے انداز میں سہمی ہوئی مہر کو دیکھتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔”اگر نہیں کیا تو میں تمہیں بتاتا چلوں کہ مجھے میرے مالکوں نے بھیجا ہے۔“ مالکوں کا لفظ کہتے ہی شمس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔ مہر کے وجود میں جیسے کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

”میرے مالک، بہت طاقت ور ہیں۔تم آئے دن ملک میں بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگز کے واقعات دیکھتی ہو گی، کتنوں کے تو ذمہ دار میرے یہ عظیم مالک ہی ہیں۔“ جتاتی نگاہیں مہر پہ ڈالتے ہوئے اس نے اپنے مالکوں کی شان میں قصیدے پڑھے۔

مہر کے جسم میں سرد سی لہریں دوڑنے لگیں۔وہ آخر کہاں پھنس گئی تھی؟

”تم شاید یہ بھی سمجھ گئی ہو گی کہ تمہارے باپ کو ہم نے مارا ہے۔“ مہر نے ایک جھٹکا لیا۔آنکھوں میں بے یقینی لیے اس نے مسکراتے شمس کو دیکھا۔یہ بات اسے ایک الگ سی تکلیف دیتی تھی۔”بلکہ، تمہارے باپ کو موت کے گھاٹ میں نے اپنے ہاتھوں سے اتارا تھا۔“ وہ کہہ کے زور سے ہنسنے لگا۔مہر کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔وہ اس وقت اپنے باپ کے قاتل سے بات کر رہی تھی۔وہ اس وقت اپنے باپ کے قاتل کے سامنے بے بس سی ہو کے بیٹھی تھی۔یہ بے بسی کا احساس، یہ لاچارگی کا

احساس، یہ مہر کی روح کو چھلنی سا کر رہا تھا۔ اسے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا، اپنے سامنے بیٹھے شمس کے اوپر غصہ آرہا تھا۔ مگر وہ بے بس تھی، مجبور تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ قانون ہمارا ہے۔ تم چلا چلا کر بھی سارے زمانے کو یہ بتاؤ گی کہ، تمہارے فرشتہ صفت (انداز میں طنز تھا) باپ کو ہم نے مارا ہے تب بھی ہمیں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑنا۔" وہ اپنی ہنسی قابو کرتے بولا۔ مہر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ اس وقت گہری تکلیف میں تھی۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو کوس رہی تھی، اس کے ڈیڈ کا قاتل اس کے سامنے تھا مگر وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"خیر، میں یہاں پہ خبر رساں کے طور پہ آیا ہوں مہر۔ اب جو میں بتانے جارہا ہوں اسے غور سے سنو۔" شمس نے توقف بھرا۔ مہر نے بھی ہر خیال کو اپنے دماغ سے جھٹکا اور اپنے کان کھڑے کر لیے۔

"تمہارے باپ نے ہمارے ہیرے چرائے تھے مہر۔ اس نے ہمارے ساتھ دغا کیا۔ اس نے یہ سب قرضے سے بچنے کے لیے کیا تھا۔ ہمارے ہسپتال نے اسے ایک بہت بڑا قرضہ دیا تھا۔ ہم اس پہ زور زبردستی کریں یہ اس کے ساتھ کچھ سخت کریں، اس کے خوف سے اس نے وہ ہیرے چرائے۔ وہ ہمارے ساتھ گیمز پہ گیمز کھیلتا گیا، ہمیں بلیک میل بھی کرتا گیا۔ اور پھر ایک دن ہماری برداشت ختم ہوگئی۔" مہر غور سے شمس کی بات سن رہی تھی۔ شمس نے جو کہانی سنائی، اس میں کچھ عجیب سا تھا۔ جیسے بہت سے پزل پیسز اس کہانی سے غائب تھے۔ کچھ تھا جو وہ چھپا رہا تھا، مہر کو اندیشہ ہوا۔ شمس نے اپنی کوٹ کی جیب سے کچھ پیپرز نکالے اور میز پہ رکھے۔

"یہ وہ قرضہ ہے جو تمہارے باپ نے ہم سے لیا تھا۔۔۔"

اپنی کہانی کو کچھ لمحے روک کے ہم دو دن پہلے کی اس تاریک رات میں چلتے ہیں جہاں عبداللہ سلطان کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"یعنی تمہاری کوئی بھی آخری خواہش نہیں ہے۔" شمس بھی بس ٹرگر دبانے کے لیے تیار تھا۔۔۔

شمس ٹرگر دبانے کے لیے تیار تھا، لیکن اس نے ابھی ٹرگر دبایا نہیں تھا، ایک اور کام تھا جو اسے کرنا تھا۔وہ کر کے بھلے عبداللہ سلطان کو مار دیتا، مگر ابھی بھی انہیں عبداللہ کی ضرورت تھی۔ابھی تو اس نے عبداللہ سلطان سے مہر کی بربادی کے پروانے پہ دستخط کروانے تھے۔۔۔

"خدارا مجھے چھوڑ دو۔مجھے چھوڑ دو۔مجھ سے جو کروانا چاہتے ہو کروالو، میری بیٹی کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔" عبداللہ سلطان رو رہے تھے۔شمس نے پستول کی نال نیچے کی۔عبداللہ سلطان کو جیسے اس لمحے یقین نہیں آیا۔وہ تو یہی تصور کر بیٹھے تھے کہ وہ اس لمحے ہی مر جائیں گے۔وہ حیران تھے۔

"ٹھیک ہے۔یہ کچھ پیپرز ہیں ان پہ دستخط کرو۔اور پھر ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔" شمس نے جیب سے پیپرز نکالے اور زمین پہ پھینک دیئے۔ساتھ ہی اس نے پین بھی زمین پہ پھینک دیا۔

"یہ کس چیز کے پیپرز ہیں؟" عبداللہ سلطان اب پیچھے مڑے۔شمس کی بندوق بھی اب نیچے ہو گئی تھی۔

"چپ چاپ سائن کر لو۔اور پھر میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے جدا۔" شمس نرمی سے بولا۔عبداللہ سلطان کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

"اگر تم نے دستخط کروانے کے بعد مجھے مار دیا۔" ایک تشویش عبداللہ سلطان نے ظاہر کی تھی۔ شمس کے چہرے پہ سختی در آئی۔

"تم اس وقت سوال جواب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔چپ چاپ دستخط کردو عبداللہ۔" شمس کا انداز سخت ہوگیا تھا۔عبداللہ سلطان زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھے۔پین ہاتھ میں تھامے وہ اب پیپرز پہ دستخط کرنے لگے۔وہ کسی بھی کاغذ کو پڑھ نہیں رہے تھے۔انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ پیپرز پہ دستخط کروانے کے بعد انہیں مار دیا جائے گا، مگر وہ جیسے قدرت کو آزمانا چاہ رہے تھے۔لیکن اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ پیپرز مہر کو برباد کرنے کی کشش رکھتے تھے تو وہ مرنے کو ہی ترجیح دیتے۔

عبداللہ سلطان نے زمین پہ پھیلے پیپرز پہ دستخط کر لیے تھے اب انہوں نے نظر اٹھا کے شمس کو دیکھا۔ عدم یقینی ان کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔

"کام ہوگیا، مجھے جانے دو۔" وہ آواز میں لڑکھڑاہٹ لیے بولے۔وہ جانتے تھے یا تو انہیں اس وقت مار دیا جائے گا، یہ انہیں واقعی جانے دیا جائے گا۔ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔تم جا سکتے ہو۔" شمس بولا

شمس نے اپنی پستول ہوا میں اٹھائی اور عبداللہ سلطان کے سر پہ تانی، عبداللہ سلطان کی آنکھوں میں خوف پھیلنے لگا۔شمس نے ٹرگر دبایا تو پستول میں سے گولی تیز رفتار سے نکلی اور عبداللہ سلطان کی کھوپڑی کو چیرتے دماغ میں داخل ہوئی۔خون کا فوارہ ان کی کھوپڑی سے نکلا اور وہ زمین پہ گر گئے۔

اسے یہ کرنے میں بس ایک لمحہ لگا تھا۔اس نے عبداللہ سلطان کو کچھ بولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ایک ہی جھٹکے میں انہیں زندگی کے دھاگے سے گرا دیا۔عبداللہ سلطان زمین پہ اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ان کا بے جان جسم خون کے تالاب میں نہا چکا تھا۔

”کہا تھا، میں تمہیں جانے دوں گا۔“ وہ مسکرا کے عبداللہ سلطان کے بے جان جسم سے کلام کر رہا تھا۔اس نے وہ پیپرز اکٹھا کیے اور مڑ گیا۔وہ جارہا تھا اور پھر ایک دم سے رک گیا۔

آنکھیں بند کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”جہنم میں ملتے ہیں، عبداللہ۔“ وہ اب جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”یہ وہ قرضہ ہے جو تمہارے باپ نے ہم سے لیا تھا۔“ حال کا شمس بولا۔مہر نے ہاتھ میں وہ پیپرز تھامے۔

اس نے وہ پیپرز کھولے۔وہ ”سنابل“ ہسپتال کی طرف سے دیا جانے والا قرضہ تھا۔مہر کافی مشکوک ہو گئی۔اور پھر اس کی نظر ان نمبرز پہ پڑیں۔اس نے جیسے دو سو چالیس والٹ کا جھٹکا کھایا تھا۔اس کی آنکھیں خوف کے مارے پھٹنے لگیں۔اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔اس کے ہاتھوں سے وہ پیپرز چھوٹے۔

”نہیں!“ وہ گہری سانسیں لیتے بولی تھی۔اس نے اب نظر شمس پہ دوڑائی جو کہ گلا پھاڑ کے ہنسے جارہا تھا۔مہر بری طرح سے ٹریپ ہو چکی تھی۔یہ قرضہ اس کی کمپنی کو دیا گیا تھا، وہ کمپنی اب اس کی تھی،

وہ اب ان درندوں کی مقروض تھی۔وہ ایک دیوالیہ کمپنی کی مالک تھی۔۔۔یہ حقیقت۔۔۔مہر کی روح کو جھنجوڑ چکی تھی۔

”یہ میں کیسے کر سکتی ہوں؟“ وہ صحیح معنوں میں اب پریشان ہوئی تھی۔اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ حالات واقعی سنگین تھے۔

”اب یہ تو تمہارے اوپر منحصر ہے۔تم سوچو، کہ تم ہمیں یہ قرضہ کیسے واپس کر سکتی ہو مہر۔“ مہر ڈر چکی تھی، وہ دبنے لگی تھی۔ شمس بھی یہی چاہتا تھا، اسے ڈرانا اور دھمکانا، اسے دبانا۔ وہ جتنا ان سب سے دبے گی، وہ آگے ان کے اتنا ہی کام آئے گی۔مہر کی ضرورت صرف اس قرضے تک یا ان ہیروں تک نہیں پابند تھی، مہر کی ان کی زندگی میں اہمیت اس سب سے بڑھ کر تھی، بہت سے حقائق تھے جن پر سے پردہ اٹھنا باقی تھا، جن سے مہر کی آشنائی ہونا باقی تھی۔

”میں کیسے؟“ وہ آنکھیں پھاڑ کے بولی۔وہ بمشکل اپنے آپ کو رونے سے روک رہی تھی۔اس کا چہرہ رُندھا ہوا سا تھا۔

”لیکن تمہیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شمس جتانے والے انداز میں بولا۔”تم وہ ہیرے ہمیں ڈھونڈ کے دے دو۔وہ چار ہیرے جو عبداللہ نے چرائے تھے، اور بس تم آزاد۔ہمارے راستے جدا جدا۔ہم یہ قرضہ معاف کردیں گے۔“ شمس نے ایک بزنس مین کی طرح ڈیل سامنے رکھی۔مہر بری طرح سے پھنس چکی تھی۔اس کا قدم قدم جکڑا گیا تھا۔وہ اتنی شدید صورتحال سے کیسے فرار حاصل کرے؟

مہر کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔اس کے اندر کی با اعتماد اور مضبوط لڑکی مرنے لگی تھی۔وہ کمزور پڑنے لگی تھی۔

ہاں۔۔۔مہر بنت عبداللہ سلطان ایک دفعہ پھر سے کمزور پڑنے لگی تھی۔مگر وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی، وہ ایک دفعہ پھر سے ہارنا نہیں چاہتی تھی۔وہ ایک دفعہ پھر سے ٹوٹنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ کتنا خوش تھی۔۔۔اس نے زندگی کو پھر سے جینا سیکھا تھا۔۔۔مگر اب، اب کیا ہونے لگ گیا تھا؟

وہ حالات کی سلاخوں کے پیچھے قید تھی۔۔۔مہر بنت عبداللہ سلطان ایک قیدی تھی۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس غمگین رات کا اختتام سورج کے آسمان پہ ابھرنے سے ہوا تھا۔

وہ چاروں ایک مرتبہ پھر سے عافیت زندگی کے اس خفیہ کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔اب وہ آگے کا منصوبہ بنانے لگے تھے۔

کمرے میں کرسیاں آج بھی گول دائرے کی صورت لگائی گئی تھیں۔

سب کی نظریں، اور سب کی توجہ شمس پہ مرکوز تھیں۔شمس بھی کل رات ہونے والے واقع کی ہر تفصیل بیان کر رہا تھا۔

"مجھے اس سے اسی طرح کی امید تھی۔" شمس نے بات مکمل کی تو نیلوفر بولی۔"وہ ایک مضبوط لڑکی ہے۔میں جانتی تھی وہ سب سنبھال لے گی۔وہ زندگی کی سختیاں دیکھ چکی ہے۔" نیلوفر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔شمس نے مختصر سا سر ہاں میں ہلایا۔

”وہ بہت مضبوط اعصاب کی ہے۔ایک آنسو بھی اس نے نہیں بہایا۔لیکن خیر سے میں اسے دبانے میں کامیاب ہو گیا۔“ شمس فخریہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

ان سب میں سب سے خاموش لیڈی اقتدار تھی۔وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

”پرفیکٹ!بس وہ ہیرے بھی ہمیں مل جائیں۔“ درانی بولا۔آواز پرجوش تھی، انداز میں لالچ کا عنصر موجود تھا۔

پیسہ، طاقت ان سب کے دلوں کو کالا کر گیا تھا۔اتنا کالا کہ وہ اس پیسے کے خاطر، اس طاقت کے خاطر کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھے۔

فی الحال سب بہت خوش تھے۔سب کچھ پرفیکٹ جارہا تھا، ان کے پلان کے مطابق۔اگر سب کچھ اسی طرح سے چلتا گیا تو مہر کا وہ بھرپور استعمال کر سکیں گے۔۔۔

اگر سب کچھ ان کے پلان کے مطابق چلتا گیا تو۔۔۔

”شمس کی باتوں نے مجھے بہت پر امید کر دیا ہے۔“ آخر کار لیڈی اقتدار بولی۔چہرے پہ تنی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

”سب اسی طرح سے چلتا رہا تو ہم بہت جلد اپنا نقصان ریکور کر لیں گے۔“ وہ سب کو دیکھتے ہوئے بولی۔اس کی آنکھوں میں امید تھی۔

سب بہت خوش تھے۔سب مکمل تھے۔ان کا کاروبار مکمل تھا۔

”درانی، تمہیں مہر پہ پوری نظر رکھوانی ہو گی۔“ لیڈی اقتدار درانی کی طرف نظر بڑھاتے بولی تھی۔ان کے چہرے پر اب کی بار شیطانی مسکراہٹ بکھری۔

”میں ہمارے مستقبل کے پارٹنر ان کرائم کی پل پل کی خبر سے واقف ہونا چاہتی ہوں۔“ وہ مسکرا کے تائید والے انداز میں بولی۔اس کمرے میں موجود ہر فرد مسکرانے لگا۔

سب مکمل تھے۔۔۔خوش تھے۔۔۔ہر پریشانی سے دور تھے۔۔۔ہر بلا ٹل چکی تھی۔۔۔سب پرفیکٹ تھا۔

سب انجان تھے کہ ان کی یہ خوشی، ان کا یہ اطمینان، عارضی تھا، کوئی تھا جو جاگ چکا تھا، کوئی تھا جو لمبی نیند کے بعد جاگ چکا تھا، اور اس کوئی کے جاگنے کی خبر ان تک جلد ہی پہنچ جانے والی تھی۔

ان کا سکون غارت ہی ہونا تھا۔

تقدیر۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وقت کی سب سے بڑی خصوصیت پتا ہے کیا ہے؟ کہ یہ گزر جاتا ہے۔انسان گزرتے وقت کے ساتھ سنبھلنے لگتا ہے، انسان اس گزرتے وقت کے ساتھ بہت کچھ حاصل کرتا ہے، بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ ہماری کہانی کے کرداروں کے لیے بھی وقت چند دن آگے بڑھ گیا۔

یہ رات کا وقت تھا۔مناج اپنی گاڑی میں بیٹھی تھی۔گاڑی کا اے سی چل رہا تھا جس کے باعث گاڑی کا ماحول کافی سرد تھا۔مناج کے ہاتھ میں درے کا کارڈ تھا۔وہ مغرب کے بعد سے اس کارڈ کو یوں ہی

دیکھے جا رہی تھی۔وہ اب تک درے کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔اس کے دل میں خلش سی تھی۔

"کیا تمہیں اس کے پاس جانا چاہئے مناج؟ کیا واقعی تم ٹھیک ہو سکتی ہو؟" مناج کے دل سے ایک آواز ابھرنے لگی۔وہ حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ایک طرف اس کے اندر بسا ایک گوشہ تھا جو اسے روکے ہوئے تھا اور ایک طرف

درفشاں کا وہ پر خلوص انداز تھا، جسے وہ بھلا ہی نہ سکی۔اس نے کتنے خلوص سے کہا تھا کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔مناج کو یوں نہ جانا بھی برا لگ رہا تھا۔

"تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی مناج۔ تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔تم جب تک مردہ ہو کوئی انسانی ذات تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی مناج۔تم کسی کے اوپر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی ہو۔کیا پتا وہ سائیکولاجسٹ بھی تمہیں استعمال کرے؟" اندر سے ایک آواز نکلی۔مناج کے چہرے پہ کرب جھلکنے لگا۔یہ احساس کہ وہ مردہ ہے، یہ اسے تکلیف دیتا تھا مگر پھر بھی وہ اسی احساس کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔

"بس ایک آخری کوشش۔۔۔بس ایک دفعہ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔مجھے صرف تجسس ہو رہا ہے کہ کیا واقعی میں بھی ٹھیک ہو سکتی ہوں؟ کیا میرے لیے کوئی امید باقی ہے؟" مناج زیرِ لب بڑ بڑائی۔وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔وہ اندر

ہی اندر ٹھیک بھی ہونا چاہتی تھی مگر اب تک وہ خود سے اقرار نہیں کر سکی تھی۔

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مناج نے اپنے پرس سے موبائل نکالا۔وہ تیزی سے یہ کر رہی تھی تاکہ اس کے دماغ میں کوئی دوسرا خیال نہ ابھرے اور اسے یہ کرنے سے نہ روک سکے۔وہ اپنی قسمت کو آزمانا چاہتی تھی۔وہ

در فشاں کو آزمانا چاہتی تھی۔

اس نے در فشاں کو کال ملائی اور موبائل کان سے لگایا۔کچھ دیر رنگ کے بعد کال اٹھا لی گئی۔

"یقیناً یہ کال مناج کی طرف سے ہے۔۔۔ہے ناں؟" فون کے اس پار سے درے کی نرم اور اپنائیت بھری آواز چہکی۔مناج ایک دفعہ پھر سے درِ فشاں کی شخصیت کے زیر اثر مسحور رہ گئی تھی۔

"مگر میں نے آپ سے پہلے بات نہیں کی۔تو آپ کو کیسے پتا چلا؟" مناج نے اپنے انداز کو مشینی رکھنے کی کوشش کی مگر وہ چاہ کے بھی اپنی حیرانی نہیں چھپا سکی۔

"ارے۔" درے زور دیتے ہوئے بولی۔"میں کوئی جادوگرنی نہیں۔بس پچھلے دن تمہیں ہی نمبر دیا تھا اس لیے اندازہ لگانا آسان تھا۔" اس کا انداز دوستانہ سا تھا۔مناج بے اختیار مسکرائی، مسکراہٹ بے جان تھی۔درے میں کچھ تھا جو اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔جو اسے آرام دہ سا کر دیتا تھا۔وہ اس سے پہلے کسی بھی انسان سے یوں بات کرتے ہوئے پر سکون محسوس نہیں کرتی تھی۔لیکن درے کی بات ہی کچھ اور تھی۔

"جی، میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔کیا آپ مجھے اپنی لوکیشن بھیج دیں گی؟" مناج کا دل ڈگمگ ہو رہا تھا۔

اس کی آواز میں بے چینی بھی عیاں تھی۔

"بالکل دے دوں گی۔ مگر صرف تب ہی جب میرے اس سوال کا جواب ہاں میں ہو گا۔ تو مناج، کیا تم اپنے آپ کو بہتر کرنا چاہتی ہو؟ کیا تم چاہتی ہو کہ تم بھی ایک مثبت سی زندگی گزارو؟" گاڑی میں کچھ دیر کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ مناج بھی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"جی۔۔۔" مناج کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے خود سے اتنا واضح اقرار کیا تھا کہ وہ بھی بدلنا چاہتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں لوکیشن دے رہی ہوں۔ مجھے انتظار رہے گا۔" درے نے کال کاٹ کے مناج کو لوکیشن بھیج دی۔

مناج لوکیشن کا تعاقب کرتے کرتے درفشاں کے گھر پہنچ گئی۔ گاڑی سے باہر نکل کر اس نے ایک نظر پورے گھر پہ دوڑائی۔ درے کا گھر اس کے گھر سے چھوٹا تھا۔ کافی چھوٹا۔ مگر نہایت خوبصورتی سے بنایا گیا تھا۔ مناج نے گاڑی سے سگریٹ نکالی اور اس کے کونے کو لائٹر سے جلایا۔ سگریٹ کو لبوں پہ لگاتے ہوئے وہ اب سگریٹ کے کش بھر رہی تھی۔ یوں ہی سگریٹ کے کش بھرتے ہوئے اس نے گھر کی گھنٹی بجائی۔

اندر درِفشاں برتن دھو رہی تھی اور احمد آئی لینڈ کچن کے سامنے ایل شیپڈ ٹیبل پر بیٹھے موبائل استعمال کر رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت گھر کی گھنٹی بجی۔

"احمد میری دوست آئی ہو گی۔ دروازہ کھول دو، میں بس آخر کے برتن دھو کر آئی۔" درے کا ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگا۔ احمد ٹھنڈی آہیں بھرتے اپنی کرسی سے اٹھا۔

اس نے گھر کا دروازہ کھولا تو سامنے ایک عام سی شکل کی لڑکی مدہوش سے عالم میں سگریٹ کے کش بھر رہی تھی۔ اس نے کندھے پہ ایک پرانی پشمینہ شال گرائی ہوئی تھی۔ احمد کے چہرے پہ ایک ناگوار سا تاثر آکے گزرا۔ مناج نے بھی اس کے انداز میں ناگواری کو فوراً بھانپ لیا۔ اسے احمد بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"یہ درفشاں کا گھر ہے؟" مناج کے مشینی انداز میں مصنوعی نروٹھے پن کا ملاپ تھا۔ احمد نے گردن ہاں میں ہلائی۔ مناج ایسے حق سے اندر داخل ہوئی جیسے یہ گھر اسی کا تھا۔

ٹھیک اسی وقت درفشاں دروازے پہ آئی۔ اس کی آستینیں مڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ گیلے تھے۔ وہ مناج کو، چہرے پہ تھکی ہوئی مسکراہٹ لیے دیکھ رہی تھی۔

"مناج اندر آجاؤ۔ میرے ساتھ اوپر والے فلور پہ چلو۔" درے مختصر سا کہہ کے مڑ گئی اور اندر جانے لگی۔ مناج نے ایک سرد نگاہ احمد پر ڈالی جس کے چہرے کے تاثرات اب بھی تنے ہوئے تھے۔ مناج نے اپنے چہرے کا رخ احمد کی طرف موڑا، سگریٹ کا گہرا کش بھرا اور ڈھیر سارا دھواں احمد کے منہ پہ چھوڑ دیا۔ احمد کھانستا اور کراہتا رہ گیا۔ جب تک احمد نے اپنی کھانسی پہ قابو پایا تب تک تو مناج منظر عام سے غائب ہو چکی تھی۔ احمد کے چہرے کی ناگواری شدید ہونے لگی۔

"نہ جانے آپا کے کیسے کیسے دوست آ رہے ہیں۔اف۔" وہ دل ہی دل میں در فشاں کو ملامت کرنے لگا۔

گھر کی سیڑھیاں آئی لینڈ کچن سے تھوڑا آگے ہی تھیں اور گولائی میں بنی ہوئی تھیں۔ان پر کالا اور سفید ماربل لگا ہوا تھا۔مناج درے کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔اوپر والی منزل میں تین کمرے تھے۔ایک کمرہ بالکل سیڑھیاں ختم ہوتے ہی دائیں طرف تھا۔سامنے ہی صوفے رکھے ہوئے تھے۔اور وہی اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔بڑے سے پردے رازداری کے لیے لگائے گئے تھے، ورنہ ڈرائنگ روم بھی اوپن تھا۔درے نے اندر آ کے پردے برابر کر دیئے اور مناج کو آرام دہ سا ہو کے بیٹھنے کو کہا۔

"مجھے دل سے خوشی ہوئی کہ تم یہاں آئی، مناج۔انسان کو جب اپنے اندر تبدیلی لانی ہوتی ہے، تو قدم اسے ہی بڑھانے پڑتے ہیں۔دوسرے صرف اسے ہدایات ہی فراہم کر سکتے ہیں مگر آخر میں عمل اس نے خود ہی کرنا ہوتا ہے۔میں بھی یہاں تمہیں صرف ہدایات دوں گی۔میں تمہاری مدد کروں گی، مگر آخر میں جو کرنا ہے تم نے ہی کرنا۔اپنے اندر انقلاب تمہیں خود ہی لے کر آنا ہوگا
مناج۔" درے مودب سے انداز میں بولی تھی۔وہ اپنے سائیکولاجسٹ موڈ میں آچکی تھی۔مناج بھی غور سے اسے سن رہی تھی۔وہ کافی گھبرائی ہوئی سی تھی۔

"میں تمہیں پہلے سے ہی بتاتی چلوں، کہ تمہارے لیے آنے والے چند منٹ کافی مشکل ثابت ہونے والے ہیں۔کیونکہ تم اپنی کنفیشن کرو گی۔کوئی بھی کنفیشن کرتے وقت بس شروع شروع کے لمحات

ہی مشکل ہوتے ہیں، اس کے بعد سب نارمل ہو جاتا ہے۔تو اب تم شروع کرو، جہاں سے بھی بتانا چاہتی ہو وہاں سے بتاؤ۔"مناج نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں خاموشی پھیل گئی۔درِ فشاں منتظر نگاہوں سے مناج کو دیکھ رہی تھی جو کہ بے چین سی لگ رہی تھی۔مناج کو احساس ہوا کہ کنفیشن کرنا واقعی بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا دل جیسے حلق میں آگیا تھا۔اسے درست الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔مناج کے ماتھے پہ پسینے کی بوند نمودار ہوئی۔

"میں۔۔۔میں ایک عجیب سی چیز میں مبتلا ہوں در فشاں۔مجھے نہیں پتا میں آپ کو کیسے بتاؤں۔" مناج نے درے سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

"ایک گہری سانس لو۔اور ایک جھٹکے میں سب کچھ بول دو۔نہ پرواہ کرو، کہ میں کیا سوچوں گی۔" چبھتی ہوئی خاموشی کچھ دیر مزید ڈرائنگ روم میں سوار رہی۔مناج نے اپنی آنکھیں زور دے کے بند کیں۔وہ بس بولنے کے لیے تیار تھی۔چہرے پہ اضطراب بڑھنے لگا تھا۔

"میں اپنے آپ کو تکلیف دیتی ہوں۔" وہ ایک جھٹکے میں اپنا گہرا راز درے کو بتانے لگی۔اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔وہ درے سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔"مجھے تکلیف کی طلب ہوتی ہے۔اور میں اپنے آپ کو تکلیف دیتی رہتی ہوں۔ کبھی سگریٹ کے جلتے کونے سے۔ کبھی ریزر سے خود کو کٹس لگا کے۔ کبھی اپنے اوپر تھپڑ برسا کے۔مجھے بس اپنے آپ کو تکلیف دینی ہوتی ہے۔میں اپنے آپ کو سزا دینا چاہتی ہوں۔میں بس اپنے آپ کو ہر وقت تکلیف میں ہی پانا چاہتی ہوں۔" مناج نے سب کچھ کہہ دیا۔اس کا تنفس پھول رہا تھا۔وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

مناج نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھانے کی ہمت کی۔اس کے دل میں خوف تھا کہ، آخر درے اس کے بارے میں کیا سوچ گی؟ درے اسے کتنا عجیب سمجھے گی؟ وہ یہی سوچ جا رہی تھی۔

جب اس نے نظر اٹھا کے درے کو دیکھا تو درفشاں ویسے ہی مسکرا رہی تھی جیسا اس کی کنفیشن سننے سے پہلے مسکرا رہی تھی۔ مناج کو کچھ بہت عجیب لگا۔کیا واقعی درے نے اس کے لیے کوئی منفی رائے قائم نہیں کی تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

"تمہیں یہی ڈر تھا ناں مناج کہ میں تمہیں جج کروں گی؟" درے نے مسکرا کے دوستانہ سے انداز میں کہا۔مناج ایک دفعہ پھر درفشاں کے سحر کے زیر اثر مسحور سی ہونے لگی تھی۔یہ لڑکی آخر کیا تھی؟ اس نے سوچا۔

"مگر میں نے تمہارے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی۔کیونکہ تم پہلی انسان نہیں جو میرے پاس یہ مسئلہ لے کر آئی ہے۔میں ایسے بہت سے کیسز دیکھ چکی ہوں۔" مناج کے دل سے ایک پھندا سا اترنے لگا۔

"کیا واقعی؟" مناج نے اچنبھے سے پوچھا۔درفشاں مدھم سا سر ہلا گئی۔

"ذہنی اذیت میں مبتلا انسان یہی تصور کرتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں۔وہ دنیا میں پہلے اور آخری فرد ہیں جو اس تکلیف کا شکار ہیں۔مگر ایسا نہیں ہوتا۔تم اکیلی نہیں ہو۔تمہارے ساتھ ایسے ہزاروں لوگ اور بھی ہیں جو بالکل اسی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔اس لیے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔تم کوئی عجوبہ نہیں ہو مناج۔" اور مناج کے دل کو قرار آنے لگا۔اس کی بے چینی دم توڑنے لگی۔اسے اب

احساس ہوا کہ درے کے پاس آنے کا فیصلہ بہترین تھا۔اسے لگا جیسے وہ کسی اجنبی سے نہیں کسی اپنے بہت ہی پرانے دوست سے بات کر رہی تھی۔کوئی بہت ہی پرانا، اپنا اپنا سا دوست۔کیا سارے سائیکولاجسٹ ایسے ہی ہوتے ہیں؟ مناج نے سوچا۔

"اور اس کی بہت وجوحات ہو سکتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ایڈونچر کے طور پر اپنے آپ کو تکلیف دیتا ہے۔اور پھر اسے اس تکلیف کی لت لگ جاتی ہے۔انسانی دماغ بہت کامپلیکس ہے، وہ پتا نہیں کن کن چیزوں میں سکون حاصل کرتا ہے۔ کبھی کبھی یہ صرف توجہ کے لیے کیا جاتا ہے۔جب کسی انسان کے دوست یا گھر والے اسے توجہ نہیں دیتے،تو وہ اپنے آپ کو تکلیف سے گزارتا ہے۔تاکہ وہ لوگوں کی توجہ حاصل کر سکے۔ کبھی کبھی یہ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ انسان نے ماضی میں اتنی تکلیفیں جھیلی ہوتی ہیں کہ وہ اس تکلیف کا عادی ہو جاتا ہے۔اور نہ چاہتے ہوئے بھی پنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے۔یا کبھی انسان اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔کسی بھی چیز کی۔چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اور بڑی سے بڑی پر بھی۔ڈپریشن میں یہ عمل بہت عام ہے۔اسے ہم سیلف ہارم بھی کہتے ہیں اور یہ بہت مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔سوسائیڈ بھی ایک طرح کا سیلف ہارم ہے۔" درے بہت ٹھہر ٹھہر کے مناج کو سب کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ مناج پوری طرح سے سمجھ جائے۔

مناج گہرے خیال میں کھوگئی تھی۔اسے واقعی لگا تھا کہ وہ دنیا کی واحد انسان ہوگی جو اپنے ساتھ یہ کر رہی ہو گی مگر یہاں تو بہت سے لوگ تھے جو یہ کرتے تھے۔اور سب کی اپنی اپنی سائکی تھی، اپنے اپنے عزائم تھے۔

”ایسا کرو۔اب تم اپنی کہانی بتانا شروع کرو۔جہاں سے بھی چاہتی ہو وہاں سے بتاؤ۔بغیر کسی گھبراہٹ کے۔میرا کام ہے سننا، اس لیے میری فکر نہیں کرنا، میں بے جھجک ہو کے تمہیں سنوں گی۔“ درِ فشاں اپنائیت سے لبریز انداز میں بولی تھی۔مناج بھی اب مکمل آرام دہ ہو گئی تھی۔اس میں جتنی بھی جھجک تھی وہ اب تک دم توڑ چکی تھی۔

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مناج نے اپنی کہانی بتانا شروع کی۔

”در فشاں، مجھے جب سے ہوش آیا تب سے میں نے اپنی امی اور اپنے ابو کو جھگڑتے دیکھا۔مجھے نہیں سمجھ آتا تھا کہ وہ دونوں کیوں جھگڑتے تھے۔میری امی اپنی جگہ مجھے کتنی اچھی لگتی تھیں۔اور ابو،وہ تو میری جان تھے۔“ مناج کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھری۔”اور پھر جب بڑی ہوئی تو پتا چلا۔“ مناج کی مسکراہٹ سمٹی۔اس نے تھوک نگلا۔”کہ ابو کو جوئے اور شراب کی لت تھی۔وہ گھر کا سارا پیسہ جوئے میں وار دیا کرتے تھے۔اور روز شراب پی پی کر آتے تھے۔وہ بالکل کمزور پڑتے گئے۔ شراب انہیں چوس چوس کے کھاتی گئی اور وہ بے بس اپنی لت کے ہاتھوں، شراب کو اپنے آپ کو کھانے دیتے گئے۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سات سالہ مناج اپنے کچے سے گھر کے صحن میں ناراض سی کھڑی تھی۔اس کے سامنے اس کے پیارے ابو طارق تھے۔طارق کے چہرے پہ احساس ندامت صاف نمایاں تھا۔ان کے پاس سے عجیب سی بو آتی تھی۔مناج ان کے سامنے سے اپنا منہ موڑ کے کھڑی تھی۔

"ابو کیا آپ کو اپنی بیٹی سے پیار ہے؟" چھوٹی مناج اپنے عزیز والد سے شدید خائف تھی۔طارق جھکے ہوئے تھے اور مناج سے بس تھوڑے سے فاصلے پر ہی تھے۔اتنے قریب سے مناج کو وہ عجیب سی بو زیادہ محسوس ہوتی تھی مگر وہ اس بو کو نظر انداز کر گئی۔

"میری ملکہ کو لگا بھی کیسے کہ اس کے ابو اس سے پیار نہیں کرتے؟" طارق شوخ سے انداز میں بولے تھے۔انداز میں مصنوعی خفگی تھی۔

"ابو پھر آپ شراب کیوں نہیں چھوڑتے۔امی سارا دن روتے رہتی ہیں۔مجھے بہت برا لگتا ہے۔آپ شراب چھوڑ دیں تو ہماری زندگی ٹھیک ہو جائے گی۔" چھوٹی مناج سخت سے انداز میں اپنے باپ کو کہنے لگی۔طارق کے چہرے پہ رنج بھرا تاثر ابھرا۔

"تو اگر میں وعدہ کروں کہ میں شراب چھوڑ دوں گا تو میری مناج مجھ سے ناراض نہیں رہے گی ناں؟" طارق نے اپنی آنکھ کے کونے سے نکلتے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہم سب خوش ہو جائیں گے۔" اس خیال نے ہی کہ اس کے پیارے ابو ٹھیک ہو جائیں گے، صرف اس خیال نے ہی اس کا موڈ پھر سے ٹھیک کر دیا تھا۔

وہ اپنے ابو سے بے پناہ پیار کرتی تھی۔بے پناہ محبت۔وہ بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے تھے، مگر یہ محبت ان کی اس لت کو توڑنے کے لیے کافی نہ تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”مگر میرے ابو ٹھیک نہ ہوسکے۔میں بھی کب تک ان سے ناراض رہتی؟ میں ان سے اتنا پیار کرتی تھی۔اب تک کرتی ہوں۔میں ہر دفعہ انہیں معاف کردیا کرتی تھی۔“

حال کی مناج سادگی سے سب بولے جارہی تھی۔اس کی آنکھیں خشک تھی۔چہرے پہ نیم سی تکلیف واضح تھی، مگر اندر۔۔۔اندر سے وہ تڑپ رہی تھی۔اندر اس کے ایک طوفان برپا تھا۔وہ اس طوفان کو اپنے چہرے پہ جھلکنے سے کس طرح سے روک رہی تھی، یہ صرف وہی جانتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نو سالہ مناج اس کچے سے گھر کے کچے سے کمرے میں اپنے باپ کے ہاتھ میں سر رکھے لیٹی تھی۔

طارق کا چہرہ

اب تک بالکل سوکھ چکا تھا۔آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے اور چہرے کی کھال لٹکنے لگی تھی۔

”ابو میری ایک دست ہے فاطمہ وہ کہتی ہے کہ میرا نام لڑکوں کا ہوتا ہے۔آپ میرا نام کیوں نہیں بدل دیتے۔“ مناج نے طارق کو مڑ کے دیکھا اور کہا۔طارق کا جسم، تکلیف کے مارے بلک رہا تھا مگر وہ اپنی اس تکلیف کو چہرے پہ آنے نہیں دے رہے تھے۔وہ اپنی تکلیف چھپاتے ہوئے مناج کے معصوم سے انداز پہ زور سے ہنس دیئے۔وہ ہنستے تھے تب بھی ان کا جسم کراہ جاری کرتا تھا۔

”وہ اس لیے کہتی ہے کیونکہ اسے تمہارے نام کا مطلب نہیں پتا مناج۔“طارق کی آواز کافی کمزور ہو گئی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت دشواری سے یہ جملے ادا کر رہے تھے۔

”اچھا۔اور میرے نام کا کیا مطلب ہے؟“ مناج کا انداز تعجب آمیز تھا۔

"مناج کا مطلب ہوتا ہے ایک با وقار ملکہ، ایک با وقار ماہرانی۔ ایسی ملکہ جس کا نفس بہت ہی مضبوط ہوتا ہے، اور جو بہت دلیر اور بہت بہادر ہوتی ہے۔ میری بیٹی بھی ایک مضبوط نفس کی با وقار ماہرانی ہے۔ سب سے معتبر، با وقار ماہرانی۔" اس ہی وقت مناج کی والدہ فرزانہ اندر چلے آئیں۔ ان کے چہرے پر تلخی پھیلی ہوئی تھی۔

"میری بیٹی تو واقعی ایک ملکہ ہے، مگر وہ تم جیسے باپ کی حقدار نہیں تھی۔" مناج کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ تنگ آ چکی تھی ان جھگڑوں سے۔ "نہ جانے کیا گناہ کیا ہے میں نے جس کی سزا میری بیٹی کو مل رہی ہے۔" فرزانہ غسل خانے کا سفر کرتے کرتے کڑوے سے انداز میں بولے جا رہی تھیں۔ انہوں نے نظر اٹھا کے طارق کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کے انداز میں طارق کے لیے بے پناہ نفرت جھلکتی تھی۔ طارق اپنی جگہ سے اٹھ کر فرزانہ کے پاس گئے۔ وہ فرزانہ کے راستے پہ کھڑے تھے اس لیے فرزانہ رک گئیں۔ وہ طارق کے چہرے کو دیکھ بھی نہیں رہی تھیں۔ طارق کا یوں راستہ روکنا انہیں شدید برا لگا تھا۔

"میں کوشش کر رہا ہوں فرزانہ۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔" طارق پھیکا سا مسکرائے۔ فرزانہ کا کندھا شل ہو گیا۔ انہوں نے اب کی بار نظر اٹھا کے طارق کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں طیش تھیں۔ طیش کے عالم میں وہ ایک استہزائیہ ہنسی ہنسیں۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔" وہ اونچی آواز میں، جذباتی انداز میں بولی تھیں۔ "تم کبھی ٹھیک نہیں ہو گے اور ہم تمہارے ساتھ اپنی زندگی ضائع کر دیں گے۔ جن لڑکیوں کے بھائی بے غیرت ہوتے ہیں، وہ تم جیسے نشئیوں کے ہاتھوں پستی ہیں طارق۔ مجھے اپنے بھائیوں سے ذرا بھی امید ہوتی تو میں کب کا اپنی

بیٹی کو تمہارے پاس سے لے گئی ہوتی۔" فرزانہ کی آواز میں تھکان تھی، شکایت بھی تھی۔وہ یہ سب جھیل جھیل کے تھک چکی تھیں۔ان کی برداشت اب دم توڑنے لگی تھی۔

"اب تم ایسا بھی مت کہو فرزانہ۔" طارق فرزانہ کے کہے گئے جملوں کی وجہ سے بہت تکلیف میں مبتلا تھے۔ان کے دل میں تکلیف ہونے لگی تھی۔

"تم۔۔۔تم" فرزانہ کی سانسیں غصے کے مارے پھولنے لگیں۔"تم مر کیوں نہیں جاتے طارق۔" فرزانہ کی آنکھ سے ایک آنسوں نکلا۔ان کی آواز کپکپارہی تھی۔ان کا وجود کپکپارہا تھا۔۔۔

طارق کے سینے میں چبھن ہونے لگی۔ان کے چہرے پہ شدت بھری تکلیف نمایاں ہوئی۔وہ سینے پہ ہاتھ رکھتے دائیں طرف لڑکھڑائے۔وہ تکلیف سے کانپتے ہوئے زمین پر گر گئے۔ان کی سانسیں بے ربط اور بے ساختہ ہوگئی تھیں۔وہ اپنا ہوش کھونے لگے تھے۔مناج تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے باپ کی طرف بڑھی۔فرزانہ حواس باختہ سے عالم میں دو قدم پیچھے کھسکی۔وہ اپنے گالوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے، طارق کے تڑپتے وجود کو دیکھ رہی تھیں۔یہ سب ہوا ہی اتنا اچانک تھا۔۔۔

"ابو، آنکھیں کھولیں۔" مناج دھاڑے مار کے چلائی تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اور جب ہم ابو کو ہسپتال لے کر گئے تو پتا چلا کہ بہت دیر ہو گئی تھی۔ شراب نے ان کا سب کچھ ختم کر دیا تھا۔ ان کے گردے ناکارہ ہو چکے تھے۔ ان کا جگر کام کرنا بند کر چکا تھا۔ ڈاکٹر نے ہمیں جواب دے دیا۔ میرا رو رو کر برا حال تھا مگر امی، انہوں نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔ لیکن اس میں

ان کا کیا قصور؟ ایک عورت جس کی زندگی بھر نا قدری کی گئی ہو، جس کو زندگی بھر وہ نہ دیا ہو جس کی وہ حقدار تھی تو وہ آخر ایسے شخص کے لیے کیسے آنسو بہائے۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"ابو چلے گئے"!

مشین پر آتی لکیر سیدھی ہو چکی تھی۔ باریک سی پتلی آواز مشین سے مسلسل رواں تھی۔ نرس نے طارق کے چہرے کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ مناج وہیں بلکتے ہوئے روتے گئی۔ وہ سسکیاں لیتے روتے ہوئے باہر گئی۔ فرزانہ دیوار سے سر لگائے کسی گہرے خیال میں کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں خشک تھیں۔

"ابو چلے گئے امی!" مناج بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ یہ حقیقت تسلیم کرنا اس کے لیے زہر پینے کے مترادف تھا۔

"ابو چلے گئے۔" مناج نے فرزانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ فرزانہ کسی برف کے مجسمے کی طرح، بس کھڑی رہیں۔ مناج ایک دم سے ڈھیلی ہو کر زمین پر گھٹنوں کے بل گر گئی۔ اور ٹھیک اسی طرح سے روتے گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"پتا ہے درفشاں، امی کو اگر اندازہ ہوتا کہ ابو کی موت کے بعد ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا تو شاید وہ کبھی بھی وہ دعا نہ کرتی۔ ابو کی موت کے بعد ہی تو میری اور امی کی زندگی تباہ ہوگئی۔ کیونکہ ہمیں۔" مناج ٹھہری۔ اس کی آنکھوں میں خوف پھیلنے لگا تھا جیسے وہ اپنے ماضی کا کوئی خوفناک پہلو یاد کر رہی ہو۔

"ہمیں پرویز اور اس کی بہن، لویزا مل گئے تھے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دس سالہ مناج اپنی والدہ کے ساتھ اپنے نانا کے گھر رہ رہی تھی۔وہ گھر کے لاؤنج میں، گول میز کے کونے پہ سر رکھ کے چوکڑی مار کے بیٹھی ہوئی تھی اور وہاں پہ ہونے والی ہر بات سن رہی تھی۔دس سالہ مناج کا چہرہ بے تاثر تھا، بالکل خالی، وہ اپنے آپ کو بھی اندر سے خالی محسوس کر رہی تھی۔ فرزانہ اپنی ماں کے عقب میں صوفے پہ زندہ لاش کی طرح براجمان تھیں۔ان کے والد سربراہی صوفے پہ بیٹھے تھے اور ان کے بڑے بھائی کھڑے ہوئے اونچی آواز میں بات کرتے نظر آرہے تھے۔

"ابا، کب تک اسے گھر بیٹھاؤ گے۔جوان بیوہ ہے۔لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔" فرزانہ کا بھائی کہہ رہا تھا۔

"سچ بولو ناں، تمہاری گھر والی سے میری بچی اور نواسی برداشت نہیں ہو رہی۔" فرزانہ کی والدہ کو جیسے اپنے بیٹے کی یہ تجویز زہر لگی تھی۔

"اماں بس ہی کرو تم۔" فرزانہ کا بھائی بد لحاظ سے انداز میں بولا۔"اتنا اچھا رشتہ ملا ہے مجھے، فرزانہ کے لیے۔اب دیر کیوں کریں۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔۔" فرزانہ کی والدہ نے اپنے بیٹے کی طرف انگلی اٹھاتے کہا مگر ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

”تم چپ کرو!“ فرزانہ کے والد دھاڑے تھے۔”اور تم تفصیل بتاؤ۔“ اور یوں ہی فرزانہ کی والدہ کی آواز کو ایک جھٹکے میں دبا دیا گیا۔

جن گھروں میں عورتوں کی آواز، گھر کے مرد یوں ہی دباتے ہیں ان گھروں کی عورتیں اسی طرح سے زمانے کے ہاتھوں پستی رہتی ہیں۔

”اس کا نام پرویز ہے۔بہت امیر اور بہت طاقتور انسان ہے۔اسے بس کوئی جوان سی عورت سے شادی کرنی ہے۔عمر اس کی تھوری بڑی ہے مگر وہ فرزانہ کی بچی کو رکھنے کے لیے تیار ہے۔اس کی بہن کے اس شہر میں بڑے بڑے ہسپتال ہیں۔اب ایسے رشتے کو میں کیسے منع کر سکتا ہوں؟“ فرزانہ کے بھائی بولے تھے۔

”ٹھیک ہے، تم بلوا لو انہیں۔ہم جلد ہی فرزانہ کا نکاح کروا دیں گے۔“

فرزانہ زندہ لاش کی طرح سب سنتے گئیں۔وہ کچھ نہ بولیں۔۔۔بولتی بھی کیوں؟ وہ جانتی تھیں ان کی آواز بھی ان کی والدہ کی آواز کی طرح دبا دی جانی تھی۔

یہ ہوتا ہے جب ہم اپنی عورتوں پہ بے جا ظلم کرتے ہیں۔۔۔وہ ڈھے جاتی ہیں۔۔۔وہ جیتے جی مر جاتی ہیں۔۔۔وہ دنیا کے سامنے رسوا ہوجاتی ہیں۔۔۔فرزانہ، ان کی والدہ اور مناج، تینوں کا کچھ یہی حال تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اور پھر امی اور پرویز کی شادی ہو گئی۔ہم دونوں اس بڑے سے گھر میں چلے گئے۔وہ گھر تھا تو بہت بڑا۔مگر اس گھر میں دہشت سوار تھی۔اس گھر میں میرے ساتھ وہ سب ہوا جس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" مناج کچھ دیر کے لیے ٹھہری۔

درے بھی پوری توجہ کے ساتھ اسے سن رہی تھی۔

"کیا میں باقی کہانی کسی اور وقت سنا دوں؟" مناج کا انداز التجائیہ تھا۔وہ بالکل تھک چکی تھی۔اس کی توانائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔چہرہ بھی بالکل بجھ گیا تھا، آنکھیں غمگین تھیں لیکن وہ روئی نہیں تھی۔

دوسری طرف درے فشاں کی روح کانپ اٹھی تھی۔بہت کم ہوتا تھا جب کسی کی کہانی درے کو اتنا متاثر کرتی تھی۔مناج کے ماضی میں کیا تاریکی کے علاوہ بھی کچھ تھا بھلا؟ درے کو عجب ہونے لگا۔

"بالکل۔ہم یہاں پر روک سکتے ہیں۔" درے نے اپنے انداز کو نارمل رکھا اور ہلکا سا مسکرائی۔مناج کا دل

ہلکا پھلکا سا ہونے لگا تھا۔اپنے اندر بسے غبار کو نکال کر وہ قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"دیکھو مناج۔تمہارے ابو نے کہا تھا کہ تم ایک ماہرانی ہو۔تم واقعی ایک ماہرانی ہو۔ایسی ماہرانی جو کہ انمول ہے۔جو کہ ہیرے سے بھی زیادہ خوبصورت ہے، ہیرے سے بھی زیادہ چمکتی دمتی ہے۔" درے نرمی سے کہتے گئی جب کہ مناج تیزی سے سر نفی میں ہلاتے گئی۔

وہ اور باوقار ماہرانی؟ کبھی نہیں۔اس نے سوچا۔

”مجھے نہیں لگتا درے، میرا کوئی نفس نہیں ہے۔میری کوئی عزت نہیں ہے۔میں اپنے آپ کو ہر وقت تکلیف میں رکھتی ہوں۔کیا ایسی ہوتی ہیں با وقار ملکہ؟ مجھے نہیں لگتا۔“ انداز میں چبھن لیے وہ بولی تھی۔صوفے پہ کھسکتے ہوئے درے مناج کے قریب آئی۔اس نے مناج کے کندھے پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

”مناج، ہمارا ماضی ہماری پہچان ہوتا ہے۔تمہارے ماضی میں جو ہوا وہ اس لیے نہیں ہوا تھا کہ تم زندگی سے ہار کے بیٹھ جاؤ۔بلکہ وہ اس لیے ہوا تھا کہ تم اس سے سیکھ حاصل کرو۔میں نے تم سے زیادہ مضبوط اور بہادر لڑکی واقعی آج سے پہلے نہیں دیکھی۔پوچھو کیسے؟“مناج الجھی۔

”کیسے؟“

”تمہاری کہانی نے میری روح کو بھی جھنجوڑ کے رکھ دیا مناج۔اور اگر کوئی اور یہ سب بتاتا تو اب تک رو رو کے ہلکان ہو چکا ہوتا۔مگر تم نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔تم واقعی ایک مضبوط اور بہادر لڑکی ہو جس کا وقار کہیں کھو گیا ہے۔لیکن، اگر وہ چاہے تو وہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو تلاش کر سکتی ہے۔مجھے تمہارے اوپر یقین ہے مناج۔“ درے نے مناج کے اندر آگ بھڑکانے کی کوشش کی۔

”مگر کیسے؟“ مناج نے پوچھا تو درفشاں مسکرادی۔یقیناً آگ بھڑک چکی تھی۔

”کیا تم واقعی کوشش کرو گی؟“ درے نے کہا تو مناج نے سر اثبات میں ہلایا۔

”تو سنو۔تمہیں تمہارا وقار صرف اس صورت ملے گا جب تم اپنی نظر میں خود کو معتبر سمجھو۔اور پتا ہے اپنی نظر میں معتبر کیسے بنا جاتا ہے؟ اپنا خیال رکھ کے۔اپنے لیے وہ کر کے جو ہماری ذات کے

لیے بہتر ہوتا ہے۔اب تم نے کچھ دنوں تک یہ کوشش کرنی ہے کہ تم وہ کرو جو تمہارے لیے بہترین ہو۔بہترین ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمہیں تکلیف نہیں دے گا، یا ہمیشہ خوش رکھے گا۔خوش تو ہمیں ڈرگز بھی رکھتے ہیں مگر کیا وہ ہمارے لیے بہترین ہوتے ہیں؟ نہیں۔ تم نے بس وہ کرنا ہے جس سے تمہارے وجود کو نقصان نہ پہنچے۔تمہارا وجود مطمئن رہے۔خوشی تو آنے جانے والی چیز ہے مناج۔ ابھی خوشی ہوگی اور اگلے لمحے نہیں۔تو تم بتاؤ، تم کوشش کروگی ناں؟“

اور اس دن مناج کے دل میں امید کی کرنوں نے جنم لیا تھا۔آج زندگی میں پہلی بار اسے بھی یقین آگیا تھا کہ وہ بھی بہتر ہو سکتی ہے۔وہ بھی جی سکتی ہے۔وہ بھی ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہے۔

”اب ایک دفعہ مسکراؤ؟ شاباش۔“ اس غمگین ملاقات کو درے نے یوں ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔مناج بھی پھیکا

سا مسکرا دی۔درے بھی بھرپور مسکرا رہی تھی۔

”آج سے تمہارا سفر شروع ہوتا ہے مناج۔اس زندگی کو ضائع نہیں ہونے دینا۔اپنے ماضی کی سیکھ کو تلاش کرنا۔

او ر صرف وہی کرنا جو تمہیں تمہاری نظروں میں معتبر بنائے۔اور جب تمہارا دل چاہے تم مجھے اپنی باقی کی کہانی سنا سکتی ہو۔“ درے آسودہ انداز میں بولتی گئی۔

مناج بھی اٹھ گئی۔ درے اس کے ساتھ ہی چلنے لگی۔ نیچے دونوں آئے تو احمد ایل شیپڈ ٹیبل کے پاس ہی بیٹھا موبائل استعمال کر رہا تھا۔ مناج کا چہرہ بالکل بجھا ہوا تھا۔ احمد نے سرسری سی نگاہ دونوں پہ ڈالی اور پھر سے موبائل پہ لگ گیا۔ کچھ دیر میں درے واپس آئی۔

"اچھی بھلی آئی تھی وہ۔" درے کے آتے ہی احمد بولا۔"اور تم نے تو اس کا پورا موڈ ہی بگاڑ دیا۔" احمد مصروف سے انداز میں بولا۔ درے اداس سا مسکرا دی۔

"مناج ہر جذبے سے عاری تھی احمد۔ اور اپنے جذبات سے عاری ہونا انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں نہ زیادہ جذباتی انسان کامیاب ہوتے ہیں، نہ وہ انسان جو جذبات سے محروم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے جذبات کو درست اوقات میں استعمال کرنا آنا چاہئے۔ یہ بھی ایک آرٹ ہوتا ہے احمد۔" درفشاں کے اندر کی بڑی بہن ایکٹیویٹ ہو چکی تھی۔ احمد کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

"چچ چچ!!، تمہیں یہ سب جاننے کے لیے سالوں سائیکولاجی پڑھنے میں ضائع کرنے پڑے، اور مجھے دیکھو، میں یہ سب پہلے سے ہی جانتا ہوں آپا۔" وہ مزے لینے والے انداز میں کہتے ہوئے مڑا اور اوپر بھاگ گیا۔

درِّ فشاں وہیں دم سادھے کھڑی رہی۔ آج کیا جانے والا حملہ اس کے لیے بہت ذاتی تھا۔ اس کے مکروہ بھائی نے اس کی ڈگری کو نا اہل قرار دیا تھا۔ کیا سارے بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں؟ درے نے سوچا۔ نا محسوس انداز میں پیر پٹختے ہوئے وہ اپنے کمرے میں گئی اور بند ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح مناج کی نیند اپنے موبائل کی رنگ سے ٹوٹی۔غیر حاضر طور پہ اس نے اپنی سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔اس نے موبائل پہ نام پڑھنے کی بھی زحمت نہ کی اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"کون؟" مناج کی آواز غنودگیت سے لبریز تھی۔

"میں درفشاں۔تیار ہو جاؤ۔اور مجھے اپنی لوکیشن بھیجو میں تمہیں پک کرنے آرہی ہوں۔" درفشاں ایسے بولی جیسے کوئی بڑی بات نہ تھی۔اس کا انداز ہر قسم کی تکلفی سے پاک تھا۔ایسا کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ مناج سے صرف دو مرتبہ ہی ملی تھی۔

"نہیں، اتنی صبح؟ میرا مطلب کیا ضرورت تھی، اور کہاں جانا ہے؟" مناج ہڑبڑاتے ہوئے بولی تھی۔وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگاتے بیٹھی۔اس کا دماغ اس وقت ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔

"اب یہ تو سرپرائز ہے۔اب جلدی اپنی لوکیشن بھیجو۔میں بس آرہی ہوں۔"درفشاں نے کال کاٹ دی۔مناج کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

اس نے درے کو لوکیشن سینڈ کی اور خود تیار ہونے چلے گئی۔اس نے سفید پھولی ہوئی آستینوں والا کُرتا پہنا تھا۔

چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔درے کے آتے ہی اس نے اپنی پشمینہ شال کندھے پہ گرائی اور خالہ کو اطلاع دے کے نکل گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" مناج نے کلٹس میں بیٹھ کر پوچھا۔

"ایک جگہ ہوتی تو بتاتی۔سب سے پہلے ہم شاپنگ پہ جائیں گے۔اب ایک باوقار ماہرانی بالکل ٹپ ٹاپ اور فریش دکھنی چاہیے۔ہے نا؟" درے کی آنکھوں میں چمک تھی۔وہ پرجوش سے انداز میں بولی تھی۔مناج درفشاں کو بے یقینی کے عالم میں دیکھنے لگی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک انسان اس سے اتنا مخلص بھی ہوسکتا تھا۔

"مجھ سے آپ کو کچھ نہیں ملنے والا پھر آپ میری اتنی مدد کیوں کر رہی ہیں؟" مناج کے انداز میں گہری الجھن عیاں تھی۔یہ وہ نہیں کہہ رہی تھی، بلکہ اس کے اندر بسی چھوٹی بچی کہہ رہی تھی جس کا دنیا سے اعتماد اٹھ چکا تھا، جسے ہر قدم پہ زخمی کیا گیا تھا۔

درے کے چہرے پہ آسودہ مسکراہٹ تھی۔وہ مطمئن نظر آرہی تھی۔

"میں؟ میں تو بس وسیلہ ہوں۔تمہاری مدد تو وہ کر رہا ہے جس کے ہاتھ میں ہماری قدر ہے۔تمہاری مدد اللہ کر رہا ہے۔" درے کی آنکھوں میں عاجزی جھلکتی تھی۔درے نے اپنا رخ مناج کی طرف سے موڑا اور کار اسٹارٹ کی۔

مناج کا دل ڈوب سا رہا تھا۔اس کا دماغ پراسس ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ یہ سب اس کے لیے بہت اچانک تھا۔

درے اپنی کلٹس سینٹارس مال لے کر آئی۔اس نے اپنی گاڑی سینٹارس مال کی پارکنگ میں پارک کی۔ مناج کے انداز میں جھجک کافی نمایاں تھی۔وہ بہت متذبذب سی چال چل رہی تھی۔

وہ دونوں اب ہشاش بشاش اور خوبصورت سینٹارس مال میں داخل ہوئے۔مناج کی چال بہت عجیب سی تھی۔وہ کبھی اتنے رش والے مقام پر، یوں چمکتے دمکتے لوگوں کے درمیان نہیں آئی تھی۔اس کا دل سمندر کے پانی کی طرح ٹھاٹے مار مار کے اس کے حلق میں آرہا تھا۔درے بھی جانتی تھی کہ مناج کے لیے یہ سب مشکل ہوگا، مگر وہ چاہتی تھی کہ مناج یہاں آئے۔وہ چاہتی تھی کہ مناج زندگی کے مختلف رنگوں کو دیکھے۔وہ گھر سے باہر قدم بڑھائے۔

”درے اس سب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ مناج اضطراب کے عالم میں درے کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

”آج تم ایک دوست کو دوسری دوست کے اوپر خرچ کرنے سے نہیں روک سکتی مناج۔“ درے مصنوعی سے

سخت انداز میں بولی اور پھر ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اسے ایک اسٹور میں لے کر آئی۔

وہ ایک کپڑوں کا اسٹور تھا۔الگ الگ اسٹائلز اور فیشن کے کپڑے وہاں پہ موجود تھی۔مناج اوپر سے نیچے اس اسٹور کو بغور دیکھے گئی۔درفشاں مناج کو ایک ایک کر کے کپڑے دکھانے لگی۔مناج کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا، وہ یوں نئے کپڑوں کی شاپنگ نہیں کرتی تھی۔اس نے سالوں سے کوئی نئے کپڑے لیے ہی نہیں تھے۔

درے نے بہرحال مناج کو اپنی پسند کے تین جوڑے دلوا دیئے۔تینوں ہی کافی خوبصورت تھے۔

مناج کو اتنے رش میں، نئے نویلے کپڑوں کے درمیان گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔وہ بہت ہی چوکنا سا ہو کے چل رہی تھی اور آنکھیں بار بار اِدھر ادھر گھمائے جا رہی تھی۔

"اب یہ پھولی ہوئی آستینیں پرانی ہو گئی ہیں۔تم کچھ نیا ٹرائی کرو۔" کاؤنٹر پہ پے منٹ کرتے وقت درے مناج کے کان میں بولی۔

مناج نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ بس مضطرب سے انداز میں آس پاس دیکھتے گئی۔آج سے پہلے کبھی بھی کسی نے اسے اتنی توجہ نہیں دی تھی جتنی درفشاں نے دی۔یہ سب ہضم کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔

"درے یہ بہت زیادہ ہورہا ہے، پلیز چلتے ہیں۔" وہ ضد کرنے والے انداز میں درے سے بولی۔درے نے ایک سرد نگاہ مناج پہ ڈالی۔

"بالکل پر سکون ہو جاؤ۔" وہ تائید کرنے لگی۔"آج تم ایک دوست کو دوسری دوست پر خرچ کرنے سے نہیں روک سکتی۔" وہ چہکتے ہوئے اپنی پرانی بات دہرانے لگی۔

مناج خاموش ہوئی تو درے اس کا ہاتھ پکڑے اسے مال میں گھمانے لگی۔اب دونوں اسکن کیئر اسٹور میں آئے۔مناج اب بھی کچھ حواس باختہ سی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کے اندر بسی جھجک دم توڑنے لگی تھی۔

اسے وہ وقت شدت سے یاد آرہا تھا جب وہ اپنے کمرے میں بند رہا کرتی تھی۔بس یوں ہی سارا سارا دن کمرے میں بند رہ کے گزارا کرتی تھی۔سارا سارا دن بستر سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش بھرتے

رہتے تھی۔اب اچانک سب کچھ بدل رہا تھا۔اسے احساس دلایا جا رہا تھا کہ وہ بھی پیار کے قابل ہے۔ مناج کے لیے یہ سب بہت غیر معمولی تھا۔

"اسکن کیئر شاپنگ میری فیورٹ چیز ہے۔" اسکن کیئر اسٹور میں آتے ہوئے درے نے مناج کے کان میں کہا۔درے کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔وہ جیسے اپنی آنکھوں کے سامنے جنت دیکھ رہی تھی۔

مناج کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔وہ اس طرح کے اسٹور میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔

"تمہارے لیے یہ ضروری ہے۔ہمارا جسم اللہ کی امانت ہے،مناج۔ہمیں اپنے جسم کا، اپنے وجود کا بھرپور خیال رکھنا چاہئے۔اور میں تمہیں اچھی سی اسکن کیئر دلواؤں گی تاکہ تم بھی اپنے جسم کا خیال رکھو۔"

وہ مناج کا ہاتھ پکڑے اسے پتا نہیں کیا کچھ دکھانے لگی۔سب چیزیں مناج کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔درے نے مناج کے لیے چیزیں لیں اور ساتھ میں اپنے لیے بھی کافی ساری چیزیں لے لی تھی۔اسے شاپنگ کرنا بہت پسند تھا۔یہ کہا جائے کہ سائیکولاجی پریکٹس کرنے کے بعد شاپنگ کرنا درے کا جنون تھا، تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔شاپنگ کرتے ہوئے تیس سالہ درفشاں اٹھارہ سال کی بن جاتی تھی۔نئی نئی، پیاری پیاری چیزیں دیکھ کے درفشاں کے اندر کی چھوٹی بچی جاگ جاتی تھی۔وہ اسکن کیئر کی شاپنگ کرتے ہوئے بہت ہی پرجوش سی نظر آرہی تھی۔

باسکٹ میں سامان لیے وہ دونوں کاؤنٹر پہ آئے۔مناج کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"یہ کچھ زیادہ ہی ہو رہا درے۔پلیز، چھوڑ دو اسے۔" مناج نے درے کا بازو دبایا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو۔ بھولو مت میرا ایک امیر بھائی بھی ہے جس نے حال ہی میں ایک کمپنی کھولی ہے۔ ہم اس کا کارڈ استعمال کریں گے۔" درے کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ مناج کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ وہ سست روی سے اپنی گردن ناں میں ہلانے لگی جیسے درے سے کہنا چاہ رہی ہو کہ "جرات بھی نہیں کرنا"۔ لیکن درے نے کونسا باز آجانا تھا۔

"درے!" مناج نے درے کو روکنا چاہا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ درے آنکھوں میں انتقام کی جست لیے احمد کا کارڈ سوائپ کر چکی تھی۔

"تم بے فکر رہو۔" درے نے مسکراہٹ دباتے مناج سے کہا۔ "بڑا آیا میری ڈگری کو نا اہل قرار دینے والا۔ اب آئے گا مزہ۔" وہ خفگی سے زیر لب بڑبڑائی۔

شاپنگ سے فارغ ہو کے دونوں پھر سے گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ حالانکہ مناج کو شروع شروع میں بہت مشکل ہو رہی تھی لیکن، آخر میں وہ بھی کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ تازہ دم سی لگتی تھی۔ دماغ بھی ہلکا پھلکا سا ہونے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنا خوشگوار محسوس نہیں کیا تھا۔ خوشگواریت کے ساتھ ساتھ اب بھی دل میں کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ دل میں نا دیدہ لہریں ابھر ابھر کے تھم رہی تھیں۔

درے اب اسے اسکن کیئر پروڈکٹس کے بارے میں بتانے لگی۔ کہ اسے کیا کیا کرنا ہے اور کب کب۔ مناج بھی غور سے سب سنتے گئی۔

"مگر یہ تو بہت زیادہ لمبا ہے؟" مناج نے پوچھا۔

"لمبا ہے تو کیا ہوا، تم وقت نکال کے یہ سب ضرور کرو گی۔اپنا خیال رکھا کرو، کیونکہ تم اس قابل ہو کہ تمہارا خیال رکھا جائے۔" چہرے پہ متانت بھری مسکراہٹ لیے وہ بولی تھی۔مناج بھی جواباً مسکرا دی۔

"اب گھر چلیں؟" مناج بولی۔وہ بس اب گھر جانا چاہتی تھی۔

"ابھی صبر کرو۔ہم پہلے سیلون جائیں گے۔" مناج پہلے کی طرح ہی مزاحمت کرنے لگی مگر درے نے اس کی تمام مزاحمت کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا اور اسے اپنے پسندیدہ سیلون لے آئی۔

سیلون درے کی ایک دوست کا ہی تھا اور کافی اچھا بنا ہوا تھا۔اس وقت سیلون میں رش بالکل نہ تھا۔در فشاں مناج کا ہاتھ تھامے ریسیپشن تک آئی۔

"یہ میری دوست ہیں۔اسے بہترین ہائیڈریٹنگ فیشل کروانا ہے۔" درے نے کہا تو مناج نے اس کا بازہ دبایا اور کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

"کیا ضرورت ہے اس کی درے؟ پلیز یہ مت کرو۔"مناج بہت زیادہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"اور میک اوور بھی!" مناج کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے در فشاں بولی۔مناج کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

"بلکہ میں بھی اسی کے ساتھ کرواؤں گی۔" درے نے پرس سے نوٹ نکال کے ریسیپشنسٹ کو تھما دیئے۔

دونوں نے پھر اپنا بہترین فیشل کروایا۔ مناج کی جلد عموماً کھردری سی رہتی تھی مگر اس فیشل کے بعد اس کی جلد کافی نرم سی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ نکھار سا آگیا تھا۔

"لو جی! تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ تمہیں تو ویسے کسی میک اوور کی ضرورت نہیں۔" درے نے مناج کا چہرہ دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ وہ واقعی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ تازہ دم سی۔ اور یہ اس لیے تھا کیونکہ مناج پہلی مرتبہ اپنے آپ میں پر اعتماد محسوس کر رہی تھی۔ خود اعتمادی ہی انسان کی شخصیت کو پر کشش بناتی ہے۔

"لیکن خیر میک اوور کرواتے ہیں اور پھر یہ والا جوڑا تم پہنو گی اور پھر ہم گھر چلیں گے۔" درے نے ایک خوبصورت سے کالے جوڑے کی طرف اشارہ کرتے کہا۔

مناج نے سیلون میں بھرپور میک اوور کروایا۔ اس میک اوور نے اس کے نقوش مزید نکھار دیے تھے۔ وہ کافی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ مناج نے پھر وہ حسین و جمیل کالا جوڑا پہنا تو جیسے اس کی شخصیت میں چار چاند ہی لگ گئے۔ وہ حسین سی لگ رہی تھی۔۔۔ پر کشش سی۔ درے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے شیشے کی طرف لے کر آئی۔ اور پھر اس نے اپنا ہاتھ مناج کی آنکھوں سے ہٹایا۔ مناج خود کو دیکھ کے بہت حیران ہوئی۔ جہاں اس کا حلیہ ہمیشہ لاپرواہ سا ہوتا تھا، بال ہمیشہ بکھرے ہوئے، وہاں اس کا یہ روپ اس پہ بہت جچ رہا تھا۔ بالوں کو نفیس سے جوڑے میں قید کیا ہوا تھا۔ چہرے پہ رونق نمایاں تھی۔ کانوں میں بالیاں اس کی شخصیت میں رنگ چھوڑ رہی تھیں۔ کالا رنگ اس پر بہت جچ رہا تھا۔

"دیکھو اسے۔۔۔ مجھے شیشے میں ایک باوقار ماہرانی نظر آتی ہے مناج۔" درے نے مناج سے کہا۔ مناج کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ اسے اپنے آپ پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ بھی ایسی دکھ سکتی تھی؟

”مجھے دو نظر آرہی ہیں۔“ مناج نم آنکھوں کے ساتھ بولی۔درے زیر لب ہنس دی۔

”آہاں! رونا مت، سارا کاجل خراب ہو جائے گا۔“ درے نے کہا تو مناج نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔درے اسے یوں ہنستا مسکراتا دیکھ کر دل سے خوش ہوئی تھی۔مناج کو اپنا آپ ایک دم سے اچھا لگنے لگا تھا۔یہ پہلی مرتبہ تھا کہ مناج نے کھل کے زندگی کو جینا چاہا تھا۔یہ پہلی مرتبہ تھا جب مناج کو احساس ہوا کہ اسے دنیا میں پرواز کرنی تھی۔اسے اونچی اڑان بھرنی ہے۔

درے نے مناج کو گھر اتارا اور خود گاڑی سے اتر کے اسے الوداع کہنے لگی۔مناج نے درے کے ہاتھ تھامے اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔مناج کے چہرے پہ ممنون سا تاثر تھا۔وہ ایک جھٹکے میں درے کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔اپنے مسکارے کی اسے اب کوئی پرواہ نہ تھی، وہ روئے جارہی تھی، جیسے ایک بچہ دنیا میں جنم لیتے روتا ہے، بالکل ویسے ہی۔

مناج نے آج نئے سرے سے دنیا میں جنم لیا تھا۔ایک نئے سفر کا اس نے آغاز کیا تھا۔

درے مسکرا رہی تھی، اس نے بھی اسے رونے سے نہیں روکا۔اچھا تھا وہ رو لے۔مناج درے کی مقروض ہوگئی تھی۔مگر درے نے ان چیزوں سے اسے مقروض نہیں کیا تھا جو اس نے خریدی تھیں، بلکہ اس احساس سے کیا تھا جو مناج کو آج تک کوئی نہیں دلا سکا۔یہ احساس کہ وہ بھی ایک معتبر انسان ہے جو زندگی بھرپور طریقے سے جی سکتی ہے، یہ احساس کہ وہ بھی محبت کے قابل ہے۔مناج کے پاس درے کے لیے اچھے گمان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

”چلو بس۔بہت رو لیے۔“ درے مناج کی پشت تھپتھپاتے بولی۔مناج بھی چپ ہو گئی تھی۔

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" مناج کی آواز گیلی تھی۔

"ارے مناج۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے اس کے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ۔ تم اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش کرو گی ناں؟" درے نے مناج سے پوچھا۔ مناج سر اثبات میں ہلانے لگی اور آنسو پونچھتے ہوئے اندر چلی گئی۔ درے کی سینے سے ایک بوجھ اترنے گا تھا۔ اس کا دل بالکل مطمئن تھا۔

مناج ابھی مکمل ٹھیک نہیں تھی۔ اسے وقت درکار تھا۔ روح پہ سالوں پرانے زخم تھے جو کہ اتنی جلدی نہیں بھر سکتے تھے۔ یہ آہستہ آہستہ ہی ہونا تھا، آہستہ آہستہ ہی مناج کے زخم بھرنے تھے، آہستہ آہستہ ہی وہ ڈپریشن کے بھنور سے نکل سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## دو ہفتے بیت گئے تھے۔۔۔

دو ہفتے لگے مہر کو ضبط کے کڑوے گھونٹ اپنے حلق میں اتارنے کے لیے۔ دو ہفتے لگے تھے اسے ہمت کے بلبلے میں قدم رکھنے میں۔ دو ہفتے لگے تھے اسے اپنے بکھرے ہوئے حصوں کو اکٹھا کرنے میں۔ اب وہ تیار تھی۔ جو ہوا تھا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ جو نقصان تھا اس کی بھرپائی کرنے کے لیے۔ مہر بنت عبداللہ سلطان اب تیار تھی۔۔۔!

**(وہ اس اندھیر رات میں بہت روئی۔ شمس سے ملاقات ختم کرکے وہ اپنے کمرے میں آئی تو اسے اپنی دنیا اجڑی اجڑی لگنے لگی۔ وہ اتنا بڑا قرضہ کہاں سے پورا کرے گی؟ وہ ہیرے کیسے تلاش کر سکتی تھی؟ قرضہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی بیٹی تک بوڑھی ہو جاتی اور قرضہ ختم نہ ہوتا۔ مہر بنت عبداللہ سلطان اپنے**

**آپ کو پہاڑوں کے نیچے ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی تھی، بکھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔وہ برباد ہو چکی تھی)**

وہ اپنے آفس میں داخل ہوئی۔اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، رنگت سفید پڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ واضح پریشانی تھی۔وہ اپنے آفس کی راہداری پار کرنے لگی تو سب ایمپلائیز مسکرا کے اسے دیکھ رہے تھے۔سب اپنی نئی باس کو مسکرا مسکرا کے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔اسے ان کے مسکراتے چہرے دیکھ کے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔کیا وہ ان سب کی امیدوں پہ پوا اتر سکتی تھی؟ کیا وہ اپنی کمپنی کو اس بینک کرپسی کی صورتحال سے بچا سکتی تھی؟ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔اپنے ڈیڈ کے کمرے تک سفر کرنا اس کے لیے محال تھا۔

**(وہ روتے گئی۔بستر کے سرہانے سر ٹکا کے روتے گئی۔وہ رات سوگ کی رات تھی۔بکھرتی زندگی کے ماتم کی رات تھی۔وہ اپنے ڈیڈ کو کوس رہی تھی، وہ اسے کس دلدل میں دھکیل کے چلے گئے تھے؟ رندھا ہوا چہرہ اس نے اپنی اسٹڈی ٹیبل کی طرف موڑا۔کالا چمکتا ہوا مصحف اسے نظر آیا۔وہ اُسے دیکھتے اور تیزی سے رونے لگی۔**

**"میرے اللہ، مجھے بچا لے۔" وہ بلکتے ہوئے بولی تھی۔آواز میں اس کے اندر کا خالی پن جھلکتا تھا).**

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو آفس کے مینجر، زاہد اس کے منتظر تھے۔وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھے جو گرم جوشی سے مہر کا استقبال کر رہے تھے۔مہر کی ہوائیاں اب بھی اڑی سی تھیں۔اس کو اپنے کندھے بوجھ سے دبتے محسوس ہو رہے تھے۔اسے اپنا وجود زمین میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اپنی ہر کیفیت کو جھڑکتے اپنی کرسی پہ براجمان ہو گئی۔زاہد بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔وہ اپنے چہرے کو نارمل کرنے لگی۔آج اسے بہت مشکل فیصلے لینے تھے۔وہ اپنے آپ کو ان مشکل فیصلوں کے لیے کئی ہفتوں سے تیار کر رہی تھی۔

**(اس اندھیری رات میں صرف اس کا مصحف ہی تھا جو اسے امید کی نادیدہ کرنیں دکھا رہا تھا۔مہر نے سب جھڑک کے اپنی اسٹڈی ٹیبل کا رخ کیا اور اپنا مصحف وہیں سے کھولا جہاں سے آخری مرتبہ چھوڑا تھا۔اور اسے پڑھنا شروع کیا۔اس نے پہلے عربی پڑھی اور پھر ترجمہ پڑھنا شروع کیا).**

"ڈیڈ نے ہماری کمپنی کو ایک بہت بڑے قرضے میں چھوڑ دیا ہے زاہد۔"زاہد کے چہرے کا سکون غارت ہو گیا۔انہیں پہلے تو شک ہوا کہ یہ کوئی وہم تھا۔بھلا ان کی نئی باس آتے ساتھ ہی اتنا بڑا بم کیوں پھوڑے گی؟ مگر پھر انہوں نے مہر کے تنے ہوئے تاثر دیکھے۔وہ جان گئے تھے کہ مہر نے واقعی یہ بولا تھا۔

"یہ کیا بات کر رہی ہیں آپ؟" وہ کرنٹ کھا کے بولے تھے۔مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا اور اپنے پرس سے کچھ کاغذات نکالے۔اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔وہ سب کچھ قبول کر چکی تھی، اسے بس اب ہر چیز کا کھلے دل کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔زاہد نے وہ کاغذات پڑھے اور ان کو پڑھتے ہی ان کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ ساتھ خوف اترنے لگا۔

"ناممکن! یہ بہت بڑی رقم ہے۔" وہ خواب کی سی کیفیت میں بولے۔مہر کچھ نہ بولی۔اس کے چہرے پہ سرد سا

پر اطمینان تاثر برقرار رہا۔

وہ ان سب کی باس تھی، ان سب کی لیڈر تھی، وہ اندر سے کتنا ہی ٹوٹ رہی ہو مگر اسے کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونے دینا تھا۔مہر بنت عبداللہ سلطان ضبط کا مظاہرہ کرتے اس تناؤ سے دوچار صورتحال میں بھی اپنے آپ کو پرسکون رکھے ہوئے تھی۔

**"(اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔"**

**مہر۔۔۔لاجواب۔۔۔ مسحور۔۔۔ قرآن کے زیر اثر وہ رو پڑی۔یہ کتاب آخر کیا تھی؟ اس کا اللہ، اس کا پروردگار آخر میں ہمیشہ اس کی دل جوئی کر ہی دیتا تھا۔آج بھی وہ اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔وہ اسے مستقبل کی سخت آزمائش کے لیے تیار کر رہا تھا۔)**

"یہ وقت پینک(panic) ہونے کا نہیں ہے۔" وہ پرسکون انداز میں بولی۔

"یہ حل تلاش کرنے کا وقت ہے۔اس کمپنی کو اس کرائسز سے نکالنے کا وقت ہے۔جو ہوا سو ہوا، اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔" وہ مایوسی کے کتنے کڑوے گھونٹ پیتی یہ سب بولی تھی۔یہ کہنا اس کے لیے کتنا مشکل تھا صرف وہی جانتی تھی۔وہ اپنے آپ کو ٹوٹنے سے روک رہی تھی۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی پھیلی رہی۔

"ہمیں کمپنی سے ایمپلائی فارغ کرنا پڑیں گے۔بڑے پیمانے میں ڈاؤن اسکیلنگ کرنی پڑے گی۔تاکہ اس قرضے سے بچا جا سکے۔" زاہد نے کہا تو مہر سر نفی میں ہلانے لگی۔

"میں اتنے سارے لوگوں کی بد دعا نہیں لے سکتی۔ یہ کمپنی بہت لوگوں کا گھر چلا رہی ہے زاہد۔" مہر کا انداز سرد تھا۔

"مگر یہ ہماری ضرورت ہے۔"

**"(ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"**

**مہر کا ضبط پھر سے ٹوٹا اور وہ رونے لگی۔اس کا رب اس پہ حد سے زیادہ مہربان تھا۔آج اسے صحیح معنی میں سمجھ آیا تھا کہ اس کا رب رحمٰن و رحیم کیوں کہلاتا ہے۔**

**"میں آپ ہی کی ہوں اللہ۔" وہ آنسوؤں کا پھندا حلق میں نگلتے بولی تھی۔ "اور میں آپ ہی کی طرف پلٹ کر جانے والی ہوں۔"**

**کچھ تھا جو اس میں بدلنے لگا تھا۔اسے اپنا سینہ کشادہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔اسے اپنے اندر توانائی بھرتی محسوس ہو رہی تھی۔)**

"کمپنی کے اکاؤنٹس میں جو رقم ہے۔اس سے ہم کچھ قرضہ اتار سکتے ہیں۔" مہر اپنے دماغ کو تیزی سے چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔یہ وقت ڈھے جانے کا نہیں تھا۔بلکہ پر سکون ہو کے کام کرنے کا تھا۔

"اس میں ہمارا نیٹ پرافٹ بھی ہے میم۔ہمیں ایک مخصوص رقم پراڈکشن میں دینی ہوگی۔" زاہد کو مہر کی تجویز اتنی پائیدار نہ لگی۔

"ہم اس میں سے مخصوص رقم چھوڑ کے باقی کی کچھ رقم نکال لیں گے۔ساتھ ساتھ پراڈکٹس ڈاؤن اسکیل کریں گے۔پیسہ جہاں بچ رہا ہو گا اسے بچانے کی کوشش کی جائے گی۔"

مہر اپنا فیصلہ حتمی سے انداز میں سنانے لگی۔

**(وہ اللہ کی تھی، یہ اقرار صرف زبان کا نہیں تھا، بلکہ اس نے دل سے اقرار کیا تھا۔وہ دل سے سب کچھ تسلیم کرنے لگی تھی۔**

**"انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایت ہو گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راہِ راست پر ہیں۔"**

**یہ پڑھتے ہوئے مہر مسکراتے مسکراتے رونے لگی۔اس نے صحیح معنوں میں آج اپنے رب کو پہچانا تھا۔)**

"ہم کمپنی کے شیئرز بیچیں گے۔ابھی میرے پاس سو فیصد شیئرز موجود ہیں۔ہم شیئرز کی قیمت سے کمپنی کو بچا سکتے ہیں۔" مہر پین ہاتھ میں گھماتے بول رہی تھی۔اس کا دماغ پوری طرح سے ہر ممکن راستہ تلاش کرنے میں مختص تھا۔

"اس میں رسک ہے۔اگر ہم کامیاب نہ ہوئے تو سب کچھ ہمارے گلے پڑے گا۔" زاہد کو یہ راستہ بھی زیادہ اچھا نہ لگا۔

"مجھے یہ ضروری لگ رہا ہے۔" مہر نے زور سے ٹیبل پہ ہاتھ رکھا۔زاہد بھی سمجھ گئے تھے، یہی مہر کا فیصلہ تھا۔

(اپنے مصحف کو بند کر کے وہ کھڑی ہوئی۔اب وہ رو نہیں رہی تھی۔اب وہ کسی کو نہیں کوس رہی تھی۔وہ پر سکون تھی، مطمئن تھی۔زندگی کی خوبصورتی، زندگی کی تلخیوں کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں ہوتی ہے۔اس کو ان تلخیوں کے ساتھ پورے دل سے تسلیم کرنے میں ہوتی ہے۔

مہر بھی یہ سمجھ چکی تھی۔وہ بھی جان گئی تھی کہ یہ سب اللہ کی اجازت سے ہو رہا تھا۔اسے ہر حال میں، بغیر کسی شکایت کے، یہ سب قبول کرنا ہی کرنا تھا۔)

”جہاں تک ایمپلائیز کو فائر کرنے والی بات ہے۔وہ بھی ہمیں کرنا ہو گا۔ وہ بھی ضروری ہے۔اب کام پہ لگ جائیں زاہد۔“ اٹل انداز میں کہتے ہوئے اس نے ہاتھ ہوا میں کھڑا کیا۔زاہد سرعت سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے کچھ بہت سنگین فیصلے لیے تھے۔

وہ اب بھی اپنے آپ کو پہاڑوں کے نیچے دبتا محسوس کر رہی تھی، چکنا چور ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اعصاب پہ قابو پائے ہوئے تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے کچھ دن مہر نے یہی کام کرنے میں لگائے۔اس نے ہیروں کی تلاش بھی شروع کر دی تھی۔اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر اسے ہیرے نہیں ملے۔وہ دن بدن مایوس ہوتی جا رہی تھی۔قرضے کا بوجھ بھی سر پہ سوار تھا۔

ان سب مسئلوں کے درمیان اس نے ایک مسئلہ سلجھانے کی کوشش کی۔وہ مسئلہ عنایا کا تھا۔وہ ان حالات میں کورٹ کی بھاگ دوڑ بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس دن اس نے آفس میں بیٹھے بیٹھے مناج کو کال ملا دی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد مہر نے بات کا آغاز کیا۔

"جی مناج میں نے کہنا تھا کہ میں حسام سے میٹنگ جلد از جلد کرنا چاہتی ہوں۔اب میرے لیے کورٹ کے جھنجٹ کو برداشت کرنا ممکن نہیں رہا۔" مہر نے سپاٹ لہجے میں مناج کو فون پہ اطلاع دی۔

"اچھا۔مجھے بتاؤ، کب کرنی ہے میٹنگ۔" مناج نے اپنے مشینی انداز میں پوچھا۔

"میں معاملات زیادہ لٹکانا نہیں چاہتی۔آج کے آج ہی یہ میٹنگ ہو جانی چاہئے۔"مہر ساتھ ساتھ کچھ فائلز بھی جانچ رہی تھی،اس لیے اس کا انداز کافی مصروف سا تھا۔

"ٹھیک ہے۔آج آٹھ بجے اپنے وکیل کے ساتھ میرے آفس آجانا۔"مناج نے پرسکون سانس باہر نکالی۔

بالآخر یہ مسئلہ بھی حل ہونے والا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ اور بھی پوچھنا تھا مناج۔" مہر نے فائلز بند کیں۔اپنی کرسی پہ بیٹھ کے اب اس نے پرسکون ہو کے مناج کے جواب کا انتظار کیا۔

"ہاں پوچھو۔" مناج نے دلچسپی ظاہر کی۔

"اگر کوئی بلیک میل ہورہا ہو۔تو اسے کیا کرنا چاہیے؟" مہر نے اپنا انداز عام رکھنے کی کوشش کی۔

"تو بلیک میل کرنے والوں پر کیس کیا جاسکتا ہے۔ عموماً بلیک میلنگ کے کیس زیادہ لمبا نہیں چلتے اور جلد ہی ثابت ہو جاتے ہیں۔ مگر لوگ ڈرتے بہت ہیں کیونکہ ان کو دھمکیاں بہت دی جاتی ہیں۔ اگر بلیک میلر پکڑا جائے تو اسے سات سال تک کی سزا سنائی جا سکتی ہے اور ساتھ میں پانچ کڑور کا جرمانہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔" مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔

"فرض کریں کہ بلیک میلر جس کو بلیک میل کررہا ہو اسے قرضہ دے چکا ہو۔ بلیک میلر ایک کرمنل ہے۔ اگر اس کا جرم ثابت ہو جائے تو کیا یہ قرضہ معاف کیا جائے گا؟" مہر کی آنکھوں میں امید جاگی تھی۔ وہ اس قرضے کے بوجھ سے جان چھڑانے کا آسان راستہ تلاش کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں۔ اگر جرم ثابت ہو جائے تو قرضہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سب منحصر ہے کے بلیک میلنگ کی فطرت کیا ہے اور جرم کس طرح کا ہے۔ اور کچھ؟" مہر کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آٹھ بجے ملتے ہیں۔" مختصر سا کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ وہ گہری سوچ میں تھی۔

رات کے وقت مہر کام سے جلدی ہی فارغ ہو کے چلے گئ۔

اس نے اس وقت سیدھا ڈی ایس پی کا رخ کرنا مناسب سمجھا۔ ڈی ایس پی کے ویسے بھی عبداللہ سلطان سے اچھے تعلقات تھے، اس لیے مہر نے ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ڈی ایس پی کے آفس میں اطمینان سی بیٹھی تھی۔

وہ ڈی ایس پی کو سب بتا چکی تھی۔ اس نے ڈی ایس پی کو قرضے کے وہ کاغذات بھی تھما دیئے تھے۔

"تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کو بلیک میل کیا جارہا ہے؟" ڈی ایس پی اسماعیل عجب سے بولا۔

"بالکل۔" مہر پر اعتماد انداز میں بولی۔ "یہ کاغذات ہیں۔ سنابل ہسپتال نے ڈیڈ کو قرضہ دیا تھا اور اب یہ لوگ میرے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔" ڈی ایس پی وہ کاغذات بغور دیکھنے لگا اور پھر اس کی ہنسی گونجنے لگی۔

"میڈم، کیا بات کر رہی ہیں۔ سنابل ہسپتال جس بندے کے نام ہے وہ جرمنی میں رہتا ہے۔ وہ بھلا جرمنی میں بیٹھے بیٹھے آپ کو دھمکیاں کیوں دے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ بس قرضے سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کر رہی ہیں۔" اسماعیل نے کہا۔ مہر کے ماتھے پہ بل پڑنے لگے۔

"نہیں۔ یہ لوگ اندر خانے کچھ غلط کر رہے ہیں۔ آپ تفتیش تو کریں۔" مہر کو اس وقت اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈی ایس پی اس معاملے کو لے کر سنجیدہ نہ تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی کمپلین کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا تھا۔

"ہم ایف آئی آر کاٹ دیں گے۔ اور تھوڑی بہت چھان بین بھی کرلیں گے، صرف اس لیے کیونکہ ہمارے عبداللہ صاحب سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ مگر ہم کوئی گارنٹی نہیں دیں گے۔" اسماعیل نے لاپرواہ انداز میں کہا۔

مہر نے ڈی ایس پی پہ کھا جانے والی نظر ڈالی۔ اپنا غصہ ضبط کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا جارہا تھا۔ اس نے یہاں آکے بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ گئی۔ کھا جانے والی نظریں اب بھی ڈی ایس پی کی آنکھوں میں گاڑی ہوئیں تھیں۔ ڈی ایس پی کچھ متذبذب سا ہونے لگا۔

"تم سب بکے ہوئے ہو۔" سخت سے انداز میں اس نے کہا۔ڈی ایس پی نے بھنویں اٹھائیں۔ڈی ایس پی نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے لیکن مہر نے اپنا ہاتھ ہوا میں کھڑا کر کے اس کو بولنے سے روک دیا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔"

پاؤں پٹختے وہ وہاں سے چلے گئی۔اب اسے مناج کے پاس پہنچنا تھا۔

مہر ڈی ایس پی کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو ڈی ایس پی نے کسی کو کال ملائی۔کال کچھ دیر میں اٹھا لی گئی تھی۔

"جی درانی صاحب، کیا حال ہے؟" وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔

"تم بتاؤ، کیوں کال کی؟" درانی کی خشک آواز میں تلخی سی تھی۔اسماعیل مرعوب سا ہو گیا۔

"آپ لوگوں کے خفیہ ہسپتال کی کمپلین کی ہے عبداللہ سلطان کی بیٹی، مہر نے۔" اسماعیل نے عام سے انداز میں بتایا۔

"اور تم نے کاٹی؟"

"ہم آپ کے وفادار ہیں سر۔آپ کا کھاتے ہیں، ہم بھلا کیوں کاٹیں گے کوئی ایف آئی آر۔بس ہم آپ کو اطلاع دے رہے تھے۔" اسماعیل نے مسکہ لگانے والے انداز میں بتایا۔

"ٹھیک ہے۔"بس اتنا سا کہہ کے درانی نے کال کاٹ دی۔وہ سنابل ہسپتال میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔درانی کی آنکھیں غصیلی ہونے لگیں۔اسے مہر کے اوپر رہ رہ کے غصہ آرہا تھا۔

اگلے ہی لمحے، چہرے پہ ناگوار سا تاثر لیے وہ لیڈی اقتدار کو کال ملاتا نظر آرہا تھا۔کچھ دیر رنگ کے بعد کال اٹھا لی گئی تھی۔

”لیڈی اقتدار یہ لڑکی پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ابھی ابھی میرے پاس ڈی ایس پی کی کال آئی تھی۔ ہمیں اسے اتنی کھلی چھوٹ نہیں دینی چاہیے۔“ درانی نے چبا چبا کے احوال بتایا۔

”بس؟ ابھی اس کی لگام کھینچ دیتی ہوں۔“ بے رحم انداز میں کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حسام کو جیسے ہی پتا چلا کہ مہر آج میٹنگ کرنے والی ہے وہ تو پھولے نہیں سما رہا تھا۔حسام کے اپارٹمنٹ میں جیسے عید کا سماں تھا۔مرینا بھی کافی خوش تھیں۔اس سے آٹھ بجنے کا انتظار ہی نہیں ہو رہا تھا۔اس لیے وہ آٹھ بجے سے کافی پہلے ہی مناج کے آفس پہنچ گیا۔

مناج آفس میں کچھ ڈاکومنٹس تیار کر رہی تھی اور حسام اس کی سامنے والی کرسی پہ بیٹھا تھا۔دیوار پہ لگی ایل ای ڈی چل رہی تھی جس پہ ایک نیوز چینل کھلا ہوا تھا۔

”ناظرین ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ سعودی شیخ عبدال مجید پاکستان اپنی بیٹی کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔“ نیوز اینکر آٹھ بجے کا خبر نامہ پڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”سعودی شیخ پاکستان میں؟“ حسام نے تبصرہ کیا۔مناج کا پرنٹر کچھ کاغذات باہر نکال رہا تھا۔اس کی نظریں ان کاغذات پر ہی مرکوز تھیں۔

"ہاں۔میں نے پرسوں خبر سنی تھی کہ شیخ کی بیٹی کے دل میں سراخ ہے۔" مناج کاغذات ہاتھ میں تھامتے بولی۔

"ہیں؟ پاکستان میں اتنے اچھے ڈاکٹرز ہیں کہ اب سعودی عرب سے لوگ آرہے؟" حسام کچھ حیران سا ہونے لگا۔مناج نے ایک سرسری نظر حسام پہ ڈالی اور کاغذات فائل میں لگانے لگی۔

"نہیں۔" انداز اب بھی مشینی تھا۔"اس کی بیٹی کا دل نکالا جائے گا۔اور اس کی جگہ کسی دوسرے کی بیٹی کا دل ڈالا جائے گا۔پاکستان میں اعضاء کا غیر قانونی کاروبار بہت عام ہے۔" مناج نے کہا تو حسام کے چہرے پہ عجیب سا تاثر آکے گزرا۔اس نے بے اختیار جھر جھری لی۔یہ خیال ہی اسے اچانک سے بہت ڈسٹرب کرنے لگا تھا۔

"ایسا بھی ہوتا ہے پاکستان میں؟" حسام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں۔" مناج نے اپنے روایتی مشینی طرز میں جواب دیا۔حسام کا دل ڈوبنے لگا۔

"کیا اس سب کو روکا نہیں جا سکتا؟ کیا ان درندوں سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں؟"حسام نے شدید کوفت کے عالم میں کہا۔

اس لمحے مناج نے ایک جھٹکا لیا۔اس کا کام کرتا ہاتھ تھمنے لگا۔وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس سب کو روکنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔یہ سب لوگ قانون چلاتے تھے، ان کے ہاتھ میں پاکستان کا نظام ہے۔بھلا ان لوگوں تک کوئی کیسے پہنچ سکتا تھا؟

وہ حسام کو جواب دینے ہی لگی تھی کہ مہر اور ولید نے اس کے دروازے پہ دستک دی۔اب وہ اٹھ کے انہیں

اندر بٹھانے لگی تھی۔حسام کا ایک دم سے دل جوش و خروش سے بھر گیا تھا۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔آخر کار لمبی تکلیف دہ راتیں بھی اپنے اختتام پر پہنچنے والی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مناج کے آفس میں تناؤ گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ٹیبل کے ایک طرف مناج اور حسام بیٹھے تھے اور دوسری طرف مہر اور اس کے وکیل، ولید بیٹھے تھے۔ولید سومرو بہت چڑے ہوئے سے لگتے تھے۔وہ کسی بات پہ بھرپور تنک رہے تھے۔

"مہر مجھے تو سمجھ نہیں آرہا آپ یوں آؤٹ آف کورٹ سیٹلمنٹ کے لیے کیسے مان گئیں۔مجھ سے مشورہ تک کرنا آپ نے گوارا نہ کیا۔" ولید سومرو کی چکنی پیشانی پہ بل تھے۔ان کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔حسام خاموشی سے سب منظر دیکھ رہا تھا۔

"مہر آپ سمجھنے کی کوشش کریں، ہمارا کیس مضبوط ہے۔ہم یہ کیس جیت جائیں گے۔" مناج کے دل میں تڑپتے ہوئے ولید کو دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

"ولید۔" مہر پر اطمینان انداز میں بولی۔اسے ولید کی ان کوششوں سے کوئی غرض نہ تھا۔"جیسے کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ یہی عنایا کے لیے بہتر ہے۔اور عنایا کی بہتری میری اول ترجیح ہے۔میرا فیصلہ اٹل ہے۔اپنا وقت ضائع نہ کریں۔" مہر نے صبر کے گھونٹ بھرتے بہت تحمل سے کہا۔ولید

کراہتے کراہتے چپ ہو گئے۔انہوں نے مہر کے اوپر کھا جانے والی نظر ڈالیں۔ وہ مناج کے ہاتھوں اپنی ہار کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

"اگر آپ کے بے وجہ کے اعتراضات ختم ہوگئے،تو میرا موئکل مہر سے بات کرلے؟" مناج نے جلانے والی مسکراہٹ لیے ولید کی طرف اپنا رخ موڑا۔ولید نے مناج کے اوپر بھی انتقاماً کھا جانے والی نظر ڈالی۔

"تو مہر، ہم عنایا کو کچھ دن تمہارے پاس رکھیں گے اور کچھ دن میرے پاس۔اس طرح سے باریاں رکھ لیں گے۔کیا خیال ہے؟"حسام کو سمجھ نہیں آیا کہ بات کا آغاز کیسے کرے۔دل میں اس وقت کچھ چبھ بھی رہا تھا۔جس سے وہ بے جھجک، جب چاہے، اپنے دل کی بات کر دیا کرتا تھا آج اس سے اتنی چھوٹی سی بات کہنا کتنا مشکل ہو رہا تھا۔افف یہ زندگی۔۔۔اور افف یہ رشتے۔۔۔

کچھ دیر کے لیے آفس میں خاموشی چھا گئی۔

"تم کیوں اتنا اُڑنے لگے ہو حسام؟ کچھ دن؟"مہر اچنبھے سے بولی تو حسام کے اوپر مایوسی کے کالے بادل چھانے لگے۔یہ آخر کیسا ٹویسٹ تھا؟ اگر مہر کو یہی سب کرنا تھا تو آخر اس میٹنگ پہ وہ کیوں راضی ہوئی؟ حسام کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔اسے اب لال جھنڈے نظر آرہے تھے۔"تمہیں کیا لگتا ہے تمہیں تمہارے کیے کی کوئی سزا نہیں ملے گی۔میں تمہیں عنایا کے ساتھ صرف ایک دن ہی رکنے کی اجازت دے سکتی ہوں۔" مہر نے سرد لہجے میں کہا۔ادھر ی ولید سومرو کے تاثرات بدلے۔اب ان کے چہرے پہ کھسیانی سی مسکراہٹ نمودار ہونے لگی۔اس میٹنگ نے ایک دم سے پلٹا کھایا تھا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں کیسے ہوتی ہے یہ سیٹلمنٹ۔" ولید نے سوچا۔اب انہیں اپنی جیت کی خوشبو آنے لگی تھی۔

"بالکل۔صرف ایک دن ہی۔" وہ بھی چہرے پہ جلانے والی مسکراہٹ سجائے بولے۔مناج اور حسام کو برا لگا ہی تھا مگر مہر کو بھی ولید کا یہ انداز بے حد کھل رہا تھا۔

"مہر ایک دن میں کیا ہو جائے گا؟ کم سے کم بھی دو دن کر لو۔پلیز مہر۔" حسام نے شکست زدہ ہو کے کہا۔مناج کا چہرہ بھی مایوسی میں ڈھلنے لگا تھا۔سب کچھ عین وقت پہ آ کے ختم ہونے لگا تھا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔ایک دن، ورنہ ایک بھی نہیں۔دن کا اپنی مرضی سے انتخاب کر سکتے ہو۔اگر تمہیں منظور نہیں تو مجھے یہ میٹنگ اسی وقت ختم کرنی پڑے گی۔" مہر کا انداز تلخ تھا۔حسام کی گردن جھک سی گئی۔وہ کتنا خوش تھا، اور اب سب چیزیں ایک ناگوار موڑ لینے لگی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ہم کورٹ میں ہی عنایا کا کسٹڈی کیس آگے بڑھائیں گے۔ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا گیا۔" مناج بھی تلخ ہو کے بولی۔مہر نے شانے اچکائے اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔وہ جانے کے لیے تیار تھی۔

ولید سومرو بھی چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ لیے کھڑے ہو گئے۔

"مجھے۔۔۔منظور ہے۔" حسام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں حسام۔ہم کورٹ میں اس سے بہتر نہج پہ پہنچ سکتے ہیں۔" مناج نے فوراً کہا۔ولید سومرو کی امید ایک دفعہ پھر دم توڑنے لگی۔وہ ہڑبڑا کے کبھی مناج کو دیکھتے، کبھی حسام کو، اور کبھی مہر کو۔دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ یہ ڈیل نہ ہو۔

"نہیں مناج۔میں اس سے بہتر کا حقدار نہیں ہوں۔شاید میری یہی سزا ہے۔مجھے سب قبول ہے۔بس ایک دن ناں؟ مجھے قبول ہے۔" حسام ہارے ہوئے انداز میں بولا۔اس کی آنکھیں نم تھیں۔

مہر بھی واپس بیٹھ گئی۔اسے حسام کی جذباتیت سے کوئی غرض نہیں رہا تھا۔وہ اس کے دل سے اتر چکا تھا، اب وہ اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کرتی تھی۔وہ محض اس کے لیے ایک انسان تھا۔۔۔عام انسان۔

"ٹھیک ہے۔کس دن؟"

"اتوار کا دن۔میں ہفتے کی رات عنایا کو لے جاؤں گا اور پیر کی صبح اسے سکول چھوڑ دوں گا اور پھر تم اسے واپس لے لینا۔یہ تو ٹھیک ہے نا؟" حسام نے محتاط انداز میں مہر سے پوچھا۔

"میرے لیے یہ قابلِ قبول ہے۔مگر یاد رہے۔عنایا کی پروٹوکول کی گاڑی ہر وقت تمہارے اپارٹمنٹ کے باہر رہے گی۔اور اگر تم کہیں جاؤ گے تو وہ ساتھ جائے گی۔یہ ایسی شرائط ہیں جن پہ مجھے کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں ہونے والی۔" وہ ہمیشہ کی طرح سخت سے انداز میں بولی۔اس کا دل صرف حسام کے لیے ہی نرم نہیں ہوا تھا۔اور ہونا بھی نہیں چاہیے تھا، حسام نے مہر کی روح پہ زخم ہی کچھ ایسے دیے تھے۔

”مجھے سب منظور ہے۔“ حسام بس سب کچھ مان چکا تھا۔وہ بھی کورٹ کے ان جھمیلوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ایک دن ہی سہی، کم سے کم اس کی بیٹی اسے مل تو رہی تھی۔کم سے کم وہ اس سے کوسوں دور نہیں رہے گی۔کم سے کم اس کی بیٹی اسے بھولے گی نہیں۔

کم سے کم۔۔۔کم سے کم۔۔۔وہ کم سے کم کو ہی اپنی سزا سمجھ کے، اپنی تقدیر سمجھ کے، قبول کرنے لگا تھا۔

مناج نے کچھ ڈاکومنٹس نکالے جس پہ سب نے دستخط کر دیئے۔پھر مہر، ہارے ہوئے ولید کے ساتھ آفس سے چلے گئے۔

اب مناج اور حسام آفس میں اکیلے تھے۔

”مجھے زندگی بھر روگ لگا رہے گا کہ میں اس سے بہتر ڈیل نہیں کرواسکی۔“ مناج نے کہا تو حسام اداس سا مسکرایا۔وہ اپنی ہار کو پورے دل سے قبول کر چکا تھا۔

”جو بھی ہے مناج، میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ مناج نے

زیر لب آمین کہا۔”مگر جہاں تک ڈیل کی بات ہے، میں اس سے بہتر کا حقدار نہیں ہوں۔جو ہے میں اسی پہ راضی ہوں۔“ مناج کے چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی۔

”ایسا نہیں ہے۔“ مناج نے تردیدی انداز اختیار کیا۔”آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ ہر ایک محبت بھرا لمحہ ڈیزرو کرتی ہے۔“ اس وقت حسام کو مناج میں کچھ عجیب سا لگا۔وہ اس طرح سے جذباتی باتیں

نہیں کرتی تھی۔وہ مشین کی طرح بس کام کی بات کرتی تھی مگر آج اس کا انداز کچھ مختلف تھااور ہمیشہ کے برعکس آج نئے کپڑے پہن کے آئی تھی۔اس کے چہرے کی کھال بھی نکھری نکھری تھی۔ہمیشہ اس کے بال چہرے پہ بکھرے ہوتے تھے مگر آج اس کے بال نفاست سے بندھے ہوئے تھے۔مگر وہ بھوری پشمینہ شال آج بھی مناج کے ہمراہ تھی۔صرف وہی پشمینہ شال تھی جو اس میں اب بھی پہلے جیسے تھی۔

"اچھا مناج، مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔کیا آپ اپنے سرکل میں کسی سائیکولاجسٹ کو جانتی ہیں؟ اصل میں میں نے اپنا ریہیب کھولنا ہے جو کے میری کمپنی فنڈ کرے گی۔جگہ میرے والد کی ہے اور اس جگہ پر میں کچھ کام کروا رہا ہوں۔تو کیا آپ مجھے کسی سائیکولاجسٹ سے ملوا سکتی ہیں؟" مناج کو یہ سن کے بہت ہی اچھا لگا۔اسے اچھا لگا یہ جان کر کہ حسام نے اپنے ماضی کے ذریعے اپنی سیکھ تلاش کی اور اس پہ عمل بھی کیا۔وہ بھی یہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ بھی اپنے ماضی کی سیکھ کب سے تلاش کر رہی تھی۔

"ڈاکٹر درفشاں سے بہتر آپ کو کوئی نہیں مل سکتا۔میری گارنٹی ہے آپ کو۔" مناج کے لیے جواب دینا مشکل نہ تھا۔ڈاکٹر درفشاں سے بہتر واقعی حسام کو کوئی نہیں مل سکتا تھا۔

"تو کیا آپ میری ان سے ملاقات کروا سکتی ہیں؟" حسام نے مزید دلچسپی ظاہر کی۔

"بالکل میں جلد ہی آپ کی ملاقات کروا دوں گی۔" اور اس وقت مناج کو یاد آیا کہ درے سے ایک ملاقات اس کی بھی باقی تھی۔اور یہ ملاقات اسے جلد ہی کرنی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر بنت عبداللہ سلطان، آنے والی مصیبت سے انجان پرسکون سی ہو کے گاڑی اس سنسان سی گلی پہ چلا رہی تھی۔ یہ گلی کافی ویران تھی، آس پاس گھر نہیں تھے، اسے عنایا سے ملنے کی جلدی تھی اس لیے شارٹ کٹ کے ذریعے گھر جا رہی تھی۔

عنایا کا معاملہ حل ہوگیا تھا اب اسے صرف ہیرے تلاش کرنے میں اپنا وقت لگانا تھا۔ مہر کے کندھے سے ایک بوجھ تو کم سے کم سرک ہی گیا تھا۔ وہ پرسکون سی ہو کے اپنی گاڑی چلا رہی تھی جب ایک زور دار آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔ اس کی گاڑی ایک دم بے قابو ہو گئی اور اس گلی میں پھسلنے لگی۔ مہر کی خوف کے مارے، سانسیں پھولنے لگی۔ اس نے فوراً سے بریک دبایا تو گاڑی جھٹکا کھا کے رک گئی۔ مہر نے نظر سائیڈ گلاس میں ڈالی۔ ایک کالی کرولا اس کی طرف آ رہی تھی۔ مہر کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کرولا میں کون ہو گا۔ وہ اپنی گاڑی وہیں چھوڑ کے نکلی اور اس گلی میں بھاگنے لگی۔

کالی کرولا مہر کی گاڑی کے پیچھے رکی۔ اس میں سے شمس نکلا جس کے چہرے پہ حیوانگی طاری تھی۔ وہ مہر کے پیچھے پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔

مہر بھی حواس باختہ ہو کے بھاگے جا رہی تھی۔ اس نے اب تک پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا تھا۔ شمس نے اس کے بازو کو تھاما۔ مہر کے سر پہ خوف و وحشت کا گزر ہوا۔ وہ اپنے بازو کو شمس کی مضبوط گرفت سے آزاد کرنے لگی۔ شمس نے مہر کو ہاتھ سے تھام کے دیوار سے لگایا۔ بیچ میں مہر کا پاؤں مڑ گیا اور

اس نے تکلیف دہ کراہ جاری کی۔اب اسے شمس نظر آیا۔اس کا خوفناک چہرہ مہر کی نظروں کے بالکل سامنے تھا۔مہر خوف کے مارے کپکپانے لگی۔اسے شمس سے خوف آرہا تھا۔

”کتنے سکون سے سمجھانے کی کوشش کی تھی میں نے تمہیں۔“شمس غرایا۔مہر کے دل پہ شمس کی دہشت سوار تھی۔اس نے خوف کے مارے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

”مگر نہیں۔میڈم کو تو مار کھانے کا شوق ہے۔کیوں گئی پولیس سٹیشن۔“ مہر نے اپنے دوسرے بازو کا استعمال کرکے شمس کی گرفت سے جان چھڑانی چاہی تو شمس نے اس کے بالوں کو ہاتھ میں جکڑ لیا۔وہ اس کا سر دیوار پہ مارنے لگا۔ اس کے پاؤں کی سڑک سے رگڑ ہوئی تو اس کا پاؤں خون آلود ہو گیا۔ وہ اس کا سر دیوار پہ مارے جارہا تھا۔۔۔مارے جارہا تھا۔۔۔

اور جہاں مہر کو لگا کہ اس سنسان گلی میں۔۔۔اس ویران رات میں۔۔۔اس اندھیرے منظر میں۔۔۔ جہاں اسے لگ رہا تھا کہ یہ تکلیف اب موت کی آمد پہ ہی ختم ہوگی۔۔۔جہاں اسے لگا کہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔۔۔وہاں پر وہ آگیا۔

اس نے شمس کے اوپر پیچھے سے وار کیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کسی کو ہراساں کرنے کی۔“ وہ چلایا تھا۔مہر ایک دفعہ پھر کانپ اٹھی۔شمس درد کے مارے کراہ رہا تھا۔مہر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔جیسے ہی شمس کی گرفت

اس کے بازو سے ڈھیلی ہوئی وہ لنگڑاتے ہوئے گاڑی کی طرف گئی اور اس کی پیچھے پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔وہ بہت زیادہ خوف ذدہ تھی۔وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ یہ کون تھا جو اس کی مدد کو آیا تھا۔

اس شخص نے شمس کے اوپر لاتوں اور مکوں کی برسات کردی تھی۔اس شخص کو دیکھتے ہی شمس کی آنکھوں میں خوف اترنے لگا۔وہ ہڑبڑا کر اپنی کرولا کی طرف بھاگا اور گاڑی گھماتے اس گلی سے چلے گیا۔جیسے ہی شمس گیا تو وہ شخص گہری گہری سانسیں لینے لگا۔اس کی سانسیں نارمل ہوئیں تو وہ سہمی ہوئی مہر کی طرف بڑھا جو کہ گاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔وہ سسک رہی تھی اور خوف کے مارے کپکپا بھی رہی تھی۔اس پہ اب بھی وحشت سوار تھی۔

مہر سسکیاں لے لے کے رو رہی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھاکہ وہ اس کے عقب میں ہی کھڑا تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟“ مہر کو یہ آواز جانی پہچانی لگی۔اور پھر اس نے ایک جھٹکا لیا۔وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی۔یہ تو وہی تھا۔۔۔احمد،جس کی تلاوت کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک حسین اضافہ ہوا تھا۔اور مہر کی کپکپاہٹ دم توڑنے لگی۔وہ ساکن ہوگئی۔اس نے سر اٹھا کے احمد کو دیکھا جس کی نگاہوں میں مہر کے لیے تشویش تھی۔نہ جانے کیا تھا اس شخص میں کہ مہر کے دل کو اسے دیکھتے ہی قرار آنے لگا۔اسے اس شخص سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔

”احمد؟“ مہر کی آواز میں لرزش تھی۔

”میرا گھر قریب ہی ہے۔میں جاگنگ کررہا تھا تو شور سنائی دیا۔آپ ایسا کریں میرے گھر چلیں۔میرے گھر میں میری بہن بھی ہے۔آپ کی مرہم پٹی کر وا کے میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گا۔“ مہر

کی سانسوں کو اب ترتیب ملنے لگی تھی۔وہ یقین کر چکی تھی کہ وہ بھیانک منظر ختم ہو گیا ہے۔وہ اب محفوظ تھی، وہ بچ گئی تھی۔اس کے رب نے اسے بچا لیا تھا۔

مہر نے اپنا سر ہاں میں ہلایا۔

"گاڑی کے ٹائر پہ گولی ماری تھی۔" مہر کی آواز کمزور تھی۔اس کے پاؤں میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

"گاڑی میں اور ٹائر موجود ہے؟" احمد نے پوچھا۔مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔پھر احمد نے گاڑی کی ڈِگی کھولی اس میں سے ٹائر نکالا اور کار جیک کی مدد سے ٹائر تبدیل کر لیا۔وہ دوبارہ سے مہر کی طرف بڑھا۔

"آئیں۔" احمد نے اپنا ہاتھ مہر کی طرف بڑھایا۔مہر نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما اور کھڑی ہو گئی۔وہ لنگڑا کے چلتے ہوئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔احمد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیو کرنے لگا۔ اس کا گھر واقعی زیادہ دور نہ تھا۔بس کچھ منٹ کے سفر کے بعد وہ وہاں پہنچ گئے تھے۔

درے نے جب اپنے گھر کے دروازے پہ اپنے بھائی کے ساتھ زخمی سی مہر کو دیکھا تو وہ بہت حیران ہوئی۔مگر اس نے اپنے سوالوں کو تھام کے رکھا۔مہر کا ہاتھ پکڑتے وہ اسے اندر لے کر آئی اور اسے صوفے پہ بٹھایا۔وہ جانتی تھی کہ اسے اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔مہر کا دل اب پوری طرح سے پر سکون ہو گیا تھا۔

ایک درفشاں تھی جسے وہ اپنا لائیف سیور کہتی تھی اور ایک احمد تھا جسے اس نے قرآن سے متعارف کروایا تھا۔وہ ہمیشہ ہی ان دونوں کے مقروض رہنے والی تھی۔یہ گھر بھی اسے اپنا اپنا سا لگتا تھا، وہ دونوں بھی اسے اپنے لگتے تھے۔

"میں جاگنگ کر رہا تھا تبھی میں نے دیکھا کہ کوئی ان پہ حملہ کر رہا تھا۔" احمد نے درے کو خود ہی بتا دیا۔درے بھی سرہلاتے ہوئے فرسٹ ایڈ کٹ کی مدد سے مہر کے پاؤں پہ پٹی کرنے لگی۔

درے مہر کے پاؤں پہ پٹی کر چکی تھی۔

"آپ دونوں کا بہت شکریہ۔مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ اگر آپ نہ آتے تو میرا کیا ہوتا۔" مہر کے دماغ میں ایک دفعہ پھر سے وہ بھیانک منظر لہرانے لگا۔

وہ اس وقت نارمل نہیں تھی۔وہ نارمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔اسے خوف آرہا تھا۔اسے اب اصل معنی میں اندازہ ہوا تھا کہ اس کے دشمن کس قدر خطرناک تھے۔اسے مستقبل کے چیلنجز کا سوچ سوچ کے خوف آرہا تھا۔اسے اپنی بیٹی کے لیے بھی خوف آرہا تھا۔

وہ کتنی مشکل سے اپنی ہمت جمع کرکے کھڑی ہوئی تھی۔۔۔بدقسمتی سے وہ ایک مرتبہ پھر سے ٹوٹنے لگی تھی۔ہاں۔۔۔مہر کو اس واقع نے توڑ کے رکھ دیا تھا۔اس کی روح چکنا چور ہونے لگی تھی۔

"ارے!" درے کھڑے ہوکے بولی۔"احمد نے وہ کیا جو اس صورت میں کوئی بھی انسان کرتا۔تم ٹینشن نہ لو۔بے فکر رہو۔ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" درے نے گرم جوش انداز میں کہا۔

"میں دارچینی اور الائچی والی چائے بنا کے لاتی ہوں۔اور میں نے کباب بھی بنائیں ہیں وہ بھی لاتی ہوں۔" درے مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی۔اس نے ایک نگاہ احمد پہ ڈالی جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ مہر کا دھیان رکھنا۔احمد نے بس مختصر سا سر کو خم دیا۔

احمد نے مہر کے سامنے کرسی رکھی اور اس پہ براجمان ہو گیا۔

"اب آپ بہتر ہیں ناں؟" احمد کے انداز میں کچھ رازدارانہ سا تھا۔وہ بہت دھیمی آواز میں مہر سے بات کر رہا تھا۔

"اگر آپ چاہیں تو مجھے سب کچھ بتا سکتی ہیں۔میں شاید آپ کے کسی کام آجاؤں۔" احمد نے آواز بالکل دھیمی کرلی۔وہ مڑ مڑ کے درفشاں کو دیکھنے لگا جو کہ پانی چولہے پہ گرم کرتی نظر آرہی تھی۔

"میں نے پولیس کو بتایا تو انہوں نے میرا یہ حال کیا ہے۔اگر آپ کو بھی بتا دیا تو میرا کیا ہوگا؟" مہر کی آواز لرز رہی تھی۔

"پولیس بکی ہوئی ہوتی ہے۔آپ کو پہلے ہی انہیں کچھ نہیں بتانا چاہئے تھا۔لیکن شاید آپ مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہیں۔" احمد نے اپنی آواز کو اور بھی دھیما کر لیا جیسے وہ نہ چاہتا ہو کہ درفشاں کے کانوں تک اس کی گفتگو جائے۔اس کے انداز میں کچھ مضطرب سا تھا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" مہر کے دل کو رسی لگنے لگی۔کیا وہ اسے سب بتا دے؟

مہر کا دل بھرنے لگا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔وہ آنسو پونچھنے لگی مگر آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔احمد کے دل کو اس روتی لڑکی کو دیکھ کر کچھ ہوا۔"میرا سب چھن رہا ہے۔سب برباد ہورہا ہے۔اتنے عرصے بعد میں اپنی زندگی سے خوش ہو رہی تھی اور اب یہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔"وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔مہر کافی ہلکان ہو گئی تھی۔اسے اپنی توانائی ختم ہوتے محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہیں۔" احمد نہایت نرمی سے بولا تھا۔ مہر نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں منتظر سا تاثر لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں کچھ تھا، اس کی صحبت میں کچھ تھا، کہ وہ پھر سے مطمئن ہونے لگی تھی۔ اسی لمحے، مہر نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

کچھ دیر لگی، تقریباً پانچ منٹ، مہر نے احمد کو سب بتادیا، کہ کوئی اسے دھمکی دینے آیا، ہیروں کا کھیل، اس نے وہ کہانی بھی احمد کو سنائی جو شمس نے اسے سنائی تھی۔ احمد غور سے سب کچھ سنتے گیا۔ بہت ہی زیادہ غور سے۔۔۔ ہر ایک ایک تفصیل کو اس نے اپنے دماغ میں مقید کر لیا تھا۔

"آپ بالکل پر سکون ہو جائیں۔ ٹھنڈے دماغ سے حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔" احمد نے مہر کے بات ختم کرنے کے کچھ دیر بعد کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میرا بال بال جکڑا ہوا ہے۔" مہر کی آواز میں بے بسی تھی۔ وہ ہار ماننے لگی تھی۔

"ایسا نہیں ہوتا۔ ہر چیز کا حل ضرور ہوتا ہے۔ آپ ذرا ایک دفعہ دماغ پہ زور ڈالیں۔ ہر ایک ایک زاویے کا سوچیں۔ وہ ہیرے کہاں ہو سکتے ہیں؟ کوئی خفیہ کمرہ؟ کوئی خفیہ گھر؟ کوئی خفیہ ہوٹل؟ زور ڈالیں اپنے ذہن پر۔ مجھے یقین ہے سب کچھ واضح ہونے لگے گا۔" احمد سمجھانے والے انداز میں بولا۔

احمد کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے مہر کسی گہرے خیال میں چلی گئی۔وہ اپنے دماغ پر زور ڈالنے لگی کہ کوئی ایسی جگہ اسے یاد آجائے۔اس کے چہرے پہ سوچنے کے باعث الجھن بھی تھی۔یک دم چہرے پر سے الجھن فنا ہوئی۔اس کی آنکھوں میں امید در آئی۔

"ایک ہوٹل ہے۔" مہر کی آواز میں امید تھی۔"سرینا ہوٹل۔میرے ڈیڈ وہاں جاتے تھے۔میں کی کارڈ ان کے کمرے سے ڈھونڈ لوں گی۔شاید وہ ہیرے ادھر ہی ہوں۔" احمد کے چہرے پہ فاتحانہ سی مسکراہٹ بکھری۔

"ٹھیک ہے۔ہم کل صبح ہی وہاں چلیں گے۔"احمد نے سرسری سا کہا۔مہر چونکی۔ کیا اس نے "ہم" بولا تھا یا اس کے کان بج رہے تھے؟

"ہم؟" مہر بے اختیار بولی۔

"دیکھئے،میں تو آپ کی مدد کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔"احمد کے انداز میں مصنوعی سی خفگی تھی۔مہر فوراً سے سر نفی میں ہلانے لگی۔وہ قطعاً احمد کو خائف کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"مہر نے تیزی سے کہا۔اس نے آگے بھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"ٹھیک ہے۔میں کل صبح آجاؤں گا۔" احمد نے مہر کو کچھ آگے بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے کہا۔مہر کے الفاظ اس کے حلق میں ہی پھنسے رہے۔وہ کیوں آخر اس کی مدد کرنا چاہ رہا تھا؟ اسے بھلا اس سب سے کیا ملنا تھا؟ وہ مشکوک ہونے لگی تھی۔

کچھ دیر بعد درے چائے کے ساتھ گرما گرم کباب لے کر ان کی طرف آئی۔مہر کو اس نے زبردستی سارے کباب کھلائے اور چائے بھی پوری پینے پہ مجبور کی۔پھر وہ احمد کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ گئی۔احمد ڈرائیونگ سیٹ پہ تھا اور مہر پیچھے بیٹھی تھی۔

گاڑی اب اسلام آباد کی سڑکوں پہ رواں تھی۔

"آپ کو یہ، ہیرے والی کہانی جو سنائی گئی ہے آپ کو اس پہ یقین ہے؟" احمد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"مجھے شک ہے کہ وہ لوگ بہت کچھ چھپا رہے ہیں، اور غلط بیانی بھی کر رہے ہیں۔" مہر جواباً بولی۔

"بالکل۔ایسا ہی ہے۔" وہ پر اعتماد سا ہو کے بولا تھا۔مہر نے آنکھیں چھوٹی کیں۔وہ آخر اتنے یقین سے ایسے کیسے کہہ سکتا تھا؟

"پولیس نے تفتیش کی تھی، آپ اس تفتیش کا احوال بتانا چاہیں گی؟" احمد نے محتاط انداز میں پوچھا۔وہ کب سے پولیس کی تفتیش کی تفصیلات جاننا چاہ رہا تھا اور آخر کار اسے موقع مل ہی گیا تھا۔مہر کو اب بھی احمد کی اس کیس میں اتنی دلچسپی سمجھ نہیں آرہی تھی مگر اس نے اپنے شک و شبہہ کا اظہار نہیں کیا۔

”ڈیڈ نے ڈرائیور کو بیچ راہ میں اتارا۔اس کا ثبوت ہے کیونکہ سی سی ٹی وی فوٹیج میں ایک جگہ پہ ڈرائیور گاڑی سے باہر نکلا تھا۔ڈرائیور نے پولیس کو بتایا کہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ اس طرح سے اسے اتارا کرتے تھے۔ڈیڈ پھر اس سوسائیٹی میں گئے جہاں۔“ مہر نے ضبط کے گھونٹ اندر اتارے۔اپنے آپ کو رونے سے اس نے ایک بار پھر روکا۔”انہیں مار دیا گیا۔“

”کچھ شہادت اور ثبوتوں کے تحت یہ بھی پتا چلا ہے کہ ڈیڈ وہاں پہلے بھی کافی مرتبہ جا چکے تھے۔“

”دلچسپ۔“ احمد نے زیر لب تبصرہ کیا۔”اب آپ سوچیں کہ، آخر اس عمارت میں ہی انہیں کیوں مارا گیا؟

کوئی اور طریقہ کیوں نہیں اپنایا گیا؟“ مہر الجھ گئی۔اسے اس وقت کچھ خاص سمجھ نہیں آرہا تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ اس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔احمد کے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ بکھری۔

”امکان یہ ہے کہ یہ ہیرے والی کہانی جھوٹ ہو۔میں عبداللہ سلطان کو جانتا ہوں۔وہ ایک شاطر بزنس مین ہیں، وہ کبھی بھی یوں قرضہ نہیں لے سکتے۔جو آپ کو کہانی سنائی گئی ہے وہ کمزور ہے۔وہ سینس نہیں بنا رہی ہے۔مجھے لگتا ہے کہ عبداللہ سلطان نے وہ ہیرے چرائے تھے، مگر قرضے سے بچنے کے لیے نہیں، کوئی اور وجہ ہوگی۔یہ قرضہ بعد میں پلانٹ کیا گیا ہوگا، تاکہ آپ کو پھنسایا جائے، اور آپ کو دبایا بھی جائے۔آپ کے حریف کو کم سے کم کہانی تو تگڑی لے کر آنی چاہیے تھی۔“ احمد زیر لب ہنس دیا۔جب اس نے ”آپ کا حریف“ بولا تو اس کی آواز میں بھرپور نقاہت تھی۔

"کیا اصل کہانی جاننا ضروری ہے۔" مہر نے پوچھا۔وہ احمد کی ذہانت سے متاثر ضرور ہوئی تھی۔اسے اب اس کی مدد لینا ایک اچھا آئیڈیا لگنے لگا۔

"کچھ حد تک۔لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو صرف ہیرے کے لیے تنگ نہیں کر رہے۔کچھ اور بھی ہے جو انہیں آپ سے چاہیے۔یہ سارے صرف اندازے ہیں۔میری ایک دوست کہا کرتی تھی کہ تفتیش کرتے وقت ایسے بیشتر اندازے لگائے جاتے ہیں۔اور پھر اپنے اندازوں کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔میں بھی یہاں اندازے لگا کے ہماری تفتیش کا سانچا تیار کر رہا ہوں۔" چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائے، آنکھوں میں ذہانت کا عکس لیے، وہ لاپرواہ سے انداز میں بولا۔مہر کو ایک طرف احمد کے اچانک اس سب میں کودنے پہ کچھ کھٹک رہا تھا دوسری طرف احمد کی اتنی دلچسپی اس کے لیے تسلی بخش بھی تھی، کم سے کم وہ اکیلی نہیں تھی۔

کچھ دیر سفر خاموشی میں کٹا اور پھر وہ دونوں قصر پہنچ گئے۔مہر اور احمد دونوں ہی گاڑی سے اترے۔

"ٹھیک ہے۔ہم کل ملتے ہیں۔" احمد مدھم سا مسکرایا۔مہر پھیکا سا مسکرائی۔اس کے لیے احمد کا کردار ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مشکوک تر مشکوک ہونے لگا تھا۔

"میں ڈرائیور کو بھیجتی ہوں، وہ آپ کو ڈراپ کر دے گا۔" مہر تکلفانہ انداز میں بولی۔

"نہیں، میں یہاں سے ٹیکسی لے کر چلا جاؤں گا۔" احمد نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

"اب رہنے دیجئے۔ کہاں اتنی رات کو خوار ہوں گے۔اب اتنا تو میں آپ کے لیے کر سکتی ہوں۔آپ یہیں انتظار کریں میں ابھی ڈرائیور کو بھیجتی ہوں۔" مہر نے نرمی سے کہا تو احمد نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔مہر مڑ کے قصر کے اندر قدم رکھنے لگی۔

احمد اسے اپنی نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔۔۔

اس کے چہرے کے تاثرات سخت پڑے،

اس کی آنکھوں میں سے انگارے برسنے لگے،

وہ اسے مل گئی تھی،

آخری کنجی،وہ آخری پزل پیس،

وہ جس کی تلاش میں تھا،

مگر اس نے تو اب تک یہ تلاش شروع نہ کی تھی۔۔۔؟

پھر وہ بیٹھے بٹھائے اسے کیسے مل گئی؟

کیا خدا نے احمد کو چن لیا تھا، کہ وہ اب یہ کام سر انجام دے؟

وہ کام جو کہ احمد پچھلے تین سالوں سے کرنا چاہ رہا تھا۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ تقریباً تیرہ سال کی لگتی تھی۔اس کے دل میں خوف سوار تھا۔اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں تھا۔ چہرے پہ واضح گھبراہٹ تھی۔

وہ ایک ہسپتال کی راہداری پہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ تھامے چلتے جارہی تھی۔چمکتی دمکتی راہداری میں ہر طرف نرسز اور ڈاکٹرز چل رہے تھے۔وہ دہشت ذدہ آنکھوں سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔جیسے ہی کوئی اس کے پاس سے گزرتا وہ چونک جاتی۔اسے دائیں جانب کمرے میں لے کے جایا گیا۔

گھبراہٹ کے مارے وہ پسینے میں بھیگ چکی تھی۔

دروازہ پیچھے سے بند ہوا تو جیسے اس کا دل بھی بند ہوگیا ہو۔اس کے سامنے ایک لیڈی ڈاکٹر کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں ایک موٹا انجیکشن تھا۔وہ اسے مسکرا کے دیکھنے لگی۔مسکراہٹ بہت نرم فطرت کی تھی لیکن پھر بھی یہ مسکراہٹ اس پہ ہیبت طاری کر گئی تھی۔

”ڈرو مت۔کچھ نہیں ہوگا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے مسکرا کے کہا۔

جوں ہی مناج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے کمرے میں پایا۔اس کی پیشانی تر تھی۔وہ پسینے میں ڈوب چکی تھی۔اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔وہ اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔اس نے اپنا لیمپ جلایا۔سائڈ ٹیبل پہ پڑے جگ کو لبوں سے لگائے وہ تیزی سے پانی اپنے اندر اتارنے لگی۔اس کی سانسوں کو ربط ملنے میں کچھ دیر لگی تھی۔

”کیا اس سب کو روکا نہیں جا سکتا؟ کیا ان درندوں سے نجات پانے کا کوئی راستہ نہیں؟“

حسام کا وہ قول اس کے دماغ میں گونجا اور تبھی مناج کے دماغ میں ایک خواب نے جنم لیا۔انوکھا عزم

اس کے دل کی زینت بنا۔اپنے اوپر سے چادر اتارتی وہ بستر سے اٹھی۔اس نے اپنے کمرے کی بتیاں جلائیں۔اس نے اپنے الماری کا رخ کیا اور اس میں سے ایک نوٹ بُک اور ایک بڑا مارکر نکالا۔اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔اس نے اپنے ٹیبل پہ نوٹ بک رکھی اور اسٹڈی ٹیبل کے سرہانے کرسی پہ بیٹھ گئی۔

وہ نوٹ بوک کے خالی صفحے کو گھورے جارہی تھی۔اسے جیسے اپنے آپ پہ یقین نہیں آرہا تھا۔وہ جانتی تھی کہ اگلا قدم بڑھانے کے بعد واپسی نا ممکن ہوگی۔

آخرکار اس نے لکھنے کا فیصلہ کیا۔۔۔

اس نے مارکر سے اس پہ لکھنا شروع کیا۔اس نے نوٹ بک کے سفید صفحے پہ یہ سب لکھا:

"پراجیکٹ حرر"

(Project Harar)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ٦: قسم ہے فجر کی

قسم ہے فجر کی

اور دس راتوں کی

اور جفت اور طاق کی

اور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو

کیا اِس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا

اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ

جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟

اور میخوں والے فرعون کے ساتھ؟

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی

اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا

آخرکار تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا

حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا

اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا

ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے

اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے

اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو

اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو

ہرگز نہیں، جب زمین پے در پے کوٹ کوٹ کر ریگ زار بنا دی جائے گی

اور تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا اِس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے

اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا!

پھر اُس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں

اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں

(دوسری طرف ارشاد ہو گا) اے نفس مطمئن!

چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے

شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں

اور داخل ہو جا میری جنت میں

(سورۃ فجر)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صبح کا موسم کافی خوشگوار تھا۔سال موسم سرما کی طرف پرواز کر رہا تھا اس لیے آج کل صبح کافی خوشگوار سی ہوتی تھیں۔ہلکی ہلکی، ٹھنڈی ہوائیں اسلام آباد پہ سوار تھیں۔ آوارہ پتے ہوا کے بہاؤ پہ ناچتے نظر آتے تھے۔درخت بھی ہواؤں کے گیت پہ رقص کر رہے تھے۔

وہ اس شاندار سے قصر کے باہر اپنی کلٹس پارک کیے کھڑا تھا۔کوہنی کلٹس کی چھت پہ ٹکائے، وہ مہر کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے خاکی رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔کوٹ کے بٹنز کھلے ہوئے تھے۔اندر سے اس کی سفید شرٹ نظر آتی تھی اور میرون ٹائی بھی۔کوٹ بے شکن تھا۔خاکی رنگ کی پینٹ بھی بالکل بے شکن تھی۔اس نے اپنی آنکھوں پہ کالا چشمہ لگایا ہوا تھا۔

احمد اپنی اسمارٹ واچ پہ وقت دیکھنے لگا۔وہ انتظار کر کر کے بیزار سا ہو چکا تھا۔ٹھیک اسی وقت مہر قصر کا سبزہ زار کراس کر کے باہر آئی۔اس نے خاکی رنگ کی فراک پہنی ہوئی تھی۔سر پہ بندانا لگا کے شمس کے دیئے ہوئے زخم کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔بندانہ کا رنگ لال تھا۔کمر میں ایک لال بیلٹ کسی ہوئی تھی۔پاؤں میں اس نے لال ہیلز پہنی ہوئی تھی۔چہرے پہ بہت ہی ہلکا سا میک اپ تھا۔وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔۔۔مگر اس کا چہرہ۔۔۔اس میں رنج اور غم بھرا ہوا تھا۔اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔آنکھوں کے نیچے ہلکے گواہی دیتے تھے کہ وہ رات بھر روئی تھی۔اس

کے چہرے پہ اس کے اندر بسی مایوسی عیاں ہوتی تھی۔وہ رات کے واقع کے بعد مایوسی کے بادلوں پہ قدم رکھ چکی تھی۔

احمد مہر کی طرف بڑھا۔مہر کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ در آئی۔

”چلیں؟“ احمد مدھم سا مسکرایا۔”گاڑی کی چابی؟“ احمد نے پوچھا تو مہر نے اس پہ سوالیہ نگاہیں ڈالیں۔

”آپ لنگڑا رہی ہیں۔مجھے یقین ہے آپ کے زخم اب بھی پوری طرح سے نہیں بھرے۔اس لیے میں نے آپ سے چابی مانگی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں سوالیہ سا تاثر دیکھ کر احمد خود سے ہی وضاحت دینے لگا۔مہر نے سر اثبات میں ہلایا اور احمد کو اپنی مرسڈیز کی چابی پکڑا دی۔دونوں مرسڈیز میں سوار ہو گئے۔

کالی مرسڈیز، اب اسلام آباد کی کشادہ اورصاف ستھری سڑکوں پہ رواں تھی۔اتوار کا دن تھا، اور وقت بھی صبح کا تھا اس لیے سڑکوں پہ رش نہ ہونے کے برابر تھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے وہ ہیرے اُدھر ہی موجود ہوں گے؟“احمد نے خاموشی کو توڑنا چاہا۔

”وہ اگر وہاں پہ نہ ملے تو مجھے نہیں پتا میں انہیں کہاں تلاش کروں گی۔“گہری آہیں بھرتے وہ بولی تھی۔اس کے اندر بسی نا امیدی اس کے انداز اور اس کے الفاظ سے صاف نمایاں تھی۔وہ اندر ہی اندر اپنی ہار تسلیم کر چکی تھی۔وہ اندر ہی اندر یہ مان چکی تھی کہ وہ برباد ہو گئی ہے۔

”ویسے ایک بات پوچھوں؟“ مہر کچھ دیر بعد بولی۔احمد نے سرسری انداز میں ”ہنہہ“ کہا۔

”میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ آپ کے لیے اتنی اہمیت کا حامل کیوں ہے؟ مطلب کوئی نہ کوئی تو وجہ ہوگی ناں کہ آپ یوں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے میری مدد کر رہے ہیں۔“ مہر بہت محتاط سے انداز میں ٹھہر ٹھہر کے بولی تھی۔وہ رات سے اس بارے میں سوچ جارہی تھی۔اب اسے پرواہ نہیں تھی، برا لگے تو لگتا رہے، مگر وہ بھی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھی۔

”کیا وجہ جاننا ضروری ہے؟“احمد نے مختصر وقت کے لیے رخ مہر کی طرف کیا اور لا پرواہ سے انداز میں بولا۔مہر نے سوچتی آنکھوں کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

”اگر آپ آگے بھی میری مدد کرنا چاہتے ہیں تو مجھے لا علم نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ سپاٹ انداز میں بولی تھی۔

احمد مسکرا دیا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، میں کیوں کر رہا ہوں آپ کی مدد؟“ احمد کندھے اچکاتے بولا۔”آپ نے یقینا کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا، کوئی نہ کوئی اندازہ لگایا ہی ہوگا۔بتانا چاہیں گی؟“ مہر نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”مجھے لگتا ہے کہ کہیں نہ کہیں، میرے دشمنوں نے آپ کو ماضی میں چوٹیں پہنچائی ہیں۔مجھے یہ بھی شک ہے کہ آپ ان سب کو پہلے سے جانتے ہیں۔وہ آپ کے مجرم ہیں احمد۔ایسا ہی ہے ناں؟“ مہر کے چہرے پہ سنجیدگی تھی۔وہ جواب طلب نگاہوں سے احمد کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے کے تاثرات تن گئے تھے۔چہرے پہ اب سنجیدگی تھی۔اس نے گہری سانس خارج کی۔

”وہ لوگ میرے بھائی کے مجرم ہیں۔بس، میں آپ کو فی الحال اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔اگر میں پوری بات بتانے لگا تو ہم باتیں ہی کرتے رہ جائیں گے اور کام کوئی نہیں ہو سکے گا۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے بولا تھا۔مہر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔اس نے احمد کے چہرے پہ تکلیف دیکھ لی تھی۔جب وہ اپنے بھائی کے بارے میں بات کر رہا تھا، حالانکہ صرف ایک جملہ ہی کہا تھا، اور تکلیف بھی چہرے پہ بس ایک لمحے کے لیے ہی نمایاں ہوئی تھی، مگر مہر وہ تکلیف بھانپ چکی تھی۔اس نے آگے سے کچھ بھی نہ پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

”ویسے آپ کافی خوش قسمت ہیں۔“ مہر نے ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لیے موضوع بدلنا چاہا۔”آپ کو در فشاں جیسی میچور اور سمجھدار بہن ملی ہے۔“ وہ متاثر سے لہجے میں بولی۔

ایک دم سے گاڑی احمد نے پیومنٹ کی طرف بڑھائی اور زور دے کے بریک دبایا۔ گاڑی نے زور دار جھٹکا کھایا، مہر کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔وہ پریشان حالی سے احمد کو دیکھنے لگی جو کہ لبوں کو بھینچ کر ہنسے جارہا تھا۔ہنس ہنس کے اس کے گال سرخ پڑنے لگے تھے۔مہر کچھ غیر آرام دہ سی ہو گئی۔

”آپ ایک دفعہ اس میچور اور سمجھدار کو شاپنگ کرتے ہوئے دیکھ لیں۔“ وہ اپنی ہنسی قابو کرتے بولا۔

”آپ کے خیالات کو بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے ہنسنے لگا۔مہر کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ آگے سے کیا کہتی۔

باقی کے سفر میں دونوں کے مابین کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔مہر بھی کچھ متذبذب سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سرینا ہوٹل پاکستان کا ایک عالی شان ہوٹل ہے۔اس کی عمارت وسیع و دراز سی زمین پہ تعمیر کی گئی ہے۔رات کے وقت یہ اپنے باہر کی بتیوں کی وجہ سے اور بھی خوب صورت اور پر تعیش نظر آتا ہے۔دن کے وقت بھی اس کی خوبصورتی کچھ کم نہیں ہوتی۔آتے ہی یہاں پر بڑے بڑے فانوس اور ستون نظر آتے ہیں جن پر آف وائٹ رنگ اور لکڑی کے ٹیکسچر والا ڈیزائن ہے۔عمارت پر بھی آف وائٹ کام ہے اور جگہ جگہ لکڑی کے ٹیکسچر والے ڈیزائن ہیں۔یہ اس ہوٹل کی تھیم ہے۔ہر چیز آف وائٹ اور جگہ جگہ لکڑی کے ٹیکسچر والے ڈیزائن ہیں۔

احمد نے گاڑی ویلے کو پارک کرنے کے لیے دے دی اور پھر دونوں سبزہ زار پہ بنے راستہ پر چلتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔سبزہ زار بہت ہی دل کش تھا اور گھاس کو نہایت خوبصورتی سے کاشت کیا گیا تھا۔

مہر نے ریسیپشن پہ اطلاع دی، کچھ معلومات بھی لیں اور احمد کے ساتھ اوپر چلے آئی۔عبداللہ سلطان کا کمرہ ہوٹل کی تیسری منزل پہ تھا۔

ہوٹل کا کمرہ کافی خوبصورت اور وسیع تھا۔دیواروں پہ آف وائٹ پینٹ تھا اور ہلکا سا ٹیکسچر بھی تھا۔ چھت پہ لکڑی کے ڈیزائن والی فالس سیلنگ لگی ہوئی تھی۔کمرے میں ایک بڑا سا بیڈ تھا۔بیڈ کے سامنے والی دیوار پہ ٹی وی تھا۔ٹی وی کے نیچے ہی ایک ٹیبل تھا جس پہ درازیں بنی ہوئی تھیں۔

”چلیں۔شروع کرتے ہیں۔“ وہ پرجوش سا ہو کے بولا۔اس نے اپنا کوٹ اتارا اور کرسی پہ اسے ٹانگ

دیا۔احمد اور مہر دونوں ہی چھان بین کرنے کے لیے تیار تھے۔ٹھیک اسی وقت مہر کا موبائل بجا۔احمد کے چہرے پہ شکی سا تاثر ابھرا۔کمر پہ ہاتھ باندھے وہ مہر کی جانب بڑھا۔

”فون اسپیکر پہ رکھیں۔یاد سے، بتانا نہیں ہے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔“مہر نے سوالیہ نگاہیں احمد پہ ڈالیں۔بھلا شمس کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے؟ اس نے سوچ کے سر جھٹک دیا۔

”کیسی ہو مہر؟“ شمس کی خشک آواز میں کمینگی گھلی ہوئی تھی۔”کل تو تم بچ گئی، مگر یاد رکھنا ہمیشہ نہیں بچو گی،اس لیے احتیاط کرنا۔“ بات کا آغاز اس نے دھمکی سے کیا۔مہر کے دماغ میں رات کا خوف ناک منظر لہرانے لگا۔اس کی آنکھوں میں صدمہ پھیلنے لگا۔اس نے گہرا سانس باہر نکالا۔

احمد سب غور سے سن رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔اگر کچھ اور بات نہیں ہے تو میں فون رکھ رہی ہوں۔مجھے بہت کام ہیں۔“ مہر کا انداز تلخ سا تھا۔

”سرینا ہوٹل میں ہو نا تم؟“ شمس نے جیسے ہی کہا مہر کے اوپر جیسے ٹرین آ کے گزر گئی۔

”وہاں کیا کام تمھیں؟“ شمس کا لہجہ مشکوک تھا۔

مہر کے چہرے کے تاثرات تن گئے۔آنکھوں میں حیرانگی پھیلی۔اس نے احمد کے اوپر نظر ڈالی جو کہ بالکل پر سکون تھا۔اس نے ہاتھ سے مہر کو اشارہ کیا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ پر سکون ہو کے اس کی بات کا جواب دیں۔مہر نے بھی اپنے آپ کو کمپوزڈ رکھنے کی کوشش کی۔

”میں بس ایک بریک لینا چاہ رہی تھی۔کیا یہ بھی نہیں کر سکتی؟“ مہر اکتاتے ہوئے بولی تھی۔

”ٹھیک ہے۔اور ہاں، اپنے ڈیڈ کے آفس کے لاکرز دیکھ لینا۔ان میں شاید تمہیں ہیرے مل جائیں۔“ مہر کے چہرے پہ لاعلمی ابھری۔

”کون سے لاکرز؟“ مہر نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

”یہ تو تمہیں ہی پتا ہوگا۔دماغ پر زور ڈالو۔کوئی لاکرز ہوں گے۔“ مہر دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے کچھ یاد کرنے لگی۔اور جوں ہی اسے یاد آیا۔

”میں دیکھ لوں گی۔اب کال رکھ دوں میں؟“ مہر کو شمس سے کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔

”اپنی ادائیں کسی اور کو دکھانا۔رات والا واقعہ دوبارہ نہ دہرایا جائے کہیں۔“ برہمی سے کہتے ہوئے شمس نے کال کاٹ دی۔

کچھ سوچتے ہوئے احمد بیڈ پہ بیٹھ گیا۔اپنی ٹھوڑی کھجاتے وہ کچھ سوچنے لگا۔مہر مضطرب سی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔وہ لوگ اس کے قدم قدم کی خبر رکھے ہوئے تھے۔پریشانی کے عالم میں وہ اپنی کنپٹی سہلانے لگی۔

وہ رک کے سوچتے احمد کی طرف مڑی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہے ہیں؟“ مہر کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

احمد کا ٹھوڑی کھجاتا ہاتھ تھم گیا۔اب اس نے نظر اٹھا کے مضطرب سی مہر کو دیکھا۔اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔وہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا اور ٹیبل تک گیا۔اس نے دراز کھولی اور دراز میں متلاشی نگاہیں گھمانے لگا۔اسے اندر ایک پین نظر آیا۔اس نے پین کے ڈھکن والے حصے کو اپنی پچ کی

انگلی اور انگوٹھے سے تھام لیا۔ دراز بند کر کے وہ پین کو ٹیبل پہ گول دائرے کی صورت گھمانے لگا۔ اس نے اب نظریں مہر پہ ڈالیں۔

مہر کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ احمد کیا کرنا چاہ رہا تھا۔اس کے چہرے پہ گہری الجھن تھی۔

''یہ چشمے۔آپ جانتی ہیں میں انہیں کیوں پہنتا ہوں؟'' وہ اس وقت اتنا عجیب سا سوال کیوں پوچھ رہا تھا؟ احمد گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مہر کی سمجھ سے بالاتر ہوتے جا رہا تھا۔

''دھوپ سے بچنے کے لیے؟'' مہر متذبذب سی ہو کے بولی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا یہ گفتگو کس رخ جارہی تھی۔احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''یہ چشمے مجھے بغیر کسی مداخلت کے ہر طرف دیکھنے کی آزادی دیتے ہیں۔'' مہر نے اپنی آنکھیں چھوٹی کیں اور ناک سکوڑی۔

''میرا سوال اب تک وہیں ہے۔'' مہر اسپاٹ لہجے میں بولی۔احمد کا ٹیبل کی سطح پہ پین گھماتا ہاتھ تھم گیا۔اس نے اپنی انگلیوں کی گرفت پین پر سے ڈھیلی کی تو پین اوندھا ہو کے ٹیبل پہ گرا، ٹیبل پہ گھومتے گھومتے وہ ٹیبل کی سرحد پار کر کے زمین پہ گر گیا۔زمین پہ گرنے سے ایک آواز بھی پیدا ہوئی تھی۔

''گاڑی چلاتے ہوئے، راستہ میں مجھے کم سے کم بھی تین گاڑیاں ایسی نظر آئیں تھیں جو کہ بے مقصد کھڑی ہوئی تھیں۔اب ایسی بہت سی علامات تھیں کہ یہ گاڑیاں تعاقب کرنے کے لیے کھڑی تھیں۔ سب سے پہلے، ہم ایک کچے علاقے سے گزرے تھے، وہاں پہ نئ نویلی سویک کھڑی تھی۔آپ کے

گھر کے راستہ پہ ایک کالی آلٹس بھی نظر آئی تھی جس کے شیشے کھلے ہوئے تھے، میں نے اندر بیٹھے آدمی کا چہرہ دیکھا تھا۔صاف ظاہر تھا وہ کسی چیز کی تلاش میں تھا۔باقی سرینا ہوٹل سے پہلے میں نے ایک گریفائیٹ رنگ کی سٹی دیکھی تھی۔اس کا انجن کھلا ہوا تھا، مگر وہ بے مقصد سی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا گاڑی کے اندر کوئی تھا جو کہ یقینا گاڑی کا اے سی چلا کے بیٹھا ہوا تھا۔یہ سارے اشارے اسی طرف نشاندہی کر رہے تھے کہ آپ کا تعاقب کیا جارہا تھا مہر۔" احمد نے ٹھہر ٹھہر کے بتایا تو مہر کا بڑھتا تجسس تھمنے لگا۔وہ بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"لیکن پھر بھی۔یہ کوئی یقینی علامت تو نہیں۔ہو سکتا تھا وہ لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔" مہر نے اپنی ایک تھیوری پیش کی۔احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔آپ اپنے دشمنوں کی طاقت کو جانتی ہیں۔پولیس میں کمپلین کرنے کے کچھ وقت بعد ہی آپ پہ حملہ کروادیا گیا۔ان کی طاقت کے بارے میں جانتے ہوئے بھی اگر اس سب کو اتفاق سمجھا جائے تو یہ سراسر بے وقوفی ہے۔میرا مشورہ ہے، اپنے دشمنوں کو پہچانیں، انہیں اپنے قریبی دوستوں سے بھی زیادہ اچھی طرح سے جان لیں۔انہیں کورس کی کتاب کی طرح رٹ لیں، اور پھر آپ کو یہ سارا کھیل محظوظ کرنے لگے گا۔" اس کی آواز پر جوش تھی، آنکھوں میں چمک تھی۔

مہر جہاں احمد کی صلاحیتوں سے متاثر ہو رہی تھی وہاں اسے احمد پہ عجب بھی ہورہا تھا۔بھلا اس سب میں محظوظ ہونے والا کیا تھا؟ مہر نے سوچا۔

سچ تو یہ تھا کہ مہر کو احمد کچھ حد تک ٹھٹکنے لگا تھا۔وہ جیسے جیسے اسے جان رہی تھی،اس کا کردار مہر کے لیے اتنا ہی سوالیہ نشان بنتا جا رہا تھا۔

"یہ آفس کے لاکرز۔" فاتحانہ مسکراہٹ کو سمیٹتے، چہرے پہ سنجیدگی لیے، وہ بولا۔"ان لاکرز کے بارے میں سوچتے ہوئے آپ کو اتنا وقت لگ گیا، لیکن آپ کے دشمن جانتے تھے۔اس بارے میں غور کیا؟"مہر کے لب کھلے۔اس نے تو اس بات پہ غور ہی نہیں کیا۔

"اپنے دماغ کو حاضر رکھیں۔یہی باریکیاں ہیں، جو ہمیں ہمارے دشمن کے قریب کرتے جائیں گی مہر۔" احمد نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔مہر نے سر اثبات میں ہلایا اور دماغ پہ زور ڈالنے لگی۔

"یعنی کے۔۔۔دشمن کوئی قریبی ہوگا۔یا کوئی قریبی شخص دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔" مہر نے احمد کو دیکھ کر تصدیق چاہی۔احمد نے بھی سر اوپر نیچے ہلا کے تصدیق کی۔

"بالکل۔آپ کا دشمن کوئی قریبی ہے۔"احمد ٹھہرا۔"اب آپ سوچیں۔کہ یہ قریبی دشمن کون ہو سکتا ہے۔عبداللہ صاحب کا کوئی دوست؟ کوئی گہرا پرانا دوست۔جس سے ان کے اچھے تعلقات ہوں۔ سوچیں سوچیں۔" احمد نے منتظر نگاہیں مہر کے اوپر منجمد کیں۔

"نہیں۔" مہر نے سوچتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔"ڈیڈ ایک بزنس مین تھے۔وہ دوستیاں کم ہی کرتے تھے۔جس سے بھی دوستی ہوتی تھی تو وہ مفاد پرستی کی بنیاد پہ ہی ہوتی تھی۔اس لیے ان کے اتنے سارے مفاد پرست دوستوں میں سے کسی کو تلاش کرنا مشکل ہوگا۔باقی گھر میں صرف نیلوفر ہوتی تھیں۔"مہر کو جس طرح سے یاد آتا گیا وہ بولتی گئی۔احمد کی چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ بکھری، اگلے ہی لمحے اس نے اپنی مسکراہٹ دبائی اور چہرے کو سنجیدہ کیا۔

"نیلوفر؟ کون ہے یہ؟" احمد نے پوچھا۔انداز میں کچھ مصنوعی سا تھا۔

”ڈیڈ کی بیوی تھیں۔ لیکن ہمیں ان پر شک کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مہر نے پر اعتماد ہو کے کہا۔

”مگر کیوں؟ ہم کیوں ان پر شک نہ کریں؟“ احمد مطمئن تھا۔ مہر کو لگا جیسے اس نے نیلوفر کا ذکر کر کے کوئی غلطی کر دی تھی۔

”کیونکہ نیلوفر ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں انہیں اچھے سے جانتی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔“ مہر تحمل سے اس کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ نیلوفر کے لیے کوئی شک و شبہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”لڑکی؟“ احمد نے اچنبھے سے پوچھا۔ مہر کے تاثرات تن گئے۔ یہ آخر اتنی بال کی کھال کیوں ادھیڑ رہا تھا۔ مہر نے سوچا۔

”ہاں وہ صرف بتیس سال کی ہیں۔“ مہر کا لہجہ کوفت زدہ تھا۔ اسے احمد کا نیلوفر پہ شک کرنا بہت برا لگ رہا تھا۔

”اور نیلوفر نے آپ کے ڈیڈ سے شادی کیوں کی؟ یہ بتایئے زرا۔“ مہر نے لب کھولے پھر بند کیے۔ آنکھوں میں احمد کے لیے ناگواری تھی۔

”شاید پیسوں کے لیے۔ لیکن یہ کوئی بہت عجیب بات نہیں، ڈیڈ کی ساری بیویوں نے ہی ان سے پیسوں کے لیے شادی کی تھی۔ لیکن احمد، نیلوفر دل کی اچھی ہیں۔ آپ یہ نہ بھولیں کے ہمارے دشمن ڈیڈ کے قاتل بھی ہیں، اب نیلوفر کو ڈیڈ کے قتل سے کیا ملنا تھا؟“ مہر نیلوفر کو کسی بھی صورت مجرم قرار

دینے پہ تیار نہ تھی۔ وہ نیلوفر کو معصوم ثابت کرنے کے لیے دل ہی دل میں خود کو وضاحتیں دینے لگی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ فی الحال ہم ہیرے ڈھونڈتے ہیں۔" احمد نے بات کو ٹال دیا۔ لیکن اندر سے وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کے لیے نیلوفر کا کردار اب بھی مشکوک تھا۔ مہر بھی یہ اندازہ کر سکتی تھی۔ اسے بہت برا بھی لگ رہا تھا، آخر نیلوفر اتنی اچھی جو تھی۔۔۔ صرف اس کے ساتھ۔

مہر اور احمد نے ہیروں کی تلاش شروع کی۔ انہوں نے درازیں کھنگالی۔ الماریاں پوری کی پوری خالی کر دیں۔ ہر ایک کونا چھان مارا، یہاں تک کہ بستر کے نیچے بھی چھان بین کی، مگر وہ ہیرے تھے کے ملتے ہی نہ تھے۔ مہر تھک ہار کے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ ہی دیر میں رونے لگ جائے گی۔ اس کے چہرے پہ مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے مایوس ہونے لگی تھی۔ وہ بہت امید لے کر یہاں آئی تھی۔ وہ بس ہیرے تلاش کر کے ہر چیز سے فرار چاہتی تھی۔۔۔

احمد نے ہاری ہوئی مہر کو دیکھا تو اس کے چہرے پہ نرم سا تاثر ابھرا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ لڑکی ٹوٹنے لگی تھی۔ کوئی اور بھی ہوتا، تو ٹوٹ جاتا۔

"آپ اتنا مایوس کیوں ہو رہی ہیں؟ آپ کے ڈیڈ کے لاکرز ابھی باقی ہیں۔" احمد نے تسلی بخش انداز اختیار کیا۔ مگر آج، احمد کے الفاظ نے مہر کو تسلی نہ دی۔ وہ اب بھی مایوس تھی۔ وہ اب بھی ہارا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بس جلد از جلد اس دلدل سے جان چھڑانا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ بکھیڑا پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

مہر کو مستقبل کا خوف تھا۔وہ اس طرح سے کیسے زندگی گزار سکتی تھی؟ اسے اپنی بیٹی کی بھی فکر تھی۔ اس پہ اس سب کا کیا اثر پڑے گا بھلا؟تکلیف کے مارے مہر نے آنکھیں میچ لیں۔احمد اب بھی اسے نرمی سے دیکھ رہا تھا۔

”پتا نہیں اور کتنے کمرے اور کتنے لاکرز مجھے کھنگالنے پڑیں گے۔ کیا میری زندگی اسی طرح سے ضائع ہو جائے گی؟“ مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔کالی چمکتی آنکھوں میں بے بسی تھی، تکلیف تھی، رنج تھا، خوف کا عنصر بھی موجود تھا، عدم یقینی بھی چھائی ہوئی تھی۔یہ آنکھیں دیکھ کے احمد کے دل میں کچھ ہوا۔اسے مہر سے ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔

”کیا اپنے ڈیڈ کے گناہوں کا خمیازہ میں اپنی موت تک بھگتنے والی ہوں؟ یہ تو نا انصافی ہوئی نہ احمد۔“ مہر کے اندر جذبات نے جوش لیا تھا۔اس کی آواز میں لاچارگی تھی۔

”کسی کے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہو رہی۔“ احمد مہر کی طرف بڑھا۔وہ نرمی سے بولا تھا۔”سب مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔بلکہ، مسئلے ختم ہونے کے لیے ہی ہماری زندگی میں بھیجے جاتے ہیں۔اس سب کے پیچھے خدا کی حکمت ہوتی ہے مہر۔ہمارا یہ دماغ خدا کی حکمت عملی تک نہیں پہنچ سکتا۔اسی لیے،جو ہے اس کا مقابلہ کریں نہ کے اس طرح سے مایوس ہو کے بیٹھ جائیں۔اس خدا نے ہی آپ کو اس مصیبت میں ڈالا ہے، وہی آپ کو نکال بھی لے گا۔اور ویسے بھی، ہم نے (ہم پر زور دیا) بہت سارے لاکرز کی چھان بین کرنی ہے۔“ آخر میں اس کے چہرے پہ گرم جوش مسکراہٹ بکھری۔ وہ بھی جواباً مسکرانا چاہتی تھی مگر۔۔۔مگر اس کے اندر بسے طوفان نے اسے مسکرانے نہیں دیا۔

وہ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟" احمد نے پیچھے سے اسے پکارا۔

"روف ٹاپ۔میرا دم گھٹ رہا ہے۔" اس کی آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔احمد نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔

وہ تنہا کمرے میں بیڈ پہ بیٹھا رہا۔وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔وہ اس وقت مہر کا ہی سوچ رہا تھا۔اسے افسوس ہورہا تھا۔آخر وہ کس مصیبت میں پھنس گئی تھی۔

وہ اپنے خیالات کو جھٹک کے بیڈ سے اٹھا۔روف ٹاپ جانے کا ارادہ کر کے وہ کمرے سے باہر نکلا۔لفٹ مصروف تھی اس لیے وہ سیڑھیوں سے گیا۔

احمد نے روف ٹاپ کا دروازہ کھولا۔دروازہ کھولتے ہی میٹھی سی خوبصورت آواز اس کے کانوں میں داخل ہو کے رس گھولنے لگی۔آواز کی تاثیر ٹھنڈی تھی۔آواز دل کو اطمینان بخشتی تھی۔

وہ کونے پہ کھڑے ہوئے گم سم ہو کے تلاوت کرے جارہی تھی۔آنکھیں بند تھیں۔وہ اسی طرز پہ تلاوت کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس پہ اس نے احمد کو کرتے سنا تھا۔

وَالۡفَجۡرِ

(قسم ہے فجر کی)

وَلَيَالٍ عَشۡرٍ

(اور دس راتوں کی)

وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ

(جفت اور تاق کی)

وَاللَّيۡلِ إِذَا يَسۡرِ

(ور رات کی جبکہ وہ رخصت ہو رہی ہو)

هَلۡ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجۡرٍ

(کیا اِس میں کسی صاحب عقل کے لیے کوئی قسم ہے؟)

أَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ

(تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا)

مہر کا دل ہلکا پھلکا ہوتا گیا۔یہ آیات اس کے دل پہ اثر کرتی تھیں۔اس کے دماغ پہ چھائی ہر پریشانی اپنا دم توڑتے گئی۔وہ اب قدرے بہتر تھی۔

احمد چہرے پہ نرم مسکراہٹ سجائے اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔وہ بھی یہ تلاوت سن کے محظوظ ہورہا تھا۔وہ بالکل اس کے برابر کھڑا ہوگیا۔اس نے مہر کے چہرے کو دیکھا، چہرہ بالکل پرسکون تھا۔وہ کچھ دیر پہلے والی مایوس مہر کے برعکس لگتی تھی۔

إِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ

(اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ)

الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ

(جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟)

وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ

(اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں؟)

مہر کو اس لمحے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس کی تلاوت کا تسلسل ٹوٹا۔بدمزہ ہو کے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو چہرے پہ پرجوش مسکراہٹ، آنکھوں میں چمک لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔مہر کچھ غیر آرام دہ سی ہونے لگی۔

"سورہ فجر۔کتنی خوب صورت سورہ ہے ناں؟" احمد کی انداز میں دبا دبا جوش تھا۔

"بہت خوبصورت۔" مہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔اب وہ کھل کے مسکرا رہی تھی۔

"آپ نے سورہ فجر کا ترجمہ پڑھا ہے؟" احمد نے مہر سے پوچھا۔

"ہاں میں نے پڑھا ہے۔" مہر نے جواب دیا۔

"ہر سورہ کا ایک موضوع ہوتا ہے۔ایک عام موضوع جس کے ارد گرد وہ سورہ گھومتی ہے۔آپ کو پتا ہے سورہ فجر کا موضوع کیا ہے؟" احمد نے جواب طلب نگاہ مہر پہ مرکوز کی۔مہر سوچ میں پڑ گئی۔اس نے سورہ فجر پڑھی تھی، اس کا ترجمہ بھی، مگر آخر سورہ فجر کا جامع موضوع کیا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔

"نہیں۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔"مگر کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟میں واقعی جاننا چاہتی ہوں۔" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔اب تو اسے کسی بھی حال میں یہ جاننا تھا۔

احمد نے ریلنگ پہ ہاتھ رکھا۔اس کے چہرے پہ چھائی پرجوش مسکراہٹ گہری ہوئی۔وہ بھی مہر کو بتانے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہلکے پھلکے بادل آسمان پہ پھیلے ہوئے تھے۔سورج کی باریک سی کرنیں عافیت زندگی کی اونچی عمارت پہ پڑ رہی تھیں۔ہسپتال میں معمول کی گہما گہمی تھی۔نرسز، ڈاکٹرز اپنے کاموں میں مصروف تھے۔نیلوفر اپنے آفس میں بیٹھی کسی خاتون سے ہنس ہنس کے کلام کرتی نظر آرہی تھی۔اس کے چہرے پہ شائستہ سا تاثر تھا۔

"ابھی حال ہی میں میں نے اپنا گھر لیا ہے۔بہت بڑا اور دلشاد۔آپ بھی آیئے گا کبھی۔یہ گھر میرے لیے جنت

کا دوسرا نام ہے۔یہ میرا محل ہے۔" وہ فخریہ انداز میں اس عورت کو اپنی کامیابی گنوا رہی تھی۔اس عورت کے چہرے پہ متاثر کن سا تاثر تھا۔وہ بھی نیلوفر سے کافی متاثر تھی۔

"ویسے عدت نہیں کرو گی؟ میرا مطلب لوگوں کے سامنے ہی کر لو۔" اس عورت نے کہا تو نیلوفر نے مسکرا کے سر کو دائیں بائیں ہلایا، اور مدھم سا ہنس دی۔

"میں نے اپنے سوشل میڈیاز کچھ عرصے کے لیے بند کر دیئے ہیں،یہی بہت ہے۔میں کون سا کوئی خاص دین پہ عمل کرتی ہوں جو عدت جیسی طویل چیز میں اپنا وقت ضائع کروں۔میرے پاس اور بھی بہت سے اہم کام ہیں۔اب تو مجھے اپنے اگلے خواب پہ کام کرنا ہے۔مجھے اپنے نئے گھر سے بھی بڑا گھر لینا ہے، وہ بھی دبئی میں۔اب اس کے لیے مجھے پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنی ہے۔اب اگر میں عدت جیسی روایت میں، اپنا وقت برباد کرنے لگی تو بھلا کیسے پورا ہو گا میرا یہ خواب؟" نیلوفر مزے سے بولتے گئی۔اس کے انداز میں تکبر کی آمیزش تھی۔

وہ عورت بھی سر اثبات میں ہلانے لگی۔وہ بھی نیلوفر کی بات سے متفق تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سرینا ہوٹل کی چھت پہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔مہر کے بال بھی اڑ کے اس کے ماتھے پہ آرہے تھے۔احمد کے بال

بھی ہوا کے رخ پہ اڑ رہے تھے۔ہلکے پھلکے سرمئی بادلوں تلے، ٹھنڈی ہواؤں کے آغوش میں وہ دونوں بات کرنے میں مگن تھے۔

"ہم جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہمیں اس میں عرب قبائل کی سخافت اور ان کے اخلاقیت کے پس منظر کے بارے میں پتا چلتا ہے۔یہ ایک جیتا جاگتا ثبوت بھی ہے کے قرآن مجید ایک قدیم کتاب ہے جس میں عرصے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔یہی چیز اگر ہم کوئی دوسری قدیم کتاب میں تلاش کریں تو ہمیں اس زمانے کے سخافتی اور اخلاقی پس منظر کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن القرآن پڑھ کے ہمیں اس

کے بارے میں علم ہو جاتا ہے۔سورہ فجر کا موضوع بھی یہی ہے، وہ قدیم عرب کی سخافت اور اخلاقیت کے پس منظر کا ایک تاریک پہلو بیاں کرتی ہے۔ذرا سوچیں، کون سا؟" وہ سادگی سے بولا تھا۔آنکھوں میں چمک برقرار تھی۔چہرے پہ سکوت طاری تھا۔مہر کچھ سوچنے لگی۔

"کون سا؟" مہر کو جب جواب نہ ملا تو وہ بولی۔

"دولت اور دنیا کی لا زوال محبت۔اس زمانے میں یہ قبائل بہت زیادہ دولت پرست اور دنیا پرست ہو گئے تھے۔اور جب کوئی معاشرہ دنیا سے محبت میں مشغول ہو جائے تو وہ بداخلاقیت کو عبور کرنے لگ جاتا ہے۔یہی حال عرب کا بھی تھا۔وہ دنیا کی محبت میں اتنا کھو گئے تھے کہ وہ بد اخلاقی پر اتر گئے تھے۔وہ یتیموں کو دھکے دیتے تھے۔غریبوں کا حق مارتے تھے۔اور آپ سوچیں، جو بندا دولت کے نشے میں چور ہو جائے وہ کیا کیا نہیں کر سکتا؟" احمد خاموش ہوا۔مہر کو بھی سمجھ آنے لگی تھی۔واقعی، آخر اس سے پہلے اس کا اس طرف دماغ کیوں نہیں گیا؟ واقعی سورہ فجر کی آیات اسی طرف نشاندہی کرتی تھیں۔

"ایسے لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ہے نا؟" مہر نے احمد کو دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔احمد نے مدھم سا مسکرا کے سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر سڑک کنارے کھڑی ادھر سے ادھر گاڑیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔سڑک پہ ٹریفک بھرپور رواں تھا۔وہ ٹریفک کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ سڑک پار کرسکے۔سڑک کے اُس پار ایک فلاحی ادارے کی عمارت تھی جس میں اس نے جانا تھا۔

ٹھیک اسی وقت، ایک سیاہ رنگ کا بچہ نیلوفر کی طرف آیا۔اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔اس کے چہرے پر دھول مٹی تھی۔وہ اتنا کمزور تھا کہ اس کے جسم کی ہڈیاں تک اس کے پھٹے کپڑوں سے نمایاں ہوتی تھیں۔وہ بچہ، آنکھوں میں التجائیہ تاثر لیے نیلوفر کی طرف بڑھا۔وہ کوئی پانچ سے چھے سال کا بچہ تھا، غذائیت کی کمی کی وجہ سے اس کا قد بہت چھوٹا رہ گیا تھا۔اس کا قد نیلوفر کے گھٹنوں تک تھا۔

"کچھ دے دیں۔" وہ بھیک مانگنے لگا۔نیلوفر نے ایک حقارت بھری نگاہ اس بچے پہ ڈالی۔دو قدم دائیں مڑ کے وہ اس سے فاصلہ اختیار کرنے لگی۔اسے اس بچے سے گھن محسوس ہورہی تھی۔

بچہ نیلوفر کی طرف بڑھا اور اس نے نیلوفر کے پجامے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔نیلوفر کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس کی آنکھیں طیش سے پھٹنے لگیں۔چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تمہاری جرات!" وہ گلہ پھاڑ کے چلائی اور اسے زور سے لات کھینچ کے ماری۔بچہ سڑک پہ گر گیا، شکر ہے کہ اس وقت گاڑی نہیں تھی ورنہ وہ گاڑی کے نیچے آجاتا۔بچے کی ایڑی کی طرف ایک زخم بھی آگیا تھا۔نیلوفر کو اس بچے کے حال پہ ذرہ برابر بھی ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔

”کچھ دے دیں، ایک ہفتے سے کچھ نہیں کھایا میں نے باجی۔“ بھوک اس بچے کو اتنا بے بس کر چکی تھی کہ اسے اپنی تذلیل یاد نہیں رہی تھی۔ایک دفعہ پھر سے وہ نیلوفر کے سامنے گڑگڑانے لگا۔نیلوفر کا دل اب بھی اس بچے کی طرف سے نرم نہ ہوا۔اس کا پارا اور بھی ہائی ہونے لگا۔

”چلو دفع ہو جاؤ۔“ وہ ہاتھوں سے چٹکی بجاتے بولی تھی۔”تم جیسوں کے ہی پیٹ بھرنے کے لیے رہ گئی ہوں میں۔نکلو یہاں سے۔“وہ اونچی آواز میں تائید کرنے لگی۔بچہ روتے روتے کھڑا ہوا اور لنگڑاتے ہوئے چلا گیا۔ٹریفک تھمی

تو نیلوفر نے سڑک پار کی اور اس عمارت میں داخل ہوئی۔عمارت میں شمس اس کا منتظر تھا۔

وہ بھول گئی تھی کہ ایک وقت میں وہ بھی اس بچے کی جگہ تھی، وہ بھی یوں ہی لوگوں کے سامنے مدد کی بھیک مانگتی تھی۔طاقت اور دولت کے نشے میں دھت ہو کے وہ سب کچھ بھلانے لگی تھی۔اس کا دل سخت ہونے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”دولت سے محبت اور دنیا سے محبت انسان کو اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ وہ اگر نیکی بھی کرتا ہے تو دکھاوے کے لیے۔وہ نیکی بھی صرف اس لیے کرتا ہے کیونکہ اس سے اس کی شان میں اضافہ ہو گا۔میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ابو جہل سے پوچھا گیا کہ کیا محمدﷺ جھوٹ بولتے ہیں؟ تو ذرا سوچیں، کہ اس نے کیا جواب دیا ہو گا؟“ احمد نے مہر سے پوچھا۔

”ابو جہل ہمارے نبی ﷺ کا سب کا بڑا دشمن تھا، تو یقیناً اس نے ہاں میں ہی جواب دیا ہو گا۔ ہے نا؟“ مسکراتے ہوئے احمد سر نفی میں ہلانے لگا۔ مہر کو اس لمحے عجب ہوا۔

”نہیں۔ ابو جہل لاکھ برا انسان ضرور، لیکن وہ غیرت مند انسان تھا۔ اس نے جھوٹ نہ بولا۔ اور اس کا جواب بھی بالکل یاد رکھنے والا ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو، ہمارا بنو ہاشم سے مقابلہ چل رہا تھا۔ انہوں نے کھانا کھلایا ہم نے ان سے بڑھ کر کھانا کھلایا، انہوں نے مہمان نوازی کی ہم نے ان سے بڑھ کے مہمان نوازی کی۔ اب تک، ہم ان سے کندھے سے کندھا ملا کر آ رہے تھے۔ اب اگر ہم نے ان کی نبوت تسلیم کر لی تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم ان کے قیامت تک غلام ہو گئے۔ اور یہ مجھے تسلیم نہیں۔ تو دیکھا آپ نے۔ اس طرح کے ہو گئے تھے عرب۔ دنیا کی محبت میں اتنے چور کے نیکی بھی کرتے تو دکھاوے کے لیے۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ عمارت کے اندر قدم بڑھا رہی تھی۔ شمس اس کے عقب میں تھا۔ نیلوفر کی آنکھوں میں تکبر بھرا تھا۔ سینہ تنا ہوا تھا۔

”نیلوفر میں نے جب انہیں بتایا کہ آپ اتنی بڑی رقم عطیہ کرنے والی ہیں تو یہ لوگ تو خوشی سے پاگل ہی ہو گئے۔“ شمس نے نیلوفر کے کان میں سرگوشی کی۔ نیلوفر مدھم سا ہنس دی۔

”ہونا بھی چاہیے۔“ وہ کندھے اچکاتے بولی۔ ”اچھی سی تصویر بنانا۔ ایک دفعہ عدت کا وقت ختم ہو تو دھوم مچا کے لگاؤں گی۔“ نیلوفر بھنویں اچکاتی بولی۔

”ویسے اس سب کی ضرورت کیا ہے۔مطلب اتنے پیسے ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟“ شمس نے پوچھا تو نیلوفر ہنس دی۔

”تم نہیں سمجھو گے۔یہ انویسمنٹ ہے۔اپنے آپ پر۔اب اگر آئندہ کبھی کوئی سکینڈل وغیرہ بھی آجائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔جہاں ایک بندہ میرے اوپر کیچڑ اچھالے گا وہاں نو بندے میری حمایت کریں گے۔میں سب کی نظروں میں ایک فرشتہ ہوں اس لیے میرے اصل پہ کسی کو شک نہیں ہونے والا۔برائی کا بہترین پردہ اچھائی کرتی ہے۔میں بھی اپنی برائی کا پردہ کر رہی ہوں۔“ نیلوفر کا سینہ اس قدر چوڑا ہو گیا تھے جیسے وہ اپنے اعمال پہ بہت ہی فخریہ ہو۔

”مگر آپ کہتی تھی کہ آپ اپنی برائی کو تسلیم کر چکی ہیں۔پھر بھلا یہ منافقت کس لیے؟“ نیلوفر کے چہرے پہ حقارت بھری مسکراہٹ بکھری۔

”بھلا منافقت سے بھی بدترین،کوئی برائی ہو سکتی ہے؟ میرا درجہ تو ابلیس سے بھی نیچے ہوا ناں شمس۔سمجھے؟“ شمس نیلوفر کو مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔

”بس جلدی کریں۔پھر ہمیں دوبارہ جانا ہے ہسپتال۔آج آپ سب لوگوں کو ایک بہت بری خبر سنانی ہے۔آج عافیت زندگی میں سنسنی پھیل جانے والی ہے۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”تو احمد ان سب کا آخر انجام کیا ہو گا۔“ مہر نے سوال کیا۔احمد کے لیے جواب دینا مشکل نہ تھا۔مہر بھی جواب جانتی تھی مگر وہ پھر بھی اس جواب کو وضاحتوں کے ساتھ سننا چاہتی تھی۔

اللہ نے سورہ فجر میں ہی عرض کر دیا کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔" احمد نے پھر یہ دو آیات پڑھیں:

"وَجِیْءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى

یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ

اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل؟

وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اِس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا"!

یعنی کہ جو معاشرے فاسق ہو جایا کرتے ہیں، ان کا زوال یقینی ہوتا ہے مہر۔اور اس وقت بھی یہی ہوا۔اللہ نے مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم دیا۔جنگِ بدر میں ابو جہل سمیت بڑے بڑے دشمنوں کو مار دیا گیا۔اور پھر بالآخر مکہ کی فتح میں پورا کا پورا مکہ مسلمانوں کے اندر آگیا۔یہی ہوتا ہے مہر، سرکشی کرنے والوں کے ساتھ۔سورہ فجر میں اور بھی مثالیں ہیں۔جیسے فرعون کی۔جو کے ایک سرکش بادشاہ تھا، خدا نے ہمیں اس سورہ میں یاد دلایا کہ اتنی سرکشی کے بعد بھی اس کا کیا انجام ہوا۔اس کے علاوہ اس میں ثمود کی قوم کی مثال ہے، عاد کی قوم کی مثال ہے۔یہ ساری سرکش قومیں تھی۔جو کہ اپنے پیغمبر کو جھٹلا چکی تھیں، اللہ کے پیغام کو جھٹلا چکی تھیں۔اور پھر خدا نے ان کے اوپر عذاب نازل کیا۔یہ انجام ہوتا ہے سرکش لوگوں کا مہر۔بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں تو ضرور انجام ملتا ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر شمس کے ساتھ پھر سے عافیت زندگی پہنچ گئی تھی۔

"سب پہنچ گئے ہیں اور ہمارے منتظر ہیں۔ آج سب کا چین اور سکون تباہ ہونے والا ہے۔" ہسپتال کے بڑے سے حال سے گزرتے شمس بولا تھا۔ نیلوفر کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔

"ایسی کیا خبر ہے شمس؟ مطلب اتنا بھی برا کیا ہو سکتا ہے؟" نیلوفر کا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

"نیچے چلیں، سب بتاتا ہوں۔" دونوں اب چلنے لگے۔ نیلوفر کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"تو احمد اس تاریک زمانے سے آزادی کیسے حاصل کی جائے گی؟" مہر کچھ ڈسٹرب نظر آ رہی تھی۔

"اس کا جواب خدا نے اگلی سورۃ، سورہ بلد میں دیا ہے۔ اس میں خدا فرماتا ہے کہ دو نمایاں راستے ہیں، مگر معاشرہ عقبہ کے راستے پر نہیں گیا۔ کیا آپ جانتی ہیں عقبہ کیا ہے؟" احمد نے پوچھا۔ مہر نے سر نفی میں ہلایا۔

"عقبہ کا مطلب ہے دشوار گزار گھاٹی۔ اور آپ کو پتا ہے کہ یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟" مہر نے ایک بار پھر گردن نفی میں ہلائی۔

"اللہ تعالی آگے کی آیت میں عقبہ کو واضح کرتا ہے۔ عقبہ کا راستہ وہ ہے جس میں ہم، ایمان لانے والوں کے ساتھ مل جائیں۔ ان لوگوں کے ساتھ مل جائیں، جنہوں نے رحم اور صبر کی تلقین کی۔ اور پھر غلاموں کو آزاد کریں، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ اور اس طرح سے ہم عقبہ پر چل سکتے ہیں۔ اور عقبہ سے گزر کر ہی ہم معاشرے کی اس پستی کو ختم کر سکتے ہیں۔"

"یعنی اتحاد حل ہے۔اتحاد اور معاشرے میں بسی برائی سے جنگ کا عزم۔بس؟" مہر نے تصدیق چاہی۔

"بالکل، ایک معاشرے میں، کسی بھی قسم کی برائی کو ختم کرنے کے لیے اتحاد کا ہونا ضروری ہے۔اکیلا انسان کبھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔" مہر کو بھی بات سمجھ آگئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر اور شمس نے ہسپتال کا بڑا سا حال کراس کیا۔تمام نرسز اپنے کام پر لگی ہوئی تھیں۔تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک گول زینہ نمودار ہوا جسے انہوں نے عبور کیا۔زینہ اترتے ہی کچھ کمرے سامنے عیاں ہوئے۔وہ لوگ اسٹور روم میں چلے گئے۔نیلوفر نے اندر آتے ساتھ ہی کمرے کی بتیاں جلائیں اور پیچھے سے دروازہ بند کیا۔وہ اسٹور روم بہت بڑا تھا۔دائیں بائیں دیواروں پہ شیلف لگے ہوئے تھے، جن پہ میڈیکل سپلائیز سجائی ہوئی تھیں۔بالکل سامنے والی دیوار پہ بڑی سی لیڈی اقتدار کی تصویر لگی تھی جس کا سائز ایک دروازے جتنا تھا۔وہ دونوں قدم بڑھاتے بڑھاتے اس تصویر تک گئے۔نیلوفر نے اس تصویر کو کسی سلائڈنگ ڈور کی طرح کھسکایا۔تصویر کے ساتھ ہی ایک پینل لگا ہوا تھا جسے نیلوفر نے کھولا۔اس میں کیز لگی ہوئیں تھیں جن پہ انگریزی نمبر شمار جڑے ہوئے تھے۔نیلوفر نے کیز دبائی تو ایک لفٹ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ اوپر آنے لگی۔

نیلوفر اور شمس اس لفٹ میں سوار ہوئے اور اس تصویر کو جگہ پر درست کرنے لگے۔لفٹ بس کچھ ہی سیکنڈ کے لیے نیچے اتری اور پھر رک گئی۔لفٹ کا دروازہ کھلا تو ان کے سامنے وہ حال نمایاں ہوا۔یہ وہی تھا۔۔۔عافیت زندگی کا خفیہ حال۔

چمکتے دمکتے حال کی سامنے والی دیوار پہ تین دروازے تھے۔وہ دائیں طرف بنے دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگے۔دروازہ کھولا تو لیڈی اقتدار اور درانی اپنی کرسیوں پہ پہلے سی ہی براجمان تھے۔

ان کے دستک دیتے ہی درانی نے دونوں پہ نظر ڈالی، جب کہ لیڈی اقتدار نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔ تنی ہوئی گردن لیے وہ اپنی کرسی پہ منجمد رہی۔

سب اپنی کرسیوں پہ بیٹھ گئے تھے۔اب سب کی توجہ شمس پہ مرکوز تھی۔

"اب بتاؤ شمس،ایسا کیا ہوا ہے جو تم نے اتنی ایمر جنسی میں یہ میٹنگ بلوائی۔" لیڈی اقتدار کا انداز ہمیشہ کی طرح مغرور تھا۔شمس نے ایک سرسری نظر ہر فرد پہ ڈالی۔سب متجسس نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔سب کے دل زور سے دھڑک رہے تھے۔

"احمد!" شمس نے بس اتنا کہا اور سب کے چہروں کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔سب کے چہرے زرد پڑنے لگے اور آنکھیں پھٹنے لگیں۔سب الجھن بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔کمرے میں اچانک سے انتشار پھیلنے لگا تھا۔

"احمد یوسف؟" نیلوفر کی آواز میں بے چینی تھی۔درانی کے اوپر ہیبت طاری ہو چکی تھی۔ان چاروں میں سب سے زیادہ پر سکون ان سب کی ملکہ، لیڈی اقتدار تھی۔اندر سے وہ بھی بے چینی کے مارے مچل رہی تھی، مگر اس نے اپنی بے چینی اپنے چہرے پہ عیاں نہیں ہونے دی تھی۔

"تفصیل سے بتاؤ۔احمد کا کیا ہوا؟ اور تم سب پر سکون ہو جاؤ۔" لیڈی اقتدار نے بلند آواز میں کہا۔وہ اس وقت اپنی ٹیم کو پر سکون کرنا چاہ رہی تھی۔

"کل رات جب مہر کی خبر لے رہا تھا تو وہ پتا نہیں کہاں سے آ گیا۔ اس نے مہر کو بچا لیا تھا۔ میں فوراً ہی وہاں سے بھاگ گیا۔ رات بہت تھی مجھے نہیں معلوم کہ اس نے میرا چہرہ دیکھا تھا بھی، یا نہیں۔" لیڈی اقتدار نے سوچتے سمجھتے سر اوپر نیچے ہلایا۔ درانی کا چہرہ اب جھک چکا تھا۔

"اُف! شاید شور شرابے کی وجہ سے وہ اُدھر پہنچا ہو۔ شاید یہ ڈرنے کی بات ہی نہ ہو۔" نیلوفر اضطرابی کیفیت میں بولی۔ وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس کسی بھی طرح سے بس یہ ایک فالتو شک نکل آئے، نیلوفر دل ہی دل میں سوچے جا رہی تھی۔

سب کا سکون ایک لمحے میں غارت ہو چکا تھا۔

"ہاں شاید یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ تم اس وقت تھے بھی اس کے علاقے میں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بس چیخ و پکار سن کر آ گیا ہو۔ تم ویسے بھی ان معاملات میں بے قابو ہو جاتے ہو۔ تمہیں مہر پہ ہلکا ہاتھ رکھنا چاہئے تھا۔" لیڈی اقتدار شمس کے اوپر برہم ہو کے برسنے لگی۔ شمس کے چہرے پہ شرمسار سا تاثر پھیلا۔

"اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو میں آپ لوگوں کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ آج مہر سرینا ہوٹل گئی تھی۔ میں نے بندے اس کے گھر کے راستوں پر کھڑے کروائے ہوئے ہیں۔ اور اس کی گاڑی میں کوئی تھا۔ کوئی مرد۔ مجھے بس خدشہ لاحق ہے کہ وہ مرد احمد نہ ہو۔" درانی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس نے کچھ بولنے کے لیے اپنے لب کھولے مگر پھر اپنے لب دبا لیے۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔

"سرینا ہوٹل۔تم نے اس سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی؟" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔

"کہہ رہی تھی بریک لینے۔" شمس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔

"محترمہ کے والد کے انتقال کو مہینے ہی ہوئے ہوں گے اور وہ گل چھڑے اڑانے ہوٹل پہنچ گئی۔" نیلوفر کا لہجہ اور انداز کڑوا تھا۔احمد کی آمد سے سب سے زیادہ ٹینشن میں وہ تھی۔

"مجھے نہیں لگتا احمد یوں کسی کے ساتھ ہوٹل جائے گا۔" درانی اچانک سے بولا۔سب کی نظریں اس پر پڑیں۔

لیڈی اقتدار اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی۔بہت انتشار پھیل چکا تھا اب اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔وہ اپنی ٹیم کو یوں گرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"بس اب بہت کر لی ملامت۔" وہ سینہ تان کے سب کو مخاطب کرتے بولی۔"شمس تم پتا کرواؤ کہ وہ مرد کون ہے۔ہم یوں ہی کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔اگر وہ احمد ہے تو کوئی بات نہیں، ہم اس کا بھی مقابلہ کر لیں گے۔ہم ایک ٹیم ہیں۔

ہم اس سے پہلے بھی ان گنت مصیبتوں سے لڑتے آرہے ہیں۔اب تک ہم نے جو کیا ساتھ کیا۔ہم نے ہر مصیبت کو فتح کیا۔تو بس، اب کھڑے ہو جاؤ سب۔پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور طاقتور ہو جاؤ۔اور جنگ کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھو۔چلو، اب اٹھو۔" وہ پرجوش انداز میں بولی تھی۔ملکہ کی آنکھوں میں عزم تھا۔ایک لگن تھی۔وہ بھی احمد سے ٹکراؤ کے لیے تیار تھی۔

نیلوفر، شمس اور درانی اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے۔ وہ سب کمرے سے جانے لگے۔

ایک ایک کر کے سب کمرے سے چلے گئے، اور پیچھے لیڈی اقتدار کھڑی تھی۔ وہی ملکہ والی شان، تنا ہوا سینہ،

اکڑی ہوئی گردن۔۔۔۔

لیکن پھر۔۔۔ کچھ غیر متوقع ہوا۔ ملکہ کے کندھے شل ہو گئے۔ آنکھیں بے چینی کے مارے پھٹنے لگیں۔ اس کے چہرے پہ گہری الجھن تھی۔ وہ بھی بہت پریشان تھی۔

"احمد کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے بے بس رہی ہوں۔" وہ آنکھیں میچتی بولی۔ وہ مضطرب تھی۔ مگر اپنی ٹیم کے سامنے اس نے اپنے آپ کو کمپوزر کھا ہوا تھا، کیونکہ وہ لیڈی اقتدار تھی۔۔۔ ان سب کی لیڈر۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"کاش! میں پہلے ہی قرآن سے جڑ جاتی۔ مجھے بھی یہ سب معلوم ہوتا۔" مہر کی آنکھوں میں نیم اداسی تھی۔

"اللہ نے قرآن کو انسانیت کے لیے بنایا ہے مہر۔ بچے، ٹین ایجرز، جوان، بوڑھے یہ سب ہی انسانیت کا حصہ ہیں۔ قرآن کو پڑھنے کے لیے، اس میں موجود علم سے فیض اٹھانے کے لیے کوئی عمر کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ آپ جب بھی اس کتاب کو کھولیں گی، تب تب یہ آپ کو کچھ سکھائے گی۔" احمد سادہ سے انداز میں بولے جارہا تھا اور مہر، اس کا دل مزید ہلکا پھلکا ہونے لگا۔ اس کی باتیں، اس کے بولنے

کا انداز، دل کو کتنا اچھا لگتا تھا ناں۔وہ بس مسکرائی، مسکراہٹ میں ہی احمد کے لیے شکرگزاری تھی۔ احمد بھی جواباً مسکرا دیا۔

”اب چلتے ہیں۔“ احمد بولا، اور آگے بڑھ گیا۔مہر بھی اس کے پیچھے جانے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ دونوں سرینا ہوٹل کے باہر کھڑے تھے۔ٹھنڈی ہوا اب بھی اسلام آباد پہ سوار تھی مگر جس طرح سے دن چڑھتا جارہا تھا ہوا میں ٹھنڈ کی آمیزش کم ہوتی جارہی تھی۔سورج بھی اپنا زور پکڑتے جا رہا تھا۔

وہ لوگ ویلے کو چابی دے چکے تھے اور اب گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

”وہ جو درخت نظر آرہا ہے ادھر دیکھیں۔“ احمد نے درخت کے اوپر انگلی اٹھائی اور اچانک بولا۔مہر الجھ کے درخت کو دیکھنے لگی۔آخر ایسا کیا خاص تھا درخت کی طرف؟ وہ متلاشی نظر اس نیم کے درخت کی طرف گھمانے لگی۔شاید کوئی نایاب جانور احمد کو نظر آیا ہو۔مگر وہاں تو کچھ تھا ہی نہیں۔

”اب جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرتی رہیں۔کچھ دیر کے لیے اپنے سوالات کو تالا لگا لیں۔کیوں، کیا،کیسے، سب بھول جائیں۔میں کچھ دیر میں سب بتادوں گا۔جو میں کہتا جا رہا ہوں ویسا کرتی جائیں۔“ احمد مسکرا رہا تھا اور بالکل مدھم سی آواز میں مہر کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔مہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔آنکھوں میں خوف چھانے لگا۔آخر یہ کیا ہورہا تھا؟ اس نے سوچا۔

”پہلے پورے دل سے مسکرائیں۔“

وہ برے دل سے مسکرائی۔ مسکراہٹ انتہائی مصنوعی تھی۔ انتہائی عجیب سی۔ اس کے سارے دانت نظر آرہے تھے۔احمد نے اس کی طرف نظر ڈالی تو وہ کچھ خائف سا ہونے لگا۔

"اف!" احمد کراہ کر رہ گیا۔"اداکاری تو اچھی کر لیں کم سے کم۔" مہر کو دیکھے بغیر اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔مہر اب بھی بری طرح سے الجھی ہوئی تھی۔

"خیر چھوڑیں۔اب میرا ہاتھ پکڑ لیں اور میری بات دھیان سے سنیں۔"مہر نے احمد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انداز میں جھجک تھی۔

"اس درخت سے نظر نہیں ہٹانی ہے۔میں آپ کو کچھ بتانے جا رہا ہوں۔آپ کی مسکراہٹ برقرار رہے۔میں

بتا رہا ہوں۔تیار رہیں۔" احمد ٹھہرا۔مہر کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔"ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے۔" مہر کے سر پہ کالے بادل چھانے لگے۔ایک لمحے کے لیے اس کی مسکراہٹ سمٹنے لگی مگر احمد کی بات پر عمل کرتے ہوئے وہ پھر سے مسکرا دی۔

"پاس میں ہی ایک گاڑی ہے۔نیلے رنگ کی۔دیکھنے کی جرات بھی نہ کریں۔ گاڑی میں ایک بندہ ہے جو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ہینڈ بریک کے پاس ایک کیمرہ ہے، یعنی وہ ہماری تصویریں کھینچے گا۔" مہر کی روح بے چینی کے مارے مچلنے لگی۔اللہ اللہ، یہ سب کیا ہو رہا تھا۔اس نے سوچا۔

"اگر آپ میری بات سمجھ گئی ہیں تو بولے ہاں۔" احمد نے کہا۔

"ہاں۔" چہرے پہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ بولی۔وہ اب عام سا مسکرا رہی تھی۔

”اچھا۔انہوں نے شیشہ اوپر کیا ہے۔اب تیار رہیں۔بہترین سا پوز کریں اور مسکرائیں۔ہاتھ بالکل سختی سے تھام لیں۔“ احمد کہہ کے بھرپور مسکرانے لگا۔

کچھ دیر میں ویلے گاڑی لے آیا۔مہر تیزی سے اندر بیٹھی، جب کہ احمد کافی پر سکون سا ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ہوا۔اندر آیا تو مہر گہری سانسیں لے رہی تھیں۔وہ پانچ منٹ اس کے لیے محال تھے۔

”اس سب کا مقصد کیا تھا؟ اور پلیز، چھپانے کی کوشش بھی نہ کیجیے گا۔“ وہ نیم برہم تھی۔احمد مدھم سا ہنس دیا۔

”بس، میں کچھ وقت کے لیے انہیں بھٹکانا چاہ رہا تھا۔“ احمد پر سکون تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مہر اب بھی بری طرح سے الجھی ہوئی تھی۔

”یہ تو بے وقوفی ہے؟ ان لوگوں کو آپ کی مداخلت کا علم ہو گیا ہے۔“ مہر نے اچنبھے سے پوچھا۔

”ہاں۔وہ تو ہونا ہی تھا۔نا ممکن تھا کہ ہم دونوں ساتھ کام کریں اور ان کو علم نہ ہو۔میں اس کے لیے تیار تھا۔“ احمد کا انداز لا پرواہ سا تھا۔مہر کو تپ چڑھنے لگی تھی۔یہ احمد ایک ہی باری ساری بات کیوں نہیں اگل رہا تھا؟ اف۔

”پھر یہ تصویریں؟ یہ مسکرانا؟ یہ پوز؟ یہ سب کیا تھا۔“ مہر بولی۔

”دیکھیں۔میں بتاتا ہوں۔“ اس نے مختصر سی نظر برہم سی مہر کی طرف موڑی۔اور پھر سے سیدھا دیکھ کے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

”میں بس کچھ وقت مانگ رہا تھا۔ کچھ چیزیں ہیں جو میں نے دیکھنی ہیں، جانچنی ہیں۔ میں نے ان تصویروں سے صرف انہیں بھٹکایا ہے۔ یہ لوگ اگر فوراً جان گئے کہ میں آپ کی زندگی میں کیا عزم لے کر داخل ہوا ہوں تو کچھ نہ کچھ آگے سے ضرور کریں گے۔ اور میں یہی تو نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ فی الوقت وہ لوگ کوئی چال چلیں۔ اس لیے یہ تصویریں، یہ پوز کر کے ان کا دھیان کچھ وقت کے لیے بھٹکا رہا ہوں۔ تاکہ وہ اس شک میں پڑ جائیں کہ کیا میں انہیں برباد کرنے کے لیے آپ سے جڑا ہوا ہوں یا ہمارے درمیان کچھ اور ہے۔ بس کچھ مہلت مانگ رہا تھا۔“ احمد ٹھہر ٹھہر کے اسے سب سمجھانے لگا۔ مہر کو بھی سب سمجھ آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر سے الجھن فنا ہوئی۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن میرے پاس تو ہیرے ہیں، وہ لوگ مجھے کچھ نہیں کریں گے۔ آپ کا کیا؟ آپ کیسے بچ جائیں گے؟“ مہر نے تشویش ظاہر کی۔

”بس آپ اتنا جان لیں، کہ مجھے کچھ نہیں کیا جائے گا۔ ختم بات۔“ احمد اٹل سے انداز میں بولا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ آگے کچھ بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔ مہر بھی سانس خارج کرتے ہوئے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

اسے احمد پہ بھروسہ تھا۔ وہ بھی نہیں جانتی تھی کیوں، بس اسے بھروسہ تھا۔ اس پہ اعتماد تھا۔ اب اسے اس کی مدد سے کوئی بھی اعتراض نہیں تھا۔

”اچھا اب آپ مجھے اچھا سا ناشتہ کھلا رہی ہیں۔“ احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈن“!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سرمئی بادل شام کے وقت گہری ہوگئے تھے مگر ابھی برس نہیں رہے تھے۔ مناج مغرب کے بعد درے کے کلینک پہنچ گئی۔وہ اب درِ فشاں کو آگے کی کہانی سنانے کے لیے تیار تھی۔

درے کالے صوفے کی ایک طرف بیٹھی تھی اور مناج دوسری۔درے کے ہاتھ میں نوٹ بک اور پین بھی تھا۔

روم میں اے سی کے باعث کافی ٹھنڈک تھی۔

"مناج، تم سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہارے لیے یہ ہفتہ کیسا گیا؟ تم نے اپنے آپ کو بہتر کرنے کے لیے کچھ کیا؟" درے نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا۔مناج نے سست روی سے سر اثبات میں ہلایا۔اس کے چہرے پہ اب بھی خالی پن جھلکتا تھا۔

"میں نے اپنے آپ کو کوئی تکلیف نہیں دی۔حالانکہ طلب ہوتی تھی۔دل چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو سگریٹ سے جلاؤں۔ چھری سے اپنے ہاتھ پر کٹ لگاؤں۔مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔اور میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔لیکن اب بھی کوئی خلش سی ہے درے۔کوئی رکاوٹ ہے، میں پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہو رہی ہوں۔اب بھی میرے خیالات مجھے گھیر لیتے ہیں اور مجھے احساس دلاتے ہیں کہ میں مردہ ہی ٹھیک ہوں۔" مناج نے اپنا حال احوال اپنے عام مشینی انداز میں بتایا۔درے نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

”وقت لگے گا مناج۔ بہتری آہستہ آہستہ آئے گی۔ یہ ایک سفر ہے۔ طویل سا سفر۔ ابھی اتنی پراگریس آئی یہ بھی بہت ہے۔ آگے اور بھی سیشنز ہوں گے، میں تمہاری مدد کروں گی، اور پھر تم ایک دن آزاد ہو جاؤ گی۔ تمہیں رہائی مل جائے گی۔“ درِ فشاں مسکرائی۔ مناج نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اب تم مجھے بتاؤ، کیا تم نے سگریٹ پینا چھوڑ دی؟“ در فشاں نے سنجیدہ نگاہوں سے مناج کو دیکھا۔ مناجنے گردن نفی میں ہلائی۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“ مناج سگریٹ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

”ہاں، اگر تم اپنے آپ سے محبت کرتی ہو، اور تم ایک خود پرست اور خود پسند انسان نہیں ہو، تو تم سگریٹ چھوڑ دو گی۔ یہ سگریٹ تمہارے جسم کو نقصان دیتی ہے مناج۔ اس میں نکوٹین ہے، جو کے دماغ میں خوشی کے ہارمون ریلیز کرتی ہے۔ اور یہ بلڈ سرکولیشن کو بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر ساتھ ساتھ اس میں ٹار ہے جو کہ پھیپھڑوں تک جاتی نالیوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ اس سے سانس لینے میں بھی دشواری ہو تی ہے۔ اس میں کاربن مونو آکسائڈ ہوتی ہے۔ کاربن مونو آکسائڈ پتا ہے کیا ہوتی ہے؟ وہ جو گاڑیوں میں سے کالا دھواں نکلتا ہے وہ کاربن مونو آکسائڈ ہوتی ہے۔ اب کوئی انسان جو اپنے آپ سے محبت کرتا ہے وہ اس طرح کی زہریلی چیزیں اپنے اندر لے گا؟ مجھے نہیں لگتا۔ اس لیے تم اپنے آپ کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلو گی۔۔“

”تم نے کہا تھا کہ اگر میں سگریٹ نہیں چھوڑوں گی تو میں خود پرست ہوں؟ وہ کیسے۔“ مناج نے پوچھا۔

"کیونکہ سگریٹ پینے سے تم اپنے ارد گرد موجود ہر فرد کو نقصان پہنچا سکتی ہو۔سگریٹ پینے والے اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں تک بھی سگریٹ کے منفی اثرات پہنچا دیتے ہیں۔جو دھواں ہم نکالتے ہیں اس میں

کاربن مونو آکسائڈ سمیت اور بھی زہریلے مادوں کی آمیزش ہوتی ہے، جو کے آس پاس موجود لوگ اپنے اندر لے سکتے ہیں۔جس طرح سے سگریٹ پینے والوں کو لنگ کینسر، ٹی بی جیسے امراض کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، اس طرح ان کے آس پاس موجود لوگوں کو بھی یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔اس لیے مناج، اب تم سگریٹ نہیں پیو گی۔ٹھیک؟" مناج نے کچھ دیر بعد سر اثبات میں ہلایا۔اپنے آپ کو بہتر کرنے کے لیے وہ یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لے گی۔

"اب شروع کرو۔تمہاری ماں کی پرویز سے شادی ہوئی۔اس سے آگے کیا ہوا؟" درفشاں کچھ دیر بعد بولی۔مناج بھی اب آگے بتانے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔سورج کی کرنیں اس وسیع و عریز سبزہ زار پہ پڑ رہی تھیں۔وہ قصر نہایت خوبصورت تھا۔اگر اس قصر کو محل کہا جائے، تو کچھ غلط نہیں ہو گا۔

پرویز، جو کہ پینتیس سالہ مرد تھا،اس نے اپنے بال ڈائی کیے ہوئے تھے۔ فرزانہ اس کے برابر میں چلتے آرہی تھیں۔ان کی آنکھیں بے جان تھیں اور نظریں نیچی۔انہوں نے سفید رنگ کا ہلکے سے کام

والا جوڑا پہنا تھا۔مناج فرزانہ کے برابر میں ان کے ڈوپٹے کی اوٹ میں چھپی تھی۔وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔اس نئی جگہ سے اسے خوف آرہا تھا۔

قصر کی عمارت کے داخلی دروازے پہ وہ کھڑی تھی۔خوبصورت سی عمر رسیدہ خاتون۔پرویز اس کی طرف بڑھا اور اسے مسکرا کے دیکھنے لگا۔اس کے چہرے پہ خوشگوار حیرانی تھی۔اس عورت نے بھی فخریہ نگاہ اپنے چھوٹے بھائی پہ ڈالی۔پھر نظر فرزانہ پہ گئی۔فرزانہ پہ نگاہ پڑتے ہی نگاہ کی فطرت میں تبدیلی آئی، ان میں حقارت تھی، رعب تھا۔پھر سہمی ہوئی مناج پہ اس کی بے رحم نگاہ پڑی۔اسے دیکھتے ہی وہ مسکرائی۔مسکراہٹ معنی خیز سی تھی۔

”لویزا آپا، کاش آپ بھی آجاتی۔اپنے بھائی کے لیے وقت نکالنا سیکھ لیں۔“ پرویز کے انداز میں نروٹھا پن سا تھا۔لویزا نزاکت سے ہنس دی۔

”میں تو تمہیں سرپرائز دینے کے لیے کہہ رہی تھی، کہ میں انگلینڈ سے نہیں آ سکتی۔تم نے کہا تھا دوپہر میں نکاح ہے۔میں جب آئی تو پتا چلا کہ جناب پہلے ہی اپنی ڈولی لے کر جا چکے ہیں۔“ وہ شوخ سے انداز میں بولی۔

لویزا نے اب اپنا رخ پریشان فرزانہ اور سہمی ہوئی مناج کی طرف موڑا۔

”تم دونوں کو بھی خوش آمدید۔“گردن مزید اکڑی۔اب کی بار انداز سخت تھا۔

”تم دونوں کو جب بھی مجھے مخاطب کرنا ہو تم لوگ میرے خطاب لیڈی اقتدار سے مخاطب کرو گے۔ سمجھے؟ لیڈی اقتدار۔“لویزا، جو کہ در حقیقت لیڈی اقتدار تھی، بولی۔وہ حال کی لیڈی اقتدار جیسی ہی پر اسرار شخصیت رکھتی تھی۔بس چہرے اور گردن پہ جھریاں کافی کم تھیں۔

اب سب گھر کے اندر چلنا شروع ہوئے۔لیڈی اقتدار آگے تھی، اس کے پیچھے مناج فرزانہ اور پرویز۔ اس کی چال بھی بالکل حال کی لیڈی اقتدار جیسے تھی، شاہانہ۔۔۔!

”اور پرویز۔“وہ چلتے چلتے ہی، بنا مڑے بولی۔”تم نے کھانے کا بھی انتظام نہیں کیا۔میں نے آکے دیکھا تو پتا چلا کہ نئی نویلی دلہن آرہی ہے، اور کوئی اہتمام ہی نہیں۔کتنے ارجنٹ نوٹس پہ میں نے ملازمین کے سر پہ کھڑے ہو کے کام کروائے۔“ وہ ہاتھ ہلا ہلا کے، انداز میں نزاکت لیے بولے جارہی تھی۔

کھانے کے ساتھ لگی کرسیوں پہ وہ چاروں براجمان ہو گئے۔سربراہی کرسی پہ لیڈی اقتدار براجمان ہوئی۔ان کے دائیں طرف پرویز، پرویز کے ساتھ فرزانہ اور فرزانہ کے برابر میں مناج۔

کھانے کی میز پہ طرح طرح کے لوازمات سجے ہوئے تھے۔فرزانہ سب دیکھ کے سوچ رہی تھی کہ چار لوگوں کے لیے اتنا سب پکوانے کا کیا فائدہ تھا بھلا؟

تینوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔

”پرویز۔تم نے اسے سب بتا دیا ہے ناں؟“ کھانے کے دوران ہی لیڈی اقتدار بولی۔پرویز نے عجیب سی نگاہ لیڈی اقتدار پہ ڈالی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اس وقت کیا باتیں لے کے بیٹھ گئی۔

”نہیں ابھی ضرورت نہیں ہے۔“ پرویز نے سرسری انداز اختیار کیا۔

”کیوں ضرورت نہیں ہے۔اسے پہلے دن سے سب پتا ہونا چاہیے کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ آج سے ہی اسے ہمارے رازوں کے ساتھ جینے کی مشق کرنی چاہیے۔کیونکہ بعد میں اس کو سب پتا چل ہی جائے گا۔“ماحول میں تناؤ پھیل گیا۔فرزانہ کے ماتھے پہ شکن ابھریں۔مناج سب سن رہی تھی مگر اسے کچھ بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔اس کا دماغ اس وقت سن تھا۔

”مگر۔۔اچھا پھر آپ خود بتا دیں۔“پرویز جان چھڑاتے بولا۔لیڈی اقتدار کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ بکھری۔فرزانہ کا دل پھڑپھڑانے لگا۔وہ اب سہمی ہوئی فرزانہ کے اوپر اپنی سرد نگاہ گاڑھے ہوئے تھی۔وہ فرزانہ کو یوں پھڑپھڑاتا دیکھ کے بہت محظوظ ہورہی تھی۔

”ہم لوگ عام لوگ نہیں۔ہمارا ایک بہت بڑا کاروبار ہے۔انسانوں کا، ان کے اعضاء کا۔“ فرزانہ کا دل ڈوبنے لگا۔ایک دم سے انہیں خوف نے جکڑ لیا تھا۔اف خدایا۔وہ اور ان کی بیٹی کہاں پہ پھنس گئے تھے؟ انہوں نے سوچا۔ان کا دل جیسے کچھ دیر کے لیے کام کرنا بند ہوگیا۔

”ڈرو مت۔تمہاری خاموشی تمہاری اور تمہاری بیٹی کی حفاظت کرے گی۔اس راز کو اپنے سینے میں دفن کرنے کی عادت ڈال لو۔کیونکہ نقصان صرف تمہارا ہی ہو گا۔“ لیڈی اقتدار کا لہجہ سخت تھا۔فرزانہ کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے ”سمجھی؟“ فرزانہ نے خوف کے مارے سر ہاں میں ہلایا۔مگر ان کی روح اندر تک کانپ چکی تھی۔یہ سب بہت بھیانک تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"لویزا عرف لیڈی اقتدار، یہ ایک بہت خطرناک عورت ہے۔ اس کی پہنچ بہت اونچی ہے۔ خود پرستی کی انتہا اس پہ ختم ہوتی ہے۔" وہ نفرت کے کڑوے گھونٹ بھرتے کہہ رہے تھی۔ وہ اپنی نفرت لیڈی اقتدار کے لیے دل کھول کے بیان کر رہی تھی۔ "یہ اپنے چرچے ہر وقت کرتی رہتی تھی۔ کہ کیسے اس کے والد نے اسے لڑکوں کی طرح بڑا کیا۔ یہ سب انگلینڈ میں رہتے تھے۔ لویزا اور پرویز کے والد پاکستانی پالیٹیشن تھے۔ انہوں نے اسے لڑکوں کی طرح پالا، گھوڑے سواری سکھائی۔ تیر چلانا سکھایا، بندوقیں چلانا سکھائیں۔ جب آس پاس لوگ ان سے سوال کیا کرتے تھے تو وہ جواب دیتے تھے کہ میں آنے والے وقتوں کے اقتدار کی پرورش کر رہا ہوں۔ اور پھر بڑی عمر میں آ کے اس کے لیے لیڈی اقتدار کا لقب استعمال ہونے لگا۔" وہ بولتی گئی، کڑوے زہریلے الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوتے تھے۔

"میری ماں کو اس دن پتا چلا کہ اسے کولڈ بلڈڈ کرمنلز میں بیاہ دیا گیا۔ مجھے اس وقت ان باتوں کی سمجھ نہیں آسکی تھی۔ پرویز سائیکوپیتھ تھا۔ نشہ وہ بھی کرتا تھا اور نشہ کر کے وہ امی کو مارا کرتا تھا۔ ان پر تشدد کیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی بہت مرتبہ تشدد کا نشانا بنایا۔ آج تک میرے جسم پہ کچھ نشانات ہیں جو مجھے پرویز نے دیے تھے۔ اسے جیسے ہمیں مار پیٹ کر سکون ملتا تھا۔ جانور صفت پرویز اور خونی لیڈی اقتدار کی صحبت میں ہمارے آنے والے سال گزرے۔ میں بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ میں ہر وقت روتے رہتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس بڑے سے گھر میں میں قید ہو گئی ہوں۔ در حقیقت، ہم قید ہی تھے۔ میں مایوس تھی کیونکہ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اور پھر میں نے اپنی ماں سے وہ کہا جو مجھے شاید نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تیرہ سالہ مناج صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔اس کے چہرے پر سرد تاثر تھے۔ فرزانہ اس کی طرف چلتے آئی۔ان کے ماتھے پر زخم تھا۔مناج کو دیکھ کر وہ زخمی سا مسکرائیں۔ان کا بدن تکلیف میں جھلس رہا تھا۔

”کیا ہوا مناج۔ایسے کیوں لیٹی ہوئی ہو؟“ فرزانہ اس کے سرہانے لیٹی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔

”کیا ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے امی؟“ مناج نے بے بسی سے کہا۔فرزانہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”کیا ہم ہمیشہ کے لیے قید ہو گئے ہیں؟ کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔“ مناج کی آنکھ سے آنسو نکلا۔وہ

اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔اس کا بچپن برباد ہو چکا تھا۔وہ کسی لاش کی طرح بس ادھر ادھر گھومتے رہتی تھی۔

”میں جانا چاہتی ہوں یہاں سے۔میں نہیں رہ سکتی ادھر۔“ مناج روئے جا رہی تھی۔ فرزانہ کا چہرہ سخت پڑا۔

وہ اپنی بیٹی کی بے بسی برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

”تم نکلنا چاہتی ہو یہاں سے مناج؟ تم فکر نہ کرو۔میں تمہیں نکال دوں گی یہاں سے۔بہت جلد۔تم فکر نہ کرو، بس تھوڑا صبر کرو۔“ فرزانہ نے کہا تو مناج کے دل میں امید کی کرنیں روشن ہوئی۔مگر اس وقت وہ واقف نہ تھی کی فرزانہ کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔

ایک دن، رات کے وقت فرزانہ نے کچن سے جا کے ایک چھری نکالی۔ وہ اس چھری کو اپنے ڈوپٹے میں چھپائے اپنے کمرے میں لے کر آئیں۔ وہ پرویز کے اوپر چھری سے وار کرنے ہی والی تھیں، کہ پرویز اٹھ گیا اور اس نے فرزانہ کے ہاتھ سے وہ چھری کھینچ لی۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ فرزانہ دہشت ذدہ ہو گئیں۔

فرزانہ قدم قدم بڑھاتے پیچھے جانے لگی۔ پرویز کھڑا ہوا اور غصیلی نگاہ لیے فرزانہ کی طرف جاتا رہا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتا اور فرزانہ ایک قدم پیچھے، اور پھر۔۔۔ دیوار آ گئی۔ انہیں رکنا پڑا۔ پرویز ہاتھ میں چھری پکڑے اب بھی انہیں دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

''تمہاری ہمت!'' پرویز نے چھری اٹھا کر پٹخی اور اپنے ہاتھوں کا استعمال کرتے فرزانہ کو اتنا پیٹا، اتنا پیٹا کہ وہ زمین پر بے ہوش ہو کے گر گئی۔ ان کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہنے لگا تھا۔ لیڈی اقتدار مناج کے ساتھ کمرے میں بھاگتی بھاگتی آئی۔ مناج زخمی ماں کو دیکھ کے بالکل پاگل سی ہو گئی۔ وہ فرزانہ کے سرہانے بیٹھ کے چلانے لگی۔

''یہ کیا پرویز؟ مر تو نہیں گئی یہ؟ اب اتنا بھی مارنے کی کیا ضرورت تھی؟'' لیڈی اقتدار اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ انداز میں مصنوعی پریشانی تھی۔

''اگر نہ کرتا تو مجھے مار دیتی۔ چھری سے وار کرنے والی تھی۔۔۔'' پرویز نے چھری کی طرف اشارہ کیا۔ لیڈی اقتدار نے چھری کو دیکھا اور پھر اس کے لب اوہ میں ڈھلے۔ اس نے ایک نظر حواس باختہ مناج پہ ڈالی جو کہ روئے جا رہی تھی۔

”اچھا، اسے چپ کرواؤ۔“ وہ لاتعلق انداز میں بولی۔”اگر مر بھی گئی تو کوئی بات نہیں۔ تمہاری بہن تمہارا بچاؤ کر لے گی۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”وہ لوگ امی کو ہسپتال لے کر گئے۔ان کے جسم پر بہت گہری چوٹیں آئیں تھیں۔ان کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔ان کو اپنے ہی ہسپتال میں ایڈمٹ کروایا گیا۔مگر بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔“ مناج کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔یہ پہلی بار تھا کہ درے کے سامنے وہ روئی تھی۔”ان لوگوں نے اس کے بعد مجھے استعمال کیا۔اور میرا ایک گردہ مجھ سے چھین لیا۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن لیڈی اقتدار مناج کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے ساتھ پرویز موجود تھا۔مناج کا چہرہ مایوس سا تھا۔

”مجھے اپنی امی سے ملنا ہے۔“مناج اپنے دل میں بسے خوف کے باوجود اس وقت بولی تھی۔اسے اپنی ماں کے علاوہ اس وقت کسی کی فکر نہ تھی۔

”ملنا ہے؟ مگر اس وقت تو شاید تمہاری ماں زندہ بھی نہ بچے چندا۔“ لیڈی اقتدار نے ایسے کہا جیسے کوئی بڑی بات نہ تھی۔مناج کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔

”ایسا نہ کہیں، پلیز۔“ مناج نے منت سماجت والے انداز میں کہا۔وہ اپنے ابو کو کھو چکی تھی، اب امی؟ کبھی نہیں۔

"تمہاری ماں کی جان صرف ایک ہی صورت میں بچ سکتی ہے مناج۔" لیڈی اقتدار نے نرمی اختیار کی۔

"وہ کیسے؟" مناج پر امید سی ہوئی۔

"چھوڑو، تم وہ ہمیں نہیں دے سکو گی۔شاید، تمہاری ماں سے الوداع کہنے کا وقت ہو ہی گیا ہے۔"لیڈی اقتدار کی آنکھوں پہ مصنوعی ہمدردی چھانے لگی۔

"آپ پلیز بتائیے۔اپنی امی کو بچانے کے لیے میں کچھ بھی دے دوں گی۔" مناج جذباتی ہو کے بولی۔

لیڈی اقتدار نے ایک ستائشی نظر پرویز پہ ڈالی۔

"گردہ دو گی اپنا؟" لیڈی اقتدار نے پوچھا۔مناج کی آنکھوں میں حیرانگی پھیلی۔وہ قطعاً اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔مناج خاموش سی ہو کے لیڈی اقتدار کو تعجب نظروں سے دیکھتے گئی۔"مجھے پتا تھا، تم نہیں دو گی۔میرے پاس اب تمہاری ماں کو ختم کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔"

"نہیں ایسے نہ کریں پلیز۔۔۔میں" مناج رکی۔آگے کا جملہ کہنے کے لیے ہمت جمع کی۔"میں دوں گی اپنا گردہ۔پلیز میری امی کو بچا لیں بس!" چھوٹی مناج روتے ہوئے التجاء کر رہی تھی۔

اب لیڈی اقتدار نے نظر مناج سے ہٹائیں۔جتاتی نگاہ پرویز پہ ڈالیں۔پرویز بھی اپنی بہن کی کارکردگی سے متاثر تھا۔

"کہا تھا ناں، منا لوں گی اسے۔او نیگیٹیو بلڈ ہمارے گھر میں ہی دستیاب تھا،اور تم کہاں کہاں خوار ہو رہے تھے۔اب اسے رات میں لے جانا آپریشن کے لیے اور اسے خوب سمجھا دینا کہ یہ سب اپنی ماں کو ہر گز نہ بتائے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”اور پھر انھوں نے میرا پیٹ کاٹ کے میرا گردہ بھی نکال لیا۔“ مناج اب رونے لگی۔ درے کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ کیا کسی کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا کچھ ہو سکتا تھا؟

”مجھے بہت دھمکیاں دی گئی کہ میں اس سب کے بارے میں امی کو نہ بتاؤں لیکن، میرے پیٹ پر ایک بڑا سا زخم تھا، اسے بھلا میں کیسے چھپا سکتی تھی؟“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تیرہ سالہ مناج اپنے کمرے میں بیٹھی درد سے کراہ رہی تھی۔ اسے اپنے پیٹ کے ایک مخصوص حصے میں شدت سے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

فرزانہ مناج کے کمرے میں اس کا حال چال دریافت کرنے آئی تھیں۔ وہ دو ہفتے بعد ہی ڈسچارج کر دی گئی تھیں، اب ان کے زخم بھی کافی بہتر تھے۔

وہ جب کمرے میں آئی تو مناج اپنے پیٹ پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں میچ کے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پہ تکلیف کا عنصر تھا۔ فرزانہ کچھ پریشان ہو گئیں۔

”کیا ہوا مناج؟ بتاؤ؟“ فرزانہ فکرمندانہ انداز میں کہتے ہوئے مناج کی طرف بڑھی۔

مناج کو جیسے ہی احساس ہوا کہ فرزانہ کمرے میں آچکی ہیں تو وہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی۔ اس نے اپنے چہرے کو عام رکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

”کچھ نہیں امی۔“ مناج نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کُرتا اوپر کرو اپنا۔" وہ بھی آخر میں تھی تو مناج کی ماں۔ وہ غصے سے بولی تھیں۔ مناج نے سر نفی میں ہلایا۔

"امی کیا ضرورت ہے؟" مناج بوکھلا کے بولی۔ طیش نگاہوں سے انہوں نے مناج کو دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے مناج کا کُرتا اوپر کیا تو اس کے پیٹ پہ ان کو بڑا سا زخم نظر آیا۔ زخم پہ ٹانکے لگے ہوئے تھے، صاف ظاہر تھا مناج کے پیٹ کو کاٹا گیا تھا اور پھر اسے سی دیا گیا تھا۔ فرزانہ کی روح کپکپانے لگی تھی۔ انہوں نے پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے مناج کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ نسیں بھڑکنے لگی تھیں۔ انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ کس نے کیا ہے تمہارے ساتھ۔ بتاؤ؟" وہ غصے کے باعث تھرتھراتے ہوئے بولی تھیں۔ ان کی ممتا کو بری طرح سے چیر دیا تھا۔

"بتاؤ کس نے کیا ہے یہ۔ ورنہ میں تمہارا حشر نشر بگاڑ دوں گی مناج۔" وہ مناج کو گریبان سے پکڑتے بولیں۔ مناج رونا شروع ہو گئی۔ اسے وہ دھمکیاں یاد آئیں جو لیڈی اقتدار اور پرویز اسے دیتے رہے تھے۔ مگر اب وہ کیسے چھپاتی؟ فرزانہ اس کا زخم دیکھ چکی تھی۔

"بتاتی ہوں بتاتی ہوں۔ وہ آپ کو مار رہے تھے امی۔ آپ کی جان کے بدلے انہوں نے میرا گردہ مانگا میں نے دے دیا۔ پلیز کسی کو نہیں بتائیں۔" مناج آنکھیں بند کر کے روتے ہوئے سب بتا رہی تھی۔ مناج کی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی کہ فرزانہ اٹھ کے کمرے سے باہر نکلیں۔ ان میں الگ سی توانائی بھر گئی تھی۔

لیڈی اقتدار اس وقت انگلینڈ میں تھیں اور پرویز گھر کے کچن میں۔

فرزانہ کچن میں داخل ہوئیں۔ پرویز ان سے پشت کیے کھڑا کاؤنٹر پہ موجود پھل کھا رہا تھا۔ فرزانہ کچھ دیر وہیں کھڑیں، شعلہ باز نگاہیں لیے اسے دیکھتے رہیں۔

فرزانہ اس کی طرف بڑھیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کے اس کی پشت پہ زور زور سے وار کرنے لگیں۔ وہ اس پہ جنگلیوں کی طرح جھپٹی تھیں۔ اس کے بالوں کو نوچنے لگیں پھر اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ چیرنی لگیں۔

"تیری اتنی جرات تو میری بیٹی کا گردہ نکالے۔ میں اپنی بیٹی پر اتنا ظلم نہیں برداشت کر سکتی پرویز۔" ان کی ممتا بری طرح سے کپکپا گئی تھی۔ وہ اپنے ہوش و ہواس میں نہیں تھی۔ اچانک حملے سے پرویز بوکھلا گیا تھا مگر کچھ دیر بعد ہی اس نے اپنے آپ پہ قابو پا لیا۔

وہ زیادہ طاقت ور تھا۔ فرزانہ کا اس کے سامنے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے فرزانہ کو زور سے دھکا دیا فرزانہ زمین پر گری۔ سر دیوار سے ٹکرانے سے ان کا وجود چکرانے لگا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔ وہ اپنا ہوش کھونے لگی مگر وہ اپنے آپ کو کھونے نہیں دے رہی تھی۔

مناج آنکھوں میں خوف لیے، لاؤنج میں کھڑی سب منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ پتھر کا مجسمہ بنی ادھر کھڑی تھی۔ پرویز نے چولہا جلایا، اور اس پہ لوہے کا چمٹا رکھا۔ چمٹا دہک کے لال ہو گیا تھا۔

وہ مناج کی طرف لپکا، اسے اپنے ہاتھوں میں دبوچ کے اس کے ہاتھ پہ وہ چمٹا کسنے لگا۔ مناج درد کے مارے چلانے لگی۔ اونچی آواز میں رونے لگی۔ اپنی امی کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔

مناج کی روتی آوازیں، تکلیف میں جھلستی چیخ و پکار، فرزانہ کے کان میں پڑیں۔وہ نیم بے ہوش تھیں، مگر اس آواز نے ان کے دل پہ چھریاں چلا دیں۔ان کی روح کپکپانے لگی۔وہ جیسے اچانک سے نیند سے جاگی۔ان کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں۔گردن اور ماتھے کی نسیں بھڑکنے لگیں۔ان کے جسم میں اچانک سے جیسے توانائی بھر گئی تھی۔ان کے ہاتھ کپکپارہے تھے۔ان کے اندر ابلتا غصہ، اپنی انتہا پہ پہنچ چکا تھا۔وہ اونچی اونچی سانسیں لینے لگیں۔

انہوں نے اپنا چہرہ اوپر کیا، چہرے پہ جارحیت اور جنون چڑھا ہوا تھا۔وہ جنونی کیفیت میں تھیں۔وہ اس وقت انسان نہیں لگتی تھیں۔وہ کھڑی ہوئیں۔انہوں نے کاؤنٹر سے چھری اٹھائی۔وہ پرویز کی طرف بڑھی جو کہ مناج کو گردن سے دبوچ رہا تھا۔وہ اتنی تیزی سے اس کی طرف لپکی تھیں کہ پرویز کو پیچھے تک دیکھنے کا موقع نہ ملا۔انہوں نے اس کی پشت پہ چھری سے وار کیا۔

پرویز نے ایک جھٹکا لیا۔اسے اپنے جسم کے اندر کچھ داخل ہوتا محسوس ہوا۔مناج کپکپانے لگی۔اسے سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا تھا۔فرزانہ اس کے اوپر چھری سے وار کرنے لگی، اور کرتے گئیں۔پرویز زمین پہ گر گیا۔وہ خون میں نہا چکا تھا۔مناج چہرے پہ بے یقینی اور خوف لیے پرویز کے خون میں جھلستے جسم کو دیکھ رہی تھی۔پرویز پیٹ کے بل گر گیا تھا۔۔۔مگر فرزانہ۔۔۔وہ اب بھی ہوش میں نہ تھیں۔

وہ اس کے سینے پہ وار کرتے گئیں، کرتے گئیں، کرتے گئیں۔انہیں ہوش نہیں رہا تھا۔وہ اس کے پورے جسم کو چیر چکی تھیں۔اس کے اعضاء تک اس کے جسم سے باہر نکل گئے تھے، مگر فرزانہ نہ

رکی۔ وہ اپنے اندر بسی نفرت، اپنے اندر بسے انتقام کو یوں بجھانے لگی۔ پرویز کا تو یہ حال تھا کہ اب اس کی لاش پہچاننے لائق نہ رہی تھی۔

فرزانہ نے ایک جھٹکا کھایا۔ اور جوں ہی وہ دنیا میں واپس آئیں۔ ان کے سامنے پرویز کی لاش تھی۔ ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ سمجھ چکی تھیں کہ وہ کیا کر گزری تھیں۔ فرزانہ نے گہری سانس بھری اور چہرہ اوپر اٹھایا۔ مناج منہ کھولے، برف کے مجسمے کی طرح سب دیکھ رہی تھی۔

فرزانہ کھڑی ہوئیں۔ چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔ مناج کا ہاتھ پکڑ کے وہ اسے کمرے میں لے کر آئیں۔ اسے نہلایا، خود بھی نہائیں۔ کپڑے بدلے اور ایک پیپر پہ کچھ لکھا۔ پھر اس پیپر کو ایک بھورے لفافے میں ڈال دیا۔ ایک بھوری پشمینہ شال انہوں نے اپنے اوپر لپیٹی اور اس کی اوٹ میں وہ لفافہ چھپا لیا۔ وہ مناج کا ہاتھ تھامے اب گھر سے نکل گئیں۔ مناج کے چہرے پہ گہرا شاک اور صدمہ تھا۔ اس کے سامنے وہ منظر بار بار لہرائے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا، اور کرب بھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس نے کیا دیکھ لیا۔

بس ایک پوش علاقے میں اتری۔ رات گہری تھی اس لیے سڑکیں سنسان تھیں۔ وہ مناج کا ہاتھ پکڑے کچھ دیر سڑک پہ چلتے گئیں اور پھر بیچ سڑک پہ اچانک سے رک گئیں۔ وہ مناج کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھیں۔ آنکھوں میں بے پناہ محبت لیے وہ اسے دیکھ رہی تھیں۔

"تمہیں پتا ہے نا، تمہاری خالہ کا گھر کدھر ہے مناج؟" فرزانہ کی آنکھیں نم تھیں مگر وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے بولیں۔ وہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ تیرہ سالہ مناج کے سامنے اب بھی وہ خوفناک منظر لہرا رہا تھا۔ فرزانہ نے اپنی پشمینہ شال کی اوٹ سے وہ خط نکالا اور مناج کو تھما دیا۔

"تم یہ خط اپنی خالہ کو دے دینا۔میں بس ابھی کچھ کام نبٹا کر آتی ہوں۔ٹھیک؟" فرزانہ نے مناج کا ماتھا چوما۔آنکھ سے آنسو نکلا، جو انہوں نے پونچھ دیا۔مناج کچھ نہ بولی بس اپنا سر اثبات میں ہلانے لگی۔

وہ یوں ہی گھٹنوں کے بل بیٹھے مناج کو دیکھے جارہی تھیں۔وہ جانا چاہتی تھیں، مگر۔۔۔مگر، اس کے لیے بہت ہمت چاہیے تھی۔

"مناج۔" فرزانہ ایک دم سے بولیں۔"تمہارے ابو کہا کرتے تھے کہ۔" فرزانہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔وہ مناج کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔"تم ایک با وقار ماہرانی ہو۔ایک مضبوط نفس کی، بہادر اور دلیر ملکہ۔وہ بالکل سچ کہتے تھے مناج۔تم واقعی ایک با وقار ماہرانی ہو۔تم ایک ملکہ ہو، ملکہ۔اور مرتے دم تک ایک ملکہ رہو گی۔اپنے ابو کی وہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھنا۔" فرزانہ نے آنکھ کے کونے میں آتا ایک آنسو صاف کیا۔گیلی سانس اندر کھینچی۔ مناج بس اپنی ماں کو سنتے گئی۔فرزانہ نے اپنی پشمینہ شال اتاری اور مناج کے کندھوں کے گرد لپیٹ دی۔

"ٹھنڈ بہت ہو رہی ہے۔اسے اوڑھ لو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔آنسو اب بھی رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"اپنا خیال رکھنا۔"فرزانہ کھڑی ہوئیں اور مڑ کے جانے لگیں، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

وہ سیدھا رضیہ کے چار سو گز کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں پر جب وہ گئی تو گارڈز نے اندر اطلاع دی۔ رضیہ اور امجد بالکل پریشان ہو گئے۔ مناج کچھ بول بھی نہیں رہی تھی۔ اور پھر مناج نے رضیہ کو وہ خط تھما دیا۔

"پیاری بہن،

مجھ سے شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خطا ہو گئی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔

میں نے پرویز کا قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش اب پہچاننے کے لائق بھی نہیں چھوڑی۔ مگر مجھے اس قتل پہ ذرہ برابر بھی شرم و ندامت نہیں۔ اگر مجھے سو دفعہ بھی موقع دیا جائے تو میں اگلی سو دفعہ بھی یہی کروں گی۔

اس نے مناج کا پیٹ کاٹ کے اس کا گردہ نکال دیا۔ میں ہر ظلم سہتے گئی۔ مگر یہ ظلم مجھ سے نہیں برداشت ہوا اور میں نے اسے اس کے انجام تک پہنچا دیا۔ میں مناج کو یہاں چھوڑ رہی ہوں۔ تم اس کا خیال رکھنا۔ اس کا بچپن سے خواب تھا کہ وہ ایک وکیل بنے۔ وہ بھی کورٹ میں جائے اور یور آنر یور آنر کر کے مجھ جیسی عورتوں کو انصاف دلوائے۔ میں نہیں آسکتی رضیہ۔ پرویز کے گھر والے بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر میں وہاں آجاتی تو پرویز کے گھر والے میرے ساتھ ساتھ تمہارا اور مناج کا جینا حرام کر دیتے۔ میں یہ سب مناج کے لیے ہی کر رہی ہوں۔ بس وہ کسی طرح سے محفوظ رہے۔ خوش رہے۔ اس لیے تم لوگ میری پرواہ نہ کرو۔ اگر میں آ بھی جاتی تب بھی مجھے مار دیا جاتا۔ تو میں کیوں سب کی زندگی خراب کروں؟

میں اپنے آپ کو اپنی بیٹی کے لئے قربان کرتی ہوں۔

میں اس قربانی سے اس کی زندگی محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”امی کی لاش پرویز کے ساتھ ہی پائی گئی۔خالو نے پولیس کو فوراً اطلاع دی۔ انہوں نے جب پرویز کے گھر ریڈ کی تو امی بھی وہیں تھیں۔ مردہ۔انہوں نے اسی چھری سے اپنے دل میں ایسے زخم اتارے کے وہ بھی چلی گئیں۔اس کے بعد سے میں وہ بن گئی جو میں اب ہوں۔میں نہ کسی کو دوست بناتی تھی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔اپنے آپ کو میں نے ہر جذبے سے پاک کر لیا۔“ مناج کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔درے کا پھوٹ پھوٹ کے رونے کا دل چاہ رہا تھا مگر وہ نہیں روئی۔وہ اپنے آپ پر قابو کئے ہوئے تھی۔

خاموشی کچھ دیر درے کے کمرے میں برقرار رہی۔پھر درے نے لب کھولے اور اپنی بات کا آغاز کیا۔

”تمہاری امی کی آخری خواہش تھی کہ تم ایک باوقار لڑکی بنو۔تم زندگی میں کچھ بڑا کرو مناج۔تمہارے ابو کی بھی یہی خواہش تھی۔تم کیوں ان سب کی خواہشات کا احترام نہیں کرتی؟ تمہاری امی اس لیے تو قربان نہیں ہوئی تھی کہ تم وہ بن جاؤ جو تم اب ہو۔وہ قربان اس لیے ہوئی تھیں تاکہ تم ایک بہتر انسان بن سکو۔تم خوش رہ سکو۔وہ تمہیں آزاد کرنے کے لیے قربان ہوئی۔اور تم اپنی امی کی

قربانی کو رائگاں کیسے جانے دے سکتی ہو؟" درے ٹھہر ٹھہر کے نرمی سے بولی۔ مناج کچھ دیر کچھ نہ بولی۔ وہ درے کی باتوں کے اوپر نظر ثانی کرتے گئی۔

"میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔" مناج کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"مناج تم کون ہو؟" درے نے اچانک سے سوال کیا تو مناج الجھ گئی۔

"مطلب؟"

"مناج تم آج اقرار کرو گی خود سے، کہ تم ایک با وقار ماہرانی ہو۔ ایک مضبوط نفس کی بہادر لڑکی۔ تیار ہو؟"

در فشاں نے کہا۔ مناج مزید الجھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"مگر یہ سچ تو نہیں۔" مناج نے کہا۔

"کھڑی ہو جاؤ۔" مناج کی بات کو نظر انداز کرتے در فشاں نے حکم جاری کیا۔ مناج کھڑی ہو گئی۔ درے نے کھڑے ہو کے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"اب جو میں کہہ رہی ہوں وہ دہراؤ۔" درے نے کہا۔ مناج نے سر اثبات میں ہلایا۔

"میں مناج ایک با وقار ماہرانی ہوں!" درے نے ہر ایک لفظ پہ زور دیا۔ مناج کے حلق میں جیسے پھندا سا لگ گیا۔ ایک عجیب سا احساس دل پہ سوار تھا۔ دل کو نادیدہ زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔ وہ نہیں بول پا رہی تھی۔

"میں مناج۔۔" مناج کی آواز اٹکی۔"میں مناج ایک باوقار ماہرانی۔" مناج کی آنکھ سے آنسو رواں ہوئے۔دل میں موجود نادیدہ زنجیروں نے کھلنا شروع کردیا تھا۔

"اور میں ایک مضبوط نفس کی۔" درے نے کہا۔مناج کے آنسو اب اور بھی تیزی سے روانہ ہوئے۔ یہ اقرار اس کے وجود میں ایک قوت بھرنے لگا تھا۔

"اور میں۔" مناج کی آواز کپکپائی مگر اب کہنا آسان تھا۔"ایک مضبوط نفس کی۔" مناج نے اپنا سر جھکا لیا۔

"بہادر اور دلیر لڑکی ہوں"!

' 'بہادر۔" مناج نے اب درے کی آنکھوں میں دیکھا۔اسے لگا جیسے وہ آزاد ہو رہی تھی۔وہ جیسے رہائی پا رہی تھی

"اور دلیر لڑکی ہوں!" مناج نے کہا تو دل پہ لگی وہ ان دیکھی زنجیریں اپنی گرفت ڈھیلی کرنے لگیں اور پھر فنا ہو گئیں۔

مناج کا وجود جیسے ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔وہ ہنسنے لگی، یہ ہنسی فتح کی ہنسی تھی۔پھر وہ ہنستے ہنستے رونے لگی۔یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

مناج نے مناج کو فتح کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا وقت تھا۔درے اپنے کلینک میں بیٹھی ہوئی تھی۔چہرے پہ واضح تھکان تھی۔کچھ دیر بعد کلینک میں حسام دروازے سے اندر آیا۔درے کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس وقت اسی کے منتظر تھی۔

حسام کے چہرے پہ تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔رسمی علیک سلیک کے بعد درے نے بات کا آغاز کیا۔

"جی حسام۔مناج نے بتایا تھا کہ آپ کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملنا ہے۔" دِرفشاں کا انداز بالکل اسپاٹ تھا۔حسام نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی۔" حسام نے ہاتھ میں موجود ڈاکومنٹس ٹیبل پر رکھے۔درے نے انہیں اٹھا کر دیکھا۔وہ ریہیب کے ڈاکیومنٹ تھے۔حسام اپنا ریہیب کھولنے جا رہا تھا اور یہ اس کے آفیشل ڈاکومنٹس تھے۔درے کی آنکھوں میں دلچسپی در آئی۔وہ ان ڈاکومنٹس کو غور سے پڑھنے لگی۔

"در اصل میں کچھ ہفتوں میں اپنا ریہیب کھولنے جارہا ہوں۔ریہیب میری کمپنی فنڈ کر رہی ہے اور میرا مقصد اس ریہیب کے ذریعے لوگوں کو مفت سہولیات فراہم کرنا ہے۔میں اپنے ریہیب کے لیے کچھ ذمہ دار ڈاکٹرز اور سائیکولاجسٹ تلاش کر رہا ہوں۔مس مناج نے آپ کا بتایا تو میں آپ کی طرف چلا آیا۔" درفشاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔اس کی اور احمد کی ایسے ہی پرورش کی گئی تھی، وہ نیکی کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی تھی۔

"یہ تو بہت اچھا ہے۔آپ فکر نہ کریں اگر اس کے پیچھے نیت خالص ہے اور واقعی یہ صرف اور صرف لوگوں کی فلاح کے لیے کھولا جا رہا ہے پھر تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔میں آپ کا بھرپور ساتھ دوں گی اور ڈاکٹرز کی ٹیم کا بھی انتظام کر دوں گی۔" درے نے فوراً جواب دیا۔

"جی بالکل۔میں شکر گزار رہوں گا۔" حسام پر خلوص انداز میں بولا۔

"اچھا میں ایک دفعہ ریہیب سینٹر کی لوکیش بھی دیکھنا چاہوں گی۔" در فشاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل آپ کل صبح آجائیں۔میں آپ کو دکھا دوں گا۔بس آج کل فینیشنگ چل رہی ہے۔" حسام نے بتایا۔معمول کی گفتگو کے بعد وہ چلا گیا اور در فشاں بھی اپنے گھر چلے گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح حسام اور درے ریہیب کی لوکیشن پہ پہنچ گئے تھے جہاں تعمیراتی کام جاری تھا۔درے حسام کا ریہیب دیکھ کر بہت متاثر ہوئی تھی۔صاف صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ریہیب پہ بہت لگن کے ساتھ کام کیا گیا تھا۔

"ویسے، آپ نے کام بہترین کیا ہے۔" درے کا لہجہ متاثر کن تھا۔دونوں اس وقت ریہیب کے باہر کھڑے تھے۔اندر چلتی مشینوں کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔

"جی، میں خود ایک معمار ہوں۔اور اپنے ریہیب کے سٹرکچر پہ میں نے بہت محنت کی ہے۔" حسام نے سادگی سے بتایا۔اس کے انداز میں بالکل بھی اکڑ نہیں تھی۔

"ویسے حسام صاحب۔اس طرح سے ریہیب کھولنا،وہ بھی مفت میں ایک بہت بڑا قدم ہے۔آخر اس سب کے پیچھے آپ کی موٹیویشن کیا تھی؟" درے کو تجسس ہوا تھا۔

"در فشاں، در اصل میں نے اپنی جوانی خود نشے کے ہاتھوں ضائع کی ہے۔" حسام کا سر ندامت کے مارے جھک گیا۔"اس کا سارا الزام مجھ پر ہے۔میں نے اپنی ایڈکشن کی وجہ سے اپنی سابقہ بیوی کی بھی زندگی برباد کی۔میں اپنی لت کی وجہ سے در بدر بھٹکا ہوں۔میں نے جیل تک میں تین خوف ناک ماہ گزارے ہیں۔میں نے لندن کے ریہیب میں تنہا زندگی گزاری ہے۔اور پھر میں واپس آیا تو اپنی بیٹی کی ایک ایک جھلک کے لیے ترسا ہوں۔میں بس اب مزید اپنی زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔میں کچھ بڑا کرنا چاہتا تھا۔اللہ نے مجھے راستہ دکھایااور پھر میں نے اپنے اس خواب پہ کام شروع کیا۔" حسام بالکل سادہ سا بولا کرتا تھا۔بہت نرمی سے۔اس کا انداز تکبر سے پاک تھا۔

"متاثر کن۔" نرمی سے مسکراتے ہوئے درے نے تبصرہ کیا۔"آپ نے اپنی زندگی سے سیکھا ہے حسام صاحب۔اب آپ کو شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔میں اس ریہیب کا حصہ بن کے اور بھی فخر محسوس کروں گی۔میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ اپنے ریہیب کا پیغام عام لوگوں تک کیسے پہنچائیں گے؟" درے نے دلچسپی لیتے پوچھا۔

"میں نے اس کے لیے بہت کچھ سوچا ہوا ہے۔میں نے ایک سوشل میڈیا ٹیم مقرر کر رکھی ہے۔ ہمارے انسٹاگرام، فیس بک اور ٹویٹر اکاؤنٹس پہلے سے بنے ہوئے ہیں۔میں اس ریہیب کی پروموشن کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔میں جگہ جگہ پوسٹرز لگواؤں گا۔ٹی وی پر ایڈ چلاؤں گا۔ ٹی وی کے لیے شارٹ فلمز وغیرہ بنواؤں گا۔بس کسی طرح سے ہماری عوام کی توجہ بھی اس طرف مرکوز ہو سکے۔یہ نشہ ہمارے معاشرے میں بہت عام ہو گیا ہے۔خاص طور پر سگریٹ اور ویپس۔ہم جب تک ان سے نفرت نہیں کریں گے تب تک ہم ان سے آزادی نہیں پا سکیں گے۔میں عام عوام

کو بتانا چاہتا ہوں کے یہ چیزیں ہمیں کس طرح سے کھا رہی ہیں، ہمیں کس طرح سے کھوکھلا کر رہی ہیں۔" درے کو حسام کا دھیما سا انداز اچھا لگنے لگا۔اس نے واقعی ہر چیز کی پلاننگ کر رکھی تھی۔

"اللہ آپ کو کامیاب کرے حسام۔میری یہی دعا ہے۔" حسام نے مسکرا کے آمین کہا۔

اسی وقت حسام اور درے کی طرف ایک بلی چلتے ہوئے آئی۔درے نے اسے آگے بڑھ کے چھونا چاہا مگر وہ بلی فوراً سے دور ہو گئی۔درے پھر مایوس سی پیچھے ہٹ گئی۔

درے کے بعد حسام آگے بڑھا۔وہ اپنے گھٹنوں کے بل پر سکون سا ہو کے بیٹھا۔اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔وہ بلی اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔حسام پچکارتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے چٹکی بجانے لگا۔درے یہ سب تعجب سے دیکھ رہی تھی۔بلی پھر ہچکچاتے ہوئے حسام کی طرف آنے لگی۔درے بالکل دنگ رہ گئی۔بلی حسام کی طرف آئی تو حسام اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔بلی بھی اپنے سر پہ حسام سے ہاتھ پھرواتے ہوئے بہت ہی محظوظ ہو رہی تھی۔

"یہ آپ نے کیسے کیا حسام؟ وہ مجھ سے تو فوراً ڈر کے بھاگ گئی تھی۔" درے نے آواز میں عجب لیے پوچھا۔

"آپ نے اس کو اچانک سے گھیر لیا اس لیے وہ گھبرا گئی۔آپ پہلے اس کے سامنے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتی۔اسے یقین دلاتی کہ اسے آپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔اور پھر اسے بلاتی اس طرح وہ آپ کے پاس ضرور آتی۔" حسام نے کہا۔

"یہ سب آپ نے کہاں سے سیکھا؟" درفشاں نے کہا۔حسام زیر لب ہنس دیا۔

"میں تیس کا ہوں مگر مجھے بلیوں سے اب بھی اتنا پیار ہے جتنا بچپن میں تھا۔میں نے بلیو ں کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارا ہے اور اب میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔آپ کو بھی بلیوں کا شوق ہے؟" حسام نے اپنے دھیمے سے انداز میں بات ختم کی اور پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ بلی اب اسکے پاؤں سے ٹکرے مار رہی تھی۔یہ بھی ایک ہنر تھا۔جانور کو اپنے آپ سے ایک جھٹکے میں محبت کروا دینا۔

"ہاں۔بلیوں کا شوق کسے نہیں ہوتا۔حضور ﷺ تک کے پاس بلی ہوتی تھی جس کا نام معزہ تھا۔مجھے تو بلیوں کا بہت شوق ہے مگر پالنے کا وقت نہیں ملتا۔" درے نے کہا۔

"میں اس کو گھر لے کر جاؤں گا۔کافی سالوں سے میرے گھر میں کسی بلی نے قدم نہیں رکھا۔آپ بتائیں، کیا نام رکھا جائے اس ننھی سی جان کا؟" حسام نے درے سے پوچھا۔درے کو حسام میں کچھ اچھا لگا۔اس کا دل بہت سادہ سا تھا۔

درے اس بلی کو دیکھنے لگی۔اس کا چہرہ بہت ہی پیارا سا تھا۔کان اس کے کالے تھے۔ناک بھی کالی سی تھی۔وہ بہت ہی کیوٹ تھی۔دیکھنے والے کو اس پہ پیار ضرور آتا تھا۔

"ہنہہ" درے نے سوچتے ہوئے کہا۔"اس کا نام ہم لونا رکھتے ہیں۔کیا خیال؟" درے نے کہا۔

"جو حکم۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ چاروں عافیت زندگی کی خفیہ بیسمنٹ میں بنے اس ملاقاتی کمرے میں جمع ہوئے تھے۔

ان کے ہاتھ میں مہر اور احمد کی تصویریں تھیں۔ مسکراتا ہوا احمد اور مسکراتی ہوئی مہر جو کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔سب کے ماتھوں پہ شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔ان تصاویر نے سب کو ہی بے حد کنفیوژ کر دیا تھا۔

"کیا ہمیں ڈرنا چاہیے لیڈی؟" درانی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔لیڈی اقتدار بھی گہری سوچ میں تھی۔

"میں اتنی جلدی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔میں مزید انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ہمارے سامنے احمد ہے،احمد۔اگر واقعی یہ مہر کی زندگی میں اس لیے داخل ہوا ہے تاکہ ہمیں برباد کر سکے تو ہمیں محتاط ہونا پڑے گا۔" لیڈی اقتدار کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تعاقب کرواتے ہیں اس کا۔" نیلوفر نے اپنی تجویز پیش کی۔لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا۔

"بہت جلدی ہے یہ۔ابھی کچھ بھی صاف نہیں ہے۔فرض کرو کہ وہ ہمیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا، اگر ہم اس کا تعاقب کریں گے تو ہم اس کی توجہ لے سکتے ہیں۔مجھے یقین ہے وہ سمجھ جائے گا۔مجھے اس کی توجہ نہیں لینی ہے۔" لیڈی اقتدار سوچتے ہوئے بولی۔

"پھر ہم آخر کریں گے کیا؟" نیلوفر پریشانی کے عالم میں بولی۔

"انتظار۔مہر کا تعاقب کرو۔کالز ٹیپ کرو۔وہ اگر ملیں گے تو ہمیں پتا چل جائے گا۔فی الحال دو امکان ہیں۔" لیڈی اقتدار اب سیدھی ہو کے بیٹھی۔اس نے ایک پر سکون سانس خارج کی۔اس کے دماغ میں تصویر بننا شروع ہو چکی تھی۔

"کیسے امکان؟" شمس نے پوچھا۔

"پہلا امکان۔ وہ دونوں آپس میں اچھے دوست ہوں۔ یا دوست سے بڑھ کے۔ اس صورت میں بھی ہم احمد کو مہر کے قریب برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ان دونوں کو الگ کرنا ضروری ہو گا۔" لیڈی اقتدار کے ماتھے پہ بل اب ڈھیلے ہوئے۔

"اور دوسرا امکان؟" اس بار بھی سوال پوچھنے والا شمس تھا۔

"وہ مہر کے ساتھ کسی مقصد سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا مقصد اس کا عزم صرف ایک ہی ہے، اور وہ ہے ہمیں تباہ کرنا۔ وہ یقیناً ہمیں گرانا چاہتا ہے۔ اس صورت میں بھی ہمیں دونوں کو الگ کرنا ہو گا۔" ایک کے بعد ایک سوالیہ نشان ابھرتا جا رہا تھا۔

"اور ہم ایسا کیسے کریں گے لیڈی؟" درانی نے پوچھا۔

"مہر کو جرائم کی دنیا میں اپنا ساتھی بنا کے۔ یہ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا، یہی ہمارا پلان تھا۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری۔ "اگر دونوں صرف دوست ہیں تو کچھ دیر کے لیے ہم رک سکتے ہیں اور ٹھیک وقت کا انتظار کر کے مہر کو جرائم کی دنیا کا مہمان بنا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو۔۔۔ تو پھر ہمیں یہ سب بہت جلد کرنا ہو گا۔ مگر جب تک احمد کے عزائم یقینی نہیں ہو جاتے ہم کوئی بھی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہمیں احمد کی غیر ضروری توجہ نہیں لینی ہے۔" لیڈی اقتدار کے دماغ میں لائحہ عمل تیار تھا۔

"اور ہم اس کے عزائم کی تصدیق کیسے کریں گے؟" شمس بولا تو لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ درانی نے لیڈی اقتدار کے اوپر نظر ڈالی۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"ہمیں تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس بار درانی بولا۔لیڈی اقتدار نے سر ہاں میں ہلایا۔

"احمد ایک بہت اچھا فریق ہے۔یہی بات اس کی سب سے اچھی ہے۔اسے جب جنگ کرنی ہوتی ہے تو وہ کھلم کھلا جنگ کرتا ہے، ڈرپوکوں کی طرح پیچھے سے وار نہیں کرتا۔اسے جب اعلان جنگ کرنا ہوگا تو اس کا اشارہ ہم تک پہنچ جائے گا۔اس لیے ہمیں صرف اشارے کا انتظار کرنا ہوگا۔" نیلوفر اور شمس بات کو سمجھ چکے تھے۔

لیڈی اقتدار اب کھڑی ہوگئی۔ان کے چہرے پہ اطمینان تھا۔

"میری بات واضح ہو چکی ہوگی۔مہر کے اوپر نظر رکھو۔اس کی ہر ایک حرکت سے مجھے آگاہ کیا جائے گا۔درانی تم مہر کی ہر حرکت کو باریکی سے جانچو گے۔ذرا سی بھی گڑبڑ نظر آئے تو آگاہ کر دینا۔نیلوفر تم مہر سے ایک بار پھر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔اس کے قریب رہو۔اس سے احمد کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرو۔اور شمس، تم سب انتظام کرو گے۔کون سا آدمی کس طرح تعاقب کرے گا وہ تم سنبھالو گے۔ہم سب ایک ٹیم ہیں۔اب اگر احمد آگیا ہے تو اس کا مقابلہ بھی ہم ہی کریں گے۔تم سب کو سمجھ آگئی ہے؟" آواز میں الگ سی جست تھی۔

سب نے ملکہ کی بات کو ذہن نشین کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔لیڈی اقتدار کی گردن مزید تن چکی تھی۔وہ آنکھوں میں جست لیے اپنے قدم بڑھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔شاہانہ چال میں رعب اب بھی برقرار تھا۔

یہ تو طے تھا کہ اندھیرے اور برائی کی یہ ملکہ، اتنی آسانی سے ٹوٹنے والی نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اب آئندہ سے کام کی باتیں اسی موبائل سے ہوں گی۔امکان ہے کہ آپ کے اصل موبائل پہ کالز ٹیپ ہورہی ہوں گی۔میں ابھی سب کچھ نہیں بتانا چاہ رہا، مگر آئندہ سے کام کی باتیں اسی موبائل سے ہونے والی ہیں۔ٹھیک؟"

رات کا وقت تھا۔مہر کام سے فارغ ہو چکی تھی۔عنایا کمرے میں سو رہی تھی اور مہر دھیمی آواز میں اپنے نئے موبائل پہ احمد سے گفت و شنید میں مصروف تھی۔

اسے آفس میں ایک پارسل بھجوایا گیا تھا۔احمد نے ساتھ ہی نوٹ بھیجا تھا کہ رات میں اسی موبائل سے وہ اسے کال کرے۔مہر نے اس کی بات پہ عمل کیا اور اسے اس موبائل سے کال کی۔

"ٹھیک ہے۔لیکن آفس کے لاکرز؟ وہ کب دیکھیں گے؟" مہر سرگوشی کرنے والے انداز میں بولی۔

"مجھے کچھ دن کا وقت چاہیے۔پہلے مجھے تسلی کرنے دیں کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے کہ نہیں۔میں ابھی ان پہ اپنے مقاصد کا اعلان نہیں کرنا چاہ رہا۔بس آپ نے وہ لاکرز میرے بغیر نہیں کھولنے۔" احمد نے آخری فقرے پہ زور دیا۔مہر سر اوپر نیچے ہلانے لگی۔

"ہم اس سے نکل تو جائیں گے ناں۔" مہر نے اپنی عدم یقینی کا اظہار کیا۔

"آپ بس میری سنتی جائیں تو کچھ نہیں ہو گا۔یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔اگر آپ اکیلے اپنی جنگ لڑنے لگیں تو یہ لوگ آپ کو برباد کر دیں گے۔اس لیے بس، بھروسہ رکھیں۔جیسے کہہ رہا ہوں ویسے

کرتی جائیں۔میں آپ کو اس سب سے نکال لوں گا۔" مہر پر اطمینان سا مسکرا دی۔اسے احمد کے الفاظ ہمیشہ کی طرح تسلی دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔

"اب آپ نے بس ادھر ادھر جانا ہے۔ان لوگوں کو ایسا تاثر دینا ہے جیسے آپ ہیرے ڈھونڈ رہی ہیں۔مجھے یقین ہے یہ آپ کر ہی لیں گی۔میں کال رکھتا ہوں۔اپنا خیال رکھیئے گا۔" اور کال کٹ گئی۔

مہر نے موبائل کان سے جدا کیا۔اس کے چہرے پہ سنجیدگی تھی۔اس کی روح اب بھی بے چین تھی۔ آخر کب وہ اس سب سے نکلنے والی تھی؟

وہ چاہتی تھی کہ بس وہ آنکھ کھولے تو اگلے لمحے ہی سب ختم ہو گیا ہو اور وہ اس سب سے آزاد ہو گئی ہو۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ ایک ریسٹورانٹ کا منظر ہے۔

ریسٹورانٹ بہت ہی خوبصورت علاقے میں واقع تھا۔آس پاس گھنے درخت اور جنگلات موجود تھے۔ در فشاں شیشے کی دیوار کے پاس بیٹھی موبائل میں مگن تھی۔اس نے لال شرٹ پہ بلو جینز کی اسکرٹ پہنی تھی۔بالوں کو آج جوڑے میں مقید کیا ہوا تھا۔

کچھ دیر میں مناج وہاں پہ آئی۔وہ بھی اچھے سے تیار ہوئی تھی۔اس کی چال اب پہلے سے کم بے جان تھی۔البتہ انداز اب بھی کچھ مشینی سا تھا، یہ مشینی انداز اب اس کی فطرت بن چکا تھا۔مگر اندر سے

وہ قدرے بہتر تھی۔ اس کے زخم بھی آہستہ آہستہ بھرنے لگے تھے۔ آج بھی در فشاں کے ساتھ اس کا ایک سیشن تھا جس کے سلسلے میں درے نے اسے اس خوبصورت سے ریسٹورانٹ میں بلوا لیا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد دونوں نے معمول کی باتیں کیں۔ درے نے پچھلے ہفتے کا حال احوال دریافت کیا، مناج بھی اسے سب بتاتے گئی۔ اس ہفتے کیا ٹھیک ہوا تھا، کون سے چیلنجز آئے وہ در فشاں کو تفصیل سے بتاتے گئی۔ در فشاں بھی سرعت سے اسے سنتے گئی۔

"ڈپریشن ایک دلدل کی طرح ہوتا ہے مناج۔ ایک دلدل جس میں انسان اپنے آپ کو قید کر لیتا ہے۔ وہ جتنا اس دلدل کے بارے میں سوچتا ہے اتنا ہی وہ اس میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس دلدل سے پتا ہے کیسے نکلا جاتا ہے؟ اپنے آپ کو آزاد چھوڑ کے۔ اپنے منفی خیالات سے جان چھڑا کے۔ دلدل میں انسان جتنا زیادہ دھنسا ہوا ہوتا ہے، اسے نکلنے میں بھی اتنا ہی وقت درکار ہوتا ہے، اور توانائی بھی۔" درے اسے سب سمجھا رہی تھی۔ مناج بھی درے کی باتوں کو پوری طرح سے سمجھ رہی تھی۔

**(مناج اب اپنی خالہ سے اچھے تعلقات رکھتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ کس طرح کتنے سال اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں۔ مناج نے اب ان سے تعلقات درست کر لیے تھے۔ وہ آئے دن ان کے ساتھ گھومنے جاتی تھی۔ وہ جیسے اپنے ضائع کیے ہوئے سالوں کا مداوا کرنا چاہ رہی تھی۔)**

"ڈپریشن کی بھی بہت اقسام ہیں، بہت درجات ہیں۔ تم اپنے خیالات کی قید میں تھی۔ تمہارے ساتھ چائیلڈہوڈ ٹراما جڑا ہوا تھا۔ یہ ایک سنگین مرض ہوتا ہے، مگر اس سے نکلا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے تم جیسے جیسے اس دلدل سے قدم باہر بڑھاتی جاؤ گی تمہیں یہ دنیا اتنی ہی پسند آئے گی۔ تم آزادی کو اپنی روح میں اترتا محسوس کرو گی مناج۔"

(وہ روز صبح واک پہ جاتی تھی۔اسے قدرت کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔اسے اچھا لگتا تھا آسمان کو دیکھنا۔چڑیا کا چہچہانا بھی اسے اچھا لگتا تھا۔بارش ہوتی تو وہ اس میں نہایا کرتی۔اسے اپنی آزادی اچھی لگتی تھی۔اسے اپنی قید اب یاد نہیں آتی تھی۔وہ آہستہ آہستہ بہتری کی طرف جا رہی تھی۔)

"تم نے اپنے آپ کو اپنے خیالات سے آزاد رکھنا ہے۔تمہارا دماغ باز نہیں آئے گا۔وہ تمہیں آئے دن منفی چیزیں سوچنے پہ مجبور کرے گا، لیکن تم نے اپنے اس بگڑے ہوئے اعضاء کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکنے ہیں۔ تمہیں اس کا سپہ سالار بننا ہے مناج۔ تمہیں اسے قابو کرنا سیکھنا ہے مناج۔ تمہیں اپنے نفس کو مضبوط کرنا ہے مناج۔"

(کبھی کبھی وہ صبح صبح اٹھتی تھی اس کی چال بالکل بجھ جاتی تھی۔ ایک دفعہ پھر سے اس کے سامنے سب منظر دہرانے لگتے تھے۔مگر اب وہ درفشاں کی باتوں پہ عمل کرتی تھی۔وہ اپنے خیالات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی تھی۔بلکہ اب وہ ان کا مقابلہ کرتی تھی۔اس نے اپنے ماضی کو اب اپنی طاقت بنا لیا تھا۔)

"اپنے آپ کو ہر وقت مصروف رکھو۔کوئی مشغلہ تلاش کر لو۔کوئی سرگرمی تلاش کر لو۔مگر اپنے آپ کو فارغ نہ رکھو۔ایک وقت آئے گا جب تمہارے منفی خیالات تمہیں خود ہی تنگ کرنا چھوڑ دیں گے، کیونکہ تمہارے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں رہے گا۔تم نے ہر صورت اپنے آپ کو بہتر کرنے کی کوشش کرنی ہے۔"

(وہ صبح اٹھ کے واک کر کے اپنے گھر کے قریب ہی ایک لیڈیز جم تھا، وہاں جاتی تھی۔وہ اپنے جسم کا خیال رکھتی تھی۔وہ کسرت کرتی تھی۔گھر آ کے وہ اپنا ناشتہ بناتی تھی اور اپنی خالہ کی بھی مدد کرتی

**تھی۔ صبح سے شام تک وہ لاء پریکٹس کرتی تھی۔اس سب کے درمیان مناج کو پراجیکٹ حرر بھی مل چکا تھا۔حرر نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔وہ حرر پہ بھی ساتھ ساتھ کام کرتی رہتی تھی۔ حرر نے اس کی زندگی میں ایک مقصد بھر دیا تھا۔وہ ایک بڑا قدم آگے بڑھانے کے لیے بھی تیار تھی۔)**

”اور اس سب میں اپنے رب کو نہ بھولنا۔یاد رکھو، جو بھی ہوتا ہے اس کی اجازت سے ہوتا ہے۔وہ قدیر ہے۔تم نے اپنے رب کو نہیں بھولنا ہے۔ تمہیں بس وہی کرنا ہے جو اسے راضی کرے۔رب کو جانے بغیر دنیا کی کوئی بھی شے حاصل کرنا بے وقوفی ہے۔تم اس رب کو بھی جانو، اور اپنی دنیا بھی سنوارو۔وہ اللہ تمہاری اب تک مدد کرتے آرہا ہے، وہ آگے بھی تم پہ بہت مہربان ہوگا۔“ درفشاں نے اپنی بات مکمل کی۔ مناج مسکرا دی۔وہ بھی تیار تھی، ایک دفعہ پھر سے اڑان بھرنے کے لیے۔ آسمانوں کی پرواز کرنے کے لیے، بادلوں کی سیر کرنے کے لیے، دنیا کو فتح کرنے کے لیے۔

مناج اب تیار تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ۷:تحریکِ حرر

میرے اندر کچھ بدل چکا ہے،

کچھ ہے جو پہلے جیسا نہیں رہا،

میں تھک گئی ہوں دوسروں کے بنائے گئے اصولوں پر جیتے جیتے،

اب دوبارہ سوچنے کا وقت گزر گیا ہے،

اب دوبارہ سو جانے کا وقت گزر چکا ہے،

ابھی تو وقت ہوا ہے اپنی جبلت پہ بھروسہ رکھنے کا،

آنکھیں بند کرنے کا، اور اڑ جانے کا!

اب وقت ہے کہ میں کوشش کروں،

کششِ ثقل کو جھٹلانے کی،

میں سوچتی ہوں مجھے کوشش کرنی چاہیئے،

کشش ثقل کو جھٹلانے کی،

مجھے الوداع کہہ دو،

میں کشش ثقل کو جھٹلا رہی ہوں!

اور تم مجھے کبھی نیچے نہیں لا سکو گے۔

میں تھک گئی ہوں حدوں کو مانتے مانتے،

کیونکہ کسی نے کہا تھا کہ حدیں ہوتی ہیں،

کچھ چیزیں شاید کبھی نہیں بدلتی،

مگر جب تک میں کوشش نہیں کروں گی میں کیسے جانوں گی؟

بہت عرصے سے میں ڈر رہی تھی،

اس پیار کو کھونے سے جس کو میں کب سے کھو چکی،

اور ایسا پیار ہی کیا،

جو بہت بڑی قیمت چکانے کے بعد ملے۔

اب وقت ہے کہ میں،

کشش ثقل کو جھٹلاؤں!

(وکٹر کی ایلفابا)

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ عافیت زندگی کے اس خفیہ ہال کا منظر ہے۔وہی تین دروازوں والا حال، جو عافیت زندگی کی بیسمنٹ میں واقع ہے۔۔۔

لفٹ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ نیچے اتری۔لفٹ کا دروازہ کھلا تو نیلوفر لفٹ سے باہر قدم بڑھانے لگی۔اس نے کالا لیڈیز کورٹ پہنا ہوا تھا، اورا سکن ٹائیٹ پینٹ بھی۔ہاتھوں میں اس کے فش نیٹ گلوز تھے اور پیروں میں اونچی کالی ہیلز۔کالے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اندر سے اس کی کالی شرٹ نمایاں ہوتی تھی۔اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

سامنے والی دیوار پہ تین دروازے تھے۔خلاف معمول اس نے آج درمیان والے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔وہ آج یہاں ملاقاتی کمرے میں جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔دروازے کے بالکل قریب آکر وہ رک گئی۔اسے جیسے کچھ یاد آیا۔

اس نے اپنی کوٹ کی جیب کھنگالی۔اس میں سے ایک تہ شدہ سفید ماسک نکالا۔ماسک کی تہوں کو کھول کر اس نے اپنے چہرے پہ چڑھا لیا۔اس کا پورا چہرہ ڈھک چکا تھا۔آنکھوں کی طرف دو سوراخ تھے، جن کے تحت وہ دیکھ سکتی تھی، ناک کی طرف دو سوراخ تھے جن کے تحت وہ با آسانی سانس لے سکتی تھی۔اس نے لوہے کے بنے ہوئے سرد ناب پہ ہاتھ رکھا۔اسے گھما کے وہ کمرے کے اندر جانے لگی۔

اس کمرے میں لال بتیاں جلی ہوئی تھیں۔کمرے میں دو بھاری جسامت والے مرد کھڑے تھے جنہوں نے کالی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ان کے ہاتھ میں ہنٹرز تھے۔کمرے میں دو نوجوان نڈھال پڑے ہوئے تھے جو کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ان کے جسم پہ شرٹس نہیں تھی اور حال بے حال تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے ان کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ان کے جسم پہ گہرے اور موٹے زخم بھی تھے۔جسم جگہ جگہ سے خون آلود تھا۔

وہ اپنے سفید ماسک کے پیچھے ہی مسکرا دی۔ان کے تڑپتے وجود کو دیکھ کے اس کی روح کو تسکین ملتی تھی۔انہیں یوں تکلیف میں بلکتا پا کے اس کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## یہ چھ سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

نیلوفر اپنے ایک کمرے کے کرائے کے اپارٹمنٹ میں سوئی ہوئی تھی۔کمرے کا حال بے حال تھا۔ الماریاں کھلی ہوئی تھیں، کپڑے الماریوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔جگہ جگہ ریپرز تھے اور دھول مٹی کی ایک موٹی تہہ زمین پہ جمی ہوئی تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے ہفتوں سے اس کمرے کی صفائی نہ کی گئی ہو۔

اس کی آنکھ کمرے کے اندر آتی تیز دھوپ سے کھلی۔اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے اس چیز کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ رات بھر روئی تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پہ ہاتھ مار کے اپنا موبائل اٹھایا۔وقت دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اسے ہسپتال پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔لیکن وہ ویسے ہی لیٹی رہی۔اس نے ہسپتال مزید دیر سے جانے کا ارادہ کیا۔ اس نے اپنا موبائل کھولا اور سیدھا فیس بک پہ گئی۔فیس بک پہ وہ کسی "جنید" کی آئی ڈی کھولنے لگی۔ اس کی آئی ڈی کھولی تو سامنے ہی اس کی تصویر تھی۔وہ خوبرو سا مرد تھا اور شیروانی میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ اس کی دلہن کھڑی تھی جس کے چہرے پہ شرمیلی سی مسکان تھی۔نیلوفر چہرے پہ اداس مسکراہٹ لیے اس تصویر کو دیکھتی رہی۔اسے یاد آیا کہ کس طرح اس کی محبت کی کہانی بھی ادھوری رہ گئی۔آخر کیا ضرورت تھی اسے یک طرفہ محبت میں گرفتار ہونے کی؟ اس نے سوچا۔

سب زندگی میں آگے بڑھنے لگے تھے۔اس کے سارے ساتھی، سارے کولیگز سب دنیا کو فتح کرنے میں مصروف تھے۔بس وہی تھی جو زندگی میں پیچھے رہ گئی تھی۔وہ زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن بڑھ ہی نہیں پا رہی تھی۔وہ اداس تھی، غمگین تھی۔وہ اپنی زندگی سے اکتانے لگی تھی۔

”جن کے ماں باپ نہیں ہوتے، وہ اسی طرح کی زندگی گزارتے ہیں۔“ اس کو پچھلے ہفتے والی بات یاد آئی، جو اس کے ہسپتال میں کام کرنے والی نرس نے اس سے کہی تھی۔ نیلوفر نے آنکھیں تکلیف سے میچ لیں۔ یہ احساس کہ وہ بے کار ہے، ایک فیلئیر ہے، یہ احساس اسے بے پناہ تکلیف دیتا تھا۔

”میں تمہارے زوال کی ذمہ داری لیتی ہوں انسپیکٹر عادل۔“ اسے یاد آیا، اسے چودہ سالہ نیلوفر کا وہ جملہ یاد آیا جو اس نے سالوں پہلے انسپیکٹر عادل کو کہا تھا۔ نیلوفر کے چہرے پہ نفرت جھلکنے لگی تھی۔ ماضی میں اس کے وجود پہ لگایا گیا ہر ایک زخم تازہ ہونے لگا تھا۔

”تم اب تک واپس نہیں گئی۔ تم اب تک اسے اس کے زوال تک نہیں پہنچا سکی۔ سب زندگی میں آگے بڑھ چکے ہیں، سوائے تمہارے۔“ وہ خود سے کلام کر کے خود کو اپنی نا اہلی یاد دلانے لگی۔

ہر طرف سوگ گھلا ہوا تھا۔ فضا میں خاموشی مغوم تھی جو کہ دل پہ کانٹوں کی طرح چبھتی تھی۔

نیلوفر ہمت جمع کر کے بستر سے اٹھی۔ غسل خانے میں جا کے اس نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ بالوں کو لاپرواہ سے جوڑے میں قید کر کے وہ گھر سے باہر نکلی۔ اس کے چہرے پہ ہلکا سا میک اپ تک بھی نہ تھا۔ وہ حال کی نیلوفر سے بالکل الگ تھی۔ نہ چال میں رعب تھا، نہ سینہ تنا ہوا تھا۔ کندھے شل تھے۔ آنکھیں بے جان تھیں۔

رکشہ عافیت زندگی کے باہر اترا۔ پیسوں کی بھیت بھاؤ کر کے وہ عافیت زندگی کی پر تعیش عمارت میں داخل ہوئی۔ اٹینڈنس لگوانے وہ ہسپتال کے ناظم کے کمرے میں گئی۔ یہ وہی کمرہ تھا جس کی کرسی پہ

حال کی نیلوفر براجمان تھی۔ کمرے کے اندر، جوان سا دکھنے والا ہسپتال کا ناظم تھا۔ نیلوفر کی آہٹ پہ اس نے اوپر منہ اٹھا کے نہیں دیکھا، بس کسی پیپر پہ کچھ لکھتا گیا۔

"معذرت مسٹر درانی، میں لیٹ ہو گئی۔" نیلوفر نے روکھے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی درانی نے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ درانی اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں تفتیشی سی تھیں۔

"تم رات بھر روئی ہو ناں، نیلوفر؟" درانی نے نرمی سے پوچھا۔ نیلوفر خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔ اس نے اس بات پہ کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ درانی نے پیپرز سے توجہ ہٹائی۔ کرسی سے ٹیک لگائی اور ہاتھ سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو نیلوفر۔" درانی نے سنجیدگی سے کہا تو نیلوفر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں ہر تاثر سے پاک تھیں۔

"تمہارے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم اب مکمل ٹوٹ چکی ہو۔" درانی کی آواز مزید دھیمی ہوئی۔ وہ گردن نیلوفر کی طرف بڑھا کے بولا۔ چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ انداز مسکا لگانے والا تھا۔ "تمہیں دیکھ کے ایسا لگتا ہے جیسے تمہاری بس ہو گئی ہے نیلوفر۔ تمہاری برداشت ختم ہو گئی ہے۔ تم اپنی زندگی کو بدلنا چاہتی ہو۔ ایسا ہی ہے ناں؟" درانی کے انداز میں مصنوعی ہمدردی تھی۔ نیلوفر کی آنکھیں اچانک سے اداس پڑ گئیں۔ چہرے پہ چھائی سرد مہری چھٹنے لگی۔ اس نے نظر اٹھا کے درانی کو دیکھا جس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ گہرے افسوس میں مبتلا ہو۔

"سر پلیز۔میں آپ کی آفر قبول نہیں کر سکتی۔مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔" نیلوفر نے ہاتھ اٹھا کے منت کرنے والے انداز میں کہا۔درانی سر نفی میں ہلانے لگا۔

"یہ صرف کوئی آفر تھوڑی ہے، یہ تمہاری ہر مشکل کا حل ہے۔تمہارے پاس دولت ہو گی۔تمہارے پاس طاقت ہو گی۔تم ایک مضبوط عورت بن سکو گی۔کیا تم ان لوگوں کا حشر نشر بگاڑنا نہیں چاہتی جنہوں نے تمہارے اوپر ظلم ڈھائے؟" درانی ہر ایک الفاظ پہ زور دیتے ہوئے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔الفاظ نیلوفر کے کانوں سے گزر کے سیدھا اس کے دل میں داخل ہوتے تھے۔

"میرا دل دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ایک حصہ چاہتا ہے کہ میں ان سب کو تڑپا تڑپا کے ماروں۔جس طرح سے انہوں نے میرے اپنوں کو چھینا اسی طرح سے میں بھی ان کے اپنوں کو چھینوں۔جس طرح سے انہوں نے میری دولت لوٹی میں بھی ان کی دولت لوٹوں۔میں ان سب کو برباد کردینا چاہتی ہوں۔" نیلوفر کا وجود غصے سے ابلنے لگا تھا۔درانی کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔وہ نیلوفر کے منفی جذبات کو ہوا دینے میں کامیاب ہوا تھا۔"مگر دوسرا حصہ ڈرتا بھی ہے۔مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔اگر اپنے نفس کو بیچ کے بھی میں کبھی خوش نہ ہو سکی تو؟ اگر میں جرائم کی دنیا میں آکے بھی مطمئن نہ ہو سکی تو؟" اور بھی بہت چیزیں تھیں جو نیلوفر کو روکے ہوئے تھیں، لیکن وہ ان سب کا ذکر درانی کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"یقین کرو نیلوفر۔بس ایک قدم بڑھانے کی دیر ہے۔اور تمہارے پاس بے تحاشا طاقت ہو گی۔تم دولت کے پہاڑوں پہ راج کرو گی نیلوفر۔" درانی بھی نیلوفر پہ اتنی جلدی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

"لیکن آپ مجھے بتاتے بھی نہیں کہ آخر ادھر ہوتا کیا ہے؟ایسا کیا ہے جس سے مجھے اتنی طاقت اور دولت ملے گی۔" نیلوفر کو تجسس ہوا۔

"اگر میں نے تمہیں بتادیا،تو یہ تمہارے مجھے ہاں کہنے کے مترادف ہی ہو گا۔پھر تم جرائم کی دنیا میں شامل ہو جاؤ گی۔اس کے بعد صرف موت ہی تمہیں اس دنیا سے آزاد کر سکے گی۔" درانی کا انداز سفاک تھا۔نیلوفر نے بے اختیار جھر جھری لی۔

"کیا اس کام میں بہت قتل و غارت ہے؟" نیلوفر کی آنکھوں میں تشویش تھی۔وہ بھی کہیں نہ کہیں یہ قدم بڑھانے کے لیے مان گئی تھی۔ مسٹر درانی نے اپنی گردن اوپر نیچے ہلائی۔

"یہ کام قتل و غارت سے بھی بدترین ہے۔ہر انسان یہاں غربت میں دھت لاچارگی کی زندگی گزار رہا ہے۔اگر ہم ان میں سے چند کی زندگی چھین لیں تو اس میں کیا حرج؟ کھانے کو ان کے پاس کچھ ہوتا نہیں۔انہیں مار کے ہم تو الٹا ان کی مشکلات ہی آسان کر رہے ہیں۔"درانی مزے لینے والے انداز میں نیلوفر سے کہہ رہا تھا۔

نیلوفر کا دل ڈوبنے لگا۔وہ کبھی بھی قاتل نہیں بن سکتی تھی۔اس کی ماں نے اس کی ایسی پرورش کی ہی نہیں تھی کہ وہ یوں قاتل بن جائے۔ کبھی نہیں۔

"میں ایک قاتل بن جاؤں گی۔میں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکوں گی۔" نیلوفر آنکھوں میں بے چینی لیے بولی تو درانی مسکرایا۔

”سب اٹھا لیتے ہیں۔ہم سب سالوں سے اٹھاتے آ رہے ہیں۔پتا ہے کیا؟ ہم اس عام سی دکھنے والی عوام سے کئی گنا مضبوط ہیں۔یہ بوجھ ہی تمہیں ہر مصیبت سے لڑنے کے لیے تیار کر دے گا۔تم ایک چٹان سے بھی زیادہ مضبوط اور ایک طوفان سے بھی زیادہ خطرناک بن جاؤ گی۔تم ایک دفعہ قدم تو بڑھاؤ۔ دنیا تمہارے سامنے سجدہ کرنے لگے گی۔تم جو بولو گی وہ تمہارے سامنے ہو گا۔“نیلوفر، ایک دفعہ پھر سے قائل ہونے لگی تھی۔یہ دنیا، یہ باتیں، یہ اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔اس دنیا میں کشش سی تھی۔وہ اس دنیا کو آزمانہ ضرور چاہتی تھی۔لیکن پھر بھی، دل میں ایک خلش سی اب بھی باقی تھی۔

”مجھے سوچنے کا موقع دیجیئے۔“نیلوفر اٹھ گئی۔درانی کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔وہ جانتا تھا اس کا آدھے سے زیادہ کام تو ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## حال میں واپس آتے ہیں۔۔۔۔

”ویڈیو بنانا شروع کرو۔“ اس لال بتیوں میں نہاتے کمرے میں نیلوفر کی آواز گونجی تھی۔اس نے زمین پہ پڑا ایک ہنٹر اٹھایا۔آنکھوں میں دہشت زدہ کر دینے والا تاثر لیے وہ ان کی طرف بڑھی۔نیلوفر کو دیکھتے ہی وہ نوجوان ڈر کے مارے کانپنے لگے۔نیلوفر ان کے سرہانے کھڑی ہوئی۔آنکھوں میں جنون لیے، وہ کچھ دیر ان کو تکتے رہی۔بے بس نوجوان اب لرزنے لگے تھے۔

نیلوفر اب پوری قوت سے ان دونوں کے اوپر ہنٹر سے وار کرنے لگی۔وہ کچھ دیر یوں ہی انہیں ہنٹر سے پیٹتے گئی۔وہ نوجوان تڑپ تڑپ کے چلا رہے تھے۔نیلوفر سے آزادی کی بھیک مانگ رہے تھے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی آوازیں اس کمرے کی ظالم دیواروں میں ہی دب جانے والی تھیں۔

نیلوفر ان کے اوپر ہنٹر برسائے جارہی تھی۔اس کے اندر بھڑکتی جو نا دیدہ آگ تھی وہ ٹھنڈی پڑنے لگی۔وہ تھم گئی۔اس نے ایک جھٹکا کھایا۔

وہ ہنٹر زمین پہ پھینک کے اب اپنے سامنے اوندھے لیٹے ہوئے، خون میں نہائے نو جوانوں کو دیکھنے لگی۔اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔ماسک اپنے چہرے سے جدا کیا۔

”اس ڈاکٹر کو ویڈیو کے ساتھ ان کی لاشیں بھی بھیج دینا۔“ نیلوفر نے ان بے جان نو جوانوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔وہ کمرے سے باہر نکلی۔

اس کی پیشانی پسینے میں ڈوب چکی تھی۔اس نے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا اور اپنے چہرے پہ جھلکتا پسینہ صاف کیا۔آنکھوں میں بے چینی سی تھی۔روح میں اضطراب نے قدم جمائے تھے۔اس نے ایک ہاری ہوئی سانس خارج کی اور لفٹ کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔آسمان پہ چھائے سرمئی بادلوں کے باعث یہ شام کا سماں لگتا تھا۔سورج بھی ان بادلوں کی اوٹ پہ چھپے بیٹھا تھا۔بادل اسلام آباد کو سورج کی تپش سے بھری کرنوں سے بچانے میں لگے ہوئے تھے۔

مناج نے اپنی گاڑی ایک کمرشل مکان کے سامنے پارک کی۔اس مکان کے اندر کچھ تعمیراتی کام جاری تھا۔یہ علاقہ بھی کمرشل لگتا تھا۔یہاں پہ کافی برانڈز اور اسٹورز وغیرہ موجود تھے۔مناج اپنی گاڑی سے اتری اور عمارت کے اندر قدم بڑھانے لگی۔

وہ کافی مختلف سی نظر آتی تھی۔اس نے آج سفید جوڑا پہنا ہوا تھا جس پہ نفیس کام ہوا تھا۔کام ہلکا تھا مگر کافی حسین تھا۔آنکھوں میں اس نے کالا چشمہ پہنا ہوا تھا اور ہاتھ میں سنہرا پرس تھا۔اس کے چہرے کی کھال کافی نکھری نکھری لگتی تھی۔بھوری پشمینہ شال آج بھی اس نے کندھے پہ گرائی ہوئی تھی۔یہ ایک چیز تھی جو اس کے بارے میں کبھی بھی بدلنے والی نہیں تھی۔

مناج کی چال میں اب کچھ مختلف سا تھا۔وہ اب اتنی بے جان اور ڈھیلی نہیں تھی۔اس کے کندھے باہر کی طرف اٹھ گئے تھے۔اس میں واضح تبدیلیاں تھیں۔

وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو وہاں حسام کھڑا کسی مزدور کو ہدایات دے رہا تھا۔اس کے ماتھے پہ کام کے باعث بل تھے۔مناج کو دیکھتے ہی، اس کے چہرے کے بل ڈھیلے ہوئے۔وہ یقیناً اسی کے منتظر تھا۔مناج چہرے پہ

پھیکی مسکراہٹ لیے اس کی طرف بڑھی۔

رسمی علیک سلیک اور حال چال دریافت کر کے مناج مدعے پہ آئی۔

"جی حسام۔کیا ضروری بات تھی جو کرنے کے لیے آپ نے مجھے بلایا تھا۔" مناج نے اپنے روایتی مشینی طرز میں حسام سے پوچھا۔

"میرے پاس کچھ دلچسپ آئیڈیاز تھے، اس جگہ کے حوالے سے جن کے بارے میں، میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔" حسام نے اپنے ہاتھ میں موجود ایک پیپر کھولا۔اس کے پاس ہی ایک ٹیبل تھا جس پہ اس نے وہ پیپر بچھا دیا۔پیپر پہ ڈرائنگ بنی ہوئی تھی۔

"آپ نے جس طرح سے مجھے بتایا، میں سمجھ سکتا ہوں یہ ادارہ ایک خطرناک کام کرنے جا رہا ہے۔یہ آرگن مافیا اور ہیومن ٹریفکنگ مافیا کو منظر عام پہ لانے میں کام کرے گا، اس لیے میں سمجھ سکتا ہوں کہ حرر کے اسٹاف کو ایک ممکنہ حد تک خطرہ لاحق ہے۔اسی حوالے سے میں نے کچھ چیزیں بھی سوچیں تھیں۔" حسام نے اب پیپر پہ بنی ڈرائینگ کے ایک مختصر حصے پہ انگلی رکھی۔ مناج کی دلچسپی بھی بڑھنے لگی تھی۔ بھنویں اکٹھا کرتے، اس نے اپنی نظریں ڈرائینگ پہ مرکوز کیں۔

"حرر کے آفس کے پچھلے حصے پہ میں ایک بنکر بنوانے کا سوچ رہا ہوں۔ ایک فائر پروف اور بلٹ پروف بنکر۔" مناج مدھم سا مسکرائی۔آنکھوں میں حیرت تھی۔وہ اس کے بارے میں پہلے کیوں نہ سوچ سکی؟

"اس بنکر کو میں بہت احتیاط سے بنواؤں گا۔اس میں وینٹی لیشن کا انتظام کیا جائے گا۔اسی بنکر میں کچھ خفیہ شیلفز انسٹال کروانے کا سوچ رہا تھا جن میں آپ حساس معلومات محفوظ کر سکتی ہیں۔یوں، اگر کوئی آفت حرر کو اپنی لپیٹ میں لے گی، تب بھی آپ کی محنت ضائع نہیں ہو گی۔اگر آپ حامی بھریں، تو ابھی سے ہی کام شروع ہو جائے گا۔" حسام نے اب مناج کو دیکھا جو کہ حسام کو متاثر کن نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

"مجھے اس سب کا پہلے سے سوچنا چاہیے تھا۔ آئندہ اگر کوئی تبدیلی کرنی ہو، تو مجھ سے پوچھے بغیر ہی کر دیجیئے گا۔ مجھے آپ پہ پورا بھروسہ ہے۔" حسام زیر لب ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی اپنی ٹیم کو ہدایات دے دیتا ہوں۔" مناج حسام سے دو قدم پیچھے گئی۔ چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ سجائے وہ مزدوروں کو کام کرتے دیکھنے لگی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی، اگر اسے اس مقصد کو حاصل کرتے ہوئے اپنی جان بھی دینی پڑے تو وہ دے دے گی۔ لیکن جو اس کے ساتھ ہوا، وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہونے دے گی۔

حسام مزدوروں کو ہدایات دے کے واپس سے مناج کی طرف بڑھا۔

"مناج، میں نے آپ سے کچھ اور بھی پوچھنا تھا۔" مناج حسام کی طرف متوجہ ہوئی۔ جواب طلب نگاہ اس نے حسام پہ ڈالیں۔ حسام نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"کیا میں بھی حرر کا حصہ بن سکتا ہوں؟" مناج کو پہلے ایک جھٹکا لگا۔ چہرے پہ حیرانی، آنکھوں میں بے یقینی لیے وہ اب حسام کو دیکھنے لگی۔ حسام چہرے پہ جواب طلب سا تاثر لیے مناج کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## یہ چھے سال پہلے کا ہی منظر ہے۔۔۔۔

نیلوفر کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پہ بیٹھی سر ہاتھوں میں گرائے درانی کے ان الفاظ کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ کیا اسے یہ آفر قبول کرنی چاہئے تھی؟ کیا واقعی اس آفر سے اس کی

زندگی کی مشکلات ختم ہوجائیں گی؟ کیا اس آفر کو قبول کرنے کے بعد وہ خوش اور مطمئن ہو سکے گی؟ وہ یہی سوچ جارہی تھی۔دل میں خدشات بھرے ہوئے تھے۔

نیلوفر نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ان بند آنکھوں کے پیچھے۔۔۔وہ کچھ دیکھ رہی تھی۔۔۔ان بند آنکھوں کے پیچھے۔۔۔ایک منظر لہرا رہا تھا۔۔۔

وہ چودہ سال کی تھی۔وہ اپنے گھر کے باہر اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔شدید غصے کے باعث اس کی گوری رنگت سرخ پڑنے لگی تھی۔گھر کے دروازے پہ دو عمر رسیدہ مرد کھڑے تھے جو اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔وہ اس کے چچا تھے۔نیلوفر کی نگاہوں میں طیش بھرا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں سے لگتا تھا جیسے وہ ان دونوں مردوں سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ ان کا قتل بھی چاہے تو کر دیتی۔

"تم لوگوں نے مجھ سے میری چھت چھینی ہے۔میں تم سب کو بتا رہی ہوں، میں تم لوگوں کو آگ لگا دوں گی، میں تم سب کو برباد کر دوں گی۔" آنکھیں اشک بار، چہرہ لال۔۔۔وہ اونچی آوازوں میں دھمکیاں دے رہی تھی۔۔۔مگر کوئی فائدہ نہ ہونا تھا، طاقت کے بل پہ اس کے چچا اس گھر پہ قبضہ کر چکے تھے۔۔۔

"ابو کے انتقال کے بعد میرے چچاؤں نے ان کی جائداد پہ قبضہ کرلیا۔اور طاقت کے زور پر مجھے اور میری ماں کو اس گھر سے نکلال دیا۔تم اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ در بدر بھٹکتی رہی تھی۔تم میڈیا سے، پولیس سے انصاف کی بھیک مانگتے رہی۔مگر کسی نے تمہارا ساتھ نہ دیا۔نیلوفر، تمہارے اوپر ظلم کی شروعات تمہارے گھر سے ہوئی تھی۔"

حال کی نیلوفر خود کلامی کرتے ہوئے خود کو وہ سب یاد دلانے لگی تھی۔چہرے پہ تکلیف اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔اب اس کی آنکھوں کے سامنے دوسرا منظر لہرانے لگا۔۔۔

چودہ سالہ نیلوفر پولیس اسٹیشن میں کھڑی تھی۔انسپیکٹر عادل اپنی کرسی پہ لمبی تان کے بیٹھا تھا۔کچھ دیر میں پولیس کے لباس میں ملبوس ایک عورت نیلوفر کی ماں کا ہاتھ پکڑ کے لے کر آئی۔ان کا حال بے حال تھا۔چہرے پہ گہرے زخم تھے۔چال بجھی ہوئی تھی۔

چودہ سالہ نیلوفر وہ دیکھتے ہی شل رہ گئی۔اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔

"تم دونوں ماں بیٹی کو اپنا سبق سیکھ لینا چاہیے۔" عادل تمسخرانہ انداز میں تبصرہ کرنے لگا۔"اب کوئی احتجاج کرنے کا سوچنا بھی مت۔بہت برا حال ہوگا۔" نیلوفر کی آنکھوں میں سرخی در آئی۔اس نے نظر عادل پہ ڈالی۔عادل تعجب سے اس چودہ سالہ لڑکی کو دیکھنے لگا۔اسے ان نظروں سے وحشت محسوس ہورہی تھی۔

"یہ کیا تم نے میری ماں کے ساتھ؟" وہ حلق کے بل چلائی۔تیز قدم بڑھاتے وہ اس کی ڈیسک کی طرف گئی۔وہ عادل کی آنکھوں میں آنکھ ڈالے بے خوف اسے دیکھ رہی تھی۔کچھ تھا اس لڑکی کے انداز میں جو عادل کو خوف میں مبتلا کر گیا تھا۔

"ہم تم لوگوں کے سامنے مجبور ہیں۔لیکن، میں واپس آؤں گی۔میں تمہیں برباد کرنے واپس ضرور آؤں گی دو ٹکے کے انسپیکٹر۔" وہ حلق کے بل چلاتے انگلی کر بولی۔بس اب عادل سے برداشت نہ ہوا۔وہ کھڑا ہوا اور سپاہیوں پہ حکم جاری کرنے لگا۔۔۔

”تم تھک ہار کے میڈیا پہ گئی۔ایک چھوٹے سے چینل نے تمہیں سہارا دینا چاہا۔تم اور تمہاری ماں نے چچاؤں کے خلاف احتجاج کیا۔لیکن، انہوں نے اس ظالم انسپیکٹر کی مدد لی۔تمہاری ماں کو لاک اپ میں بند کر دیا، اسے پیٹا۔۔۔تمہیں انصاف کے نمائندوں سے بھی انصاف نہ ملا نیلوفر۔۔۔“ وہ ایک دفعہ پھر سے خود کو یاد دلانے لگی۔وہ یاد دلانے لگی خود کو، کس طرح سے یہ معاشرہ اسے انصاف نہ دلا سکا۔۔۔

ایک اور منظر اب اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا تھا۔۔۔

”میری ماں کو بچا لیں، پلیز۔وہ مر رہی ہیں۔“ وہ ہسپتال میں موجود تھی۔وہ رو رو کے اپنے سامنے کھڑے عمر رسیدہ ڈاکٹر سے درخواست کر رہی تھی جس کا دل اس روتی بچی کو دیکھ کے بالکل بھی نہ پگھلا۔چہرے پہ سخت تاثر لیے وہ اسے گھورے جا رہا تھا۔

”آپ ان کے اخراجات نہیں اٹھا سکتیں۔آپ انہیں کسی اور ہسپتال لے کر جائیں۔“ظالم ڈاکٹر سرد انداز میں بولا۔

”بہت دیر ہو جائے گی۔بہت خون بہہ گیا ہے ڈاکٹر، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ نیلوفر بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔وہ اپنی ماں کو اتنی جلدی کھونا نہیں چاہتی تھی۔اس کی عمر صرف اٹھارہ سال ہی تو تھی۔ وہ کیسے اپنی ماں کے بغیر یہ زندگی گزار سکتی تھی۔

”ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر بے نیاز تھا۔اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔وہ مڑ گیا اور جانے لگا۔

"تم لوگ غارت کیوں نہیں ہو جاتے۔" نیلوفر حلق کے بل چلائی تھی۔ڈاکٹر مڑا، چہرے پہ ناگوار تاثر لیے وہ نیلوفر کو دیکھنے لگا۔

"دیکھو لڑکی، تماشا نہ کرو۔" ڈاکٹر نے نیلوفر کا بازو تھامتے چبا چبا کے کہا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا وہ جو بڑا انصاف پسند بنا پھرتا ہے۔وہ جو ہمارا رب بنا پھرتا ہے، اس کا عذاب تم جیسے درندوں پر کیوں نہیں نازل ہوتا؟تم لوگ کیوں نہیں جل کے راکھ ہو جاتے؟ آخر ہم ہی کیوں تم جیسوں کے ہاتھوں مار کھائیں؟" نیلوفر نے اپنا بازو اس ڈاکٹر کی گرفت سے آزاد کیا۔وہ غصے کے مارے کپکپا رہی تھی۔اس کے سر پر پڑا ڈوپٹہ سرک کے زمین پہ گر گیا تھا۔

"گارڈ، اسے اور اس کی ماں کو نکالو یہاں سے۔اب تو مر کے بھی اس کی ماں کو داخلہ نہیں دوں گا۔" ڈاکٹر کی انا پہ چوٹ لگ گئی تھی۔

گارڈز نیلوفر کی طرف بڑھے، وہ نیلوفر کو بازو سے تھام کے لے کر جانے لگے۔

"میں تم لوگوں کے زوال کی ذمہ داری لیتی ہوں۔تمہارے خاندان کو تباہ کردوں گی۔" نیلوفر کہے جارہی تھی اور گارڈز اسے گھسیٹ کے لے کر جا رہے تھے۔

منظر تحلیل ہوا۔۔۔ دل جیسے نچوڑنے لگا تھا۔۔۔دل میں لہرے ابھرنے لگیں۔

اس سے رہا نہیں گیا اور وہ پھر سے رونے لگی۔بغیر آواز کے وہ روتے گئی۔اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

"اور تمہاری ماں اس معاشرتی نظام کے ہاتھوں مار دی گئی۔وہ ڈاکٹر آج تک ہنسی خوشی رہ رہا ہے۔اسے بھی قدرت نے کوئی سبق نہ سکھایا۔کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کے تم بھی اس کے سامنے اس کے اپنوں کو مارو؟ تڑپا تڑپا کے؟وہ بھی وہی تکلیف سہے جو تم نے اس دن سہی تھی؟" نیلوفر کی آنکھیں شعلہ باز ہونے لگی تھیں۔اس نے سرد سانس خارج کی۔دل میں بھڑکتی، انتقام کی آگ اپنا زور پکڑتے جارہی تھی۔اسے بھی اس معاشرے سے اپنا انتقام لینا تھا۔۔

"تم اس معاشرے کے ہاتھوں پستی رہی ہو۔کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم اس خود ترسی کی زندگی سے نکل جاؤ؟ تم صرف اس خدا کے بھروسے کیسے جی سکتی ہو جس نے تمہارا کوئی ساتھ نہ دیا؟ اس نے تم سے سب کچھ چھین لیا ہے نیلوفر۔مگر اب اور نہیں، اب تمہیں بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا ہوگا۔ تمہیں بھی طاقت حاصل کرنی ہوگی۔یہ موقع تم ضائع نہیں کر سکتی نیلوفر۔"نیلوفر کا دماغ بن چکا تھا۔ آنکھوں میں جست و جنون لیے، وہ کھڑی ہوئی۔سائیڈ ٹیبل سے اس نے موبائل اٹھایا اور درانی کو کال ملانے لگی۔اب وہ رکنے والی نہیں تھی۔

وہ تیار تھی، پہاڑوں سے زیادہ مضبوط بننے کے لیے، طوفان سے بھی زیادہ خطرناک بننے کے لیے۔۔۔اس کے بدلے وہ اپنے نفس کی قیمت چکانے پہ تیار تھی۔

"مسٹر درانی، میں تیار ہوں۔" وہ شعلہ باز انداز میں بولی۔

"کل صبح جلدی آجانا۔تمہارے اقتدار کا وقت، ہوا جاتا ہے۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## حال میں واپس آتے ہیں۔۔۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ہلکی پھلکی بارش آسمان سے برس رہی تھی۔ماحول میں ہر طرف خوشگواریت گھلی ہوئی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے اسلام آباد کے رہائیشی بھی محظوظ ہوتے نظر آرہی تھی۔

درفشاں احمد کے آفس میں داخل ہوئی۔اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا اور چہرے پہ مسکراہٹ۔اس کے آفس میں داخل ہوتے ہی ایک ایمپلائی نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔جب تصدیق کر لی کہ یہ احمد کی بہن تھی تو وہ لوگ بھی اپنے کاموں میں لگ گئے۔وہ احمد کے کمرے میں داخل ہوئی۔احمد اپنے لیپ ٹاپ پہ مگن،کچھ کام کر رہا تھا۔اسے دیکھتے ہی احمد تھم گیا۔لیپ ٹاپ کھسکایا۔وہ درفشاں کو دیکھنے لگا۔ درفشاں پورے دل سے مسکرا دی۔احمد کو درے کا انداز ٹھٹکنے لگا۔درے کے انداز میں اسے کچھ بناوٹی لگا۔

"احمد۔!" وہ چہکی اور اس کی طرف بڑھی۔اس سے پہلے تو درے اتنی گرم جوشی سے اسے مخاطب تب ہی کرتی تھی جب اسے کوئی ذاتی کام نکلوانا ہو۔احمد نے سوچا۔آنکھوں میں شرارت در آئی۔

"میں نے بریانی بنائی تھی۔وہی لے کر آئی ہوں۔" وہ احمد کی مخالف کرسی پہ بیٹھی۔بیگ میں سے بریانی کا بڑا سا ڈبا نکالا اور ٹیبل پہ رکھا۔

"دلچسپ۔" احمد معنی خیز انداز میں بولا۔

"اب سچ سچ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئی ہو آپا۔" وہ مزے لیتے ہوئے بولا۔درے کے رنگ اچانک سے اڑ گئے۔اپنے چہرے کے تاثرات عام کرتے ہوئے وہ جواب دینا شروع ہوئی۔

"ارے، میں تو بس اس لیے آئی تھی۔۔۔" درے کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

"تاکہ میں تم سے کوئی کام نکلوا سکوں۔ہے ناں؟" احمد مسکرا دیا۔درے کے چہرے پہ شدید ناگوار سا تاثر ابھرا۔اف یہ احمد، اس نے سوچا۔

"آپا!یہ ڈرامے بازی چھوڑ دو۔سیدھا مدعے پہ آؤ۔کیا کام نکلوانا ہے مجھ سے؟" احمد اب سنجیدہ ہو کے بولا۔درے کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔اس نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"مجھے دو ہیکرز کا انتظام کر کے دو احمد۔" درے بولی۔احمد اس چیز کی قطعاً توقع نہیں کر رہا تھا۔اس نے اپنی بھنویں اکھٹا کیں۔

"کس لیے؟" وہ بولا۔

"مناج کے لیے۔وہ ایک ایجنسی کھول رہی ہے جو کہ آرگن مافیا کو سرِ عام لانے میں کام کرے گی۔کیا تم اس کی اس چیز میں مدد نہیں کرو گے؟ تم اسے ہیکرز کا بندوبست کر کے نہیں دے سکتے۔" احمد نے ایک جھٹکا لیا۔۔۔آرگن مافیا۔۔۔انٹرسٹنگ۔وہ کچھ دیر گہری سوچ میں مغوم رہا۔

"کیا پلان ہے تمہاری دوست کا۔یعنی وہ کس طرح سے کرنے والی ہے یہ سب؟" احمد نے انداز سرسری رکھا۔

"پتا نہیں، لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی۔" درے جواباً بولی۔احمد نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ہو جائے گا۔" احمد سرسری سے انداز میں کہہ کر بریانی کا ڈبا اپنی طرف کھسکانے لگا۔ درے کھل کے مسکرا دی۔

”مجھے پتا تھا، تم میرا یہ کام کر دو گے۔“ درے چہک کے بولی تھی۔احمد نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔مزید میلو ڈرامہ شروع۔یہ آپا کبھی نہیں بدلنے والی تھی۔اس نے سوچا۔درے مڑ کے جانے لگی۔

”بریانی کے لیے شکریہ۔“ وہ دروازے پہ تھی جب احمد بولا۔

”تمہیں کیا لگا تھا تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے بریانی بناؤں گی؟ نکڑ والے غفور کی ہے۔“ وہ جلانے والے انداز میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔احمد کا نوالہ منہ میں ہی رہ گیا۔

”آپا کا بچپنا، کبھی بھی ختم نہیں ہونے والا۔“ وہ زیر لب تبصرہ کرتے ہوئے بریانی کا لقمہ حلق میں اتارنے لگا۔وہ جو دنیا کے نزدیک ایک مچور اور سمجھدار لڑکی تھی، وہی لڑکی اپنے بھائی کے نزدیک دنیا کی احمق ترین لڑکی تھی۔

آفس سے باہر نکلی تو درفشاں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔وہ تر و تازہ موڈ کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھی۔گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ مناج کو کال ملانے گی۔کچھ دیر میں مناج نے کال اٹھا لی۔

”ہاں مناج، تمہارا کام ہو گیا ہے۔احمد دو ہیکرز کا انتظام کر دے گا۔“ درفشاں بولی۔

”تمہارا بہت شکریہ درے۔مجھے تمہارا یہ احسان یاد رہے گا۔“ فون کے اس پار سے مناج کی مشینی آواز گونجی۔

”مناج کیا میں بھی اس عظیم مقصد میں تمہارے کام آسکتی ہوں؟میں بھی کچھ بڑا کرنا چاہتی ہوں۔میں بھی زندگی میں کچھ اعلیٰ نسب کرنا چاہتی ہوں مناج۔“ درفشاں درخواستانہ انداز میں بولی۔

"نہیں درفشاں۔میں جو کرنے جارہی ہوں وہ خطرناک ہے۔میں کبھی تمہاری جان کو خطرے میں نہیں جھونکوں گی۔" مناج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے منہ پہ انکار کر دیا۔وہ واقعی درفشاں کی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"لیکن مناج، اگر کبھی تمہیں لگے کہ اس عدم میں میں بھی تمہارے کام آسکتی ہوں تو مجھے ضرور بتانا۔ اس عظیم عدم کا حصہ بن کے میں واقعی فخر محسوس کروں گی۔" درفشاں اپنائیت سے لبریز انداز میں بولی۔کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

"ضرور۔" مناج مختصر سا بولی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## یہ چھے سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

نیلوفر کا دل اتنا زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے اپنی نبض صاف سنائی دیتی تھی۔نیلوفر کا رکشہ عافیت زندگی کی بلند و بالا عمارت کے سامنے رکا۔وہ رکشے سے باہر نکل کے رکشے والے کو پیسے دینے لگی۔ چہرے پہ واضح گھبراہٹ لیے وہ عافیت زندگی کی عمارت کو اوپر سے نیچے دیکھنے لگی۔وہ جانتی تھی آج اس کی زندگی بدلنے والی تھی، آج عافیت زندگی کا یہ ہسپتال اس کے لیے بدلنے والا تھا۔

وہ عافیت زندگی کی عمارت میں داخل ہوئی تو ایک دفعہ پھر سے اس کے قدم زنجیر ہوئے۔وہ کیا ٹھیک کرنے جارہی تھی؟ اگر اب بھی اس کی زندگی ٹھیک نہ ہوئی تو؟ اگر اس سب کے بعد بھی وہ مطمئن نہ ہو سکی تو؟

وہ اپنے خیالات میں گم سم تھی جب اس کی طرف ایک نرس چلے آئی۔

”آپ میرے پیچھے چلیں۔ مسٹر درانی آپ کے منتظر ہیں۔“نرس نے نیلوفر کے کان میں سرگوشی کی تو وہ چونک اٹھی۔ نیلوفر نے حلق کے اندر تھوک نگلا۔اپنے تمام خیالات کو جھٹک کے اس نے سر اوپر نیچے ہلایا۔اب وہ پیچھے مڑ کے دیکھنے والی نہیں تھی۔اس نے تہیہ کرلیا تھا۔

ان دونوں نے ہسپتال کا دراز حال عبور کیا۔گول زینہ اتر کے وہ دونوں بڑے سے اسٹور روم میں داخل ہوئے۔کمرے کے اندر آتے ہی نرس نے بتیاں جلائیں اور دروازہ پیچھے سے لاک کیا۔نیلوفر اس کمرے میں پہلے بھی آچکی تھی۔وہ یہی سوچ رہی تھی کہ آخر اس اسٹور روم میں اسے کیوں لایا گیا؟ کیا یہ کوئی ٹریپ تو نہیں؟

وہ اسٹور روم میں سیدھا چلتے گئی۔سامنے لیڈی اقتدار کی بڑی سی تصویر تھی۔نیلوفر بہت کنفیوژڈ تھی۔ اسی وقت نرس نے لیڈی اقتدار کی تصویر کو کسی دروازے کی طرح کھسکایا۔نیلوفر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس نے سوچا۔

نرس نے دیوار پر لگے پینل پر کچھ کیز دبائی تو ایک لفٹ اوپر آنے لگی۔نیلوفر تعجب سے سب دیکھ رہی تھی۔اس سب کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔وہ جس کمرے کو معصومانہ اسٹور روم سمجھتی تھی وہ تو خفیہ بیسمنٹ کا راستہ نکلا۔

نیلوفر نرس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گئی۔اس کے دل کی گہرائیوں سے آوازیں آرہی تھی کہ وہ چلے جائے۔۔۔وہ اپنے اوپر یہ ظلم نہ کرے۔۔۔مگر نیلوفر نے اپنی دل کی اس وقت نا سنی۔وہ دل کی ہر سرگوشی کو نظرانداز کر کے نرس کے ہمراہ اس بڑے سے حال میں چلنے لگی۔

"وہ دروازہ دیکھ رہی ہو تم۔" نرس نے سامنے والی دیوار کے بائیں طرف والے دروازے پہ انگلی سے اشارہ کیا۔

" اس میں چلی جاؤ۔وہ تمہارے منتظر ہیں۔"نرس کہہ کے مڑ گئی اور لفٹ کے ذریعے اوپر جانے لگی۔

نیلوفر اب اس حال میں اکیلی تھی۔آخر کیا تھا اس دروازے کے پیچھے؟ نیلوفر نے سوچا۔

نیلوفر سست روی سے قدم بڑھانے لگی۔دھڑکنوں نے رفتار پکڑ لی تھی۔نیلوفر نے دروازے کے سرد ناب پہ اپنا ہاتھ رکھا۔آنکھیں بند کیں اور دروازہ کھولا۔پتا نہیں کیوں، لیکن اس وقت وہ اپنی آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔وہ اندر کا منظر دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

"کھول دو اپنی آنکھوں کو۔اب بہت دیر ہو گئی ہے۔واپسی کے راستے بند ہو چکے ہیں۔" یہ آواز درانی کی نہیں تھی۔اس وقت نیلوفر کو احساس ہوا کہ اس کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔نیلوفر کے ماتھے پہ بل نمایاں ہوئے۔اس نے اب اپنی آنکھوں کو کھولنے کا ارادہ کیا۔

اس نے اپنی پلکوں پہ زور دیا۔۔۔آنکھوں کے سامنے سے تاریکی چھٹنے لگی۔۔۔وہ منظر اس کے سامنے ابھرنے لگا۔۔۔اور نیلوفر۔۔۔نیلوفر پوری قوت سے۔۔۔چلانے لگی۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## حال میں واپس آتے ہیں۔۔۔

نیلوفر شمس کی نیلی ویگن میں سوار تھی۔وہ لوگ اس وقت ایک سنسان علاقے میں گاڑی چلا رہے تھے جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ویگن کی کھڑکی سے وہ اندھیرے میں ڈوبی سڑکیں دیکھ سکتی تھی۔اس کے چہرے پہ فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔آنکھوں میں الگ سی چمک تھی۔

"اس ڈاکٹر کے بیٹوں کی لاش، اسے بھیج دی تھی ناں؟" نیلوفر نے شمس سے پوچھا۔وہ دماغ میں ڈاکٹر کا حال تصور کرنے لگی جو اس کا اپنے بیٹوں کی لاش دیکھ کے ہوا ہو گا۔کیا وہ بھی اسی طرح سے تڑپا تھا جس طرح سے وہ تڑپی تھی؟ نیلوفر نے سوچا۔

"ہاں بھیج دی تھی۔پولیس کو کمپلین بھی کروائی انہوں نے، لیکن آپ جانتی ہیں ہمیں کچھ نہیں ہو گا۔" شمس نیلوفر کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔نیلوفر کو یوں خوش دیکھ کے وہ بھی کافی خوش تھا۔

گاڑی پھر ایک فیکٹری کے باہر رک گئی، فیکٹری کے ساتھ ہی گودام بھی کھڑا کیا گیا تھا۔فیکٹری نہایت وسیع و عریض سی زمین پہ تعمیر کی گئی تھی۔نیلوفر کا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

"گارڈز کو خرید لیا تھا۔سارا راستہ صاف ہے۔اب ہم چلیں؟" شمس بولا۔نیلوفر نے قہقہہ لگایا۔اس سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔وہ اپنی گاڑی سے اتری۔شمس بھی اترا۔اس نے ڈگی سے ایک نیلا کین نکالا جس میں پٹرول بھرا ہوا تھا۔

دونوں اب ایک میدان پار کرنے لگے۔ میدان کے بیچ و بیچ ہی فیکٹری تھی، اور فیکٹری کے عقب میں گودام۔ میدان میں ہلکی پھلکی گھاس بھی اگائی گئی تھی۔

"ویسے نیلوفر، آپ نے بتایا نہیں کہ آپ اس فیکٹری میں آگ کیوں لگانا چاہتی ہیں؟" شمس کو تجسس ہونے لگا۔

"یہ میرے ابو کی فیکٹری تھی جس پر حق میرا اور میری ماں کا تھا۔ لیکن اس پہ میرے چچاؤں نے ناجائز قبضہ کیا تھا شمس۔ میں ان کے ان خزانوں پہ آگ لگانے آئی ہوں۔" نیلوفر کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی، ایسی مسکراہٹ جو کے دیکھنے والے کہ دل میں دہشت ڈال دے۔

"اور آج نیلوفر کا انتقام مکمل ہوجائے گا۔" شمس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ خود میں ہی بولے جارہی تھی۔ "عادل ہسپتال میں سڑ رہا ہے۔ میرے چچا آج کے بعد سے سڑکوں کی خاک چھانیں گے۔ اور وہ ڈاکٹر، وہ تو بس پاگلوں کی طرح در بدر کی ٹھوکریں کھائے گا۔ نیلوفر کی طاقت لا زوال ہے شمس۔" وہ کہہ کے پھر سے ہنسنے لگی۔ یہ احساس، کہ وہ اپنے دشمنوں کی زندگی انگلی کے اشارے سے تباہ کر سکتی تھی، یہ احساس اس میں توانائی بھر رہا تھا۔

وہ دونوں اب فیکٹری کے اونچے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ شمس آگے بڑھا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا پیٹرول کا بڑا سا کین اس نے کھولا۔ وہ فیکٹری کے دروازے کے ارد گرد اسے چھڑکنے لگے۔ سارا پیٹرول اس نے خالی کردیا۔ اب وہ نیلوفر کی طرف آیا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک لائٹر نکالا۔

"کیا آپ تیار ہیں؟" معنی خیز مسکراہٹ لیے وہ لائیٹر اس نے نیلوفر کی طرف بڑھایا۔نیلوفر کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔اس نے لائیٹر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔وہ دو قدم پیچھے گئی۔شمس بھی اس کے ساتھ دو قدم پیچھے گیا۔

اس نے لائیٹر جلایا۔آگ کا باریک شعلہ لائٹر کی سطح پر سے ابھرا۔نیلوفر آگ کے اس شعلے کو اپنی نظروں کے قریب کر کے دیکھنے لگی۔آنکھوں میں اس کے کڑواہٹ تھی۔بے دردی تھی۔بے رحمی تھی۔

اس کی سانسیں پھولنے لگیں۔اس کے وجود میں شدت بھرا غصہ بھر گیا تھا۔چہرے پہ نسیں پھڑکنے لگی تھیں۔اس نے جلا ہوا لائیٹر فیکٹری کے شاہانہ دروازے کی طرف پوری قوت سے پھینک دیا۔لائٹر کی سطح پر سے ابھرتے شعلے کی پیٹرول کے کچھ قطروں سے ٹکرار ہوئی۔پہلے ایک باریک سی چنگاری نکلی، اور جلد ہی اس چنگاری نے ایک شاہانہ شعلے کا روپ اختیار کیا۔آس پاس موجود گھاس پھونس شعلے کو بھڑکاتے گئی۔آگ فیکٹری میں پھیلنے لگی تھی۔آگ اس قدر شاہانہ تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے رات کے اس پہر سورج کا زمین پہ ظہور ہو گیا ہو۔

چہرے پہ فاتحانہ مسکراہت سجائے وہ اس آگ کو دیکھنے لگی۔

وہ دونوں اب وہاں سے جانے لگے اور ویگن میں سوار ہو گئے۔

"اب گھر چلو۔آج آخر کار نیلوفر سکون کی نیند سو سکے گی۔" وہ گہری سانس خارج کرتے بولی تھی۔وہ واقعی کافی خوش تھی۔شمس نے بھی ویگن چلانا شروع کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## یہ چھے سال پہلے کا منظر ہے۔۔۔

نیلوفر اس دروازے پہ کھڑی حلق کے بل چلائے جا رہی تھی۔خوف اس کی روح کو اس قدر جکڑے ہوئے تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکی۔اس کمرے میں اسٹریچر پہ ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔۔۔بے جان لاش۔اس لاش کی آنکھیں تک نکال دی گئی تھیں۔اس لاش کا پیٹ کاٹا گیا تھا۔درانی کے ہاتھوں پہ خون میں لت پت گلوز چڑھے ہوئے تھے۔اس نے ڈاکٹرز والا ایپرن پہنا ہوا تھا اور ساتھ ہی ڈاکٹرز والی ٹوپی بھی۔وہ اپنا ہاتھ اس مردہ لاش کے پیٹ کے اندر ڈال کے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس اسٹریچر کے عقب میں وہ کھڑی ہوئی تھی۔گردن اس کی بھرپور تنی ہوئی تھی۔لیڈی اقتدار، جو اس وقت قدرے جوان تھی۔چہرے پہ مسکراہٹ سجائے وہ نیلوفر کے اوپر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔نیلوفر کی چیخ تھم گئی۔آنکھوں میں خوف لیے وہ پورے منظر کو دیکھے گئی۔لیڈی اقتدار نے اب نیلوفر کی طرف قدم بڑھائے۔وہ نیلوفر کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔

"بالکل خاموش!" لیڈی اقتدار بلند آواز میں بولی۔نیلوفر وحشت زدہ ہو گئی تھی۔"تم جرائم کی دنیا کا حصہ بن چکی ہو۔ذرا سی نوک جھونک۔۔۔اور تم برباد کر دی جاؤ گی۔" وہ ہر لفظ پہ زور دیتے ہوئے تنبیہ کرنے لگی۔

یہ وہ وقت تھا جب نیلوفر کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی سنگین غلطی کر بیٹھی تھی۔اس دلدل نے اس کا گوشہ گوشہ جکڑ لیا تھا، اس دلدل سے فرار کا اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔۔۔موت۔

اور وہ فی الحال مرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلی ویگن نیلوفر کے قصر کے باہر رکی۔وہ نیلی ویگن سے اتر کے شمس کو کچھ کہنے لگی اور پھر اپنے قصر میں داخل ہوئی۔قصر کے چاروں اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔سبزہ زار کراس کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا۔اس کی ہڈیوں تک میں ٹھنڈی ہوا اتر رہی تھی۔نیلوفر کو کپکپی چڑھی۔

وہ قصر کی عمارت میں داخل ہوئی۔چہرہ بے تاثر تھا۔وہ کچھ دیر پہلے کی خوش باش نیلوفر سے قدرے مختلف لگتی تھی۔اب اس کے چہرے پہ خالی پن سا تھا۔اس نے اپنا پرس ایسے ہی قصر کے لاؤنج میں پھینک دیا۔وہ سفید سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر والی منزل میں آئی۔وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور پیچھے سے دروازہ بند کیا۔بند دروازے سے ٹیک لگا کے اس نے آنکھیں بند کیں۔آنکھیں کھولیں تو ان میں پانی بھرا ہوا تھا۔

”تم مطمئن کیوں نہیں ہوتی ہو نیلوفر؟“ وہ بے یقینی کے عالم میں خود کلامی کرنے لگی۔اسے اپنے آپ پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

”چھے سال پہلے تم جرائم کی دنیا کی قید میں بند ہوئی تھی۔چھے سال نیلوفر۔۔۔“ وہ اونچی آواز میں خود کو یاد دلانے لگی۔آنسو اس کی آنکھوں سے رواں اس کے گالوں کی سمت پار کر رہے تھے۔

”تم کیوں عادی نہیں ہو رہی ہو اس دنیا کی؟ نہ بھولو کہ واپسی نا ممکن ہے۔اسی دنیا میں خوش کیوں نہیں ہو جاتی؟“ وہ حیران تھی۔۔۔خود پہ۔اس کا یہ دل پوری طرح سے مطمئن کیوں نہیں ہوتا تھا؟

آخر ہر خوشی اتنی عارضی کیوں ہوتی تھی؟ وہ اپنے دل کو کالا کرنے کے چکر میں جرم پہ جرم، گناہ پہ گناہ کرتے گئی۔ کہ شاید اس کا یہ دل عادی ہو جائے۔ کہ شاید اس کا یہ دل اسی دنیا میں سکون حاصل کرلے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اطمینان اسے آج تک نہ ملا۔ وہ قاتل تھی، وہ بڑے سے بڑے گناہ کرتی تھی۔ وہ مجرم تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا دل اس حقیقت کو قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ کتنی کوشش کرتی تھی کہ وہ اس دنیا کے اندھیر رنگوں میں ڈھل جائے۔ لیکن آج تک وہ اس مشق میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ کمرے کی بتیاں جلائیں۔ دیوار پہ ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ اس تصویر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

وہ تصویر اس کی ماں کی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں کی۔ تصویر میں رنگ کافی کم تھے۔ نور بیگم بھی کافی جوان لگتی تھیں۔ وہ ہو بہو نیلوفر کا عکس تھیں جیسے۔ وہی گھنگرالے بال۔ چہرے پہ وہی ادا۔ وہی نین نقش اور وہی خوبصورتی۔ نیلوفر بالکل اپنی والدہ، نور بیگم پہ گئی تھی۔ چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ لیے وہ اس تصویر کو دیکھے گئی۔ وہ کہیں کھونے لگی۔۔۔ ماضی میں۔۔۔ ماضی کے ایک منظر میں۔۔۔

تیرہ سالہ نیلوفر اپنے سابقہ گھر میں تھی جو کہ اس کے چچاؤں نے ہتھیا لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں رہ رہی تھی۔ نیلوفر ایک ہاتھ میں دوائی کی بوتل اور دوسرے میں روئی کا گولا پکڑے ہوئے تھی۔ بوتل انڈیل کے اس نے کچھ

دوائی روئی میں جزب کی۔ روئی کا گولہ پھر وہ اپنی ماں کے سر پہ لگے زخم پہ دبانے لگی۔ نور بیگم نے تکلیف دہ سسکی لی۔ نیلوفر کو یہ سسک سن کے کچھ ہوا۔ اس کے چہرے پہ غم تھا اور رنج بھی۔

"نیلوفر۔ تم تو ابھی سے ہی کافی اچھی ڈاکٹر بننے لگی ہو۔" نور بیگم نے نیلوفر کے چہرے پہ تکلیف دیکھی تو بول اٹھیں۔ وہ نیلوفر کا موڈ بہتر کرنا چاہتی تھیں۔ اپنا غم چھپا کے وہ کافی شوخ انداز میں بولیں۔ نیلوفر بے اختیار مسکرا دی۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا۔

"دیکھیئے گا، میں ایک بہت بڑی ڈاکٹر بنوں گی۔" نیلوفر بھی اپنے آپ کو ڈاکٹر کا کوٹ پہنے ہوئے، بڑے سے ہسپتال میں نرسز کو حکم دیتے ہوئے تصور کرنے لگی۔ موڈ ایک دم سے تر و تازہ ہونے لگا۔

"اور پھر تم بھی میری ایسے ہی مرہم پٹی کیا کرو گی۔" نور بیگم نیلوفر کو خوش دیکھ کے پر سکون ہونے لگی تھیں۔ نیلوفر کا ہاتھ تھما۔ اس نے خائف سی نظر نور بیگم پہ ڈالی۔

"اللہ! امی اللہ نہ کرے اس وقت ہم جاہلوں کے ہاتھ میں ہوں۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہو جاؤں پھر دیکھیئے گا، آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔" وہ بولی۔ نور بیگم مسکرا دی۔

"اور پھر؟"

"پھر ان جنگلی جانوروں پہ کیس کر کے اپنا گھر واپس لوں گی۔" نور بیگم مدھم سا ہنس دیں۔

"اور پھر؟" وہ نیلوفر کے انداز سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

"پھر میں ایک اچھی ڈاکٹر بنوں گی، جو ایسی ہماری جیسی عورتوں کا دھیان رکھتی ہے۔ میں ہمارے جیسی عورتوں کا کندھا بنوں گی امی۔ دیکھئے گا آپ۔" نور بیگم پورے دل سے مسکرا دی۔ انہیں نیلوفر پہ فخر محسوس ہو رہا تھا۔

"تم میرا نام روشن کرو گی نیلوفر، مجھے یقین ہے۔" وہ نرمی سے نیلوفر کے سر پہ ہاتھ پھیرتے بولی۔ نیلوفر بھی بستر پہ ان کے برابر میں لیٹ کر ان سے چمٹ گئی۔

"تم مستقبل میں میرے لیے باعث فخر بنو گی، مجھے یقین ہے۔" وہ شفقت سے اس کا ماتھا چومنے لگی۔

"مجھے بھی یقین ہے۔" اپنی ماں کے آغوش میں وہ پرسکون سی ہو کے بولی۔

وہ رو رہی تھی۔۔۔حال والی نیلوفر اس تصویر کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ چہرے پہ گہرا کرب تھا۔وہ ڈاکٹر تو بن گئی تھی، وہ نرسز پہ اپنا حکم بھی چلاتی تھی۔۔۔لیکن اچھی۔۔۔وہ یہی نہیں بن سکی۔ چھے سال پہلے اس نے ایک ایسا قدم بڑھایا تھا جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہی تھی۔اور نہ جانے کب تک بھگتنے والی تھی۔اس کے نزدیک واپسی کا ہر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

نیلوفر اندر سے کس درجے کے عذاب سے گزر رہی تھی، اس کی کیفیت کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔دنیا کے نزدیک وہ تو ایک مغرور، اپنے آپ میں مگن عورت تھی۔۔۔کوئی نہیں تھا جو اس کے اس حساس روپ سے واقف تھا۔۔۔

کوئی نیلوفر کے اصل سے واقف نہ تھا۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر اپنے آفس میں ریسیپشن کے پاس کھڑی ایک مرد ایمپلائی سے بات کر رہی تھی۔چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ کسی فائل کا جائزہ لے رہی تھی۔اسے اپنے پرس میں کچھ تھرتھراتا محسوس ہوا۔مہر ایک دم سے چوکنا ہو گئی۔اس کے ہاتھ میں اس کا اپنا موبائل تھا، اور پرس میں احمد کی طرف سے دیا جانے والا

موبائل۔اس نے ایمپلائی سے آئیں بائیں باتیں کی اور اس سے جان چھڑائی۔ پھر اس نے اپنا دوسرا موبائل نکالا تو اس میں احمد کا میسج تھا۔

"آپ کے آفس میں انتظار کر رہا ہوں۔"

مہر کو جھٹکا لگا۔۔یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ سب چھوڑ چھاڑ کے اپنے کمرے میں جانے لگی۔

وہ کمرے میں آئی تو اندر وہ کھڑا تھا۔مہر کے چہرے پہ حیرانی پھیلنے لگی۔ اس نے سفید پوری آستین کی شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پہ سفید ٹوپی بھی تھی اور چہرے پہ سفید ماسک۔ آنکھوں پہ اس نے کالا چشمہ لگایا ہوا تھا۔مہر کے آتے ہی اس نے اپنا فیس ماسک اتار کے مہر کی ڈیسک پہ رکھ دیا۔

"اتنا حیران نہ ہوں۔ گارڈز نے اندر آنے دیا۔ آپ کے ایمپلائیز ماشاء اللہ سے سن دماغ ہیں، کسی نے مجھ پہ توجہ ہی نہیں دی۔ آپ کے سر پہ جو آپ کے دشمنوں نے فوج بٹھا رکھی ہے ان سب سے بچنے کے لیے مجھے یہ کرنا پڑا۔" مہر نے اپنے چہرے پہ چھائی حیرانی چھپائی۔

"آپ مجھے پہلے بھی بتا سکتے تھے۔" اب تک وہ اپنے آپ کو نارمل کر چکی تھی۔ احمد مسکرا دیا۔

"چلیں، کوئی نہیں۔اب ہم ان لاکرز کی تلاشی لیتے ہیں۔"احمد نے اپنا چشمہ بھی اتارا اور ٹوپی بھی اور دونوں کو ڈیسک پہ رکھ دیا۔

"متجسس بہت تھی میں۔ لیکن میں نے اب تک کھولے نہیں۔بس اب ہیرے ہمیں یہاں سے مل جائیں۔" مہر ہاری ہوئی سانس خارج کرتے بولی۔

”ہیرے یہاں پہ نہیں ملنے والے۔“ احمد اسپاٹ لہجے میں بولا۔مہر کا چہرہ مزید بجھ گیا۔

”مطلب؟“

”میں عبداللہ صاحب کو جانتا ہوں۔وہ ایک ہوشیار بزنس مین تھے۔وہ کبھی اتنے قیمتی ہیرے یوں اپنے آفس میں چھپانے کی غلطی کر ہی نہیں سکتے تھے۔آپ خود سوچیں۔یہ کمرہ آپ کے آفس میں بالکل کونے میں ہے۔فرض کریں کہ آپ کے ڈیڈ یہاں ہیرے لائے بھی تو پہلے انہوں نے آفس کے پورے ہجوم کو پار کیا ہو گا۔لیکن ہاں،یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ رات میں لائیں ہوں۔مگر مجھے نہیں لگتا کہ ایک ہوشیار بزنس مین یہ غلطی کرے گا۔ہیرے کسی اور مقام پہ ہونے چاہیے۔اس آفس سے زیادہ محفوظ مقام۔سمجھ رہی ہیں آپ؟“ مہر کا چہرہ مایوسی کے رنگوں میں ڈھلنے لگا۔اب اس کا آفس کے لاکرز بھی دیکھنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔اگر یہاں نہیں تو وہ ہیرے کہاں تھے؟ مہر کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

”اگر وہ ہیرے نہیں ملے تو میں برباد ہو جاؤں گی احمد“ وہ سانس خارج کرتے مایوس کن انداز میں بولی۔اس کے ارد گرد تناؤ جیسے بڑھتا جارہا تھا۔ایک تو سر پہ بھاری قرضہ سوار تھا،اور پھر ہیرے ملنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے،وہ ایک دفعہ پھر سے ٹوٹنے لگی تھی۔

احمد کا چہرہ نرم پڑا۔اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

”آپ اتنی جلدی مایوس کیوں ہو جاتی ہیں مہر؟ ہر چیز اپنے وقت پہ ہو جائے گی۔یقین کریں۔“ وہ تسلی بخش انداز اختیار کرتے بولا تھا۔مہر سر نفی میں ہلانے لگی۔

"کیا کرلوں گی میں اگر کچھ بھی نہیں ہوا احمد؟ میری زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ مجھے نہیں سمجھ آرہا میں ان کرائسز سے کیسے نکلوں گی۔" وہ آواز میں بے بسی لیے بولی تھی۔ احمد کی آنکھوں میں سے چمک فنا ہوئی۔ اسے مہر پہ ترس آرہا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ وہ مہر کو یوں ٹوٹنے نہیں دے سکتا تھا۔

احمد کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اس نے پھر اپنی بات کا آغاز کیا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں مہر؟" احمد نے اچانک سوال کیا۔ مہر احمد کے منہ سے کچھ تسلی بخش سننے کی توقع کر رہی تھی اس لیے ذرا چونکی۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ ہیرے مجھے مل جائیں۔ ان ہیروں کو واپس کر کے میں وہ قرضہ معاف کروا لوں۔" مہر احمد کو بتانے لگی۔ احمد نے سوچتے سمجھتے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، اگر وہ ہیرے مل بھی گئے تو کیا وہ آپ کو چھوڑ دیں گے؟ کیا وہ آپ کا پیچھا چھوڑ دیں گے؟ کیا آپ ایسے لوگوں کی باتوں پہ بھروسہ کر کے غلطی نہیں کر رہی ہیں، جنہوں نے آپ کے ڈیڈ کو مارا، جو کہ جرائم کی اس اندھیری دنیا کے فرد ہیں؟" احمد ہاتھوں کو باندھ کر تفتیشی انداز میں بولا تھا۔

مہر گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے کبھی اس سب کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ کیا اکھاڑ لے گی وہ ان سب کا اگر انہوں نے ہیرے حاصل کرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا؟ مہر مضطرب سی ہو کے اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ کے وہ اپنی کنپٹی سہلانے لگی۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ مصیبتوں میں گرتی جا رہی تھی۔

”میں کیسے فرار حاصل کروں گی؟ میں بری طرح پھنس چکی ہوں۔“ مہر کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔پہلے تو اسے لگتا تھا کہ ہیرے ڈھونڈ کے وہ اس دلدل سے نکل جائے گی، اب ہیرے ملنے کے بعد وہ محفوظ ہو گی کہ نہیں، اسے اس پہ بھی یقین نہ تھا۔

”دیکھیں۔میرا مقصد آپ کو مایوس کرنا نہیں ہے۔میں صرف اتنا سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ آپ کی ترجیح ہیرے تلاش کرنا نہیں ہونی چاہئے۔بلکہ آپ کی ترجیح کچھ ایسا کرنے کی ہونی چاہئے جس سے وہ سب تباہ و برباد ہو جائیں۔جس سے وہ سب آپ کو نقصان پہچانے کی جرات ہی نہ کر سکیں۔“احمد مہر کی ٹیبل کی طرف بڑھتے بولا تھا۔مہر نے اپنا سر سہلانا بند کیا۔اس نے نظر اٹھا کے احمد کو دیکھا۔

”مگر میں یہ سب کیسے کروں گی؟“

”آپ مایوس نہ ہوں مہر۔میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔“ وہ اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے نرمی سے بولا۔وہ مسکرایا تو مہر بھی بے اختیار مسکرا دی۔

”آپ نے اپنے دماغ کو حاضر رکھنا ہے مہر۔آپ نے کوشش کرنی ہے کہ اپنے دشمنوں کو پہچانیں۔ان کے بارے میں چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کا جائزہ لیں۔یہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی ہوتی ہیں جو ہمارے بڑے بڑے سوالات کا جواب دیتی ہیں۔آپ اپنے آپ کو مضبوط کر لیں مہر۔آپ کی ترجیح صرف اور صرف ان کو برباد کرنا ہونی چاہئے۔کیا آپ اپنے ڈیڈ کے قاتلوں کو برباد ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی؟“مہر کے اندر ایک آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔احمد کے الفاظ اس کے دل میں قوت بھرنے لگے تھے۔واقعی اس نے اس سب کے بارے میں اس طرح سے کیوں نہ سوچا تھا؟ صرف نظریہ بدلنے سے ہی وہ کس قدر پر امید ہونے لگ گئی تھی۔

اس نے اپنی گردن سست روی سے اثبات میں ہلائی۔ احمد فخریہ سا مسکرا دیا۔ مہر اب سب کچھ جھڑک کے کھڑی ہوئی۔ احمد بھی اسی کے ساتھ کھڑا ہوا۔

”آپ نے اپنے آپ کو ٹوٹنے نہیں دینا ہے مہر۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے، آپ نے طاقت اور بہادری کی مثال قائم کرنی ہے۔ ہم مل کے اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیں گے۔“ وہ انداز میں لگن لیے بولا۔ مہر بھی پرجوش مسکراہٹ لیے سر اوپر نیچے ہلانے لگی۔

ہمیشہ نرم اور میٹھے الفاظ ہی تسلی بخش ثابت نہیں ہوتے، کبھی کبھی حقیقت کا آئینہ دکھا کر بھی انسانوں کا دل بہلایا جا سکتا ہے۔

”چلیں پھر، لاکرز کھولتے ہیں۔“ احمد بولا۔ مہر بھی اس کے ساتھ لاکرز کی طرف بڑھی۔

دونوں نے لاکرز کھولے، تو حسب توقع اندر ہیرے نہ تھے۔ لیکن لاکرز کے اندر کچھ ڈاکومنٹس ضرور تھے۔

احمد نے وہ ڈاکومنٹس اپنے ہاتھ میں تھامے اور انہیں پڑھنے لگا۔ جبکہ مہر، وہ بس چپ چاپ اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس نے کچھ بھی مایوس کن نہ سوچا اور نہ کہا۔ احمد ہاتھ میں ڈاکومنٹس تھامے مہر کی مخالف کرسی پہ بیٹھا۔ وہ انھیں بغور پڑھ رہا تھا۔ اسے یقینا ان میں کچھ دلچسپ مل گیا تھا۔

”سب سے پہلے آپ یہ بتائیں۔“ احمد نے ڈاکومنٹس ٹیبل پہ رکھے اور مہر کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آپ کو اپنے ڈیڈ کے کسی فارم ہاؤس کے بارے میں پتا ہے؟“ احمد مہر کی آنکھوں کا جائزہ لینے لگا۔ مہر کچھ سوچتے ہوئے سر نفی میں ہلانے لگی۔

"میرے علم میں تو نہیں ہے۔" مہر گردن نفی میں ہلاتے ہوئی بولی۔احمد نے اپنے ہاتھوں کو اسٹریچ کیا۔چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ آپ کے ڈیڈ کے دو فارم ہاؤس کے ڈاکومنٹس ہیں۔" احمد نے اتنا کہا اور مہر ڈاکومنٹس ہاتھ میں تھام کے انہیں دیکھنے لگی۔واقعی۔۔۔وہ ان کے بارے میں لا علم تھی۔

"آپ ان کے بارے میں نہیں جانتی تھیں، ممکن ہے کہ ہیرے ادھر ہوں۔" احمد شانے اچکاتے بولا۔ مہر پرجوش ہو کے گردن اوپر نیچے ہلانے لگی۔وہ کچھ دیر پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ اب وہ ہیرے کہاں تلاش کرے گی۔۔۔اور یہاں بیٹھے بٹھائے اسے دو جگہیں مل بھی گئی تھیں۔

"ہاں بالکل۔مجھے ان دونوں کے بارے میں نہیں پتا۔ڈیڈ نے ان دونوں فارم ہاؤس کے بارے میں مجھ تک سے چھپایا، یعنی ادھر ہیروں کی موجودگی کا ایک بڑا امکان ہے۔" مہر پر امید ہو کے بولی۔

"نہیں۔زیادہ بڑا نہیں۔مگر امکان ضرور ہے۔" لا پرواہ سے انداز میں احمد نے مہر کی تھیوری رد کی۔

"میرا یہ ماننا ہے کہ یا تو یہاں ہیرے چھپائے ہوں گے، یا ان دو فارم ہاؤس میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔اسی لیے، آپ کے ڈید نے ان فارم ہاؤس کی موجودگی کے بارے میں آپ تک سے چھپایا ہے۔ اور جیسے کے آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے دشمن اور آپ کے ڈیڈ جرائم میں ایک دوسرے کے پارٹنرز تھے، تو اگر واقعی،ان مقامات پہ کچھ مشکوک سا ہوتا رہا ہے تو ہمیں اپنے دشمنوں کے بارے میں کچھ مزید مل سکتا ہے۔کیا کہتی ہیں؟" مہر احمد کا زاویہ سمجھ چکی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"بالکل۔امکان ہے۔اور ویسے بھی ہماری ترجیح صرف اور صرف اپنے دشمنوں کو برباد کرنا ہے، اس لیے ہمیں وہاں لازمی جانا چاہئے۔" مہر احمد کا فقرہ دہرانے لگی۔اسے مہر پہ فخر ہورہا تھا، ٹھیک اسی طرح سے جیسے ایک استاد کو اپنے اسٹوڈنٹ کی کارکردگی پہ ہوتا ہے۔

"بس ٹھیک ہے۔ہم جلد ہی جائیں گے۔ان فارم ہاؤس میں ایک چکر لگانا تو بنتا ہی ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**ہیروں کا یہ بھیانک کھیل کہاں سے شروع ہوا تھا؟**

**رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے ہم اپنی کہانی کو روک کے ڈھائی سال پہلے کے وقتوں میں قدم رکھتے ہیں۔ڈھائی سال قبل:**

وہ چاروں عافیت زندگی کی بیسمنٹ میں بنے اس خفیہ ملاقاتی کمرے میں موجود تھے۔لیڈی اقتدار کھڑی ہوئی تھی۔آس پاس اس کے تین کرسیاں تھیں جن پہ شمس نیلوفر اور درانی براجمان تھے۔

لیڈی اقتدار کی گردن پوری شان سے اب بھی اکڑی ہوئی تھی۔چہرے پہ اس کے فخریہ مسکراہٹ تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا جس پہ ویلوٹ کا نرم و ملائم کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ویلویٹ کے اوپر خوبصورت سے موتی بھی جڑے ہوئے تھے۔

"آج میں نے تم سب کو اس لیے بلایا ہے تاکہ میں تم سب کو، ایک تحفہ دے سکوں، ایک انعام دے سکوں۔"

لیڈی اقتدار نے اس ڈبے کو کھولا۔ڈبے میں سے روشنی نکلنے لگی۔وہ چار نایاب سے پتھر، آس پاس کی روشنی کی وجہ سے بھرپور چمک رہے تھے۔دیکھنے والے کو وہ اپنے سحر میں باند لیتے تھے۔ان چار خوبصورت ہیروں پہ ان تینوں کی نظریں پڑیں تو ان کے دل مچلنے لگے۔وہ اس کی خوبصورتی میں کھونے لگے تھے۔

”یہ ہمارے جرمن کلائنٹ نے، انعام کے طور پہ ہمیں دیا تھا، کیونکہ ہم نے اس کی بیٹی کا ہارٹ ٹرانسپلانٹ کروایا اور وہ اب زندگی میں واپس آگئی ہے۔میں چاہتی تو ان ہیروں کی بھنک بھی تم سب تک پڑنے نہ دیتی، اور انہیں اپنے پاس ہی رکھے رہتی۔لیکن نہیں۔میں تم سب کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ، تم سب اقتدار کا بھروسہ جیتنے میں کامیاب ہوئے ہو۔میں تم سب کو بتانا چاہتی تھی کہ اقتدار کو تم سب کی وفا پہ سو فیصد بھروسہ ہے۔بابا کہتے تھے، جو بے وفا ہوتا ہے اسے مار دینا چاہیئے، اور جو وفادار ثابت ہوجائے اسے سینے سے لگا کے رکھنا چاہیئے۔اس کی قدر کرنی چاہیئے۔اقتدار بھی تم سب کی قدر کرتی ہے، پس تم لوگ بھی اقتدار کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کرو، زندگی جنت نہ بن جائے تو نام بدل دینا۔“ لیڈی اقتدار اپنے روایتی تکبر سے لبریز انداز میں مختصر سی تقریر دینے لگی۔سب اپنی ملکہ کو سرعت سے سن رہے تھے۔سب کے چہروں پہ پرجوش مسکراہٹ تھی۔

اسی کمرے میں ایک لاکر موجود تھا جس میں لیڈی اقتدار نے وہ ڈبا رکھا اور اس لاکر کو چابی سے بند کر دیا۔اب وہ پرسکون سی ہو کے اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

”لیڈی، ان کی قیمت کتنی ہے؟“ نیلوفر کے منہ میں پانی بھر آیا۔وہ ہیرے واقعی بے حد حسین تھے۔

"تیس ملین ڈالرز کے آس پاس۔ہم ان ہیروں کو بیچ کے رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔یہ ہیرے ہمارے دولت کے خزینوں کا ایک خوش بخت اضافہ ثابت ہوں گے۔"

وہ تینوں یہ سن کے ایک دم سے بہت خوش ہو گئے تھے۔وہ ہیرے۔۔۔وہ نایاب ہیرے۔۔۔وہ قیمتی اور خوبصورت ہیرے۔۔۔صرف ان کے تھے۔۔۔ہے ناں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**اگلے دن:**

عبداللہ سلطان اپنے آفس میں بیٹھے کام کر رہے تھے، ٹھیک اسی وقت ان کا موبائل تھرتھرایا۔یہ نمبر غیر مطلوبہ تھا جس کے باعث وہ کافی مشکوک ہونے لگے تھے۔انہوں نے بہرحال کال اٹھا لی۔

"تمہاری بیوی جس ہسپتال میں کام کرتی ہے، اس کے بیسمنٹ میں ایک خفیہ بیسمنٹ ہے۔ادھر چار ہیرے چھپے ہوئے ہیں۔" فون کے اس پار سے آواز گونجی۔۔۔پھٹی پھٹی، بھاری سی آواز جو کہ غیر انسانی معلوم ہوتی تھی۔

عبداللہ سلطان اور بھی زیادہ مشکوک ہوئے۔وہ جانتے تھے کہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے، جو بھی کال کر رہا تھا اس نے ڈھیروں وائس فلٹرز لگائے ہوئے تھے اور انکرپشن بھی کی ہوئی تھی، جس کے باعث آواز پہچانی نہیں جاتی تھی۔

"بکواس بند کرو۔میں ایسے لوگوں کو منہ تک نہیں لگاتا جو اپنی شناخت تک دکھانے سے ڈرتے ہیں؟"

عبداللہ سلطان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا تھا۔ان ہیروں کی قیمت تیس ملین ڈالرز کے آس پاس ہے۔“ عبداللہ سلطان کرنٹ کھا کے کھڑے ہوئے۔ تیس ملین ڈالرز؟ یہ ہیرے تو ان کی پوری زندگی سوار سکتے تھے۔۔

”اور تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“ دل میں اپنا لالچ چھپاتے وہ بولے تھے۔

”دو دن بعد ہسپتال کی انتظامیہ لاہور جا رہی ہے۔میں تمہیں چابیاں لا کے دے سکتا ہوں۔اس بیسمنٹ کی۔بیسمنٹ میں موجود اس لاکر کی۔تم وہ ہیرے لے لینا۔دو ہیرے میرے اور دو تمہارے۔ کیا کہتے ہو۔“ عبداللہ سلطان گہری سوچ میں پڑ گئے۔وہ اگر ہیرے لیں گے تو یا تو سارے لیں گے یا ایک بھی نہیں لیں گے۔

”بکواس بند کرو۔اور آئندہ کال کرنے کی ہمت بھی نہ کرنا۔“ عبداللہ سلطان نے کال کاٹ دی۔مگر ان کے دماغ میں ایک منصوبہ بننے لگا تھا۔وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہیروں کو اپنی ملکیت میں لے کر ہی دم لیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس دن نیلوفر اور باقی ہسپتال کی انتظامیہ لاہور گئی عبداللہ سلطان اسی دن عافیت زندگی پہنچ گئے۔
ہسپتال میں داخل ہو کے وہ ہسپتال کے کونے کونے میں متلاشی نظریں گھمانے لگے۔انہیں دیوار کے

ساتھ کھڑی ایک نرس نظر آئی جو کہ مسکرا مسکرا کے کسی سے فون پہ باتیں کر رہی تھی۔اس نرس کے چہرے پہ بھرپور میک اپ تھا۔کانوں میں مہنگے ٹاپس تھے اور پیروں میں مہنگی ہیلز۔

عبداللہ سلطان اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے، کہ یہ کسی غلط کام میں ملوس تھی۔ایک عام سی نرس اتنی مہنگی ہیلز اور اتنے مہنگے ٹاپس بھلا کیسے خرید سکتی تھی۔انہیں اپنا شکار مل گیا تھا۔

وہ سستی سے قدم اس کی طرف بڑھانے لگے۔آنکھوں میں سرد مہری تھی، اور چہرہ بے تاثر۔وہ نرس کے برابر میں کھڑے ہو کے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگے۔نرس کو جب اپنے برابر میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے اپنی گردن موڑی۔عبداللہ سلطان کو دیکھتے ہی وہ کچھ غیر آرام دہ سی ہونے لگی۔

"ایکسکیوز می؟" نرس نے آنکھیں پھاڑ کے عبداللہ سلطان کو دیکھا۔

"یہاں پہ نیلوفر کام کرتی ہے۔میں اس کا شوہر ہوں۔" نرس کے تاثرات پہ ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔

"اچھا، مبارک ہو۔اگر کوئی کام نہیں ہے تو جائیں؟" نرس کا انداز بد لحاظ سا تھا۔

عبداللہ سلطان کے چہرے پہ خسیانی مسکراہٹ بکھری۔انہوں نے کوٹ کا پٹ کھولا۔اور کوٹ کے پٹ کے اندر کی جیب سے ایک نوٹ کی گڈی نکالی۔نرس کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹنے لگی۔نوٹوں کی وہ گڈی دیکھ کے اس کی رال ٹپکنے لگی۔اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑے۔عبداللہ سلطان نے جب تسلی کر لی کہ نرس اچھی طرح سے وہ نوٹ دیکھ چکی تھی تو انہوں نے کوٹ کا پٹ بند کر دیا۔

"میرا نام روشنی ہے۔میں آپ کی کیسے مدد کر سکتی ہوں؟" ایک لمحے میں روشنی کا انداز پلٹا کھا گیا تھا۔ وہ بہت ہی میٹھے سے لہجے میں بات کرنے لگی تھی۔آنکھوں میں اس کے اچانک معصومیت بھر گئی۔ عبداللہ سلطان زیر لب ہنس دیئے۔

"میری گاڑی میں ملو۔نوٹوں سے بھرا پورا سوٹ کیس تمہارا منتظر ہے۔" عبداللہ سلطان سرد سے انداز میں بولے۔روشنی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پہ براجمان ہو گئے۔

"کیا کرنا ہو گا مجھے؟" روشنی کی آنکھوں میں نٹ کھٹ سا تاثر تھا اور چہرے پہ شرارتی مسکراہٹ۔ عبداللہ سلطان کے تاثرات مزید سخت ہوئے۔

"غداری کرنی ہو گی۔مگر اس غداری کی پوری رقم دوں گا۔" عبداللہ سلطان نے بہت آرام آرام سے بتایا۔

"قبول ہے۔بتاؤ۔کیسے کرنی ہے غداری؟" اب کی بار روشنی بولی تو اس کا لہجہ ایک بار پھر سے لا پرواہ سا ہو گیا تھا۔

"تم مجھے بتاؤ کہ اس ہسپتال میں کون سا غلط کام ہو رہا ہے؟" عبداللہ سلطان بہت ہی ٹھہر ٹھہر کے سوال کر رہے تھے۔

"شاید یہاں پہ کوئی غلط کام نہ ہوتا ہو؟" روشنی پر اعتماد ہو کے بولی۔عبداللہ سلطان زیر لب ہنس دیئے۔

"میں تمہارے مالکوں کے لیے منی لانڈرنگ کرتا ہوں روشنی۔ان کا پیسہ دوسرے ممالک بھیجتا ہوں۔ تاکہ ان کے کالے پیسے پہ پردہ رکھ سکوں۔اس لیے میرے ساتھ یہ گیمز نہ کھیلو۔اور چپ چاپ بتاؤ، یہاں کیا ہوتا ہے۔" روشنی نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

"ہم اعضاء کا غیر قانونی کاروبار کرتے ہیں۔دنیا بھر سے ہمارے پاس کلائنٹ آتے ہیں اعضاء خریدنے۔ بس یہ ہے ہمارا کاروبار۔" روشنی بے نیاز انداز میں سیدھا سیدھا بولے جارہی تھی۔

"اور تم لوگ کہاں سے لاتے ہو اعضاء؟" عبداللہ سلطان کو تجسس ہوا۔

"لوگوں کو اغواء کرتے ہیں کبھی کبھی۔ کبھی یہ غریب لوگ خود ہمیں اعضاء بیچتے ہیں۔ تمہیں سمجھ آ ہی گئی ہو گی۔"روشنی جیسے بے زار ہونے لگی تھی۔

"مجھے بتاؤ اس ہسپتال میں کوئی خفیہ جگہ ہے؟" عبداللہ سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔نرس نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"ایک انڈر گراؤنڈ بیسمنٹ ہے۔ کبھی کبھی بسیمنٹ میں ہم نرسز اور ڈاکٹرز کو جمع کیا جاتا ہے، کوئی ضروری بات کرنے کے لیے۔اس کے علاوہ اس بیسمنٹ میں تین کمرے ہیں۔ ایک آپریشن تھیٹر ایک کمرہ قیدیوں کے لیے ہے۔اور ایک ملاقاتی کمرہ ہے؛ لیڈی اقتدار مسٹر درانی نیلوفر میم اور شمس کا۔" روشنی تیز تیز عبداللہ کو سب بتاتے گئی۔عبداللہ سلطان سنتے گئے۔

"مجھے اس بیسمنٹ میں لے کے چلو گی؟بس آخری فیور۔" روشنی کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

”کیوں نہیں۔لیکن اور پیسے لوں گی۔اور ہاں رات کے وقت ہی جا سکے گے کیونکہ رات کے وقت رش کم ہو گا۔نیلوفر میم کے کمرے سے جا کے چابیاں چرانی ہوں گی۔اور پھر میں تمہیں لے چلوں گی۔باقی تم اپنی طرف سے بھی انتظام کر کے آنا۔“ روشنی نے آنکھیں گھمائیں۔

”منظور ہے۔“ عبداللہ سلطان بغیر کسی جھجک کے بولے۔”نمبر دو۔آنے سے پہلے کال کروں گا۔“ روشنی نے پھر عبداللہ سلطان کو اپنا نمبر دے دیا اور دونوں پھر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

پلان کے مطابق عبداللہ سلطان اور روشنی رات کو ہسپتال میں ملے۔اس وقت رش بھی کافی کم تھا۔ روشنی عبداللہ سلطان کو نیلوفر کے کمرے میں لے آئی۔اس نے صفائی والی سے اچھے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نیلوفر کے کمرے کی چابیاں لے لی تھیں۔

”میں کیمریں ڈفیوز کر رہی ہوں۔تم یہاں چابیاں ڈھونڈو۔جو چابی نظر آئے اسے اٹھا لینا۔“ روشی کہہ کے نیلوفر کے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

عبداللہ سلطان اچھی طرح سے کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ان کی نظر نیلوفر کی ڈیسک کے نیچے ایک لاکر پہ پڑی جو کہ چابی سے بند کیا ہوا تھا۔عبداللہ سلطان کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔انہوں نے اپنے بیگ سے دو بابی پنز اور ایک چھوٹی چھری نکالی۔پنز کو لاک میں گھسایا اور پھر پتلی چھری کو لاک کے اندر ڈال کے لاک کو گھمایا۔ایک کلک کی آواز آئی اور لاکر کھل گیا۔اند چابی کا ایک گچھا تھا ساتھ ہی کچھ رقم اور پیپرز۔عبداللہ سلطان نے چابی کا گچھا جیب میں رکھ لیا۔

"کیمریں ڈفیوز ہو گئے؟" عبداللہ سلطان نے کھڑے ہو کے پوچھا۔

"بس ایک سیکنڈ۔" روشنی نے کی بورڈ کی ایک کی دبائی اور پھر وہ بھی سیدھی ہو گئی۔"ہو گیا کام۔واپس آکے سب سیٹ کرنا ہو گا۔یاد رہے۔" روشنی آہستہ سے بولی۔

دونوں احتیاط سے کمرے سے باہر نکلے۔خوش قسمتی سے وہ دونوں اپنی مشکوک سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے کسی کی نظروں میں نہ آئے۔دونوں نے پھر ہسپتال کا بڑا سا حال کراس کیا۔زینہ اتر کے وہ اسٹور روم کے باہر پہنچے۔اسٹور روم کا دروازہ بند تھا۔عبداللہ سلطان نے چابی کا گچھا نکالا، کچھ دیر کی جد وجہد کے بعد اسٹور روم کا دروازہ بھی کھل گیا۔اب وہ دونوں بڑے سے اسٹور روم میں داخل ہوئے۔روشنی نے کمرے کی بتیاں جلائیں۔عبداللہ سلطان آرام دہ ہو کے پورے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

اب وہ دائیں اور بائیں طرف بنے شیلوز کے درمیان سے چلنے لگے۔سامنے والی دیوار پہ لیڈی اقتدار کی بڑی سی تصویر تھی۔رشنی نے اسے کھسکایا، عبداللہ سلطان بمشکل اپنے تعجب کو چھپا پا رہے تھے۔دیوار پہ لگے پینل کو روشنی نے کھولا اور اس میں کچھ کیز دبائیں۔لفٹ اوپر آنے لگی۔عبداللہ سلطان نے بے اختیار بھنویں بھینچیں۔دل ہی دل میں وہ متاثر بھی ہو رہے تھے۔

عبداللہ اور روشنی لفٹ میں سوار ہو گئے۔لفٹ نیچے اتری اور عافیت زندگی کے بیسمنٹ میں پہنچ گئی۔وہ اب حال میں تھے، وہی تین دروازوں والا حال۔

"مجھے بتاؤ۔ملاقاتی کمرہ کون سا ہے؟ آگے کا سفر میں اکیلے طے کروں گا۔" عبداللہ سلطان نے سرد لہجے میں کہا۔روشنی نے دائیں طرف بنے دروازے پہ اشارہ کیا۔عبداللہ سلطان نے سر اثبات میں ہلایا۔

عبداللہ سلطان اب چلتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔چابی کا استعمال کر کے انہوں نے دروازہ کھولا۔اندر جاتے ہی انہوں نے دروازہ بند کیا۔عقب میں ہی ان کے سوئچ بورڈ تھا جس کو دبانے سے کمرہ روشن ہو گیا۔

گول دائرے کی صورت میں چار کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ساتھ ہی ایک میز بھی تھا۔میز کے ساتھ ہی دیوار پہ کونے پہ ایک لاکر تھا۔عبداللہ سلطان کو ہیروں سے قرب محسوس ہونے لگا۔ان کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

وہ اس لاکر تک گئے اور چابی کا استعمال کر کے اس لاکر کو کھولا۔انہیں وہ خوبصورت ڈبا نظر آیا جس میں وہ ہیرے تھے۔عبداللہ سلطان کے منہ میں پانی بھرنے لگا۔اور جیسے ہی انہوں نے وہ ڈبا کھولا تو وہ چمکتے دمکتے ہیرے ان کی آنکھوں میں روشنی چھوڑنے لگے۔عبداللہ سلطان بے اختیار ہنسنے لگے۔بے شمار دولت کی کنجی ان کے سامنے تھی، ان کے ہاتھوں میں تھی۔عبداللہ سلطان نے ڈبا اپنے بیگ میں ڈال دیا اور پھر بتیاں بجھا کے کمرے سے باہر آگئے۔

بیسمنٹ سے واپسی کا سفر آسان تھا۔انہوں نے اوپر آکے کیمریں دوبارہ سے کھولے۔سارے لاکرز بند کیے، چیزیں سمیٹی کمپیوٹر بند کیا، چابیاں جگہ پہ رکھیں۔ساتھ ہی وہ فوٹیج بھی مٹا دیں جن میں وہ دونوں کہیں ساتھ نظر آتے تھے۔سب کام بالکل صفائی سے کر کے عبداللہ سلطان وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ چاروں لاہور کے دورے سے واپس آئے تو ان پر ہیروں کی گمشدگی کی خبر کیسے عیاں ہوئی۔ ان سب کے اوپر جیسے پتھروں کی برسات ہو گئی۔ وہ تیس ملین ڈالرز کے نایاب ہیرے، جو ان کو بے شمار دولت سے نوازنے والے تھے، وہ کوئی ان کی غیر موجودگی میں چوری کر کے لے گیا تھا۔

لیڈی اقتدار نے پورے ہسپتال میں دھوم ہی مچا دی۔ ہر کسی سے تفتیش کی، ظلم کی انتہاء عبور کر لی لیکن ہیرے اسے نہیں ملے۔ چور جو بھی تھا، بہت صفائی سے کام کر کے گیا تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج بھی ساری مٹا چکا تھا۔

کچھ دن بعد، جب لیڈی اقتدار اپنے قصر کے لاؤنج میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی تب کسی کی کال آئے۔ اس کے چہرے پہ ناگوار سا تاثر تھا۔ موڈ پہلے سے ہی خراب تھا۔ فون پہ نظر ڈالی۔ عبداللہ کالنگ۔ لیڈی اقتدار نے کال اٹھا کے فون کان سے لگایا۔

"کیسی ہو لویزا؟" عبداللہ سلطان مزے لینے والے انداز میں بولے۔ لیڈی اقتدار کے چہرے پہ لکیروں میں اضافہ ہوا۔ اسے کچھ بری طرح سے کھٹکنے لگا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ بھی کچھ حد تک اندازہ لگا چکی تھی کہ ہیرے عبداللہ نے ہی چوری کیے تھے۔ بس اب تصدیق کرنا باقی تھی۔

"تمہارے ہیرے میں نے چرائے ہیں۔" لیڈی اقتدار کرسی پر سے اٹھی، نگاہیں طیش ہوئیں۔ اس کا ضبط ٹوٹنے لگا۔ اب وہ ہیرے کیسے لے؟ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ لیڈی اقتدار کی سانسیں بے ربط ہونے لگیں۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔

"تم جانتے ہو میں تمہارا حشر نشر بگاڑنے کی طاقت رکھتی ہوں عبداللہ۔" وہ ضبط کے کڑوے گھونٹ پیتے بولی۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ فون کے اس پار جاکے عبداللہ سلطان کو گردن سے دبوچ کے ان کے ٹکرے ٹکرے کردے۔

عبداللہ سلطان پہ لیڈی اقتدار کے الفاظ نے کوئی اثر نہ کیا۔وہ زور سے ہنسنے لگے۔لیڈی اقتدار مزید مضطرب ہوئی۔کچھ غلط تھا، عبداللہ اتنا پر اعتماد کیوں تھا؟ لیڈی اقتدار نے سوچا۔

"میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔میں تمہارے راز سے واقف ہوں لویزا۔تم لوگ اعضاء کا غیر قانونی کاروبار کرتے ہو ناں؟" لیڈی اقتدار کے سر پہ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔وہ ڈھیلی ہوکے کرسی پہ بیٹھی۔عبداللہ سلطان پوری تیاری کر چکے تھے۔

"فرض کرو اگر میں اس عوام میں یہ بات پھیلا دوں؟ مجھے کوئی ثبوت دینے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔مجھے صرف شک ان سب کے دلوں میں ڈالنا ہوگا۔پھر دیکھتے ہیں تم اس جذباتی عوام سے کیسے جان چھڑاؤ گی؟" عبداللہ سلطان معنی خیز انداز میں دھمکی دے رہے تھے۔لیڈی اقتدار کا حلق کڑوا ہوگیا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" لیڈی اقتدار غصے سے آنکھیں میچ کے بولی۔

"تم لوگ اب ہر ماہ مجھے رقم دیا کرو گے۔بینک کے تھرو نہیں، میں کسی کو شک میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ پورا پورا کیش دیا کرو گے تم لوگ۔ہر ماہ، منہ مانگی قیمت۔میں تمہارے اس راز کی حفاظت کروں گا۔ اور اگر مجھے شک ہوا کہ تم لوگ میرے قتل کے منصوبے بنانے لگے ہو تو مجھے تمہارے کاروبار کو تباہ

کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔" عبداللہ سلطان کے نزدیک ان کا پلان بے عیب تھا۔لیڈی اقتدار بھی اس وقت چکرانے لگی تھی۔عبداللہ کو مارنا ایک اچھا راستہ نہیں تھا۔وہ لوگ عبداللہ کے ذریعے ہی منی لانڈرنگ کرواتے تھے، اس صورت میں اگر عبداللہ چلا گیا تو اتنی ساری دولت کہاں جائے گی؟ لیڈی اقتدار بے بس ہونے لگی تھی۔عبداللہ بھی اس کے ہاتھوں کو جکڑنے میں کامیاب رہے تھے۔

"تمہیں، ہماری پارٹنرشپ کا خیال نہیں آیا عبداللہ؟" وہ غصے سے دھاڑی تھی۔ وہ اندر سے بے چین ہونے لگی تھی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ملین ڈالرز کے ہیرے کیسے بازیاب کرواتی۔۔

"پارٹنرشپ والی بکواس اپنے پاس رکھو لویزا۔اور ہاں ایک بات بتانا بھول گیا، تمہارے ہسپتال میں ایک نرس کام کرتی ہے روشنی، اس نے ہی مجھے ہسپتال کی بیسمنٹ تک پہنچایا۔خیر اس کا کام بھی تمام کر دینا لویزا۔" عبداللہ سلطان لاتعلق سے انداز میں بولے۔لیڈی اقتدار کو مزید تپ چڑھی۔

"تمہارا موازنہ تو میں کتے سے بھی نہیں کر سکتی عبداللہ۔" آواز میں بے پناہ نفرت اور کڑواہٹ لیے وہ بولی تھی۔

"کتے سے تمہارا موازنہ کتے کی شان میں تذلیل کے مترادف ہوگا، کم سے کم کتا وفادار تو ہوتا ہے، تم تو ایک گدھ سے بھی بدتر ہو، تم بے وفا ہو عبداللہ، دغا باز ہو۔" وہ اپنی کڑواہٹ کا پورے دل سے اظہار کر چکی تھی۔عبداللہ سلطان کا زوردار قہقہہ گونجا، انہیں اپنی شان میں کہے گئے الفاظ جیسے بالکل بھی برے نہ لگے۔

"میں صرف ایک شاطر بزنس مین ہوں لویزا۔ تمہیں مجھ سے سیکھنا چاہیے۔اب میں اس روشنی کو بتا چکا تھا کہ میں کیا کرتا ہوں، اب اس کو مارنے کا کام تم کر لو گی، میں اب سکون سے بے پناہ دولت کے مزے اڑاؤں گا۔" اور بس، عبداللہ سلطان نے کال کاٹ دی۔

لیڈی اقتدار غصے سے کپکپانے لگی، اس نے ہاتھ سے مکا بنایا اور ٹیبل پہ زور سے دے مارا۔

اور یہاں سے شروع ہوئی تھی، ان ظالم ہیروں کی داستان۔۔۔

ہیرے جو محض ایک پتھر ہی تھے۔۔۔

فرق یہ تھا کہ وہ چمکتے تھے۔۔۔اور ذرا خوبصورت تھے

ان کی یہی چمک تھی، جس نے انسانوں کی عقل کو مفلوج کر دیا تھا۔۔۔۔

انہیں اپنے اصل سے غافل کر دیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**ماضی کو پس پشت دھکیل کے حال میں قدم بڑھاتے ہیں۔۔۔**

وہ چاروں حسب معمول عافیت زندگی کی بیسمنٹ میں واقع اس ملاقاتی کمرے میں جمع تھے۔جب سے احمد کی واپسی ہوئی تھی تب سے یہ سلسلہ کچھ زیادہ چل رہا تھا۔

طاقت کھو جانے کا خطرہ، دولت کھو جانے کا اندیشہ تھا، احمد ان کے لیے تباہی کا دوسرا نام تھا۔وہ لوگ اس کی واپسی پہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

کرسیاں گول دائرے کی صورت لگائی گئی تھیں۔ شمس ان سب کو کچھ بتانے میں لگا ہوا تھا۔

"وہ ہیرے اس کے آفس کے لاکر میں نہیں تھے لیڈی۔" شمس نے بجھے ہوئے انداز میں بتایا۔لیڈی اقتدار نے سر اثبات میں ہلایا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ وہ ہیرے وہاں نہیں ہوں گے۔وہ موت سے پہلے ہمیں بھٹکانے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ نہیں۔خیر، ہم یہاں پہ ایک خاص مقصد کی وجہ سے جمع ہوئے ہیں۔سب سے پہلے مجھے تفصیل چاہیے، کیا اس ہفتے مہر نے کچھ غیر معمولی کیا؟" وہ رعبدار انداز میں بولی۔وہ بولتے بولتے سرسری سی نظر ہر فرد پہ ڈال دیا کرتی تھی۔

درانی نے حلق صاف کیا اور بولنا شروع کیا۔

"نہیں لیڈی، اس کی پل پل کی خبر رکھی ہے میں نے، اب تک کچھ بھی غیر معمولی نہیں کیا۔سرینا ہوٹل کے بعد وہ دونوں ملے نہیں، لیکن مہر نے اپنے فون پہ اس سے باتیں کی ہیں۔لیکن باتوں کی فطرت بھی بس عام سی ہے، یعنی حال احوال، کام کے متعلق۔اس دوران مہر عبداللہ کے دوستوں کے گھر بھی گئی ہے، یعنی وہ ہیروں کی کھوج میں لگی ہوئی ہے۔" درانی نے بات ختم کی۔لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا۔وہ مہر کے اتنے صاف ستھرے پیٹرن کے پیچھے ایک بہت بڑا خطرہ بھانپ چکی تھی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"اس سب نے میرا شک اور بھی بڑھا دیا ہے۔" سب ذرا چونکے، ان کو سمجھ نہیں آیا کہ اس سب نے شک کیسے بڑھا دیا؟

"تم سب غور کرو۔" وہ نظریں جھکائے دماغ پہ زور ڈالتے بولی۔"احمد سے ملاقات سے پہلے مہر کتنی غلطیاں کر رہی تھی۔وہ پینک کے عالم میں تھی، وہ ایک کے بعد ایک گڑبڑ کر رہی تھی۔اور اب، سب کچھ کتنا سیدھا ہوگیا۔" لیڈی اقتدار مسکرائی۔"احمد کے آنے کے بعد وہ اب ایک گڑبڑ بھی نہیں کر رہی ہے۔یقیناً یہ ہمت، یہ طاقت اسے احمد نے دی ہے۔جہاں تک فون پہ باتوں کا سوال ہے، پتا کرواؤ مہر کے پاس کون کون سے پارسلز آئیں ہیں، اور کہاں سے۔اگر احمد واقعی اس کے ساتھ کام کر رہا ہے تو وہ بخوبی واقف ہوگی کہ ہم اس کی کالز ٹیپ کر رہے ہیں۔وہ دونوں اگر واقعی ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں تو کسی دوسرے موبائل کے ذریعے اپنی باتیں کر رہے ہوں گے، اور یہ باتیں صرف ہمیں گمراہ کرنے کے لیے کی جارہی ہیں۔تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہوسکتا ہے، مگر یہ سب بہرحال صرف اندازے ہیں۔ابھی بھی ہم تصدیق نہیں کر سکتے۔مجھے بس ایک اور اشارہ چاہیے، ایک تگڑا اشارہ، احمد کی طرف سے، اس کے بعد ہم اپنی کاروائی شروع کرتے ہیں۔"

کمرے میں موجود ہر فرد لاجواب تھا۔ایسا نہیں تھا کہ وہ لوگ اپنی ملکہ کی ذہانت سے واقف نہ تھے، لیکن اتنی باریکی اور بھنائی سے ساری صورت حال کو پرکھنا ان سب کے لیے متاثر کن ضرور تھا۔

"اب آتے ہیں مدعے پہ۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ در آئی۔"مہر کی دکھتی رگ کیا ہے؟ ہم آخر اسے جرائم کی دنیا میں کیسے پھنسا سکتے ہیں؟" نظریں اٹھا کے وہ ہر فرد کے اوپر گاڑنے لگی۔

"اس کی بیٹی کو اغواء کر لیتے ہیں۔وہ وہی کرے گی جیسا ہم کہیں گے۔" شمس نے ایک تجویز پیش کی۔ نیلوفر سر ناں میں ہلانے لگی۔

"نہیں۔وہ پاگل ہو جائے گی۔وہ عنایا سے جدائی ہر گز برداشت نہیں کر سکے گی۔مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے اسے اغواء کیا تو وہ کسی کام کی نہیں رہے گی۔" نیلوفر کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور پھر اس کے دماغ میں کچھ سوجنے لگا۔وہ بے اختیار مسکرائی۔ایک بے عیب سا پلان اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔

"کیا ہے کہ۔۔۔" نیلوفر نے مسکراتے ہوئے نچلا ہونٹ دبایا۔"مہر کے ساتھ میں نے کوئی آٹھ ماہ گزارے ہیں۔میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔اور اس کی دکھتی رگ سے بھی۔" نیلوفر زیر لب ہنس دی۔

"کس چیز کی بات کر رہی ہو نیلوفر؟" لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں چمک در آئی۔وہ پہلے سے ہی جانتی تھی کہ نیلوفر ہی اس صورت میں ان سب کی مدد کر سکتی تھی۔

"یہ نہ پوچھیں کہ کیا چیز ہے۔بلکہ یہ پوچھیں کہ مہر کی دکھتی رگ کون ہے۔"

اگلے لمحے وہ سب کو اپنا شیطانی منصوبہ بتانے لگی۔۔۔سب سنتے گئے۔۔۔سب کے چہرے پہ خوشی پھیلنے لگی۔۔۔منصوبہ بے عیب تھا۔۔۔مکمل تھا۔۔۔

اوہ مہر۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مناج کی گاڑی اسلام آباد کی کشادہ، مدھم دھوپ کی کرنوں میں نہاتی سڑکوں پہ رواں تھی۔پچھلی سیٹ پہ اس کے خالہ اور خالو تھے جو کہ بے حد خوش نظر آرہے تھے۔مناج کے چہرے پر بھی مختصر

مسکراہٹ تھی۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ گاڑی میں خاموشی تھی، اور فتح کی آمد کی خبر بھی۔ مناج آج نئی پرواز کرنے والی تھی، ایک نئے سفر کا آغاز کرنے والے تھی۔

**"(میرا نام مناج ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی کے ستائیس سال اپنے مقصد سے محروم رہ کے گزارے ہیں۔**

**میرے بابا نے مجھے کہا تھا کہ میں ایک باوقار ملکہ ہوں، میری امی نے مجھے یاد دلایا کہ میں ایک باوقار ماہرانی ہوں، اور پھر درے نے بھی میری یاددہانی کروائی کہ میں ایک ملکہ ہوں۔ ایک قیمتی ملکہ۔ ہم سب ہی قیمتی ہیں، اور اپنی زندگیوں کی ماہرانی بھی، بس ہمیں اس چیز کا احساس نہیں۔ اپنے آپ کو اپنی نظروں میں معتبر بنائیں تو آپ کو پہچان ہوگی کہ آپ کتنی خاص ہیں۔ آپ اس رب کی مخلوق ہیں، خاص کیسے نہ ہوں گی؟)"**

گاڑی اس کمرشل مکان کے سامنے رکی، وہی مکان جس میں مناج نے حسام سے کام کروایا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ بالآخر وہ اپنی منزل پہ پہنچ گئی تھی۔۔۔ بلکہ یہ منزل کہاں؟ یہ تو بس ایک اسٹاپ تھا، سفر تو ابھی شروع ہونا تھا۔ مناج کی بے جان آنکھیں آج جیت کا جشن منا رہی تھیں۔ وہ فخریہ تاثر لیے گاڑی سے اتر کے عمارت کو اوپر سے نیچے دیکھنے لگی۔

**"(غفلت میں، میں اس قدر ڈوب گئی تھی کہ میں اپنے آپ کو تکلیف دینے لگی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میرا جسم اللہ کی امانت ہے، مجھے اس کا خیال رکھنا تھا۔ مجھے اپنا خیال رکھنا تھا، مجھے اپنے لیے جینا تھا۔ میں سب بھولنے لگی تھی۔ اتنے سالوں کی غفلت سے میں جاگ گئی ہوں۔ اور اب اپنے مقصد**

**سے آشنا ہو کے میں پیچھے نہیں رہ سکتی۔میں اپنی زندگی کے ان تاریک وقتوں میں واپس قطعاً نہیں جانا چاہتی۔)"**

"تحریک حرر فاؤنڈیشن:اکیسوی صدی کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے شروع کی جانے والی شاندار مہم"!

عمارت کے اوپر بینر پہ یہ بڑے بڑے ہندسوں میں لکھا گیا تھا۔مناج نے ایک تازہ ہوا کا جھونکا اپنے اندر اتارا۔تحریک حرر کے آفس کے باہر درے اور حسام کھڑے، گرم جوش مسکراہٹ لیے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ساتھ ہی میں گنتی کے چند لوگ بھی تھے جو کہ اس کے نئے نویلے ایمپلائیز تھے۔اپنے خالہ خالو کے ساتھ وہ اسٹیپس چڑھ کے درے اور حسام کی طرف لپکی۔

"بہت بہت مبارک ہو مناج۔" درفشاں نے پھولوں کا گلدستہ مناج کے حوالے کیا اور اسے گلے لگایا۔ وہ اپنی دوست کی کامیابی سے بہت خوش نظر آتی تھی۔مناج کے خالو کے چہرے پہ فخریہ مسکان بکھرنے لگی۔انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اسے دعائیں دی۔

وہ ایک دفعہ پھر سے عمارت پہ لگے اس بورڈ کو دیکھنے لگی تھی۔اب وہ سب دروازے کی طرف بڑھے۔شیشے کے دروازے کے باہر ایک لال ربن لگا ہوا تھا۔

**(اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں، تو اس کا جواب آسان ہے۔میں بس اپنے رب کو راضی کرنا چاہتی ہوں۔اس نے مجھے اس قدر تاریک زندگی سے نکالا ہے، مجھے جینے کی امید دلائی ہے، میں بس اس رب کو راضی کرنا چاہتی ہوں۔**

میں چاہتی ہوں کہ جب میں مروں اور جب حساب کتاب کے لیے اٹھائی جاؤں تو میرا رب مجھ سے بولے۔۔۔

'وہ مجھے بولے کہ:

"اے نفس مطمئن!

چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے

شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں

اور داخل ہو جا میری جنت میں (سورہ فجر))"

مناج ہاتھ میں قینچی تھامے اس لال ربن کو کاٹنے لگی۔اس کے برابر میں اس کی خالہ اور خالو تھے۔اس کے پیچھے حسام اور درے اور ان کے پیچھے حرر کے باقی ایمپلائیز تھے۔مناج کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔وہ جانتی تھی اس قدم کے بعد زندگی پہلے جیسی نہیں رہنے والی تھی۔سب کچھ بدل جانا تھا۔سب کچھ بہت مختلف ہوجانا تھا۔کیا وہ واقعی اس کے لیے تیار تھی؟ مناج نے لرزتے دل کے ساتھ ربن کاٹ دی۔

"(ہاں میں یہ سب اپنے لیے ہی کر رہی ہوں۔ہم ہر اچھا کام اپنے لیے ہی کرتے ہیں۔ہر نیکی بس ہمیں ہی فائدہ دیتی ہے۔یہی تو معتبر بننے کی مشق سے میں نے سیکھا، کام بھلے سے مشکل ہو لیکن

**ہمیں کرنا چاہئے اگر وہ ہمیں فائدہ پہنچائے۔میں بھی اس معاشرے سے برائی کو ختم کرنے کی جد و جہد کر کے بس اپنی آخرت سوارنا چاہتی ہوں۔آخر میں ہم سب کا ٹھکانا تو وہی ہے ناں۔بس اس لیے۔**

**میرے لیے یہ اہم نہیں کہ میں اس عدم میں کامیاب ہوں گی کہ نہیں، لیکن میرے لیے یہ اہم ضرور ہے کہ میں اس عدم کے لیے جان لگا دوں۔میں بس جب اٹھائی جاؤں تو کم سے کم اپنے رب کو یہ بتا سکوں کہ میں غیرت مند تھی، تیرے بندوں کو تڑپتا دیکھ کے میں نے آنکھیں بند نہ کیں۔میں نے کم سے کم کوشش کی، اور فتح دینے والا تو بے شک تو ہی ہے میرے رب۔)"**

"میں مناج۔آپ سب کی باس۔میں تحریک حرر کی اس نئی شروعات میں آپ سب کا استقبال کرتی ہوں۔" حرر کے اندر مناج پشت پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔اس کے سامنے کچھ فاصلے پہ حرر کے تمام ایمپلائیز ہجوم کی صورت میں کھڑے تھے۔اس کے دائیں طرف حسام تھا اور بائیں طرف در فشاں۔ حسام کے برابر میں مناج کے خالو اور در فشاں کے برابر میں خالہ۔

وہ اپنے ازلی مشینی انداز میں ہی بات کرتی تھی۔اب کی بار آواز میں گرج نمایاں تھی جس کی وجہ سے آواز میں رعب جھلکتا تھا۔

"حرر کا مطلب ہوتا ہے آزادی۔آزاد ہونے کا حق ان کو دینا جو اس حق سے محروم ہیں، یہی ہماری اولین ترجیح ہے، اور یہی ہمارا مقصد ہے۔اگر آپ میں سے کسی ایک کو بھی اس مقصد سے گہرا لگاؤ نہیں، اس مقصد کے اوپر اپنی جانیں عزیز ہیں، اس مقصد کو حاصل کرنی کی وہ جستت نہیں ہے، تو آپ اسی وقت استعفاء دے کر جا سکتے ہیں۔ہم یہاں لوگوں کی خدمت کرنے آئیں ہیں، اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر۔اگر آپ لوگوں میں اس تحریک کو لے کر خلوص نہیں تو حرر کے یہ دروازے آپ

کے لیے بند ہیں۔" مناج نے تقریر مکمل کر کے ایک سرد نگاہ سارے ایمپلائیز پہ ڈالی۔ کوئی ایمپلائی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مناج یہ دیکھ کے دل سے خوش ہوئی۔ بالآخر، حرر کی اس شاندار تحریک کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔

**(میں جانتی ہوں کہ آزادی سے محروم ہونا کیسا گزرتا ہے۔ میں بھی قید میں تھی۔ میری بھی اس قید کا فائدہ اٹھاتے مجھے میری کڈنی سے محروم کیا گیا تھا۔ میں اس تکلیف اور درد کو سمجھتی ہوں۔ لیکن اب مجھے کسی چیز کی شکایت نہیں ہے۔ میرے ساتھ وہ سب اس لیے ہوا تھا تاکہ میں اس سب سے سیکھ سکوں۔ مجھے میرے اللہ کی ہر مصلحت سمجھ میں آنے لگی ہے۔**

**بس اب میرا یہی عزم ہے: کہ جو میرے ساتھ ہوا وہ کسی اور کے ساتھ نہ ہونے دوں۔**

**اور عزم کی تکمیل کی لیے میں ہر حد عبور کرنے کے لیے تیار ہوں۔)"**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تین دن گزر گئے تھے۔ صبح ہی احمد نے مہر کو میسج کر دیا تھا کہ دوپہر کے اوقات میں وہ فارم ہاؤس پہنچ جائے۔ وہ خود ایک کرائے کی گاڑی میں سفر کرتے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ اس نے فارم ہاؤس سے کافی دور گاڑی کھڑی کی اور پھر پیدل فارم ہاؤس پہنچا۔ مہر وہاں نہیں پہنچی تھی، اور یہی وہ چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا مہر کے پیچھے تعاقب کار تعین کیے ہوئے تھے، اور فی الحال وہ نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

وہ فارم ہاؤس کے سبزہ زار میں مہر کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے آدھی آستین کی سفید شرٹ اور بلو پجامہ پہنا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کالا چشمہ بھی لگایا ہوا تھا اور ہاتھ میں مہنگی اسمارٹ واچ تھی۔

کچھ دیر بعد مہر نے اپنی مرسڈیز فارم ہاؤس کے باہر روکی۔اسے کافی دیر ہو گئی تھی کیونکہ آج کل وہ اپنے دشمنوں کے ڈر سے عنایا کو خود ہی اسکول سے لیتی تھی۔وہ اپنی گاڑی سے اتری۔موبائل نکالا تو اس میں احمد کا میسج بھی تھا کہ وہ کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔مہر نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

وہ آج بلا شبہ حسین لگ رہی تھی۔سر پہ فلورل پیٹرن والا بندانہ باندھا ہوا تھا۔کہنیوں تک آتی آستینوں والی فلورل پیٹرن والی فراک جو ٹخنوں تک آتی تھی۔چہرے پہ ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔

وہ فارم ہاؤس کا بڑا دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوئی، اس سے پشت کیے احمد کھڑا موبائل میں مگن تھا۔وہ احمد کی طرف بڑھی۔احمد نے ایک نظر پہلے اس پہ ڈالی۔رسمی علیک سلیک کے بعد دونوں نے بات شروع کی۔

"میں نے آج آنکھیں کھول کے گاڑی چلائی تھی۔مجھے یقین ہے ایک نیلی گاڑی میرا تعاقب کرتے گئی ہے۔" وہ فخریہ سا ہو کے احمد کو بتا رہی تھی۔احمد اس کے انداز پہ مسکرایا۔اسے بھی سن کے اچھا لگا تھا۔

"بڑا ہی تیر مار لیا آپ نے۔" مصنوعی لاتعلق انداز میں اس نے تبصرہ کیا۔مہر کے چہرے پہ ہنوز مسکراہٹ برقرار رہی۔

وہ دونوں پتھروں کے بنے ایک راستہ پہ چل رہے تھے۔دائیں اور بائیں طرف گھنے درخت تھے۔ پرندوں کے چہچہانے کی آواز مسلسل ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔موسم بھی کافی خوش گوار تھا۔ہواؤں کا گزر بسر بھی ہوتا جا رہا تھا۔اس ٹھنڈی اور پرسکون فضامیں وہ دونوں یوں ہی چلتے گئے۔

"آپ کا تعاقب نہیں کیا جارہا؟" مہر نے اچنبھے سے پوچھا۔

"نہیں، فی الحال تو نہیں۔اور اچھا ہی ہے۔میں اپنی واپسی کی خبر فی الحال ان پہ نہیں کھولنا چاہتا، جب تک اس فارم ہاؤس کی چھان بین نہ کر لوں تب تک تو بالکل نہیں۔" وہ سادگی سے گردن جھکائے مہر کو بتاتے گیا۔مہر نے سرعت سے اثبات میں سر ہلایا۔

پتھریلا راستہ اپنے اختتام پہ پہنچ گیا۔اب وہ لوگ ہموار سے سبزہ زار میں تھے۔سبزہ زار کے بیچ و بیچ ایک اسٹرکچر کھڑا کیا ہوا تھا جو کہ دکھنے میں کافی ماڈرن اور ہشاش بشاش تھا۔اسٹرکچر کے عقب میں ہی نیلے پانی سے افروز سیومنگ پول بھی تھا۔مہر اور احمد دونوں ہی سیومنگ پول کی طرف بڑھنے لگے۔

"کیا ہیرے ادھر مل جائیں گے؟" مہر نے ساتھ چلتے ہوئے احمد سے پوچھا۔احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں، مجھے یقین ہے یہاں ہیرے موجود نہیں ہیں۔اب آپ شروع ہو جائیں،مایوس ہونا۔میں جانتا ہوں میری آفس میں کہی بات کا تو آپ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہو گا۔" وہ مصنوعی خفا سے انداز میں کہنے لگا۔مہر زیرلب ہنس دی۔

"نہیں پروگرامر صاحب، میں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔" وہ چہرے پہ خشمگین مسکراہٹ سجائے بولی تھی، اپنی ماں کا جملہ دہرایا تو دل میں ایک الگ سی تکلیف ہوئی تھی۔ احمد نے بھنویں اٹھا کے

نگاہوں میں عجب لیے اسے دیکھا۔مہر اس کے کالے چشمے کے پیچھے اس کی نگاہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"پروگرامر صاحب؟" وہ زیر لب بڑبڑایا، مہر نے نہ سنا۔خیر، اسے برا بھی نہیں لگا، نہ جانے کیوں۔

اب دونوں سیومنگ پول کے کنارے پہ کھڑے تھے۔

"ویسے آپ کو کیوں لگتا ہے کہ یہاں ہیرے نہیں ملیں گے؟" مہر نے اب کی بار پوچھا۔احمد نے اب اپنا چشمہ اتار کے جیب میں رکھ دیا۔اس کی کالی ذہین آنکھیں وہ اب دیکھ سکتی تھی۔

اس نے گردن موڑی اور انگلی سے اسٹرکچر کے سامنے ایک چیز کے اوپر اشارہ کیا۔۔۔یہ بوتلیں لگتی تھیں۔۔۔کسی مشروب کی۔

"کیونکہ میں نے وہ بوتلیں دور سے ہی دیکھ لی تھیں۔یہ جگہ میرے مطابق ایک پارٹی پلیس ہے۔پارٹی پلیس میں عبداللہ صاحب جیسا شاطر بزنس مین کبھی بھی ہیرے نہیں چھپائے گا۔" مہر سمجھ گئی تھی۔ اس نے سر اوپر نیچے ہلایا۔اب دونوں اسٹرکچر کی طرف چلنا شروع ہوئے۔

اسٹرکچر میں داخل ہوئے تو ایک بہت ہی دلچسپ منظر ان کی آنکھوں کی زینت بنا۔دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اندر کا حال بے حد خراب تھا۔ہر طرف شراب کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ٹیبل پہ تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔زمین پہ جگہ جگہ پلاسٹک کے ساشے رکھے تھے جن میں سفید سا پاؤڈر تھا۔

"استغفر اللہ۔" احمد اچنبھے سے بولا۔مہر کو اس ماحول میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔

"مجھے تو شک ہونے لگا ہے کہ آپ عبداللہ صاحب کی بیٹی نہیں ہیں۔" وہ آنکھوں میں شرارت لیے گویا ہوا۔

"میں سمجھی نہیں۔" مہر نا سمجھی سے بولی تو احمد بس اپنے آپ میں ہی مسکرا دیا۔اپنی مسکراہٹ دباتے، آنکھوں میں شرارتی تاثر لیے وہ ایک دفعہ پھر سے بولا۔

"سچ سچ بتائیں، آپ تو ایسی نہیں ہیں ناں؟" مہر کو جیسے کرنٹ لگا۔اسے احمد کا یہ کہنا بہت برا لگا تھا۔

"احمد!" وہ آنکھیں پھاڑ کے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔احمد زیر لب ہنس دیا۔مہر منہ موڑ کے خفگی سے ناک سکوڑنے لگی۔

"اچھا اچھا۔مذاق کر رہا تھا۔" احمد ہنسی کو قابو کرتے ہوئے بولا۔مہر اب بھی کچھ غیر آرام دہ سی تھی۔ پھر دونوں کی نظر اس حال کی دیوار پہ لگی ایک بڑی سی تصویر پہ پڑی۔تصویر میں کوٹ پہنے عبداللہ سلطان تھے اور ان کے برابر میں، کالی ساڑھی پہنے ہوئے نیلوفر کھڑی تھی۔دونوں بھرپور مسکرا رہے تھے۔مہر کا سر شرمندگی کے مارے جھکتا چلا گیا۔نیلوفر کا بھی اس ہولناک جگہ سے کوئی تعلق تھا؟ وہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔دوسری طرف احمد فاتحہ سا مسکرا رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" احمد نے مہر کی طرف نظریں گاڑیں۔مہر نظریں چرانے لگی۔

"نی۔۔نیلوفر۔" اور بس۔احمد زور سے ہنسنا شروع ہو گیا۔مہر کا شرمندگی کے مارے سر جھکتا چلا گیا۔

"کیا ہوا آپ کی اچھی لڑکی کو؟ اس کے دفاع میں کچھ بولنا چاہیں گی؟" وہ بولا۔مہر نے اب اپنے تاثرات نارمل کیے۔

”بس اب چھوڑیں۔ ہم چھان بین شروع کرتے ہیں۔“ وہ دانستہ طور پہ بات کا رخ بدل گئی تھی۔ احمد نے بھی چہرے کے تاثرات نارمل کر لیے۔

احمد اور مہر نے فارم ہاؤس کی تلاشی لی۔ مین حال میں تو انہیں کچھ نہ ملا۔ اندر ایک کمرہ بنا تھا جس میں وہ لوگ گئے۔ ان دونوں نے اس کی بھی چھان بین شروع کی۔ کمرے میں خاص کچھ نہ تھا۔ انہوں نے الماری کھولی تو اندر سے کپڑوں کا پہاڑ باہر نکلا۔

”یہ کپڑے۔ مردوں والے تو عبداللہ سلطان کے لگتے ہیں۔ یہ لیڈیز کپڑے، کیا ایسے کپڑے نیلوفر پہنتی ہے؟“ احمد نے کپڑوں کو دیکھتے کہا۔ مہر جھک کر کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ یہ نیلوفر کا اسٹائل ہے۔ وہ ایسے ہی کپڑے پہنا کرتی تھیں۔“ مہر ہر کپڑے کو دیکھتے کہہ رہی تھی۔

”یعنی نیلوفر کا کردار بہت مشکوک ہے۔ آپ کے مطابق وہ اچھی لڑکی تھی مگر یہاں کچھ اور کہانی لگ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے نیلوفر دوہری شخصیت کی حامل لڑکی ہے۔“ احمد چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائے بولا۔ مہر کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ نیلوفر کو برا تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ یہ حقیقت اس کے اوپر گراں گزر رہی تھی۔

”دوہری شخصیت؟ یہ کچھ زیادہ نہیں؟“ مہر نیلوفر کے دفاع میں بولی۔

”میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ میری دوست کہتی تھی کہ تفتیش کے دوران اندازے لگائے جاتے ہیں۔ اور پھر ان اندازوں کے ذریعے اپنی آگے کی تفتیش کا سانچا کھینچا جاتا ہے۔ میں بھی بس یہی کر رہا

ہوں۔اور پھر اس سب نے نیلوفر کے کردار کو بہت مشکوک کر دیا ہے۔یعنی آپ کے سامنے وہ اتنا اچھا بنتی تھی کہ آپ اس کی برائی آنکھوں سے دیکھ کر بھی جھٹلانے کے لیے تیار ہیں۔" مہر کا چہرہ بالکل بجھ گیا تھا۔آنکھوں میں سے چمک اتر گئی تھی۔دل کے ایک خانے میں تکلیف بھی ہوئی تھی، کہ آخر وہ لڑکی جسے وہ اتنے ماہ اپنا بہترین دوست سمجھتی تھی وہ اس طرح کی نکل رہی تھی۔

"اب آپ مجھے نیلوفر کے بارے میں بتائیں۔وہ کیا کرتی ہے؟ کہاں جاب کرتی ہے؟ اس کی کیا ایکٹیوٹیز ہیں؟ جو بھی آپ جانتی ہیں، مجھے سب بتائیں۔" احمد بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔مہر کا دل بھاری ہونے لگا۔دل کا ایک کونا تھا جو نیلوفر کو یوں مجرم قرار دینے سے کترا رہا تھا۔مگر پھر بھی اس نے سب کچھ بتانا شروع کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر اپنے آفس میں سربراہی کرسی پہ شان سے بیٹھی تھی۔اس کے چہرے پہ برہمی تھی۔اس نے پنک سلیولیس کرتی پہ آرگینزا کا گاؤن پہنا ہوا تھا۔گاؤن پہ پنک پھول بنے ہوئے تھے۔بالوں کو اس نے بے ترتیب سے جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔وہ آنکھوں میں سرد سا تاثر لیے اس نرس کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"اور آج کیوں دیر سے آئی ہو؟" نیلوفر کی آنکھیں اندر تک اس نرس کو ملامت کرنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"میری طبیعت آج بھی کچھ خراب سی تھی۔" نرس نے گردن جھکا کے نادم سے انداز میں جواب دیا۔

اس نے اپنے قدم اس سفید چمکتے دمکتے فرش میں اتارے۔اپنی ہیلز پہ تحکم سے چلتے ہوئے وہ سہمی ہوئی نرس کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ہاتھ باندھے وہ اس نرس کو سرد گھوری سے نواز رہی تھی۔

"تم عافیت زندگی میں کام کرنا ڈیزرو نہیں کرتی۔"آواز میں واضح برہمی تھی۔ انداز کرخت تھا۔

"یو۔۔آر۔۔۔فائیرڈ"!

"میم ایسا نہ کریں۔میری طبیعت واقعی خراب تھی۔۔" نرس نے التجاء والے انداز میں کہا۔

"مجھے اس سب سے کوئی غرض نہیں۔تم جا سکتی ہو۔" نیلوفر کا انداز بے نیاز تھا۔وہ اب واپس اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔نرس بجھے ہوئی چال چل کے واپس چلے گئی۔وہ جانتی تھی کہ نیلوفر کے سامنے کچھ بھی کہنا بے فیض تھا۔

**"(نیلوفر لیڈی اقتدار کے ہسپتال عافیت زندگی کی سینئر مینجر ہیں۔وہ لیڈی اقتدار کے دونوں ہسپتالوں کی نگرانی کرتی ہیں۔میں نے سنا ہے وہ کام کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔وہ لا پرواہی برداشت نہیں کرتیں۔ان کے نزدیک سب کچھ بالکل اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے۔نیلوفر کی اس اصول پرستی کی وجہ سے ہی لیڈی اقتدار کے ہسپتالوں نے آسمانوں کی بلندیوں کو عبور کیا ہے۔)"**

نیلوفر اپنی ہیلز پہ ہی تحکمانہ چال چلتی اس گالف کلب میں داخل ہوئی۔اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔وہ ایک عورت کی طرف بڑھی جو کہ عمر میں اس سے تھوڑی ہی بڑی تھی۔

"کیسی ہو شہلا!" ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ گرم جوش انداز میں بولی۔دونوں نے گلے سے لگ کے، نازک سے انداز میں گال سے گال ملائے۔

”اف میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی نیلوفر۔اتنی دیر کیوں ہو گئی۔“ شہلا کے انداز میں مصنوعی سی خفگی تھی۔

”اف شہلا۔تم تو جانتی ہو یہ ہسپتال میں ڈاکٹرز اور نرسز کتنے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔بس ان کے ساتھ ہی مصروف تھی۔“ نیلوفر کے انداز میں نروٹھاپن گھلا ہوا تھا۔”گیم شروع کریں؟“

**"(لیکن نیلوفر بہت زیادہ ورکا ہولک نہیں ہیں۔وہ دیگر سرگرمیوں میں اور سپورٹس میں بھی انوالوڈ رہتی ہیں۔وہ گالف کھیلتی ہیں۔چیس کھیلتی ہیں۔بیڈمنٹن کھیلتی ہیں۔وہ ایک بہترین کھلاڑی ہیں۔“**

**”کیوں؟آپ نے انہیں کھیلتے دیکھا ہے؟“ احمد نے پوچھا۔**

**”ہاں بہت مرتبہ۔میں ہمیشہ ان سے ہار جاتی ہوں۔“ مہر نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔**

**”اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک بہترین کھلاڑی ہیں۔اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ ایک بدترین کھلاڑی ہوئیں۔“ مہر کے چہرے کے تاثرات تن سے گئے۔)**

گالف کا گیم ختم کر کے وہ شہلا کے ساتھ شاپنگ مال میں آگئی تھی۔

”میں نے سنا ہے دا ملانو کے نئے بیگز لانچ ہوئے ہیں۔تمہارے ہاتھ وہ لگے؟“ شہلا نے پوچھا۔وہ دونوں بیگز کے اسٹور میں موجود تھیں۔

”کیسے نہیں لگے؟ مہنگے بیگز تو میرا جنون ہیں شہلا۔جس دن وہ لانچ ہوئے تھے میں نے اسی دن منگوا لیے۔“نیلوفر نے فخریہ انداز میں بتایا اور شانے اچکا دیے۔

”لکی یو!“ شہلا کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔

(نیلوفر فیشن انتھوزیئسٹ (enthusiast) ہیں۔انہیں نئے نئے بیگز خریدنا بہت پسند ہے، اور وہ جمع بھی کرتی ہیں۔وہ نئے نئے کپڑے، مہنگی ہیلز خرید کے جمع کرتی ہیں۔ انہیں فیشن سے عشق ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد مہر کی بات کو غور سے سن رہا تھا۔اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔کچھ تھا جو اسے ٹھٹک رہا تھا، کچھ تھا جو اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہا تھا۔وہ بس دل ہی دل میں جانتا تھا کہ نیلوفر ان کے لیے اہم تھی۔

"یہ نیلوفر تو مجھے بورنگ سی لگی۔سیلف آبسیسڈ نارسسٹ ٹائپ سی۔" احمد دماغ میں ہر ایک نقطے کو جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے اب یقین آنے لگا ہے کہ نیلوفر دوہری شخصیت کی حامل ہے، وہ دو زندگیاں جی رہی ہے۔آپ مجھے ایک بات بتائیں کہ کیا نیلوفر ہمیشہ سے ہی دولت مند تھی؟" احمد نے پوچھا۔

"مجھے اس بارے میں سچ میں علم نہیں ہے احمد۔" مہر کچھ الجھ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔میں نیلوفر کو ٹریس کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔مجھے آپ بتائیں کہ اس نے کس یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے؟" احمد نے اپنا موبائل نکالا۔موبائل پہ وہ کسی کو میسج لکھنے لگا تھا۔

"راولپنڈی میڈکل کالج۔" احمد نے میسج ٹائپ کر کے موبائل جیب میں ڈالا۔"آپ کیا کرنے والے ہیں؟" مہر کو تجسس ہوا۔

”کل تک مجھے علم ہو جائے گا کہ نیلوفر کی دولت اچانک آئی ہے یا وہ پہلے سے ہی دولتمند تھی۔مجھے نیلوفر اس تفتیش میں بہت اہم لگ رہی ہے۔میں آپ کو زیادہ نہیں بتا سکتا لیکن میرا نیلوفر سے سامنا ہو چکا ہے، وہ والی نیلوفر اور یہ والی، دو الگ الگ انسان ہوں جیسے۔مجھے ایسا لگتا ہے،وہ سب کو جو دکھانے کی کوشش کرتی ہے وہ در حقیقت ویسی نہیں ہے۔“مہر کو بات ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہی تھی۔معاملہ وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا ہی جارہا تھا۔وہ کافی کنفیوژ ہو گئی تھی۔

اسی وقت مہر کے دماغ میں کچھ کلک کیا۔وہ فوراً سے احمد کی طرف مخاطب ہوئی۔

”نہیں نہیں، نیلوفر کا اس کیس میں تعلق نہیں ہو سکتا ہے۔“ احمد نے مشکوک ہو کے آنکھیں چھوٹی کیں۔”جو قرضہ مجھے دیا ہے،وہ کسی اور ہسپتال کی طرف سے ہے، سنابل۔یعنی نیلوفر کا اس معاملے میں ہاتھ نہیں ہو سکتا ہے، نہ ہی اس کے ہسپتال کا ہاتھ۔“ مہر کے دل کو قرار آنے لگا۔

”ٹھیک ہے، ہم سنابل کو بھی دیکھ لیں گے، آپ قرضے کے ڈاکومنٹس لے کر آجایئے گا۔" مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اور کل ہم دوسرے فارم ہاؤس جائیں گے۔“ احمد کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔”اور وہ بھی ساتھ۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ اب وقت آگیا ہے کہ میں ان سب کو بتا دوں کہ میں واپس آگیا ہوں۔“ احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی، آنکھوں میں تپش در آئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر کے اس فارم ہاؤس میں پہنچنے کی خبر ان سب تک پہنچ گئی تھی۔وہ سب شاق کے عالم میں تھے۔ ملاقاتی کمرے کی سفید بتیاں روشن تھیں۔

”وہ پارٹی پلیس کیسے پہنچ گئی؟ وہ بھی اکیلے؟“ نیلوفر چونک گئی تھی۔

”شاید ہیروں کو تلاش کرتے کرتے وہ پہنچ گئی ہو۔“ شمس نے اپنی رائے پیش کی۔نیلوفر سر نفی میں ہلانے لگی۔دماغ میں سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔

”نہیں، عبداللہ نے اس سے سب کچھ چھپایا تھا۔“ نیلوفر کو اب یقین آنے لگا تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔لیڈی اقتدار بے تاثر چہرہ لیے سب کچھ سن رہی تھی۔ماتھے پہ لکیریں نمایاں تھیں۔

”شاید اب قدم بڑھانے کا وقت آ پہنچا ہے۔مہر کو جرائم کی دنیا کا فرد بنانا ہی ہو گا۔نیلوفر تم اپنے پلان پہ کام شروع کرو، ہم یہ کام اب جلد ہی کر لیں گے، مجھے اب یقین آچکا ہے کہ مہر احمد کے ساتھ مل کے کام کر رہی ہے۔“ لیڈی اقتدار سفاک سے لہجے میں بولی۔

کمرے میں بیٹھے ہر فرد کا دل حلق میں آگیا۔۔۔ایک انسان، جو معصوم ہوا کرتا تھا، وہ جلد ہی اس دنیا کا حصہ بننے والا تھا۔اس دنیا کی کالک میں کالا ہوجانے والا تھا۔۔۔

سب یہی سوچ رہے تھے، سب کو اپنی داستان یاد تھیں، کہ کس طرح مجبوریاں انہیں اس دنیا میں لے کر آئیں، دولت اور طاقت سے محبت ان کی کمزوری بنی اور وہ اس دنیا میں کھینچے چلے گئے۔۔۔سب کو اپنی اپنی داستان بخوبی یاد تھی!

"اب تیاری کر لو۔" لیڈی اقتدار کی بھاری گرج دار آواز گونجی۔اور وہ کھڑی ہو گئی۔"میں اب دیر نہیں کروں گی" حکم جاری کر کے وہ کمرے سے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جیسا کے پلان کیا گیا تھا، مہر اور احمد اگلے دن فارم ہاؤس کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

مہر گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی جب کہ احمد قرضے کے وہ پیپرز بغور دیکھ رہا تھا جو سنابل کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔وہ آنکھوں میں مشکوک سا تاثر لیے ان ڈاکس کو دیکھے جارہا تھا۔پھر اس نے ان ڈاکومنٹس کی تصویریں لی اور اپنے جرمنی والے دوست علی کو وہ تصویریں بھیج دیں۔اس نے علی کو کال ملائی، اسے کچھ وقت پرانی کال بھی یاد تھی جو اس نے علی کو کی تھی، اور جب اس نے مدد مانگی تو علی نے انکار کر دیا، اسے سب یاد تھا۔کچھ دیر میں علی نے کال اٹھا لی۔

"علی میں نے تمہیں کچھ ڈاکومنٹس بھیجے ہیں۔یہ ایک ہسپتال کے ڈاکومنٹس ہیں جو کہ ایک آدمی کے نام ہے جو بظاہر جرمنی میں رہتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ جرمنی میں نہیں رہتا۔اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ہسپتال اس بندے کا بھی نہیں ہے۔میرے اندازوں کی تصدیق کرو اور پھر اپڈیٹ دو۔" احمد نے نہ کوئی سلام دعا کی، نہ ہی حال احوال دریافت کیا، بس حکم جاری کرنے لگا۔صاف ظاہر تھا کہ وہ اب بھی اس سے خفا تھا۔

"ناراض ہو؟" فون کے اس پار سے علی کی آواز گونجی۔

"بس کام کردو، تمہارا احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔" خفگی سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔

مہر نے ایک مشکوک نگاہ احمد پہ ڈالی۔اب احمد نے موبائل پرے رکھا۔

"مزے کی بات۔نیلوفر کے بارے میں بھی چھان بین کروا لی ہے۔" احمد مہر کی طرف مڑے بغیر بولا۔

مہر حیران ہوئی۔

"آپ کے ہر جگہ اتنے لنکس کیسے نکل جاتے ہیں؟" مہر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔احمد مدھم سا مسکرایا۔

"کیونکہ میں لنکس بنانے میں ایفرٹ ڈالتا ہوں۔میں لوگوں کی مدد کرتا ہو اس کے عوض وہ میری مدد کرتے ہیں۔اس دنیا میں احسان کی بھی تجارت ہوتی ہے مہر۔" احمد پرسکون ہو کے مہر کو بتانے لگا۔مہر نے مختصر سی گردن ہلائی۔

"خیر۔نیلوفر یونیورسٹی میں پڑھنے تک کرائے کے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔اس کی ماں نہیں تھی۔جابز کر کے، ڈراموں میں کام کر کے وہ اپنے خرچ پورے کرتی تھی۔میرٹ میں اس کا ایڈمیشن ہوا۔اور پھر اس کی ڈگری مکمل ہوئی۔اور اچانک سے وہ بے حد امیر ہو گئی تھی۔ویسے اتنا بھی اچانک نہیں۔عافیت زندگی، جو کہ لیڈی اقتدار کا ہسپتال ہے، اس میں جاب ملنے کے کچھ ماہ بعد وہ حد سے زیادہ امیر ہو گئی۔اب آپ خود سوچیں، کہ آخر کوئی اتنی جلدی سے دولت حاصل کیسے کر سکتا ہے؟ یقینا اس ہسپتال میں کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔کچھ بھیانک۔لیڈی اقتدار کا کردار بھی ہمارے لیے

مشکوک ہے۔" وہ پرجوش ہو کے مہر کو بتاتے گیا۔مہر کو بھی سمجھ آگئی تھی، سب کچھ واقعی مشکوک تھا۔

مہر کا دل ڈوبنے لگا تھا۔اسے یہ سب تھکانے لگا تھا۔معاملات تھے کہ سمٹنے کے بجائے الجھتے چلے جارہے تھے۔وہ آئے دن کی بھاگ دوڑ سے بھی تنگ آنے لگی تھی۔

کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد وہ دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے۔فارم ہاؤس بالکل خالی تھا۔یعنی ایک فرنیچر بھی فارم ہاؤس میں نہ تھا۔مہر اور احمد خالی ہاتھ ہی واپس آکے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"وقت ضائع ہوا۔"گاڑی میں بیٹھ کے مہر نے تبصرہ کیا۔احمد کسی گہری سوچ میں تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ اسے خالی کیا گیا ہے۔" احمد بے تاثر سے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟" مہر الجھی۔

"مطلب کہ فارم ہاؤس کو خالی کیا گیا ہے۔یقیناً انہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہمیں ان فارم ہاؤس کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔تو بس ان کو خالی کروالیا۔کیونکہ خود دیکھیں۔یہاں پہ مٹی کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔" احمد اپنی دریافت کے بارے میں مہر کو بتانے لگا۔

مہر نے اب سر جھٹک کے گاڑی چلانا شروع کی۔گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پہ رواں تھی، ٹھیک اسی وقت احمد کے موبائل پہ رنگ ہوئی۔اسے علی کی طرف سے میسج موصول ہوا تھا۔احمد تیزی سے وہ میسج پڑھنے لگا۔اور وہ میسج پڑھتے پڑھتے، پہلے اس کے چہرے پہ الجھن بکھری۔۔۔اور پھر یہ الجھن مسکراہٹ میں بدل گئی، خوش گوار مسکراہٹ میں۔۔۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں مجھے کیا پتا چلا ہے۔" احمد کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ آنکھیں منور تھیں۔ مہر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ دماغ میں سوال در سوال آ رہے تھے۔

"وہ قرضہ۔ وہ جو ہسپتال ہے ناں۔" ایک زور دار قہقہہ احمد نے بلند کیا۔ مہر تھوڑی الجھی، اس کے لیے گاڑی چلانا مشکل ہوگیا تھا۔ احمد نے اپنی ہنسی پہ قابو پا لیا۔ آنکھوں میں جنون لیے اس نے الجھی ہوئی مہر کو دیکھا۔

"وہ جس جرمن آدمی کے نام ہے۔۔۔وہ دس سال پہلے مر چکا ہے۔"

مہر کے سر پہ جیسے پہاڑ آکے ٹوٹ گیا۔ اس نے جھٹکا کھا کے بے اختیار بریک پہ پیر دبایا۔ چرچراہٹ کی آواز کرتے گاڑی بیچ سڑک پہ رک گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مہر کے پیچھے چلتی گاڑیاں بھی یک دم بریک لگانے لگی، بریک لگنے کی آوازیں سڑک پہ گونجنے لگیں۔ گاڑیاں آپس میں ٹکراتے بچ گئیں۔ مہر حواس باختہ کے عالم میں احمد کو دیکھ رہی تھی جو کے زور سے ہنسے جارہا تھا۔

پیچھے سے ہارن کی زور دار آوازیں اور لوگوں کی لعن طعن سنائی دی تو مہر ہوش میں آئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وہیل کو تھاما اور ہڑبڑاہٹ کے عالم میں گاڑی چلانا شروع کی۔ آنکھیں اب بھی بے یقینی کے مارے کھلی ہوئی تھیں۔

"آپ کو کچھ زیادہ ہی بڑا جھٹکا لگ گیا ہے۔" احمد مسکراتے ہوئے تبصرہ کرنے لگا۔ کچھ وقت لگا مہر کو اپنے شاک پہ قابو پانے میں۔

"ان لوگوں نے اتنا بڑا گیم کیسے کھیل لیا؟ یعنی وہ ہسپتال، سنابل وہ اس آدمی کا تھا ہی نہیں جسے میں اس سب کے پیچھے ماسٹر مائینڈ سمجھ رہی تھی۔" مہر واقعتاً حیران تھی۔احمد نے چہرے پہ سنجیدگی طاری کی اور سر اثبات میں ہلایا۔

"یہ پاکستان ہے، قانون کی ناک کے نیچے سے کام کیسے کیے جاتے ہیں، یہ سب بخوبی جانتے ہیں۔آپ کو اپنے حریف کی طاقتوں کا علم ہونا چاہیئے۔اب آپ کو یقین آجانا چاہیئے کہ نیلوفر مشکوک ہے، اور ساتھ ساتھ لیڈی اقتدار بھی اس سب میں ساتھ ہے۔آپ کو اپنے حریف کے بارے میں اب علم ہو جانا چاہیئے۔" احمد سمجھانے والا انداز اختیار کرتے بولا۔

"اب آگے کیا کرنا ہے؟" مہر کنفیوژ ہوکے بولی۔

"اب ہم نے کچھ نہیں کرنا ہے مہر۔اب وہ لوگ ہی کریں گے جو بھی کرنا ہے۔" احمد کے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ بکھری۔

"مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہا احمد۔" مہر اکتا گئی تھی۔یہ سب اس کے سر پہ سوار ہورہا تھا۔

"دیکھیں مہر، میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ لیڈی اقتدار اس سب کے پیچھے تھی، میں نیلوفر کو بھی جانتا تھا۔میں شمس سے بھی واقف ہوں اور عافیت زندگی کے کالے کرتوت سے بھی۔لیکن اگر میں آپ کو اچانک سے اتنا کچھ بتاتا تو آپ کبھی بھی یقین نہ کرتی، اس لیے میں نے آپ کے سامنے دلیل پیش کیں، ثبوت پیش کیے۔تاکہ آپ خود سے اپنے دشمنوں کو جان سکیں، ان کی طاقتوں کو جان سکیں، نہ بھولیں یہ جنگ جتنی میری ہے اتنی آپ کی بھی ہے۔اس میں آپ کو بھی لڑائی کرنی ہوگی۔میں بس

آپ کو تیار کر رہا تھا۔اب آپ اپنے دشمنون کو جان گئی ہیں، آپ کی ٹریننگ ہو چکی ہے۔آپ آگے سب کچھ سنبھال سکتی ہیں۔" احمد نے بات مکمل کی۔مہر کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔

"تو یعنی بس مجھے انتظار کرنا ہے، کہ آگے وہ لوگ کیا کریں گے؟ بس؟" مہر بولی۔احمد پرجوش ہو کے سر اوپر نیچے ہلانے لگا۔

"ہاں جی۔اب آپ میری ہدایات سنیں، میں آپ کو کچھ چیزیں بتا رہا ہوں جو آپ کے کام آئیں گی۔۔۔"

اور احمد مہر کو باقی کے سفر کی کچھ ہدایات دینے لگا۔مہر بھی ان سب باتوں کو ذہن نشین کرنے لگی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ایک ہفتے بعد:

دوپہر کا وقت تھا۔دھوپ کی کرنیں قصر کی دیواروں پہ وار کیے ہوئے تھیں۔دن کے اس وقت قصر سنہرا سا نظر آرہا تھا۔

مہر اپنے قصر کے لاؤنج پہ صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔آج اتوار کا دن تھا اس لیے عنایا حسام کے ساتھ ہی تھی۔آخری ملاقات کے باد مہر نے احمد سے کوئی بات نہ کی تھی۔نہ ہی شمس نے اسے تنگ کیا تھا۔اسے احمد کی ہر ایک ہدایت یاد تھی اور وہ بھی اپنے حریف سے ٹکرانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

ٹھیک اسی وقت ملازمہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔مہر کے کانوں میں قدموں کی چاپ پڑی تو وہ چوکنا ہو گئی۔اس نے ملازمہ کے اوپر نظر ڈالی جس کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔مہر کے چہرے پہ رونق سی آگئی۔ بہت لمبے عرصے بعد اس کی ماں نے اسے خط بھیجا تھا۔اس کے چہرے پہ اداس مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

"میم آپ کی والدہ کی طرف سے خط آیا ہے۔"مہر نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ملازمہ نے وہ خط اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ماں کا خط جہاں اس کے اوپر خوشگوار تاثر چھوڑ دیتا تھا وہاں یہی خط دل میں بہت سی مدفن تکلیفوں کو ابھرنے پہ مجبور بھی کر دیتا تھا۔ماضی کی تکلیف دہ یادیں اس کے دماغ میں گردش کرنے لگیں۔مہر نے لفافے سے بھورا پیپر نکالا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

"ہماری شہزادی!

ہم امید ہی کر سکتے ہیں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ہم تصور بھی نہیں کرنا چاہیں گے کہ آپ کسی بھی قسم کی تکلیف میں مبتلا ہوں۔

ہم ہر روز آپ کا انتظار کرتے ہیں۔کہ شاید کسی دن آپ ہمارے پاس آ جائیں۔روز رات کو اس امید سے سوتے ہیں کہ صبح ہماری آنکھ کھلے تو آپ ہمارے سامنے ہوں۔مگر مہر، آپ نہیں آتیں۔اور شاید آپ کبھی نہ آئیں مگر ہم آپ کا انتظار کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔ہمارے بیٹے بھی ملک سے باہر چلے گئے ہیں اور ہمارے سر پہ آیا کو بٹھا گئے ہیں۔مگر کیا ایک ماں کے لیے یہ کافی ہوتا ہے؟

مہر ہم آپ کو یہ خبر سنانا تو نہیں چاہتے تھے لیکن ہم مجبور ہیں۔ہمیں اسٹیج فور بریسٹ کینسر ہے مہر۔ شوگر کی وجہ سے ہماری کیمو بھی نہیں ہو سکتی اور اب ہم اپنی موت کے انتظار میں اپنے یہ دن گزار رہے ہیں۔ ہمارا جسم اندر سے کھوکلا ہو رہا ہے۔ہم دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم ختم ہو رہے ہیں مہر اور بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔کیا آپ اسے ہماری آخری خواہش سمجھ کے پوری نہیں کر سکتیں؟ کیا آپ ہم سے ملنے نہیں آ سکتیں؟ کیا ہمارے ان دنوں میں آپ ہمارے ساتھ نہیں رک سکتی؟ کیا ہم آپ سے کچھ زیادہ مانگ رہے ہیں مہر؟

اپنے آخر کے دن بھی ہم یوں ہی آپ کے انتظار میں کاٹ دینے والے ہیں۔وہ جو بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والی ہے۔

آپ کی والدہ شائلہ عظیم۔"

مہر ہاتھ میں وہ خط تھامے کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور اس خط پہ ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔مہر کی روح کو سنگین پچھتاوے نے جکڑ لیا۔ وہ گہرے رنج میں مبتلا تھی۔اس کا دل بھاری ہونے لگا تھا۔نادیدہ بوجھ اس کے دل پہ سوار ہو گیا تھا۔ وہ اس بوجھ ذدا دل کے ساتھ بھلا کیسے جی سکتی تھی؟ وہ کیسے اس پچھتاوے سے جان چھڑا سکتی تھی؟ وہ کیسے وہ کھویا ہوا وقت واپس لا سکتی تھی؟ لاؤنج میں بیٹھے، اپنے آنسوؤں سے خط کو بھگوتے وہ یہی سوچے جا رہی تھی

مہر کو اس لمحے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی۔وہ کس طرح سے اپنی ماں کے ساتھ انصاف نہ کر سکی۔وہ آخر کس چیز کی انہیں سزا دیتی رہی؟ وہ کیوں ایک اچھی بیٹی نہ بن سکی؟ اور اس لمحے مہر بنت عبداللہ سلطان کی زندگی ایک سوالیہ نشان بننے لگی تھی۔۔۔

خط اس کے ہاتھوں سے پھسل کے گود میں جا گرا۔مہر گیلی سانس اندر کھینچتے کھڑی ہوئی تو وہ خط زمین پہ گر گیا۔پیر اپنی چپلوں میں گھسیڑتے وہ لاؤنج سے باہر نکلی۔سبزہ زار کراس کر کے وہ گھر سے باہر نکلی اور اپنی گاڑی پہ سوار ہوئی۔

اسے اب کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔اسے بس اپنی ماں سے ملنا تھا۔بس ان سے معافی مانگنی تھی۔ان کو احساس دلانا تھا کہ وہ بھی ان سے اتنا ہی پیار کرتی تھی جتنا وہ اس سے کرتی تھیں۔انہیں بتانا تھا کہ وہ ان سے جدا رہنا چاہتی نہیں تھی لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔وہ بس کسی بھی طرح سے اب اپنی ماں کو اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی ماں کے گھر کے سامنے روکی۔حواس باختہ سے عالم میں وہ گاڑی سے اتری اور اندر جانے لگی۔

اسے گھر کے گارڈز تک نے اسے اندر جانے سے نہ روکا۔

اس کا دماغ بالکل سن تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔وہ تو اس بات سے بھی انجان تھی کہ اس گھر میں اس کی ماں کا کمرہ کون سا تھا۔۔۔اف مہر۔۔۔!

بھٹکتے بھٹکتے وہ اپنی ماں کے کمرے تک پہنچی۔بستر پہ لیٹی اپنی کمزور سی بوڑھی ماں پہ اس کی نظر پڑی تو اس کے قدم زنجیر ہوئے۔دل پہ جیسے خنجر برسنے لگے تھے۔

آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہوا۔اسے لگا جیسے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکے گی۔اسے لگا جیسے وہ اپنی ماں کا سامنا نہیں کر سکے گی۔وہ ایک دفعہ پھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی،ٹھیک اسی طرح سے جس طرح وہ ہمیشہ اپنی ماں سے بھاگتے رہی تھی۔

ہر ایک قدم بڑھانا اس کے لیے مشکل تر ہوتا گیا، وہ اپنے آپ سے جنگ کرتے ہوئے، اپنے دل میں بسے ان جذبات سے جنگ کرتے ہوئے ایک ایک قدم بڑھاتے گئی اور شمائلہ کے پاس پہنچی۔ ان کے سرہانے کھڑے ہو کے ان کے نورانی چہرے کو دیکھنے لگی جس پہ نا جانے کتنی لکیریں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت جھلکتی تھی۔سالوں کی دبی وہ محبت جس سے مہر بھاگتے رہی تھی،اس ہی محبت نے آج جوش لیا تھا۔وہ ان کے سرہانے زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ان کے نورانی چہرے کو عجب سے دیکھنے لگی۔

"ماں!" مہر نے بالکل دھیمی سی آواز میں کہا۔آنسوؤں کا ایک پھندا اس نے حلق میں نگلا۔

یک دم شمائلہ کی آنکھ کھلی۔اپنے سامنے اپنی بیٹی کو دیکھ کے ان کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ ڈھیروں جد و جہد کر کے وہ اٹھ کے بیٹھیں۔مہر کھڑی ہوئی اور ان کے سامنے بستر پہ بیٹھ گئی، وہ ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی، وہ اب بھی شرمندہ تھی۔وہ آنکھوں میں عجب لیے مہر کو اوپر سے نیچے دیکھنے لگیں۔۔۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ مہر کو صدیوں کے انتظار کے بعد دیکھ رہی تھیں۔آنکھوں میں محرومی اور چہرے پہ ترسا ہوا سا تاثر تھا۔

وہ بے یقینی کے عالم میں بھاری بھاری سانسیں لینے لگیں، انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی بیٹی آخر کار ان سے ملنے آگئی تھی۔

"مہر!" شمائلہ بھاری بھاری سانسیں لیتے ہوئے بولیں۔"کہہ دیجیئے یہ خواب نہیں ہے!"مہر نے شفقت سے شمائلہ کے جھریوں زدہ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔وہ اداس سا مسکرا دی۔سالوں سے جو دیوار ان دونوں کے بیچ میں نافذ تھی وہ آج دم توڑ گئی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔اور آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔" مہر نے آنسوؤں کا ایک اور پھندا نگلتے کہا۔

"آج ہم مکمل ہو گئے ہیں مہر۔اب ہم سکون سے مر سکیں گے۔" شمائلہ نے مہر کے شفاف چہرے پہ نرمی سے ہاتھ پھیرا۔مہر پھر سے رونے لگی۔

"کہیں نہیں جائیں گی آپ۔" مہر نے اپنے آنسو پونچھتے کہا۔

"کتنی بڑی ہو گئیں ہیں آپ۔اور خوبصورت بھی۔کیا واقعی آپ ہمیں نہیں چھوریں گی؟" شمائلہ کی کمزور آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"نہیں! اور ہم آپ کے کینسر کا علاج کروائیں گے۔آپ کو کچھ نہیں ہوگا ماں۔" شمائلہ کی مسکراہٹ ڈھیلی پڑی۔ماتھے پہ لکریں ابھریں۔چہرے پہ الجھن لیے وہ مہر کو دیکھنے لگیں۔

"کون سا کینسر؟" شمائلہ نے جیسے ہی پوچھا تو مہر کرنٹ کھا کے کھڑی ہوئی۔وہ اداسی، وہ سالوں بعد ملنے کی

بے خودی ہوا ہوئی۔۔۔اب سر پہ صرف اور صرف خطرہ منڈلانے لگا۔۔۔

"آپ نے خط بھیجا تھا؟ ماں آپ نے بتایا تھا آپ کو کینسر ہے؟" مہر بلند آواز میں تائید کرنے لگی۔اس کے وجود میں انتشار پھیلنے لگا تھا۔

"نہیں مہر ہم نے آپ کو کوئی خط نہیں بھیجا۔ہم بالکل صحتیاب ہیں!" شمائلہ نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔اور مہر۔۔۔وہ جہاں تھیں وہیں کھڑی رہ گئی، اسے سب کچھ سمجھ آنے لگا۔۔۔

"ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑدیں ہیں۔۔۔" مہر کے دماغ میں وہ قول دہرانے لگا جو وہ اسے کہا کرتی تھیں۔اوخدایا، وہ کیسے نہ پہچان سکی۔

"ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔۔۔"

ماں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔۔۔لیکن۔۔۔لیکن آج ماں نے شکایت کی۔۔۔وہ کیوں نہ سمجھ سکی۔۔۔

مہر نے نظر اٹھا کے شمائلہ کو دیکھا جو کہ بری طرح سے الجھی ہوئی تھیں۔اسے احساس ہوا جیسے اچانک سے شمائلہ

کی آنکھوں میں خوف منڈلایا تھا۔اسے ان کی آنکھوں میں سایہ دکھائی دیا۔۔۔

"مہر پیچھے دیکھیں!" شمائلہ چلائیں۔

کچھ زور دار اس کی سر کی پشت سے ٹکرایا۔مہر کے کان بجنے لگے۔وہ جھٹکا کھا کے گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گری اس کا سر بے اختیار جھک گیا۔تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ مہر اپنا سر اٹھا نہیں سکی۔اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔سارا منظر گڈ مڈ ہونے لگا تھا۔۔۔

"مہر!" شمائلہ کی آواز مہر کے کانوں میں گونجی۔ مہر کا سر بھاری ہوتا چلا گیا۔۔۔ آوازیں آنا بند ہوتی گئیں۔۔۔ آنکھوں پہ چھائی دھند بڑھتی چلی گئی۔

"اٹھاؤ ان دونوں کو۔" پیچھے سے آواز گونجی۔ آواز شناسا تھی مگر دماغ اس قدر مفلوج تھا کہ وہ آواز پہچان نہ سکی۔

اس کو محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے اس کے بازو تھامے تھے۔ سر کے اوپر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ اور یوں مہر بنت عبداللہ سلطان نے اپنا ہوش کھو دیا۔۔۔

کاش وہ اپنا ہوش نہ کھوتی۔۔۔ کاش۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لیڈی اقتدار اپنے شاہانہ سے دراز کمرے میں قیام پذیر تھی۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کے اپنا خوبصورت عکس دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں نسوانی پرفیوم کی خوشبو معدوم تھی۔

اس نے سفید مامتو پہنا ہوا تھا۔ اور گردن پہ پتھروں کی خوبصورت مالا۔ اپنے لبوں پہ وہ لپ اسٹک لگا رہی تھی۔

اپنی سفید ہیلز پہن کر بھرپور شان و شوکت سے چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے سے نکلی اور قصر کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک لڑکی بیٹھی تھی جو اسی کی منتظر نظر آرہی تھی۔ لیڈی اقتدار کے آتے ہی وہ لڑکی احتراماً کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پہ پر اعتماد مسکراہٹ بکھری۔ وہ بالکل پر سکون لگتی تھی۔

لیڈی اقتدار تنی ہوئی گردن لیے صوفے پہ بیٹھی اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ لڑکی بھی بیٹھ گئی۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟" لیڈی اقتدار کے انداز میں مصنوعی نروٹھا پن تھا۔اپنی انگلی کو کنپٹی کی طرف لے کر گئی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"درفشاں۔"وہ درفشاں تھی۔آنکھوں میں ٹھنڈا تاثر لیے، چہرے پہ پر اعتماد سی بے رحم مسکراہٹ سجائے وہ گویا ہوئی۔لیڈی اقتدار کے لب اوہ میں ڈھل گئے۔اس کے انداز میں ملکہ کی بے نیازی تھی۔

"میرے گارڈز بتا رہے تھے کہ تمہارے پاس کچھ ایسا ہے جس سے مجھے بہت فائدہ ہوگا؟" لیڈی اقتدار پنے روایتی مغرور انداز میں بولی۔

"صرف یہی نہیں۔میں نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میں بدلے میں بہت کچھ چاہتی ہوں۔" وہ عام درفشاں سے مختلف لگتی تھی۔اس کے انداز میں عام درفشاں جیسی نزاکت تھی نہ ہی اپنائیت۔اس کی شخصیت میں صرف اور صرف بے دردی اور بے رحمی تھی۔

"اور تمہیں کیا چاہیے؟" لیڈی اقتدار نے بھنویں اٹھا کے کہا۔

"دولت اور طاقت۔دیں گی؟" درفشاں آنکھوں میں چمک لیے بولی تھی۔لیڈی اقتدار زیر لب ہنس دی۔پھر مسکراہٹ دبائے چہرے پہ سنجیدگی چھائے وہ درفشاں کو دیکھنے لگی۔

"پہلے خبر بتاؤ۔" لیڈی اقتدار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ کے کالے دھندے کے بارے میں کچھ لوگ ہیں جو جانتے ہیں۔ تحریک حرر کے بارے میں سنا ہے آپ نے؟ وہ لوگ اسی تحریک کا حصہ ہیں، میں بھی بظاہر ان ہی کے ساتھ کام کرتی ہوں۔" در فشاں کے چہرے پہ مختصر مسکراہٹ تھی۔لیڈی اقتدار کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"تو کیا مجھے ان کے علم سے ڈرنا چاہیے؟" لیڈی اقتدار نے اپنے آپ کو پر سکون ظاہر کیا۔

"بالکل۔کیونکہ وہ لوگ آپ کو تنگ کرنے میں کوئی کثر نہیں چھوڑیں گے۔وہ آپ کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔مگر" درفشاں کی مسکراہٹ گہری پڑی۔

"مگر؟" لیڈی اقتدار نے جواباً مسکرا کے در فشان کو دیکھا۔

"مگر اگر آپ مجھے اپنا دوست بنا لیں۔" در فشاں معنی خیز انداز میں بولی۔"تو میں آپ کو سب کچھ صحیح وقت پر بتاتی رہوں گی اور بدلے میں مجھے چاہیے دولت اور طاقت۔بے شمار دولت، اور بے شمار طاقت۔۔!" در فشاں کی آنکھوں میں آگ تھی، الگ سی تپش تھی۔یہ شعلہ باز آنکھیں اس سے پہلے کسی نے اس میں نہ دیکھی تھیں۔

"مجھے تمہاری بات پہ بھروسہ نہیں۔پہلے میں تمہارا امتحان لوں گی۔مجھے کچھ ایسا بتانا جو کہ مجھے واقعتہً فائدہ پہنچائے۔تب ہی میں شاید تمہیں اپنا دوست تسلیم کروں۔"لیڈی اقتدار نے کہا مگر درفشاں کی مسکراہٹ برقرار رہی۔اس نے اپنا بیگ اٹھایااور کھڑی ہونے لگی۔

"میر انتظار کیجیئے گا لیڈی۔میں آپ کی شانِ حضور میں ایک خبر جلد پیش کروں گی۔" چہرے پہ سرد سا تاثر لیے وہ ڈرائنگ روم سے قدم بڑھانے لگی۔لیڈی اقتدار متاثر کن نگاہوں سے اس پر اعتماد لڑکی کو جاتے دیکھ رہی تھی۔اس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔

"تو یعنی کھیل دلچسپ ہو جانے والا ہے۔" اس کے جاتے ہی اس نے زیر لب تبصرہ کیا۔

در فشاں قصر کا بڑا دروازہ عبور کر کے باہر جانے لگی۔آنکھوں میں لگن اور جنون لیے وہ قصر سے دور جانے لگی۔وہ واقعی در فشاں کا مختلف روپ تھا۔۔وہ روپ، جو کسی کے گمان تک میں نہ تھا۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## باب نمبر ۸:بازار.... انسانوں کا

وہ لوگ جو ہم سے اوپر ہیں،

جو دولت مند ہیں،

جو طاقت ور ہیں،

وہ جو چاہے وہ کرتے ہیں۔

ہم جیسے لوگ،

تمہارے جیسے،

میرے جیسے،

انہیں ہماری پرواہ نہیں۔

ہم ان کی سڑکیں بناتے ہیں،

ہم ان کی جنگیں اور سب کچھ لڑتیں ہیں،

لیکن وہ،

وہ ہماری پرواہ نہیں کرتے۔

(سپائڈر مین ہوم کمنگ کا ولچر)

☆☆☆☆☆☆☆

یہ لکڑی کی بنی ہوئی، ایک منزلہ عمارت کا منظر ہے جو کہ کسی پہاڑی علاقے میں واقع ہے۔عمارت کے چاروں اور نا ہموار زمین تھی اور زمین پہ گھنا سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔آس پاس جنگلی درخت بھی نظر آتے تھے۔عمارت بس ایک ہی دراز سے کمرے پہ مشتمل تھی۔

سورج کی کرنیں اس کمرے کی کھڑکیوں کے ذریعے اندر داخل ہوتیں اور فرش پہ نچھاور ہوتیں۔ سورج کی حدت میں کمرے کی لکڑیاں سنہرے رنگ کی نظر آتی تھیں۔کمرے کے کونے میں ایک سٹریچر تھا جس پہ شمائلہ کا بے ہوش وجود لیٹا ہوا تھا۔ان کے سرہانے ایک عورت کھڑی تھی جو کہ ان کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔کمرے کے بیچ و بیچ کرسی تھی جس پہ مہر کا بے ہوش وجود بندھا ہوا تھا۔بے ہوشی کے باعث مہر کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کے لمبے بال اس کے چہرے پہ بکھرے ہوئے تھے۔اس کے ہاتھ کرسی پہ کس کے باندھے گئے تھے اور پاؤں بھی کرسی سے بندھے تھے۔

اس کے سامنے، تھوڑے سے فاصلے پر ہی، اپنے چہرے پہ نحوست طاری کیے، شمس کھڑا تھا۔ شمس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ یک دم اس نے جگ کا پورا پانی مہر کے منہ پہ پھینک دیا۔ مہر حواس باختہ ہو کے بے ہوشی کے غلبے سے باہر آئی۔ پانی اس کے چہرے سے ٹکرایا تو اس کے سارے بال گیلے ہو کے چہرے پہ چپک گئے۔

چہرے پہ بکھرے کالے بال مہر کی آنکھوں کی حدت کو روکے ہوئے تھے۔ وہ کچھ بھی ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دماغ سن سا تھا۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے اپنے بالوں کو منظر سے ہٹانا چاہا۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی رسی سے رگڑ کے باعث اس کے ہاتھ پہ مرچیں سی لگنے لگیں۔

ٹھیک اسی وقت مہر کی یاد داشت واپس آئی۔ اسے جو کچھ گھنٹے پہلے ہوا تھا، سب یاد آ گیا تھا۔

مہر کے اندر خوف اور بے چینی پھیلنے لگی۔ وہ چلانے لگی۔ لیکن اس کے منہ میں کاغذ ٹھونس دیا گیا تھا جس کے باعث اس کی آواز دب گئی تھی۔ وہ پوری قوت سے چلانے کی کوشش کرتے گئی، لیکن ہر چیخ و پکار دب رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی، اسے اپنی ماں کی فکر ستا رہی تھی۔ اوپر سے چہرے پہ بکھرے بال تھے جو اسے ٹھیک سے کچھ دیکھنے بھی نہیں دے رہی تھی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔

مہر کو احساس ہوا کہ کسی کا ہاتھ اس کے سر کو چھو رہا تھا۔ بھاری اور طاقتور ہاتھ۔ اس ہاتھ کو وہ پہچان سکتی تھی۔ مہر کے اندر خوف اب ابلنے لگا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگی تھی۔ اتنی زور سے کہ اس کے حلق میں درد ہونے لگ گیا تھا۔

شمس نے مہر کے چہرے پہ بکھرے بالوں کو منظر سے ہٹا کے کان کے پیچھے کیا۔اب مہر سارا منظر ٹھیک سے دیکھ سکتی تھی۔وہ لکڑی کے اس کمرے کو بھی دیکھ سکتی تھی۔یہ کمرہ اس کے لیے انجان تھا۔وہ یہاں پہلی دفعہ ہی لائی گئی تھی، اور آخری دفعہ بھی۔۔!

اس اپنے سامنے شمس کھڑا نظر آیا۔شمس کے دائیں اور بائیں جانب دو مرد کھڑے تھے۔

شمس نے اس کے منہ سے کاغذ کھینچ کے نکالا۔مہر کے لب آزاد ہوئے۔

"میری ماں کدھر ہے!" مہر پوری قوت سے چلائی تھی۔

"بتاؤ مجھے میری ماں کدھر ہے!"وہ اپنے اندر بسے خوف کے باوجود چلا رہی تھی۔اس وقت ماں کی فکر خوف کو غالب لے چکی تھی۔

"بتاؤ مجھے ورنہ،میں تمہیں کچا چبا۔۔" مہر کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔۔۔ہوا ہی کچھ یوں تھا۔

شمس نے مہر کے منہ پہ جان لگا کے تھپڑ مارا۔تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ مہر کا سر ترچھا ہوگیا تھا۔اس کا دماغ سن سا ہوگیا، اسے ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔اس کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ترچھا منہ کیے، چہرے پہ بے یقینی لیے وہ ایک دم سے برف کی بن گئی تھی۔

"بالکل چپ!" شمس نے مہر کو بالوں سے پکڑ کے اس کے منہ کو سیدھا کیا۔بال کھینچنے پر مہر نے تکلیف دہ سسکی لی۔

"باس۔لیڈی نے کہا تھا، زیادہ سختی نہیں کرنی ہے۔" شمس کے برابر میں کھڑے مرد نے کہا تو اس کے ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے پڑے۔ٹھیک اسی وقت مہر کے دماغ میں ایک بتی جلی۔۔۔

"باس لیڈی نے کہا تھا۔۔۔" مہر کے دماغ میں وہ الفاظ گونجنے لگے۔"باس لیڈی۔۔۔"

شمس نے مہر کی کرسی اچانک سے گھمائی تو مہر کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔وہ ایک دم سے ہڑبڑا گئی۔

اب اس کے سامنے اسٹریچر پہ پڑا اس کی ماں کا بے ہوش وجود تھا۔اس کے چہرے پہ نرمی در آئی، آنکھوں میں ترسا ہوا سا تاثر۔اسے اپنی محرومی اس لمحے یاد آئی۔تو وہ لوگ اس کی ماں کو بھی لے آئے تھے۔۔۔

وہ کتنے ہی لمبے انتظار کے بعد اپنی ماں سے مل رہی تھی، اور آخری وقت میں ہی دونوں کو جدا کر دیا گیا۔۔ابھی تو دونوں نے اپنے اس ملن کا جشن تک نہ منایا تھا۔۔اس کے نصیب میں ہر خوشی اتنی عارضی کیوں ہوتی ہے؟مہر نے سوچا۔

"دیکھو۔" شمس نے اب انداز پر سکون رکھا۔لیڈی اقتدار کی ہدایت تھی کہ مہر کے اوپر زیادہ سختی نہ کی جائے، اسے اپنی مالکن کی ہدایت پہ عمل کرنا تھا۔

"تمہاری ماں بالکل ٹھیک ہے۔ہم اسے کچھ نہیں کریں گے۔تم سمجھ رہی ہو؟" مہر آنکھوں میں محرومی سے لبریز تاثر لیے اپنی ماں کے بے ہوش وجود کو دیکھے جا رہی تھی۔اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہورہی تھی۔وہ کتنی بدنصیب تھی۔

کتنے سال بعد تو اس نے اپنی ماں سے ملنے کی جرات کی تھی، اور آخری وقت میں ماں ان ظالمین کے ہاتھ لگ گئی۔۔۔

"سمجھ رہی ہونا؟" شمس دوبارہ سے بولا۔اب کی بار انداز تھوڑا سخت ہوا۔مہر نے کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

"میری ماں کا کیا قصور تھا؟ ان کے ساتھ کیوں کر رہے ہو ایسا؟" آنکھیں اب بھی بند تھیں اور آواز گیلی۔بند آنکھوں کی حدت پار کر کے ایک آنسو اس کے گالوں پہ لڑکھڑایا۔

"ہم نے تمہاری ماں کو ہمیشہ کے لیے قید میں نہیں ڈالا۔تمہیں بس ہمارا چھوٹا سا کام کرنا ہو گا۔بہت ہی چھوٹا سا کام، اور پھر ہم تمہاری ماں کو جانے دیں گے۔" شمس نے ایک مرتبہ پھر سے انداز نرم بنایا۔

مہر اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔احمد اسے اس سب کے لیے ہمیشہ سے تیار کرتا آرہا تھا، اسے بھی اپنے دماغ کا استعمال کرنا تھا، مگر اس تناؤ سے دوچار صورتحال میں وہ ایسا نہیں کر پارہی تھی۔

مہر نے گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کیں۔وہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"آپ مایوس نہ ہوں مہر، میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔" احمد کے وہ نرمی سے کہے گئے الفاظ اس کے دماغ میں گونجے۔ایک دفعہ پھر اس کی آنکھیں نم پڑیں۔

وہی تو نہیں تھا اس کے ساتھ، وہ اب کیا کرتی۔۔۔وہ اکیلے ان سب کا کیسے مقابلہ کرتی؟

اسے احمد شدت سے یاد آیا۔

"میری برداشت ختم ہورہی ہے۔" شمس کو تپ چڑھنے لگی تھی۔اس سے مہر کی خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔"تم بولو۔کیا تم وہ سب کرنے کے لیے تیار ہو جو ہم بولیں گے؟" مہر کی بند آنکھوں کی سمت سے ایک اور آنسو نکل کے اس کے گال پہ دستک دینے لگا۔

"آپ نے اپنے دماغ کو حاضر رکھنا ہے مہر۔آپ نے کوشش کرنی ہے کہ اپنے دشمنوں کو پہچانیں۔ان کے بارے میں چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کا جائزہ لیں۔یہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی ہوتی ہیں جو ہمارے بڑے بڑے سوالات کا جواب دیتی ہیں۔آپ اپنے آپ کو مضبوط کر لیں مہر۔"آفس میں کہا گیا احمد کا یہ جملہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔

مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں، اب کی بار آنکھوں میں خوف نہیں، اطمینان تھا۔احمد اس کے ساتھ نہ ہو کے بھی اس کی مدد کر چکا تھا۔وہ اس کے پاس نہ ہو کے بھی اس میں ہمت بھر چکا تھا۔وہ پچھلے کئی ہفتوں سے اسے اسی سب کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ سرد، پر اطمینان نگاہیں بے صبر سے شمس کے اوپر ڈالیں۔مہر کے چہرے پہ سختی سی تھی۔ شمس بھی اس کے بدلتے انداز کو بھانپ چکا تھا۔

"کیا تم کچھ بولو گی بھی؟" دل برداشتہ ہو کے شمس چلایا تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مہر کو ایک اور تھپڑ سے نواز دے۔

"میں تم لوگوں کے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتی۔" وہ بالکل سادہ سے انداز میں بولی۔اس کے انداز میں شمس

کے لیے ذرہ برابر بھی ڈر یا خوف نہ تھا۔

"تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ سمجھی؟ یا تو تم ہمارا کام کرو گی یا تو ہم تمہاری ماں کو مار دیں گے۔"اس لمحے مہر کا اطمینان گھاٹے میں آنے لگا تھا۔ایک دفعہ پھر سے اس کا دل بے چین ہونے لگا۔اسے اپنا آپ جکڑا ہوا محسوس ہوا۔

وہ اب کیا کرے؟ اسے لگا جیسے وہ ایک مرتبہ پھر سے ٹوٹ رہی ہے۔

"آپ نے اپنے آپ کو ٹوٹنے نہیں دینا ہے مہر۔چاہے کچھ بھی ہوجائے، آپ نے طاقت اور بہادری کی مثال قائم کرنی ہے۔ہم مل کے اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیں گے۔" ایک دفعہ پھر سے احمد کے کہے ہوئے الفاظ مہر کے دماغ میں منڈلانے لگے، یہ الفاظ اس کے اندر توانائی بھرنے لگے۔مہر کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن در آئی۔

وہ اس کے پاس نہ ہو کے بھی اس کی اس طرح مدد کر رہا تھا جس طرح وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔مہر نے پھر سے آنکھیں بند کر کے اپنے دماغ پہ زور ڈالنے کی کوشش کی۔یقینا اس عذاب سے نکلنے کا کوئی تو حل ہو گا۔مہر نے سوچا۔

"کون سا کام۔" وہ گہری سانس خارج کرتے بولی۔ آنکھیں اب بھی کستی سے بند تھیں۔ شمس ایک گھٹنے کے بل زمین پہ بیٹھا اور مہر کے چہرے کے سامنے اپنا چہرہ ٹکایا۔اس کے چہرے پہ خسیانی مسکراہٹ تھی۔

شمس سے قرب محسوس ہوا تو مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔وہ اندر سے بھلے سے گھبرا رہی تھی لیکن اس نے اپنی گھبراہٹ چہرے پہ آنے نہ دی۔چہرے پہ اب بھی اطمینان تھا۔

"تمہیں کچھ دنوں تک بتا دوں گا۔اس سے پہلے تمہیں ہمارے بہت سے اور بھی کام کرنے ہوں گے۔ پھر تمہاری ماں ہماری قید سے آزاد۔" شمس سرگوشی کرنے والا انداز اختیار کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"اور اگر تم لوگوں نے میری ماں کو پھر بھی نہ چھوڑا تو؟" مہر نے تشویش پیش کی۔ شمس چہرے پہ سنجیدگی

طاری کرتے ہوئے سر نفی میں ہلانے لگا۔

"تم ہماری ٹیم ہو مہر۔تم جب تک ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہو ہم تمہارے شانہ بشانہ چلیں گے۔لیکن اگر تم ہمارے احکام نہیں مانو گی تو شاید ہم تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری ماں کا بھی حشر نشر بگاڑ دیں گے۔"

مہر کا دماغ صورتحال کا اچھے طریقے سے جائزہ لینے لگا تھا۔وہ یہ تو جان گئی تھی کہ ان سب کو اس کی ضرورت تھی۔کوئی کام تھا جو وہ لوگ کروانا چاہ رہے تھے۔اور جب تک وہ کام وہ انجام نہ دیتی، وہ

لوگ بھی اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔اس کے پاس شاید حامی بھرنے کے علاوہ فی الوقت کوئی راستہ نہ تھا۔

لیکن پھر بھی، مہر نے ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

"کون سے کام۔" وہ بولی۔

"پہلے میرے ایک سوال کا سچ سچ جواب دو۔احمد کو تم نے کیا کیا بتایا ہے؟ اور یاد سے، جھوٹ بولنے کی جرات بھی نہ کرنا۔" مہر کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔تو یہ سب اس لیے ہو رہا تھا؟ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

وہ جان گئی تھی کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح سے احمد اور اسے الگ کرنا چاہتے تھے۔یہ سب اسی لیے ہی کیا جا رہا تھا۔

"وہ بس میری ہیرے ڈھونڈنے میں مدد کر رہا ہے۔" مہر کی پر اطمینان نظریں شمس کے چہرے پہ مقید تھیں۔شمس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"بس ہیرے؟ اور کچھ؟ اتنے ہفتے کیا کرتے پھر رہے تھے تم دونوں؟" شمس مہر کے چہرے پہ معصومانہ سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہم بس ہیرے ہی تلاش کرتے رہے ہیں۔اس نے مدد کی آفر دی میں نے قبول کر لی۔بس۔" مہر شمس کے چہرے کو گھورتے ہوئے شانے اچکا گئی۔

"اور وہ موبائلز۔ تمہارے گھر کی تلاشی لی تو موبائل ملا ہمیں۔ اس میں صرف احمد کا نمبر تھا۔" شمس کے انداز میں اضطراب گھلا ہوا تھا۔

"یہ بھی احمد کی تجویز تھی۔ کام کی بات ہم اسی موبائل پہ کرتے تھے۔" مہر اس وقت بالکل بھی جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اس قت جھوٹ بولنا بے فیض تھا۔ وہ سب اندازے لگا چکے تھے بس ان اندازوں کی تصدیق چاہ رہے تھے۔

"اور اپنے عام فون پہ بھی باتیں کرتے تھے۔ اس کا کیا؟" شمس کی آنکھوں میں مشکوک سا تاثر تھا۔ اس کے انداز میں کچھ معنی خیز تھا۔

"یہ بھی احمد کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ان سب کو علم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ساتھ مل کے ہیرے تلاش کر رہے ہیں۔" مہر کا لہجہ سپاٹ تھا۔ شمس پورے دل سے مسکرایا۔ مہر کو یہ مسکراہٹ ٹھٹکنے لگی تھی۔ شمس کھڑا ہوا۔ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے وہ مہر کو گھورنے لگا۔

"اور تمہیں یہ بھی احمد نے ہی کہا ہوگا، کہ جب تمہاری تفتیش کی جا رہی ہو تو تم نے بالکل سچ بولنا ہے۔"

مہر یہ سنتے ہی بری طرح سے چونک گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ایک ہفتے پہلے:

وہ دونوں مہر کی گاڑی یہ سوار فارم ہاؤس سے واپسی کے راستے یہ تھے۔

”جی تو اب آپ میری ہدایات سنیں، میں آپ کو کچھ چیزیں بتا رہا ہوں جو آپ کے کام آئیں گی۔۔۔“

یہی کہنے کے بعد احمد نے گہری سانس خارج کی۔مہر نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنے کان کھڑے کیے۔

”مجھے یقین ہے ان کا اگلا قدم آپ سے سب کچھ اگلوانا ہو گا۔وہ لوگ ہماری پراگریس جاننا چاہیں گے، وہ لوگ جاننا چاہیں گے کہ ہم کہاں تک پہنچ چکے ہیں اور کیا کچھ کرتے رہیں ہیں۔آپ سے یہ سب جن حالات میں بھی پوچھا جائے، آپ نے ان کے ہر سوال کا جواب سچ سے دینا ہو گا۔“ احمد ایک ایک لفظ پہ زور دے کے کہہ رہا تھا۔مہر کچھ الجھی۔

”جھوٹ بولنا بہتر نہیں ہو گا؟“ مہر نے پوچھا۔احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

”جھوٹ بولنے کا فائدہ نہیں۔وہ سب جانتے ہوں گے۔آپ نے بس سب کچھ سچ سچ کہنا ہو گا۔لیکن ایک چیز کا دھیان رکھنا ہے۔“ احمد نے آخری فقرے پہ زور دیا۔”آپ نے صرف اور صرف ہیروں کا ذکر کرنا ہے۔آپ نے یہ نہیں بتانا کہ ہم انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں۔بس یہ کہ ہم ہیرے تلاش کرنا چاہتے ہیں۔اس چیز کا خاص خیال رکھنا ہو گا آپ نے۔“ مہر مزید الجھی۔

”مگر اگر سب سچ بتانا ہی ہے تو پھر یہ ہی کیوں چھپائیں؟“ احمد کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

”کیونکہ،میں جانتا ہوں تفتیش کے وقت وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ آپ جو بھی کہہ رہی ہیں میری ہدایات پہ عمل کرتے کہہ رہی ہیں۔وہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے آپ کو سچ بولنے کا کہا ہے۔اس لیے اگر ہم اپنے انتقام کے عزم کو گول کر جائیں گے تو وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔

میرے بارے میں وہ لوگ پہلے سے ہی جانتے ہیں، لیکن آپ کے لیے ان کے شک و شبہات دور ہو جائیں گے۔ان لوگوں کو یہی لگے گا آپ صرف اور صرف ہیرے ہی ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"جینیس!" وہ دل ہی دل میں بولی۔وہ اس وقت شمس سے نہیں احمد سے متاثر تھی۔ اس نے بہت آگے کا

سوچ رکھا تھا۔وہ اپنے دشمنون کی رگ رگ سے واقف تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" مہر کے انداز میں مصنوعی حیرانی تھی۔

"کیونکہ ہم احمد کو جانتے ہیں۔اور تم جو بھی کر لو۔ہماری ناک کے نیچے ہمیں دھوکا نہیں دے سکتی۔کتنا ہی اچھا ہو کہ تم اپنی اوقات میں رہ کے بس ہیرے ہی تلاش کرتے رہی ہو، ورنہ چیزیں بہت مختلف بھی ہو سکتی تھیں۔" مہر کے دل کو قرار آنے لگا۔وہ جو ظاہر کرنا چاہتی تھی، اس میں وہ کامیاب ہوئی تھی۔مگر اب بھی خطرہ پوری طرح سے ٹلا نہیں تھا۔اس کی ماں اب بھی ان کے قبضے میں تھی۔

"ٹھیک ہے۔اپنی ماں کو جی بھر کے دیکھ لو۔کیونکہ لمبے عرصے کے لیے تم ان سے دور رہنے والی ہو۔" مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔دل ایک دم سے تڑپ اٹھا۔تو جدائی کا وقت ایک مرتبہ پھر آ پہنچا تھا۔۔۔

لیکن یہ سب اٹل تھا۔، مہر جانتی تھی، اس کے پاس اب دوسرا راستہ موجود نہ تھا۔وہ اپنی ماں کو جی بھر کے دیکھنے لگی۔آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تیار ہو؟" شمس نے پوچھا۔مہر نے آنکھیں بند کیں اور اپنی گردن جھکا لی۔

"کیا واقعی میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں؟" وہ آواز میں تکلیف سموئے بولی۔

"ہاں۔نہیں ہے۔" شمس بے دردی سے جواب دینے لگا۔مہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔اس کی ماں اس کے دشمنوں کے پاس رہنے والی تھی۔دل میں خوف سوار تھا۔مگر اسے یہ سب کرنا تھا۔اسے اپنی ماں کو چھوڑنا ہو گا۔اسے اپنے دشمنوں کو برباد کرنے کے لیے احمد پہ بھروسہ کرنا تھا۔وہ اس سب کے لیے تیار تھی۔

اس نے اپنی گردن اٹھائی۔اپنی پلکیں آنکھوں کے احاطے سے ہٹائیں۔اب کی بار اس کی آنکھوں میں آگ تھی۔

مہر بنت عبداللہ سلطان ایک پہاڑ بن چکی تھی۔وہ ٹوٹنے والی نہیں تھی۔وہ گرنے والی نہیں تھی۔جو چاہے وہ لوگ کر لیتے، وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ان سب کو وہ اب برباد کر کے ہی دم لے گی!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر کی آنکھوں میں پٹی بندھی ہوئی تھی۔وہ شمس کے ساتھ اس کی ویگن میں سوار تھی۔دونوں ویگن کی پچھلی نشست پہ بیٹھے تھے۔درمیان میں فاصلہ تھا۔مہر کے چہرے پہ سکوت تھا، لیکن دل میں طرح طرح کی لہریں ابھر کے معدوم ہو رہی تھیں۔وہ اپنی ماں کو چھوڑ آئی تھی۔۔۔دل میں خدشات بھرے پڑے تھے۔

”میری ماں کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بولی، جیسے درخواست نہیں بلکہ حکم دے رہی ہے۔

”جب تک تم ہمارے احکام مانتے رہو گی ہم تمہیں چوٹ پہچانے کا سوچیں گے بھی نہیں۔“ شمس بولا۔

”میں بتا رہی ہوں شمس۔ میں کانٹوں سے گزر کے اپنی ماں سے ملی تھی۔ اور اب اگر تم لوگوں نے انہیں کچھ کیا تو میں قسم کھاتی ہوں کہ تم سب کو جیتے جی زمین میں گاڑ دوں گی۔“ مہر کا انداز شعلہ باز تھا۔ وہ دانت پیستے سختی سے بولی تھی۔ شمس پہ مہر کی دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ زور سے ہنسنے لگا۔

”اچھی لگتی ہو جب یوں غصہ کرتی ہو۔ کیوٹ۔“ شمس قہقہہ بلند کرتے ہی بولا۔

”خیر۔ میں تمہارے دوسرے موبائل سے احمد کو کال ملا رہا ہوں۔ تم اس سے صاف صاف کہہ دینا کہ تمہیں ہیرے مل گئے ہیں۔ تم اسے یہ بھی کہہ دینا کہ اب تمہیں اس کے ساتھ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا۔ اور پھر موبائل واپس مجھے دے دینا۔“ شمس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ وہ مہر کا وہی موبائل تھا جو احمد نے اسے دیا تھا۔ لیڈی اقتدار کے چیلوں نے مہر کے قصر کی تلاشی لی تھی تو اس وقت انہیں یہ موبائل مل گیا تھا۔

”یہ فون ہمیں تمہارے قصر کی تلاشی لیتے وقت ملا تھا۔ اب چلو، اسے وہی سب کہو جو میں نے کہا ہے۔“ مہر نے مختصر سا سر ہاں میں ہلایا۔

اس کے چہرے پہ مختصر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر اگلے لمحے اس نے اپنے چہرے کو نارمل کر لیا۔ شمس نے کال ملائی اور فون اسپیکر پہ کیا۔ کچھ دیر ٹو ٹو کے بعد احمد نے کال اٹھالی۔

احمد اپنے آفس میں کچھ مصروف تھا۔

"احمد آپ کہاں ہیں؟" مہر فوراً بولی۔ شمس مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

آفس میں بیٹھا احمد یہ سنتے ہی چونک اٹھا۔اس کے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ بکھری۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ایک ہفتے پہلے:

احمد اور مہر فارم ہاؤس سے واپسی کے راستے پہ گامزن تھے۔احمد اب اسے اگلی کچھ ہدایات دینے لگا۔

"ہو سکتا ہے انہیں ہمارے فونز کے بارے میں علم ہو جائے۔" احمد کچھ سوچتے ہوئے اچانک سے بولا۔ مہر نے گردن موڑ کے ایک سرسری سی نظر احمد پہ ڈالی۔

"کیا بات کر رہے ہیں۔یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔" مہر کچھ بوکھلا گئی تھی جب کہ احمد پر سکون تھا۔

"نہیں۔اگر کبھی آپ کو مجھے یہ اشارہ کرنا ہو کہ فون ان کے پاس ہے۔یا وہ ہماری گفتگو سن رہے ہیں تو آپ نے بات کا آغاز اس سوال سے کرنا ہے: کہاں ہو احمد؟ٹھیک؟" مہر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"ویل ڈن مہر! مجھے آپ سے اسی طرح کی امید تھی۔" احمد دل ہی دل میں بولا۔ اسے مہر کی کارکردگی پہ فخر محسوس ہو رہا تھا۔

"آفس میں ہوں۔ آپ بتائیں، ہیروں کا کچھ پتا چلا؟" احمد پر سکون سا ہو کے بولا۔ شمس کے ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے ہوئے۔ چہرہ اب نارمل تھا۔

"جی۔ مجھے ہیرے مل گئے ہیں۔ ایک ویئر ہاؤس تھا ڈیڈ کا۔ وہاں سے مل گئے۔" مہر پر اطمینان ہو کے بولی۔ آواز مصنوعی تشکر آمیز سی تھی۔

"ویئر ہاؤس۔ ہنہہ؟" احمد نے سوچا۔ بولا کچھ نہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

"اوہ۔ آپ مجھے بھی لے چلتیں۔ میں نے کہا تھا ہم ہیروں کی تلاش میں جہاں بھی جائیں گے ساتھ جائیں گے۔" احمد بولا۔

"نہیں بس۔ فوراً خیال آیا تو چلی گئی۔ آپ کی مدد کا بہت شکریہ۔ کبھی کوئی مدد چاہیے ہو تو میں حاضر ہوں۔" مہر کا انداز خوشگوار سا تھا۔

"دیکھئے مہر۔ ہم آگے بھی مل کے کام کر سکتے ہیں۔ شاید آپ کو ہیروں پر بس نہیں کرنی چاہئے۔" احمد کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہار رہا ہو۔ شمس کی آنکھوں میں چمک اترنے لگی۔

"نہیں احمد۔ مجھے بس ہیرے ہی چاہیے تھے۔ آپ کا بہت شکریہ۔" شمس نے جارحانہ طور پہ کال کاٹ دی۔ اس کی باچھیں کھل اٹھیں تھیں۔ اس کے نزدیک احمد کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ شمس نے ایک پر سکون سانس خارج کی۔ سب پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" مہر بولی۔ شمس زیر لب ہنس دیا۔

"کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پہ سب بتادوں گا۔" شمس نے کہا۔ وہ اب بالکل پر سکون تھا۔ اس کا کام یہاں پہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہیں ٹھیک وقت پہ سب بتادوں گا۔"

وہ تینوں عافیت زندگی کی بیسمنٹ میں واقع اس سفید کمرے میں موجود تھے۔ آج کمرے میں گول میز بھی تھی جس پہ ایک اسپیکر رکھا گیا تھا۔ اسپیکر شمس کی شرٹ پہ لگے ایک مائیک سے کنیکٹڈ تھا۔ اس کے باعث وہ مہر اور شمس کی ہر گفتگو سن پا رہے تھے۔

سب نے آخری فقرہ سن کے سکون بھری سانس خارج کی۔ شمس نے اپنا کام بخوبی نبھایا تھا۔

"اب دونوں کو الگ کرنا آسان ہونا چاہیے۔" درانی ٹیک لگاتے بولا۔ لیڈی اقتدار کے ماتھے پہ بل تھے۔ وہ گہری سوچ میں لگتی تھی۔ کچھ تھا جو اسے اب بھی کھٹک رہا تھا۔

"جب تک مہر دبئ نہیں چلی جاتی تب تک ہم مطمئن نہیں ہو سکتے۔ احمد نے اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔" لیڈی اقتدار کی پر اطمینان آواز گونجی۔ درانی نے سرعت سے سر اوپر نیچے ہلایا۔ احمد نے واقعی اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا تھا، اس نے سوچا۔

نیلوفر گہری سوچ میں تھی۔ اس نے سر جھٹک کے کچھ بولنے کے لیے اپنے لب کھولے۔

”ہوسکتا ہے کہ احمد کو اندازہ ہو گیا ہو کہ مہر دباؤ میں آ کے یہ سب کہہ رہی تھی۔“ نیلوفر نے اپنی تھیوری پیش کی۔

”بہت حد تک یہی ممکن ہے۔اس لیے درانی تم مہر کے گھر کے آس پاس پہرا بڑھا دو۔اگر وہ واقعی اس بارے میں جانتا ہے تو وہ مہر سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔اسے بس ہمارے پلان کی بھنک تک نہیں پڑھنی چاہئے۔مہر کا بغیر کسی خلل کے دبئی پہنچ جانا ضروری ہے۔“لیڈی اقتدار حکم جاری کر کے کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے لیڈی۔سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہی ہو گا۔“ درانی تابعداری سے بولا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کالی اندھیری رات عبداللہ سلطان کے قصر کے اوپر پھیلی ہوئی تھی۔منظر پہ لگی بتیوں کے باعث وہ دراز سا قصر بھرپور چمک رہا تھا۔

مہر اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھی۔وہ کرسی پہ بیٹھی شیشے کی دیوار کے پار کا منظر دیکھ رہی تھی۔اسے سیاہ آسمان نظر آرہا تھا۔اندھیرے آسمان پہ چودھویں کا چاند بھی نظر آرہا تھا۔آج آسمان پہ ستارے نہیں تھے اور چاند تنہا تھا۔وسیع آسمان پہ تنہا، اوراکیلا بھی۔۔۔بالکل اسی کی طرح۔وہ بھی اکیلی تھی اپنے دراز سے قصر میں۔ڈیڈ چلے گئے، ماں سے ملی، اتنے سالوں بعد ان سے قربت محسوس کی۔۔۔لیکن، وہ بھی اس سے دور ہو گئیں۔وہ ایک بار پھر اکیلی رہ گئی تھی۔وہ کرسی سے ٹیک لگا کے آنکھیں بند کر گئی۔اس کے چہرے پہ واضح تکلیف تھی۔روح بے چین تھی۔

"کیا کچھ اب بھی ہونا باقی ہے میرے اللہ؟" وہ آبدیدہ سے لہجے میں شکایت کرنے لگی۔"یا اللہ کیا میری تکلیف ختم ہوگی بھی؟" وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔اس کا دل بھرنے لگا تھا۔وہ ہر چیز سے لا تعلق ہونے لگی تھی۔

ٹھیک اسی وقت اس کی گود میں پڑا موبائل بجنے لگا۔مہر نے اسے اٹھایا۔ شمس کالنگ۔مہر ہڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔اس نے تیزی سے کال اٹھائی اور فون کان سے لگایا۔

"اپنی ماں سے بات کرنی ہے؟"شمس کی آواز سن کے مہر کا دل جیسے اچھل کود کرنے لگا۔

"ہاں۔" مہر کی آواز میں لرزش تھی۔کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"مہر! آپ ٹھیک ہیں ناں؟" شمائلہ کی متفکر آواز دوسری طرف سے گونجی تھی۔ مہر کچھ لمحوں کے لیے ساکن ہوگئی۔اس سے کچھ بھی بولا نہ گیا۔آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور آبشار کی صورت میں آنسوں پھوٹ پھوٹ کے بہنے لگے۔

"میں آپ کو آزاد کروا لوں گی ماں۔"مہر کی آواز بھری ہوئی تھی۔"ہم ایک ساتھ رہیں گے ماں۔میں اب آپ سے دور نہیں رہنا چاہتی۔" مہر نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔ وہ بلکتے ہوئے اپنی ماں کو امید دلانے لگی۔

"اوہ مہر! آپ کیوں رو رہی ہیں۔" شمائلہ آواز میں تکلیف لیے بولیں۔مہر کی بھری ہوئی آواز سن کے ان کے دل پہ جیسے خنجر چلنے لگے۔

"اس طرح سے نہ روئیں، ہمارا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ آپ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہیں؟ بس اس وقت ہماری آپ سے ملاقات ہوئی تھی وہی کافی تھی۔ ہم اس وقت مکمل ہو گئے تھے۔ ہماری روح پہ لگے زخم بھر گئے تھے۔" شمائلہ نے نرمی سے کہا۔ پریشان وہ بھی بہت تھیں۔ ایک نئی جگہ پر اچانک سے قید ہو جانے پر وہ بہت خوف ذدہ بھی تھیں۔ مگر شمائلہ ایک مضبوط اور صابر خاتون تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماں تھیں، جس کے سامنے اس کی بچی تکلیف سے بلک کے روئے جا رہی تھی۔ وہ اپنی ہر تکلیف مہر کی تکلیف دہ آہ سن کے بھلا بیٹھی تھیں۔

"ہم ملیں گے ماں۔ آپ کی مہر آپ کو نکال لے گی۔ ہم جتنا وقت اس زندگی میں ایک دوسرے سے محروم رہے ہیں، ہم اتنا ہی وقت اب ساتھ رہ کے گزاریں گے۔ آپ کو میں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔" مہر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہم جانتے ہیں۔ آپ ہلکان نہ ہوں۔ ہمیں یقین ہے آپ ہمیں نکال لیں گی۔ اور ہم یہاں پر ٹھیک ہیں۔ ہمیں کھانا مل رہا ہے۔ ہماری ضروریات کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ ایک بوڑھے وجود کو کیا چاہیئے ہوتا ہے؟ آپ

پر سکون ہو جائیں۔" شمائلہ نے مہر کو دلاسا دینا چاہا۔

مہر کے گلے میں گلٹی بن کے معدوب ہوئی۔ ایک بار پھر سے چہرہ رندھا ہوا سا ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دیں ماں۔ میں نے آپ کے اوپر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔" مہر کا نفس بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اس کا نفس اسے ملامت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"مہر! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔" شمائلہ نے جیسے ڈھیروں آنسو اپنے اندر اتارے۔"ہم نے آج تک آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔اور ویسے بھی ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔ آپ بھی چھوڑ دیں۔ جس آزمائش میں خدا آپ کو ڈالے اسے پورے دل کے ساتھ قبول کرلیں۔لوٹنا آپ نے اسی رب کے پاس ہے۔تو کیوں آپ خود کو ہلکان کر رہی ہیں؟"شمائلہ کا انداز اپنائیت سے لبریز تھا۔اور پھر جیسے کسی نے ان کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔

"بس اب بہت ہو گئی ڈرامے بازی۔تم سو جاؤ۔میں بس جلد ہی ملنے آؤں گا۔" شمس جیسے اکتا گیا تھا۔ کال اب کٹ گئی تھی۔

مہر گیلے چہرے کے ساتھ اسی طرح سے منجمد رہی۔آنسو اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔۔۔

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ

(سورہ فجر آیت ۱۶:۱۵)

اس وقت مہر کے دماغ میں ایک دم سے سورہ فجر کی یہ دو آیات ابھریں۔اس نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

**"مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا**

**اور جب وہ اُس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا"**

مہر نے ان آیات کا ترجمہ مدھم آواز میں دہرایا۔اس کے لب اداس سی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ اس کے سینے میں ایک خوشگوار سا احساس بھرنے لگا۔

"یا اللہ۔ماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔مجھے شکایتیں نہیں کرنی چاہیے۔مجھے اس آزمائش کو قبول کر لینا چاہیے۔ یہ سمجھ کے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کی اجازت سے ہو رہا ہے۔میں ان لوگوں جیسا نہیں بننا چاہتی جیسے ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔میری زندگی میں ایک وقت تھا جب ہر طرف بے فکری تھی۔ میں جس چیز پر ہاتھ رکھتی وہ خرید سکتی تھی۔میں ملک ملک سفر کیا کرتی تھی۔اور اگر آپ نے مجھ سے وہ سب لے لیا ہے تو مجھے اس سب کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔میرے اللہ، بس آپ مجھے اس آزمائش سے جلد نکال لیں۔میں وعدہ کرتی ہوں میں شکایتیں کرنا چھوڑ دوں گی۔اور میں اپنی مصیبتوں کا سامنا کروں گی۔میری مدد کریں میرے رب۔" مہر کی آنکھیں نم تھیں۔اس کے دل کو قرار آنے لگا۔وہ بالکل پر سکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم اسلام آباد پہ چھائی اس تاریک رات میں اپنا رخ ایک لکڑی کی دو منزلہ عمارت کی طرف موڑتے ہیں جو کہ پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔عمارت کے ارد گرد درجنوں گارڈز بندوق تانے کھڑے تھے۔ آس پاس کوئی گھر نہ تھا، بس وہ عمارت ہی تھی اور جنگلی درخت۔

رات کے اس پہر صرف جنگلی جانوروں کی عجیب و غریب آوازیں ہی گونج رہی تھیں۔عمارت کی نچلی منزل پہ ایک کمرہ تھا جس پہ سنگل بیڈ تھا جہاں شمائلہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پہ خوف سا تھا۔

نیلوفر ہاتھ باندھے شمائلہ کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔شمائلہ نے شکایتی نظر شمس پہ ڈالیں۔

"ہمیں تھوڑی دیر اور بات کرنے دیتے۔" وہ اداسی سے بولیں۔ شمس کی آنکھوں میں غصہ اترنے لگا۔ وہ شمائلہ کی طرف لپکا اور ان کے بال کھینچنے لگا۔شمائلہ کی درد بھری چیخ اس کمرے میں گونجی۔

شمائلہ کی در بھری چیخ و پکار نیلوفر کے کانوں میں پڑی۔اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ان چیخوں نے اس کی روح کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔وہ جیسے برف کی ہو گئی۔اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔اس چیخ نے اسے کسی اور زمانے میں بھیج دیا تھا۔۔۔کسی اور وقت میں۔۔۔جب وہ چودہ سال کی تھی۔۔۔

اس کی ماں بستر پہ بیٹھی ہوئی تھی۔نیلوفر کی چاچی انہیں بالوں سے جکڑتے ہوئے، انہیں نہ جانے کون کون سے طعنوں سے نواز رہی تھی۔نیلوفر کے وجود میں انگارے برسنے لگے۔وہ اپنی چاچی کی طرف بڑھی اور انہیں زور سے دھکا دیا۔چاچی اس اچانک وار کے لیے تیار نہ تھی اور فوراً ہی زمین پہ ڈھیر ہو گئی۔نیلوفر ان کے اوپر بیٹھ کے ان کے منہ پہ تھپڑ برسانے لگی۔اس کے وجود میں بھڑکتی آگ کو تسکین ملتی گئی۔وہ غصے سے پاگل ہونے لگی تھی۔وہ اپنی چاچی کو یوں ہی مارتے گئی۔۔۔

حال کی نیلوفر کا وجود بھی غصے سے کپکپا رہا تھا۔اس نے اپنے ہاتھ مٹھی میں بھینچ لیے۔وہ جارحانہ انداز میں شمس کی طرف بڑھی اور اس کی ناک کی طرف زور دار مکہ مارا۔شمس کے لیے یہ وار نہایت غیر متوقع تھا۔

شمس ہکا بکا سا ہو کے نیلوفر کو دیکھنے لگا۔اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔نیلوفر نے ایک زور دار تھپڑ شمس کے منہ پہ رسید کیا۔شمس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح لال ہو گیا۔اب نیلوفر نے شعلہ باز نگاہیں شمس کے شرمسار سے وجود پہ گاڑیں۔اس نے شہادت کی انگلی شمس کے اوپر اٹھائی۔

"اگر تم نے آئندہ ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا تو میں تمہیں کچا چبا جاؤں گی!" وہ دانت پیستے ہوئے شمس کو دھمکی دینے لگی۔"سمجھے!" نیلوفر چلائی۔"اب دفع ہو یہاں سے۔" وہ انگلی سے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے بولی۔شمس چہرے پہ بے یقینی اور خوف کے ملے جلے تاثرات لیے کمرے سے نکل گیا۔

نیلوفر کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔اسے خود بھی سمجھ نہ آسکا کہ اس پر یہ جنون کا غلبہ کیوں چڑھا تھا۔نیلوفر کے ہاتھ اب ڈھیلے پڑے۔اس نے پلٹ کے شمائلہ کو دیکھا جو کہ آنکھوں میں معصومیت لیے پلکیں جھپکا رہی تھیں۔وہ کافی سہمی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔وہ انہیں دیکھ کے بے اختیار مسکرا دی۔

"آپ ڈریں نہیں۔میں آپ کو کچھ نہیں کروں گی۔" نیلوفر نے نرمی سے کہا تو شمائلہ کے چہرے پہ چھایا خوف سرکنے لگا۔

"آئندہ کبھی وہ پھسلے تو آپ بے جھجک ہو کے مجھے بتانا، میں اس کا اس سے بھی برا حال کروں گی۔"

شمائلہ نے متذبذب سے انداز میں سر اثبات میں ہلایا۔

نیلوفر نے قدم ان کی طرف بڑھائے۔وہ چہرے پہ مدھم سی مسکراہٹ لیے شمائلہ کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے کو دیکھنے لگی جس پہ جہاں بھر کی تھکان تھی۔

"آپ ہمیں اچھی لگیں۔ہمیں یوں بچانے کا بہت شکریہ بیٹی۔"شمائلہ نرمی سے مسکراتے ہوئے مشکور سے انداز میں بولیں۔

"بیٹی؟" وہ الجھ کے زیر لب بڑ بڑائی۔وہ شمائلہ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔آنکھوں میں ستائش لیے وہ ان کی نورانی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔میں بہت بری ہوں۔بہت زیادہ۔" نیلوفر چہرے پہ اداس مسکراہٹ سجائے بولی۔

"مجھے یوں اچھا نہ کہیں۔" نیلوفر خود پہ ہی طنزیہ سا ہنس دی۔شمائلہ اپنا سر نفی میں ہلانے لگیں۔

"کوئی انسان برا پیدا نہیں ہوتا ہے بیٹی۔آپ کے اندر جو اچھائی کا گوشہ ہے وہ ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ حصہ قید ہے، وہ حصہ اس قید سے جان چھڑانا چاہتا ہے، اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔وہ گوشہ آپ کو بار بار کہتا ہے کہ کسی طرح سے اس دنیا سے بھاگ جاؤ، لیکن آپ کے مطابق واپسی کے سارے راستے تو بند ہیں۔ہم صحیح کہہ رہے ہیں ناں؟" نیلوفر ششدر سی ہو کے انہیں

دیکھتی رہ گئی۔اس کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلنے لگی۔وہ سست روی سے کھڑی ہوئی۔چہرے پہ تناؤ بڑھتا چلا گیا۔اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" نیلوفر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔شمائلہ مسکرائیں۔

"تجربہ میری بیٹی۔کیا یہ سچ نہیں کہ آپ اس زندگی سے فرار چاہتی ہیں؟" شمائلہ کی آنکھوں میں امید سی تھی، وہ ان پر امید آنکھوں سے نیلوفر کو بھی امید کا راستہ دکھانا چاہتی تھیں۔نیلوفر تیزی سے سر نفی میں ہلانے لگی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے۔" کرب سے آنکھیں میچ کر وہ تیز قدم بڑھاتے کمرے سے نکل گئی۔آج کسی نے اسے پڑھ لیا تھا۔

کوئی تھا جو اسے دیکھتے ہی اس کے اصل کو جان گیا تھا۔نیلوفر کے لیے یہ سب بے حد غیر معمولی تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر کی آنکھ کمرے میں داخل ہوتی دھوپ سے کھلی۔آج وہ کچھ زیادہ ہی دیر سو گئی تھی۔اسے سب سے پہلا خیال عنایا کا آیا۔اتوار کے دن وہ حسام کے ساتھ رکی تھی اور اب پیر تھا، کچھ دیر میں اسے عنایا کو پک کرنا تھا۔وہ بستر سے اٹھی اور غسل خانے کی طرف جانے لگی، اسی دوران اس کی نظر سنگھار میز پہ پڑی۔سنگھار میز پہ ایک پارسل رکھا ہوا تھا جس پہ ایک کارڈ لگا یا گیا تھا۔مہر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، اس پارسل کی طرف لپکی اور اسے بغور دیکھنے لگی۔اس نے نوٹ پڑھا۔

"کال می۔"

مہر نے جارحانہ انداز میں اس پارسل کو پھاڑنا شروع کیا۔اس نے قینچی کا استعمال کرنے کی زحمت نہ کی اور بس اپنے ناخنوں سے ہی اس پارسل کی ریپنگ کو چیرنے لگی۔وہ جیسے اس پارسل کی بہت وقت سے راہ تک رہی تھی۔

اندر موبائل تھا، بٹنوں والا چھوٹا سا موبائل۔مہر نے اسے کھولا تو اس میں احمد کا نمبر موجود تھا۔مہر نے بغیر کچھ سوچے احمد کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگالیا۔کچھ دیر بعد احمد نے کال اٹھالی۔

"کیسے ہیں مہر؟" اس کی آواز سنتے ہی مہر کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑ لی۔اس کے دل کو جیسے قرار آنے لگا۔کم سے کم اب وہ اکیلی نہیں تھی۔

"احمد!" مہر گہری سانس لیتے بولی۔چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر در آیا۔وہ اسے بہت کچھ بتانا چاہتی تھی۔

"کیا ہوا ہے مہر؟ بتائیں۔" احمد متفکر ہو کے بولا۔

"میری ماں کو لے گئے وہ۔میں کیا کروں؟ میں بہت شدید پریشان ہوں احمد۔" مہر کی آواز گیلی تھی۔ احمد کی فکرمندی میں اضافہ ہوا۔

"ایک سیکنڈ۔سب سے پہلے تو پر سکون ہو جائیں۔مجھے شروع سے سب کچھ سننا ہے، ہر ایک تفصیل جاننی ہے۔" احمد سنجیدہ ہو کے بlo„ ولا۔مہر نے اپنی نم آنکھیں پونچھیں۔گہری سانسیں لیتے وہ اپنے آپ کو پر سکون کرنے لگی۔

"مجھے ایک خط آیا تھا۔۔۔"مہر نے شروع سے احمد کو سب کچھ بتایا۔اس نے احمد کو ایک ایک چیز تفصیل سے بتائی۔احمد بھی سب کچھ غور سے سنتے گیا۔

"آپ کے مطابق خط بالکل ویسا ہی تھا جیسے آپ کی ماں لکھتی تھیں۔کیا آپ کے پاس کہیں اپنی ماں کے خط موجود ہیں؟" احمد نے پوچھا۔

"ہاں۔میری الماری میں ہی ہیں۔" مہر بے چین سے انداز میں جواب دینے لگی۔

"میرا اندازہ درست تھا۔کوئی آپ کے گھر آیا تھا۔اس نے ان خطوط کا جائزہ لیا اور ایک بے عیب سا ریپلیکا تیار کیا۔ماننا پڑے گا، یہ لوگ پرفیکشنسٹ ہیں۔" وہ متاثر کن سے انداز میں بولا۔یہ بھی کوئی متاثر ہونے کا وقت تھا؟ مہر نے سوچا۔

"آپ فون اسپیکر پہ رکھتے ہوئے ہی کسی ملازمہ سے پوچھیں، کہ پچھلے دنوں کوئی آیا تھا۔"

مہر موبائل مٹھی میں دبوچتے کمرے سے باہر نکلی۔اسے ریلنگ کے پاس پوچھا لگاتے ہوئے ایک ملازمہ نظر آئی۔

"سنیں۔کیا پچھلے دنوں کوئی میری غیر موجودگی میں آیا تھا؟" مہر نے پوچھا۔ملازمہ دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے یاد کرنے لگی۔

"جی۔نیلوفر میڈم اپنا کچھ سامان لینے آئیں تھیں۔" ملازمہ کہہ کر دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔مہر کی آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیلنے لگیں۔تو نیلوفر۔۔۔واقعی؟ مہر سکتے میں آگئی تھی۔اسے نیلوفر کے لیے شدت سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

اگر نیلوفر کے متعلق دل میں کوئی شک تھا بھی تو وہ اس لمحے دور ہوگیا تھا۔اسے اب نیلوفر کی برائی پہ یقین ہوگیا تھا۔

وہ کیسے اس کے ساتھ شانہ بشانہ چلا کرتی تھی؟ اس کا مورل سپورٹ بنتی تھی؟ سب جھوٹ تھا؟ سراب تھا؟ مہر کو رہ رہ کے غصہ آرہا تھا۔اسے اپنا دل کرچی کرچی ہوتا محسوس ہوا۔وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں لوٹی۔اس کا ہر انداز بجھ گیا تھا۔

"اب اگر آپ کے کوئی شک و شبہات تھے بھی تو وہ دور ہو جانے چاہیے۔نیلوفر بھی آپ کے دشمنوں سے ملی ہوئی ہے مہر۔" احمد تائیدی انداز میں بولا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" مہر کا انداز روکھا سا تھا۔دل اچانک سے مرجھا گیا تھا۔

"انہوں نے کہا تھا وہ آپ سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں۔آپ کو اس کام کی تفصیلات ملیں تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ٹھیک؟" احمد جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" مہر نے کہا تو احمد نے کال کاٹ دی۔

مہر نے فون کان سے جدا کیا اور سنگھار میز پہ رکھا۔اس نے مڑ کے اپنے خالی بستر پہ دیکھا۔اسی جگہ پہ جہاں عنایا سویا کرتی تھی۔اسے اپنی بچی یاد آرہی تھی، لیکن۔۔۔لیکن فی الحال وہ اسے وقت نہیں دے سکتی تھی۔ان صورتحال میں بہتر یہی تھا کہ وہ حسام اور مرینا کے سپرد رہتی۔

مہر اگلے لمحے حسام کو کال ملاتی نظر آرہی تھی۔وہ اس سے عنایا کو پورا ہفتہ رکھنے کی بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

f☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

راحیلہ صدیقی ایک پرجوش اور توانا جرنلسٹ تھی جس نے اپنی زندگی کے آٹھ سال (HumanTrafficking)انسانی اسمگلنگ کے مافیا کے اوپر ریسرچ کرنے میں لگائے۔اس وقت مناج ُحسام اور درے کے ساتھ راحیلہ صدیقی کے چھوٹے سے دفتر میں موجود تھی۔راحیلہ سربراہی کرسی پہ بیٹھی تھی، مخالف سمت تین کرسیاں رکھی گئی تھیں۔بیچ والی پہ مناج تھی، دائیں طرف حسام اور بائیں طرف در فشاں۔حسام اور در فشاں کی گود میں نوٹ بک تھی اور ہاتھوں میں پین۔وہ سب کسی ضروری سلسلے میں یوں مل رہے تھے۔

”پہلے تو میں آپ سب کو تحریک حرر فاؤنڈیشن کی اوپننگ پہ ڈھیر ساری مبارکباد پیش کروں گی۔“ اپنے چہرے پہ مودب سی مسکراہٹ سجائے راحیلہ تکلفانہ سے انداز میں ان سب سے مخاطب ہوئی تھی۔”آپ لوگ ایک عظیم کام کر رہے ہیں۔ایک ایسے مسئلے کے اوپر روشنی ڈال رہے ہیں جس پر روشنی ڈالنا بہت ضروری ہے۔اس سب میں میں آپ کی جتنی ہو سکے اتنی مدد کرنا چاہوں گی۔“وہ سینے پہ ہاتھ رکھتے خوش دلی سے بولی۔مناج پھیکا سا مسکرا دی۔

”بہت بہت شکریہ راحیلہ۔آپ ایک بہت بہادر اور دلیر جرنلسٹ ہیں۔اور آپ کا ساتھ ہمارے لیے باعث فخر ہے۔“ مناج اپنے مشینی انداز میں بولی۔”ہم در اصل اعضاء کے غیر قانونی کاروبار کو ایکسپوز کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔اسی سلسلے میں ہمیں لگتا ہے کہ آپ کی ریسرچ ہماری بہت مدد کر سکتی ہے۔ہمیں اندازہ ہے کہ اعضاء کا یہ مافیا ہیومن ٹریفکنگ کے مافیا سے جڑا ہوا ہے۔ہمارے اس اندازے میں کتنی سچائی ہے؟“بات سمیٹ کے مناج جواب طلب نگاہوں سے راحیلہ کو دیکھنے لگی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔جہاں تک میری ریسرچ ہے، یہ بہت حد تک ممکن ہے۔مناج آپ ہی بتائیں، میں کہاں سے بتانا شروع کروں۔" راحیلہ نے نرمی سے کہا۔

"آپ ہمیں جہاں سے بھی بتانا چاہیں، وہاں سے بتائیں۔" مناج سننے کے لیے تیار تھی۔حسام اور درے بھی لکھنے کے لیے تیار لگتے تھے۔

اور راحیلہ۔۔۔وہ بھی بولنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پاکستان میں یہ کافی مقامات پہ ہورہا ہوتا ہے۔پنجاب ان جگہوں کا سب سے بڑا سینٹر ہے۔یہ کام کسی پوش علاقے میں بنے گھر میں بھی ہوسکتا ہے یا کسی گاؤں دیہات میں واقع حویلی میں۔اس کام کے لیے مقید ایک ایسے ہی گھر پہ ہم سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔۔۔

گھر کے باہر دو گارڈز پہرا دے رہے تھے۔ایک چھوٹا سا باغیچہ عبور کر کے گھر کی عمارت میں چبوترے کے ذریعے اندر داخل ہوتے تھے۔اندر آتے ہی بہت سے خوبصورت، چمکتے دمکتے چہرے نظر آتے تھے۔کچھ مسکراتے ہوئے۔کچھ اداس سے۔کچھ کی آنکھیں نم۔اور کچھ خوش ہونے کا محض ناٹک ہی کر رہے تھے۔

اس گھر کے مکین اپنی بد قسمتی سے بخوبی واقف تھے۔وہ جانتے تھے کہ ان کا اس قید خانے سے رہائی کا کوئی امکان نہ تھا۔اگر وہ کچھ کرتے تو مار دئے جاتے۔اب ان کے پاس یہ دوزخ ذدہ زندگی گزارنے

کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔خوشی سے جیتے، یا اپنے آپ کو ملامت کر کے۔۔۔ تھی تو یہ زندگی ہی۔۔۔ اور جینی بھی ان سب نے ہی تھی!

**"(انیس سو ستر تک پاکستان میں ریڈ لائٹس ایریا کافی عام تھے۔مگر پھر ضیاء الحق نے ان ریڈ لائٹ ایریاز پر پابندی نافذکی۔اور اس طرح یہ کام وہاں پہ ختم ہوگیا۔مگر انسان بہت چالاک چیز ہے۔اس کے لیے برائی کا ایک راستہ بند ہو تو وہ اور راستے تلاش کر لیتا ہے۔اور ایسا ہی ہوا۔اب میں تمہیں ماڈرن ڈے ریڈ لائٹ ایریاز کے بارے میں بتاتی ہوں۔جو کہ در حقیقت ریڈلائٹ ایریاز نہیں بس ان کا کردار ادا کرتے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ ان سب کو یہ دو ٹکے کے سیاست دان سپورٹ کرتے ہیں اور اس لیے ہیومن ٹریفکنگ کا مافیا اتنا مضبوط ہے، کیونکہ اس سب کے پیچھے طاقتور امراء اور پالیٹیشنز ہیں۔پولیس ہو یا کوئی دوسری طاقت، ان کے ہر کسی کے ساتھ تعلقات ہیں۔یہاں پر عورتیں بہت طریقوں سے لائی جاتی ہیں۔گاؤں دیہات کے علاقوں سے کبھی انہیں خریدہ جاتا ہے۔ کبھی انہیں اغواء کیا جاتا ہے۔کبھی انہیں خوابوں کے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔بس یہ سمجھ لو کہ جو چیز سالوں پہلے کھلے عام ہورہی تھی اب بس بند دروازوں کے پیچھے ہو رہی ہے۔)"**

یہ ایک دیہاتی علاقے کا منظر لگتا تھا۔

یہ ایک کمرہ تھا جسے آفس جیسا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔چھت پہ چھپڑا ڈالا ہوا تھا۔اس کچے پکے آفس میں ایک میز رکھی ہوئی تھی جس کے ارد گرد تین کرسیاں تھیں۔ماحول میں گیلی مٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

اسی آفس میں دو شخص کسی گفتگو میں مگن تھے۔ایک اس آفس کا انچارج اور ایک شخص اس گاؤں کا رہائشی تھا۔

"سر مگر ویزا کیوں نہیں لگتا۔" گاؤں کے اس رہائشی کے ماتھے پر مایوسی کے بل تھے۔

"بھائی میرے، مسئلے ہی اتنے ہیں۔پیسے ہی اتنے لگتے ہیں۔اب بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔" آفس کے انچارج نے کہا۔اس کے انداز میں مصنوعی سی ہمدردی تھی۔

"سب گھر والے بڑی آس لگائے بیٹھے ہیں۔میرے استنبول جانے سے جیسے ان سب کے مسئلے حل ہو جائیں گے۔میں انہیں کیا منہ دکھاؤں میرے بھائی۔" وہ دیہاتی لب و لہجے میں بات کرتا تھا۔ وہ اس وقت بہت پریشان نظر آرہا تھا۔اس نے اپنی آنکھوں میں نہ جانے کتنے ہی خواب سجائے ہوئے تھے، اور اچانک سے سارے خواب کرچی کرچی ہوتے نظر آرہے تھے۔۔۔

"اچھا چل۔میں تجھے ایک دوسرا راستہ بتاؤں گا۔" انچارج کے چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ بکھری۔

"تو ایلیگل طریقے سے چلا جا۔آسان ہے۔پیسے بھی کم۔اور محفوظ بھی۔ اور جلدی پہنچ جائے گا۔ بتا؟" وہ نوجوان گہری سوچ میں پڑ گیا۔کیا واقعی یہ ایک اچھا رراستہ تھا؟ وہ جانتا نہ تھا۔

**"(اب میں آپ سب کو ہیومن سمگلنگ کے ایک دوسرے طریقے کے بارے میں آگاہ کرتی چلوں۔آپ سب واقف ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان ایمپلائیمنٹ یعنی بے روزگاری ہے۔اسی مسئلے کا استعمال کر کے ان کو جال میں پھنسایا جاتا ہے۔میں بتاتی ہوں یہ سب کیسے ہوتا ہے۔انسٹا یا فیس بک پر پیجز بنائے جاتے ہیں۔اور عارضی طور پہ جگہ جگہ آفیسز کھولے جاتے**

ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لوگ کم پیسوں میں، آسان طریقے سے نوجوانوں کو باہر کے ملک بھیج سکتے ہیں۔ جیسے ترکی، ملائیشیا یا کوئی سا بھی اور ملک۔ یہ لوگ نوجوانوں کے کچے ذہنوں سے کھیلتے ہیں، انہیں یہ تاثر دیتے ہیں کہ باہر کے ملک جانے سے ان کا ہر مسئلہ حل ہوجائے گا۔ اور پھر جب ان سب میں باہر جانے کا جنون آجاتا ہے تو یہ انہیں مایوس کر دیتے ہیں۔ لیگل طریقے سے باہر جانا مشکل بنا کے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر اِلیگل طریقے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان سے پیسے بٹورتے ہیں، اور پھر انہیں چور راستوں سے ملک سے باہر نکالتے ہیں۔" اس لمحے در فشاں کا لکھتا ہاتھ تھم گیا۔ وہ بالکل ساکن پڑ گئی۔ اس کا چہرہ سفید ہونے لگا۔ اچانک اسے فیروز یاد آیا۔ اس کا پیارا بھائی۔ جو اسے ایک انسٹا پیج کے بارے میں بتاتا تھا۔۔۔ جو اسے بتاتا تھا کہ ایک آفس تھا۔۔۔ اور ایک دن وہ خط چھوڑ کے چلا گیا۔۔۔ در فشاں کو لگا جیسے سالوں پرانی پہیلی آج حل ہونے لگی تھی۔

"اور پھر کیا ہوتا ہے؟ یعنی یہ لوگ انہیں باہر ملک لے جاتے ہیں؟" حسام نے لکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ چلے جاتے ہیں اور کچھ مار دئے جاتے ہیں۔" اور درے کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ سالوں پرانے راز سے آج پردہ اٹھنے لگا تھا۔۔۔ کیا ممکن تھا اس کا بھائی بھی اس ہی مافیا کے ہاتھوں مارا گیا؟

"مار دئے جاتے ہیں؟ یہ بہت مشکل نہیں ہوجاتا ہوگا؟" حسام نے ایک بار پھر سے سوال کیا۔ راحیلہ بھی تحمل سے اس کے ہر سوال کا جواب دینے لگی۔

"نہیں وہ لوگ بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ اکثر وہ بیچ سمندر میں پوری کی پوری کشتیاں الٹا دیتے ہیں۔ اور اکثر کو ایسے ہی مار دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے اس طرح سے اپنا جرم چھپانا کوئی مشکل کام نہیں۔" راحیلہ آگے اور بھی بولنا چاہتی تھی مگر وہ سمجھ گئی تھی کہ حسام کچھ اور پوچھنے لگا تھا تو وہ تھم گئی۔

"مگر وہ پیسے لے کر ہی کیوں نہیں بھاگ جایا کرتے؟" حسام کے اندر موجود نرڈ جاگ گیا تھا۔

"یہ زیادہ رسکی ہوگا۔اس طرح سے لوگ احتجاج کریں گے اور لوگوں میں شعور پیدا ہوگا۔شعور ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔شعور ان سب کا کاروبار تباہ کر سکتا ہے۔اور اس لیے ان کا ان نوجوانوں کو چور راستوں سے لے کر جانا زیادہ آسان ہے۔" راحیلہ نے موضوع سمیٹا، اب وہ اگلی بات پہ آئی۔)

وہ ایک گودام تھا۔۔۔لیکن انسانوں کا۔۔۔!

شہر سے کافی دور تھا،اور ایسے علاقے میں تھا جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ادھر ڈھیر سارے گارڈز پہرا دے رہے تھے۔اس بڑے سے گودام کی طرف ایک نیلی شرٹ والا بندہ چلتا آرہا تھا۔اس کے ہاتھ میں کچھ فائلز تھیں۔اسے گارڈز نے نہیں روکا۔گودام کے دروازے کے پاس ایک سفید شرٹ میں ملبوث بندہ بیٹھا تھا۔

"ہاں کیا ہوا۔"سفید شرٹ والے بندے نے پوچھا۔

"یہ فائل بڑے ہسپتال سے آئی ہے۔میچ ڈھونڈو اور بتاؤ۔کل صبح تک یہ چار میچز روانہ کردینا۔" نیلی شرٹ والے نے لاپرواہی سے بتایا۔سفید شرٹ والے نے فائلز پکڑیں اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تو بہت عام ہیں۔مل جائیں گے۔" سفید شرٹ والے نے فائلز پڑھتے ہوئے کہا۔

ان سب کے لیے یہی زندگی کا معمول تھا۔۔۔اس ویئر ہاؤس میں مقید انسانوں کی، ان کے نزدیک اب کوئی زندگی نہیں تھی۔وہ ان کے لیے بس ایک بکاؤ مال تھے۔۔۔

"(ہومن ٹریفکنگ اعضاء کے لئے بھی کی جاتی ہے۔ کبھی لوگوں کی مرضی سے ان کے اعضاء خریدے جاتے ہیں کبھی زبردستی ان سے چھین لیے جاتے ہیں۔ہم اس اعضاء کے کاروبار کو سمجھنے سے پہلے ملک کے قانون کو دیکھتے ہیں۔ملک کا قانون یہ کہتا ہے کہ اگر کسی کو اعضاء چاہیے ہو تو وہ اپنے خاندان کے کسی فرد سے ہی لے سکتا ہے۔اس کے علاوہ وہ کسی سے بھی اعضاء نہیں لے سکتا۔یہ قانون اس لیے موجود ہے تاکہ اگر کوئی کسی کو زبردستی اٹھا کے لے کر آئے اور یہ تاثر دے کہ وہ اپنی مرضی سے سب کر رہا ہے تو ایسا کرنے والا شخص کامیاب نہیں ہو۔اور اس قانون کی پاس داری تمام ہسپتال ہی کرتے ہیں سوائے کچھ کے، جو کہ اس کاروبار میں ملوس ہیں۔ان کے بہت کنیکشنز ہیں۔ان کو پولٹیشنز کی سپورٹ ہے اس لیے یہ سب بہت طاقت ور ہیں۔جگہ جگہ سے لوگوں کو اغواء کیا جاتا ہے۔کبھی گاؤں دیہات جا کر لوگوں کو اکسایا جاتا ہے کہ وہ پیسوں کے بدلے اپنے اعضاء بیچیں۔امیر ممالک کے امراء ان کے بہت بڑے کلائنٹ ہیں۔ڈارک ویب کے ذریعے ساری ڈیلنگز کی جاتی ہیں۔)"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مناج اپنی گاڑی سے اپنے گھر جا چکی تھی۔حسام در فشاں کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

در فشاں فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔حسام نے در فشاں کا یہ بجھا بجھا سا انداز بھانپ لیا تھا۔

"یہ سب کتنا بھیانک ہے ویسے۔" حسام نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"بہت۔۔" درے کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی گہرے خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔حسام نے در فشاں کے اوپر تشویش بھری نظر ڈالی۔

"آپ نے اپنے بھائی کو سب بتایا درے؟" حسام نے پوچھا۔

"نہیں فی الحال تو نہیں۔" درے کا انداز بجھا ہوا تھا۔

"مگر کیوں؟ آپ کو اپنے بھائی کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔آپ ایک خطرناک کام کر رہی ہیں، لیڈی اقتدار کے سامنے ڈبل ایجنٹ بننے کا ناٹک کر رہی ہیں، آپ کے بھائی کا یہ سب جاننا فرض ہے۔"حسام نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔

"اس نے تردید ہی کرنی ہے۔وہ بہت پروٹیکٹو ہے۔" درے کچھ بیزار سی نظر آ رہی تھی۔

"تو کیا ہوا؟ وہ آپ کا بھائی ہے۔اسے منائیں گی تو وہ مان جائے گا۔آپ دونوں فیملی ہیں،اس لیے کسی سے کچھ بھی نہ چھپایا کریں۔" حسام نے کہا تو درے بے دلی سے مسکرائی۔

"شاید، چیزیں چھپانا ہماری رگوں میں دوڑتا ہے۔وہ بھی ایسا ہی ہے۔بہت سی چیزیں ہیں جو مجھے نہیں بتاتا۔"حسام مختصر سا مسکرا دیا۔

”آپ کچھ بوجھل لگ رہی ہیں۔سب خیریت؟“ حسام سے بھی رہا نہیں گیا اور بالآخر وہ بول اٹھا۔درے نے سر نفی مین ہلایا۔چہرے پہ واضح کرب تھا۔حسام کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

”تین سال پرانی پہیلی آج حل ہوئی ہے حسام۔میرے لیے یہ سب بہت غیر معمولی ہے۔“ درے نے کھوئے ہوئے انداز میں حسام کو بتایا۔حسام نے اس سے پہلے در فشاں کو اتنا ڈسٹرب کبھی نہیں دیکھا تھا۔اس کی آنکھوں میں درے کے لیے فکرمندی چھانے لگی۔

”آپ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔شاید آپ کا دل ہلکا ہو جائے۔“ حسام نے نرمی سے کہا۔در فشاں کے چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ بکھری۔وہ بھی گھنٹوں لوگوں کو سنا کرتی تھی، اور آج کوئی تھا جو اسے سننا چاہ رہا تھا۔در فشاں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”میرے ایک بھائی تھے،فیروز۔“ درے کی آواز گیلی تھی۔مگر وہ روئی نہیں۔وہ احمد کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں رویا کرتی تھی۔

”وہ تین سال پہلے کہیں کھو گئے تھے۔اور آج معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔وہ بھی یہی کہتے تھے۔ایک انسٹا پیج ہے۔ایک آفس ہے۔جس کے ذریعے وہ استنبول جائیں گے۔اور ایک رات، وہ اچانک سے غائب ہو گئے۔ہم نے بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔اب دل تسلیم کرنے لگا ہے کہ فیروز بھائی نہیں رہے۔وہ بھی اس مافیا کے ہاتھوں یقینا مارے گئے ہیں۔“ درے کا لہجہ غمگین تھا۔مگر وہ روئی نہیں۔حسام کی آنکھیں بھی اداس رنگوں میں جھلسنے لگی تھیں۔

"آپ زیادہ ہلکان نہ ہوں۔ بلکہ آپ اب ذیادہ پر سکون رہیں گی۔ یقیناً آپ کے دل میں ایک خلش سی ہوتی ہوگی، ایک سوال ہمیشہ رہتا ہوگا کہ آپ کے بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اور وہ سوال آپ کو بے چین کر دیتا ہوگا۔ آج کے بعد یہ بے چینی آپ کے راستے میں قدم نہیں رکھے گی۔اب آپ پہلے سی بھی زیادہ کھل کے جینے کی کوشش کریں گی۔" درے زیر لب ہنس دی۔واہ! وہ جو سب کو تھیراپیز دیا کرتی تھی، آج اسے بھی کوئی تھیراپی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔درے دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"آپ ابھی فارغ ہیں ناں؟" حسام درے سے مخاطب ہوا۔

"جی۔ کوئی کام؟"

"پھر ہم کہیں چلتے ہیں۔ آپ کا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔اور میرا بھی گھومنے کا دل کر رہا ہے۔ بتایئے چلیں گی؟" حسام کا انداز پر خلوص تھا۔درے کا انکار کرنے کا دل نہیں چاہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ کہاں جائیں گے؟" درے نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"چلیں، راول لیک چلتے ہیں۔ بچپن میں ڈیڈ کے ساتھ آیا کرتا تھا۔" حسام نے پرانے وقتوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔درے بھی خوشگوار سا مسکرا دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

راول لیک اسلام آباد کا ایک بہت ہی خوب صورت سیاحی مقام ہے۔راول لیک کے ارد گرد کے ماحول کو کافی خوشگوار سا بنایا گیا ہے۔ادھر لکڑی کے پل بنائے گئے ہیں، جن پہ چڑھ کے سیاح راول لیک کے نیلے پانی کو دیکھ سکتے ہیں۔خوبصورتی سے کاشت کی گئی گھاس جگہ جگہ نظر آتی ہے جو دیکھنے والے

کو مسحور کر دیتی ہے۔ جگہ جگہ palmtrees بھی اگائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ بیٹھنے کے لیے بنچز بھی رکھے گئے ہیں۔ راول لیک کے آس پاس پتھروں سے مختلف راستے بنائے گئے ہیں۔ ہر راستے کے دائیں اور بائیں جانب پتلے پتلے پولز ہیں جو کہ چیس کے موہروں کی مشابہت دیتے ہیں۔

حسام اور درے ایسے ہی ایک پتھروں کے بنے راستے پہ چلتے آ رہے تھے۔ درے نے کالی شرٹ پر جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی اور آنکھوں پر اس کے موٹا چشمہ تھا۔ بال سلیقے سے پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے جو کہ ہوا کے باعث اس کے کندھے کی طرف جھول رہے تھے۔ حسام نے سفید شرٹ اور جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر اس کے نظر کا چشمہ تھا پر درے جتنا موٹا نہیں۔ کالے بادل ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور تیز ہوائیں دونوں کے وجود سے ٹکراتی گزر رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی اس خوشگوار سے موسم سے کافی محظوظ ہو رہے تھے۔

"کتنا خوب صورت موسم ہے۔" درے نے بادلوں کو دیکھتے کہا تو حسام مسکرایا۔

"بس امید ہے کہ یہ آپ کا موڈ بہتر کر سکے۔" حسام کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری۔

"موڈ تو اسی وقت بہتر ہو گیا تھا جب آپ نے ساتھ چلنے کی آفر دی تھی۔" درفشاں نے نرمی سے کندھے اچکا دیے۔ حسام خود میں ہی ہنسنے لگا۔

"اوہ۔ یعنی پھر مجھے آپ کو یہاں لا کر اپنا پیٹرول ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔" دونوں مدھم سا ہنس دیئے۔

چلتے چلتے دونوں راستے کے بند حصے تک پہنچے اور وہاں سے وہ ندی کا صاف اور شفاف پانی دیکھنے لگے۔ادھر سے ہی کافی دور انہیں ہری بھری سی پہاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ندی میں کچھ لوگ بوٹ رائیڈنگ کر رہے تھے۔حسام کا دل بھی بوٹ رائڈنگ کرنے کو چاہا۔

"آپ بوٹ رائڈنگ کرنا چاہیں گی؟" حسام نے درے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میں نے اس سے پہلے نہیں کی۔تو اب نہیں کرنا چاہوں گی۔" درے نے صاف انکار کر دیا۔

"ایک دفعہ ٹرائی تو کیجیئے۔" حسام نے درے کو راضی کرنے کی کوشش کی۔

"اب میں تیس کی ہوگئی ہوں۔اب دل وہ چیزیں ٹرائی کرنے کا نہیں چاہتا جو کبھی نہ کی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔تیس کا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی جینا چھوڑ دی جائے۔"درے مسکرا دی۔

"اب ایسی بات نہیں کہ میں ایک بور انسان ہوں۔بس اب کچھ نیا کرنے کا دل نہیں چاہتا۔" در فشاں کچھ دیر بعد بولی۔

"ایک دفعہ میرے کہنے پر کر لیں۔مزہ نہیں آیا تو ہم فوراً واپس آجائیں گے۔ٹھیک؟" اور ایک دفعہ پھر، حسام کے پرخلوص انداز کی وجہ سے درے انکار نہ کر سکی۔اس نے مسکرا کے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" در فشاں بالآخر مان ہی گئی۔

اور پھر دنوں بوٹ رائڈنگ کے لیے بوٹ میں اترے۔درے نے اسپورٹس شوز پہنے تھے تو اس کے لیے بوٹ میں اترنا مشکل نہ تھا۔اس کے اترتے ہی بوٹ پانی میں مختصر سا جھومنے لگی۔درے کے دل

میں لہریں ابھرنے لگیں۔اس نے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ حسام کو دیکھا جو کہ مسکراہٹ کو دبا رہا تھا۔

"ڈریں مت۔کچھ نہیں ہوتا۔" حسام نے بوٹ میں اترتے ہوئے کہا۔حسام کے اترتے ہی بوٹ مزید ڈگ مگ ہوئی۔درے کی گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"یہ لیں جیکٹ پہن لیں۔" حسام نے درے کی طرف نارنجی لائف جیکٹ بڑھائی۔درے نے حسام کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔اس کے چہرے پہ واضح گھبراہٹ تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا یہ محفوظ نہیں ہے؟" درفشاں کچھ مضطرب سی ہو گئی تھی۔

"فکر نہ کریں۔یہ بس فورمیلٹی ہے۔" حسام نے کہا۔درے پر سکون نہ ہوئی۔اس نے بے دلی سے لائف جیکٹ پہنی اور بوٹ پہ سوار ہو گئی۔درے آگے تھی اور حسام اس کے پیچھے، وہ دونوں اس طرح سے بیٹھے تھے کہ درے کی حسام کی طرف پشت تھی۔

دونوں نے چپو گھمانا شروع کیے۔درے کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا۔اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات تھے۔اس کا دماغ بوٹ رائیڈنگ سے منسلک ہر منفی شے سوچنے میں مگن تھا۔اسے گزرے وقتوں میں بوٹ رائیڈنگ سے ہونے والے ہر حادثات یاد آنے لگے۔دل ڈوبتا چلا گیا۔

ان ہی خیالات میں، وہ بے دھیانی میں، غلط رخ میں چپو گھمانے لگی۔اس کے باعث کشتی پانی میں عجیب و غریب طرز میں جھومنے لگی۔درے دل ہی دل میں پہلا کلمہ پڑھنے لگ گئی۔

"دوسری طرف چلائیں۔کوئی بات نہیں ابھی سب نارمل ہو جائے گا۔" حسام پیچھے سے بولا۔درے نے کپکپاتے ہاتھوں سے درست رخ میں چپو گھمایا۔

بوٹ اب سیدھا سیدھا پانی میں اپنا راستہ بنانے لگی۔اور جس طرح سے بوٹ اس نیلے پانی میں اپنی راہ بناتے چلے جا رہی تھی درے کی گھبراہٹ میں بھی کمی آتے گئی۔کچھ لمحے بعد گھبراہٹ منظر عام سے غائب ہوگئی، اب وہ پرسکون سی ہونے لگی تھی۔اسے چپو گھمانے میں مزہ آنے لگا۔ایک الگ ہی مزہ تھا بیچ ندی میں چپو اس طرح سے گھمانے کا۔چپو پانی سے ٹکراتا تو ایک خوبصورت سی نرم صحبت کی حامل آواز پیدا ہوتی تھی۔آواز کانوں میں رس گھولتی تھی اور دل کو بھی قرار بخشتی تھی۔بے پناہ سکوت ماحول میں چھایا ہوا تھا۔

"بس شروع میں تھوڑا مشکل تھا۔" درفشاں بالکل پر سکون ہو کے بولی۔

"اور پھر جب اس کی عادت ہوگئی تو یہ بہت اچھا لگنے لگا۔بہت حسین۔"

"سچ میں بہت حسین۔" حسام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔وہ کسی گہرے خیال میں تھا۔

یہ ندی سے آتی، چپو کے ٹکرانے کی خوبصورت آواز تھی یا یہ درے کا ساتھ تھا جو اس کے دل کو اتنا سکون بخش رہا تھا؟ حسام نے سوچا۔

وہ دونوں، اس ہموار سی خاموش ندی کے نیلی پانے میں بوٹ چلاتے گئے۔ندی کے پانی میں دو سفید ہنس بھی نظر آئے جو ان کی کشتی کے عقب میں ہی پانی میں تیر رہے تھے۔وہ دونوں عجب سے ان خوبصورت پرندوں کو دیکھتے گئے۔

انہیں دور ہی واقع ہری بھری پہاڑیاں بھی یہاں سے دکھائی دے رہی تھیں۔پہاڑیوں کے اوٹ میں سورج دکھائی دے رہا تھا جو آسمان سے رخصت ہوجانے کی تیاری کر رہا تھا۔۔اندھیرا پھیل جاتا، اس سے پہلے ہی دونوں واپس مڑ گئے۔

بوٹ رائیڈنگ کرنے کے بعد وہ دونوں زمین پہ واپس آئے۔درے کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔دونوں کے دلوں میں خوشگوار سا احساس سمایا ہوا تھا۔

"اب قریب میں میرا فیورٹ رول والا ہے۔جب بھی آتا ہوں تو ان کے رول ضرور کھاتا ہوں۔اب تو وہ بہت بوڑھے بھی ہو گئے ہیں۔آئیں چلتے ہیں۔" وہ پتھریلے راستے پہ واپسی کی راہ پہ گامزن تھے جب حسام بولا تھا۔

درے اس کے پیچھے چلنا شروع ہوئی۔ایک چھوٹا سا اسٹال تھا جس کے پیچھے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ حسام نے دو رول بنوائے۔ایک درے کو دیا اور ایک خود کھایا۔

"یہ واقعی بہت مزے کا ہے۔" درے نے رول کا لقمہ بھرتے کہا۔رول میں چٹپٹا سا چکن تھا جس پر کوئلے کا داغ لگایا گیا تھا۔ساتھ میں کھیرے ٹماٹر تھے، اور ایک دہی اور مایو سے بنایا گیا، گارلک ساس تھا جو کہ چکن کے چٹپٹے ذائقے کے ساتھ توازن قائم کرتا تھا۔

"کہا تھا ناں۔" حسام نے لقمہ بھرتے ہوئے کہا۔

رول ختم کر کے دونوں پھر سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔بالآخر ایک خوبصورت شام کا اختتام ہوا تھا، خوبصورت اور حسین شام، شام جو درفشاں اور حسام جلد بھولنے والے نہ تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات اس لکڑی کی دو منزلہ عمارت پہ پھیل چکی تھی۔ ہوا کے باعث پاس جنگلی درختوں کے پتوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ٹھنڈی سی سرد ہوا عمارت کے احاطے پہ سوار تھی۔

لکڑی کی اس عمارت کے ارد گرد آج بھی گارڈز کا پہرا کافی سخت تھا۔

شمائلہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کسی گہرے خیال میں لگتی تھیں۔ دروازے کے چرچرانے کی آواز آئی تو شمائلہ کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ جھٹکا کھا کے انہوں نے اپنا منہ دروازے کی طرف موڑا۔

اپنے چہرے پہ مسکراہٹ سجائے نیلوفر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاولوں کی پلیٹ تھی۔ نیلوفر کو دیکھتے ہی شمائلہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری، وہ جیسے نیلوفر کی ہی راہ تک رہی تھیں۔

نیلوفر نے چاولوں کی پلیٹ بستر پہ شمائلہ کے سامنے رکھی اور خود بھی بستر پہ ہی بیٹھ گئی۔

"آپ کو شمس نے دوپہر کا کھانا دیا؟" نیلوفر نے پوچھا۔ شمائلہ نے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے ہاتھوں سے ہی چاول کھانا شروع کیے۔

"اسے نظر انداز کریں شمائلہ۔ وہ بالکل بچوں جیسا ہے۔ کل آپ کی وجہ سے اسے میں نے پیٹ دیا اس لیے اس نے انتقاماً، کھانا نہیں دیا۔ شمس کا غصہ اسی کی طرح آپے سے باہر ہے۔" نیلوفر چہرے پہ کوفت لیے بولی تھی۔ شمائلہ نے کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ رات کا کھانا کھاتے گئیں۔

نیلوفر بھی خاموش رہی۔وہ جیسے کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن جانتی نہیں تھی کہ کچھ بولنا چاہیے تھا کہ نہیں۔جب شمائلہ نے کھانا ختم کر لیا تب نیلوفر نے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”شمائلہ، آپ نے کل کہا تھا کہ میں جرائم کی دنیا سے جانا چاہتی ہوں۔آپ نے نیلوفر کو درست پہچانا تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔لیکن شمائلہ۔“ نیلوفر اپنے اوپر استہزائیہ ہنسی ہنسی۔اس کی آنکھوں میں کچھ غمگین کر دینے والا تھا۔”نیلوفر اپنے لیے واپسی کا ہر دروازہ بند کر کے آئی ہے۔میں ایک کے بعدایک، برے سے برا جرم کرتے گئی۔میں اپنے لیے تمام دروازے بند کر چکی ہوں۔اور میرا گوشہ جو مجھے بار بار اس دنیا سے جانے کی تلقین کرتا ہے؟ میں اسے جھڑک کے چپ کرا دیتی ہوں۔“ نیلوفر اداس سا مسکرا دی۔دل میں ٹیسیں سی اٹھ کر معدوم ہو رہی تھیں۔دل کے گہرے راز تھے جو آج وہ یوں ہی کسی کو بتانے لگی تھی۔ شمائلہ کے چہرے پہ افسوس تھا، نیلوفر کے لیے ہمدردی تھی۔

”نیلوفر اندھیروں میں ڈوب چکی ہے شمائلہ۔وہ جکڑی جا چکی ہے۔“ نیلوفر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”آپ اپنی برائی میں کبھی خوش نہیں ہو سکیں گی۔“ شمائلہ نے نرمی سے کہا۔

”یہی تو بات ہے شمائلہ میں کبھی خوش ہی نہیں ہوتی۔“ نیلوفر استہزائیہ انداز میں بولی۔”اس سب سے پہلے جو زندگی گزار رہی تھی اس میں بھی نہیں تھی۔جب اس دنیا کا حصہ بنی تب بھی مطمئن نہ ہو سکی۔مجھے تو لگنے لگا ہے کہ یہ خوشی، اطمینان، سکون جیسے احساسات فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ وہ آنکھوں میں بے بسی اور لاچارگی لیے شمائلہ کو دیکھنے لگی۔

شمائلہ کے چہرے پہ آسودہ سا تاثر تھا۔وہ جیسے نیلوفر کی ہر الجھن کا جواب اپنے پاس رکھتی تھیں۔ انہوں نے ایک شفقت بھری نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔وہ شفقت بھری نگاہ جب نیلوفر نے دیکھی، تواسے لگا جیسے وہ موم کی بنی ہوئی تھی۔وہ پگھلنے لگی تھی، اسے اس وقت احساس ہوا کہ وہ بھی اس احساس کے لیے کتنا ترس رہی تھی، کہ کوئی اس سے پیار کرتا ہے، کہ کوئی اب بھی اس کے لیے شفقت رکھتا ہے۔نیلوفر آنکھوں میں حیرانی لیے شمائلہ کو دیکھ رہی تھی۔وہ ایک دفعہ پھر سے ان کے سحر کے زیر اثر کہیں کھونے لگی تھی۔

”آپ کو اب تک اطمینان اس لیے نہیں مل سکا نیلوفر، کیونکہ آپ غلط چیزوں میں سکون تلاش کرنے لگی تھیں۔“ شمائلہ سادگی سے بولیں۔نیلوفر کی آنکھوں میں الجھن در آئی۔

”نیلوفر اب برباد ہو چکی ہے۔بس!“ نیلوفر نے ہاتھ اٹھا کے حتمی سے انداز میں کہا اور منہ شمائلہ کی طرف سے پھیر لیا۔

”آپ ایک دفعہ پوچھیں اپنے آپ سے، کہ اگر آپ کے پاس واپسی کا راستہ موجود ہوتا تو کیا آپ اس سب کو چھوڑ نہ چکی ہوتیں؟“ شمائلہ نے نیلوفر کے چہرے پہ نظر گاڑی۔نیلوفر نے اپنا منہ شمائلہ کی طرف موڑا۔آنکھوں میں شمائلہ کے لیے حیرت تھی۔آنکھیں نم بھی تھیں۔ بہت سے جذبات بس اس ایک جملے نے جگا دیئے تھے۔نیلوفر نے سست روی سے سر ہاں میں ہلایا۔ آنسوؤں کا ایک پھندا اس کی آنکھوں سے نکلا۔

”بہت پہلے ہی!“ وہ گیلی سانس اندر کھینچتے بولی۔شمائلہ آسودہ سا مسکرا دیں۔

"تو ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ غلط گمان کرتی ہیں۔واپسی ممکن ہے۔ واپسی ہمیشہ ممکن ہوتی ہے نیلوفر۔ہمارا خدا، وہ رحیم ہے نیلوفر، وہ رحمن ہے۔وہ غفور ہے!" شمائلہ کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

"پھر اس خدا نے مجھ پہ اتنے ظلم کیوں ڈھائے؟ کیوں مجھ سے میری جائداد چھینی؟ جنہوں نے میری جائداد چھینی انہیں برباد نہ کیا؟ کیوں جنہوں نے میری ماں کو مارا انہیں برباد نہیں کیا؟ اس کا رحم تب کہاں تھا شمائلہ؟ اس کا عدل و انصاف اس وقت کہاں تھا؟" نیلوفر کے انداز میں شکایت تھی۔اس کے جذبات ابل ابل کے باہر آرہے تھے۔

شمائلہ نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا۔اپنے پیارے اللہ کے بارے میں یہ باتیں سننا مشکل ضرور تھیں لیکن شمائلہ نے صبر کی راہ کو چنا اور نیلوفر کے ناجائز شکووں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"آپ اس دنیا میں انصاف کی تلاش کیوں کرنے بیٹھ گئیں نیلوفر؟ جب اصل عدالت تو اس دنیا میں لگنی ہی نہیں ہے۔" شمائلہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھرنے لگی۔نیلوفر کچھ الجھی۔

"اللہ نے ظالمین کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے نیلوفر۔جو ظالم ہے اسے سزا مل کے ہی رہے گی۔اگر اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا میں۔اس دن نیلوفر، جہنم ہم سب کے سامنے لائی جائے گی۔زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔۔وہ کسی بھوکے شیر کی مانند نظر آئے گی۔"یہ سن کے نیلوفر کے دل میں کچھ ہوا تھا، شمائلہ کا انداز ہی ایسا تھا کہ ہر لفظ سیدھا نیلوفر کے دل پہ اثر کرتا تھا۔نیلوفر کی آنکھوں میں خوف کا گزر ہوا۔

"اور اس وقت ہوگا صحیح معنوں میں انصاف، نیلوفر۔خدااس وقت جس کو چاہے جہنم میں ڈال دے۔ جس کو چاہے جنت میں۔اور ہم انسانوں کے خدا کے فیصلوں پہ سوال کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ ہم اپنے خود کے اعمال میں جکڑے ہوں گے۔اس وقت صرف ہمیں اپنی فکر ہوگی، کہ بس کسی طرح سے ہمارے اعمال ہمیں جنت تک پہنچا دیں۔وہ دن گناہگاروں کے دل کو جھنجوڑ کے رکھ دے گا۔وہ جانتے ہوں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہونے والا ہے، مگر افسوس، تب بہت دیر ہوگئی ہوگی نیلوفر۔بہت دیر۔اور پھر وہی گناہگار اس دن اپنے رب کے حضور پکاریں گے:

"کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔(سورۃ فجر)"

کتنا ہی دردناک انجام ہے ناں یہ نیلوفر؟ پوری زندگی، لمبی طویل زندگی گزار کے بھی اس میں اپنے لیے کوئی ایسا کام ہی نہ کرنا جو کہ وہاں کام آئے۔کاش!کاش نیلوفر، ہم اپنے رب کی قدر اس دنیا میں ہی کرنا سیکھ جائیں، کاش! کاش، ہم اس کے پکارنے پہ اس کی طرف لوٹ آئیں۔"

شمائلہ نے اپنی بات سمیٹی۔ان کی آنکھیں گیلی تھیں۔نظر نیلوفر پہ پڑی تو انہیں ایک مختلف نیلوفر نظر آئی۔نیلوفر پہ ہیبت سوار تھی۔آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔وہ جیسے سکتے میں آگئی تھی۔اس لمحے اس کی پوری زندگی سوالیہ نشان بننے لگی تھی۔

نیلوفر ایک دم سے کھڑی ہوئی۔اس کا دل خوف کے مارے لرز رہا تھا۔وہ الٹے قدم اس کمرے سے بھاگ نکلی۔وہ کیسے مزے سے کہا کرتی تھی کہ اس کا درجہ ابلیس سے بھی نیچے ہوگا۔اب وہ سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کیا واقعی وہ جہنم کی آگ کی بھنک تک برداشت کر سکے گی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کالی رات اپنے اختتام کو پہنچی اور سورج آسمان پہ اپنے جلوہ افروز کے ساتھ پرواز کرنے لگا۔ مگر سورج کی پرواز زیادہ دیر نہ ٹکی، جلد ہی اسلام آباد کو گہرے بادلوں، اور ٹھنڈی نم ہواؤں نے گھیر لیا۔ گہرے سرمئی بادلوں کی اوٹ میں چھپا سورج اسلام آباد کے مکینوں پر اپنی کرنوں سے وار کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بے فیض۔

اس خوشگوار سی صبح میں ہم اپنا رخ مہر کے قصر کی طرف موڑتے ہیں جو کہ اپنی ازلی شان و شوکت میں ہی کھڑا تھا۔

مہر نے سفید کرتی پہنی ہوئی تھی جس پہ فلورل پرنٹ تھا۔ وہ پر اعتماد انداز میں اپنے گھر کے سبزہ زار میں چل رہی تھی۔ لان عبور کر کے باہر آئی تو اسے ٹنٹڈ شیشوں والی ویگن نظر آئی جس کے پچھلے دروازے کے ساتھ شمس کھڑا تھا۔

مہر بھی شمس سے ملنے ہی آئی تھی۔ اسے کچھ دیر پہلے ہی شمس کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ اچھا سا تیار ہو جانے کے بعد اپنے قصر سے باہر آئی۔

مہر نے گہری سانس خارج کی اور اس ویگن کی طرف چلنا شروع ہوئی۔ وہ ویگن کے بالکل قریب آ گئی۔ شمس کے چہرے پہ مکروہ سا تاثر تھا۔ اس نے پچھلی نشست کا دروازہ مہر کے لیے کھولا۔ مہر جھرجھری لیتے ہوئے ویگن کے اندر سوار ہو گئی۔

مہر بے دھیانی میں، کوفت زدہ آہیں بھرتے ویگن میں سوار ہوئی۔اسے احساس ہوا کہ اس کے برابر میں کوئی تھا۔۔۔کوئی بہت ہی شاندار سا۔مہر کی نگاہوں میں مشکوک سا تاثر ابھرا۔اس نے اپنی گردن موڑی۔۔۔وہ اسے دیکھنے لگی۔آنکھیں پھٹنے لگیں۔وہ جہاں تھی، جیسی تھی، وہیں تھم گئی۔

”کیسی ہو مہر؟“ تنی ہوئی گردن لیے، لیڈی اقتدار بولی تھی۔چہرے پہ تکبرانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔مہر کے چہرے پہ عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔”میں تم سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔“ وہ مصنوعی نروٹھے سے انداز میں بولی۔مہر کے الفاظ اس کے حلق میں ہی رہ گئے۔وہ بالکل سن رہ گئی۔اسے اندازہ نہ تھا کہ اس سارے کھیل کی ماسٹر مائنڈ، اندھیرے اور بدی کی یہ سفاک ملکہ اس سے خود ملنے آئے گی۔۔۔!

”دیکھو۔کیا کرتی پھر رہی ہو تم۔“ وہ بے نیاز سے انداز میں بولی۔خفگی سے کندھے اچکائے۔مہر ٹکٹکی باندھ کے لیڈی اقتدار کو ہی گھورے جا رہی تھی۔”لیکن، تم جو کر رہی ہو اس کا نقصان صرف اور صرف تمہاری ماں کو ہی پہنچے گا مہر!“ لیڈی اقتدار ہر لفظ پہ زور دیتے بولی۔انداز میں واضح دھمکی تھی۔مہر کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔

”تم احمد سے اب بھی بات کر رہی ہو۔“ مہر ذرا سا چونکی۔تو وہ سب جانتے تھے۔۔۔مہر نے سوچا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے ہم یہ سب نہیں پتا لگا سکتے؟ تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ میں تمہیں بتا رہی ہوں مہر کہ اگر اپنی ماں اور اپنی پرواہ ہے تو اس احمد سے جان چھڑوالو۔“ لیڈی اقتدار دانت پیستے سختی سے بولی۔ مہر نے اپنی گردن سیدھی کی اور سامنے والی کرسی کی پشت پہ دیکھنے لگی۔اسے اب گاڑی کے تناؤ سے دوچار ماحول میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔

"وہ خود غرض انسان ہے مہر۔اسے تمہاری اور تمہاری ماں کی پرواہ نہیں ہے۔وہ صرف ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے اور بس۔اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے،اگر اسے تمہیں قربان کرنا پڑے تو وہ بے جھجک کر دے گا۔اسے اگر تمہاری ماں کو قربان کرنا پڑے تو وہ یہ بھی کر گزرے گا مہر۔ وہ ایسا کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگائے گا، اور تم کیا کر رہی ہو۔" لیڈی اقتدار نے استہزائیہ نظر مہر پہ ڈالی۔"تم اس کے پیچھے اپنی جان تو خطرے میں ڈال رہی ہو لیکن ساتھ ساتھ اپنی بوڑھی ماں کو بھی خطرے میں جھونک رہی ہو۔" وہ دانت پیستے بولی۔اس کے انداز میں کڑواہٹ تھی، احمد کے لیے شدید نفرت تھی۔

مہر آگے سے کچھ بھی نہ بول سکی۔وہ اس وقت الجھ سی گئی تھی۔کیا لیڈی اقتدار ٹھیک کہہ رہی تھی؟ کیا احمد واقعی ایسا تھا؟کیا وہ واقعی اسے قربان کر سکتا تھا؟ نہیں نہیں۔۔۔ وہ تو جس احمد کو جانتی ہے وہ تو ایسا دور دور تک نہیں کر سکتا تھا۔اس کا احمد ایسا تھوڑی تھا۔

مہر نے اپنے تمام خیالات کو جھڑکا۔وہ اپنے آپ کو نارمل کرنے لگی۔وہ لیڈی اقتدار کے سامنے قطعی گھٹنے ٹیک دینا نہیں چاہتی تھی۔

"شمس کہہ رہا تھا کہ، آپ سب لوگوں نے مجھ سے کوئی کام کروانا ہے، جس کے بعد میری ماں مجھے دے دی جائے گی۔مجھے ذرا اس کام کے بارے میں بتائیے۔" مہر اپنے آپ کو پر سکون کرتے بولی۔ لیڈی اقتدار نے اپنے سر کو جنبش دی۔چہرے پہ متاثر کن سا تاثر ابھرا۔آج اسے لگا جیسے وہ عبداللہ سلطان کی بیٹی سے مل رہی تھی، ٹو دا پوائنٹ اور صرف اپنی بات کرنے والی۔

"اب دیکھو، یہی بتانے تو مجھے یہاں تک آنا پڑا۔" ملکہ نے مصنوعی خفگی سے ناک سکوڑی۔"مہر، صرف یہ کام کرنا کافی نہیں ہو گا، یہ کام تمہیں احمد کی مداخلت کے بغیر کرنا ہو گا۔مجھے بھنک بھی پڑی کہ احمد

تمہارے آگے پیچھے ہے، تو تمہاری ماں کو مارنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کروں گی۔" لیڈی اقتدار نے مہر کو دھمکی دی۔مہر کا دل ڈوبنے لگا۔

"اور آسان موت نہیں۔اس کے میں پہلے سارے اعضاء نکالوں گی۔" لیڈی اقتدار سرگوشی کرنے والے انداز میں بولی۔چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ تھی۔مہر کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔یہ الفاظ اس کے کان میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترے تھے۔"اور اسے تکلیف دے دے کے ماروں گی۔تڑپا تڑپا کے۔اور پھر میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔میں تمہارا بھی حشر نشر بگاڑ دوں گی۔تمہیں اتنی تکلیف سے نوازوں گی کہ تم مجھ سے موت کی بھیک مانگو گی۔تم میرے سامنے گڑگڑاؤ گی۔مگر میں تمہیں ایک لمبے وقت کے لیے موت نہیں دوں گی۔تم بخوبی جانتی ہو کہ میں یہ سب کر سکتی ہوں۔"لیڈی اقتدار کہہ کے دبی دبی آواز میں ہنسنے لگی۔

مہر کے دل پہ لیڈی اقتدار کی دہشت سوار ہوگئی تھی۔وہ جس کے ساتھ بات کر رہی تھی وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔وہ ملکہ تھی اس مافیا کی جو کہ نا جانے کتنی زندگیاں برباد کر چکا تھا۔وہ ایک خطرناک عورت تھی۔ظالم اور سفاک عورت تھی۔مہر کو لیڈی اقتدار سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

"جیسا آپ بولیں گی ویسا ہی ہوگا۔" مہر ہار مانتے بولی۔وہ اس طاقتور شیطانی صفات کی حامل عورت سے بھلا کیسے جیت سکتی تھی؟اس کی ترجیح اس کی ماں کو چھڑانا ہی ہونی چاہئے تھی۔وہ اس معاملے میں احمد کے اوپر بھروسہ نہیں کر سکتی تھی، ذرا سی بھی نوک جھونک اس کی ماں کی موت کے مترادف تھی۔

لیڈی اقتدار فخریہ سا مسکرائی۔آنکھوں میں فاتحانہ تاثر تھا۔اب وہ مدعے پہ آنے لگی۔مہر کے اوپر کچھ حقائق عیاں کرنے لگی۔

"تمہارا باپ، ہم سب کے لیے منی لانڈرنگ کرتا تھا۔" اور مہر نے بے یقینی کے عالم میں لیڈی اقتدار کو دیکھا۔کیا وہ لوگ اس سے وہ کروانا چاہ رہے تھے جو وہ سوچ رہی تھی؟ اوہ خدایا۔ مہر کو ایک دم سے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔وہ اپنے سر پہ ایک نئ آفت منڈلاتے دیکھ سکتی تھی۔

"وہ یہ ہمارے لیے کرتا تھا، اور پالیٹیشنز کے لیے بھی۔مگر اس کی موت کے بعد اس کے اکاؤنٹس جام ہو چکے ہیں۔اور کیونکہ تم اس کی وارث ہو تو وہ اکاؤنٹس تم ہی کھول سکتی ہے۔" مہر کے چہرے پہ واضح خوف و گھبراہٹ دیکھ کے لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئ۔

مہر بے ساختہ سی ہو کے تیزی تیزی گردن نفی میں ہلانے لگی۔وہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگی۔

مہر کا یہ رد عمل دیکھ کے لیڈی اقتدار محظوظ ہو رہی تھی۔

"اس لیے ہمارا کالا پیسہ لے کر تم دبئ جاؤ گی۔دبئ میں تمہارے جو اکاؤنٹس ہیں ان میں وہ پیسہ تم ڈالو گی۔یہ کرنے کے بعد تمہارے اکاؤنٹس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھل جائیں گے۔اس کے بعد تمہیں ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔تم جیسے ہی دبئ سے واپس آؤ گی تمہاری ماں صحیح سلامت تمہیں واپس کر دی جائے گی۔" لیڈی اقتدار مہر کو دیکھنے لگی جس پہ ہیبت طاری ہو گئ تھی۔

"یہ جرم ہے۔میں یہ نہیں کر سکتی!" مہر بلند آواز میں زور دے کے بولی۔وہ ایک دم سے تڑپ اٹھی تھی۔لیڈی اقتدار لبوں پہ ہاتھ جما کے نزاکت سے ہنسنے لگی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" تمسخرانہ انداز میں لیڈی اقتدار بولی اور پھر سے ہنسنے لگی۔

مہر پھر سے سیدھی ہو کے بیٹھی۔ڈسٹرب سے عالم میں اس نے اپنی گردن جھکا لی۔چہرہ کھینچ گیا تھا اور ڈھیروں بل چہرے پہ نمایاں تھے۔مہر نے آنکھیں بند کیں۔وہ کتنی بری طرح سے پھنس چکی تھی۔۔۔ مہر اپنے آپ کو بے بس پانے لگی تھی۔

"ایک کال مہر۔ایک کال اور تمہاری ماں کو مار دیا جائے گا۔" لیڈی اقتدار نے انداز میں سختی برقرار رکھی۔وہ جان گئی تھی کہ یہ لڑکی اب ٹوٹ گئی تھی۔ان کا کام با آسانی ہو جائے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔کیا وہ واقعی مہر کو جانتی تھیں؟

مہر ہنوز آنکھیں بند کر کے گردن جھکائے بیٹھی رہی۔کیا واقعی اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا؟ کیا وہ اب بری طرح سے پھنس چکی تھی؟ نہ جانے اور کتنے تلخ حقائق پر سے پردہ اٹھنا باقی تھا۔اسے احمد یاد آنے لگا۔کاش وہ جان سکتا کہ یہ ظالم لوگ اس کے ساتھ کیا کرنے والے تھے، لیکن اب تو وہ اسے بتانے تک کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔وہ کتنی ہی بے بس تھی ناں۔۔۔ہے ناں؟

"سوچ لو مہر۔اچھے سے سوچ لو۔کچھ دنوں میں تمہاری ماں تمہارے ساتھ ہو گی، محفوظ اور خوش باش۔"لیڈی اقتدار چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ سجائے بولی۔

مہر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔اب اس نے اپنی گردن اٹھائی۔چہرے کا تناؤ سمٹ چکا تھا۔ہر بل ڈھیلا ہو چکا تھا۔

وہ مہر بنت عبداللہ سلطان تھی۔وہ اتنی آسانی سے کیسے ٹوٹ سکتی تھی؟ وہ اس سب کا بھی سامنا کر سکتی تھی، ہاں اکیلے ہی!

مہر نے گردن موڑ کے سرد نگاہ لیڈی اقتدار پہ ڈالی۔

”تیار ہوں۔“مہر بے تاثر انداز میں بولی تو لیڈی اقتدار کی باچھے کھل اٹھیں۔

”مجھے اچھا لگا۔۔“ لیڈی اقتدار کہتے کہتے رک گئی۔مہر کے انداز میں تھا جو اسے بری طرح سے ٹھٹھکنے لگا تھا۔وہ مشکوک سی نگاہیں مہر پہ مرکوز کرتے اس کا جائزہ لینے لگی۔مہر کے چہرے پہ مدھم مسکراہٹ دیکھ کے لیڈی اقتدار کے چہرے پہ چھائی مسکراہٹ سمٹ گئی۔یہ مسکراہٹ بہت ہی غیر متوقع تھی، بہت زیادہ۔۔۔!

”مگر، میری ایک شرط ہے!“ مہر کسی بزنس مین کی بیٹی کی طرح،انداز میں عیاری لیے بولی۔

لیڈی اقتدار کے چہرے کا ہر ایک زاویہ بگڑتا چلا گیا۔وہ اندھیرے اور برائی کی ملکہ تھی تو کیا ہوا۔۔۔ وہ جس لڑکی سے اس لمحے بات کر رہی تھی، وہ بھی اتنی آسانی سے ٹوٹنے والی تھوڑی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حرر کے آفس میں بھی کام اب رواں دواں تھا۔آفس کے اندر معمول کا رش تھا۔سوشل میڈیا ٹیم آنے والے ایک ایونٹ کی بہترین پروموشن کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

اسی میں ہم حرر کی بیک سائیڈ پہ بنے بنکر کا رخ کرتے ہیں۔بنکر کافی چھوٹا تھا۔زمین پہ لال فر والا کارپٹ بچھا ہوا تھا اور دیواروں پہ کالا پینٹ تھا۔بنکر کے بیچ و بیچ ایک چھوٹی سی گول میز رکھی گئی تھی۔

دیوار کے ساتھ ایک ڈیسک لگائی گئی تھی جس پہ کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔حسام کے ہاتھ میں کچھ پیپرز تھے جو کہ وہ غور سے جانچ رہا تھا۔

ان پیپرز پہ عافیت زندگی میں کام کرنے والے ہر ڈاکٹر اور نرس کا ڈیٹا تھا۔ یہ ڈیٹا احمد کی طرف سے بھیجے جانے والے ہیکرز نے جمع کیا تھا۔

"مل گئی!" حسام نے پیپر میز پہ پٹختے فاتحانہ سے انداز میں کہا۔درے اور مناج اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

"یہ لڑکی پرفیکٹ ہے۔پنڈی کے ایک پرانے علاقے میں رہتی ہے مگر اس کا بینک بیلنس بتا رہا ہے کہ یہ کچھ غلط ضرور کر رہی ہے۔یہ وکیشن پہ کہیں گئی ہے،اور کچھ دنوں میں اس کی واپسی ہے۔" مناج سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلانے لگی۔دوسری جگہ در فشاں بھرپور مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے۔ہم پھر اس کے گھر میں گھسیں گے۔ہمیں کسی نہ کسی طرح لویزا کے ہسپتال میں تو داخل ہونا ہی ہے۔" مناج نے سوچتے سمجھتے اپنے مشینی انداز میں فیصلہ سنایا۔

"مناج، مگر ہم اس کے گھر میں گھسیں گے کیسے؟" در فشاں نے پوچھا تو مناج مدھم مسکرا دی۔

"مجھے تالے توڑنے آتے ہیں۔اور مجھے لگتا ہے کہ تم لوگوں کو بھی یہ کام سیکھ لینا چاہیے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کی فجر قضاء ہوئی ہی تھی کہ مہر نے پیکنگ شروع کر دی۔وہ لوگ اسے جلد از جلد دبئی بھیجنا چاہ رہے تھے۔احمد سے راز داری اختیار کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

صبح باسی ہونے لگی تو مہر کو اپنے چھوٹے موبائل پہ ایک کے بعد ایک کال موصول ہونے لگی۔مہر نے دھڑلے سے ہر کال کو نظر انداز کیا۔

یہ کرتے ہوئے مہر کو دل ہی دل میں بہت برا بھی لگ رہا تھا۔کیا وہ احمد کے ساتھ ٹھیک کر رہی تھی؟کیا احمد اور وہ ٹیم نہیں تھے؟ احمد نے تو اس سے کہا بھی تھا کہ اسے سب بتائے، لیکن وہ فی الحال وہ مجبور تھی۔

احمد کی کالز اٹھا کے وہ اپنی ماں کی زندگی مزید خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔اس کی ہر چال پہ ان سب کی گہری نظر تھی۔اسے صفائی سے اپنا کام انجام دینا تھا۔اپنی ماں کی آزادی کے لیے،اور اپنی آزادی کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد اپنے کمرے کے بستر کے کنارے پہ بے چین سا ہو کے بیٹھا ہوا تھا۔ہاتھ میں چھوٹا موبائل دبوچے وہ بے چینی کے عالم میں اپنا پاؤں زمین پہ تھپتھپائے جارہا تھا۔چہرے پہ نہ جانے کتنے بل تھے۔اسے مہر پہ رہ رہ کے غصہ آرہا تھا۔وہ اچانک سے ایسا کیوں کرنے لگی تھی؟ وہ کیوں اس سے راز داری اختیار کرنے لگی تھی؟ احمد کو یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دھوکا دے دیا ہو۔وہ مہر سے بری طرح خفا تھا۔اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور اپنے گھٹنے پہ ماردی۔

اگلے لمحے وہ کھڑا ہوا۔چھوٹا موبائل اس نے ڈیسک پہ رکھا اور اپنا عام موبائل اٹھایا۔اپنی انگلیو ں کا تیزی سے استعمال کرتے ہوئے وہ کسی کو کال ملانے لگا۔کچھ دیر بعد کال اٹھا لی گئی۔

"ہاں ذالقرنین۔" کال اٹھ گئی تو احمد اپنے آپ کو نارمل کرتے بولا۔اندر سے وہ غصے سے کپکپارہا تھا۔

"ذرا چیک کرو قریب کے دنوں میں کسی مہر بنت عبداللہ سلطان کی کہیں فلائٹ تو نہیں؟"اس کی آنکھوں میں شک ابھرا۔

"جی احمد بھائی،ابھی کردیتا ہوں۔تھوڑی دیر ہولڈ کیجیے۔" ذو القرنین نے کہا۔احمد بھی بے چینی کے مارے ٹہلنے لگا۔

"جی۔مہر بنت عبداللہ سلطان۔" کچھ دیر بعد زالقرنین بولا۔"ان کی فلائٹ شام پانچ بجے کی ہے۔دبئ کی۔" احمد کو اس لمحے سانپ سونگھ گیا۔وہ اپنا سر پکڑتے رہ گیا۔اس کا اندازہ بالکل نشانے پہ جاکے لگا تھا۔وہ ہمیشہ سے ہی جانتا تھا وہ لوگ مہر سے یہی سب کروائیں گے۔احمد اضطراب کے عالم میں اپنی کنپٹی مسلنے لگا۔مہر کے لیے جہاں غصہ تھا وہاں تشویش بھی۔وہ اسے اپنے آپ کو آگ میں حوالے کرنے کیسے دے سکتا تھا؟

"سنو۔" احمد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔"میری بھی اسی جہاز پر فلائٹ بک کردو۔"اس کی آنکھوں میں شدید ناگواری تھی۔اب مہر کے خاطر اسے اپنا نیا نویلا آفس یوں اکیلا چھوڑ کے دبئ جانا پڑ رہا تھا۔اف۔۔۔احمد بس سانسیں بھرتا رہ گیا تھا۔

"اکونومک یابزنس؟" ذالقرنین نے پوچھا۔

"اکونمکس۔" احمد کی آواز میں کوفت سی تھی۔

”ٹھیک ہے بھائی ہو جائے گی۔یہاں آ کے ٹکٹس لے لینا مجھ سے۔“ ذالقرنین نے کہا تو احمد نے کال کاٹ دی۔اسے اس لڑکی کی وجہ سے نا جانے کیا کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔احمد نے لا محسوس انداز میں پیر پٹخا اور موبائل بیڈ کی طرف اچھالا۔

”ایسی کی تیسی۔میں بھی دیکھتا ہوں کیسے بھاگتی ہو مجھ سے۔“ احمد زیرِلب بڑبڑایا۔

اس نے ہڑبڑاہٹ کے عالم میں پیکنگ شروع کی۔اس کا دماغ گھوم چکا تھا۔جو کپڑے ملتے وہ اپنے بیگ میں ڈال دیتا۔اپنے کریڈٹ کارڈز اور ڈاکومنٹس سب اس نے سوٹ کیس میں اچھال دیئے۔اور پھر وہ سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑے کندھے پر بیگ پیک لٹکائے کمرے سے نکلا۔سیڑھیاں اترا تو در فشاں آئی لینڈ کچن میں مصروف تھی۔

”احمد اتنی جلدی میں کہا جا رہے ہو۔“ درے نے پیچھے سے پکارا۔

”وقت نہیں ہے آپا، تفصیل نہیں پوچھنا۔دبئ جارہا ہوں۔“ احمد نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔چہرے کا ہر زاویہ بگڑا ہوا تھا۔

درے بری طرح سے چونکی۔اسے لگا اس نے کچھ غلط سن لیا تھا۔

”دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟ ایسے کیسے منہ اٹھا کے دبئ جا رہے ہو؟“ در فشاں نے غصے میں کہا۔

”میرا پیچھا چھوڑ دو۔میرا سر ویسے ہی گھوما ہوا ہے۔کچھ الٹا سیدھا بول دوں گا پھر روتی رہ جاؤ گی۔“ احمد کا غصہ اس پہ حاوی ہونے لگا تھا۔درے بھی پھر احمد کی بہن تھی، ہو گئی آگ بگولہ۔

”دفع ہو۔“وہ بھی اپنے بھائی کی بد لحاظی بھلا کیوں برداشت کرتی؟

"ہاں ہاں۔دفع ہو۔" احمد اب دروازے کی طرف پہنچا۔

"کچھ کھا کے تو چلے جاتے۔" ایک لمحے میں وہ احمد کے لیے اپنی ناراضگی بھلا بیٹھی اور متفکر ہو کے کہنے لگی۔

"راستے سے بہت سامان لینا ہے ابھی تمہارا سڑا ہوا کھانا کھا کے اپنا وقت نہیں ضائع کر سکتا۔" یہ سن کے تو درے کی روح میں آگ سی لگ گئی۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" احمد سر جھٹکتے ہوئے بائیک پہ بیٹھا اور روانہ ہو گیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حسام کی گاڑی اسلام آباد کی سڑکوں پہ رواں تھی۔وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ڈرائیونگ کر رہا تھا جب کہ مناج اور درے پچھلی نشست پہ براجمان تھیں۔دونوں نے اوپر سے نیچے جلباب زیب تن کیے ہوئے تھے جس کے باعث وہ سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھیں۔

حسام کی گاڑی پھر پنڈی کے ایک پرانے سے علاقے میں داخل ہوئی۔

"پہنچ گئے۔" حسام نے گاڑی ایک پرانی عمارت سے دور پارک کی۔

**(وہ لوگ یہاں پہ عمارہ نامی نرس کے اپارٹمنٹ میں گھسنے آئے تھے۔عمارہ لیڈی اقتدار کے ہسپتال عافیت زندگی میں ہی کام کرتی تھی).**

"حسام اس بوڑھے چوکیدار کو باتوں میں لگا کے رکھنا، ہم اس کی بے دھیانی کا فائدہ اٹھاتے بلڈنگ میں گھسیں گے۔" مناج کے کہتے ہی حسام گاڑی سے اتر گیا۔اس کے دل میں لہریں سی ابھر رہی تھیں۔وہ

ایک انٹروورٹ تھا، زیادہ باتیں کرنا، لوگوں میں گھلنا ملنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن آج، حرر کی اس تحریک کے خاطر اسے یہ کرنا پڑ رہا تھا۔

اس بلڈنگ کا چوکیدار بوڑھا سا تھا۔ چہرے پر لمبی سی داڑھی تھی اور ماتھے پر نماز کے باعث کالا نشان۔ انہوں نے سر پہ سفید ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور نیچے چاندنی رنگ کا کرتا۔ حسام ان کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ سی تھی۔

"ہاں بیٹا کہاں جانا ہے؟" چوکیدار پختون لب و لہجے میں بولے تھے۔ حسام کے چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ اس نے موبائل نکالا، بوڑھے چوکیدار کی طرف کرتے ہوئے وہ مڑ گیا۔ چوکیدار بھی حسام کے موبائل میں جھانکتے ہوئے مڑ گئے اور اس کے موبائل میں ایک تصویر دیکھنے لگے۔ اب چوکیدار کی بلڈنگ کے دروازے کی طرف پشت تھی۔

"یہ بلڈنگ کدھر ہے؟ پاس ہی ہے ناں؟" حسام نے ایک بلڈنگ کی تصویر سامنے کی۔ یہ تصویر اس نے راستے میں کھینچی تھی۔ بات کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو تلاش کرنا تھا ناں۔

"ہاں بیٹا۔ یہ ادھر سے سیدھا جا کے بائیں مڑو گے، رفیق درزی کی دکان کے ساتھ والی گلی میں ہی ہوگی۔" بوڑھے پٹھان چوکیدار نے ہاتھ ہلا ہلا کے بتانا شروع کیا۔

اور یہی وقت تھا جب درے اور مناج جلباب پہنے ہوئے بلڈنگ کے اندر داخل ہوئیں۔ وہ بوڑھے چوکیدار کی نظروں میں نہیں آئی تھیں۔ حسام نے بہرحال دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ چچا جی۔ ویسے داڑھی کتنی خوبصورت ہے آپ کی۔ میں کب سے اگانا چاہتا ہوں مگر اچھی نہیں آتی تو کاٹ دیتا ہوں۔" حسام نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔ اسے کسی بھی طرح سے بوڑھے چوکیدار کو درے اور مناج کی واپسی تک باتوں پہ لگائے رکھنا تھا۔۔۔

مناج اور درے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ رہی تھیں۔ وہ بہت چوکنا تھیں۔ جیسے ہی کسی کی آہٹ سنائی دیتی تو اپنی رفتار بالکل آہستہ کر لیتیں۔ وہ تیسری منزل پہ پہنچی۔ ایک پتلی راہداری سیڑھیاں ختم ہوتے ہی نمودار ہوئی تھی۔ دائیں اور بائیں طرف گھروں کے دروازے تھے۔ صد شکر عمارہ کا گھر بالکل شروع میں ہی تھا، کورنر پہ۔ درے اور مناج دروازے کے پاس آ کے کھڑی ہو گئیں۔

"تم اب دیکھنا۔ تالہ کیسے توڑا جاتا ہے۔" مناج نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا۔ درے آس پاس نظر دہرائے جا رہی تھی۔ کچھ بھی غلط ہوتا تو ان دونوں کو بغیر سوچے سمجھے یہاں سے بھاگ جانا تھا۔ وہ ہر چیز کی تیاری کر کے آئی تھیں۔

"یہ چاندنی تالے سب سے آسان ہوتے ہیں۔" مناج نے اپنے بیک پیک سے ایک پاکٹ نائف نکالی۔ درے اب متوجہ ہوئی۔

"ان کی سائڈ پہ ایک لیب لگا ہوتا ہے جسے ہم اکھاڑ دیں گے۔" مناج اس تالے کی سائڈ پہ لگا لیب پاکٹ نائف کی مدد سے اکھاڑنا شروع ہوئی۔ لیب اکھڑ گیا تو چار گول دائرے نظر آئے۔ یہ سوراخ تھے جن میں لوہے کی بنی ہوئی باریک تاریں ڈالی گئی تھیں۔ مناج نے تالا ترچھا کیا تو چاروں باریک تاریں نکل کے زمین پہ گر گئیں۔

"اب کام آسان ہے۔ چھری سے اس تالے کو کھول دینا ہے۔" مناج نے کی ہول میں پاکٹ نائف گھسائی اور اسے گھما دیا۔ تالہ ایک کلک کے ساتھ کھل گیا۔ درفشاں تعجب سے سب دیکھتی رہی۔ تالہ ٹوٹ جانے کے بعد مناج نے کنڈی کھولی تو دروازہ کھل گیا۔ کسی نے انہیں اندر آتے نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے پیچھے سے دروازہ بند کیا اور گھر میں داخل ہوئے۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب کچن تھا۔ لابی عبور کرتے ہی لاؤنج تھا اور لاؤنج کے فوراً بعد ہی کمرے کا دروازہ۔ اپارٹمنٹ میں بس ایک ہی کمرہ تھا۔ وہ دونوں سیدھا کمرے میں گئیں۔

کمرے میں آکے انہوں نے الماریاں کھول کے چھان بین شروع کی۔ وہ دونوں بہت احتیاط سے کام کر رہے تھے۔ جو چیز اٹھاتے اسے جگہ پہ رکھ دیتے۔ درے کو الماری سے دو نرس والے سفید کوٹ ملے۔ وہ دونوں ان کوٹس کے ساتھ زمین پہ چوکڑی مار کے بیٹھ گئیں۔

"جلدی بٹنز دو۔" درے نے مناج سے خاص بٹنز مانگے جن میں چھوٹا سا مائکروسکاپک کیمرا انسٹال تھا۔ مناج نے اپنے بیگ سے بٹنز سے بھرا ہوا ایک تھیلا نکالا۔ بٹن سفید تھے لیکن بیچ میں ایک چھوٹا سا سلور نشان بنا ہوا تھا۔ مناج نے ساتھ ساتھ دھاگا بھی نکال کے درفشاں کے حوالے کر دیا۔

"ویسے مناج تم نے آج تک کتنے تالے توڑیں ہیں؟" درے نے سوئی دھاگے سے کوٹ میں نئے بٹنز لگاتے شرارتی سے انداز میں پوچھا۔

"ہم وکیل لوگ بہت ٹیڑھے کام کرتے ہیں۔ اس لئے یہ سب نہ پوچھو۔" مناج کے مشینی انداز میں مدھم سی شرارت تھی۔ درے مسکرادی۔

"کتنے ٹیڑھے۔" درے زیر لب ہنس دی۔

"اتنے ٹیڑھے کے تمہیں میرے انسان ہونے پر بھی شرمندگی محسوس ہو گی۔" دونوں ہی مدھم سا ہنس دیئے۔ درفشاں اب بھی بٹنز لگا رہی تھی۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا میں یوں کسی کے گھر میں تالا توڑ کے گھسوں گی۔" درفشاں مسکراہٹ دباتے بولی۔

"اچھا ہے۔زندگی میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی کرنا چاہیے۔ایک جیسی زندگی انسان کو بور کر دیتی ہے۔" مناج بولی۔

"اگر احمد کو بھنک بھی پڑ گئی ناں کہ میں یوں تالے توڑ کے کسی کے گھر میں گھسی ہوں تو اس کا تو حال ہی خراب ہو جانا ہے۔" یہ کہہ کے درے زور سے ہنسنے لگی۔مناج بھی ساتھ ساتھ ہنس دی۔

درے اب سارے بٹنز تبدیل کر چکی تھی۔وہ کوٹ اپنی نظروں کے سامنے رکھ کے سارے بٹنز کو دیکھنے لگی۔اندر سے وہ مطمئن نہ تھی۔

"اگر میں ہوتی تو سمجھ جاتی کہ کسی نے میرے کوٹ کے بٹن تبدیل کیے ہیں۔مگر ہر کوئی مناج نہیں ہوتا۔" مناج نے تبصرہ کیا۔درفشاں کچھ بے چین ہونے لگی۔

"بس دعا کرتے ہیں کہ وہ لڑکی بہت بد دماغ ہو۔" درے نے کہتے ہوئے کوٹ پہ تہہ لگانا شروع کی۔ دونوں نے الماری میں ہر چیز کو ترتیب دی۔

"اب تم باہر جا کے اشارہ دینا مجھے۔" ترتیب دے کے مناج بولی۔دونوں کی سانسیں پھول گئی تھیں۔

درے بہت آہستگی سے قدم بڑھاتے دروازے تک گئی۔ دروازے کو بہت ہلکے سے کھول کے باہر آئی۔ باہر کوئی نہیں تھا۔جب وہ مطمئن ہوئی تو اس نے دروازہ بجا دیا۔ مناج بھی باہر آگئی۔اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور بیگ سے نیا تالہ نکال کے دروازے پہ لگایا۔وہ تیز دھڑکتے دلوں کے ساتھ اب نیچے اترنا شروع ہوئیں۔

دونوں نیچے آئیں تو حسام اب بھی بوڑھے چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔اس کے چہرے پہ کوفت صاف ظاہر ہوتی تھی۔ دونوں اپنے جلباب کے پیچھے ہی ہنسنے لگیں۔ان دونوں کو واپس آتا دیکھ کے حسام نے سکون بھری سانس فضا کے سپرد کی۔

”ہیں؟ یہ کیسی عورت جو بیچ راہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلے گئی۔“ بوڑھے چوکیدار حسام کے ساتھ باتوں میں بہت مغوم نظر آرہے تھے۔انہیں حسام خاصا شریف معلوم ہوا تھا۔

”چلیں میں چلتا ہوں۔“ حسام کی بھی بس ہو چکی تھی۔اس نے کبھی کسی سے اتنی دیر بے وجہ بات نہیں کی تھی۔ ٹھنڈی سانسیں لیتا وہ مڑا۔

”دوبارہ چکر ضرور لگانا بیٹا۔“ بوڑھے چوکیدار نے خوشگواریت سے کہا۔حسام نے اونچا ”جی ضرور“ کہا اور واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھ کے وہ ٹھنڈی سانسیں لینے لگا، جیسے کندھوں سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

”تمہارا کام سب سے مشکل تھا حسام۔“ مناج کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ درے اپنا جلباب کھینچ کے اتار چکی تھی اور اب گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

"اڑا لو مذاق۔ ویسے بڑے ہی کوئی نیک انسان تھے۔ یوں آنکھوں میں دھول جھونکتے اچھا نہیں لگا۔"

حسام کا دل کچھ بھاری سا ہو رہا تھا۔

"ہاں مجھے یقین ہے جلد تمہارے گھر اپنی بیٹی کا رشتہ بھی بھیج دیں گے۔" مناج تمسخرانہ سے انداز میں بولی تو سب ایک ساتھ ہی ہنس دیئے۔

زندگی اچانک سے کتنی ایڈونچرس سی ہوگئی تھی۔۔۔ ہے ناں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بورڈنگ سے کچھ وقت پہلے ہی شمس مہر کے ساتھ ایئرپورٹ پہنچ گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا تو مہر بھی گاڑی سے اتری۔ وہ اندر ہی اندر مضطرب سی تھی۔ وہ ایک جرم کرنے والی تھی، اس لیے قدرے بے چین تھی۔ شمس ڈِگی کی طرف بڑھا اور ایک سوٹ کیس نکالا۔ وہ سوٹ کیس اس نے مہر کے حوالے کیا۔ مہر نے جھجکتے ہوئے وہ سوٹ کیس تھام لیا۔ وہ جانتی تھی یہ سوٹ کیس ان سب کا کالا پیسہ سموئے ہوئے تھا۔

"تم کب تک آؤ گے؟ لیڈی نے کہا تھا تم ہی مجھے آگے ہدایات دو گے۔" مہر نے شمس سے پوچھا۔

"کل صبح۔ رات کو میں تم سے کال کر کے تمہارے ہوٹل کا پوچھ لوں گا۔ کل صبح پھر میں اپنی یہ خطیر امانت لے جاؤں گا۔" شمس نے سادگی سے کہا۔

"اور کام؟ وہ کب تک ہو جائے گا؟" مہر کے دل کو بے قراری نے جکڑا ہوا تھا۔

"کچھ دن تک۔ تھوڑا صبر رکھنا۔" شمس کے کہتے ہی مہر ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس تھامے دوسرے میں شمس کا، مڑ کے ایئرپورٹ کے اندر داخل ہوئی۔

شمس گاڑی سے ٹیک لگائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔اس کا کام ہو گیا تھا۔مہر کو بربادی کی راہ پہ بھیج دیا گیا تھا۔وہ اس وقت بہت خوش تھا۔بہت ہی خوش۔

"کیا حال ہے شمس؟" یہ آواز اس کے کانوں میں پڑی تو شمس سکتے میں آگیا۔ اس کی ہمت بھی نہ ہو سکی کہ وہ پیچھے مڑ کے دیکھ سکے۔

یہ نہیں ہو سکتا تھا۔کیا یہ اس کا وہم تھا؟ سب کچھ اتنی صفائی سے ہوا تھا پھر وہ؟ خوف اور اضطراب کے عالم میں شمس سوچنے لگا۔سر پہ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

"احمد!"احمد اس کے بالکل سامنے آ کے کھڑا ہوا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے اس نے موت سے پہلے ہی موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔

"میں کب سے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔چچ چچ۔کیا ہوا؟ کیا لگا تھا تمہیں۔مجھے کچھ پتا نہیں لگے گا؟" احمد ہاتھ باندھے شمس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔شمس کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑتے چلا گیا۔احمد کے چہرے پہ جتانے والی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں تپانے والا تاثر تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اس نے اپنا چہرہ پر اطمینان رکھا۔سب کچھ اس کے سامنے سلو موشن میں ہو رہا تھا۔اسے ڈر تھا کہ کوئی اسے پیچھے سے پکار نہ لے اور اس کے بیگز کی تلاشی نہ لینے

لگے۔وہ برباد ہو سکتی تھی۔اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتی تھی۔وہ ایک جھٹکے میں اپنی بیٹی سے بچھڑ سکتی تھی۔اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات تھے۔

مہر نے اپنا بیگ ٹریڈمل پر رکھا۔اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔اس نے بھرپور کوشش کی کہ اس کی گھبراہٹ اس کے چہرے پر نہ جھلکے۔اور پھر اس نے چیک پار کیا۔ اسے بس کوئی پیچھے سے رکنے کا نہ بول دے۔مہر کو خوف ستائے جا رہا تھا۔پھر وہ چیک سے نکل کر بیگز کا انتظار کرنے لگی۔اس کے کپڑوں کا بیگ باہر آگیا تھا۔مہر کی سانسیں تھمنے لگیں۔کچھ وقت گزرا لیکن شمس والا بیگ باہر نہ آیا۔مہر کی نبض مزید تیز ہو گئی۔

شمس والا بیگ بھی بالآخر باہر آگیا۔مہر نے سکون کی سانس باہر کو نکالی۔ اس نے دونوں بیگ ہاتھ میں تھامے اور چلنا شروع کیا۔ ایک مشکل مرحلہ تو کم سے کم گزر گیا تھا۔

وہ انجان تھی کہ اب تک کا سب سے کٹھن مرحلہ تو اس کے لیے جہاز میں منتظر تھا۔۔۔

بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔مہر نے اپنے کپڑوں والا بیگ کارگو میں دیا اور خود شمس والا بیگ پلین کے اندر لے آئی۔

اس کا ٹکٹ بزنس کلاش میں تھا۔وہ پلین کی راہداری میں چلتی جا رہی تھی۔اس کے آگے بھی پیسنجرز تھے اور پیچھے بھی۔وہ بہت سہمی ہوئی سی لگتی تھی۔دل بھاری بھی ہو رہا تھا۔جہاں جرم کرنے کا بوجھ ستا رہا تھا وہاں احمد سے اتنے بڑے قدم کے بارے میں چھپانا بھی اس کے وجود پہ گراں گزر رہا تھا۔

"کدھر جا رہی ہو مہر؟" اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی تو وہ اچانک سے بت بن گئی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ احمد ادھر؟ اوہ نہیں۔ مہر نے جھٹکا کھا کے ایک بار پھر سے چلنا شروع کیا۔ قدم اب پہلے سے زیادہ سست تھے۔ آنکھوں میں گہری الجھن۔ وہ جان گئی تھی احمد ٹھیک اس کے پیچھے تھا۔ لیکن وہ یہاں تک کیسے آگیا؟ اس نے سوچا۔

"آپ نے میرا بھروسہ کیسے توڑ دیا مہر؟ آپ نے اگر یہ کرنا تھا تو مجھے اتنی امیدیں کیوں دلائیں؟" احمد کا انداز شکوہ گو تھا۔ وہ بہت ہی مدھم سی آواز میں مہر کے کان میں بولے جا رہا تھا۔ مہر کے قدم مزید سست پڑے۔ یہ الفاظ، اور یہ انداز، اس کے دل پہ خنجر کی طرح وار کر رہا تھا۔

"آپ نے ایک لمحہ نہیں لگایا میرا اعتماد کرچی کرنے میں؟ کیا میں اتنا فالتو تھا آپ کے لیے؟ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں، شاید آپ کی کوئی مجبوری ہو۔ لیکن پھر بھی مہر، میں آپ سے خفا ضرور ہوں۔ اور میں وضاحت کا بھی انتظار کروں گا۔" یہ جملہ جیسے ہی ادا ہوا مہر کے قدم زنجیر ہوئے۔ کچھ تھا ان الفاظ میں جو اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ یہ تکلیف۔۔۔ احمد کے تلخ ہو جانے پہ یہ تکلیف، آخر اسے اتنی شدت سے کیوں ہو رہی تھی؟

"آپ اپنی زبان سے پیچھے ہٹیں ہیں۔ لیکن میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کسی بھی وقت مجھے سب کچھ سچ بتا دیں، بس۔ بس یہی چیز ہمارے درمیان سب کچھ پہلے جیسا کر سکتی ہے۔" وہ جھٹکا کھا کے پھر سے چلنا شروع ہوئی۔ احمد کے الفاظ اس کے کان میں پڑتے تو اس کی روح جھنجوڑنے لگ جاتی۔

احمد کی سیٹ آگئی تھی، وہ اب بیٹھنے لگا تھا۔

”اگر مجھے احساس ہوا کہ اب آپ کو میری ضرورت نہیں، تو میں اپنے آپ کو آپ کے اوپر مسلط نہیں کروں گا۔میں چلا جاؤں گا۔۔۔ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔میرا اعتماد اگر کسی کے اوپر سے اتر جاتا ہے، تو وہ پہلے جیسا کبھی نہیں ہوتا۔“ آخری الفاظ کہہ کے احمد اپنی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔مہر نے گردن موڑ کے نظر احمد پہ ڈالی جو کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں مہر کے لیے بے پناہ شکایت تھی۔

مہر اسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔۔۔

مہر کے چہرے پہ کرب جھلکنے لگا۔روح تکلیف کے مارے مچلنے لگی۔اپنی سیٹ تک جانا ہی اس کے لیے دشوار ہونے لگا۔احمد کا یوں اتنا سب کہنا،اس کے دل پہ الگ طرح کا ضرب لگا گیا تھا۔

وہ اپنی سیٹ پہ پہنچی۔شمس والا سوٹ کیس جگہ پہ رکھ کے وہ اپنی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔سیٹ پہ بیٹھ کر اس نے کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔وہ رونا چاہتی تھی، اس سے یہ تکلیف اب مزید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”تم اسے اپنا دل نہیں دے سکتی مہر!“ مہر زیر لب بڑبڑائی۔”تم اس کے حقدار نہیں ہو۔“

تکلیف۔۔۔تکلیف۔۔۔اور صرف تکلیف۔وہ اپنے آپ کو کس قدر تکلیف سے گزار کر یہ سب کہہ رہی تھی۔اس تکلیف کا اندازہ مہر کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## باب نمبر ۹: جرائم کی دنیا میں خوش آمدید....

اس دور کے رسم و رواجوں سے

ان تختوں سے ان تاجوں سے

جو ظلم کی کوکھ سے جنتے ہیں

انسانی خون سے پلتے ہیں

جو نفرت کی بنیادیں ہیں

اور خونی کھیت کی کھادیں ہیں

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

وہ جن کے ہونٹ کی جنبش سے

وہ جن کی آنکھ کی لرزش سے

قانون بدلتے رہتے ہیں

اور مجرم پلتے رہتے ہیں

ان چوروں کے سرداروں سے

انصاف کے پہرے داروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھے پہ ظلم کرو

جو عورت کو نچواتے ہیں

بازار کی جنس بنواتے ہیں

پھر اس کی عصمت کے غم میں

تحریکیں بھی چلواتے ہیں

ان ظالم اور بدکاروں سے

بازار کے ان معماروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

جو قوم کے غم میں روتے ہیں

اور قوم کی دولت دھوتے ہیں

وہ محلوں میں جو رہتے ہیں

اور بات غریب کی کہتے ہیں

ان دھوکے باز لٹیروں سے

سرداروں اور وڈیروں سے

میں باغی ہوں میں باغی ہوں

جو چاہے مجھ پہ ظلم کرو

(حبیب جالب)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شمس اپنی ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان، گاڑی کے اسٹیئرنگ وہیل کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔آنکھیں بند تھیں اور چہرے پہ تناؤ پھیلا ہوا تھا۔چہرے کے پٹھے کھنچے ہوئے تھے۔وہ بے اختیار دانت پیسنے لگا۔اس کا چہرہ سرخ رنگ میں ڈھلنے لگا تھا۔اس نے اپنی آنکھیں کستی سے بند کی ہوئی تھیں۔

اس کے وجود کو اس لمحے شدت بھرے غصے نے گھیرا ہوا تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسٹیئرنگ وہیل اکھاڑ کے پھینک دے۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گاڑی کی سیٹس کو چیر پھاڑ دے۔وہ اپنے غصے کو کسی نہ کسی طرح سے نکالنا چاہتا تھا۔

موبائل پہ رنگ ہوئی تو شمس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔لیڈی اقتدار کالنگ۔ یہ نام پڑھ کے شمس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔اس کے چہرے پہ بے بسی در آئی۔وہ کتنا بے بس ہوگیا تھا۔۔احمد نے اسے کتنا بے بس کر دیا تھا۔۔وہ سوچنے لگا، اور دل ہی دل میں اسے ملامت کرنے لگا۔

گہری سانسیں لیتے ہوئے اس نے اپنے اعصاب پہ قابو پانے کی کوشش کی۔کال اٹھا کے اس نے فون کان سے لگایا۔

"سب کام ہوگیاناں شمس؟ مہر کسی بھی مداخلت کے بغیر چلی گئی؟"لیڈی اقتدار کی بھاری، گرج دار آواز میں بے چینی گھلی ہوئی تھی۔

شمس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی۔اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھی بنائی۔آنکھ غصے کی شدت کے باعث نم ہونے لگی۔اس کے لیے کچھ بھی کہنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"جی لیڈی۔سب ہو گیا۔" وہ غصے کو آواز میں جھلکنے سے روکتے ہوئے بولا۔ آواز قدرے مدھم تھی، اور کچھ حد تک بے تاثر بھی۔

"اور احمد؟ اسے دور دور تک کوئی بھنک تو نہیں پڑی؟" شمس کا تنفس تیز ہونے لگا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ موبائل اٹھا کے پٹخ دے۔اس کا زور زور سے چلانے کا دل کر رہا تھا۔زندگی میں آج سے پہلے اس نے اپنے آپ کو اتنا بے بس کبھی نہیں پایا تھا۔

"مہر اکیلے گئی ہے۔" جھوٹ بولنا اس کے دل کو تکلیف دے رہا تھا۔وہ ایک بھیانک کھیل کا حصہ بن چکا تھا، اگر مستقبل میں یہ جھوٹ اس کا کبھی کھلے گا، تو وہ یقیناً مار دیا جائے گا۔۔۔شمس بھی بری طرح پھنس چکا تھا۔احمد اسے پھنسا کے جا چکا تھا۔اس کے دل میں احمد کے لیے شدید نفرت تھی۔بلکہ جو اس کے دل میں احمد کے لیے تھا، وہ نفرت سے بڑھ کر تھا۔

لیڈی اقتدار نے کال کاٹ دی تو شمس نے موبائل برابر والی سیٹ پہ اچھال دیا۔

شمس کا تنفس مزید تیز ہونے لگا۔وہ جنگلیوں کی طرح ڈیش بورڈ میں مکے برسانے لگا۔وہ اس وقت اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔شمس اپنے منہ پہ تھپڑ برسا کے زور زور سے چلانے لگا۔اس

کے اعصاب قابو میں نہ رہے۔غصے کے مارے اس کے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ بھاری بھاری چیخیں گاڑی کی ساؤنڈ پروف کھڑکیاں دبائے ہوئے تھیں۔وہ چیخیں اپنے اندر غصہ اور نفرت سمائے ہوئے تھیں۔

"ایک دن سب کو عقل آجائے گی۔یہ سب تمہیں مارنے پہ آمادہ ضرور ہوں گے۔" غصے کی شدت کے باعث شمس کی آواز لرز رہی تھی۔"اور اس دن!" شمس زور سے چلایا۔"میں تمہیں اپنے ان ہاتھوں سے ماروں گا احمد۔"

وہ ہاتھ اٹھا کے انہیں دیکھنے گا۔ان ہاتھوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دماغ میں وہی کرب ناک منظر ابھرنے لگا۔۔۔وہی منظر جس میں احمد نے شمس کا انچ انچ اپاہج کر دیا تھا۔۔۔

## کچھ دیر پہلے۔۔۔

شمس آنکھوں میں خوف اوروحشت لیے احمد کو دیکھنے لگا جو کہ اس کے سامنے پر اطمینان سا کھڑا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔سب کچھ اتنا صفائی سے ہوا تھا۔۔۔پھر وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟شمس نے سوچا۔

"تم؟ تم یہاں کیسے؟" بے یقینی کے عالم میں بس وہ اتنا ہی بول سکا۔وہ سہی معنوں میں بوکھلا گیا تھا۔

احمد کے چہرے پہ پھیلی 'تپانے والی مسکراہٹ گہری ہوئی اور وہ مدھم سا ہنس دیا۔شمس کو تپ چڑھنے لگی۔

"ہے ناں؟ کیسے پہنچ گیا۔" وہ معصومانہ سے انداز میں کہہ کے پھر سے ہنسنے لگا۔

"بس اسے اتفاق سمجھ لو؟ خوبصورت اتفاق۔ یاد کرو شمس کہ پہلے تم مجھے کتنی دھمکیاں دیا کرتے تھے؟ موت کی؟ مجھے معذور کرنے کی؟" احمد نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چہرے پہ کڑواہٹ بھرنے لگی تھی۔

"اب کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کیوں خوف کے مارے آنکھیں پھٹ رہی ہیں شمس؟" ہر لفظ پہ زور دیتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"میں نے بہت انتظار کیا۔ میں نے انتظار کیا، کہ آخر کب یہ دھمکیاں حقیقت کے رنگوں میں بدلیں گیں۔ کس دن میرے اوپر ایک ایسا حملہ کروا دیا جائے گا جو کہ مجھے ختم کر دے گا۔ لیکن تم لوگوں کی دھمکیاں، تم لوگوں کی طرح ہی کمزور ہوا کرتی تھیں۔ ڈھائی سال پہلے جیسے تیسے کر کے تم لوگوں نے مجھے روک لیا، لیکن اب کیسے روکو گے؟ میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ میں لوٹوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ میں واپس ضرور آؤں گا۔ اور اب دیکھو میں آگیا ہوں۔ اور اب کی بار، میں تم لوگوں کو برباد کیے بغیر نہیں جانے والا۔" شمس کو لگا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس سے احمد کی باتیں مزید برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

"لیکن تم لوگوں نے آج تک مجھے نہیں مارا۔ تم لوگوں کے لیے یہ مشکل تو نہیں تھا؟ پھر بھلا کیوں میں ڈھائی سال بعد بھی زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ اگر تم لوگ عبداللہ سلطان کو ایک جھٹکے میں مار سکتے ہو، مہر کی ماں کو ایک جھٹکے میں اغواء کر سکتے ہو، تو پھر یہ کیوں نہیں کر سکتے؟ میرے پاس آخر ایسا کیا ہے جو تم لوگوں کو روک رہا ہے؟" آنکھوں میں سوال لیے وہ تپانے والا انداز اختیار کرتے ہوئے گویا ہوا۔

شمس کا خون کھولنے لگا تھا۔اس نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے، اور پھر بند کیے پھر کھولے اور پھر بند کیے۔اس کے پاس جیسے الفاظ ختم ہونے لگے تھے۔وہ احمد کو واقعی کیا بتاتا؟ کیا سچ بتانا آسان تھا؟ اس نے سوچا۔

"تم۔۔۔تم بہت پچھتاؤ گے۔" وہ الفاظ تلاش کرتے بولا۔احمد شمس کی جد و جہد دیکھ کے اور بی کشش سے مسکرانے لگا۔یہ مسکراہٹ شمس کو اندر تک چھلنی چھلنی کرنے میں کوئی کثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔
"تم جتنا ہمارے قریب آؤ گے تم اتنا ہی پستے جاؤ گے۔ڈھائی سال پہلے بھی تمہاری زندگی میں کوئی کم مشکلات نہیں تھیں۔" شمس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظوں کا استعمال کرتے کہا۔احمد نے استہزائیہ نظر شمس پہ ڈالیں۔

"اچھا مار دو گے مجھے؟ جیسے پچھلے کئی سالوں سے مجھے مارنا چاہ رہے ہو؟" احمد طنزاً بولا۔

"ہاں یہ سچ ہے ہم تمہیں نہیں ماریں گے احمد۔لیکن پھر بھی تم برباد ہو جاؤ گے۔یہ سب ویسا نہیں ہے،جیسا تمہیں نظر آتا ہے۔تم ہم سے قریب تر قریب ہوتے جاؤ گے، اور اسی سلسلے میں تم ایک دن اپنے آپ سے نفرت کرنے لگ جاؤ گے۔اپنی زندگی سے نفرت کرنے لگ جاؤ گے۔" شمس پھولتی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔

"اوہ۔۔۔واقعی؟" احمد مصنوعی سے حیران انداز میں بولا۔

"تم مہر کی زندگی خطرے میں ڈال رہے ہو احمد۔تم یہ سب کرتے ہوئے اس کی ماں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال رہے ہو۔"

”نہیں تم مہر کو کچھ نہیں کرنے والے۔نہ ہی تم اپنے مالکوں کو بتاؤ گے کہ میں اس کے ساتھ دبئی جا رہا ہوں۔“ احمد کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔وہ پر اعتمادی سے بولا تھا۔

”اور تم مجھے کیسے روکو گے؟“ شمس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں وہ ہیرے تمہارے پاس ہیں شمس۔“ یہ سنتے ہی شمس کا رنگ فق ہو گیا۔اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔

”تم نے عبداللہ سے ڈیل کی تھی کہ تم انہیں عافیت زندگی کی بیسمنٹ کی چابیاں فراہم کرو گے؟ اور پھر دو ہیرے تمہارے دو ہیرے ان کے۔بھول گئے تو میرے پاس ویڈیو بھی موجود ہے۔“شمس کا ہاتھ احمد کی طرف اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔وہ چہرے پہ المناک سا تاثر لیے احمد کو دیکھتا رہا۔

”دھیان سے۔اس وقت میں تمہیں برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔“ احمد سختی سے بولا۔شمس سر نفی میں

ہلانے لگا۔

”وہ بڈھا میرے ساتھ گیم کھیل گیا۔نہ اس نے چابیاں لیں، نہ ہی کوئی مدد۔اس نے وہ ہیرے بھی ہوشیاری سے چرا لیے۔میرا یقین کرو وہ ہیرے میرے پاس نہیں ہیں۔“ شمس نے بے بسی سے کہا۔احمد دانت باہر نکال کے ایک دفعہ پھر سے ہنسنے لگا۔

”مجھے کیوں وضاحتیں دے رہے ہو؟ اپنی وضاحتیں اپنی لیڈی اقتدار اور نیلوفر میڈم کے لیے بچا کے رکھو۔“ شمس کے اوپر جیسے پہاڑ آ کر گر گیا۔وہ بری طرح سے پھنس چکا تھا۔اگر لیڈی اقتدار پہ اس

کی بے وفائی کا پول کھلتا تو وہ اسے اذیت ناک موت سے نوازتی۔وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی موت دیکھ سکتا تھا۔

"مجھے اور بھی بہت کچھ پتا ہے شمس۔" شمس کو ڈرا ہوا دیکھ کے احمد سرگوشی نما انداز میں گویا ہوا۔ "کیا ہے کہ، تم لوگ چاہے جتنا بھی مل جل کے کام کرلو۔آخر میں تم سب ہو تو برے ہی۔کسی سے مخلص نہیں ہو سکتے۔تم اس دن فارم ہاؤس میں نشے میں تھے۔تمہارا دھیان فارم ہاؤس میں لگے کیمراز پہ نہیں گیا جن کی ٹیپ، خیر سے تم نے ڈیلیٹ اب تک نہیں کی تھی۔ادھر ہی نشے کی حالت میں تم نے عبداللہ سلطان کو کال کی تھی، انہیں چابیاں فراہم کرنے کی آفر دی تھی۔میں نے بہت محنت کر کے وہ ٹیپ نکالی ہے، اور میں نے اس ٹیپ کا درست استعمال کرنا ہے۔فرض کرو اگر میں نے وہ ٹیپ تمہاری لیڈی اقتدار کو دے دی۔۔۔تو کیا ہو گا ناں؟ سیدھا جہنم میں بھیجے گی وہ تمہیں۔" احمد کے چہرے پہ مصنوعی سی اداسی اترنے لگی۔شمس سر نفی میں ہلانے لگا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" شمس تائیدی انداز میں بولا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ احمد کے اوپر برس پڑے۔

"بالکل درست۔میں ایسا بالکل بھی نہیں کروں گا، اگر تم اپنا منہ بند رکھو۔مہر کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اس کی ماں کو کچھ نہیں کرو۔منظور ہے؟" احمد خشمگین سا مسکرایا۔شمس جانتا تھا اس کے پاس اب کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا۔ایک طرف موت تھی تو ایک طرف اس کی وفاداری کا ڈھونگ۔۔۔

"منظور ہے۔" شمس نے جواب دیا۔

”اب چلتا ہوں۔یاد سے، مہر کو ایک خراش بھی نہیں آنی چاہیے۔۔“ احمد کہہ کے مڑ گیا۔

”تم پچھتاؤ گے۔احمد۔“ احمد نے ایک کان سے سنا دوسرے کان سے نکالا۔”یہ سب ویسا نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔اس کھیل کے اختتام میں سب سے زیادہ تکلیف تمہیں ہی پہنچے گی۔تم مرو گے نہیں،نہ ہی تمہیں کوئی چوٹ پہنچے گی، لیکن تمہاری رو چھلنی چھلنی ہو جائے گی۔ تم اپنے آپ سے نفرت کرو گے احمد۔“ شمس کی روح غصے کے باعث تڑپنے لگی تھی۔اس میں ڈھیروں غصہ بھر گیا تھا۔احمد واپس شمس کی طرف مڑا اور اسے مسکرا کے دیکھنے لگا۔

”اچھا چھا۔رو مت۔“ احمد نے اس کے نرمی سے گال تھپتھپائے اور پھر سے مڑ گیا۔شمس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔وہ کس قدر لاچار تھا۔ایک طرف اس کی وفا داری کا ڈھونگ تھا اور ایک طرف یہ دھندا تھا۔فی الحال شمس نے اپنی وفاداری کو چنا۔اس نے کسی کو کچھ بھی نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔

اس سفر کی شروعات تین سال پہلے، کسی کھوئے ہوئے کی تلاش سے ہوئی، تین سال گزر گئے تھے۔۔ اس سفر کا رخ بھی بدل گیا تھا۔اب اس سفر نے انتقام کا بھیانک روپ اختیار کر لیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد کے ایک بڑے آڈیٹوریم میں تحریک حرر فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک پروگرام ہوسٹ ہونا تھا جس کا مقصد سامعین کو اپنے عزائم سے آگاہ کرنا تھا۔حرر کی سوشل میڈیا ٹیم نے اس ایونٹ کی بھرپور پروموشن کی تھی جس کے باعث آج کی اس محفل میں اچھی خاصی عوام نے شرکت کی تھی۔

آڈیٹوریم میں ہر طرف بلو کرسیاں قطار در قطار لگائی گئی تھیں۔ کرسیوں کے بیچ میں سے راہداری بھی نکالی گئی تھی۔ کچھ اسٹیپس بنا کے اسٹیج اٹھایا گیا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے والی دیوار پہ بڑا سا بینر لگایا گیا تھا جس پہ تحریک حرر فاؤنڈیشن کے مقاصد کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ پورے آڈیٹوریم کو بھی موقع کی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔

عمارہ کے اپارٹمنٹ میں کاروائی کر کے وہ تینوں اپنے اپنے گھر گئے تھے اور پھر بہتر کپڑے پہن کے دوبارہ سے آڈیٹوریم پہنچ گئے تھے۔

وہ تینوں اس وقت بیک اسٹیج میں موجود کچھ چیزوں کے بارے میں گفت و شنید میں مصروف تھے۔ مناج نے سفید کرتا پہنا ہوا تھا جس پہ باریک سا کام کیا گیا تھا۔ حسام نے کرسپ سا کالا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے موقع کی مناسبت سے تھوڑا اسٹائلش چشمہ پہنا تھا۔ در فشاں نے سفید شرٹ پہ جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ تینوں کافی صاف ستھرے اور اچھے نظر آرہے تھے۔

”بہت لوگ آگئے ہیں۔ حسام تم تیار ہو؟ میں کیمرا مین کو تیار کرواؤں؟“ مناج نے اپنے مشینی انداز میں پوچھا۔ اس کے ماتھے پر مصروفیت کے باعث بل تھے۔

”جی میں تیار ہوں۔“ حسام نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ مناج پھر وہاں سے چلی گئی۔ آنکھوں میں عجب لیے درے حسام کو دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کرلیں گے نا؟“ در فشاں نے پوچھا۔ حسام کے چہرے پہ گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آپ مجھے جانتی نہیں ہیں درے۔ اسکولز وغیرہ میں جب بھی کوئی فنکشن ہوتا تھا تو میں اس میں حصہ ضرور لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کبھی کسی فنکشن میں، میں حصہ نہ لوں تو ہمارے سکول کی پرنسپل مجھے بلوا کے پوچھتی تھیں کہ حسام سب خیریت تو ہے۔" پرانے وقتوں کو یوں یاد کرتے ہوئے وہ خوش سا ہونے لگا۔ لیکن خوشی عارضی تھی، ان ہی پرانے وقتوں میں بہت سیاہ منظر بھی کھلے ہوئے تھے جو کہ حسام کی آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگے تھے۔ حسام کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ سمٹی۔

"اور پھر میں ڈرگز کرنے لگا۔ اور یوں ہی، میں برباد ہو گیا۔" حسام نے نظریں جھکائیں۔ آنکھوں کی چمک فنا ہو گئی تھی۔

"میں آپ کو ایک بات بتاتی ہوں حسام۔ آپ ضروت سے زیادہ جذباتی ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے، آپ سے ہوئی تھی غلطیاں، لیکن اب سب ٹھیک تو ہے۔ تو پھر بار بار اپنے آپ کو ملامت کرنے کا کیا فائدہ؟" درے کا انداز سپاٹ تھا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا درے۔" حسام نے گردن نفی میں ہلائی۔

"کر سکتے ہیں۔ ہم سب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کوشش کریں تو ہم اپنے جذبات کو قابو کر سکتے ہیں۔ آپ کو بس اپنے آپ کو ملامت کرنے کا شوق ہے۔ آپ یہ سب اپنے گلٹ کی وجہ سے کرتے ہیں۔ آپ جان کے اپنے آپ کو سزا دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو معاف کرنا سیکھیں حسام۔" درے کے اندر بسی سائکولاجسٹ جاگ گئی تھی۔ حسام نے اپنی گردن اٹھائی۔ اب اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

"اور یہ سب آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کیونکہ آپ ایک سائکولاجسٹ ہیں؟" اندازشوخ سا تھا۔

"وہ بھی۔ مگر اس سے بڑھ کے ہم دوست ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم سب، یعنی میں آپ اور مناج، ہم تینوں ہی ساتھ میں گرو کریں اور اپنا بہترین ورجن بنیں۔" درے خوشدلی سے بولی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ کبھی کوئی انسان اپنا بہترین ورجن بن سکتا ہے درے۔ انسان غلطیاں کرتا ہے۔ وہ غلطیاں کرنا کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔" حسام نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"بہترین ورجن بننے کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہم پرفیکٹ بن جائیں گے یا ہم غلطیاں نہیں کریں گے۔ نہیں۔

یہ ایک جد و جہد ہے، جو انسان کو مرتے دم تک کرنی چاہیے۔ وہ غلطیاں بھی کرے گا، گناہ بھی کرے گا۔ مگر اس کا ردِ عمل بدل جائے گا۔ وہ اپنی غلطیوں سے منہ نہیں پھیرے گا بلکہ ان سے سیکھ حاصل کرے گا۔ وہ اپنے گناہوں کو جسٹی فائی نہیں کرے گا بلکہ اس پر سچے دل سے توبہ کرے گا۔ وہ اپنی خامیوں کو جانے گا، اور انہیں دور کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ایک پراسیس ہے، ایک مثبت زندگی اور خوش بخت آخرت کے لیے، ہمارے لیے اس پراسیس سے گزرنا ضروری ہے۔" درے نے بات ختم کی۔ حسام نے سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

"آپ میرے ساتھ میری آرٹ گیلری چلیں گی درے؟" حسام نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ درے حیران ہوئی۔

"آپ کی آرٹ گیلری بھی ہے؟" درے کی آنکھیں حیرت کے رنگوں میں ڈھلیں۔

"ہاں۔ میں چودہ سال کا تھا جب میرے ڈیڈ نے بنوا کے دی تھی۔ آخری مرتبہ شادی کے دنوں میں ہی

گیا تھا۔سوچ رہا ہوں اب دوبارہ سے جانا شروع کروں۔تقریر کے بعد جانا چاہیں گی؟" حسام نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔اور ویسے بھی، اس طرح کی سرگرمیاں زندگی میں ہونی چاہیے۔ یہ زندگی میں فرار کا راستہ

بنتی ہیں۔"

"اور آپ کے لیے فرار کا راستہ کیا ہے درے؟"

"مجھے پودے بہت پسند ہیں۔آپ نے میرے گھر کے باہر پودے دیکھے تھے؟ وہ درخت، وہ پھول' وہ سب

میں نے لگوائے تھے۔گھر کے گارڈن میں بھی سارے پودے میں نے لگوائے تھے۔میرا فرار میرے پودیں ہیں۔میں روز شام کو انہیں پانی دیتی ہوں۔ان کے آس پاس موجود ٹھنڈک کو انجوائے کرتی ہوں۔مجھے میرے پودے بہت عزیز ہیں۔" حسام کچھ جواباً بولنا چاہ رہا تھا، لیکن پیچھے سے مناج کی مشینی آواز گونجی تو وہ تھم گیا۔

"حسام تیار رہو۔باقی سب تیار ہیں۔" یوں تسلسل ٹوٹنے پر درے اور حسام تھوڑا بدمزہ ضرور ہوئے۔ لیکن خیر، حسام وہاں سے اسٹیج کی طرف جانے لگا۔

حسام ایک ایک قدم بڑھاتے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔آج وہ بہت سالوں بعد تقریر کرنے جا رہا تھا۔اس کے دل میں نیم گھبراہٹ بھی تھی۔اس نے نظر اٹھا کر

آڈیٹوریم میں دیکھا جو کہ سامعین سے بھرا پڑا تھا۔اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے ہمت جمع کی اور اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

**"(تو احمد اس تاریک زمانے سے آزادی کیسے حاصل کی جائے گی؟" مہر کچھ ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔**

**"اس کا جواب خدا نے اگلی سورة،سورہ بلد میں دیا ہے۔۔۔۔)"**

"اسلام علیکم۔میں تمام سامعین کا تحریک حرر فاؤنڈیشن کے اس سیمینار میں پر جوش استقبال کرتا ہوں۔" حسام نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلا جملہ اس سے کئی بہتر کہہ سکتا تھا لیکن گھبراہٹ نے اسے موقع نہیں دیا۔اس نے سب کچھ جھٹرک کے اپنی تقریر جاری رکھی۔

"آج آپ سب کو اتنی تعداد میں،یہاں دیکھ کے دلی خوشی ہو رہی ہے۔آپ سب کی اس سیمنار میں موجودگی آپ سب کے ذمہ دار شہری ہونے کا ثبوت ہے۔" حسام کی گھبراہٹ فنا ہونے لگی تھی۔اب وہ پرسکون ہونے لگا تھا۔تقریر کرتے کرتے اس کے انداز میں روانگی آنے لگی تھی اور اب وہ پر اعتماد ہونے لگا تھا۔

اس نے مائیک اسٹینڈ سے جدا کیا۔مائیک ہاتھ میں تھامے اب وہ آرام دہ سا ہو کے تقریر کرنے لگا تھا۔

"میں یہاں لمبی تمہید باندھنا نہیں چاہتا۔میں سیدھا مدعے پہ آنا چاہوں گا۔

آپ لوگوں کے سامنے میں کچھ اہم سوالات عرض کروں گا:

آخر تحریکِ حرر کیا ہے؟

آخر کیوں ہم سب کو تحریکِ حرر فاؤنڈیشن کو سنجیدگی سے لینا چاہیے؟

آخر تحریکِ حرر کی کیا اہمیت ہے اور یہ ضروری کیوں ہے؟

اس کو سمجھنے کے لیے میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ حرر کا کیا معانی ہے۔ قرآن پاک میں بہت مقامات میں غلاموں کی آزادی کی بات کی گئی ہے۔بہت مقامات میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے تحریر۔ تحریر کا یہ لفظ حرر سے نکلا ہے۔اور حرر کا مطلب ہوتا ہے رہائی۔انگریزی میں اسے ہم لبریشن بولیں گے۔" پھر حسام نے گردن اسٹیج کی پیچھے بنی دیوار کی طرف موڑی اور انگلی سے بینر کی طرف اشارہ کیا۔

"تو یہ بورڈ پر لکھا ہے کہ اکیسوی صدی کی غلامی سے آزادی۔۔۔" حسام نے گردن ایک بار پھر سامعین کی طرف موڑی۔"مگر کیا غلامی سالوں پہلے ہی ختم نہیں ہوگئی تھی؟"حسام نے ایک وقفہ لیا۔ آنکھوں میں سوالیہ سا تاثر تھا۔وہ سامعین کو سوچنے پہ مجبور کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں! حقیقتاً ہم غلامی سے آج تک آزادی نہیں پا سکے۔تو میں جس غلامی کی بات کر رہا ہوں، وہ بھلا کس طرح کی ہے؟یعنی اس کی فطرت کیا ہے؟"

**"(اس میں خدا فرماتا ہے کہ دو نمایاں راستے ہیں، مگر معاشرہ عقبہ کے راستے پر نہیں گیا۔کیا آپ جانتی ہیں عقبہ کیا ہے؟)"**

"ہم نے بس غلامی سے ظاہری طور پر آزادی حاصل کی ہے۔ورنہ ہم آج تک غلامی سے آزادی نہیں پا سکے ہیں۔پولیس کو سال بھر ڈھیروں رپورٹس موصول ہوتی ہیں کہ نہ جانے کتنے لوگ لاپتہ ہو گئے،

کتنی عورتیں لا پتہ ہوئیں، کتنے بچے لا پتہ ہوئے۔وہ آخر کہاں جاتے ہیں؟ اورآخر اکا دکا کے علاوہ یہ خبریں میڈیا کہ ذریعے ہم سب تک کیوں نہیں پہنچتی؟ اس کا بھی جواب بہت آسان ہے۔یہ پورا ایک مافیا ہے جو کہ ہیومن ٹریفکن میں ملوث ہے۔انسانوں کی خرید و فروخت اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ' چور راستوں سے لے کر جانے کو ہم ہیومن ٹریفکنگ یا ہیومن سمگلنگ کہتے ہیں۔جی بالکل یہ ہمارے سو کالڈ ماڈرن زمانے میں ہوتا ہے۔اور جو اس کاروبار میں شریک ہوتے ہیں ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہوتی ہے۔یہ اپنی طاقت کے زور پہ ان تمام خبروں کو دبا لیتے ہیں۔"

**"(عقبہ کا مطلب ہے دشوار گزار گھاٹی۔اور آپ کو پتا ہے کہ یہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟)"**

"ہیومن ٹریفکنگ کے ذریعے جو عورتیں حاصل کی جاتیں ہیں ان کو استعمال کیا جاتا ہے ریڈلائٹ ایریاز کی کمی کو پورا کرنے کے لیے۔ریڈ لائٹ ایریاز تو سالوں پہلے بند ہو گئے، لیکن کیا واقعی ایک سادہ سودہ سا بین برائی کا راستہ روک سکتا تھا؟ نہیں۔کبھی نہیں۔اور بالکل ایسا ہی ہوا۔اس سب نے ہیومن ٹریفکنگ کو اور بھی فروغ دی۔اور نہ جانے کتنی عورتو ں کو اغواء کیا جاتا ہے، ان سے ان کا گھر چھینا جاتا ہے، ان پر نہ جانے کتنے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔اس سب کے بعد انہیں ایک دوزخ ذدہ زندگی جینے پہ مجبور کیا جاتا ہے۔یہ سب بہت تاریک اور بھیانک ہے اگر ایک بندہ اس بارے میں سوچے۔"

**"(اللہ تعالی آگے کی آیت میں عقبہ کو واضح کرتا ہے۔عقبہ کا راستہ وہ ہے جس میں ہم،ایمان لانے والوں کے ساتھ مل جائیں۔ان لوگوں کے ساتھ مل جائیں، جنھوں نے رحم اور صبر کی تلقین کی۔۔۔)"**

"لیکن یہ سب ان عورتوں پر بس نہیں ہوتا۔ہیومن ٹریفکنگ ایک اور برائی کو فروغ دیتی ہے۔اور وہ برائی ہے اعضاء کا غیر قانونی کاروبار۔جی ہاں! لوگوں کو ان کے گھروں سے محروم کیا جاتا ہے تاکہ انہیں کاٹ کر ان کے اعضاء نکالے جائیں! یا غریبوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے اعضاء بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔اور نہ جانے کتنی ہی بھیانک چیزیں ان بند دروازوں کے پیچھے ہو رہی ہوں گی؟ کیا کوئی پوچھنے والا نہیں؟ کیا اس سب پہ کوئی آواز اٹھانے والا نہیں ہے؟"

**"(اور پھر غلاموں کو آزاد کریں، غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔اور اس طرح سے ہم عقبہ پر چل سکتے ہیں۔اور عقبہ سے گزر کر ہی ہم معاشرے کی اس پستی کو ختم کر سکتے ہیں۔ ")**

"یہ آزادی صرف نام کی آزادی ہے۔ہم اب تک غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔اور اسی غلامی کو ایکسپوز کرنے کے لیے ہم نے حرر کو قائم کیا۔ان غلاموں کی رہائی کے لیے حرر قائم کیا، جو نہ جانے کن کن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔مگر ہم یہ اکیلے نہیں کر سکتے۔کسی بھی قسم کی تبدیلی یا انقلاب لانے کے لیے اتحاد قائم کرنا ضروری ہے۔ہم اہلِ عرب میں سے ہی مثال لیتے ہیں؛ حضور ﷺ کے صحابیِ اکرام کی۔

اس وقت معاشرے میں کتنے بگاڑ تھے؟ ہم ساتھ مل کر جتنے ہو سکے اتنے بگاڑوں کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس زمانے میں شراب عام تھی، یتیموں مسکینوں کا حق مارنا عام تھا۔بیواؤں کا حق مارنا عام تھا۔زنا عام تھا۔جوا عام تھا۔ظلم و وحشت عام تھی۔عورتوں کے حقوق کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔انہیں ایک چیز سمجھا جاتا تھا نہ کہ ایک انسان۔اور پھر اسلام آیا۔اور اسلام نے سب کچھ بدل دیا۔ اور آگے جا کے مسلمانون نے مل کر ایک مثالی کمیونٹی قائم کی۔یہ سب ان کی ملی بھگت تھی۔انہوں

نے قربانیاں دیں۔برے کاموں سے اپنے آپ کو روکا۔کیونکہ وہ خلوص رکھتے تھے، اللہ کے لئے، اس کے حبیب ﷺ کے لیے، دینِ اسلام کے لیے۔وہ غیرت مند لوگ تھے جو کہ معاشرے میں بگاڑ کو دیکھتے تو اس کو روکنے کی کوشش کرتے۔نہ کے اس سے آنکھیں پھیر لیتے۔ہم بھی ان ہی میں سے ہیں۔ہم بھی دینِ اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ہم بھی نبی ﷺ کے امتی ہیں۔مگر کیا ہم میں ان کے پیروں کی دھول کے برابر بھی غیرت ہے؟ اتنی دلیری ہے؟ نہیں۔ہم اندھے ہوتے جا رہے ہیں۔ہم اپنی دنیا اپنے پیسے،اپنے عیش و آرام کی خاطر ایسے مسئلوں سے آنکھیں پھیر رہے ہیں جن پر بات کرنا، جن پر آواز اٹھانا بہت ضروری ہے۔مگر دیر ابھی بھی نہیں ہوئی ہے۔ہمیں لوگوں میں بس علم و شعور پھیلانا ہے۔ہمیں بس اوپر کی آتھورٹیز تک اپنا پیغام پہنچانا ہے کہ ہم غیرت مند ہیں۔ہم اپنے ملک کے بہن بھاؤں کے اوپر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔اور یقین جانیں، یہ حربہ کام کرے گا! شعور اس دھندے کا سب سے بڑا دشمن ہے۔آج یہاں سے آپ جائیں تو آپ ایک عزم کے ساتھ جائیں، کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے آپ اپنے وطن کے بگاڑ کو درست کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

مجھے اجازت دیجیئے گا۔اور تحریک حرر فاؤنڈیشن کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیئے گا۔" حسام نے سانس لی اور سامنے موجود سامعین کو دیکھا جو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

یکدم زور دار تالیاں پورے کے پورے حال میں گونجنے لگیں۔حسام کی سانس پھول رہی تھی۔بال ماتھے

پر بکھرے تھے۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔تالیوں کی گونج اب بھی برقرار تھی۔

یہ تالیاں۔۔۔اس کے کان میں پڑ رہی تھیں۔وہ خوش تھا بہت خوش۔۔۔لیکن کیا وہ اتنی خوشی کا حقدار تھا؟ کیا وہ اتنی عزت افزائی کا حقدار تھا؟ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔۔۔

حسام کی آنکھیں نم پڑیں۔وہ پیچھے بیک سٹیج آیا تو مناج اور درے اسے مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ دونوں اس کی

کارکردگی سے بہت متاثر تھے۔

"آپ نے کر دکھایا! اٹ واز اوسم حسام!" درے نے جوش میں کہا۔مناج بھی متاثر کن نگاہیں حسام پہ گاڑے ہوئے تھی۔

"بہترین! تمہارے پاس لفظوں کا ہنر ہے۔ہم اس ہنر کا آگے بھی بہترین استعمال کریں گے۔چلو میں راحیلہ

کو بلواتی ہوں اسے کچھ رپورٹس دینی ہیں۔"مناج ایک بار پھر سے رخصت ہو گئی۔حسام کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔وہ اپنے آنسو روکے ہوئے تھا۔

"کہا تھا نا میں نے کہ آپ بہت جذباتی ہیں۔اس سب کی عادت ڈال لیں حرر کے اکلوتے اسپیکر۔"درے کا انداز بہت دوستانہ سا تھا۔

"میرے لیے یہ سب بہت غیر معمولی ہے درے۔میں بھلا کیا تھا؟ ایک ڈرگ ایڈکٹ جو اپنے نفس سے بار بار ہار جایا کرتا تھا۔اور اب میں زندگی میں کچھ عظیم کر رہا ہوں درے۔میں خود سے پوچھ رہا ہوں کہ میں نے آخر ایسا کیا کیا جو خدا نے مجھے اتنی بڑی نعمت سے نواز دیا؟"حسام کے چہرے پر

الجھن سی تھی۔وہ سر جھکائے بولے جا رہا تھا۔درے چہرے کو نرم سی مسکراہٹ میں ڈھالے اسے سنتے گئی۔

"بس سب چھوڑ دیں۔مجھے راول لیک والا حسام زیادہ پسند ہے۔آپ مسکراتے ہوئے اور خوش باش زیادہ

اچھے لگتے ہیں۔" حسام کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ بکھری۔اس کے دماغ میں راول لیک کی وہ حسین یادیں لہرانے لگیں۔

"ویسے دن بدن آپ میری مینٹور بنتی جا رہی ہیں درے۔"حسام کا انداز ہی ایسا تھا کہ درے بھی ہنس دی۔

دونوں پھر آڈیٹوریم سے چلے گئے۔اب دونوں آرٹ گیلری کی جانب روانہ ہوگئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حسام کی آرٹ گیلری زیادہ بڑی نہیں تھی، لیکن کافی خوبصورت تھی۔زمین اور دیواروں پہ دھول کی موٹی تہہ اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اس آرٹ گیلری کو سالوں سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔دیواروں پہ فریمز میں مقید پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔فریمز کے شیشے پر بھی مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔زمین پہ بہت سی پینٹنگز تھیں جنہیں کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

درے پورے آڈیٹوریم کا جائزہ لے رہی تھی۔ہر پینٹنگ کسی شاہکار سے کم نہیں تھی۔

اس وقت حسام کی پرانی یادیں تازہ ہونے لگی تھیں۔وہ کس طرح سے بچپن میں یہاں آیا کرتا تھا اور سب کچھ بھول جایا کرتا تھا۔وہ کتنا آزاد تھا۔۔۔ہر بوجھ سے آزاد۔۔۔ہر تکلیف سے آزاد۔۔۔ہر قسم کے رنج سے آزاد۔۔۔کیا اس کی یہ آزادی کبھی لوٹے گی بھی؟

حسام نے سفید کپڑا اٹھایا جس سے پینٹنگز کو ڈھکا ہوا تھا۔وہ پینٹنگز فی الحال فریم پہ نہیں لگائی گئی تھیں اس لیے

ہی انہیں کپڑے سے ڈھکا گیا تھا۔درے ساری پینٹنگز کو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"ان سب میں سے آپ کی فیورٹ کون سی ہے حسام؟" حسام نے ایک نظر پوری آرٹ گیلری میں دہرائی۔اس کے لیے جواب دینا بہت آسان تھا۔اس نے آگے بڑھ کے دیوار سے ایک پینٹنگ اتاری۔درے کی طرف واپس آکے اس نے درے کو وہ پینٹنگ تھمائی۔درے اس پینٹنگ کو غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ والی۔کیونکہ یہ میری پہلی پینٹنگ ہے۔"

اس پر ایک بلی بنی ہوئی تھی جس کا فر بھورا تھا اور اس پر ٹائیگر کے جیسے سٹرائپس تھیں۔سٹرائپس کا رنگ ہلکے بھورے رنگ کا تھا۔اس کے ماتھے پر ہلکے بھورے رنگ سے لکیریں بنی ہوئی تھیں جو کے انگریزی کے ایلفابیٹ ایم جیسی لگتی تھی۔

"اور اس پینٹنگ میں میری بہت سی حسین یادیں مقید ہیں درے۔شاید اسی وجہ سے،میرے لیے یہ پینٹنگ بہت خاص ہے۔یہ پینٹنگ میں نے پہلی دفعہ اس آرٹ سٹوڈیو میں بنائی۔اسی دن میرے ڈیڈ

نے مجھے آرٹ اسٹوڈیو کا سرپرائیز دیا تھا۔میں کبھی وہ دن نہیں بھولنا چاہتا۔اور یہ جو تصویر میں آپ کو نظر آرہا ہے یہ میرا پہلا بلا ہے۔شیر خان۔اور یقین مانیں آج تک نہ جانے کتنی بلیاں پالی ہیں' مگر شیر خان جیسا بلا آج تک نہیں ملا۔میں نے یہ پینٹنگ پہلی دفعہ پروفیشنل آرٹ کٹ کا استعمال کر کے بنائی تھی۔یہ پہلا تجربہ تھا۔اس پینٹنگ کو بناتے ہوئے میں نے پہلی مرتبہ خود کو آرٹسٹ محسوس کیا تھا۔اس پینٹنگ کو دیکھتے ہی جیسے وہ ساری خوبصورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔میں ان یادوں کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔" حسام کے چہرے پہ اداس مسکراہٹ تھی۔

"بہت خوب۔" درے نے سادگی سے آنکھیں جھپکاتے کہا۔

"ایک عام انسان اس پینٹنگ کو محض ایک بلی کی پینٹنگ سمجھے گا۔مگر یہ صرف ایک بلی کی پینٹنگ ہو کے بھی کتنی گہری ہے نا؟ کتنی یادیں اس معصوم پینٹنگ سے منسلک ہیں۔یہ پینٹنگ آپ کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔مجھے اچھا لگا جان کے۔"حسام نے اپنی گردن جھکا لی، اس کے گال سرخ پڑنے لگے تھے۔

کچھ تھا درے میں، درے کی صحبت میں جو وہ بالکل خوش ہو جاتا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے وہ درے کی باتیں یوں ہی گھنٹوں سن سکتا تھا۔کیا درے بھی اس سے اسی طرح کی وابستگی رکھتی تھی؟ وہ فی الحال جانتا نہ تھا۔

اس نے آگے بڑھ کے دیوار سے ایک اور پینٹنگ اتاری۔

"یہ آپ رکھ لیجیے۔" حسام نے درے کو وہ پینٹنگ تھمائی۔وہ پینٹنگ بہت حسین تھی۔اس کے بیچ میں ایک درخت بنا ہوا تھا۔درخت کا آدھا حصہ چیری بلاسم کے درخت جیسا دکھتا تھا۔اس کے پتے لائی لیک، پنک اور سفید رنگ سے بنائے گئے تھے اور آدھے درخت کے پتے ہرے تھے۔چیری بلاسم والا حصہ دن میں ڈوبا ہوا تھا۔اور ہرے پتوں والا حصہ اندھیری رات میں۔

"یہ بہت خوبصورت ہے۔آپ کا بہت شکریہ۔" درے اس پینٹنگ کو دیکھ کے مسحور رہ گئی۔وہ پینٹنگ تھی بھی ایسی ہی، سارے رنگ آپس میں گھل کے بہت اچھا اثر چھوڑتے تھے۔

حسام مدھم سا مسکرایا۔ہاتھ پشت کی طرف باندھ کے وہ ساری پینٹنگز کو دیکھنے لگا۔اس کی بہت سی پرانی یادیں تازہ ہونے لگی تھیں۔مگر یہ یادیں اتنی تکلیف کیوں دیتی تھیں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## دبئ انٹرنیشنل ایئرپورٹ، دبئ۔۔۔

دبئ ایئرپورٹ کی بات کی جائے، تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ صرف ایک ایئرپورٹ نہیں بلکہ ایئرپورٹ سے بڑھ کے ہے۔یہاں پہ ہر طرح کی سہولیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔شاپنگ کرنی ہے؟ یہاں بہترین سے بہترین ڈیوٹی فری شاپنگ مالز موجود ہیں۔بچوں کو جھولے جھلانے ہیں؟ یہاں پہ کِڈز ایریا بھی موجود ہے۔مساج کروانا ہے؟ یہاں اعلیٰ طرز پہ بنے ہوئے بہترین سپا بھی دستیاب ہیں۔

سفید بتیاں دبئ ایئرپورٹ کی اس پرتعیش عمارت کو منور کرتی تھیں۔سفید، چمکتے دمکتے ٹائلز پہ جب یہ روشنی پڑتی

ہے تو وہ اِنعکاس ہو کے لوگوں کی آنکھوں سے ٹکراتی ہے۔یہ سب اتنا ہی پر کشش اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے کہ اگر بندا نیند کے گہرے غلبے میں بھی ہو تو اس خوبصورتی کو دیکھ کے ایک جھٹکے میں جاگ جائے۔

اس ہی خوبصورتی، اور ان ہی سہولیات کی وجہ سے یہاں پہ لوگ گھنٹوں اپنا وقت گزار سکتے ہیں، بغیر کسی

بیزاریت کے۔دبئ ایئرپورٹ واقعتا خوبصورتی کا دوسرا نام ہے۔جدید آسائشوں سے آراستہ، زندگی میں ایک بار تو یہاں کا چکر لگانا ہی چاہیئے!

دبئ ایئرپورٹ میں خطیر تعداد میں کنیکٹنگ فلائٹس رکتی ہیں۔اس کے باعث دبئ ایئرپورٹ میں کافی گہما گہمی ہوتی ہے، لیکن ایئر پورٹ اتنا بڑا ہے کہ عموماً تو اس گہما گہمی کا احساس نہیں ہوتا۔یہاں پہ جگہ جگہ بینچز پہ بیٹھے، لوگ تیز ترین انٹرنیٹ سرف کرتے نظر آتے ہیں۔

مہر اور احمد چیکس پار کر کے دبئ ایئر پورٹ کے، روشنیوں میں نہاتے اس منظر میں چل رہے تھے۔یہاں پہ انہیں مختلف رنگوں کے لوگ نظر آرہے تھے جو کہ اپنی اپنی راہوں میں رواں تھے۔ سیاہ رنگت کا حبشی ہو یا سفید رنگت والا کوئی انگریز۔کوئی کورین کوئی جاپانی اور کوئی ایشیائی تو کوئی عربی، سب اپنے ارد گرد سے بے خبر، بس اپنے آپ میں مگن تھے۔

احمد نے آدھی آستین کی کالی شرٹ پہ جینز کی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ہاتھ میں اس کے مہنگی واچ تھی، اور پیروں میں سپورٹس شوز۔مہر نے گھٹنوں تک آتی لوز سی کالی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور جینز کی

پینٹ۔ پیروں میں اس کے خاکی ہیلز تھیں۔ اس نے اپنے بالوں کو کرل آئرن سے کرل کیا ہوا تھا۔ دونوں کے انداز میں کھچاؤ سا تھا، دونوں ایک دوسرے سے کافی کھچے کھچے لگتے تھے لیکن پھر بھی ساتھ ہی چل رہے تھے۔

"تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ کھا لیتے ہیں۔" احمد کا انداز سرد سا تھا۔ وہ یقیناً اب بھی مہر سے خفا تھا۔ مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ اپنے آپ پہ قابو پا چکی تھی لیکن چہرہ اب بھی مرجھایا ہوا تھا۔

دونوں نے ایک ریسٹوران سے برگرز لیے اور آمنے سامنے ٹیبل پہ بیٹھ کے لذیذ سے برگر کے لقمے بھرنے لگے۔ یہاں کھانے کا ذائقہ بھی قدرے مختلف تھا اور برگر بھی پاکستان کے عام برگرز سے کافی بڑا تھا۔

"آپ کو یہاں آ کے میری ماں کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔" مہر لا تعلق سے انداز میں بولی تھی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں ڈنڈنا رہی تھیں۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے اندھیرے اور برائی کی ملکہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا۔ وہ معاہدہ اسے ستائے جا رہا تھا۔

"کیا آپ کو واقعی لگتا ہے کہ میں نے کوئی انتظام نہیں کیا ہوگا؟ آپ کیا احمد یوسف کو جانتی بھی ہیں مہر؟ ظاہر ہے میں سب دیکھ بھال کے آیا ہوں۔ ان لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔" احمد کا انداز اب بھی سرد سا تھا، انداز میں تلخی بھی گھلی ہوئی تھی۔ جہاں مہر کچھ پرسکون ہونے لگی وہاں اسے احمد کا تلخ انداز اندر سے کاٹ رہا تھا۔ اگر اسے اندازہ ہوتا کہ وہ ان ہیروں کے کھیل میں احمد کو اپنا دل دے بیٹھی تھی، تو وہ کبھی بھی لیڈی اقتدار سے وہ معاہدہ نہ کرتی۔۔۔ لیکن اب، اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

مہر نے سب کچھ جھڑکا، ماحول میں پھیلے تناؤ کو زائل کرنے کے لیے اس نے بات جاری رکھی۔

”ویسے آپ کو ایک دفعہ جمیرا جانا چاہئے۔دبئی کا بہت خوبصورت اور عالی شان سٹیٹ ہے۔“وہ گیلی سانس اندر کھینچتے، مسکرا کے گویا ہوئی تھی۔

احمد کے چہرے کے تاثرات اچانک نرم پڑے۔اس کی نکھوں میں شرارت جھلکنے لگی۔

”ایک دفعہ ایمریٹ ہلز بھی ضرور جائیں۔یہ تو میرا فیورٹ اسٹیٹ ہے۔یہاں کا نظارہ اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔اور دبئ مرینا تو بہت ہی حسین ہے۔اب اگر آ ہی گئے ہیں،تو دبئ کو بھرپور ایکسپلور کیجیۓ گا۔“مہر برگر کا لقمہ بھرتے کہے جارہی تھی۔وہ احمد کو نہیں دیکھ رہی تھی جو کے بنا آواز کے ہنسے جا رہا تھا۔احمد نے ڈھیروں جد و جہد کے بعد اپنی ہنسی کو قابو کیا۔وہ اب نارمل سے انداز میں برگر کا لقمہ بھرنے لگا۔

”آپ کہاں جائیں گی؟“ احمد نے اپنے انداز کو سرد رکھنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن سچ تو یہ تھا کہ اب وہ سرد نہیں ہو پا رہا تھا۔

”جمیرا جاؤں گی یا ایمریٹ ہلز۔“ مہر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔”ڈیڈ کے ساتھ جب بھی آتی تھی وہیں پر رکتی تھی۔“ احمد کے سر پر سایہ سا لہرانے لگا۔

”ویسے مجھے نہیں لگتا آپ کو وہاں جانا چاہئے۔“ احمد نے سرسری سا کہا۔مہر کچھ الجھ گئی۔

”وہ کیوں؟“ مہر نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ کا کاروبار ڈوب رہا ہے مہر۔ آپ کے اوپر قرضے کا بوجھ سوار ہے۔ جمیرا اور ایمریٹ ہلز انتہائی مہنگے علاقے ہیں۔ یہاں کم سے کم بھی ایک رات کا کرایہ تین لاکھ روپے تک کا ہوگا۔ کیا واقعی اس کرائسز میں آپ کو اتنا پیسہ برباد کرنا چاہئے؟" احمد نے بھرپور کوشش کی اپنا انداز بے نیاز سا رکھے۔ وہ مہر کو یہی تاثر دینا چاہ رہا تھا کہ اسے مہر کے کہیں بھی رکنے سے کوئی غرض نہیں، حقیقت اس سے برعکس تھی۔۔۔

مہر احمد کی بات سن کے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اسے واقعی جمیرا یا ایمرٹ ہلز جانا اب ایک اچھا آئیڈیا نہیں لگ رہا تھا۔

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے ایمپلائیز، وہ کیا سوچیں گے۔ اب آپ بتائیں میں کہاں جاؤں؟ "

مہر نے جب یہ کہا تو احمد نے اندر ہی اندر سکون بھری سانس خارج کی۔ اب اسے اس بے وقوف لڑکی کے لیے دن کے تین

لاکھ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ شکر! اس نے سوچا۔

"القصیص چلتے ہیں۔ وہاں پر ایک مناسب سا ہوٹل موجود ہے۔" احمد نے کہہ کے شانے اچکا دیے۔

"ٹھیک ہے ہم چلیں۔۔" مہر کا برگر کا لقمہ بھرتا ہاتھ تھما۔ الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

"ایک سیکنڈ۔ آپ کو یہ سب کیسے پتا؟ القصیص کے بارے میں؟ جمیرا کے بارے میں؟" مہر نے اچنبھے سے پوچھا۔ احمد کے چہرے پہ جتاتی مسکراہٹ بکھری۔

"کیونکہ دبئی میرا دوسرا گھر ہے آنٹی جی۔ اور یہ کچھ دیر پہلے مجھے آپ کیا کہے جا رہی تھیں؟" احمد کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا۔ اب وہ مڑ کے جانے لگا۔ مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے اسے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا؟ اس نے سوچا۔ وہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کھڑی ہوئی اور احمد کے ساتھ، اپنے بیگز ہاتھ میں تھامے باہر جانے لگی۔

رات کے اس وقت جب ائیرپورٹ کی ٹھنڈی اور خوشگوار فضا سے قدم باہر نکالے تو گرم گرم بھپکے دونوں کے جسم سے ٹکرانے لگے۔ سڑکوں کی پومنٹ میں انہیں ہر طرح کے لوگ چلتے نظر آ رہے تھے۔ انگریز، ایفریکن، پاکستانی اور انڈین۔ سب اپنے آپ میں مگن چل رہے تھے۔ مگر کسی کا بھی لباس زیادہ بے پردہ نہ تھا۔

"مگر آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا کہ آپ دبئی کے ہیں؟" مہر نے باہر نکل کے پوچھا۔ احمد نے مسکراہٹ دبائی اور خاموش ہی رہا۔ اس نے مہر کے سوال کا جواب نہ دیا۔

دبئی کی سڑکوں میں پولیس کی ہیوی بائیکز کے علاوہ کوئی دوسری بائیک عموماً نظر نہیں آتی۔ ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اسٹائیلش اسٹریٹ لائیٹس کے باعث سڑکیں کافی منور ہوتی ہیں۔ پاکستان کے بر عکس سڑکوں کی سطح بہت ہموار تھی۔ سڑک میں گڈے وغیرہ، بالکل بھی نہ تھے۔ سڑک بے انتہا صاف ستھری تھی۔

دبئی میں مگر درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہوا بھی کافی حبس آلود ہوتی ہے۔ یہاں سالہ سال گرمی ہی رہتی ہے کیونکہ دبئی دراصل ہے تو صحرا ہی۔ اسی درجہ حرارت کی وجہ سے دبئی میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا جا سکتا۔ یہاں پر سردیوں میں بھی درجہ حرارت میں بس مختصر ہی کمی آتی ہے۔

اسی گرم فضا سے جان چھڑانے کے لیے احمد اور مہر نے فوراً ہی سفید ٹیکسی پکڑی۔ اپنے بیگز ڈگی میں ڈال کے دونوں ٹیکسی کی پچھلی نشست پہ براجمان ہو گئے۔ اے سی کی ٹھنڈک کی وجہ سے ماحول کافی خوش گوار تھا۔ احمد اب بھی مہر سے زیادہ بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ مہر کو یہ بہت کھلنے لگا تھا۔

”لیونڈر ہوٹل النابدا جانا ہے۔“ احمد نے ٹیکسی والے کو انگیریز میں کہا۔

”آپ کتنے سال دبئ میں رہے ہیں؟“ مہر نے دونوں کے درمیان حائل تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

”پندرہ سال۔ میں پندرہ سال کا تھا، جب بابا کی جاب چلی گئ تھی اور ہمیں پاکستان آنا پڑا۔ ورنہ میں نے آدھی سے زیادہ زندگی تو دبئ میں ہی گزاری ہے۔ اسی لیے میں دبئ کو اپنا دوسرا گھر مانتا ہوں۔“ احمد کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دل ہی دل میں دبئ کو بہت پسند کرتا تھا۔

”اچھا، میں آپ کے دوسرے گھر کے بارے میں جاننا چاہوں گی۔“ مہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ احمد مدھم سا مسکرا دیا۔ اس کا موڈ بھی اچھا ہونے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ سب انیسوی صدی میں شروع ہوا تھا۔ ایک قبیلہ مچھلیوں کے شکار کے لیے دبئ کے ساحل پہ قابض ہوا تھا۔ اور یہاں سے ہی دبئ میں آبادی کا یہ سلسلہ رواں ہوا۔ لیکن، دبئ ہمیشہ سے ہی اتنا دلکش، جدید اور خوبصورت نہ تھا، جتنا آج ہو گیا ہے۔

یہ تو محض ایک بنجر صحرا تھا جہاں اونچی بلڈنگز اور آسائشوں کا تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تو گھاس پھونس کا نام و نشان تک نہ تھا۔

دبئ نے در حقیقت ترقی اپنے تیل کے ذخائر کی دریافت کے بعد کی۔اور پچھلے تیس سالوں میں دبئ کا نقشہ ان ذخائر نے بدل کر رکھ دیا۔جتنی ترقی کئ ممالک صدیوں میں نہ کر سکے اتنی ترقی دبئ نے بس تیس سالوں میں ہی کر دکھائی۔

دبئ کی غالب خصوصیت اس کی بلند و بالا، چمکتی دمکتی منور عمارتیں ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ، نیلے پانی سے فروزاں ساحل بھی۔یہاں کے ساحل انتہائی خوبصورت ہوتے ہیں۔ساحلوں کے ارد گرد سفید ریت بچھی ہوئی ہوتی ہے، اس سفید ریت میں گند کی ملاوٹ دور دور تک نظر نہیں آتی۔سمندر کا نیلا پانی، دیکھنے والے کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔پانی اتنا صاف اور شفاف ہوتا ہے کہ سمندر کی سطح با آسانی نظر آ جاتی ہے۔ساحل کے پاس ہی پام کے درخت بھی ہیں جو کہ دبئ کے ان ساحلوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔

**"(مجھے جب سے ہوش آیا میں دبئ میں ہی تھا۔ہاں، اگر کوئی دبئ کو پہلی مرتبہ دیکھے تو اس کی خوبصورتی دیکھ کے بالکل دنگ رہ جائے، لیکن مجھے اس سب کی عادت ہے۔یہاں پر ہر کسی کو ایک معیاری طرزِ زندگی جینے کو ملتی ہے۔وہ طرز زندگی جو کسی بھی ترقی پزیر ملک میں پایا جاتا ہے۔لیکن بد قسمتی سے، پاکستان کی عوام چھوٹی سے چھوٹی ضروریات کے لیے بھی ترسا دی جاتی ہے۔۔)"**

رات کے اس پہر بھی دبئ چمک رہا ہوتا ہے۔اگر کراچی پاکستان کا روشنیوں کا شہر ہوا تو اس حساب سے تو دبئ دنیا کو سورج ہی ہوا۔پیومنٹ پہ لگی اسٹریٹ لائیٹس اور منور عمارتیں دبئ کو چمکا کے رکھے ہوئے ہے۔یہ لائیٹس بھی بہت ہی اسٹائیلش سے طرز پہ لگائیں گئ ہیں۔

یہاں کی سڑکیں بہت کشادہ ہیں۔ہموار سڑکوں کے باعث سفر بہت آسان ہوتا ہے۔پاکستان کی ناہموار سڑکوں پہ سفر کرتے ہوئے جہاں کوئی ان گنت جھٹکے لگتے ہیں، یہاں پہ سفر کرتے وقت جھٹکوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

**(ایسا نہیں تھا کہ ہم بہت زیادہ آمدنی والے لوگ تھے۔نہیں ہم عام آمدنی والے لوگ تھے مگر، یقین جانیں ہم پاکستان کے امراء سے بھی بہتر زندگی گزارا کرتے تھے۔ہم عام آمدنی والے لوگ تھے مگر پھر بھی میرے پاس ہمیشہ نئے ماڈل کا موبائل ہوتا تھا۔میں کھلے عام سڑکوں پہ، موبائل ہاتھ میں پکڑے گھوما کرتا تھا کیونکہ یہاں پر چوری کا تو کوئی تصور ہی نہیں۔مجھے تو جیبوں میں والٹس اور موبائل ڈالنا پاکستان میں آکے معیوب لگتا تھا۔)**

دبئی میں دو طرح کے علاقے عام طور پہ ہوتے ہیں۔ایک بہت مہنگے اور عالی شان۔ایک تھورے سستے مگر اس کے باوجود، قدرے عالی شان۔

عالی شان علاقے جیسے جمیرا ایمریٹ ہلز میں تو ہمیں صرف محل ہی محل نظر آئیں گے۔اونچی عالی شان عمارتیں ہر طرف کھڑی ہوئی ہوں گی۔مہنگی سی مہنگی جدید سے جدید گاڑیاں ہمیں سڑکوں پہ رواں دواں نظر آئیں گی۔

دبئی کہ تھوڑے سستے علاقوں کا طرز زندگی مہنگے علاقوں سے بہت منفرد ہے مگر پھر بھی یہ طرز زندگی بہترین ہے۔یہاں پر بھی اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔خوبصورتی سے بنائے گئے پارکس اور سیاحی مقامات بھی موجود ہیں۔جدید گاڑیاں ادھر بھی نظر آتی ہیں۔ادھر بھی سڑکیں کشادہ ہی ہوتی ہیں اور عالی شان شاپنگ مالز ادھر بھی پائے جاتے ہیں۔

**(میں ہر ہفتے باہر کا کھایا کرتا تھا۔شاپنگ مالز میں گھوما کرتا تھا،اور اچھی سے اچھی چیزیں پہنا کرتا تھا، خریداری کرتا تھا۔مطلب عام آمدنی کے باوجود ہمارے پاس ہر آسائش میسر تھی۔)**

دبئ کے شاپنگ مالز بہت دلشاد اور ہشاش بشاش ہوتے ہیں۔یہاں ہر قسم کے برانڈز ہمیں نظر آئیں گے۔شاپنگ مالز میں ہر طرح کی سہولیات بھی موجود ہیں۔یہاں ہمیں چھوٹے چھوٹے لڑکے اکیلے شاپنگ کرتے دکھیں گے۔عرب بھی ہمیں بہت نظر آئیں گے۔عرب ہمیشہ اپنے روایتی لباس میں ہی پھرتے ہیں۔بہت کم ہی ہوگا کہ ہمیں کوئی عرب اپنے روایتی لباس میں نہ ملے۔عرب یہاں کے بہت خوش اخلاق اور نرم مزاج ہوتے ہیں۔

اور یہ تھا احمد یوسف کے دوسرے گھر، دبئ کا ایک مختصر سا نظارہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لیونڈر ہوٹل النہدا کالے آسمان تلے بھرپور چمک رہا تھا۔ہوٹل اس وقت آسمان کی بلندیوں کو چھوتا نظر آرہا تھا۔سامنے سے بلڈنگ گولائی میں بنی ہوئی تھی۔شیشے کی دیواریں نظر آتی تھیں جن پہ بلو ٹنٹ لگایا گیا تھا، جس کے باعث باہر سے وہ نیلی دکھائی دیتی تھی۔ہوٹل کافی حسین طرز پہ بنایا گیا تھا اور کافی ماڈرن بھی تھا۔

مہر اور احمد کی وہ سفید ٹیکسی لیونڈر کے داخلی دروازے کے پاس آکے رکی۔ دونوں گاڑی سے ساتھ ہی اترے اور پھر دونوں نے سوٹ کیس نکالے۔اس کے بعد ٹیکسی اپنی راہ چل دی اور مہر اور احمد اپنی۔

مہر اوپر سے نیچے، نظریں گھماتے اس حسین و جمیل ہوٹل کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو اس ہوٹل کے بارے میں کیسے پتا تھا؟" مہر نے ہوٹل کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"چار سال پہلے آپا اور فیروز بھائی کے ساتھ آیا تھا تو ادھر ہی رکا تھا۔اس ہوٹل کا کرایہ زیادہ نہیں اور سہولیات بہترین ہیں۔پول ایریا ہے، بڑے بڑے کمرے ہیں۔بھلا اور کیا چاہئے ہمیں؟ ویسے آپ کو شاید عادت ہو جمیرا کے اس سے بھی بڑے ہوٹلوں میں رکنے کی۔"

"نہیں۔میں کون سا روز روز آتی تھی۔دو تین دفعہ ہی آئی ہوں، بس۔" مہر نے کہتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

اب دونوں اس حبس زدہ ماحول کو پیچھے چھوڑ کے ہوٹل کی ٹھنڈی اور خوشگوار فضامیں داخل ہوئے۔ الناہدا کی لابی بھی کافی خوبصورت تھی۔چھت پہ لگی بتیوں کے باعث لابی چمک رہی تھی۔لابی میں ہی جگہ جگہ نرم و ملائم صوفے رکھے ہوئے تھے۔دیوار کے ساتھ، کونے میں ایک ریسیپشن بنایا گیا تھا۔

ریسیپشن پہ جا کے احمد اور مہر نے اپنے اپنے کمرے لیے۔احمد نے دانستہ طور پہ مہر کے برابر والا کمرہ لیا۔دونوں اپنے کارڈز سوائپ کر کے لفٹ کی جانب بڑھنے لگے۔

لفٹ میں صرف وہی دونوں تھے۔ان دونوں کو چھٹی منزل پہ جانا تھا۔احمد نے لفٹ کے بٹن دبائے تو لفٹ اوپر جانے لگی۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"لفٹ کا دروازہ بند ہوا تو مہر بولی۔

"آپ کو میری ناراضگی کی اتنا پرواہ کیوں ہے آخر؟" مہر کے ماتھے پہ بل پڑے۔وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی ناراضگی، اس کی تلخی اسے اتنی تکلیف کیوں دے رہی تھی۔۔۔پھر وہ اسے کیسے بتاتی؟

"آپ جانتی ہی ہیں کہ سب ٹھیک جا رہا تھا۔" احمد بولا۔مہر اب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔"مگر پھر آپ نے چیزیں چھپانا شروع کر دیں۔جب تک آپ چیزیں چھپانا نہیں چھوڑیں گی ہم شاید کبھی ساتھ کام نہ کر سکیں۔میں آپ کا انتظار کروں گا، جب بھی چاہیں مجھے سب سچ سچ بتا دیں۔" احمد کی بات ختم ہوئی تو لفٹ بھی رک گئی۔دروازہ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ کھلا تو چھٹے فلور کی ہشاش بشاش راہداری ان دونوں کی نظروں کے سامنے نمودار ہوئی۔

احمد مہر کو پیچھے چھوڑ کے راہداری میں قدم اپنے کمرے کی جانب بڑھانے لگا۔

مہر کے قدم زنجیر ہو گئے۔وہ بھلا اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس ظالم ملکہ کے ساتھ ایک ڈیل کر کے آ رہی تھی۔وہ ڈیل جس نے اس کے ہاتھ باندھ کر رکھ دیئے تھے۔مہر کو پچھتاوا ہونے لگا تھا۔کاش وہ اس وقت وہ شرط نہ رکھتی۔۔۔کاش!

لفٹ کا دروازہ بس بند ہی ہونے لگا تھا کہ مہر ہڑبڑا کے باہر نکلی۔وہ راہداری میں تیزی سے چلنے لگی۔ احمد اپنے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

"آپ ویسے کیوں آئے ہیں؟" مہر تھوڑا اونچی آواز میں بولی تھی۔

"میں اب کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔کل ملیں گے۔"احمد نے کی کارڈ دروازے پہ لگایا تو دروازے کا لاک کھل گیا۔

مہر ایک بار پھر وہیں کھڑی رہی۔ یہ تلخی ہر گزرتے وقت کے ساتھ اسے زخم آلود کرتے جا رہی تھی۔

اس نے بے دلی سے کی کارڈ دروازے پہ لگایا۔اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔وہ اب کمرے میں داخل ہوئی۔

مہر کا کمرہ کافی بڑا تھا۔کمرے میں آف وائٹ سا پینٹ تھا جس کی ٹون تھوڑی گرے سی تھی۔سامنے ہی شیشے کی دیوار بنائی گئی تھی جس کے پار پول ایریا نظر آتا تھا۔شیشے کی دیوار کے ساتھ گرے پردے لگائے گئے تھے۔کمرے کے بیچ و بیچ بیڈ رکھا ہوا تھا۔بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پہ ایک ٹیبل لگائی گئی تھی۔ٹیبل کے اوپر، دیوار پہ ہی ٹی وی بھی لگا ہوا تھا۔

شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک کرسی رکھی تھی جس پر اون چڑھایا ہوا تھا۔وہ کرسی کم صوفہ زیادہ تھی، کیونکہ وہ قدرے نرم تھی۔

یہ خوبصورت کمرہ، یہ جدید سہولیات، اس وقت مہر کے دل میں بسی بے قراری کو کم کرنے میں کام نہ آسکی۔وہ اپنی زندگی کو بالکل بکھرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔اس کی بیٹی اس سے دور تھی۔اس کی ماں کسی انجان جگہ پر قید تھی۔وہ اب ایک جرم کرنے دبئ پہنچی ہوئی تھی۔سب سمجھ رہے تھے کہ مہر عیاشی کرنے دبئ آئی تھی۔وہ سب کو کیسے بتاتی کہ وہ اپنے باپ کے جرائم کی سزا کاٹنے یہاں آئی ہے۔ وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساتھ بوجھل ہوتے جا رہی تھی۔

وہ نرم سے بستر پر ڈھیلی سی ہو کے لیٹ گئی۔ بستر بہت نرم تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جسم کی تھکان وہ نرم بستر جذب کر رہا ہو۔ وہ آرام دہ سی ہونے لگی تھی۔ فون کی رنگ اس کے کان میں گونجی تو مہر اٹھ کے بیٹھ گئی۔

شمس کالنگ۔ مہر نے بیزاری سے کال اٹھائی۔

"ہاں پہنچ گئی؟" شمس نے کہا۔ مہر کے چہرے پر ناگوار سا تاثر ابھرا۔ وہ اس وقت شمس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"ہاں۔ ماں کیسی ہیں؟" مہر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ماشاء اللہ سے بالکل ٹھیک ہیں۔ کہاں قیام کر رہی ہو تم؟" شمس کا انداز لاپرواہ سا تھا۔

"لیونڈر ہوٹل الناہدا۔ تمہارا بیگ میرے پاس ہی ہے۔ مجھے اب بتاؤ کہ میں کب تک اس کام سے فارغ ہو جاؤں گی۔ میں اس سب کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہوں؟" مہر نے کوفت کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں کل بیگ لینے آ جاؤں گا۔ ابھی کچھ تیاریاں کرنے دو، پھر تمہیں بتادوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ ریسٹ کرو کچھ دن۔ دبئی میں گھومو پھرو انجوائے کرو۔ تمہاری ماں محفوظ ہاتھوں میں ہے۔" شمس نے تسلی بخش سے انداز میں کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

مہر نے موبائل بیڈ پہ اچھالا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے کو تھا۔ وہ تھوڑا فریش ہونے کے لیے پول ایریا جانے کا ارادہ کر کے کمرے سے باہر نکلی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دیوار کے اس پار، احمد کمرے کے نرم و ملائم بستر پہ بیٹھا کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔یقینا اس نے کوئی بری خبر سنی تھی کیونکہ اس کے ماتھے پہ فکر کے باعث بل تھے۔روح بے چین ہونے لگی تھی۔

"ہاں اچھا کیا مجھے بتا دیا۔ٹھیک۔"کال کاٹ کے،وہ مضطرب سے عالم میں بستر سے اٹھا۔ہاتھ کھڑا کر کے وہ گردن کی پشت کھجانے لگا۔وہ شیشے کی دیوار کے سامنے ادھر ادھر ٹہلنے لگا تھا۔وہ ایک دم سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

"اف میری زندگی میں ہر بندا الٹے کام کیوں کر رہا ہے ؟یہ کیا کرتی پھر رہی ہے آپا؟"وہ بے چینی کے عالم میں زیر لب بڑبڑایا تھا۔اس نے غصے کے مارے شیشے کی دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پہ لات مار دی۔وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ تنہا ہی یہ سارا بکھیڑا کیسے صاف کرے؟

وہ اندر ہی اندر شدید پریشانی میں مبتلا تھا۔

وہ تیز تیز انگلیاں چلاتے ہوئے در فشاں کو کال ملانے لگا۔اس کے سر میں اب ٹیسیں ابھرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد در فشاں نے کال اٹھا لی۔

"ہاں احمد پہنچ گئے دبئ؟" درے نے عام سے انداز میں پوچھا۔یقینا وہ کچھ گھنٹے پہلے کی لڑائی کو سرے سے بھلا چکی تھی۔

"ہاں۔تم بتاؤ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟" احمد نے پوچھا۔درے جو کہ کچن کی صفائی کر رہی تھی ایک دم سے چونکی۔

"میں کیا کر رہی ہوں؟" وہ لا علمی بھرے انداز میں گویا ہوئی۔ اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ احمد سچ جان چکا تھا۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہی ہو؟ یہ ڈبل ایجنٹ والا ڈرامہ نہ کرو آپا، میں بتا رہا ہوں یہ کھیل بہت خطرناک ہے۔

تم کیوں اتنی خطرناک چیزیں کر رہی ہو؟ اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے تمہیں؟" وہ چبا چبا کے کہتے تائید کرنے لگا۔ وہ دبئی میں بیٹھے درفشاں کو یہ سب کرنے سے کیسے روک سکتا تھا، وہ یہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

درے کے تاثرات سخت ہوئے۔ تو احمد کو علم ہو گیا تھا۔ یقیناً یہ اس کے بھیجے گئے ہیکرز ہی تھے جو کہ ایک چھوٹی سی بات بھی اس سے چھپا نہ سکے۔ درے دل ہی دل میں ان دو ہیکرز کو لعن طعن سے نوازنے لگی۔

"تمہارے چمچوں نے تمہیں بتا ہی دیا یعنی۔ خیر میں کیوں ڈروں؟ میں کوئی غلط کام تھوڑی کر رہی ہوں۔" درے کا انداز قدرے بد لحاظ تھا۔ احمد کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا درے کے سامنے بحث کرنا بے فیض تھا، اس نے اس کی ایک نہیں سننی تھی۔

"آپا! خدا کی قسم اب اگر تمہیں کوئی مچور اور سمجھدار کہے گا ناں، میں نے قتل کر دینا ہے اس کا۔ تم سے زیادہ بچکانہ اور احمق پوری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" اس نے غصے سے تڑپتے ہوئے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ درفشاں سے اب مزید بات نہیں کر سکتا تھا۔

احمد کی آنکھوں میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔دل میں طرح طرح کے خدشات منڈلانے لگے تھے۔۔۔ مہر کے لیے۔۔۔در فشاں کے لیے۔سب کی فکر اسے ستائے جارہی تھی۔

نہ جانے ہر کوئی اس کی زندگی خراب کرنے پر کیوں تلا ہوا تھا؟ اسے ایک دم سے ہر ایک انسان سے نفرت محسوس ہونے لگی۔بھاڑ میں جائے مہر۔نا جانے اسے کن کاموں میں لگا دیا تھا۔اور یہ درے اس کے پیٹھ پیچھے کیا کر رہی تھی؟ یہ سب سوچ سوچ کے احمد کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

ایک سے بڑھ کر ایک نمونے آخر اسے ہی نصیب ہونے تھے؟ اس نے سوچ کے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔آنکھوں میں فکرمندی بڑھنے لگی تھی۔جہاں ہر کسی کو لگتا تھا کہ احمد بے حساس انسان ہے، وہاں کوئی احمد کے اس روپ سے واقف نہیں تھا۔اسے بھی سب کی فکر ہوتی تھی، اسے بھی اپنوں کی پریشانیاں ستاتی تھیں، لیکن وہ یہ سب دوسروں پر عیاں نہیں ہونے دیتا تھا۔

احمد اب آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔اسے اپنے غصے کو اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دینا تھا۔ٹیبل پہ پڑی بوتل سے ٹھنڈا پانی اس نے اپنے حلق میں نگلا۔وہ اب ٹھنڈا اور پرسکون ہونے لگا تھا۔

وہ شیشے کی دیوار کے پار دیکھنے لگا۔اسے پول ایریا میں مہر نظر آئی۔وہ اسے ٹھیک سے دیکھ سکتا تھا۔

وہ پول ایریا میں سست روی سے چہل قدمی کر رہی تھی۔اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا، چال بھی بالکل مرجھائی ہوئی تھی۔

مہر نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اسے اپنی آنکھ کی طرف لے کر گئی۔احمد سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنا آنسو پونچھ رہی تھی۔

یہ دیکھ کے، اس کے بجھے ہوئے انداز دیکھ کے، احمد کے دل کو کچھ ہوا۔وہ بھولنے لگا کہ کس طرح سے وہ اس سے سب کچھ چھپا رہی تھی۔وہ بھولنے لگا کہ کیسے مہر نے اس کا اعتماد توڑا تھا۔اس کا غصہ جتنا تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے اترنے لگا۔وہ اس سے کچھ دیر اور خفا رہنا چاہتا تھا، اس سے مزید ناراض رہنا چاہتا تھا۔لیکن وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔وہ پگھلنے لگا تھا، اس کا دل جیسے اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

وہ کمرے سے نکلا، پول ایریا جانے کا ارادہ کیا۔

جب احمد نیچے اترا تو مہر سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے ہو کے، سوئمنگ پول کے صاف اور شفاف پانی کو گھورے جا رہی تھی۔احمد اس کی طرف بڑھا اور خاموشی سے اس کے عقب میں جا کے کھڑا ہو گیا۔مہر اپنے خیالات میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے احمد کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔احمد اسے دیکھ کے اداس سا مسکرایا۔

"کیا ہوا؟ کہیں آپ سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانے کا تو نہیں سوچ رہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے طنز کرنے لگا۔مہر چونکی،اس نے مڑ کے احمد کو دیکھا جو کہ سادگی سے مسکرا رہا تھا۔مہر بھی مسکرا دی۔

یہ مسکراہٹ۔۔۔مہر کو سمجھ نہ آسکا کہ اس مسکراہٹ میں ایسا کیا تھا جو وہ یک دم اتنی خوش ہو گئی تھی؟ وہ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر کیوں مطمئن ہونے لگی تھی؟ یہ مسکراہٹ اس کے دل کو اتنا قرار کیوں بخش رہی تھی؟

"نہیں۔میں نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔" مہر نے نرم سی نگاہ احمد کی آنکھوں میں ڈالی۔احمد نے اگلے لمحے مہر کے اوپر سے نظریں ہٹائیں اور سوئمنگ پول میں دیکھنے لگا۔

"یہ تبدیلی کیسے آگئی آپ کے اندر؟" احمد نے پوچھا۔

"بس کچھ چیزیں اپنے وقت پہ سمجھ آ ہی جاتی ہیں۔اور میں مجبور ہوں احمد۔میں مجبوری کے باعث آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔میں جانتی ہوں آپ کو برا لگ رہا ہے، لیکن اپنی جگہ پہ میں، مجبور ہوں۔" احمد کو ایک مرتبہ پھر سے مہر کا دھوکا یاد آیا۔ اس نے دانستہ طور پہ موضوع بدلنا چاہا۔

"ہم کچھ دنوں تک کہیں چلیں گے۔کیا خیال ہے؟ آپ کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔" احمد کے چہرے پہ مدھم مسکراہٹ تھی۔وہ مہر کو تھوڑے بہتر حال میں دیکھنا چاہ رہا تھا۔وہ دبئ آکے کچھ زیادہ ہی مرجھا گئی تھی، اسے احساس تھا۔

اور وہ احساس ہی تو کرتا تھا، اپنے آپ سے جڑے ہر ایک شخص کا۔درے کا خیال اس کے دماغ میں سوار تھا، اس کی فکر بھی اسے ہر لمحے ستا رہی تھی اور پھر مہر، وہ اسے بھی یوں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔وہ اسے بھی یوں ٹوٹتا ہوا، مرجھایا ہوا نہیں دیکھ پا رہا تھا۔اسے ان دونوں کو ان مشکلات سے نکالنا تھا۔

"میری ماں قید ہے۔ میری کمپنی ڈوب رہی ہے اور میں سیر سپاٹے کرتے ہوئے اچھی لگوں گی بھلا؟" مہر استہزائیہ سے انداز میں بولی۔ وہ ڈیل، وہ سفاک معاہدہ جو وہ اندھیرے کی ملکہ کے ساتھ کر آئی تھی وہ ایک دفعہ پھر سے اسے یاد آیا۔

"اب اگر آپ کی زندگی میں پریشانیاں ہیں تو اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ناں کہ آپ کچھ کر ہی نہیں سکتی؟ ہم جلد کہیں نہ کہیں جائیں گے۔ بات ختم!" احمد کا انداز حتمی تھا۔ مہر اب اسے انکار نہ کر سکی۔

"ٹھیک ہے پھر۔" مہر کی آواز گیلی تھی۔ دونوں وہاں کھڑے اس اندھیری رات میں اس پول کو دیکھتے گئے۔ خاموشی کے علاوہ وہاں کوئی شے اب موجود نہ تھی۔

دونوں کچھ نہ بولے، خاموش ہی رہے، لیکن یہ خاموشی ہی کتنی سکون بخش تھی۔ کم سے کم وہ اس کے ساتھ تو تھا۔۔۔ کم سے کم۔۔۔ مہر کو ایک بار پھر وہ ڈیل یاد آئی۔ وہ کیوں اپنے ساتھ وہ کھلواڑ کر آئی؟ وہ کیوں اپنے اوپر وہ ظلم کر آئی؟ اس نے گہری سانس خارج کی اور نظر احمد پہ ڈالی جو کہ سوئمنگ پول کے نیلے پانی کو ہی گھور رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تھا۔۔۔ لیکن کب تک؟ مہر نے سوچا۔

"کیا آپ ہمیشہ ایسے نہیں رہ سکتے؟" وہ کسی گہرے غبار میں ڈوب کے بولی۔ احمد نے چونک کے مہر پہ نظر ڈالی۔ اس کے لیے مہر کا یوں کہنا غیر متوقع سا تھا۔ احمد مہر کی گہری، کالی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا جو کہ نہ جانے اس سے کیا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ آنکھیں نم تھیں، اپنے اندر نہ جانے کون کون سا کرب چھپائے بیٹھی تھیں۔

"کیا آپ ہمیشہ کے لیے میرے شانہ بشانہ نہیں رہ سکتے؟ میرے سرہانے؟ میرے ہم راہ؟" احمد نے مہر پہ عجیب سی نگاہ ڈالی۔وہ کچھ متذبذب سا ہوتا چلا گیا۔

"رات بہت ہو رہی ہے،میں چلتا ہوں۔" وہ سرسری سا کہہ کر جانے لگا۔

مہر گردن موڑ کے اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔وہ کیوں بھول رہی تھی کہ اس ڈیل کے ہوتے ہوئے وہ اور احمد ایک نہیں ہو سکتے تھے؟ وہ کیوں اتنی شدت سے اس کے ساتھ کی خواہش رکھتی تھی؟ کیااسے واقعی احمد سے محبت ہونے لگی تھی؟

وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتی کہ وہ دونوں اب ایک نہیں ہو سکتے تھے؟ ان دونوں کی راہیں تو ہمیشہ سے ہی جدا تھیں۔۔۔اور یقینا منزل بھی۔مہر نے سوچا۔

مہر نے اپنی گردن واپس اپنی جگہ پہ ٹکائی۔اب کی بار اس کے چہرے پہ سختی در آئی۔اس نے اپنی نم آنکھیں پونچھیں۔سرد نگاہیں سوئمنگ پول کے پانی پہ مرکوز کیں۔

"نہیں مہر! اس ڈیل کے ہوتے ہوئے تم اور احمد ایک نہیں ہو سکتے۔وہ تم سے بہتر کا حقدار ہے۔" کرب کے مارے مہر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔وہ کل کی گئی اس غلطی کو یاد کرنے لگی۔وہ غلطی جو بار بار اسکی اور احمد کی ملتی جلتی راہوں میں رکاوٹ بن رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## پچھلے دن:

"لیکن،، میری ایک شرط ہے!" وہ لیڈی اقتدار کی وین میں بیٹھے بولی۔لیڈی اقتدار کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا جاتا ہے۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اس وقت کوئی شرط رکھنے کی پوزیشن میں ہو؟" لیڈی اقتدار کا انداز حتمی تھا۔ وہ اپنی حیرانی کو بخوبی چھپا گئی تھی۔

"بالکل! بلکہ آپ میری یہ شرط قبول نہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں لیڈی!" مہر چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائے بولی تھی۔لیڈی اقتدار کو کچھ بہت ناگوار لگا۔یہ لڑکی آخر کیا کرنا چاہ رہی تھی؟اس نے سوچا۔

"کیا تمہیں اپنی جان کی فکر نہیں مہر؟"لیڈی اقتدار چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ لیے بولی تھی۔مہر مدھم سا ہنس دی۔لیڈی اقتدار کو یہ ہنسی، بری طرح سے کھٹک رہی تھی۔

"آپ اس وقت مجھے مارنے کی بیوقوفی نہیں کریں گی۔آپ نے ابھی بتایا کہ وہ اکاؤنٹ ڈیڈ کے تھے۔ اور انہیں صرف میں ہی کھول سکتی ہوں۔اب اگر میں ہی مر گئی تو آپ کی وہ دولت۔۔۔اس کا کیا ہوگا؟میں اگر شاید خودکشی کر لوں، تو اس کا نقصان تو سب سے زیادہ آپ کو ہی ہوگا۔ہے ناں لیڈی؟" لیڈی اقتدار کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔اب کی بار اس کے چہرے پہ حیرانگی صاف عیاں تھی۔"اس وقت آپ نے میری ماں کو مارنے کی غلطی کی تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ لوگوں کے کسی بھی کام آؤں گی؟ وہ اکاؤنٹس، جن میں آپ کا کڑوڑوں کا مال ہے وہ میرے پاس ہیں۔آپ کے پاس میری شرط ماننے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔"مہر سینے پہ انگلی سے دستک دے کر گردن اٹھا کے بولی تھی۔اس کی آنکھوں میں تپش سی تھی۔اب اس نے نظر لیڈی اقتدار کے اوپر سے

ہٹائی۔لیڈی اقتدار کو تپ چڑھنے لگی تھی، وہ یہ تو جان گئی تھی کہ یہ لڑکی اتنی آسانی سے دبنے والی نہ تھی۔

"ٹھیک ہے۔بتاؤ۔" لیڈی اقتدار کا انداز عام تھا۔

"آپ کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ احمد ہے۔میں یہ تو جان چکی ہوں۔مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس کا اور میرا ساتھ اچھا نہیں لگتا۔آپ لوگ ڈرتے ہیں کہ وہ میرے ذریعے آپ سب تک پہنچ کے آپ لوگوں کو تباہ نہ کر دے۔چلیں۔میں یہ مسئلہ حل کر دوں گی۔دبئی سے واپس آکے میں اس بات کو یقینی بناؤں گی کہ وہ میرے آس پاس بھی نہ بھٹکے۔مگر اس کے بدلے آپ کو میرے اوپر جتنا بھی قرضہ ہے وہ معاف کرنا ہوگا۔" لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں بے یقینی اتر گئی۔یہ ناممکن تھا! یہ لڑکی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔وہ قرضہ۔۔۔وہ تو ان کے ہیروں کی کنجی تھا۔۔۔قرضے سے ہاتھ دو بیٹھنا، ہیروں سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے؟" لیڈی اقتدار غصیلی آواز میں بولی تھی۔اس لڑکی نے اس کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔"اگر وہ قرضہ معاف کیا تو ہمیں وہ ہیرے کون لا کے دے گا۔" لیڈی اقتدار کی نسیں بھڑکنے لگیں۔جھریوں زدہ چہرے پہ تناؤ پھیل گیا تھا۔مہر کے چہرے پہ مسکراہٹ ہنوز برقرار رہی۔

"آپ کے کاروبار کو احمد سے خطرہ ہے لیڈی۔کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔یہ قرضہ معاف کروائے بغیر تو میں دبئی نہیں جانے والی۔مجھے نہیں لگتا کہ آپ میرے ساتھ کوئی زبردستی کر سکتی ہیں۔"

لیڈی اقتدار تھم گئی۔ وہ کیا کہتی؟ کہ وہ اس کی ماں کو مار دیتی؟

"کبھی نہیں لیڈی۔ یہ ڈیل ہم کبھی نہیں کر سکتے۔" کان میں لگے ہیڈ فون سے لیڈی اقتدار کو درانی کی خشک آواز سنائی دی۔ گاڑی میں لگے مائیکروفون کے ذریعے وہ، سنابل میں ہی بیٹھ کے ساری گفتگو سن رہا تھا۔ وہ بھی مہر کے اس رد عمل کی دور دور تک امید نہیں کر رہا تھا۔

لیڈی اقتدار کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"منظور ہے۔" لیڈی اقتدار بولی۔ مہر کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا لیڈی؟" کان میں لگے ہیڈ فون میں سے درانی کی آواز گونجی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آج شام تک آپ کے وکیل سے ملنا چاہوں گی، قرضے کا یہ معاملہ آج کے آج ہی اپنے اختتام کو پہنچ جانا چاہیے۔" حتمی انداز میں کہہ کر مہر نے دوستی کا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیڈی اقتدار نے اپنا جھری زدہ ہاتھ مہر کے ہاتھ سے ملایا۔ وہ بھی اب مدھم سا مسکرا رہی تھی۔ مہر گاڑی سے اتر کے ایک دفعہ پھر اپنے قصر کی جانب بڑھ گئی۔

لیڈی اقتدار اب گاڑی میں اکیلی تھی۔

"آپ کو یہ ڈیل نہیں کرنی چاہیے تھی۔" درانی خائف ہو کے بولا، جب کہ لیڈی اقتدار پر سکون تھی۔

"نہیں۔ ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ ہمارے اور بھی کام آئے گی درانی۔ اور اب میں اسے اپنے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اسے ہمارے شانہ بشانہ چلتے، خطرناک اور مشکل فیصلے لیتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ احمد کے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ، ہماری ٹیم کا حصہ بن کے زیادہ اچھی لگے گی درانی۔ وہ اس کاروبار

کے لیے بہت منافع بخش ثابت ہو گی۔یہ لڑکی جرائم کی دنیا میں حکومت کرنے کے لیے بنی ہے۔ جرائم کی دنیا میں اپنا نام بنانے کے لیے ہی بنی ہے۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یادوں کا سلسلہ تمام ہوا۔وہ سوئمنگ پول کے پاس کھڑی اب رونے لگی۔بغیر آواز کے۔۔۔اس کے وجود کے ساتھ گہرا پچھتاوا چمٹ گیا تھا۔

”کاش وہ معاہدہ تم نے نہ کیا ہوتا مہر۔۔۔“ وہ گیلی آواز لیے بولی تھی۔۔۔پچھتاوے کے علاوہ اب کچھ نہ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## تحریک حرر فاؤنڈیشن کا آفس، اسلام آباد۔

ستمبر کا مہینہ چل رہا تھا۔اسلام آباد کا موسم آج کل کافی خوش گوار رہتا تھا۔وقتاً فوقتاً بوندا باندی بھی برسنے لگ جاتی۔تحریک حرر فاؤنڈیشن کی عمارت کے سامنے والی روڈ فی الحال گیلی تھی۔آسمان پہ ہلکے سرمئی بادلوں کا بسیرا تھا۔

حرر کے تمام افراد صبح صبح ہی آفس میں جمع ہو گئے تھے۔اس وقت تمام ایمپلائیز حرر کے بنکر میں موجود تھے۔ڈیسک پہ لیپ ٹاپ رکھا تھا جس کے پیچھے چار کرسیاں تھیں۔راحیلہ، مناج، حسام اور در فشاں کرسیوں پہ براجمان تھے۔

حرر کے باقی ایمپلائیز پیچھے کھڑے سب دیکھ رہے تھے۔لیپ ٹاپ فی الحال بند تھا اور مناج اسے کھولنے ہی لگی تھی۔

"حسام کی ویڈیو بھی وائرل ہو گئی۔حرر کا پیغام اب اور بھی زیادہ پھیلنے لگا ہے۔یہ بھی ایک کامیابی ہے۔" مناج نے لیپ ٹاپ کھولتے سب کو بتایا۔لیپ ٹاپ اب کھل گیا تھا۔ مناج نے سافٹ ویئر کھول کے کیمراز کے ساتھ کنیکشن قائم کرنے کی کوشش کی۔سب دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ عمارہ کے کوٹ پہ لگے ان بٹنز کے ساتھ کنیکشن قائم ہو جائے۔

"مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی سب سمجھ نہ جائے۔" درے کچھ بے چین سی تھی۔اگر وہ لڑکی سب جان جائے گی تو اس کی ساری محنت مٹی میں۔وہ سوچ سوچ کے مضطرب ہوئے جا رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں۔" مناج نے کہا اور تبھی کیمراز کا سگنل بھی مل گیا۔لیپ ٹاپ ان مائیکروسکاپک کیمراز سے کنیکٹ ہو گیا تھا۔سب نے سکون کی سانس خارج کی۔ کھیل بالآخر شروع ہو گیا تھا۔

لیپ ٹاپ پہ عمارہ کے سامنے والا منظر نظر آرہا تھا۔وہ کسی ٹیکسی میں سوار تھی۔

"چلو جی۔اٹس شو ٹائم۔" پورے ہجوم میں در فشاں سب سے زیادہ پر جوش نظر آتی تھی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد عمارہ کی ٹیکسی عافیت زندگی کی عمارت کے باہر رکی۔وہ اب عافیت زندگی کی عمارت میں داخل ہوئی۔سب غور سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

عمارہ اپنی اٹینڈنس لگوانے نیلوفر کے کمرے میں گئی۔

"یہ کون ہے؟" در فشاں نے پوچھا۔اس کے لیے نیلوفر کا چہرہ معیوب تھا۔

"نیلوفر۔ عبداللہ سلطان کی بیوہ۔" حسام نے سرد سے لہجے میں جواب دیا۔

ایک دفعہ پھر سے سب کی نظریں اسکرین پہ مرکوز تھیں۔

"عمارہ پندرہ منٹ میں حال میں پہنچو۔لیڈی اقتدار نے تمام نرسز اور ڈاکٹرز کو حال میں مطلوب کیا ہے۔"نیلوفر سرد سے انداز میں کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔اس نے میز سے کچھ فائلز سمیٹی اور باہر جانے لگی۔

"کس حال کی بات کر رہے ہیں؟" درفشاں نے پوچھا۔

"دیکھنے تو دو درے۔" مناج کچھ چڑ سی گئی تھی۔درے اب بالکل چپ ہو گئی۔

"جی میم۔کچھ خاص ہے کیا؟" عمارہ نے پوچھا۔آواز میں گھبراہٹ تھی۔عموماً جب بیسمنٹ کے حال میں ان سب کو جمع کیا جاتا تھا تو کوئی بری خبر ہی ان کے سروں پہ پھوڑی جاتی تھی۔

"مجھے معلوم نہیں۔لیکن لیڈی اقتدار کافی برہم تھیں، اس لیے وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھنا۔"نیلوفر کہہ کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

عمارہ سست سی چال چلتے، مریض کے کمرے میں آئی۔وہاں پر اس نے مریض کی رپورٹس وغیرہ چیک کیں، اور پھر باہر آگئی۔

وہ عافیت زندگی کے بیسمنٹ کے اس راستے پہ گامزن تھی۔۔۔وہ سب اس راستے کو دیکھ رہے تھے۔۔۔وہی بڑا سا حال۔۔۔گول زینہ۔۔۔۔بڑا سا اسٹور روم جس میں دائیں اور بائیں طرف شیلوز تھیں۔۔۔لیڈی اقتدار کی بڑی سی

تصویر جو کہ پہلے سے ہی کھسکائی ہوئی تھی۔لفٹ بھی اوپر ہی موجود تھی۔

وہ لفٹ میں سوار ہو گئی۔لفٹ اب نیچے اترنے لگی۔

سب منظر کو حیران کن چہروں سے دیکھنے لگے۔سب دل ہی دل میں متاثر بھی تھے۔

”واہ! ایک خفیہ انڈر گراؤنڈ بیسمنٹ۔“ مناج سے بولے بغیر رہا نہیں گیا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا تو سب کے سامنے اس تین دروازے والے حال کا منظر نمایاں ہوا۔وہ تین دروازے ان کی اسکرین پہ صاف نظر نہ آتے تھے کیونکہ حال میں نرسز اور ڈاکٹرز کا بھرا مجموعہ موجود تھا۔سب بہت طریقے سے لائینز میں کھڑے ہو رہے تھے۔عمارہ بھی ایک لائن میں جا کے کھڑی ہو گئی۔وہ کافی گھبرا رہی تھی۔

ان قطاروں کے اس پار لیڈی اقتدار ہاتھ پشت پہ باندھے کھڑی تھی۔یہ بالکل ایسا ہی منظر تھا جیسے کسی اسکول کی اسمبلی کا ہوتا ہے۔بچوں کی جگہ پہ یہاں سارے نرسز اور ڈاکٹرز کھڑے تھے اور پرنسپل کی جگہ پہ لیڈی اقتدار اور اس کے برابر میں نیلوفر تھی۔حال میں کاٹ دار خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔کوئی بھی بات چیت نہیں کر رہا تھا۔

حرر کے بنکر میں بیٹھے ہر فرد کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔

”سب آ گئے نیلوفر؟“ لیڈی اقتدار نے نیلوفر کے کان میں سرگوشی کی۔نیلوفر نے گردن اثبات میں ہلائی۔لیڈی اقتدار کے پیچھے، دو بھاری جسامت والے مرد بھی کھڑے تھے۔لیڈی اقتدار کی گردن

مزید تن گئی۔اس نے اپنے چہرے پہ برہمی طاری کی۔وہ اب اپنی چیلوں کی فوج سے کلام کرنے کے لیے تیار تھی۔

"آج آپ سب لوگوں کو بھلا کیوں مدعو کیا گیا ہے؟" لیڈی اقتدار کی مغرور آواز حال میں گونجی تھی۔وہ

ان قطاروں کے سامنے ہاتھ پشت پہ باندھے ٹہلنے لگی۔چال میں وہی ملکہ والا رعب تھا اور شان و شوکت بھی۔

"کیونکہ آج مجھے،معلوم پڑا ہے کہ ہمارے درمیان ایک غدار موجود ہے۔مگر یہ تو چلتا ہی رہے گا۔ جب تک یہ کاروبار قائم ہے'تب تک ہمیں وقتاً فوقتاً چند کیڑے مکوڑے تو دکھتے رہیں گے۔" ملکہ بے نیازی سے کہہ کے شانے اچکا گئی۔

"ان کیڑے مکوڑوں کو کچلنا ہمارا کام ہے۔" لیڈی اقتدار اب تھم کے سب کو دیکھنے لگی۔"ان کیڑے مکوڑوں کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے۔اور آج میں تم سب کے سامنے اس ایک کیڑے کا خاتمہ کروں گی۔تاکہ وہ تمہارے لیے عبرت بن سکے۔" آخری کا فقرہ لیڈی اقتدار نے چبا چبا کے ادا کیا۔بھاری نسوانی آواز میں تپش کی آمیزش تھی۔ہر نرس اور ڈاکٹر کا دل لرزنے لگا تھا۔ وہ لیڈی اقتدار کے زیر اثر مرعوب ہونے لگے تھے۔

لیڈی اقتدار نے ہاتھ بڑھایا تو نیلوفر نے اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھما دی۔

وہ اب ایک ایک کر کے ہر ورکر کا جائزہ لینے لگی۔ بھاری بھرکم مرد اس کے پیچھے پیچھے ہی چل رہے تھے۔ وہ ہر ایک ورکر کے پاس آ کے رکتی، کچھ دیر کے لیے اسے گھورتی اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ ظالم لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں جھانک بھی لے۔

اب لیڈی اقتدار عمارہ کی طرف آئی۔ حرر کے کارندے اب لیڈی اقتدار کو بہت پاس سے دیکھ سکتے تھے، اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو ان سب کے اوپر دہشت چھوڑ گیا تھا۔

لیڈی اقتدار نے عمارہ کا جائزہ لیا۔ اسے کچھ دیر گھورا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔۔۔ وہ وہیں کھڑی، شعلہ باز نگاہیں لیے اسے گھورتی رہی۔

عمارہ کی سانسیں بے قابو ہونے لگیں۔ لیڈی اقتدار آخر اس کے پاس کیوں رک گئی تھی؟ اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ عمارہ کو سوچ سوچ کے، ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔

وہ پشت پہ ہاتھ باندھے عمارہ کو گھورتے گئی۔ عمار کی جرات نہ ہوئی کہ لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں دیکھ سکے۔ لیڈی اقتدار مسکرا دی۔

"پکڑو اسے۔" لیڈی اقتدار کی آواز گونجی ہی تھی کہ اس کے ساتھ چلتے مردوں نے عمارہ کو بازوؤں سے تھام لیا۔

عمارہ بوکھلا کے لیڈی اقتدار کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی اور بے یقینی تھی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ اس نے ایسا کیا کیا جو اس کے ساتھ یہ کیا جا رہا تھا۔

حال میں موجود تمام ورکرز پیچھے ہٹ گئے۔اب وہ قطاروں کی صورت میں نہیں کھڑے تھے بلکہ ہجوم کی صورت میں کھڑے کسی تماشائی کی طرح وہ منظر دیکھ رہے تھے۔بیسمنٹ میں ہر طرف انتشار پھیل گیا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا لیڈی۔میرا یقین کریں۔" عمارہ گڑگڑانے لگی۔لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں بے دردی تھی۔

"تمہارا مرنا ضروری ہے لڑکی۔تم ضرور مرو گی۔" وہ برفیلے سے انداز میں بولی تھی۔عمارہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔عمارہ کے سامنے اس کی موت کھڑی تھی۔اس کا کلیجہ حلق میں آگیا تھا۔وہ اس سب سے کیسے بھاگ سکتی تھی، اور کیا بھاگنے کا کوئی راستہ موجود بھی تھا کہ نہیں؟وہ سوچنے لگی۔

لیڈی اقتدار نے اپنی گردن آگے کی، اس کے لب عمارہ کے کانوں کہ بالکل قریب تھے۔اس کے چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ تھی۔

"میں جانتی ہوں تم بے گناہ ہو۔"عمارہ یہ سنتے ہی ششدر سی رہ گئی۔"مگر میں تمہیں مار کر اپنے دھندے کو بچا رہی ہوں۔ان لوگوں سے جو ان کیمروں کے پیچھے مقید ہیں۔" لیڈی اقتدار نے عمارہ کے کان میں بالکل دھیمی آواز میں

کہا۔حال میں کسی کو بھی اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔وہ اپنا پیغام حرر کے کارندوں تک پہنچا چکی تھی۔

عمارہ کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی۔تو وہ صرف قربانی کا بکرہ تھی؟ کیا اس کی جان اتنی ہی بے معنی تھی۔۔۔؟ لیکن اب وہ بھی کیسے بھاگتی۔اس کے ہاتھ ان بھاری بھرکم مردوں کی گرفت میں تھے۔۔۔فرار نا ممکن تھا۔مایوسی کے بادلوں نے عمارہ کو گھیر لیا تھا، وہ ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔

"تم لوگوں کو میں چن چن کے ماروں گی۔تم لوگوں کو جلا کے راکھ کردوں گی میں۔تم سب کو مجھ سے ڈرنا چاہیے۔لیڈی اقتدار کے گھونسلے میں قدم رکھنے کی سزا، تم سب بھگتو گے۔" لیڈی اقتدار غرائی تھی۔۔حرر کے آفس میں موجود ہر شخص نے جھرجھری لی، سب کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ درے کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ان سب میں سب سے زیادہ خوف زدہ وہ لگتی تھی۔اس کا ہاتھ اس کے سینے تک آیا۔لیڈی اقتدار نے اس رسی کا پھندا بنایا۔

"پلیز لیڈی مجھے مت ماریں۔مجھے چھوڑ دیں۔" عمارہ گڑگڑائی۔لیکن لیڈی اقتدار کے اوپر کوئی اثر نہ ہوا۔اس نے اس پھندے کو عمارہ کی گردن پہ کسا اور اسے زور دے کے کھینچا۔عمارہ کا دم گھٹنے لگا۔ حلق میں اس کے تکلیف ابھرنے لگی۔اس کا سانسیں لینا محال ہونے لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز آنے لگی۔اس کا چہرہ پھولنے لگا۔اس کی ٹانگ اور ہاتھ بے بسی کے مارے تھر تھرانے لگے۔اور پھر عمارہ کا چہرہ نیلا پڑنے لگا۔اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شدت بھری تکلیف میں مبتلا تھی۔وہ تکلیف کی اس کیفیت میں کچھ دیر یوں ہی تڑپتی رہی۔موت عمارہ کے سر پہ ہی منڈلا رہی تھی۔۔۔موت کا وار بس عمارہ کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھا۔

اور ایک وقت آیا جب عمارہ کی جسم میں موجود حرارت ختم ہوئی، اس نے ہر حرکت کرنا بند کر دی۔ لیڈی اقتدار نے رسی پر سے گرفت ڈھیلی کی تو عمارہ کا بے جان وجود ڈھیلا ہو کر زمین پر گر گیا۔حال میں موجود ہر فرد اس بھیانک منظر کو آنکھوں میں خوف لیے دیکھ رہا تھا۔

لیڈی اقتدار عمارہ کے بے جان وجود کو چھوڑ کے اب مڑی۔وہ اب ہر ورکر کو دیکھنے لگی۔آنکھوں میں جتاتا تاثر تھا، ان آنکھوں میں دھمکی سی نمایاں تھی، وہ جیسے ان تمام ورکرز کو بتانا چاہ رہی تھی کہ ان سب کی اوقات بس اتنی ہی تھی، ذرا سی غلطی پر وہ بھی یوں ہی مار دیئے جانے تھے۔

"جو بھی بے وفائی کرے گا، اس کی سزا صرف موت ہی ہو گی، صرف اور صرف موت۔"وہ آنکھیں پھاڑ کے غرائی تھی۔

نیلوفر بھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔یہ پہلی بار تھا جب اسے یہ سب شدت سے برا لگ رہا تھا۔اس کے دل کو کچھ ہوا تھا، یہ سب دیکھ کے اس کے دل کو کچھ نہایت برا لگا تھا۔شاید اس کا سویا ہوا نفس جاگنے لگا تھا۔۔۔

"چلو اب سب کام پر لگو۔" نیلوفر بلند آواز میں بولی تو ایمپلائیز حال چھوڑ کے ایک ایک کر کے جانے لگے۔اب لیڈی اقتدار اور نیلوفر بالکل اکیلے تھے۔

لیڈی اقتدار اب نیلوفر کی طرف جانے لگی تھی۔۔۔

مناج نے ایک جھٹکے میں لیپ ٹاپ بند کیا، وہ اب مزید وہ منظر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

در فشاں سینے پہ ہاتھ رکھ کے اونچی اونچی ابکائیاں بھرنے لگی۔وہ ہڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔ایسا لگتا تھا جیسے اس نے کوئی چڑیل دیکھ لی ہو۔وہ خوف اور دہشت میں مبتلا لگتی تھی۔

در فشاں سب کچھ چھوڑ کے بنکر سے باہر نکلی۔باقی سب اپنے چہروں پہ ہاتھ رکھے اسے ایسا کرتے دیکھ رہے تھے۔تمام افراد سکتے میں آگئے تھے۔

مناج اونچی اونچی سانسیں لینے لگی۔یہ سب کیا ہوتا تھا؟ کیا ان سب کے لیے جانیں لینا اتنا آسان تھی؟ وہ سوچنے لگی۔کیا یہ لوگ اتنے برے تھے کہ اپنے لوگوں تک کو نہیں چھوڑتے تھے۔اس دن مناج کو احساس ہوا کہ برائی کی انتہاء تو انسانوں پر ہی شروع ہوتی ہے۔

مناج ہمت نہ ہاری۔وہ ان سب کی لیڈر تھی۔اسے ان سب کی ہمت بندھانی تھی۔وہ ہمت جمع کرتی کھڑی ہوئی اور بنکر سے باہر نکلی۔وہ سیدھا واشروم میں داخل ہوئی۔

واش روم میں در فشاں سنک میں جھکی الٹی کر رہی تھی۔اس کا حال ایک دم سے بالکل خراب ہوگیا تھا۔اس کی آنکھوں کے ارد گرد نمی اکٹھا تھی۔اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔مناج درے کی طرف سست سست قدم بڑھا رہی تھی، اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی درے تھی، جو اسے تھیراپیز دیا کرتی تھی، یہ وہی درے تھی جو اس کے ساتھ شاپنگ کیا کرتی تھی۔در فشاں نیم پاگل سی لگ رہی تھی۔وہ اپنے ہوش میں نہیں لگتی تھی۔

درے نے سنک سے اپنا سر اٹھایا۔وہ پھٹی پھٹی نم آنکھوں سے مناج کو دیکھنے لگی۔مناج کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ درے کو کیا کہتی۔

"یہ مجھ سے کیا ہو گیا مناج؟" درے نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے گالوں کو چھوا۔اس کے بالوں کی پونی ڈھیلی ہوگئی تھی۔بال پونی سے نکل کے اس کی پیشانی پہ چپک گئے تھے۔"مجھ سے ایک قتل ہوگیا۔میں نے اپنے آپ کو برباد کر دیا۔" درے نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی کنپٹی مسلی۔وہ اونچی اونچی سانسیں لے رہی تھی۔وہ دیوانی سی لگتی تھی۔مناج درے کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔

کبھی کبھی کچھ انسان اپنے آپ کو اتنا مضبوط ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا بھلا بیٹھتی ہے کہ وہ بھی ہر انسان کی طرح ٹوٹ سکتے ہیں، اس وقت بھی مناج کی یہی کیفیت تھی۔اسے درے کا یہ حال غیر یقینی لگ رہا تھا۔

"نہیں درے۔ہوش میں آؤ۔" مناج نے درے کو اس کے کندھوں سے تھاما۔مضبوط اعصاب کا ہونے کے باوجود بھی اس لمحے درے اپنے اعصاب کھو گئی تھی۔

"درے میری بات اطمینان سے سنو۔" درے اپنا سر تیزی سے نفی میں ہلانے لگی۔وہ دہشت، خوف اور جنون کی کیفیت میں مبتلا تھی۔مناج نے درے کے گالوں کو کستی سے تھاما۔اس نے اپنا چہرہ درے کے چہرے کے قریب کیا۔

"اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔تم نے لویزا کو قتل کرنے کا نہیں کہا تھا۔ہمارے پلان میں قتل کبھی بھی شامل نہیں تھا۔" مناج بلند آواز میں زور دے دے کے کہہ رہی تھی۔درے کی آنکھیں اب بھی خوف کے مارے پھٹی ہوئی تھیں۔وہ سر نفی میں ہی ہلاتے گئی۔

"مگر وہ میری وجہ سے قتل ہوئی۔ وہ میری وجہ سے مر گئی ہے۔" درے نے مناج کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نکلا۔ یہ پہلی بار تھا کہ در فشاں احمد کے علاوہ کسی کے سامنے روئی تھی۔ اس وقت اس کے آنسو بھی اس کے اختیار میں نہیں رہے تھے۔ مناج دم بخود رہ گئی۔ درے کا رونا۔۔۔ بہت عجیب گزرتا تھا۔ درے بھی رو سکتی تھی؟ اسے حیرت نے جکڑ لیا۔

"نہیں درے۔ ہوش کرو۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ ہوش کرو۔" مناج کی سانسیں بھی پھولنے لگی تھیں، اس کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔ اپنی بہترین دوست کا یہ حال اس کے اوپر گراں گزر رہا تھا۔ وہ اس کو کندھے سے دبوچ کر باہر لے کر آئی۔

باہر باقی سب درے اور مناج کو پریشان چہروں سے تک رہے تھے۔ مناج نے درے کو صوفے پہ بٹھایا۔

"پانی لاؤ جلدی۔" مناج نے اونچی آواز میں کہا تو حسام نے جگ سے پانی نکال کر مناج کے حوالے کیا۔ حسام بہت پریشان لگ رہا تھا۔ درے کا یہ حال اس کے لیے بھی غیر یقینی سا تھا۔

"میں قاتل بن گئی ہوں۔" درے نے بد ہواسی کے عالم میں کہا۔ مناج نے درے کے منہ پہ سارا پانی پھینکا تو درے نے جھٹکا لیا۔ اس کی کپکپاہٹ دم توڑ گئی۔ وہ جیسے نیند سے ایک دم جاگی تھی۔

"تم نے کچھ نہیں کیا در فشاں۔ تم اس کی ذمہ دار نہیں ہو۔" درے کی کپکپاہٹ اب مکمل فنا ہو گئی۔ وہ اب ڈھیلی ہو کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ حرر میں موجود ہر فرد اب بھی سکتے میں تھا، سب نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک قتل ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ وہ سب یہ منظر جلد بھلانے والے نہ تھے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## دو دن پہلے:

در فشاں لیڈی اقتدار کے قصر کے باہر موجود تھی۔اس نے بال پونی ٹیل میں باندھے ہوئے تھے۔ چیکس والی شرٹ کے نیچے جینز کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔سپورٹ شوز پہنے وہ پر اعتماد انداز میں گارڈ کی طرف بڑھی۔

”لیڈی سے کہو، تحریک حرر سے ان کا خاص مہمان آیا ہے،ایک اہم خبر لے کر۔“ گارڈاندر انٹرکام تک گیا اور پھر اس نے درے کو اندر جانے کا کہا۔در فشاں تحکم سے اندر چلنے لگی۔اس نے دراز سبزہ زار کراس کیا اور پھر گھر میں داخل ہوئی۔اندر ایک ملازمہ نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کو کہا۔کچھ دیر بعد مغرور چال چلتی لیڈی اقتدار ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔درے کھڑے ہونے لگی مگر لیڈی اقتدار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیااور خود بھی بیٹھ گئی۔

”ہاں تو در فشاں۔کچھ کھاؤ گی یا کچھ پینا چاہو گی؟“ لیڈی اقتدار کے چہرے پہ تکبرانہ مسکراہٹ تھی۔

”نہیں لیڈی،بس آپ کو کچھ بتاؤں گی اور چلتی بنوں گی۔“ در فشاں نے سرد لہجے میں کہا۔

”اگر خبر واقعی اچھی ہوئی تو میں تمہیں انعام سے نوازوں گی۔“ لیڈی اقتدار نے کہا۔

”کیا میں آپ لوگوں کے لیے کام نہیں کر سکتی لیڈی؟“ در فشاں نے کہا تو لیڈی اقتدار کی نگاہیں مشکوک سی ہوئی۔

”تم آخر کیا کر سکتی ہو ہمارے لیے؟“لیڈی اقتدار نے پوچھا۔

"یہ تو آپ ہی بہتر بتا سکتی ہیں۔میں ایک سائکولاجسٹ ہوں۔لوگوں سے باتیں کرتی ہوں۔ان سے ہمدردی کرنے کی بہت اچھی اداکاری کرتی ہوں۔ان کا بہترین دوست بننے کا ناٹک کرتی ہوں۔ان کو میٹھی میٹھی باتیں بتا کر اس دنیا سے پھسلاتی ہوں۔کیا آپ کے اس کاروبار میں میری جگہ نہیں بن سکتی؟" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

"میں سوچوں گی۔تم ابھی اپنی خبر مجھے سناؤ۔" لیڈی اقتدار لا پرواہی سے بولی۔

"پرسوں، آپ کے بڑے ہسپتال میں ایک لڑکی بھیجی جا رہی ہے۔اس کے کوٹ پہ بٹنز لگائے گئے ہیں جن میں کیمرا ہے، وہ لڑکی اس سب سے انجان ہے۔یہ ہم نے اس لیے کیا تھا، تاکہ ہم آپ کے ہسپتالوں میں گھس کے کچھ قیمتی اکٹھا کر سکیں۔کیا یہ خبر آپ کی شان و شایان کے مطابق ہے لیڈی؟"لیڈی اقتدار کے چہرے پہ سختی در آئی۔اسے حرر والوں پہ تپ چڑھنے لگی۔ان سب کی یہ مجال۔۔۔سوچتے ہوئے لیڈی اقتدار نے ہاتھوں کی مٹھی بنائی۔

"تمہارا بہت شکریہ۔تمہارا انعام تمہارے بینک اکاونٹ میں جمع ہو جائے گا۔میری کال کا اب تم انتظار کرنا۔مجھے لگتا ہے میرے پاس تمہارے لیے ایک کام ہے۔" درفشاں کے چہرے پہ سرد مسکراہٹ بکھری۔اپنا بیگ اٹھاتے وہ کھڑی ہوئی اور گھر سے رخصت ہو گئی۔

حال کی لیڈی اقتدار نیلوفر کے ساتھ اس حال میں موجود تھی۔نیلوفر کے چہرے پہ اب بھی ناگواری ابھری ہوئی تھی۔اسے یہ سب اس وقت بہت برا لگ رہا تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ وہ نرس ان کیمراز کے بارے میں لا علم تھی۔ پھر اس پہ غداری کا الزام لگا کے کیوں مار دیا؟" نیلوفر نے اپنا انداز نارمل رکھا۔

"کیونکہ میں اس سائکولاجسٹ کو گندا کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی یقیناً یہ سب منظر دیکھ رہی ہو گی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اس قتل کا بوجھ اپنے سر لے۔ قتل کا بوجھ اس کے دل کو کالا کر دے گا۔" لیڈی اقتدار نے نیلوفر کو دیکھا تو نیلوفر مصنوعی سا مسکرائی۔ وہ لیڈی اقتدار پہ اپنی تبدیلی عیاں کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"مسٹر درانی کو کچھ بتایا؟" نیلوفر نے پوچھا۔ لیڈی اقتدار نے خاموشی اختیار کی۔

"کبھی نہیں!" لیڈی اقتدار کہہ کر حال سے جانے لگی۔

نیلوفر اسے جاتے ہوئے دیکھے گئی۔ اس کے دماغ میں کچھ سوجھنے لگا تھا۔ اسے اس وقت امید کی کرنیں نظر

آئی تھیں۔۔۔ کہ شاید وہ بھی جرائم کی دنیا کو چھوڑ سکتی تھی۔ کیسا ہی عجب تھا ناں کہ جب اس نے واقعتہً جرائم کی دنیا سے فرار کا راستہ تلاش کرنا چاہا تو اسے ایک راستہ نظر آنے بھی لگا؟ اسے اتفاق کہا جائے یا تقدیر۔۔۔ نیلوفر سوچ میں پڑ گئی۔

کیا وہ رب، جس سے وہ اتنے سال بد ظن رہی، کیا وہی رب اس پہ اب مہربان ہونے لگا تھا؟ کیا وہ اس کی مہربانی کی مستحق بھی تھی؟ نیلوفر سوچ میں پڑ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**لیونڈر ہوٹل النابدا، القصیص، دبئی۔**

دبئی کے آسمان پہ شام اتر گئی تھی۔لیونڈر ہوٹل النابدا، بادلوں سے گھیرے ہوئے نیلے آسمان تلے اپنی بھرپور شان و شوکت لیے کھڑا تھا۔سڑکوں پہ اس وقت کافی گہما گہمی تھی۔

ہوٹل کے چھٹے فلور پے احمد ہاتھ میں دو ریکٹ لیے مہر کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔اس نے نیلی، آدھی آستین کی شرٹ پہنی ہوئی تھی اور نیلا پجامہ بھی۔اس نے مہر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کچھ دیر بعد مہر باہر آئی۔احمد کو اپنے کمرے کے باہر دیکھ کر مہر کے چہرے پہ خوشگوار حیرانی پھیلنے لگی۔

"کھیلنا چاہیں گی مہر؟"احمد چیلنج دینے والا انداز اختیار کرتے بولا۔مہر کو اس کے انداز پہ ہنسی آئی۔

"آرہی ہوں پروگرامر صاحب۔"مہر نے نرمی سے کہا اور پھر اندر گئی۔کچھ ہی دیر میں وہ باہر آئی، اس کے سر پہ ایک خاکی رنگ کی اسٹرا ہیٹ تھی۔دونوں چھٹے فلور کی راہداری میں چل رہے تھے۔

"پروگرامر صاحب؟ ویسے، اچھا لگا مجھے۔" احمد نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔مہر مسکرا کے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کی شان و شایان میں، اچھے خطاب سے تو نوازنا بنتا ہی تھا ناں۔" مہر چہک کے بولی۔احمد مسکرا دیا۔وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔احمد کو اس کا خوش ہونا، نہ جانے اتنا کیوں سکون بخشتا تھا۔وہ دل سے خواہش کرتا تھا کہ وہ ایسے ہی رہے، خوش باش، چہکتی، مسکراتی اور ہنستے ہوئے۔یہ مسکراہٹ، اس کی یہ ہنسی، اس پہ بہت جچتی تھی۔

دونوں اب پول ایریا میں پہنچ گئے تھے۔پول ایریا میں کچھ لوگ موجود تھے لیکن زیادہ بھیڑ نہ تھی۔

دونوں نے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا۔مہر کو شروع میں دشواری ہوئی مگر پھر اسے پریکٹس ہو گئی۔احمد کو بیڈمنٹن کافی اچھے سے کھیلنا آتا تھا اور دونوں نے کافی دیر کھیلا مگر فضامیں حبس اتنا شدید تھا کہ دونوں کی حالت تو کچھ ہی دیر میں خراب ہو گئی۔دونوں پھولی ہوئی سانسیں لیتے دوبارہ عمارت کے اندر اے سی کی ٹھنڈک میں آ گئے۔

وہ دونوں عمارت کے اندر آ کے شیشے کی دیوار کے پار کا منظر دیکھنے لگے۔اس منظر میں زیادہ ہریالی نہ تھی، مگر پھر بھی وہ منظر نہایت حسین اور دلکش تھا۔بڑی بڑی اونچی اونچی ہشاش بشاش عمارتیں، خوبصورت سے کاشت کیے پارکس، اور نیلا سمندر بھی وہاں سے دکھائی دیتا تھا۔اس منظر سے نظر ہٹانے کا دل بالکل بھی نہیں چاہتا تھا۔

"دبئ واقعی بہت خوبصورت ہے۔" مہر دبئ کی خوبصورتی میں بالکل کھو گئی تھی۔احمد مدھم سا مسکرا دیا۔

"ابھی آپ نے اصل خوبصورتی نہیں دیکھی۔کل ہم ڈاؤن ٹاؤن دبئ چلیں گے۔ ہم ایکویریم جائیں گے اور دبئ فاؤنٹین کا رقص بھی دیکھیں گے۔ٹھیک؟" احمد نے سرسری سا کہا۔

"ہاں ضرور۔" مہر بھی کھل اٹھی تھی۔

احمد کے ساتھ یوں وقت گزارتے ہوئے، وہ اپنی ڈیل کو، اپنی ان شرائط کو سرے سے بھلا بیٹھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سورج غروب ہوتے ہوئے آسمان سے روشنی لے گیا۔ آسمان پہ اندھیرا پھیلا تو بادلوں کی اوٹ میں چاند نے اپنی جگہ لی۔ دبئی اپنی بھرپور چمک دمک میں رات میں رواں ہوا۔

دبئی بلا شبہ دن میں بھی حسین لگتا ہے، لیکن رات میں تو اس کی خوبصورتی کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ یہ اتنا حسین لگتا ہے کہ بس۔ عمارتوں پہ رنگ برنگی لائیٹس منظر کو منور کر دیتی ہیں۔ زرد سٹریٹ لائیٹس بھی اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

رات جس طرح سے گہری ہوتی گئی سڑکوں میں رش بھی کم ہوتا گیا۔ پھر رات بھی اپنے اختتام پہ پہنچی اور تیز ترار سورج آسمان پہ طلوع ہوا۔ دن کی آمد ہوئی تو حبس میں اضافہ ہوا۔ دن بڑھتا چلا گیا تو سورج کی تپش میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

احمد اور مہر شام کے وقت ڈاؤن ٹاؤن کے لیے نکلے تھے۔ دبئی میں دن کافی لمبا ہوتا ہے اس لیے وہ وقت بھی دوپہر جیسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں ڈاؤن ٹاؤن دبئی ٹیکسی کے ذریعے گئے۔ راستے میں انہیں دبئی کی اور بھی اونچی اونچی عمارتیں نظر آئیں۔ یہ عمارتیں آرکیٹیکچرل ماسٹر پیس سے کم نہیں تھیں۔ دبئی کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں کی عمارتیں باقی ممالک کی طرح بس لمبی لمبی نہیں ہوتیں، بلکہ یہ بہت ہی کریئیٹو ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے بہت سوچ بچار کیا جاتا ہے۔ ہر عمارت اپنے اندر کوئی ایسی خصوصیت لیے ہوتی ہے جو اسے باقی عمارتوں سے ممتاز بناتی ہے۔

پندرہ منٹ سے آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ ڈاؤن ٹاؤن پہنچے۔ ڈاؤن ٹاؤن دبئی میں ہی دبئی مال واقع ہے اور وہ دونوں دبئی مال ہی جانا چاہتے تھے۔

دبئی مال کے راستے پہ انہیں برج الخلیفہ کی اونچی عمارت بھی دکھائی دی۔برج الخلیفہ کی اس اونچی عمارت کو دیکھتے ہوئے مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔برج الخلیفہ کی عمارت اونچی ہے تو سہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انتہائی خوبصورت بھی ہے۔عمارت جتنی اونچائی کو پہنچتی ہے اتنی ہی پتلی ہوتی رہی ہے۔عمارت اس وقت چاندنی سے رنگ کی نظر آرہی تھی۔

دبئی مال برج الخلیفہ کہ بہت ہی پاس ہے۔

دبئی مال دنیا کا سب سے بڑا مال ہے اور یہ انتہائی جدید ہے۔اس کے ایک طرف تو پانی ہی پانی ہے، پانی جو کہ نہایت نیلا اور شفاف ہے۔یہ پانی وقتاً فوقتاً گانوں کے گیت میں رقص کرتا ہے، احمد اور مہر بھی یہ رقص دیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن رات کے وقت، کیونکہ رات کے وقت ہی اس کی خوبصورتی اپنی انتہا پہ ہوتی ہے۔

دن کے اس پہر، دبئی مال کے باہر کی دیواریں سورج کی روشی کی وجہ سے سنہرے رنگ کی لگتی تھیں۔دبئی مال کے باہر چبوترا سا بنایا گیا ہے جس پہ دبئی کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔

مال میں اس وقت بھرپور گہما گہمی تھی، لیکن مال اتنا وسیع ہے کہ یہاں پہ رش کا خاص احساس نہیں ہوتا۔

احمد نے بلیک شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے کف موڑے ہوئے تھے اور ساتھ خاکی رنگ کی پینٹ زیب تن کررکھی تھی۔وہ اس وقت نہایت پرکشش لگ رہا تھا۔ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح اس کے مہنگی سمارٹ واچ تھی۔اور بالوں کو اس نے اسٹائیلش طرز پہ سیٹ کیا ہوا تھا۔

مہر نے کالی لانگ فراک پہنی تھی جو کہ ٹخنوں تک آتی تھی۔ سر پر اس نے ایک بھوری ہیٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں

میں بھورے رنگ کی چمڑے کی بنی ہوئی ہیلز پہنی ہوئی تھیں۔

دبئی مال میں بس ایک قدم رکھنے کی دیر ہوتی ہے اور انسان دنیا جہاں کو بھلا بیٹھتا ہے، یہ ہے ہی اتنا خوبصورت۔ چھت انتہائی اونچی تھی۔ اندر لگی بتیوں کی وجہ سے دبئی مال بھرپور چمک رہا تھا۔ وہ ایک ایسا منظر تھا جو کہ زندگی میں ایک نہ ایک مرتبہ تو دیکھنا ہی چاہئے۔

کچھ دیر چلنے کے بعد احمد اور مہر کو مصنوعی واٹر فال نظر آیا۔ جی ہاں۔۔۔! دبئی مال کے اندر ایک مصنوعی سا واٹر فال بنایا گیا ہے۔ واٹر فال گولائی میں بنا ہوا ہے۔ سیفٹی کے لیے واٹر فال سے پہلے ریلنگ لگائی گئی ہے۔ احمد اور مہر اس واٹر فال کو دیکھ رہے تھے۔ لائیٹنگ کی وجہ سے واٹر فال چاندنی سے رنگ کا لگتا تھا۔۔۔ مسحور کن اور دل فریب۔

"زیادہ امیدیں نہیں لگائیے گا۔ ہم صرف ایکویریم دیکھنے آئیں ہیں۔" واٹر فال کو دیکھتے ہوئے احمد نے مہر کے کان میں سرگوشی کی۔

"فکر نہ کریں۔ مجھے شاپنگ کا زیادہ شوق نہیں۔ مگر میں ونڈو شاپنگ تو کر ہی سکتی ہوں نا؟" مہر نے معصومیت سے پوچھا۔ احمد نے کوئی جواب نہ دیا بس مختصر سا مسکرا دیا۔

واٹر فال کو کچھ دیر دیکھنے بعد، جب دل بھر گیا تو مہر احمد کے ساتھ اسٹورز کا جائزہ لینے لگی۔ یہاں اسٹورز کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ انٹرنیشنل، ایک سے بڑھ کے ایک برینڈ یہاں پہ پایا جاتا تھا۔ کپڑے

جوتے بیگز گھڑیاں سب کچھ بہترین کوالٹی کا تھا۔سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے تصویروں میں دکھایا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ حسین۔

مہر اسٹورز میں جا کے چیزوں کو دیکھنے لگی۔اگر وہ پرانی والی مہر ہوتی تو اس سب میں سے بہت کچھ با آسانی خرید سکتی تھی مگر خیر، اس نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔اس نے بس ہر چیز کو دیکھ کر ہی اپنے دل کو بہلا لیا۔

"اب ایکویریم چلتے ہیں؟" وہ احمد کے ساتھ چلتے بولی تھی۔

احمد بس مہر کو دیکھتا رہ گیا۔اس نے پہلی دفعہ مہر کو اتنا خوش و خرم دیکھا تھا۔اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو کہ آج سے پہلے اس نے مہر میں نہیں دیکھی تھی۔دل کا ایک کونا خواہش کرتا تھا کہ وہ اسی طرح سے ہمیشہ خوش و خرم رہے، وہ یوں ہی چمکتی دمکتی رہے۔وہ مرجھاتی تھی تو دل کٹنے لگتا تھا۔۔اور جب وہ یوں خوش ہوتی تھی تو روح جیسے مکمل ہوجاتی تھی۔۔آخر ایسا کیوں تھا؟احمد جانتا نہ تھا۔

دونوں اب ساتھ چلتے ہوئے ایکویریم تک پہنچے۔وہ دیوار جتنا اونچا اور بڑا چکور سا ایکویریم تھا۔وہ بہت اونچا تھا،بہت زیادہ! وہاں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی مچھلی موجود تھی۔ اندر کورل ریف اور سمندر کے دیگر پودے موجود تھے۔پانی بالکل شفاف اور نیلا تھا اور مچھلیاں بہت مزے سے ٹہل رہی تھیں۔مچھلیوں کا ایک جھنڈ احمد اور مہر کی طرف آیا۔یہ ایک توے کے سائز جتنی مچھلیاں تھیں اور انتہائی خوبصورت تھیں۔ان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔پنکھ اور پونچھ ان کی پیلی تھی اور پنکھ کے پاس سے زرا سی کالک بھی لگی ہوئی تھی۔

"یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔ تصویروں میں دیکھا تھا مگر یہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔" مہر کی آواز پرجوش تھی۔ چہرے پہ جہاں بھر کی خوشی تھی۔

"ابھی تو آپ نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ ابھی ٹنل باقی ہے مہر۔" احمد جتانے والے انداز میں بولا۔ مہر پہلے سے بھی زیادہ پرجوش ہو گئی تھی۔

دونوں نے ٹکٹ خریدے اور پھر ایکویریم کی ٹنل میں داخل ہوئے۔

وہ منظر غیر معمولی سا تھا۔ سرنگ اندر سے گول تھی۔ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف پانی تھا جو کے مضبوط شیشوں میں قید تھا۔ شیشے کے پار ہر طرح کی مچھلی نظر آتی تھی۔ شارک ہو یا ڈالفن ہو یا گولڈ فش، ہر قسم کی مچھلی پانی میں تیرتی نظر آتی تھی۔ مہر کے دل میں یک دم گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

"اگر یہ ٹوٹ گیا تو؟" مہر کی آواز میں خوف سا تھا۔ وہ گردن نیچے جھکائے شیشے پہ دیکھنے لگی جس پہ وہ چل رہی تھی۔ اسے پیر کے نیچے نیلا شفاف پانی صاف نظر آرہا تھا۔

"یہ پاکستان نہیں ہے۔ آپ بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ شیشے بہت مضبوط ہیں، اور بہت مہارت سے اس سرنگ کو بنایا گیا ہے۔ بے فکری کے ساتھ اس منظر کو انجوائے کریں۔" احمد نے کہا تو مہر پرسکون ہو گئی۔

عام طور پہ خوبصورت مناظر دیکھ دیکھ کے، ایک وقت آتا ہے کہ دل بیزار ہو جاتا ہے، لیکن وہ منظر اتنا حسین تھا کہ اس کو دیکھتے ہوئے انسان کا دل چاہتا تھا کہ بس دیکھتا ہی رہے دیکھتا ہی رہے۔ وہ منظر

آنکھوں کو بہت بھاتا تھا۔۔۔یا شاید جس کے ساتھ یہ منظر دیکھا جارہا تھا وہی اتنا خاص تھا کہ اس منظر کو دیکھنے کا مزہ دوبالا ہوگیا تھا۔

خوبصورت اور رنگ برنگی مچھلیاں چاروں اور تیر رہی تھیں۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ کسی دوسری دنیا میں سفر کر رہے تھے۔کسی اجنبی سی انجان دنیا میں۔وہ منظر دنیا سے باہر کا لگتا تھا۔حیرت ہوتی تھی کہ ہم ان مچھلیوں کو اتنے قریب سے دیکھ سکتے تھے۔ان کی ہر ایک چال کو ان کے ہر ایک نقش کو اتنے پاس سے دیکھ سکتے تھے۔ہم باریکی سے ان کے رنگوں کو جانچ سکتے تھے۔وہ دونوں جب سرنگ سے واپس آئے تو بہت تر و تازہ تھے۔وہ منظر اب دونوں کی یادوں میں ہمیشہ کے لیے قید ہوجانے والا تھا۔

"آپ آئس کریم کھائیں گی؟" احمد نے پوچھا تو مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔وہ اس وقت اپنے سارے غم اور تکلیفیں بھلا بیٹھی تھی۔وہ اپنی ساری محرومی احمد کے اس تسلی بخش ساتھ کی وجہ سے بھلا بیٹھی تھی۔

وہ پہلی مرتبہ زندگی کو اتنا کھل کے جی رہے تھے۔وہ پہلی مرتبہ زندگی کے رنگوں میں خود کو رنگ رہی تھی۔یہ سب احمد کے ساتھ کے بغیر ممکن نہ تھا۔

دونوں نے فوڈ کورٹ تک کا سفر کیا اور اپنے لیے آئس کریمز خریدیں۔آئس کریم کون کے اندر تک بھری ہوئی تھی۔فلنگ کو کون کے اوپر کسی پہاڑ کی طرح ڈالا ہوا تھا اور اسے چاکلیٹ میں ڈِپ کیا ہوا تھا۔آئیس کریم اتنی لذیذ تھی کہ منہ میں جاتے ہی گل جاتی تھی۔خالص مٹھاس حلق سے ٹکراتی تھی

جو کہ ذہن کے ہر خانے میں سکون بھر دیتی تھی۔ آئس کریم کھانے کے بعد سر بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

”یہ اتنی لذیذ کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی سوچ سے باہر ہے۔“ مہر پرجوش سی ہو کے بولی۔

”یہاں ہر چیز بہترین کوالٹی کی ہوتی ہے مہر۔ ہر چیز بھرپور غذایت سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہو گا یہاں کے لوگوں کی صحت کافی اچھی ہے اور ان کے چہروں پر بھی نکھار ہے۔ یہ سب اس اچھی غذایت کی وجہ سے ہے۔“ احمد نے بتایا۔

آئس کریم ختم کر کے جب دونوں باہر آئے تو رات اتر گئی تھی۔ وقت اتنی تیزی سے گزر گیا تھا کہ پتا ہی نہ چلا۔ رات کے وقت باہر کا منظر دن سے بے حد مختلف تھا۔ رنگ برنگی لائٹیں ہر طرف روشن تھیں۔ گہما گہمی بھی کافی بڑھ گئی تھی۔

فاؤنٹین کا ناچ بھی شروع ہونے لگا تھا اس لیے دونوں فاؤن ٹین کی طرف آ گئے۔

کچھ دیر بعد ایک عربی گانا اونچی آواز میں بجنے لگا۔ فاؤنٹین کے پانی نے جوش لیا۔ پانی کے اندر رنگین بتیاں لگی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے یہ تاثر پڑتا تھا کہ پانی رنگین ہے۔ پانی اس گانے کے گیت پر رقص کرنے لگا۔ وہ کرتب دکھانے لگا تھا۔ جیسے ہی گانے کے سر اونچے ہوتے وہ دھار کی صورت میں آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتا۔ وہ آسمانوں میں چکر کاٹتا، اور جھوم جھوم کے آپس میں ٹکراتا۔ یہ منظر بھی اس دنیا کا نہیں لگتا تھا۔

اس خوبصورت منظر کو الوداع کہنا مشکل تھا۔ دلوں پہ پتھر رکھ کے دونوں نے بالآخر دبئی مال کی اس وسیع و عریز عمارت کو الوداع کہا۔ ٹیکسی میں سوار ہوکے، اب دونوں القصیص واپس جا رہے تھے۔

"مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ میری آنکھوں نے یہ سب دیکھا ہے احمد۔" مہر کی آواز میں تھکان تھی۔

"مجھے اچھا لگا کہ آپ ان مشکل حالات میں بھی اپنی زندگی کو جینا نہیں چھوڑ رہی ہیں مہر۔ میں آپ کے لیے دل سے خوش ہوں۔" احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے دل کو واقعی بہت اچھا لگ رہا تھا اسے مسکراتا دیکھ کر۔ اسے خوش دیکھ کر۔ نہ جانے کیوں؟ اس بے وقوف لڑکی کو، جو اسے دھوکہ دے کے دبئی بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی، اس لڑکی کو خوش دیکھ کر اس کا دل اتنا مطمئن کیوں ہو رہا تھا بھلا؟ احمد سوچ میں پڑ گیا تھا، وہ اب تک کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔

"آپ نہ ہوتے تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔" مہر نے احمد کو سادگی سے دیکھتے کہا۔ احمد نے بھی اس پر نرم نگاہ ڈالی۔ اگلے ہی لمحے دونوں نے نگاہیں ایک دوسرے پر سے ہٹا لیں۔

"میں زندگی میں ایک بار پھر یہاں واپس آنا چاہوں گی۔ جب سب ٹھیک ہو جائے گا، میں یہاں دوبارہ ضرور آؤں گی۔" ٹیکسی لیونڈر کے باہر رکی تھی جب مہر بولی۔

"اکیلے ہی؟" وہ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا۔ مہر کچھ الجھ گئی، اس بات کا آخر کیا مطلب تھا؟

دونوں اب لیونڈر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ہوٹل کی لابی کے نرم و ملائم صوفوں پہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”ویسے احمد۔میں نے کچھ نوٹس کیا ہے۔“مہر صوفے پہ آرام دہ ہو کے بولی تھی۔

”کیا؟“ احمد نے دلچسپی لی۔

”آپ کسی الجھن کا شکار ہیں۔“مہر اسی انداز میں بولی جس انداز میں احمد اپنی تھیوریز اور اپنے اندازے

اسے بتایا کرتا تھا۔وہی اسپاٹ سا لہجہ، اٹھے ہوئے کندھے اور پر اعتماد انداز۔احمد بھی سمجھ گیا تھا، اس سے مسکرائے بغیر رہا نہیں گیا۔

”اوہ؟“احمد کے چہرے پہ مصنوعی حیرانی تھی۔”اور آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟“ احمد چیلنج دینے والے انداز میں گویا ہوا۔

”مجھے شاید آپ کو پڑھنا آ گیا ہے احمد۔“نرم نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔

”آپ اکثر مطمئن رہتے ہیں۔پر سکون بھی۔اور آپ پوری کوشش کرتے ہیں کہ سب پر یہی تاثر جائے کہ آپ بے فکر ہیں۔آپ بہت اچھے ”پوکر فیس“ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔میں نے آپ کے پوکر فیس کے ذریعے آپ کے اندر بے چینی دیکھی تھی احمد۔ایکویریم میں بھی ایک وقت میں آپ سر جھکائے ہوئے تھے۔چہرے پر اضطراب سا تھا۔آئیسکریم کھاتے ہوئے بھی آپ نے ایک پاز لیا اور پھر اچانک سے دوبارہ کھانے لگے۔فاؤنٹین دیکھتے ہوئے بھی کچھ لمحے آپ کی مسکراہٹ پھیکی پڑگئی ایسا لگا جیسے آپ کسی الجھن کا شکار تھے۔کیا میں غلط ہوں؟“احمد نے ایک اونچا قہقہہ لگایا۔اس کے چہرے پہ متاثر کن سی مسکراہٹ بکھری۔

"آپ نے تو مجھے بہت ہی تفصیل سے اسٹڈی کر لیا مہر۔" احمد کا انداز نٹکھٹ سا تھا۔

"ویسے اگر نہیں بتانا تو نہ بتائیں۔میں فورس نہیں کروں گی نہ ہی اپنے اندازوں کی تصدیق چاہوں گی۔"احمد کا چہرہ سنجیدہ پڑنے لگا۔اس نے نظر اٹھا کے مہر کو دیکھا۔

"آپ کی مچور اور سمجھدار نے میرا جینا دوبھر کیا ہوا ہے مہر۔" وہ اچانک سے بولا تو مہر چونک گئی۔مہر نے

اسے اچنبھے سے دیکھا۔کیا وہ واقعی آج اسے کچھ بتا رہا تھا، وہ بھی کچھ ذاتی؟مہر نے اس چیز کی تو توقع نہ کی تھی۔

"وہ عجیب سی حرکتیں کرتی پھر رہی ہے۔اس کی دوست نے ایک تنظیم بنائی تھی اور اس نے اسے تنظیم کو جوائن کر لیا۔صرف یہ ہی نہیں وہ ڈبل ایجنٹ بننے کی کوشش کر رہی ہے۔مجھے بس اس کی فکر ہے۔" احمد نے مختصر سا بتایا۔مہر اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔

"فکر نہ کریں۔درفشاں کبھی کچھ غلط نہیں کرے گی۔"وہ دل جوئی کرنے والے انداز میں بولی تو احمد زیر لب

ہنس دیا۔

وہ اسے مسکراتا اور ہنستا دیکھ رہی تھی۔کتنا اچھا لگتا تھا اس کا ہنسنا۔اس کا مسکرانا۔اس کا اس سے یوں باتیں کرنا۔۔لیکن۔۔۔لیکن تکلیف کیوں ہوتی تھی؟ دل میں اتنی چبھن کیوں ہوتی تھی؟ وہ ڈیل، وہ

معاہدہ، اور وہ شرائط بار بار مہر کے سامنے آ رہی تھیں۔ وہ دونوں خوش رہ سکتے تھے، مگر اس ڈیل کے ہوتے ہوئے وہ بھلا کیسے احمد کے ساتھ رہ سکتی تھی؟

مہر کا دل بھاری ہونے لگا۔ مسکراہٹ فنا ہوئی۔ چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر ابھرا۔ چہرے پہ الجھن ا بھرنے لگی۔

"احمد۔" اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔ احمد نے ہنسی روک کے نظر مہر پہ ڈالی۔

"کیا ہم۔ میں اور آپ؟" مہر کی آنکھیں نم پڑنے لگیں۔ احمد اس کی ان آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"کیا ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ہی یوں نہیں رہ سکتے؟ ایک دوسرے کی خوشیوں میں خوش؟ غموں میں غم زدہ؟ ایک دوسرے کا کندھا بن کر؟ یوں ہی شانہ بشانہ؟ ایک دوسرے کے ہمراہ؟ کیا ہم یہ زندگی کا سفر ایک ساتھ نہیں گزار سکتے احمد؟"

گیلا لہجہ۔۔۔ سادہ سے الفاظ۔۔۔ جن میں جذبات کی شدت تھی۔۔۔ ان لفظوں میں کہیں نہ کہیں محرومی بھی جھلکتی تھی۔

احمد بس اسے دیکھتا رہا۔ چہرے پہ نہ حیرانی تھی نہ ہی بے یقینی۔ اس کے لیے جیسے یہ بالکل بھی غیر متوقع نہ تھا۔

اس کے چہرے پہ گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ مسکراہٹ، خود ہی میں بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ بہت کچھ جو احمد اب تک بولا بھی نہ تھا۔ مہر بھی اس مسکراہٹ کو بھانپ چکی تھی، اس کی تاثیر کو سمجھ چکی تھی۔

وہ مسکراہٹ اقرار کی علامت تھی، احمد کی مہر کے لیے محبت کا اقرار۔۔۔

”اس جھنجٹ سے نکلنے دیں مہر۔“ وہ بس اتنا سا بولا۔اتنا سا ہی بولنا، مہر کو بہت کچھ بتا رہا تھا۔وہ بھی اسے

اپنا دل دے چکا تھا۔وہ بھی اس کی خوشی میں خوش ہونا چاہتا تھا اور اس کے غموں میں غمگین، وہ بھی اس کے ساتھ ہی زندگی کا یہ سفر پار کرنا چاہتا تھا۔وہ بھی اس کی روح کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔

احمد کھڑا ہوا۔ایک دفعہ پھر سے اس نے مسکراتے ہوئے مہر کو دیکھا۔پلٹ کے وہ لفٹ کی طرف جانے لگا۔مہر

اسے لفٹ میں سوار ہوتا دیکھتی گئی۔وہ جا رہا تھا، کاش وہ کچھ دیر اور رک جاتا؟ کاش؟

مہر کی آنکھیں نم ہوئیں۔یہ کیسی محبت کی کہانی تھی جس کا آغاز ہی زوال کی پیشن گوئی سے ہو رہا تھا؟

یہ کیسی محبت کی کہانی تھی جو کہ ادھوری رہ جانے کے لیے ہی لکھی جا رہی تھی؟

اس ڈیل کے ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں بھلا کیسے ایک ہو سکتے تھے؟ مہر اس وقت یہی سوچ جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد صبح سویرے ہی جاگ گیا تھا۔اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کیا۔اب کی بار سارا سامان ترتیب سے رکھا۔بیگ کندھے پہ لٹکاکے سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلا اور مہر کے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔اس نے مہر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔کچھ دیر بعد مہر باہر آئی۔

وہ نیند کے زیر اثر تھی لیکن احمد کو یوں تیار دیکھ کے وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔

”میں جا رہا ہوں۔“ احمد نے مہر کو اطلاع دی۔

”اتنی جلدی؟“ مہر کو جیسے یقین نہیں آیا۔

”ہاں۔ میں یہاں اپنی کمپنی کی ریجسٹریشن کے لیے آیا تھا۔ سارا کام ہو گیا ہے۔ بس اب ای میل کا انتظار ہے تو میں جا رہا ہوں۔ میری نئی نویلی کمپنی بھی ہے، میں اسے زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔“ احمد نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ مہر کے چہرے پر اداسی نمایاں تھی۔ کیا وہ حسین لمحے اتنے مختصر تھے؟ اس نے سوچا۔

احمد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ مہر اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔

احمد نے پھر ایک لاکٹ اپنی جیب سے نکالا۔ لاکٹ دل کی شیپ کا تھا اور چاندی سے بنا ہوا تھا۔ وہ کافی خوبصورت اور نفیس تھا۔ لاکٹ دیکھتے ہی مہر کی آنکھوں میں ستائش اتری۔ کیا وہ اس کے لیے لیا گیا تھا؟

اس نے سوچا۔۔

”ہیپی برتھ ڈے مہر۔“ احمد سادگی سے بولا۔ مہر چونکی، آج۔۔۔ آج واقعی اس کی برتھ ڈے تھی، گیارہ ستمبر۔۔۔ وہ حیران رہ گئی۔ مہر نے چہرے پہ بے یقینی لیے وہ لاکٹ اپنے ہاتھ میں تھاما۔ وہ احمد کو چہرے پہ حیرانگی لیے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" آواز میں خوش گوار حیرانی تھی۔

"اس دن، آفس کے لاکرز میں کچھ اور بھی کاغذات تھے۔اس میں آپ کی ڈیٹ آف برتھ لکھی تھی۔مجھے یاد رہ گئی۔" وہ مسکرایا۔

"آپ پہ اچھا لگے گا مہر۔اسے اتاریئے گا نہیں۔" وہ ایسے بولا جیسے درخواست کرنا چاہ رہا ہو۔

وہ بڑے بڑے بول نہیں کہا کرتا تھا۔وہ مشکل الفاظ کا استعمال کر کے، لمبی تمہید باندھ کر بھی اسے یہ

تحفہ دے سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔وہ ایک پریکٹیکل انسان تھا۔اسٹریٹ فارورڈ اور ٹو دا پوائنٹ۔وہ اپنے افعال سے اپنی محبت کا اظہار کرنا جانتا تھا۔

"یہ نہایت حسین ہے احمد۔" مہر کی آنکھیں نم پڑیں۔یہ تحفہ اس کی طرف سے دیا جانے والا پہلا تحفہ تھا، کیا ممکن تھا یہ تحفہ آخری بھی ہو؟ "میں اسے کبھی نہیں اتاروں گی۔" احمد نے سر اثبات میں ہلایا اور گردن جھکا لی۔

وہ اب جانے لگا۔جلد ہی وہ اس کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا۔وہ دبئی سے جانے لگا تھا۔پاکستان پہنچنے کے بعد مہر کو احمد سے قطع تعلق کرنا تھا، اسے وہ ڈیل یاد تھی۔لیکن کیسے؟محبت میں اتنا آگے نکل جانے کے بعد وہ اب اسے کیسے یوں ہی چھوڑ دے؟ وہ اس کے بغیر جینے کا اب تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔

لیکن کچھ چیزیں ہوتی ہیں اٹل، اور یقینی بھی۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شام کا وقت تھا۔وہ مرجھائی ہوئی اپنے بستر پہ بیٹھی ہوئی تھی ٹھیک اسی وقت اسے شمس کی کال آئی تھی۔مہر نے وہ کال فوراً ہی اٹھا لی۔

”کل ہم جا رہے ہیں، سب تیاریاں مکمل ہیں۔کل صبح پہلے ہم اپنا کام مکمل کریں گے اور پھر میں تمہیں ایئرپورٹ چھوڑوں گا۔شام کے وقت تمہاری فلائیٹ ہے۔“ شمس کا انداز بھی لا تعلق سا تھا۔وہ بھی بس بیزار آگیا تھا۔

”میری ماں مجھے مل جائے گی نا؟“ مہر نے پوچھا۔

”ہاں ایئرپورٹ پر اسے لے لینا۔پھر بس، کل ہی ملیں گے۔“ مہر نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

آخر اس کھیل کا بھی اختتام ہونے جا رہا تھا۔مگر اس کھیل کے بعد کا کیا؟اسے اپنی ماں تو مل جائے گی۔اس کا قرضہ بھی معاف ہو چکا ہے۔مگر احمد اور اس کی داستان کا کیا؟ کیا وہ کبھی مکمل ہو بھی سکے گی؟

مستقبل سے انجان، وہ ان ہی سوچوں میں گم سم رہی۔یہ دن گزارنا، اور یہ رات، یوں تنہا گزارنا اس کے لیے بہت دشوار ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شمس ٹیکسی میں مہر کو صبح صبح ہی لینے پہنچ گیا تھا۔مہر آوری کلر کا لانگ ڈریس پہنے ہوئے لیونڈر سے باہر نکلی۔کالا چشمہ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں کا نظارہ چھپائے ہوئے تھا۔ وہ سیدھا چلتے چلتے گاڑی میں بیٹھ گئی۔اس سے تھوڑا ہی دور شمس بیٹھا ہوا تھا۔

"تمہیں بینک لے کر جارہا ہوں۔تمہیں یہ نوٹوں والے بیگ کے ساتھ ایک کمرے میں جانا ہے۔بیگ وہاں کے مینجر کے حوالے کرنا ہے اور پھر کچھ کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔وہ کاغذات تمہاری آزادی کا پروانہ ہیں۔اس کھیل کو ختم

کر کے میں تمہیں ایئرپورٹ چھوڑ آؤں گا۔" شمس نے سرد لہجے میں کہا۔

مہر کا دل ڈگمگانے لگا۔وہ آج ایک جرم کرنے جارہی تھی۔وہ اپنے ہاتھ اس کھیل میں کالے کرنے جارہی تھی۔وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ غیر قانونی کرنے لگی تھی۔دل میں لہریں ابھر ابھر کے معدوم ہورہی تھیں۔مگر واپسی ناممکن تھی۔یہ

سب اسے کرنا تھا، اپنی آزادی کے لیے، اپنی ماں کی آزادی کے لیے۔بس آخری دفعہ، اور پہلی دفعہ۔۔۔بس، اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں واپس نہیں آئے گی۔۔۔ایسا بس مہر کو لگتا تھا، حقیقت اس سے مختلف بھی ہو سکتی تھی۔۔۔

ٹیکسی ایک بہت ہی عالی شان سے دکھنے والی بینک کی عمارت کے سامنے آکے رکی۔وہ دونوں گاڑی سے باہر نکلے، شمس نے مہر کو ڈگی سے نکال کے وہ سوٹ کیس تھمایا۔

دونوں بینک کی عالی شان اور کشادہ عمارت کے اندر داخل ہوئے تو بینک کا ناظم دونوں کو نظر آیا۔وہ چہرے پہ گرم جوش مسکراہٹ لیے دونوں کا استقبال کر رہا تھا۔وہ عربی لب و لہجے میں ان سے بات چیت کر رہا تھا۔

"یہ مہر ہیں۔آپ انہیں کاروائی کے لیے لے جائیں۔" شمس نے اس مسکراتے مینجر کو انگیریزی میں کہا۔مینجر

نے مہر کے اوپر نظر ڈالی جو کہ بالکل گھبرائی ہوئی تھی۔اس کا انداز متذبذب سا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے اس کشادہ سی عمارت اسے گھٹن کا شکار کر گئی تھی۔

"شیور شیور۔مہر، آپ آئیں۔" مینجر مسکرا کے بولا۔مہر نے ایک غیر آرام دہ سی نظر اس پہ ڈالی۔اس نے

اپنے کالے چشمے اتارے اور ہاتھ میں تھامے۔سوٹ کیس کو گھسیٹتے ہوئے وہ ناظم کے پیچھے چلنے لگی۔

وہ دونوں اس ناظم کے آفس میں داخل ہوئے۔ناظم کی ڈیسک کے پیچھے والی دیوار پہ ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ناظم نے دروازہ کھولا اور خود اندر گیا، مہر بھی اس کے پیچھے چلتی گئی۔اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔قدم قدم پہ اس پر نیا سرپرائز عیاں ہوتا تھا۔اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے پھوٹنے لگے تھے۔وہ شدید اضطراب کے عالم میں تھی۔۔۔کیا ہر مجرم کا جرم کرنے سے پہلے یہی حال ہوتا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔

دروازے کے اس پار ایک پتلی راہداری تھی۔راہداری میں شیشے کی بنی دیوار تھی جس پہ ان کا عکس نظر آتا تھا۔وہ اس پتلی راہداری میں چلتے گئے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔کمرہ بس دو ہی افراد کو اندر سمانے کی گنجائش رکھتا تھا۔کمرے کے بیچ و بیچ ایک ڈیسک تھی۔بینک کے ناظم ڈیسک کی دوسری طرف گئے۔انہوں نے مہر کو آنکھ سے اشارہ کیا۔مہر اشارہ سمجھ گئی تھی۔

مہر نے سوٹ کیس ٹیبل پہ رکھا۔اس کا دل اب اور بھی زور سے دھڑکنے لگا تھا۔دل جیسے اچھل اچھل کے اس کے حلق میں آرہا تھا۔دل کی گہرائیوں سے ایک آواز آرہی تھی۔۔۔کہ وہ یہ چھوڑ کے بھاگ جائے۔۔۔ابھی بھی وقت ہے مہر بنت عبداللہ سلطان یہ سب چھوڑ کے بھاگ جاؤ۔مگر وہ اپنے دل کی تمام آوازوں کو نظرانداز کرتی گئی۔ٹھیک اسی طرح جیسے

چھے سال پہلے نیلوفر نے کی تھی۔۔۔کیا وہ بھی دوسری نیلوفر بننے جارہی تھی؟

بینک مینجر نے سوٹ کیس کھولا تو اس میں ڈھیر سارے نوٹ تھے، اس کے چہرے پہ خسیانی مسکراہٹ بکھری۔اس نے سوٹ کیس بند کرکے نیچے رکھا۔اور مہر کے سامنے کچھ پیپرز رکھے اور ایک پین بھی۔ اب دستخط کرنے کا وقت تھا۔مہر کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔اسے لگا کہ وہ یہ نہیں کر سکے گی۔اس نے پین اٹھایا اور پیپر پہ پین کی نب کو کسا۔اس کا ہاتھ ہلنے سے انکار کرنے لگا تھا۔مہر کا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔پورا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

مہر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ایک گہری سانس اندر لی۔۔۔اور گہری سانس باہر نکالتے ہوئے، ایک جھٹکے میں ہی وہ ان کاغذات پہ دستخط کر گئی۔کام مکمل ہوگیا تھا۔مہر منی لانڈرنگ کر چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## اسلام آباد انٹر نیشنل ایئرپورٹ، اسلام آباد۔

ایئرپورٹ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ مہر بنت عبداللہ سلطان کی چال بہت مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں سے ملنے والی تھی، دل میں خوشی کا عنصر بھی کہیں نہ کہیں موجود تھا، لیکن پھر بھی دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ دل اداس تھا، غمگین تھا۔ وہ جرم کر کے آئی تھی، کوئی عام جرم نہیں بلکہ ایک سنگین جرم۔ دل میں بوجھ سوار تھا۔

اس نے چیکس پار کیے اور اپنا بیگ گھسیٹتے وہ باہر نکلی۔ وہ ویٹنگ ایریا میں پہنچی تو اس کی نظر اس پہ پڑی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا، لیکن وہ واقعتہً ادھر تھا۔ احمد۔۔۔ جو کہ آنکھوں میں شدت بھرا غصہ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ مہر کا دل ڈوبنے لگا۔ قدم زنجیر ہو گئے۔ احمد ہاتھ باندھے اس کی طرف بڑھا۔ احمد بالکل اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں مہر کے لیے بے پناہ شکایت تھی۔ مہر کے سر پہ گھنٹیاں بجنے لگیں۔

”میں نے آپ کو کتنے ہی موقعے دیئے مہر، کہ آپ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیں۔ لیکن آپ آخری وقت تک مجھ پہ بھروسہ نہ کر سکیں۔ کیا میں بھروسے کے لائق نہیں تھا مہر؟“ احمد تلخی سے بولا۔ مہر کا چہرہ غمگین ہو گیا۔ کیا وہ سب جانتا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ مہر بس اتنا ہی بول سکی۔

"میں نے جہاز میں کہا تھا کہ میں آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ کو مجھ پہ اعتبار نہیں تھا ناں؟ میں جانتا ہوں آپ منی لانڈرنگ کر کے آرہی ہیں۔ آپ میرے دشمنوں کے ساتھ مل گئی ہیں مہر۔ آپ ان کی اس دولت کو چھپانے میں ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔" مہر کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ سب جانتا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک مجرم تھی؟ وہ بھی ان ہی میں سے تھی جن کو وہ برباد کرنے نکلا تھا؟

"آپ نے سب کچھ اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہے مہر۔ میں یہاں پہ سب کچھ ختم کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" احمد مڑا۔ مہر کی سانسیں بے ترتیب ہوئیں۔

"آپ مجھے نہیں سمجھ سکتے احمد۔" مہر نے اسے پیچھے سے تلخی سے کہا۔ احمد تھم گیا۔ "میری ماں مجھ سے چھن گئی۔ میرے ڈیڈ قتل کر دیئے گئے۔ میں آپ کو بتاتی تو وہ میری ماں کو کبھی واپس نہ کرتے۔" مہر کے انداز میں بے بسی تھی۔ احمد پلٹا، چہرے پہ تلخی برقرار تھی۔

"وہ اب بھی آپ کی ماں کو واپس نہیں کرنے والے۔ آپ اب پھنس چکی ہیں۔ لیکن اس بار میں بھی آپ کی مدد کو نہیں آنے والا ہوں مہر۔ آپ کو اپنی جنگیں تنہا لڑنے کا شوق ہوا ہے، آپ کو یہ تنہائی مبارک ہو۔ اپنا خیال رکھیئے گا۔" وہ کہہ کے پھر سے مڑ گیا اور تیز تیز قدم بڑھاتے ایئرپورٹ سے نکل گیا۔ مہر جہاں تھیں وہیں کھڑی رہی۔ ایئرپورٹ کے اس ہجوم میں وہ جیسے بھٹک گئی تھی۔

ایک جھٹکے میں سب ختم ہو گیا تھا۔۔۔ ایک جھٹکے میں۔۔۔ سارے رشتے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ وہ اتنی آسانی سے اسے کیسے چھوڑ گیا؟ مہر کو اس وقت یقین نہ آیا۔ اگر وہ اسے ابھی نہ چھوڑتا، کیا تب بھی دونوں کی کہانی واقعی چل پاتی؟ اس ڈیل کے ہوتے ہوئے کیا واقعی احمد اور مہر کبھی ایک بھی ہو سکتے تھے۔ مہر کا سر چکرانے لگا تھا۔ دل کرچی کرچی ہو جانے کی یہ تکلیف اس کی روح پہ گراں گزر رہی تھی۔

وہ بد حواسی کے عالم میں وہیں کھڑی تھی، جب اس کا موبائل بجا۔چونک کے اس نے کال اٹھائی۔وہ کال شمس کی تھی۔مہر نے تیزی سے وہ کال اٹھائی۔

"پارکنگ ایریا میں تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" شمس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔مہر اپنا سوٹ کیس گھسیٹتے چلنے لگی۔کم سے کم۔۔۔ماں تو اسے مل ہی جائیں گی۔۔۔اس نے سوچا اور ڈھیروں آنسو اندر نگلے۔۔۔کیا ہوا اگر اس کی محبت کی داستان ایک بار پھر سے ادھوری رہ جانے والی تھی؟ وہ محبت کے معاملے میں ہمیشہ سے ہی بد قسمت تھی۔۔۔وہ یہی سوچتے ہوئے پارکنگ ایریا تک سفر کرنے لگی۔ اپنے چہرے پہ اس نے جبراً مسکراہٹ پھیلائی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے غموں کی بوچھاڑ ماں پہ عیاں نہیں ہونے دے گی۔وہ ان سے ملے گی، خوش باش۔۔۔

مہر پارکنگ ایریا میں آئی،اس امید سے کہ کہیں اسے کمینی شکل والا شمس نظر آئے گا۔۔۔اور اس کی وین میں شمائلہ ہو گی۔۔۔وہ اسی امید سے پارکنگ ایریا میں آئی تھی۔

پارکنگ ایریا میں کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔مہر شمس کی نیلی ویگن کو تلاش کرنے لگی۔۔۔لیکن۔۔۔لیکن شمس کی ویگن کا پارکنگ ایریا میں نام و نشان تک نہ تھا۔مہر کے وجود میں انتشار پھیلنے لگا۔۔۔

اس نے ایک بار پھر سے پارکنگ ایریا کا چکر کاٹا۔وقت کے ساتھ ساتھ انتشار بڑھتا جارہا تھا۔ماں تھی کہ ملنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔مہر پاگلوں کی طرح ایئرپورٹ کے چکر کاٹنے لگی تھی۔۔۔یہ سب کیا تھا؟ اسے سمجھ ہی نہ آسکا۔۔۔

کیا ان لوگوں نے اسے دھوکہ دیا تھا؟ مہر کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ رنگت زرد پڑنے لگی۔

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے شمس کو کال ملائی۔

"کیسا لگا میرا مذاق؟" شمس ہنستے ہوئے گویا ہوا۔ مہر کی روح کانپ اٹھی۔ دل پھڑپھڑانے لگا تھا۔۔۔

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" وہ اونچی آواز میں بولی۔ آنسوؤں کی رسی کھلی اور وہ پارکنگ لاٹ میں ہی رونے لگی تھی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اسے آس پاس کے ماحول کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی ٹرک کے نیچے آ کے کچلا گیا تھا۔۔۔ "میں نے تم لوگوں کی وجہ سے اپنے آپ کو برباد کیا۔ میں نے منی لانڈرنگ کرتے ہوئے سب کچھ کھو دیا۔ تم سب یہ کیسے کر سکتے ہو؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔ آواز باقاعدہ لرز رہی تھی۔ کاش وہ پچھلے وقتوں میں واپس جا کے اپنے آپ کو وہ غلطی کرنے سے روک سکتی۔۔۔ کاش!

"ابھی وہ وقت نہیں آیا مہر۔" شمس نے بے رحم سے لہجے میں کہا۔

"تم لوگ یہ کیسے کر سکتے ہو۔ پلیز شمس۔ رحم کرو۔ میری ماں سے مجھے ملوا دو۔" مہر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ مہر کے اندر توانائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اس کی قوت کو ان ظالموں نے چوس لیا تھا۔ درد کی لہر اس کے وجود میں دوڑنے لگی۔ وہ ڈھیلی ہو کے زمین پہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔۔۔ سوٹ کیس اس کے عقب میں لڑھک گیا۔۔۔

"اپنی ای میل پر ویڈیو دیکھو مہر۔ اب تو اصل کھیل شروع ہوا ہے۔ جرائم کی دنیا میں خوش آمدید۔" شمس نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

یہ شمس کس ویڈیو کی بات کر رہا تھا؟ کیا اس کی ماں کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا؟ مہر کو طرح طرح کے خدشات ستانے لگے۔اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ موبائل کان سے جدا کیا اور اپنی ای میل کھولی۔ای میل پہ شمس نے ایک ویڈیو بھیجی۔مہر کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

مہر نے وہ ویڈیو پلے کی۔

اس کی آنکھ خوف کے مارے پھٹنے لگی۔۔۔لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔۔۔اس نے جو دیکھا،اس پہ اسے خود بھی یقین نہ آسکا۔۔۔وہ بار بار، بار بار اس ویڈیو کو پلے کرتی گئی۔۔۔کاش یہ کوئی خواب ہو۔۔۔ بس ایک خواب۔۔۔وہ

ویڈیو کاش حقیقت نہ ہو۔۔۔کاش۔۔۔!

اس ویڈیو میں مہر کی فوٹیج تھی۔۔۔منی لانڈرنگ کرتے ہوئے۔وہ کس طرح سے بینک کے مینجر کو پیسے دے رہی تھی، وہ کسی طرح سے کاغذات پہ دستخط کر رہی تھی۔ویڈیو میں سب نمایاں تھا۔ویڈیو اس اینگل سے بنائی گئی تھی کہ صرف مہر کا چہرہ ہی نمایاں تھا، بینک مینجر کا چہرہ واضح نہ تھا۔۔۔

مہر دم بخود رہ گئی تھی۔وہ گھٹنوں کے بل اسی طرح سے بیٹھی رہی۔اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح سے توڑ دی گئی تھی کہ جڑنے کا کوئی امکان بھی نہیں بچا تھا۔

وہ برباد ہو گئی تھی۔۔۔اس کا گوشہ گوشہ جکڑا گیا تھا۔۔۔وہ ایک کرمنل تھی۔۔۔ایک آفیشل کرمنل۔۔۔

اور وہ ویڈیو، اس کے مجرم ہونے کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔۔۔

مہر کو اپنا آپ خالی خالی سا لگا۔۔۔اسے لگا جیسے اسے ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔۔۔اندھیری، کالی زنجیروں نے۔۔۔جو شیطانی قوتیں اپنے اندر سمائے ہوئے تھیں۔۔۔

اس قید سے فرار، مہر کو ناممکن لگ رہا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## پچھلی رات:

عافیت زندگی کی بیسمنٹ میں واقع اس سفید ملاقاتی کمرے میں درانی اور لیڈی اقتدار بیٹھے ہوئے تھے۔

لیڈی اقتدار اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی پہ پہنی انگوٹھی کو اپنے بائیں ہاتھ سے گھما رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں سوچ کا تاثر تھا۔وہ گہری سوچ میں لگتی تھی۔

دوسری طرف درانی ہاتھ میں سگار پکڑے، سگار کے کش بھرتا دکھائی دیتا تھا۔اس نے سگار کا کونا اپنے لبوں سے لگا کے کش اندر بھرا، اور ڈھیر سارا دھواں باہر نکالا۔میٹھی سی خوشبو فضامیں مغوم تھی۔

”کیا مہر کی ماں کو رہا کر دینا چاہیئے درانی؟“ لیڈی اقتدار اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔درانی نے سگار کا ایک اور کش بھرا اور دھواں باہر نکالا۔

”مجھے نہیں لگتا۔یہ کچھ زیادہ ہی جلدی ہوگا۔“ درانی کا انداز لاپرواہ تھا۔لیڈی اقتدار نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”پھر کب؟“ لیڈی اقتدار بولی۔

"ہمیں اسے تب چھوڑنا چاہئے جب وہ جرائم کرتے کرتے اس مرحلے پہ آجائے کہ وہ اپنے جرائم پہ پردہ ڈالنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لئے تیار ہو جائے۔یہاں تک کہ جرائم کرنا اس کے لیے ایک معمولی بات بن جائے۔تب اس کی ماں کو آزاد کرنے کا بہترین وقت ہو گا۔" لیڈی اقتدار غور سے درانی کی بات سنتے گئی۔چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری۔

"بہترین۔" وہ معنی خیز سے انداز میں کہتے کھڑی ہوئی۔شیطانی نظروں کا تبادلہ ہوا۔۔۔درانی نے اپنائیت سے مسکرا کے سر کو خم دیا۔۔۔ملکہ اپنا فیصلہ بنا چکی تھی۔مہر کی ماں فی الوقت آزاد نہیں کی جائے گی۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر 10:تناسخ

یہ دنیا تاریک ہے۔۔۔،

خود پرست ہے۔۔،

ظالم ہے۔۔!

یہ دنیا اگر۔۔۔

اگر روشنی کی ایک رمق میں بھی دیکھ لیتی ہے۔۔۔

تو اسے تباہ کر دیتی ہے۔۔۔!

(ٹینگلڈ کی مدر گادل)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ فنا ہو جانا چاہتی تھی۔۔۔اسی وقت۔۔۔اسی گھڑی۔

تکلیف اس کے وجود کے گوشے گوشے پر سمائے ہوئی تھی۔۔۔

وہ کرب میں جھلس رہی تھی،

وہ تکلیف سے بلک رہی تھی۔۔۔۔

اور وہ اسی چیز کی تمنا کر رہی تھی کہ۔۔۔

کاش وہ فنا ہو جائے!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ائیر پورٹ کے پارکنگ ایریا میں یوں ہی نڈھال بیٹھی تھی۔اس کے عقب میں اس کا سوٹ کیس اوندھا پڑا ہوا تھا۔بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔آنکھیں خشک تھیں اور اپنے اندر لاچارگی اور بے بسی سمائے ہوئے تھیں۔

وہ اس چوٹ کے بعد بھلا کیسے اٹھ سکتی تھی؟ وہ بھلا کیسے اس سب کا مقابلہ کر سکتی تھی؟ وہ تو اب قید ہو چکی تھی۔اس کے وجود کو ان دیکھی زنجیروں نے جکڑ لیا تھا۔مہر بنتِ عبداللہ سلطان بالکل برباد ہو چکی تھی۔وہ چٹانوں کے نیچے آ کے کچل دی گئی تھی۔ان اندھیری طاقتوں نے اسے چکنا چور کر دیا تھا۔

"اٹھو!" پیچھے سے اسے کسی نے پکارا۔مہر کو بس آواز آئی۔وہ نہیں پہچان سکی یہ کون تھا۔وہ شل سے وجود کے ساتھ یوں ہی بیٹھی رہی۔

"اٹھو بس۔سب دیکھ رہے ہیں۔" مہر نے ایک جھٹکا لیا۔وہ پہچان گئی تھی کہ یہ کون تھا۔مگر وہ واپس کیوں آگیا؟ وہ تو اسے کچھ دیر پہلے ہی چھوڑ کے چلا گیا تھا؟ مہر نے گردن موڑ کے نہیں دیکھا۔اس نے بس اپنے ہاتھ اٹھائے اور ماتھے پہ بکھرے بال سمیٹے۔

"اٹھو جلدی۔" اس نے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا تو احمد کچھ غیر آرام دہ سا کھڑا تھا۔مضطرب سے انداز میں

وہ آس پاس دیکھے جارہا تھا۔

"کیا کر رہی ہو؟ سب دیکھ رہے ہیں۔"احمد نرمی سے کہہ کے ہاتھ آگے بڑھانے لگا۔مہر نے اس کا ہاتھ تھاما، اپنے اندر ہمت اور توانائی جمع کرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔وہ اب بھی ششدر سے عالم میں تھی، گہرے صدمے میں تھی۔وہ اپنے شاق سے نہیں نکل سکتی تھی۔ مہر کو لگا جیسے وہ اندھیروں میں ڈوب رہی تھی، جیسے وہ کسی کھائی میں گر رہی تھی۔وہ جانتی تھی کہ تیر اس کی طرف چلا دیا گیا ہے۔۔۔لیکن کمان سے نکلا ہر تیر نشانے پہ تھوڑی لگتا ہے۔۔۔

وہ حواس باختہ سے عالم میں احمد کو دیکھے جا رہی تھی۔آنکھیں بے تاثر تھیں۔اس کا حال بے حال لگتا تھا۔

احمد عجیب سی نگاہیں اس پہ ڈالنے لگا۔کیا وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا؟ اس نے سوچا۔

مہر نے احمد کو کچھ نہیں کہا اور بس گم سم سی پارکنگ ایریا سے جانے لگی۔احمد اس کی طرف بڑھا۔

”کہاں جارہی ہو۔“ احمد اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا تو مہر تھم گئی۔اس نے سرد سی نگاہ احمد پہ ڈالی۔ اسے اب بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیوں تھا جب وہ کچھ دیر پہلے سب کچھ ختم کر کے جا چکا تھا؟

”گرفتار کروانے خود کو۔سب برباد ہو گیا ہے۔“ مہر نے دھیمی سی بے تاثر آواز میں کہا۔احمد نے گہری سانس لی۔

”کچھ برباد نہیں ہوا ہے اور تم کوئی گرفتاری نہیں کروا رہی۔“ احمد ہاتھ باندھتے تائید والے انداز میں گویا ہوا۔

مہر بس احمد کو دیکھتے ہی رہ گئی۔اگر وہ اسے چھوڑنے نہیں والا تھا تو پھر اس وقت وہ سب اس نے کیوں کہا؟اس وقت اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا وہ؟ مہر کی آنکھوں میں احمد کے لیے شکایت ابھری۔ آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔احمد کے چہرے پہ ہلکی پھلکی سی شرمندگی جھلکنے لگی۔

”دیکھو، تم میری باتوں کو اتنا سنجیدہ نہ لو، میں بس غصے میں تھا۔تم جیسا سمجھ رہی ہو اس طرح کچھ نہیں ہے۔چلو میری گاڑی میں چلو۔میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“احمد نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور اپنی کلٹس کی طرف بڑھنے لگا۔

مہر کو ابھی بھی کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہا تھا۔اس وقت مہر بس یہی سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی اس تاریکی میں اسے روشنی کی امید بھی کرنی چاہیئے تھی؟ یا احمد یہ سب اس کا دل بہلانے کے لیے کہہ رہا تھا؟ کیا واقعی اس دلدل سے فرار اب بھی ممکن تھا؟

احمد ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا اور مہر اس کے عقب میں بیٹھ گئی۔گاڑی میں بیٹھتے ہی مہر کے دل بھرنے لگا۔اس کے چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر ابھرا۔آنسوؤں کی رسی کھلی اور وہ بھی رونے لگی۔سسکیاں لے لے کر، وہ روتے گئی۔اتنا کچھ کرنے کے بعد، اپنے آپ کو یوں کالا کرنے کے بعد بھی کچھ ٹھیک نہ ہو سکا تھا۔۔سر پہ آج بھی وہی کالے بادل منڈلا رہے تھے جنہوں نے اسے اس کے ڈیڈ کے قتل کے بعد گھیرا تھا۔

"یہ سب کیا ہو گیا احمد۔میں نے یہ کیا کردیا؟" وہ غمگین سے لہجے میں گویا ہوئی۔آواز میں بے بسی تھی اور خوف بھی گھلا ہوا تھا۔یہ حقیقت کہ وہ لوگ اسے ہر چیز سے محروم کر سکتے تھے، یہ حقیقت کے اس کی پوری زندگی اب ان طاقتوں کے ہاتھ میں آگئی تھی، یہ حقیقت اسے اندر ہی اندر مار رہی تھی۔

احمد چہرے پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ لیے، بس اسے سنتا گیا۔

"اتنا سنگین جرم سر انجام دینے کے باوجود میں اپنی ماں کو حاصل نہ کر سکی۔میں نے آپ سے بھی سب کچھ چھپا کے رکھا۔مگر کسی چیز کا فائدہ نہیں ہوا۔سب بالکل الٹ ہوگیا۔میں اس سب سے نکل بھی نہیں سکتی ہوں" مہر نے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔

"میری ماں اب بھی ادھر ہے، ان ظالموں کے پاس۔ میں یہاں اپنا آپ کالا کر بیٹھی ہوں۔ میں جرم کر چکی ہوں۔ میرا ٹھکانا بس جیل ہے، میری بیٹی کا اب کیا ہو گا احمد؟ وہ بھلا مجھ سے کیا سیکھے گی۔ اس سب نے مجھے میری بیٹی سے بھی کتنا دور کر دیا ہے۔ میں کسی بھی اچھائی کی مستحق نہیں ہوں۔ میں برباد ہو چکی ہوں احمد۔" احمد اسے یوں ہی سنتا گیا۔ وہ اپنے دل میں دبائے بو چھاڑ اسے سناتی گئی۔ اس وقت اسے کسی دلاسے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس وہ اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ اور احمد ایسا کرنے میں بس اس کی مدد کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ میری ماں کو میرے حوالے کریں گے بھی کہ نہیں۔ میری زندگی پوری طرح سے برباد ہو چکی ہے۔ میں نے یہ سب اپنے ساتھ خود کیا ہے۔ اگر میں نے اپنی ماں سے ساری زندگی قطع کلامی نہ کی ہوتی تو شاید دل اتنا بے چین نہ ہوتا جتنا ابھی ہے، شاید پھر دل اتنا خالی نہ ہوتا جتنا ابھی ہے۔ کم سے کم یہ پچھتاوا تو دل میں نہ بسیرا کر رہا ہوتا۔ میں نے ساری زندگی اپنی ماں کا حق مارا۔ میں ان کی وہ بیٹی نہیں بن سکی جس کی وہ مستحق تھیں۔ شاید مجھے اسی کی سزا مل رہی ہے احمد۔" مہر بالآخر بول بول کر چپ ہو گئی۔ دل اب ہلکا ہونے لگا تھا۔ آنسو رک گئے تھے۔ احمد کے چہرے پہ وہ اپنائیت بھری مسکراہٹ برقرار تھی۔

کچھ دیر گاڑی میں خاموشی کا بسیرا رہا۔ پھر احمد نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ وہ اب بھی بالکل مطمئن تھا، اس کی آنکھوں میں اعتماد تھا، اگر وہ آنکھیں مہر دیکھ لیتی تو وہ بھی سمجھ جاتی کہ احمد نے اسے کبھی چھوڑا ہی نہ تھا۔ وہ اس دفعہ بھی اس کی مشکلات کا حل اپنے ساتھ لایا تھا۔

”تمہیں پتا ہے مجھے شروع سے معلوم تھا کہ تم کیا کرنے آئی تھی۔“ احمد نے خاموشی کو توڑا۔ مہر کچھ الجھی۔اس نے سوالیہ نگاہوں سے احمد کو دیکھا جس کے چہرے پر مدھم مسکراہٹ تھی۔

”کیا تمہیں واقعی ایسا لگتا ہے کہ میں نے اس سب کے بارے میں کچھ سوچا نہیں ہو گا؟“ احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔مہر کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔

”مجھے نہیں سمجھ آ رہا؟“

”اگر میں چاہتا تو تمہیں روک سکتا تھا۔مگر میں نے نہیں روکا۔میں نے تمہیں یہ کام کرنے دیا۔کیونکہ اسی میں

بہتری تھی۔میں اس سب کی تیاری کر چکا تھا۔اور تمہیں کوئی نہیں پکڑے گا، بے فکر رہو۔بلکہ تم تو مجرم بھی نہیں ہو مہر!“ احمد نرمی سے مسکرایا۔مہر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔وہ چونکی۔کیا اس نے درست سنا تھا؟ وہ مجرم نہیں تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

”مگر کیسے؟“ مہر الجھ کے بولی تو احمد نے اپنا موبائل نکالا۔اس نے موبائل پہ ایک ویڈیو کھولی اور موبائل مہر کے سامنے رکھ کے اسے دکھانے لگا۔وہ ویڈیو دیکھ کے مہر کی آنکھوں میں بے یقینی پھیلنے لگی۔۔۔لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔اس نے سوالیہ نگاہ احمد پہ ڈالی جو کہ اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ جیسے مہر سے کہنا چاہ رہی ہو کہ ”کاش تم نے مجھ پہ پہلے ہی بھروسہ کر لیا ہوتا مہر“۔

اس ویڈیو میں شمس تھا۔جو گاڑی میں اس سے شمائلہ کے اغواء کی گفتگو کر رہا تھا۔اور کس طرح سے اس نے کہا کہ وہ انہیں چھوڑ دے گا۔اور پھر وہ بینک میں داخل ہوئی۔بینک مینجر اسے مسکرا کے خوش

آمدید کہہ رہا تھا۔اور پھر وہ دونوں اس کمرے میں گئے جہاں اس نے پیپر سائن کئے، وہ سب کچھ اس ویڈیو میں قید تھا۔مہر بالکل دنگ رہ گئی تھی۔اسے سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کیسے ہوا۔اور جوں ہی اسے کچھ یاد آیا۔۔وہ نیکلس۔اس نے اپنے گلے پہ پہنے اس نیکلیس کو بے اختیار چھوا، اب کی بار اس کے چہرے پہ خوش گوار حیرانی تھی، وہ سمجھ گئی تھی، وہ احمد کے طریقے سے بخوبی واقف تھی۔ایک دفعہ پھر سے احمد نے اسے بچا لیا تھا۔ایک دفعہ پھر سے احمد نے اسے کھائی میں گرنے نہیں دیا، وہ اس وقت بھی اس کی ہمت بنا جب اسے لگا تھا کہ واپسی نہ ممکن ہے، جب اسے ہمت جمع کرنا ممکن ہی نہیں لگتا تھا۔

وہ نگاہوں میں عجب لیے اسے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں احمد کے لیے متاثر کن سا تاثر تھا۔

"تعریف کا شکریہ۔" احمد نے لا پرواہی سے کہا۔"آج سے تم صرف ایک والنٹیئر ہو، پولیس کی فشنگ مہم کا ساتھ دینے والی والنٹیئر جس نے منی لانڈرنگ کے مافیا کو بے نقاب کرنے میں ان کی مدد کی ہے۔"

"یہ سب کیسے احمد؟ آخر یہ فشنگ کیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" مہر نا سمجھی سے بولی۔

احمد کی مسکراہٹ فنا ہوئی۔چہرے پہ کرختگی اور سختی در آئی۔اس نے اگنیشن میں چابی گھسائی اور کار اسٹارٹ

کی۔اس نے اب گاڑی کا اے سی چلایا۔گاڑی کا ماحول یک دم پر اسرار سا ہو گیا۔

"تم جاننا چاہتی تھی نہ کہ میں تمہاری مدد کیوں کر رہا تھا؟" احمد بولا۔مہر کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہوا۔

مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔تو آخر وہ وقت بھی آگیا تھا۔۔۔مہر نے سوچا۔

"پھر آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے دشمنوں نے احمد یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا۔" اس کے انداز میں شکایت سی تھی، لہجہ شعلہ باز تھا۔اس کے چہرے پہ کہیں نہ کہیں گہرا کرب بھی جھلکتا تھا۔وہ آنکھوں میں تپش لیے مہر کو دیکھنے لگا۔

اس نے اب سب کچھ مہر کو بتانا شروع کیا۔۔۔شروع سے۔۔۔آخر تک۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## تین سال پہلے:

فیروز کی گمشدگی کو ایک ماہ ہونے والا تھا۔وہ لوگ اپنی زندگیوں میں آگے بڑھنے لگے تھے۔اس سوالات کے ساتھ جینا، کہ ان کا پیارا محبوب بھائی کدھر ہے، زندہ بھی ہے کہ نہیں، زندہ ہے تو کس حال میں؟ اور اگر مردہ ہے تو اس کی لاش کہاں ہے؟ اس عدم یقینی کے ساتھ جینا نہایت مشکل تھا۔۔لیکن وہ جی رہے تھے۔۔۔وقت گزار رہے تھے۔بہرحال، انہوں نے فیروز کی تلاش اب تک چھوڑی نہیں تھی۔اسے ڈھونڈنے کی، اسے کھوجنے کی وہ دونوں ہی پوری کوشش کر رہے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔درفشاں گھر کے لاؤنج میں خاندان کی کچھ عمر رسیدہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

دونوں عورتیں اس کی خالہ تھیں، ایک ممتاز اور دوسری سمینا۔

میز پہ چائے کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے اور نمکو کی پلیٹ بھی جس میں سے آدھی سے زیادہ نمکو چٹ کری جا چکی تھی اور باقی بس، تکلفانہ ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ درفشاں کافی غیر آرام دہ سی نظر آرہی تھی۔

"ویسے۔" ممتاز خالہ نے ہاتھوں میں نمکو بھری۔"پولیس کو کمپلین کی تم لوگوں نے؟" نمکو منہ میں ڈال کے وہ اب دانتوں سے اسے چبانے لگیں۔ خستہ نمکو کے ٹوٹنے کی آواز ان کے منہ کی سمت سے آتی تھی۔

درفشاں نے محض سر اثبات میں ہلایا، بولی کچھ نہیں۔

"ہائے بیچارا۔ نہ جانے کہاں ہو گا۔ یہ سارے جو ہوتے ہیں نا، وہ ہوتے ہیں۔۔" سمینا خالہ جیسے ایک لفظ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔"کیا کہتے ہیں انہیں؟ ہاں اسکیم۔ یہ سب اسکیم وغیرہ ہوتے ہیں۔" درفشاں بس یوں ہی سنتے گئی۔ وہ پچھلے مہینوں سے گھسی پٹی باتیں سن سن کے بیزار ہوچکی تھی۔ یہ جیسے روز کا معمول بن چکا تھا، ہر کوئی آتا تھا، اس سے ہر تفصیل پوچھتا تھا۔ تفصیل کے بات مشورے دیتا تھا، مشورے دینے کے بعد افسوس کا اظہار کرتا تھا۔

"چلو بس اب اللہ بہتر کرے۔ ہماری تو دعا ہے کہ جلد فیروز واپس آ جائے۔ بڑا ہی پیارہ بچہ تھا۔ ملنسار اور خوش اخلاق۔" ممتاز خالہ چہرے پہ اداسی لیے بولیں۔ درفشاں کی کوفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

"اب نہ جانے کیا ہو گا تم دونوں کا۔ ماں باپ پہلے نہیں۔ اور ایک بھائی' جو گھر کا معاشی نظام چلاتا تھا وہ بھی چلا گیا۔ بس اب اللہ ہی بھلا کرے۔" سمینا خالہ نے مٹھی بھر کے نمکو اٹھائی اور منہ میں ڈالی۔

"ہاں مگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بے جھجک پوچھ لینا۔ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔" اس بات پہ در فشاں

کے چہرے پہ کڑوی مسکراہٹ بکھری۔وہ جانتی تھی کہ در حقیقت کوئی ان کے ساتھ نہ تھا۔ان کے والدین کے انتقال کے بعد سے کوئی ان کے ساتھ نہ رہا تھا۔اس وقت بھی سب رشتہ داروں نے یہی سب باتیں کی تھیں۔مدد کے لیے ان سب نے جب بھی کسی کو پکارا، کوئی نہ کوئی بہانا انہیں پکڑا دیا گیا۔وہ ہمیشہ سے اکیلے تھے اور آئندہ بھی اکیلے رہنے والے تھے۔یہی حقیقت تھی، تلخ تھی، لیکن حقیقت تھی۔۔۔

"ویسے در فشاں میرا مشورہ ہے کہ یہ گھر بیچ کے کسی چھوٹے گھر میں چلے جاؤ۔اب پانچ کمرے ہیں'احمد اور تم نے بھلا کیا کرنا اتنے بڑے گھر کا؟"ممتاز خالہ نے مشورہ دیا۔در فشاں نے بیزاری سے آنکھیں میچ لیں۔لوگ اتنا ظالم کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ گھر ان کے ماں باپ نے کتنی محبت سے بنایا تھا۔۔۔در فشاں کو سوچ سوچ کے گھٹن محسوس ہونے لگی۔

"نہیں۔اللہ کا شکر ہے،ابھی اتنے برے وقت نہیں آئے۔ہم ٹھیک ہیں۔" درے نے لہجہ عام سا بنایا۔

"بھئی میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔نہ جانے آگے کیا ہونا ہو۔وقت کا کچھ پتا ہے بھلا؟" اب در فشاں کا سر پھٹنے لگے تھا، وہ اپنے آپ کو کچھ کڑوا بولنے سے روک رہی تھی۔

کچھ دیر معمول کی باتوں کے بعد اس کی خالہ چلے گئیں۔

ان دونوں کے جاتے ہیں اس نے کلینک کی انتظامیہ کو کال ملا دی، وہ بس اب کل سے ہی دوبارہ جوائننگ دینے لگی تھی۔وہ گھر بیٹھ کے، گھر کا یہ زہریلا ماحول برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

رات کا وقت تھا جب احمد گھر واپس آیا۔اس کے چہرے پہ شدید تھکان واضح تھی، کندھے تھکان کے باعث  بھاری محسوس ہو رہے تھے۔درفشاں نے اس کے آتے ہی کھانا میز پہ لگایا۔دونوں نے کھانا شروع کیا۔فیروز بھائی کے بغیر کھانے کی عادت بھی دونوں کو آہستہ آہستہ ہونے لگی تھی۔۔۔

"پولیس کو کچھ پتا چلا؟" پچھلے مہینے سے ہر روز وہ یہی سوال پوچھ رہی تھی، اور احمد نے وہی رد عمل دیا جو وہ پچھلے مہینے سے دے رہا تھا۔۔اس نے سر نفی میں ہلایا۔

وہی مایوسی کے کالے بادل پھر سے درفشاں کے سر پہ چھانے لگے۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھ بند کرے اور جب کھولے تو اس کے فیروز بھائی اس کے سامنے ہوتے، اسے مسکرا کے دیکھ رہے ہوتے۔۔۔مگر پلک جھپکانے سے بھی ایسے معجزے کہاں ہوتے ہیں؟

"وہ کسی مجبوری کی تحت استنبول گئے ہوں گے، مجھے یقین ہے وہ خود بات کر لیں گے۔مجھے یقین ہے۔" درے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔وہ بس اپنی دم توڑتی امیدوں کو ہوا دینے کے لیے بہانے تلاش کر رہی تھی۔امیدیں ہی تھیں جن کے سہارے وہ زندگی بسر کر رہی تھی، ان امیدوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھنا، وہ نہیں چاہتی تھی۔

احمد کے ماتھے پر بل پڑے۔

"ایئر پورٹس کے ڈیٹا کے مطابق وہ استنبول نہیں گئے آپا۔کچھ سمجھ نہیں آرہا۔اگر وہ پاکستان میں ہیں تو کدھر ہیں؟" احمد اچنبھے سے بولا۔درے کا دماغ مزید الجھ گیا۔

بھائی کے جانے سے سب کچھ کتنا مشکل ہو گیا تھا۔سب کچھ کتنا خالی ہو گیا تھا۔اسے خالی پن ہر جگہ محسوس ہوتا تھا۔

"کسی انہونی نے فیروز بھائی کو جکڑ لیا ہو گا احمد۔مگر مجھے امید ہے وہ ایک دن ضرور ملیں گے۔ہمیں ہمارا بھائی ضرور ملے گا۔" درفشاں آواز میں آس لیے بولی تھی۔وہ اس بات کا اقرار نہیں کر رہی تھی کہ وہ بھی اندر سے مایوس تھی۔اندر سے اس کا دل واقف تھا کہ اب فیروز نہیں ملنے والا۔

کھانے کے بعد دونوں اپنے اپنے کمروں کی جانب چل دیئے۔احمد جاتے ساتھ ہی لیپ ٹاپ پہ لگ گیا۔ وہ فری لانسنگ کرتا تھا، اور رات تک وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ ہی لگا رہتا تھا۔

کام سے فارغ ہوکے وہ بیڈ پے سیدھا لیٹ گیا اور موبائل استعمال کرنے لگا۔وہ اس وقت انسٹا پہ لگا ہوا تھا، ٹھیک اسی وقت اسے ایک پوسٹ نظر آیا۔۔استار ترکی آرگنائیزیشن (Star turkey organization)

"یہ دیکھو، سیٹل ان ترکی نام کا یہ پیج ہے۔ان کا آفس بھی ہے، میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔بے فکر رہو۔"

احمد کے دماغ میں فیروز کا وہ فقرہ گردش کرنے لگا جو ڈیڑھ مہینے پہلے اس نے اس سے کہا تھا۔وہ تھوڑا چوکناہوا اور اٹھ کے بیٹھ گیا۔آنکھوں میں مشکوک سا تاثر تھا۔

اس نے وہ پیج کھولا اور اسے فالو کیا۔وہ اس پیج کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگا۔وہ پیج تین ماہ پرانا تھا۔اس میں کافی زیادہ پوسٹنگ کی جاتی تھی۔ساری پوسٹ بہت پروفیشنل سی لگتی تھی۔ایسے جیسے یہ کوئی بہت معیاری ادارہ ہو۔احمد کے شک میں اضافہ ہوا۔اس پیج کو دیکھ کہ نہ جانے کیوں وہی والا پیج یاد آرہا تھا جو فیروز نے اسے دکھایا تھا۔

فیروز کے لا پتہ ہونے کے بعد وہ پیج غائب ہوگیا تھا۔کیا یہ کوئی اشارہ تھا؟ کیا احمد کو اس پیج پر تفتیش کرنی چاہئے تھی؟احمد فیصلہ نہیں لے پا رہا تھا۔

احمد نے فی الحال موبائل پرے رکھ دیا۔اب اس کے قرآن دہرانے کا وقت تھا۔

وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل تک گیا۔اس نے اپنا ہرے سرورق والا مصحف نکالا جو کہ ہرے غلاف میں مقید تھا۔مصحف بھی کافی پرانا لگتا تھا اور غلاف بھی قدرے پرانا تھا، کیونکہ سلائی جگہ جگہ سے نکلی ہوئی نظر آتی تھی۔

احمد اس اندھیری رات میں، اپنے کمرے میں، تنہائی میں قرآن کی تلاوت کرتا گیا۔۔اپنی زندگی کی مصروفیات۔۔اپنی زندگی کی ہر کشمکش کو وہ ایسے ہی بھلاتا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آنے والے کچھ دن درے اور احمد کے لیے مصروف سے گزرے تھے۔احمد نے پولیس اسٹیشن کے چکر لگانے چھوڑ دیئے تھے کیونکہ اسے یقین ہوگیا تھا کے پولیس اس معاملے کو لے کر سنجیدہ نہیں تھی۔پولیس والے بس ٹال مٹول ہی کیے جارہے تھے۔

دن کے کسی اوقات میں ایک بار پھر سے اس کی نظروں میں اسٹار ترکی آرگنائیزیشن کی جانب سے کی گئی ایک اور پوسٹ گزری۔وہ متجسس ہو کے پوسٹ پڑھتا چلا گیا۔

پوسٹ میں ترکی جانے کے فوائد گنوائے گئے تھے۔اس پوسٹ کو ایسا بنایا گیا تھا کہ کوئی بھی کچی عمر کا نوجوان، اس پوسٹ کو پڑھ کے یہی، تصور کرنے لگ جائے کہ ترکی جا کے اس کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔احمد کو یہ پیج پہلے سے بھی زیادہ ٹھٹکنے لگا۔کیا یہ کوئی اسکیم تھا یا پھر یہ ایجنسی بس مارکٹنگ کر رہی تھی؟ احمد کو یہی دو امکان نظر آئے۔

اس کا تجسس اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔آخر کار اس نے پیج کا ڈی ایم کھولا اور انہیں ایک میسج بھیجا:

"کیا آپ لوگ مجھے اور تفصیلات دے سکتے ہیں؟"احمد نے پیغام بھیج کے موبائل بند کر دیا۔دل میں عجیب سی لہرے ڈگ مگائی تھیں۔نہ جانے کیوں اس کے دل کو لگ رہا تھا کہ ان کا فیروز کی گمشدگی سے تعلق تھا۔وہ بس اپنے شک کی تصدیق چاہتا تھا۔

وہ دلدل میں اپنا پہلا قدم بڑھا چکا تھا، یہ وہی دلدل ہے جس میں احمد یوسف آج تک جکڑا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا وقت تھا، معمول کے مطابق احمد پروگرامنگ کرنے میں مصروف تھا۔اسے حال ہی میں ایک نیا کلائنٹ ملا تھا اور اب وہ اسی کی ویب سائیٹ پہ کام کر رہا تھا۔

لیپ ٹاپ پہ اس کا ہاتھ تیزی سے کوڈز ٹائپ کر رہا تھا۔وہ کچھ دیر ٹھہرتا، کچھ سوچتا، اور پھر سے ٹائپنگ شروع کرتا۔لیپ ٹاپ کے عقب میں رکھا موبائل تھرتھرایا، موبائل کی اسکرین جگمگائی۔احمد نے ٹائپنگ کرتے ہوئے ہی ایک سرسری سی نگاہ موبائل پہ ڈالی۔

اسٹار ترکی کے پیج نے اس کے میسج کا رپلائی دے دیا تھا۔احمد کا ٹائپنگ کرتا ہاتھ تھما۔اس نے سب کام چھوڑ کے اپنا موبائل اٹھایا اور ان کا ڈی ایم کھولا۔

"آپ کہاں جانے میں انٹرسٹڈ ہیں۔" وہ یہ میسج پڑھ کے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

"استنبول۔آپ لوگ مجھے تفصیلات دے سکتے ہیں؟" احمد نے ٹائپ کیا۔

"آپ کس شہر سے ہیں؟"

"اسلام آباد۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ ہمارے آفس آجائیں۔ہمارے ادارے کے کونسلر آپ کو ہدایات فراہم کر دیں گے اور تمام اہم تفصیلات سے آگاہ کر دیں گے۔آپ اپنا واٹس ایپ نمبر بھی دے دیجیے' تاکہ ہم آپ کو لوکیشن بھیج دیں۔"

احمد گہری سوچ میں پڑ گیا۔کیا واقعی اس سب کا کوئی فائدہ تھا؟ کیا وہ کسی طرح سے فیروز تک رسائی حاصل کر سکتا تھا؟ یا وہ یہ جان سکتا تھا کہ فیروز کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ احمد نے اس وقت فیصلہ کیا کہ وہ ایک دفعہ تو ان کے آفس کا چکر ضرور لگائے گا۔اگر اسے آفس میں کچھ بے ضرر لگا تو وہ آگے اس معاملے کو نہیں دھکیلے گا۔اس نے دل میں یہی سوچا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" احمد نے اپنا نمبر دے دیا۔کچھ دیر میں اسے واٹس ایپ پر لوکیشن موصول ہو گئی۔آفس راولپنڈی کے ایک کمرشل علاقے میں تھا اور گھر سے تھوڑا دور تھا۔دوری اب احمد کے لیے بے معنی تھی، وہ فیصلہ کر چکا تھا۔اب کوئی بھی شے اس کے فیصلے کو بدل نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن دوپہر کے اوقات میں احمد راولپنڈی کے اس کمرشل علاقے میں پہنچ گیا تھا جہاں اسٹار ترکی کا آفس

واقع تھا۔کچھ دیر گلیوں میں بھٹکنے کے بعد اسے آفس مل گیا تھا۔

اسٹار ترکی کے آفس کے سامنے اپنی بائیک پارک کر کے وہ آفس میں داخل ہوا۔آفس میں داخل ہوتے ہی سامنے اسے ریسیپشن نظر آئی۔ریسیپشنسٹ ایک مرد تھا جو کہ کسی سے فون پہ بات کر رہ تھا۔اے سی کے باعث آفس میں کافی ٹھنڈک تھی۔دیوار کے ساتھ تین لوہے کی کرسیاں بھی لگائی گئی تھیں۔

احمد کو دیکھتے ہی ریسیپشنسٹ نے فون نیچے کیا اور مسکرا کے احمد کا استقبال کیا۔احمد ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ریسیپشن کی طرف آیا۔

"جی سر، میرا نام جلیل ہے۔میں آپ کی کیسے مدد کر سکتا ہوں؟" جلیل نامی ریسیپشنسٹ نرمی سے بولا۔احمد نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

"میں نے کچھ تفصیلات لینی تھی۔میں ترکی جانا چاہتا ہوں، جاب کے سلسلے میں۔" احمد کا انداز سرسری تھا۔

"جی سر، ممکن ہے۔اندر حسان صاحب ہیں جو کہ سارے انتظامات کرواتے ہیں۔آپ دس منٹ میں ان سے مل لیں۔" جلیل دراز سے کچھ نکالنے لگا۔"تب تک آپ یہ فارم بھر دیں۔" وہ دراز میں متلاشی نظریں گھمانے لگا۔

اسی وقت دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔احمد نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔جلیل نے اندر آنے والے شخص

کو دیکھ کر سر خم دیا۔اندر آنے والا شخص احمد کے برابر آکے کھڑا ہوگیا۔اس کے پاس سے مردانہ پرفیوم کی تیز مہک آتی تھی۔احمد اور اس اجنبی کی نظروں کا ملاپ اب تک نہیں ہوا تھا۔

"جی سر، آپ اپنا نام بتائیں؟" جلیل نے فارم اور پین احمد کی طرف بڑھاتے کہا۔

"احمد۔احمد یوسف۔"جلیل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن بول نہ سکا۔احمد کے برابر میں کھڑا مرد فارم کی طرف جھپٹا۔اس نے جارحانہ انداز میں فارم چھین لیا تھا۔احمد نے عجیب سی نگاہ اس شخص پہ ڈالی جس کا چہرہ سایوں میں جکڑا ہوا تھا۔

"شمس، سب ٹھیک تو ہے؟" جلیل بوکھلا گیا تھا۔

شمس نے اب گردن موڑ کے احمد کو دیکھا جو کہ پرسکون سی سرد نگاہیں لیے اسے ہی گھور رہا تھا۔

شمس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔وہ تیزی سے احمد کی طرف لپکا۔ اس کا کندھا دبوچ کر اسے دیوار

سے لگایا۔ جلیل بالکل الجھ گیا۔احمد کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔اس نے غصیلی نگاہوں سے شمس کو دیکھا۔

"دروازہ بند کرو جلیل!" شمس نے اونچی آواز میں کہا تو جلیل نے پہلی فرصت میں آفس کا دروازہ بند کیا۔اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہاں ہو کیا رہا تھا۔ آفس کی سرد فضا میں تناؤ پھیل گیا تھا۔

شمس کی غصیلی نگاہیں احمد پہ مرکوز تھیں۔وہ سانسیں پھلا کے اسے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر بے یقینی کے باعث بل تھے۔

احمد نے اپنی آنکھوں میں تپش طاری کی، وہ بھی اسے شعلہ باز نگاہیں لیے گھور رہا تھا۔

"ہاتھ نیچے!" احمد کی آواز مدھم تھی مگر انداز رعب دار تھا۔ شمس کو کچھ ٹھٹکنے لگا۔سامنے کھڑے شخص میں ڈر کا

کوئی عنصر موجود نہ تھا۔وہ اب بھی پر سکون تھا۔ شمس نے مزید سانسیں پھلائیں۔ایسا کرتے ہوئے وہ وحشی درندے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

"آج کے بعد مجھے یہاں نظر نہیں آؤ گے تم۔سمجھے؟" شمس نے چبا چبا کے ہر ایک لفظ ادا کیا۔احمد کے دماغ میں سوال در سوال آنے لگے۔یہ شخص تو اس کے لیے اجنبی تھا، پھر وہ اسے کیسے جانتا تھا؟

"ورنہ کیا؟" احمد بھی ڈرا نہیں تھا۔ شمس کی آنکھوں میں حیرانی پھیلی۔ وہ احمد کو ڈرانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔اس نے اب کچھ اور کرنے کا فیصلہ کیا۔

شمس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پستل نکالی۔۔ احمد بالکل ساکن ہوگیا۔ آنکھیں پھٹنے لگیں۔اس کے جسم نے حرکت بند کر دی۔سانس ایک دم تھم سی گئیں۔ شمس نے آہستگی سے پستل کی نال احمد کی کنپٹی پہ رکھی۔احمد کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے ابھرنے لگے۔

"ورنہ گولی تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا!" شمس نے چبا چبا کر کہا اور احمد کے کندھے پر سے گرفت ڈھیلی کرکے اسے چھوڑ دیا۔احمد گہری سانسیں لیتا شمس سے دو قدم پیچھے ہوا۔ آنکھوں میں شمس کے لیے خوف تھا۔

"دفع ہو جاؤ اب۔ نظر نہیں آنا مجھے۔"احمد دروازے سے جانے لگا تھا تو شمس پیچھے سے چلایا۔

احمد باہر آیا تو وہ تلملایا ہوا تھا۔ آخر کوئی اس کے ساتھ یہ سب کیسے کر سکتا تھا؟ یہ سوچ سوچ کے وہ آگ بگولا

ہوئے جارہا تھا۔

اسے ایک لینڈ کروزر بھی نظر آئی۔احمد نے اس لینڈ کروزر پر زور سے لات کھینچ کے ماری اور آگے بڑھ گیا۔غصے میں اس کے اعصاب تن گئے تھے۔احمد نے ایک دکان سے پانی کی بوتل لی اور روڈ کی پیومنٹ پر بیٹھ کر پانی اپنے حلق میں اتارا۔ جس طرح غصہ اس کے دماغ سے سرکنے لگا' دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔اب وہ ہونے والے واقع پہ ایک گہری نظر ڈال رہا تھا۔

تو اب یہ تو ثابت ہو چکا تھا کہ اس جگہ پہ کچھ نا کچھ غلط ضرور ہو رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ احمد کے دماغ میں اور بھی کئی سوالات تھے۔ کیا ان کا فیروز سے کوئی تعلق تھا بھی؟ اور یہ بھلا اسے کیسے جانتے تھے؟ اسے کچھ نہ کچھ کرکے اب ان سوالات کا جواب تو تلاش کرنا ہی تھا، لیکن کیسے؟ وہ مضطرب ہونے لگا تھا۔

ٹھیک اسی وقت احمد کی جیب میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔ احمد نے موبائل کھولا۔ اس کے پاس ای میل آئی تھی اس کمپنی سے جس میں کچھ دنوں پہلے اس نے انٹرویو دیا تھا۔ احمد کچھ پر سکون ہونے لگا۔ اسے ویسے بھی مسلسل آمدنی کی ضرورت تھی۔ پہلے اس کے اوپر صرف اپنے خرچے تھے مگر اب اس کے اوپر درفشاں کی بھی ذمہ داری تھی۔

کمپنی کا آفس اسی کمرشل علاقے میں واقع بلڈنگ میں بنا ہوا تھا۔ احمد اسی وجہ سے یہاں کام کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ یہاں سے وہ اسٹار ترکی کے اس مشکوک ادارے پہ' زیادہ نزدیک سے نظر رکھ سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد کو اپنے نئے آفس میں جاب کرتے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ آفس کی بلند عمارت اسٹار ترکی آرگنائیزیشن کی پٹی پہ ہی تھی۔ آفس، اس عمارت کے چوتھے فلور پہ واقع تھا۔ وہ اکثر و بیشتر آفس کی بلڈنگ سے اسٹار ترکی آفس کو دیکھا کرتا تھا۔ اسے پچھلے ہفتے میں دو سے تین مرتبہ شمس اپنی لینڈ کروزر میں سوار یہاں پر نظر آیا تھا۔ احمد نے محض پچھلی دفعہ ہونے والے واقعے کے بعد وہاں جانے کی جرات نہ کی تھی لیکن اب اس کا تجسس اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ دل میں ہر وقت ہل چل مچی رہتی

تھی اور یہی سوال دماغ میں سوار رہتا تھا کہ آخر وہاں ایسا کیا ہو رہا ہے؟ کیا واقعی فیروز کی گمشدگی کا اس ادارے سے کوئی تعلق ہے؟ وہ اب تک نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہا تھا۔

ایک دن تنگ آ کے، احمد نے کچھ خطرناک کرنے کا فیصلہ کیا۔اس کو شمس کی طرف سے موصول دھمکی بھی یاد تھی مگر وہ اس طرح سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔

اس دن شمس کی لینڈ کروزر اسٹار ترکی کے آفس کے بالکل سامنے کھڑی تھی جب اس نے اپنی واردات کرنے کا فیصلہ کیا۔احمد اپنے بریک کے وقت اپنے ہاتھ میں کچھ فائلز تھامے اسٹار ترکی کے اداری کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔لینڈ کروزر کے بالکل پیچھے کھڑے ہو کے اس نے اپنے اطراف میں نظریں گھمائیں۔جب اس نے تسلی کر لی کہ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا اس نے ہاتھ میں موجود فائلز زمین پہ گرا دیں۔

احمد کا دل زور سے دھڑک رہا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو پر سکون ظاہر کیا۔اس نے نیچے جھک کر مصروفانہ انداز میں فائلز اٹھانا شروع کیں۔اس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک گول ڈیوائس نکالی۔ڈیوائس کے پیچھے ایک پیپر لگا تھا جو اس نے کھینچ کے اتارا۔ایک دفعہ پھر اس نے مضطرب ہو کے اطراف کا جائزہ لیا۔سب اپنے آپ میں مگن چلے جا رہے تھے، احمد نے پر سکون سانس خارج کی۔

پیپر اترنے پہ اس ڈیوائس کی سطح نمایاں ہوئی جس پہ ایک بہت مضبوط اڈھیسو گلو لگائی گئی تھی۔احمد نے ایک دفعہ پھر سے اطراف میں دیکھا۔ایک گہری سانس اندر لی۔۔۔اور ایک گہری سانس باہر نکالی۔

اس نے گاڑی کے نیچے وہ ڈیوائس چپکا دی۔ڈیوائس گاڑی کے نیچے چپک چکی تھی۔احمد نے ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اپنی فائلز جمع کیں اور کھڑا ہوا۔سانسیں بحال ہونے لگی تھیں، کسی نے اسے مشکوک کاروائی انجام دیتے نہیں دیکھا تھا۔اپنا چہرہ، اور کپڑے درست کرتے وہ آفس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

یہ ڈیوائس کوئی عام ڈیوائس نہ تھی۔اس ڈیوائس میں احمد نے ایک جی پی ایس ٹریکر ڈالا ہوا تھا۔وہ شمس کی ہر حرکت پہ نظر رکھنا چاہتا تھا۔اسے یہ کرنا ضروری لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اور اسی طرح سے کچھ دن مزید گزرے۔اب اتوار کا دن آن پڑا تھا۔

روز کا اب کچھ یوں معمول بن گیا تھا۔احمد روز صبح کام پہ جاتا، کام سے واپس آکے وہ اپنے جی پی ایس ٹریکر سے شمس کی گاڑی کی ہر حرکت دیکھا کرتا تھا۔

اسے ان دنوں میں کوئی خاص پیٹرن نظر نہیں آیا۔ایک دفعہ بس شمس ایئرپورٹ گیا تھا۔وہ ایک دن چھوڑ کے ایک دن، عافیت زندگی کے ہسپتال بھی جایا کرتا تھا۔باقی وہ کبھی وہ ایک کالونی جاتا' کبھی دوسری کالونی۔احمد کوئی نقطہ جوڑ نہیں پا رہا تھا۔اسے ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں آرہا کہ یہ شمس کرتا کیا تھا۔ وہ عافیت زندگی کیوں جاتا تھا؟ اور پھر اس کا اسٹار ترکی میں کیا کام؟ اور پھر بیچ میں ایک ایئرپورٹ بھی آگیا۔پزل کے ٹکرے بکھرتے جا رہے تھے۔

اتوار کے دن احمد کی چھٹی تھی اس لیے اس نے اپنی گاڑی میں ہی شمس کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔وہ اپنے موبائل کے سافٹ ویئر سے شمس کی لوکیشن دیکھتا،اور اس طرح سے اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتا۔ شمس آج ایئرپورٹ کے راستے پہ گامزن تھا۔وہ دوسری دفعہ ایئرپورٹ جارہا تھا یعنی ایئرپورٹ میں یقیناً کوئی ضروری کام ہورہا ہوتا ہے۔احمد اتنا تو سمجھ گیا تھا۔ شمس ہمیشہ ایئرپورٹ سے واپس آجاتا تھا، یعنی وہ ایئرپورٹ میں بس کسی کو چھوڑنے جاتا تھا۔لیکن کسے؟ اور کیوں؟ یہ احمد سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

ایئرپورٹ کے باہر شمس نے اپنی لینڈ کروزر روکی۔احمد نے شمس کی لینڈ کروزر سے کافی دور، درختوں کی اوٹ میں اپنی کلٹس پارکی۔وہ دوربین کی مدد سے شمس کی لینڈ کروزر کو دیکھ رہا تھا۔

لینڈ کروزر کے شیشے ٹنٹڈ تھے اس لیے احمد اندر کا منظر نہیں دیکھ پارہا تھا۔گاڑی کے دروازے کھلے، ڈرائونگ سیٹ سے شمس نکلا اور پچھلی نشست سے ایک جوان سی لڑکی۔اس لڑکی نے نیلی سلیو لیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔بالوں پر بینڈ لگاکے پیچھے کسا ہوا تھا۔وہ ایک ماڈل تھی جو کے اس نے کسی اشتہار میں دیکھی تھی۔

شمس کا بھلا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق؟ احمد نے سوچا۔

اس ماڈل کو شمس نے ایک سوٹ کیس دیا۔شمس ہاتھ ہلا ہلا کے اس لڑکی کو کچھ کہنے لگے۔ماڈل کے چہرے پر گھبراہٹ واضح تھی۔وہ اتنی سہمی ہوئی کیوں لگ رہی تھی؟ احمد نے سوچا۔دماغ میں کہیں نہ کہیں تصویر بننے لگی تھی۔

شمس اب ماڈل سے بات کرتے ہوئے کمینگی سے مسکرایا۔یہ کمینی سی مسکراہٹ دیکھ کے تو احمد کا خون کھولنے لگا تھا۔وہ ماڈل اب بیگ ہاتھ میں تھامے ایئرپورٹ کے اندر چلی گئی۔شمس پھر دوبارہ سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔احمد کے دماغ میں مزید سوال ابھرے۔

اس وقت احمد کو کچھ یاد آیا۔دو سال پہلے اس نے ایک خبر پڑھی تھی جس میں ماڈل' ایک امیر پالیٹیشن کے لیے منی لانڈرنگ کرتے پکڑی گئی تھی۔احمد کو احساس ہوا کہ یہاں پر بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

احمد کے دماغ میں تصویر واضح ہونے لگی تھی۔کوئی آخر منی لانڈرنگ کیوں کرتا ہے؟ تاکہ اپنا کالا پیسہ چھپا سکے اور اس پر پردہ رکھ سکے۔یقینا شمس صرف ایک مہرہ تھا، اور اس کے پیچھے کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔یہ لوگ یقیناً طاقت ور بھی ہوں گے۔تو کیا یہ لوگ فیروز کے مجرم ہو سکتے تھے؟ احمد کو لگا کہ اس چیز کا امکان فی الوقت' کافی زیادہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد نے شمس کے اوپر دور سے ہی نظر رکھنا جاری رکھی۔اسی طرح سے شمس کا تعاقب کرتے کرتے ایک ہفتہ بیت گیا تھا۔وہ دن رات شمس کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔شمس اسے ایک دفعہ پھر سے ایئرپورٹ کے قریب نظر آیا تھا۔عافیت زندگی جانا تو اس کی روز کی روٹین میں تھا۔مگر سب پزل پیسز بکھرے ہوئے تھے۔وہ کوئی پزل پیس جوڑ نہیں پا رہا تھا۔فیروز کا ان سب سے تعلق بھی واضح نہ تھا۔

اس کے علاوہ آفس کے کاموں نے احمد کو ضرورت سے زیادہ تھکا دیا تھا۔اس سے پہلے وہ کافی مرتبہ انٹرنشپز

کر چکا تھا مگر یوں مسلسل کام کرنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔اور یوں ہی وہ آفس پالیٹکس سے بھی متعارف ہوا تھا۔اس کے علاوہ احمد کو لگ رہا تھا جیسے اس کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں ہو رہا۔ بس ایک گھسا پٹا فارمیٹ تھا جس پہ سب کو کام کرنا تھا۔فری لانسنگ کرتے وقت احمد کے پاس کام کرنے کی آزادی ہوتی تھی، وہ اس آزادی کو مس کر رہا تھا۔احمد کو اب آفس کے ماحول سے بھی کوفت ہونے لگی تھی۔اسی لیے وہ آج کل اپنی خود کی کمپنی بھی شروع کرنے کا سوچا کرتا تھا۔

رات کا وقت تھا۔احمد اپنے آفس سے گھر کے واپسی کے راستے پہ گامزن تھا۔وہ ایک ویران سڑک میں اپنی کلٹس ڈرائیو کر رہا تھا۔سڑک کافی ویران تھی اور آس پاس ایک گھر بھی آباد نہ تھا۔اسی وقت احمد کے کانوں میں کسی گاڑی کے سڑک پہ تیز دوڑنے کی آواز آئی۔احمد کو کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ملا، گاڑی اتنی تیزی سے اس سڑک پہ چلتے آئی اور پہیوں کو موڑ کے اس کے سامنے آ کے رک گئی۔احمد یک دم سے بوکھلا کے بریک دبانے لگا۔اس کی کلٹس اس گاڑی کو لگتے لگتے بچی۔احمد کو تپ چڑھنے لگی۔یہ بھلا کون جاہل تھا؟ اس نے سوچا۔چہرے پہ غصے کے باعث تناؤ پھیل گیا تھا۔

وہ گاڑی سے اترنے ہی لگا تھا جب اس نے نظر اس کے سامنے کھڑی گاڑی پہ ڈالی۔وہ لینڈ کروزر تھی، شمس کی۔۔۔!احمد کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔

”یہ گولی تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا۔“ اسے وہ دھمکی یاد آئی۔احمد کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور اس میں سے کچھ نکال کے اپنی جیب میں ڈالا۔

شمس اپنی لینڈ کروزر سے نکلا۔اس کی موٹی ناک پہ غصہ سوار تھا۔وہ احمد کی کلٹس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ احمد گاڑی سے اترا۔

احمد کے اترتے ساتھ ہی شمس اس کی طرف جارحانہ انداز میں لپکا۔اس کے پیٹ میں دو گھوسے مارے اور اس کو کندھوں سے دبوچتے دیوار سے لگایا۔احمد درد سے کراہ کر رہ گیا لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے چہرے کو بالکل پر سکون کر لیا۔

شمس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہی گول ڈیوائس نکالی جو احمد نے لگائی تھی۔وہ ڈیوائس دیکھ کے احمد کے چہرے پہ نہ حیرت ابھری نہ بے یقینی۔وہ بالکل پر سکون رہا۔

”یہ تم نے لگائی ہے نا؟“ شمس نے چبا چبا کر کہا۔احمد نے لا پرواہی سے آبرو اچکائے۔

”نہیں۔اور چھوڑو مجھے۔زیادہ دماغ نہ خراب کرو۔“احمد بد لحاظی سے بولا۔اس کا کندھا دیوار سے کستی سے دبایا ہوا تھا جس کے باعث کندھے میں تکلیف ہو رہی تھی۔

”دیکھو! میرے ساتھ گیمز نہ کھیلو!میں تمہیں خبر دار کر رہا ہوں۔اس سب سے خود ہی دور ہو جاؤ۔“شمس کو احمد کا پر سکون سا انداز کھلنے لگا۔

”میں نے کہا نا‘میں کوئی کھیل نہیں کھیل رہا۔مجھے جانے دو۔“ احمد تنک کے بولا۔

”میں بتا رہا ہوں احمد! میں نے تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہیں معذور کر دینا ہے!“ اور اب قتل کی دھمکی بس معذور

کرنے کی دھمکی بن گئی تھی۔بہت ہی دلچسپ۔احمد دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

”میں نے کہا مجھے چھوڑو!“ احمد کا ہاتھ اس کی جیب میں گیا۔وہ شیشے کی چھوٹی سی بوتل میں قید تیز مہک والا پرفیوم تھا۔احمد نے ہاتھ اوپر اٹھا کے شمس کی آنکھوں میں وہ پرفیوم چھڑکا۔شمس کی آنکھوں

میں جلن ہونے لگی تھی۔وہ چلانے لگا تھا۔اس نے احمد کے کندھے سے اپنا ہاتھ اٹھا کے آنکھوں کو مسلا۔احمد نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے شمس کے منہ پہ زور دار تھپڑ لگائے۔

شمس کے لیے یہ وار غیر متوقع تھا، وہ چلا کے زمین پہ گر گیا۔احمد نے دانت پیستے ہوئے، زمین پہ گرے ہوئے شمس کو دو لاتیں اور کھینچ کے ماریں۔وہ اسٹار ترکی کے آفس میں ہونے والے واقع کا حساب لے رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا۔"احمد کی سانسیں غصے کے باعث پھولنے لگی تھیں۔شمس اب بھی چلائے جارہا تھا۔اس کی آنکھوں میں بہت زیادہ تکلیف ہورہی تھی۔اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اندھا ہو جائے گا۔

احمد اب تیزی سے اپنی گاڑی میں بیٹھا، گاڑی کو موڑتے ہوئے وہ اب وہاں سے چلا گیا تھا۔

اس وقت احمد یوسف کو یقین ہونے لگا تھا کہ یہی لوگ اس کے بھائی کے مجرم تھے۔ان کے جرم کے بارے میں وہ جانتا تھا، اسی لیے ہی وہ لوگ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ احمد اس وقت یہی نتیجہ اخذ کر پایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ اگلے دن کی دوپہر کا وقت تھا۔سورج اپنی تپش سے آمیز کرنوں سے عافیت زندگی کی بلند و بالا عمارت کے اوپر وار کر رہا تھا۔عافیت زندگی کی عالی شان عمارت دن کے اس پہر چمک رہی تھی۔ سورج کی کرنیں گلاس والز پہ پڑ کے منظر پہ انعکاس ہوتی تھیں۔

ان اوقات میں عموماً گہما گہمی زیادہ ہوتی ہے لیکن آج گہما گہمی کافی کم تھی۔ نیلوفر ہسپتال کی نئی نئی مینجر بنی تھی اور وہ اپنی جاب کو بھرپور نبھانے کی کوشش کر رہی تھی۔وہ آفس میں بیٹھے، کچھ پیپرز دیکھ رہی تھی جب اندر لیڈی اقتدار آئی۔لیڈی اقتدار کے چہرے پہ برہمی تھی۔ وہ نیلوفر کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔نیلوفر نے ملکہ کے وجود میں گھلے اضطراب کو بھانپ لیا تھا۔

نیلوفر نے سب کام چھوڑ کے ٹیبل پہ پڑے جگ سے لیڈی اقتدار کے لیے پانی گلاس میں نکالا۔لیڈی اقتدار پانی غٹاغٹ پی گئی۔

"اتنی پریشانی نہ لیں۔" نیلوفر آواز میں تشویش لیے بولی،تو لیڈی اقتدار نے تاثرات عام کیے۔اسے یک دم احساس ہوا کہ وہ اپنی پریشانی چہرے پہ لے آئی تھی۔۔۔

"مجھے ڈر ہے کہ میں احمد کے پیچھے ایک قیمتی اثاثہ نہ کھودوں۔" لیڈی اقتدار نے اپنا انداز پر سکون رکھا۔نیلوفر نے سوچتی آنکھوں سے لیڈی اقتدار کو دیکھا۔اگلا فقرہ کہنے کے لیے' اس نے ہمت جمع کی۔

"مجھے لگتا ہے ہمیں کچھ بھی سوچ سمجھے بغیر اسے ختم کر دینا چاہئے۔آپ نے دیکھا'اس نے شمس کا کیا حشر کیا۔وہ دلیر ہے لیڈی۔مجھے لگتا ہے وہ آگے اور بھی مسئلے کھڑے کرے گا۔"

"اس کو مارنا دغا کرنے کے مترادف ہو گا۔میں اپنے کاروبار کے ساتھ دغا نہیں کر سکتی۔ہمیں احمد والا معاملہ کسی دوسرے طریقے سے حل کرنا ہو گا۔" لیڈی اقتدار نے سرد، مرعوب کر جانے والی نظر نیلوفر پہ ڈالی۔

"مگر شاید یہ ہی ضروری ہو۔" نیلوفر نے کہا تو لیڈی اقتدار کی آنکھوں کی سرد مہری بڑھنے لگی۔

"تم سوچ لو نیلوفر۔اگر میں اپنے ایک خاص بندے کے اوپر پیچھے سے وار کروں تو میں کسی کے اوپر بھی وار کر سکتی ہوں۔یہ نا ہو اکہ،اگلا نمبر تمہارا ہو۔" لیڈی اقتدار نے تحکمانہ انداز میں کہا۔نیلوفر کے چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا گیا۔

"مگر شاید آگے جاکے ہمیں یہی کرنا۔۔۔"نیلوفر کہنے ہی لگی تھی کہ لیڈی اقتدار نے زور سے ہاتھ ٹیبل پہ مارا۔وہ پھر سے نیلوفر کو گھورنے لگی، اب کی بار نگاہوں میں برہمی تھی۔

"ہمیں نہیں۔مجھے!" لیڈی اقتدار دانت پیستے تائید کرنے والے انداز میں بولی۔"تم یاد رکھو۔یہ دھندا میرا ہے۔" وہ جتانے والے انداز میں کہتے ہوئے اپنی انگلی سے اپنے سینے پہ دست دینے لگی۔"اس دھندے کو میں نے کھڑا کیا ہے۔اور اگر اسے کوئی نقصان ہوتا ہے تو وہ بھی میرا ہے۔تم اپنا مقام نہ بھولو نیلوفر۔تمہیں یہ پوسٹ دی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ملکہ بن گئی ہو۔تم اب بھی میرے اندر کام کرتی ہو۔تم میرے ٹکروں پہ پلتی ہو۔میں چاہوں تو ایک منٹ میں تمہیں سڑک کی خاک چھنوانے کے لیے چھوڑ دوں۔" لیڈی اقتدار کی جہاں گردن اکڑنے لگی وہاں نیلوفر کے تاثرات تن گئے۔چہرے پر کچھ بہت ناگوار سا تھا۔"اس لیے اپنی جگہ، اپنا مقام یاد رکھو۔" لیڈی اقتدار کہہ کر کھڑی ہوئی۔"سمجھی؟" اس نے کہا تو نیلوفر نے سخت تاثرات کے ساتھ سر اثبات میں ہلایا۔

نیلوفر کو ایک لمحے میں لیڈی اقتدار نے اپنا مقام یاد کرا دیا تھا۔نیلوفر کی آنکھوں میں خائف سا تاثر تھا۔چہرہ

رندھا ہوا ہونے لگا۔

"دیکھئے گا۔ایک دن آپ اس کے قتل کا حکم جاری ضرور کریں گی۔" لیڈی اقتدار کے جانے کے بعد نیلوفر خائف انداز میں بولی تھی۔اس کی انا کو بہت ٹھیس پہنچی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## گیارہ دن بعد:

شام کے چھے بج رہے تھے۔احمد کی چھٹی ہو گئی تھی اور وہ اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔وہ بائیک کی کک بس مارنے ہی لگا تھا کہ اسے سڑک کی دوسری طرف ایک نوجوان نظر آیا جو کہ پیومنٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔نوجوان کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پہ مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ احمد کے چہرے پہ متفکر سا تاثر ابھرا۔

وہ بائیک وہیں چھوڑ کے اس نوجوان کی طرف بڑھا۔

"بھائی سب ٹھیک تو ہے؟" احمد نوجوان کے عقب میں کھڑے ہو کے بولا۔اس نو جوان نے احمد پہ مایوس کن سی نظر ڈالی۔

"بھائی میں ادھر آیا تھا۔" اس نے سٹار ترکی آرگنائیزیشن کے آفس کی طرف اشارہ کیا۔"ابھی کوئی میرا والٹ لے کر چلا گیا۔بائیک اسٹارٹ کی تو پیٹرول بھی نہیں ہے۔فون بھی وہ لے گیا۔اب میں کیا کروں بھلا۔" نوجوان مرجھائے ہوئے انداز میں بولا۔وہ کافی پریشان لگتا تھا۔ احمد اسے دیکھتے ہی سمجھ

گیا تھا کہ اس کی پریشانی گہری تھی۔اس کے چہرے پہ دھول مٹی اس چیز کی نشاندہی کر رہی تھی کہ وہ کافی گھنٹوں سے ادھر بیٹھا تھا۔

احمد مدھم سا مسکرایا۔اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا والٹ نکالا۔

"نام کیا ہے؟" احمد نے اپنے والٹ سے کچھ نوٹ نکالتے کہا۔

"عثمان۔"عثمان نامی نوجوان نے جواب دیا۔احمد نے ہزار کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔عثمان دم بخود

سا نوٹوں کو دیکھنے لگا۔اس کے چہرے پہ خوش گوار حیرانی پھیلی۔

"نہیں بھائی اتنے کی ضرورت نہیں۔بس پیٹرول ڈل جائے اتنے ہی چلیں گے۔اور میں واپس کر دوں گی۔" عثمان کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔اس سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔احمد بس زیر لب ہنس دیا۔

"نہیں نہیں۔رکھ لو۔کوئی بات نہیں۔اور تھوڑا پیٹرول مجھ سے لے لو تاکہ پیٹرل پمپ تک بائیک چلے جائے۔" عثمان کی آنکھوں میں ممنون سا تاثر ابھرا۔

"بھائی آپ کا بہت شکریہ۔میں دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" عثمان نے پر خلوص سے انداز میں احمد کا شکریہ ادا کیا۔

"میرا نام احمد ہے۔احمد یوسف۔اور میں ادھر۔" احمد نے اپنے آفس کی بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔
"کام کرتا ہوں۔کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے مل لینا۔" احمد نے معتبر سے انداز میں سینے پہ ہاتھ رکھتے کہا۔

"احمد بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"ویسے کیا کرنے آئے تھے ادھر؟" احمد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"باس یہ ایجنسی ہے۔پاکستان سے باہر سیٹل کروانے میں مدد کرے گی۔کب سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔

ایم بی اے کی ڈگری بھی ضائع جا رہی ہے اور کام ملتا نہیں۔اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے باہر کام مل جائے گا۔" احمد نے سر اوپر نیچے ہلایا۔کیا اسے ادھر جانے سے روکنا چاہیئے تھا؟اس نے سوچا۔

"چھان بین کرلی ویسے؟ کوئی فراڈ تو نہیں؟" احمد نے تھوڑا متذبذب انداز میں پوچھا۔اسے پہلی ملاقات میں ہی ایسے ہی کوئی مشورہ دینا تھوڑا غیر مناسب لگا۔

"نہیں بھائی۔مجھے تو صحیح لگے۔کیوں، آپ کو بھی باہر سیٹل ہونا ہے؟"عثمان نے معصومیت سے پوچھا۔ احمد کو

اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس سال کا ہی ہو گا۔

"نہیں نہیں۔ویسے کہاں جارہے ہو تم؟" احمد نے پوچھا۔

”ترکی انشاء اللہ۔یہ لوگ کہہ رہے استنبول بھیج دیں گے۔میں نے جگہ جگہ پتا کیا‘ لیکن ان کے ریٹس کافی کم ہیں۔میں افورڈ کر سکتا ہوں۔“ عثمان نے کہا۔

”پھر کب جا رہے ہو؟“احمد کی دلچسپی میں اضافہ ہونے لگا۔

”دو ماہ بعد کا کہہ رہے ہیں۔“عثمان نے سرسری سا کہا۔احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔پھر ہوتی رہے گی ملاقات۔“یہ کہہ کے احمد نے اپنی بائیک سے تھوڑا سا پیٹرول نکالا اور عثمان کی بائیک میں ڈالا۔ہاتھ ملا کے، پھر سے خوش دلی سے شکریہ ادا کر کے عثمان وہاں سے چلا گیا۔

احمد وہاں کھڑے یہی سوچتا رہ گیا کہ کیا اسے عثمان کو یہ سب کرنے سے روکنا چاہیئے تھا؟ یا شاید تھوڑا انتظار کر کے دیکھنا چاہیئے تھا کہ یہ ایجنسی والے آخر کرنا کیا چاہ رہے ہیں۔

احمد نے اس وقت کچھ وقت انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔اسے یہی کرنا تھوڑا بہتر لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ایک ہفتے بعد۔۔۔

دوپہر کا وقت تھا۔احمد کے آفس میں بریک چل رہا تھا۔حسب معمول احمد آفس کی کھڑکی طرف گیا جہاں سے اسے اسٹار ترکی کا آفس نظر آتا تھا۔

اسی وقت احمد کو روڈ کی پومنٹ میں بیٹھا عثمان نظر آیا۔وہ آج بھی کافی پریشان لگ رہا تھا۔وہ جیسے کسی گہری

سوچ میں ہو۔احمد متجسس ہونے لگا۔حال احوال دریافت کرنے وہ آفس سے نکلا اور وڈ کراس کر کے عثمان تک پہنچا۔

”عثمان؟ سب ٹھیک تو ہے۔“ احمد بولا تو عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔وہ مسکرا کے احمد کو دیکھنے لگا۔

”کیا حال ہے احمد بھائی؟ بڑے دنوں بعد نظر آئے؟ نہیں، نہیں، سب ٹھیک ہے۔“ عثمان نے وقفہ لیا،

سوالیہ نگاہ احمد پہ ڈالی۔”ایک مشورہ چاہئے تھا ویسے۔“ عثما ن کے انداز میں جھجک نمایاں تھی۔

”ہاں ضرور۔“ احمد نے دلچسپی لیتے کہا۔

”یہ میں گیا تھا ایجنسی والوں کے پاس۔ کہہ رہے ہیں،لیگل جانا ممکن نہیں۔“ عثمان بولا۔۔۔

احمد، جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔دماغ میں گھنٹی بجنے لگی۔خون منجمد ہو گیا۔آنکھیں پھیلنے لگیں۔عثمان کا بس اتنا

کہنا اس کے بہت سے سوالوں کا جواب دے گیا تھا۔۔۔

”یہ کہہ رہے تھے کہ اِل لیگل جانا بہتر ہے۔اور پھر وہاں پر کام دلوا دیں گے۔لیکن پتا نہیں کیوں‘ دل سوچ

سوچ کے بے چین ہو رہا ہے۔“احمد بس عثمان کو دیکھتا رہ گیا۔۔۔وہ کچھ بول نہ سکا۔۔۔زبان نے بولنے سے انکار کر دیا تھا۔

"کاش کہ میں تم لوگوں کو بتا سکتا میں کتنا مجبور ہوں۔مگر فکر نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔میں تم دونوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور سب کچھ صرف تم دونوں کے لیے کر رہا ہوں۔ہم جلد ملیں گے۔"فیروز کا وہ خط احمد کے دماغ میں لہرانے لگا۔پزل کے ٹکرے یکے بعد دیگرے آپس میں جڑنے لگے تھے۔

دفعتاً احمد حال کے منظر سے منقطع ہونے لگا۔۔۔عثمان اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔۔۔اس کے پیچھے سے اس کے آفس کی عمارت فنا ہونے لگی۔۔۔سڑک کی پیومنٹ پیروں کے نیچے سے سرکنے لگی۔۔۔

وہ اب ایک مہینے پہلے کے منظر میں تھا۔۔۔پولیس اسٹیشن میں۔اس کے سامنے پولیس والا بیٹھا ہوا تھا جو کہ مشکوک نگاہیں اس پہ گاڑے ہوئے تھا۔

"آپ کو کیا یقین ہے کہ وہ استنبول جانا چاہتے تھے؟" پولیس والا شکی سے انداز میں بولا۔

"جی۔" احمد نے کہا تو پولیس والے نے برا سا منہ بنایا۔

"میں نے ایئر پورٹ کا ریکارڈ نکلوایا ہے۔فیروز یوسف،آپ کے بھائی کی کوئی بھی سیٹ بک نہیں ہوئی۔کہیں کی بھی۔یعنی وہ استنبول نہیں گیا۔" پولیس اسٹیشن میں بیٹھے احمد کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔وہ بالکل دنگ سا پولیس والے کو دیکھتا رہ گیا۔

پولیس اسٹیشن کا منظر آنکھوں کے سامنے سے تحلیل ہوا۔۔۔حال کا منظر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے سامنے واپس آتا گیا۔۔۔اس کے سامنے عثمان تھا جو کہ متعجب نگاہیں لیے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔

کیا فیروز بھی اِل لیگل طریقے سے استنبول گیا تھا؟ احمد نے سوچا۔

کیا اس کا زندہ ہونا ممکن تھا؟ احمد کے دماغ میں مزید سوال ابھرنے لگے۔

"بھائی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" عثمان کے کہتے ہی احمد نے جھٹکا لیا۔دماغ میں آتے وہ خیالات منظر عام سے غائب ہوئے۔

"کیا مجھے جانا چاہیے؟" عثمان نے ایک بار پھر کہا۔احمد اپنے آپ کو نارمل کر چکا تھا۔

"یہ غلطی کبھی مت کرنا۔ سمجھ رہے ہو؟"احمد حتمی انداز میں بولا۔وہ عثمان کو قطعاً اس کھائی میں چھلانگ لگانے

نہیں دے سکتا تھا' جس کھائی میں اس کے بھائی نے چھلانگ لگائی تھی۔ عثمان کے چہرے پہ مایوسی در آئی۔

"مگر پھر میں کیسے جاؤں؟" عثمان نے دل برداشتہ سے انداز میں کہا۔اسے اپنے ترکی سیٹل ہونے کے خواب کرچی کرچی ہوتے محسوس ہوئے۔

"کچھ عرصے کہیں بھی کام کر کے سیونگز جمع کرو۔جلد بازی کے چکر میں کچھ الٹا سیدھا نہیں کر بیٹھنا۔" احمد کچھ ڈسٹرب سا ہونے لگا تھا۔عثمان دل سے مطمئن نہ ہوا۔ایک بظاہر آسان راستہ تھا، جو ایجنسی والوں نے اسے دکھایا تھا، اورایک وہ راستہ تھا جس کی تلقین اسے احمد کر رہا تھا۔۔وہ کون سا راستہ چنتا؟

"شکریہ۔میں چلتا ہوں۔" عثمان نے کہا۔احمد کا دل مزید بے چین ہو گیا۔اس لمحے احمد کو یقین آگیا تھا کہ یہ لوگ ہی فیروز کے مجرم تھے۔ساری چیزیں اس چیز کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

"آپ کا نمبر مل سکتا ہے بھائی؟" عثمان جاتے جاتے بولا۔احمد نے سر اثبات میں ہلایا اور اپنا نمبر اسے دے دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## ایک مہینے بعد:

صبح کا وقت تھا۔احمد کے کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، کھڑکیوں کے ذریعے ٹھنڈی ہوائیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس آفس جانے کے لیے تیار تھا۔

فی الحال وہ کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔یہ عثمان تھا۔احمد کے ماتھے پہ نہ جانے کتنی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

وہ بے چین سا نظر آرہا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ یہ غلطی مت کرنا۔"وہ بے دلی سے بولا۔اس کے اندر مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔

"بھائی،گھر والوں کو بہت امیدیں ہیں مجھ سے۔میں ان امیدوں پہ پورا اترنا چاہتا ہوں۔اپنے چھوٹے بھائی کو پڑھانا ہے۔اسے بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا ہے۔اور اگر ہمارے یہی حالات رہے تو شاید وہ ایک جماعت بھی آگے نہ پڑھ سکے۔" احمد کے چہرے پہ غمگین سا تاثر ابھرا۔دل مزید بے چین ہونے لگا۔

وہ اسے کیسے روکے؟ احمد کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

عثمان بھی دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ مگر اس نے اس وقت اپنے خوابوں کو چنا۔ اسے لگا، کہ استنبول جا کے اس کے خواب پورے ہو جائیں گے۔اس کے گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔اِل لیگل ہی سہی، لیکن وہ استنبول جانا چاہتا تھا۔۔

"اچھا۔" احمد کو لگا کہ آگے کچھ کہنا بے فیض تھا۔اس کے الفاظ ضائع ہو جانے تھے۔

"آپ کا شکریہ مجھے سننے کا بھائی۔میرے اوپر پچھلے مہینے سے اتنا دباؤ تھا کہ اگر میں آپ سے نہ کہتا تو میں ایسے ہی مر جاتا۔مجھے سننے کا' دل سے شکریہ۔" احمد اداس سا مسکرا دیا۔اور آج جب پہلی دفعہ احمد نے چاہا تھا کہ وہ اس کی سن لے۔۔۔تب ہی اس نے اس کی نہ سنی۔وہ غلطی کرنے جا رہا تھا، اور احمد بھی اسے یہ غلطی کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں۔۔۔" احمد سوچنے لگا کہ اسے کہنا چاہئے کہ نہیں۔"یہ غلطی نہیں کرو۔" احمد کا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔وہ عثمان کا جواب جانتا تھا۔

"نہیں بھائی۔بس ابھی نکل رہا ہوں۔اب میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ اللہ حافظ۔امید ہے جب آپ سے دوبارہ ملاقات ہو گی تو میں اس وقت ایک بڑا انسان بن جاؤں گا۔"عثمان نے خوشدلی سے کہہ کر کال کاٹ دی۔

احمد اپنا بوجھل سا وجود لے کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔عثمان کھائی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔واپسی ممکن نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلا دن بھی احمد نے مضطرب سے عالم میں گزارا۔ ہر وقت عثمان کی فکر اسے ستاتے رہتی تھی۔ آفس میں کام بھی

وہ بے دلی سے کرتا تھا۔

رات کے وقت وہ اپنا مصحف کھول کے سبق دہرا رہا تھا۔ وہی ہرا، بوسیدہ سا مصحف۔ یہ وہی مصحف تھا جس سے اس نے اپنا حفظ کیا تھا۔ اس مصحف سے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ وابستگی سی بن گئی تھی اس مصحف سے، کوئی تعلق سا بن گیا تھا جیسے۔ کوئی دوسرا مصحف، چاہے کتنا بھی حسین کیوں نہ ہوا، اس کے برابر نہیں آسکتا تھا۔

وہ سبق دہراتے ہوئے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ سب کچھ۔۔۔ اپنی مصروف زندگی کی کشمکش۔۔۔ ہر فکر۔ سب اس مصحف سے دیدار کے بعد بے معنی ہو جاتی تھی۔ اس میں لکھی آیت کی تلاوت کے بعد سب کچھ دماغ سے محو ہو جاتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت احمد کا موبائل بجا۔ اس نے آیت مکمل کر کے نظر موبائل کی اسکرین پہ ڈالی۔ موبائل پہ جو نمبر تھا وہ پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ احمد کچھ مشکوک ہوا۔ اس نے کال اٹھا کے فون کان سے لگایا۔

"احمد بھائی! میں ہوں۔ عثمان۔" عثمان کی ہلکان آواز فون کے اس پار سے گونجی۔ اس کی آواز میں خوف تھا۔

احمد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً سے موبائل میں کال ریکارڈر کھولا اور موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو۔سب ٹھیک تو ہے؟" احمد نے فکرمندی سے پوچھا۔جوں ہی ایک زور دار آواز فون کے اس طرف سے گونجی۔۔۔آواز کانوں میں چبھتی تھی۔۔۔دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیتی تھی۔احمد کا دل ڈوبنے لگا۔وہ جانتا تھا یہ آواز گولی چلنے کی تھی۔

"ہیلو،ہیلو؟" احمد کہہ کے اپنے پیروں پہ کھڑا ہوا۔اس کے وجود میں انتشار پھیل گیا تھا۔

"بھائی میں پھنس گیا ہوں۔" عثمان کی آواز میں گہرا کرب تھا۔۔۔رنج تھا۔۔۔پچھتاوا تھا۔۔۔زندگی چھن جانے کا خوف تھا۔۔۔اس کی آواز میں بے بسی تھی۔۔۔لاچارگی تھی۔۔۔وحشت تھی۔۔۔

"کیا ہوا سب ٹھیک ہے؟" احمد کی آواز میں اضطراب بڑھتا چلا گیا۔وہ گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

"گھر کال کرنے کی کوشش کی کوئی کال نہیں اٹھا رہا۔یہ موبائل مجھے ادھر ملا تھا۔میرے ذہن میں اس وقت صرف آپ کا نمبر آیا۔مجھے نہیں پتا میں کہاں ہوں۔" عثمان رو رہا تھا۔ایک اور گولی چلنے کی آواز گونجی۔احمد ایک دم سے چونک گیا۔اس کا دل حلق میں آگیا تھا۔

فون کے اس پار عثمان ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔کان سے فون لگائے۔آنکھوں میں خوف لئے۔چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا اور اس پہ دھول مٹی چپکی ہوئی تھی۔بال گرد آلود تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی صحرا میں ہو۔اس کے سامنے ایک لاش تھی جس پر سے خون بہہ رہا تھا۔

"بات کیا ہے؟" احمد نے اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ لوگ دھوکے باز نکلے۔ ہمیں بیچ میں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہاں پر ہر کسی کو مار دیا جارہا ہے۔ سب ہلاک ہوگئے ہیں۔ ہم کچھ ہی بچے تھے اور اب مجھے لگ رہا ہے صرف میں ہی بچ گیا ہوں۔ مجھے نہیں پتا میں زندہ بچوں گا بھی کہ نہیں۔" عثمان نے روتے ہوئے کہا، وہ سسکیاں لے لے کر' بلک بلک کے رو رہا تھا۔ بائیس سالہ عثمان نے اتنی سی عمر میں ہی کیا کچھ دیکھ لیا تھا۔ ایک باریک لکیر پہ اس کی زندگی کرتب کھیلنے لگی تھی۔

"پر سکون ہو جاؤ۔" ایک اور گولی کی آواز احمد کے کان میں گونجی۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں میچ لیں۔

دل اور بھی زور سے دھڑکنے لگا۔

"بھائی میں نے جلد بازی کر کے سب برباد کر دیا۔ میرے گھر والوں کا اب کیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے مجھے مار دیا جائے گا۔ ہم سب کو مار دیا جائے گا۔ زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہے بھائی۔ سب برباد ہو رہا ہے۔" احمد کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ بڑھتے تناؤ کے باوجود' وہ اپنے اعصاب پہ قابو پانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"بھائی کیا میں آپ سے ایک بات کہہ سکتا ہوں؟" عثمان کی آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"ہاں بولو۔" احمد نے کہا۔

"مجھے نہیں پتا میں آپ سے یہ کیوں کہہ رہا ہوں۔ مگر کیا آپ میرے گھر والوں کا خیال رکھ سکتے ہیں؟" احمد کا دل مزید ڈوبنے لگا۔ آنکھیں غمگین ہو گئیں۔

”کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔کوئی راستہ نکل آئے گا۔“

”نہیں اب۔۔۔“ اور ایک زور دار آواز فون کے پار گونجی۔احمد کا وجود ہل کے رہ گیا تھا۔عثمان کی تکلیف دہ سسک اسے سنائی دی۔جیسے وہ درد سے کراہ رہا ہو۔احمد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”ہیلو؟ ہیلو؟ ہیلو؟“ احمد کہتا رہ گیا۔مگر کوئی جواب نہ آیا۔جواب آتا بھی کیسے۔۔۔۔

اس نے کال کاٹ دی اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔اس کی روح کانپ اٹھی تھی۔ماتھے کی رگ پھڑ پھڑانے لگی تھی۔اسے ان سب پر بہت غصہ آیا۔وہ سب جو فیروز کے بھی مجرم تھے۔ اب اس کے پاس ان سے نفرت کرنے کی وجوہات بڑھ گئی تھیں۔وہ اپنا سر ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔چہرے پہ تناؤ پھیلا ہوا تھا۔آنکھوں میں انگارے برس رہے تھے۔

ایک اور انسان مار دیا گیا۔۔۔کیا ان طاقتوں کے لیے انسانی جان بس ایک کھلونا تھی؟ احمد اس وقت یہی سوچے جا رہا تھا۔

رات کے اس پہر، بستر پہ بیٹھے احمد یوسف نے فیصلہ کر لیا تھا، چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے اسے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے، وہ ان اندھیر طاقتوں کو مات دے کر ہی دم لے گا۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عثمان کی موت کا احمد پہ گہرا اثر ہوا تھا۔وہ بھلے سے اپنے جذبات چھپا کے رکھتا تھا مگر اس مرتبہ احمد کی روح اندر تک ہلا دی گئی تھی۔اس کی نفرت ان اندھیر طاتوں کے لیے دن بدن شدید ہوتے گئی۔وہ اٹھتے بیٹھتے اس مافیا کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ہر وقت اس کے دل میں آگ بھڑکتی رہتی تھی۔

وہ کسی بھی طرح سے اس مافیا کو چکنا چور کر دینا چاہتا تھا۔وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ ان سب کو روکنے کے لیے آخر کیا کیا جا سکتا تھا؟

اسی کشمکش اور عدم یقینی میں احمد نے ایک تیر چلانے کا سوچا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سب کا فائدہ ہونا بھی تھا کہ نہیں، لیکن وہ بس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔احمد اپنے بستر کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔چہرے پہ اطمینان پھیلا ہوا تھا۔اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور کسی کو کال ملائی۔یہ نمبر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔کچھ دیر بعد دوسری جانب سے فون اٹھا لیا گیا۔

"اوہ احمد! السلام و علیکم۔" یہ احمد کا دوست علی تھا جو کہ جرمنی میں رہتا تھا۔

"وعلیکم اسلام۔" علی کے برعکس احمد کے انداز میں خوشگواریت نہ تھی۔انداز سرد سا تھا۔

"کیا حال ہے؟ اتنے وقت کے بعد کال کی۔" علی چہکا۔

"ہاں بس۔کچھ مصروفیات تھیں۔خیر تم ایک ایجنسی میں کام کرتے تھے۔ ہے نا؟" احمد نے پوچھا۔نگاہیں جواب طلب تھیں۔

"ہاں۔ہیومن رائیٹس پراٹیکشن ہب۔" علی سادگی سے بولا۔اسے اس بات کا بالکل برا نہیں لگا کہ احمد نے

اتنے ماہ بعد بھی کام کے لیے کال کی تھی۔

"ٹھیک۔ تو کیا یہ ایجنسی میری ایک چیز میں مدد کر سکتی ہے؟ کیا تم اپنی آتھورٹیز کو یہ مسودہ دے سکتے ہو جو میں تمہیں ای میل کروں؟" احمد نے اپنا سر ہاتھ سے مسلا۔ وہ اب کچھ ڈسٹرب ہونے لگا تھا۔

"ہاں، میں کر سکتا ہوں، مگر ہوا کیا ہے؟" علی تھوڑا بہت متفکر ہو گیا تھا۔

"میں تمہیں ای میل پہ سب بھیج رہا ہوں۔ تم آگے خود سمجھ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" احمد نے کال کاٹ دی اور علی کی ای میل پہ وہ وائیس ریکارڈنگ بھیج

دیں۔ ساتھ ہی اسٹار ترکی کے انسٹاگرام اکاؤنٹ کے کچھ اسکرین شارٹس بھی۔

احمد پھر موبائل سائڈ پہ رکھ کے انتظار کرنے لگا۔ انتظار کرنا اس کے لیے بہت دشوار تھا۔

کچھ دیر میں موبائل تھرتھرایا تو احمد نے تیزی سے میسج کھولا۔

"اوہ گاڈ۔ یہ معاملہ تو بہت ہی سنجیدہ ہے۔ میں اپنے باس کو کل ہی دکھاؤں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہاری کس طرح سے مدد کی جا سکتی ہے۔ اپڈیٹ کا انتظار کرنا۔" علی نے اسے یہ میسج بھیجا تھا۔ احمد نے ایک گہری سانس لی اور موبائل پرے رکھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سب کا کچھ فائدہ بھی تھا یا نہیں۔ مگر جو بھی تھا اس نے اب کر دیا تھا۔ اگر اس سب کا نتیجہ مثبت نہیں ہو گا تو وہ کچھ اور بھی کرنے کو تیار تھا۔ اگر یہ راستہ کام نہ کرتا، تو وہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## پانچ دن بعد:

احمد اپنے آفس میں بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا' جب اسے علی کی کال موصول ہوئی۔احمد نے بغیر سوچے سمجھے علی کی کال اٹھالی۔رسمی علیک سلیک کے بعد علی مدعے پہ آیا۔

"احمد جو ریکارڈنگ تم نے بھیجی تھیں وہ میں نے اپنے باس کو دکھائی ہیں۔" احمد کی آنکھوں میں امید کے

باعث چمک در آئی۔

"اچھا۔پھر۔" احمد کی نگاہیں جواب طلب تھیں۔

"یہ جو تم نے دکھایا۔یہ بہت خطرناک لگ رہا ہے۔یعنی بہت زیادہ ہائی پروفائل۔ اور ہماری ایجنسی صرف ہیومن رائٹس پروٹیکشن ایجنسی ہے، ہم عموماً اتنے ہائی پروفائل کرمنلز کا مقابلہ نہیں کرتے ہیں۔" علی کے کہتے ہی احمد کا چہرہ بجھ گیا۔خیر، کوئی بات نہیں۔اگر اس طرح نہیں تو کسی اور طرح ہی سہی۔احمد نے سوچا۔

"ٹھیک ہے۔تمہارے وقت کا شکریہ۔"احمد روکھے سے انداز میں کہہ کر کال رکھنے لگا۔لیکن اسے وقت علی کچھ بولا تو احمد تھم گیا۔

"سنو تو بھائی۔تو اس لیے ہماری ایجنسی نے ایک انٹرنیشنل کرائم ایجنسی سے رابطہ قائم کیا ہے۔اور انہیں تمہارا کیس بھیجا۔" احمد چونکا۔آنکھوں کی چمک لوٹی۔دل میں امید جاگنے لگی۔ارے واہ! اس سے بہترین کیا ہوسکتا تھا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اور وہ لوگ اس کیس کو لے کے بہت سنجیدہ ہیں۔ان کا ایک ایجنٹ پاکستان بھی آئے گا احمد۔" علی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آگے "لیکن" بولنے والا تھا۔احمد نے آنکھیں سکیڑیں۔

"لیکن احمد میں نے تمہاری لا علمی میں کچھ کر دیا ہے۔" احمد نے اپنا ہاتھ مٹھی میں بھینچ لیا۔"میں نے اپنے باس کو یہ بتایا تھا کہ مجھے یہ مسودہ پاکستان کے کسی پرائیویٹ انویسٹی گیٹر نے بھیجا ہے۔" احمد کے چہرے پہ بے یقینی پھیل گئی۔ چہرے غصے کے رنگ اوڑھنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے؟ یہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" احمد دنگ رہ گیا تھا۔

"سوری یار، مگر ضروری تھا۔صرف اس ہی لیے،انہوں نے یہ کیس سنجیدگی سے لیا تھا۔اگر میں کہتا کہ یہ سب کسی عام بندے نے بھیجا تھا تو میری بات کی اتنی اہمیت نہ ہوتی۔ میں اپنی جگہ مجبور تھا۔" احمد نے اپنے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"یار کیا ضرورت۔۔۔" احمد کہتے کہتے تھم گیا۔چہرے پہ پھیلا غصہ زائل ہونے لگا۔یہ اتنا بھی برا نہیں تھا ویسے؟ احمد نے دل ہی دل میں سوچا۔"چلو ٹھیک۔پھر آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" احمد کی دلچسپی انتہاء کو پہنچ گئی تھی۔یہ سب ایک خوشگوار موڑ موڑنے لگا تھا۔احمد کو یہ موڑ بہت ہی اچھا لگا۔

"وہ جو ایجنٹ آئے گا،تمہیں اس کے ساتھ مل کے کام کرنا ہوگا۔ائیرپورٹ پہ بھی تم ہی اسے ریسیو کرو گے۔ٹھیک؟" علی بولا۔احمد بات کو سمجھ گیا تھا۔تو یہ کھیل اس طرح سے شروع ہونا تھا۔

دلچسپ!احمد کی آنکھوں میں شاطر سا تاثر ابھرا۔

"ٹھیک ہے۔کون ہے یہ ایجنٹ ویسے؟" احمد نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں مجھے جیسے ہی پتا چلتا ہے میں تمہیں بتا دوں گا۔فی الحال کے لیے بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ پاکستان سے ہی تعلق رکھتا ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں ہاتھ میں پوسٹ کارڈ لیے کھڑا تھا۔جس ایجنٹ کا اسے انتظار تھا اس کی فلائیٹ اتر گئی تھی اور کچھ ہی دیر میں وہ بس آنے ہی والا تھا۔

احمد نے کالا کرسپ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ہاتھ میں مہنگی واچ اور پیروں میں پالشڈ جوتے' جو کہ چمک رہے تھے۔چہرے پہ اس نے کالا ماسک لگایا ہوا تھا اور سر پہ کالی ہیٹ نے اس کے بالوں کو ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھوں پہ اس نے کالا چشمہ لگایا ہوا تھا۔اس نے اس چیز کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس کا چہرہ صاف عیاں نہ ہو سکے۔وہ اپنی شناخت اس ایجنٹ پہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ویٹنگ ایریا میں سے لینڈ ہونے والے جہاز کے پیسنجرز ایک کے بعد ایک آنے لگے۔سب پیسنجرز اپنے گھر والوں سے مل رہے تھے۔ایئرپورٹ کے ویٹنگ ایریا میں بھیڑ بڑھ گئی تھی۔

احمد وہاں کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔اس نے کوئی بھی حرکت نہ کی۔

اسی بھیڑ میں۔۔۔وہ نظر آئی۔شخصیت اتنی کمال تھی کی اس بھیڑ میں بھی وہ الگ سے پہچانی جاتی تھی۔

خوبصورت اور مغرور سے نقوش، کھڑی ہوئی ناک، اٹھے ہوئے کندھے۔۔۔وہ پر اعتماد انداز میں چلتی آرہی

تھی، گردن تنی ہوئی تھی۔اس نے اس وقت لیدر جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور جینز کی ڈھیلی ڈھالی سی پینٹ۔ بالوں پہ نیا نیا بوائے کٹ کروایا ہوا تھا۔گلے میں تانبے کی چین لٹک رہی تھی اور کان میں چاندی کی بالیاں تھیں۔اس کے چہرے پہ رعب جھلکتا تھا۔

اس کی نظر اوپر سے نیچے کالے لباس میں ملبوس احمد پہ پڑی۔اس نے اس کے ہاتھ میں موجود پوسٹ کارڈ دیکھا۔

"ویلکم زینت۔" اس پوسٹ کارڈ پہ یہ لکھا ہوا تھا۔

اوہ۔۔۔تو یہ ہے وہ ایجنٹ؟ زینت نامی اس ایجنٹ نے لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

"عبدالحمید؟" زینت اس کی طرف بڑھ کے بولی۔احمد نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالا۔اس نے کارڈ زینت کو تھمایا۔زینت کچھ الجھ کے اس کارڈ کو پڑھنے لگی۔

"اسلام آباد میں آپ کو خوش آمدید۔میں آپ کا میزبان، عبدالحمید۔" زینت نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔چہرہ نہ دکھانا تو بنتا تھا، لیکن آواز؟ اتنی پرائیوسی۔زینت نے سوچا۔

خیر دیکھتے ہیں یہ کس کھیت کی مولی ہے۔جتنا یہ بن رہا ہے اتنا دم ہے بھی کہ نہیں؟ زینت پڑھتے ہوئے سوچ

رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔کہاں جانا ہے؟" زینت بولی۔احمد نے جیب سے ایک اور کارڈ نکالا۔ اوہ تو وہ ہر سوال کی تیاری کر کے آیا تھا۔زینت نے دوسرا کارڈ تھامتے ہوئے سوچا۔

"میرے پیچھے چلیں، میری گاڑی تک۔" زینت نے منہ اٹھا کے دیکھا تو احمد اسے دور جاتا دکھائی دے رہا تھا۔اف بد تمیز۔اس کا انتظار تو کر لیتا۔زینت نے دل ہی دل میں سوچا۔

زینت اس کے پیچھے چلنا شروع ہوئی۔احمد اپنی کلٹس میں بیٹھ گیا۔

"بڑا کلاسی بنتا پھر رہا ہے، مگر چلانی تو اسے کلٹس ہی ہے۔ہنہہ۔"زینت نے سوچا۔وہ احمد کی کلٹس کی پچھلی نشست پہ سوار ہو گی۔زینت جب گاڑی میں بیٹھ گئی تو احمد نے گاڑی کے ڈیشبورڈ سے ایک اور کارڈ نکال کے زینت کو تھمایا۔

"امید ہے آپ نے ایک محفوظ فون کا انتظام کر لیا ہو گا جس کو کوئی ٹریس نہیں کر سکے گا۔" اسی کارڈ کے نیچے احمد کا ایک نمبر درج تھا۔

زینت کو کچھ بہت برا لگا۔یہ مغرور ایجنٹ اپنے آپ کو سمجھتا کیا تھا؟ اس نے خفگی سے نظر اٹھائی۔ظاہر ہے وہ یہ سب پہلے ہی کر چکی تھی۔

"جی کر چکی ہوں۔" اس کی آواز بھاری سی تھی، زیادہ باریک اور نسوانی نہ تھی۔

احمد نے ایک اور کارڈ ڈیش بورڈ سے نکالا اور زینت کو تھما دیا۔

"رات کے گیارہ بجے کال کرنا۔نہ ایک منٹ آگے نہ ایک منٹ پیچھے۔دیکھتے ہیں تم کتنی قابل ہو۔"زینت یہ پڑھ کے چڑھ گئی۔

"بے فکر رہو ایجنٹ عبدالحمید۔" زینت نے روکھے سے انداز میں کہا۔فرنٹ مرر میں نظریں احمد کی آنکھوں میں گاڑیں۔احمد بھی فرنٹ مرر سے اسی کی شعلہ باز آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

زینت نے وہ کارڈ اپنی انگلیوں کے بیچ دبایا۔۔۔اور اسے پھاڑ دیا۔جتاتی نگاہیں احمد کی آنکھوں میں گاڑی ہوئی تھیں۔

احمد نے سب کچھ جھٹک کے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے اس کے ہوٹل میں چھوڑ دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گیارہ بجنے ہی والے تھے۔احمد نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔اس کا لیپ ٹاپ اس کی اسٹڈی ٹیبل پہ کھلا ہوا تھا۔لیپ ٹاپ پہ اس نے ایک سافٹ ویئر کھولا ہوا تھا۔احمد نے ایک چھوٹا سا موبائل لیپ ٹاپ سے کنیکٹ کیا ہوا تھا۔یہ موبائل خاص تھا کیونکہ اس موبائل کی لوکیشن ٹریس نہیں کی جا سکتی تھی۔اس کے علاوہ اس سافٹ ویئر کی مدد سے احمد کی اصلی آواز کال موصول کرنے والے کو سنائی نہیں دی جا سکتی تھی۔آواز پہ بہت سارے فلٹرز لگ جاتے تھے اور اصل آواز سے قدرے بھاری اور پھٹی پھٹی آواز زینت تک پہنچتی۔

ٹھیک گیارہ بجے زینت کی کال موصول ہوئی۔احمد نے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائی، اور کال اٹھا لی۔

"کیا حال ہے زینت۔امید کرتا ہوں پاکستان کی آب و ہوا تمہیں خوش بختی میں پائے گی۔" احمد کی عجیب و غریب سی آواز زینت تک پہنچی۔آواز زینت کے کانوں میں چبھتی تھی۔زینت کچھ کوفت زدہ سی ہو گئی۔

"بہت خوب۔تم نے بھی پکا کام کیا تھا۔پلیٹ نمبر تمہاری گاڑی کی نکلی تھی۔دلچسپ۔مگر یہ کوئی تمہاری قابلیت کا ثبوت نہیں ہے۔تمہیں ثابت کرنا ہو گا کہ تم میرے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو کہ

نہیں۔ میرا اسٹینڈرڈ ہے۔ گلی کے ایجنٹ، میں ایسے ہی کسی راہ چلتے کے ساتھ کام نہیں کرتی۔" زینت ایئرپورٹ میں ہونے والے واقع کی بھڑاس اب نکال رہی تھی۔ انداز جلانے والا تھا۔ احمد اونچا اونچا ہنسنے لگا۔ زینت کو مزید تپ چڑھی۔

"چلو پھر، ایسا کرو مسٹر عبدالحمید، مجھے بتاؤ' کے تفتیش کا سانچہ بھلا کیسے بنایا جاتا ہے؟" زینت کا انداز انتقام لینے والا تھا۔ احمد کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔

"ٹیسٹ لے رہی ہو میرا؟" احمد بولا۔ زینت زور سے ہنس دی۔ احمد کی مسکراہٹ سمٹی۔

"تفتیش کا سانچہ اندازوں سے بنایا جاتا ہے مسٹر عبدالحمید۔ صورتحال کو پرکھ کے، ان کا جائزہ لے کر، دور دور

کے اندازے لگائے جاتے ہیں۔ اور پھر ان اندازوں کی تصدیق کرنے کے لیے ثبوت اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں تفتیش کرنے کے بارے میں اتنی بیسک چیز بھی پتا ہوتی تو فوراً بتا دیتے۔ مجھے شک ہے کہ تم ایک اصلی انویسٹی گیٹر ہو بھی کہ نہیں۔" زینت سختی سے بولی تھی۔ احمد ششدر سا رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو نارمل کیا۔ وہ زینت سے یوں دبنے والا نہیں تھا۔ اس کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

"صرف ایک بچگانہ سے سوال سے تم میری قابلیت کا اندازہ نہیں لگا سکتی ایجنٹ زینت۔ مجھے صرف ایک لمحہ لگے گا تمہارے اوپر اپنی قابلیت عیاں کرنے میں۔ لیکن شاید اس کے بعد تم مجھ سے بہت نفرت کرو۔" احمد کا لہجہ بے تاثر تھا۔ زینت ٹھٹک گئی۔ یہ دو ٹکے کا، سڑک چھاپ انویسٹی گیٹر اپنے آپ کو سمجھتا کیا تھا؟ اس نے خفگی سے سوچا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ثابت کرو!" زینت چیلنج دینے والے انداز میں گویا ہوئی۔وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ کتنا قابل ہے۔

"تمہارا اصل نام مریم ہے۔" احمد نے کہا تو زینت کی آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیلنے لگیں۔یہ کیسے ہوسکتا تھا؟

زینت نے اپنی بے ربط سانسوں کو ترتیب دی۔ہو سکتا تھا اس نے بس ہوا میں تیر چلایا ہو۔یہ کوئی تگڑا ثبوت تو نہیں تھا۔زینت نے سوچا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ صرف اتنا ہی کافی ہے؟" زینت عرف مریم (ہم اپنی کہانی میں اس کردار کو زینت سے مخاطب کریں گے) بولی تو احمد ایک بار پھر سے ہنسا۔

"تمہارا پورا نام مریم جنید ہے۔" میرم پتھر کی بن گئی۔"تم کراچی سے اسلام آباد آئی تھی۔نسٹ میں پڑھنے۔تمہیں اسکالر شپ ملی تھی۔تم بی ایس سی ایس کرنے آئی تھی۔تمہارے دونوں ماں باپ وکیل تھے اور ایک ہائی پروفائل کیس کو پراسیکیوٹ کر رہے تھے، اسی سلسلے میں دونوں کو مار دیا گیا تھا۔" زینت کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔یہ کیسا ایجنٹ تھا جس نے بس اس کی شکل دیکھ کے، کچھ ہی گھنٹے میں اس کی اتنی ساری معلومات نکال لی تھیں؟ زینت حیران رہ گئی تھی۔زینت کو ایجنٹ عبدالحمید کی قابلیت پہ سو فیصد یقین آگیا تھا۔اس کی اس کیس میں دلچسپی مزید بڑھ گئی تھی۔

"مجھے یقین ہوچکا ہے۔میں اب واقعی اس سب کے لیے بھرپور تیار ہوں۔"زینت ایک اچھے اسپورٹ مین کی طرح یہ بات تسلیم کر گئی۔احمد مسکرایا۔

"ویری گڈ۔اب میں تمہیں اپنا پلان بتاتا ہوں۔۔۔" اور احمد اپنے کمرے میں بیٹھے اسے اپنا پلان بتانے کے لیے تیار تھا۔زینت بھی سننے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**(تو زینت، تم اپنی ایک پروفائل بناؤ گی۔تمہاری پروفائل میں ہم تمہاری اصلی کہانی ہی استعمال کریں گے، لیکن ایک ٹویسٹ کے ساتھ۔" احمد کہہ کے شاطر سا مسکرایا۔زینت کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔**

**"تمہاری کہانی کچھ اس طرح ہو گی کہ، تمہارے ماں باپ کا قتل کر دیا گیا تھا۔اس کے بعد تم معاشرے کے ہاتھوں پستے گئی۔تم ایک چھوٹے سے علاقے میں کرائے کے گھر میں رہنے لگی۔تمہارا انسان ذات سے اعتبار اٹھ گیا۔تم انسان ذات سے نفرت کرتی ہو۔ہاں ایک چیز جو ہم نے گول کر جانی ہے وہ ہے تمہاری نسٹ کی ڈگری۔تم ایم بی بی ایس کر رہی تھی لیکن معاشی حالات کی وجہ سے تم نے ایم بی بی ایس بیچ سے ہی چھوڑ دیا۔تم اپنی پروفائل بنانے کا کام کر لو گی نا؟ یا اس میں میں مدد کروں؟"**

**"ڈونٹ یو وری۔سب ہو جائے گا۔" زینت خوشدلی سے بولی۔)**

زینت اس پرانی بلڈنگ میں داخل ہوئی۔بلڈنگ کا حال خراب تھا۔جگہ جگہ سیلن تھی۔مگر کچھ چیزیں اسے انصاف کے لیے کرنی پڑ رہی تھیں اور اسے کوئی شکایت نہ تھی۔انٹرنیشنل ایجنسی میں کام کر کے وہ عام لوگوں سے قدرے مختلف بن گئی تھی۔اسے کم کھانے میں، اور مشکل حالات میں جینے کی عادت ہو گئی تھی۔

وہ اپنے کرائے کے گھر میں داخل ہوئی۔گھر کا حال تو بلڈنگ کے حال سے بھی بدتر تھا۔کیڑے مکوڑے ہر جگہ تھے۔پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔مٹی کی موٹی تہہ زمین پہ موجود تھی۔زینت نے بس ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔وہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔اسے کیڑے مکوڑے سے ڈر نہیں لگتا تھا۔وہ آسائشوں کے بغیر بھی جی سکتی تھی۔

**("اس کے بعد اگلہ مرحلہ ہے عافیتِ زندگی ہسپتال میں داخل ہونا۔"**

**"لیکن عبدالحمید، جو کیس تم نے بھیجا تھا وہ تو ہیومن اسمگلنگ کا تھا۔پھر اس میں اس ہسپتال میں کیوں جانا ہے؟" زینت کے دماغ میں ایک سوال ابھرا۔**

**"اس سے پہلے میں اس مافیا کے ایک فرد کی تفتیش کر چکا ہوں۔وہ اس ہسپتال میں روز جاتا تھا۔اس ہسپتال میں کچھ پر اسرار ضرور ہے۔تمہیں کچھ بھی کر کے یہاں جاب حاصل کرنی ہے۔اداکاری کرلوگی نا؟" احمد نے پوچھا۔**

**"فکر ہی نہ کرو۔"زینت شاطر سا مسکرائی۔)**

زینت اس وقت نیلوفر کے آفس میں کھڑی تھی۔

اس کا حلیہ، ایئرپوٹ والی زینت سے قدرے مختلف تھا۔آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے۔کندھے نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے۔کپڑے بالکل سادہ سے تھے۔زینت کے چہرے پہ کڑواہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”دیکھئے، ہم ابھی کسی کو ہائر نہیں کر رہے۔ آپ جا سکتی ہیں۔“ نیلوفر روکھے سے انداز میں بولی۔ زینت کی

آنکھوں میں آنسو پھوٹنے لگا۔

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے آنسو دیکھ کے میرا دل نرم پڑ جائے گا، تو تم اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔“ نیلوفر کا انداز مغرور تھا۔ زینت کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھری۔

”مجھے انسان ذات سے کوئی امید نہیں ہے مادام۔ اور آپ سے تو بالکل نہیں۔ یہ جو اونچے عہدوں پہ

براجمان ہیں، ان سے میں امیدیں وابستہ نہیں کرتی مادام!“ زینت کا انداز تلخ تھا۔ نیلوفر نے اپنا پین ٹیبل پہ رکھا اور زینت کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی اچانک سے زینت میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

”تمہیں انسان ذات سے اتنی نفرت کیوں ہے لڑکی؟“ نیلوفر نے آنکھیں مٹکا کے پوچھا۔

”کیونکہ ان انسانوں نے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے قتل کے بعد انصاف کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ لیکن آج تک مجھے مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں دیا گیا۔“ زینت سختی سے کہہ کے مڑ گئی۔ وہ کمرے سے جانے لگی۔

دوسری طرف نیلوفر۔۔۔ اس کی آنکھیں نرم پڑیں۔ اسے زینت سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ وہ بھی انصاف کے لیے تڑپی تھی۔۔۔ ادھر ادھر بھٹکی تھی۔۔۔ آخر میں خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ وہ زینت کو مایوس نہیں لوٹانا چاہتی تھی۔

”رکو!“ نیلوفر نے پیچھے سے اسے پکارا۔ زینت مسکرائی۔ اگلے لمحے اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹی،

چہرے پہ وہی سختی طاری کی۔ وہ نیلوفر کی طرف پھر سے مڑ گئی۔ "اپنا نمبر دے جاؤ۔ میں کچھ دن تک شاید تمہیں کال کر لوں۔" نیلوفر نے کہا۔ زینت نمبر دے کر چلے گئی۔ باہر نکل کے وہ ٹیکسی پہ بیٹھی اور احمد کو کال ملا کے اسے سارا احوال بتانے لگی۔

**("اس کے بعد تمہیں کسی بھی طرح سے پتا لگانا ہوگا کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ تمہیں پتا لگانا ہوگا کہ کون کون اس سب میں ملوث ہے۔ اور یہاں سب کچھ کس طرح سے ہوتا ہے۔ تم کسی بے وقوف سی نرس کو دوست بنا لینا۔ اور پھر اس سے سب کچھ اگلوانے کی کوشش کرنا۔ تمہیں ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد ان کے کالے دھندے میں شامل ہونا ہے۔")**

"آپ کل سے جوائن کر لیں۔" یہ کال عافیت زندگی کی طرف سے تھی۔ زینت مسکرا رہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی۔ اسے یہ کال نیلوفر سے ملاقات کے چار دن بعد موصول ہوئی تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے یہ چار دن اس کی چھان بین کی ہوگی۔ اور انہیں وہی ملا ہوگا جو اس نے ان سب کے لیے چھوڑا تھا۔ وہ سکون کی سانسیں بھرنے لگی۔ ابھی تک سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

زینت نے ہسپتال جوائن کیا تو اس کا سب سے پہلا کام کسی بے وقوف نرس کے قریب ہونا تھا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہ تھا، وہ انسانوں کو پڑھنا بخوبی جانتی تھی۔

اس نے ایک ہفتے تک ہسپتال میں کام کرنے والی ہر نرس کا جائزہ لیا۔ اسی سلسلے میں اسے عائشہ ملی، جو کہ تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس کا ایک دس سال کا بیٹا تھا۔ شوہر مر چکا تھا اور کوئی بھی اسے سپورٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک تو عائشہ بڑھی عمر کی تھی اور پھر حد سے زیادہ جذباتی بھی تھی۔ وہ چھوٹی

چھوٹی تفصیلات بھول جایا کرتی تھی۔زینت نے اپنے دوست کے طور پہ عائشہ کو چنا۔وہ اس کو اندر تک پڑھ چکی تھی۔اب اس کا کام تھا عائشہ کے دل میں اپنی جگہ بنانا۔

ایک دن عائشہ زینت کے ساتھ پیشنٹ کے وارڈ میں موجود تھی۔عائشہ پیشنٹ کے سرہانے کھڑے رپورٹس بنا رہی تھی جب کہ زینت کاؤچ پے بیٹھی تھی۔اس نے اپنے چہرے پہ رندھا ہوا سا تاثر طاری کیا ہوا تھا۔دفعتاًزینت پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔روتی ہوئی زینت کو دیکھتے ہی عائشہ کا دل پھڑپھڑانے لگا۔وہ تیزی سے زینت کی طرف لپکی۔

"ارے کیا ہوا زینت؟" عائشہ پنجابی لب و لہجے میں بات کرتی تھی۔

"کچھ نہیں بس،اماں یاد آرہی تھیں۔" زینت روتے ہوئے بولی۔عائشہ غمگین سی ہونے لگی۔

"ارے ارے۔کیا ہوگیا؟ ایسے نہ رو بچی۔" عائشہ زینت کے گال تھپتھپانے لگی۔وہ نرمی سے اس کی آنکھ

سے آنسو پونچھنے لگی۔

"میں کیا کروں، میں پوری دنیا میں اکیلی ہوں۔میرا کوئی بھی نہیں۔" زینت سسکیاں لیتے کہہ رہی تھی۔عائشہ کا دل بھاری ہونے لگا۔اسے زینت پہ ترس آنے لگا۔

"اب آئندہ تم مجھے روتے ہوئے نظر نہیں آنی چاہئے ہو۔میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لو۔" عائشہ شفقت سے اس کے بوائے کٹ بالوں پہ ہاتھ پھیرتے بولی۔زینت اداس سا مسکرا دی۔

"کیا واقعی؟ کیا آپ مجھے باقی سب کی طرح چھوڑ کے نہیں جائیں گی؟" زینت روتے ہوئے بولی۔عائشہ سر نفی میں ہلانے لگی۔

"چلو بس، اب چپ ہو جاؤ۔آج میں اپنی پکی سہیلی کے ساتھ کھانا کھانے جاؤں گی۔" عائشہ خوش دلی سے بولی۔وہ اندر سے ایک اچھی عورت تھی۔مگر زمانے کی سختیوں کی وجہ سے اسے یہ راستہ چننا پڑا۔ وہ اپنے بیٹے کو بہترین زندگی دینا چاہتی تھی' اس لیے اس اندھیری دنیا میں داخل ہوئی۔

زینت دل میں ہنس رہی تھی۔تیر نشانے پہ لگا تھا۔وہ عائشہ کہ پھسانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

**"(اس کے ساتھ ساتھ تمہیں مجھے ہر چیز کی خبر دینی ہوگی زینت۔پل پل کی خبر۔)"**

زینت نے سب کچھ سست رکھا۔وہ ایک دم سے سب کچھ جاننے کی کوشش کرتی تو شاید با آسانی پکڑی جاتی۔سب سے پہلے تو اس نے اپنے اوپر تنگی کا رونا رویا۔اس کے بعد اس نے عائشہ کے اوپر یہ تاثر دیا جیسے وہ تنگی کی وجہ سے خودکشی کرنے کا سوچ رہی ہے۔اس سب کے بعد عائشہ کے دل پہ خنجر چل گئے۔ایک دن اس نے زینت سے کہا کہ وہ اس کے مسائل کا حل لے کر اس کے پاس آئے گی۔اسی دن،رات کے وقت وہ نیلوفر سے ملنے اس کے آفس گئی۔

"جی عائشہ، کیا ہوا ہے۔" نیلوفر کی روکھی آواز میں تھکان تھی۔

"میم میں آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔اگر آپ کو برا لگے بھی، تو اس کی مجھے پرواہ نہیں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں جاؤں گی۔" عائشہ گردن جھکائے، جذباتی انداز میں بولی۔نیلوفر نے کوفت کے عالم میں تھکی ہوئی سانس خارج کی۔چہرے پہ ناگواری سی ابھری۔

"ٹھیک ہے۔بات کرو۔" نیلوفر چڑ کے بولی تھی۔اسے نرس کا یوں جذباتی ہونا پسند نہیں تھا۔

"میری دوست ہے،زینت۔اس کے سر پہ بہت مسائل ہیں میم۔" عائشہ کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔

"وہ تنگی کی وجہ سے خودکشی کرنے والی تھی۔کیا آپ لوگ اسے بھی اس کاروبار کا حصہ نہیں بنا سکتے؟ اس کی ہر پریشانی دور ہوجائے گی میڈم۔" نیلوفر کے چہرے پہ تناؤ بڑھتا گیا۔اس کے لبوں کے پاس پھٹوں میں کھچاؤ سا پھیلا۔ہاتھ کی بے اختیار مٹھی بن گئی۔

"تم دوست نہیں، دشمن ہو اس کی۔ سمجھی!" نیلوفر ایک دم سے آگ بگولا ہو گئی۔عائشہ بوکھلا کے دو قدم پیچھے ہوئی۔اسے نیلوفر سے اس طرح کے رد عمل کی توقع نہ تھی۔

"اگر تم اس کے ساتھ مخلص ہوتی' تو کیا تم اسے جہنم کا ٹکٹ یوں دیتی؟ عائشہ بتاؤ؟ یہ جہنم ہے، جہنم۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔" نیلوفر کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب اس نے اس جہنم میں قدم رکھے تھے۔اس دنیا میں خوش باش رہنے کا ناٹک کرنا، اپنے آپ کو اس دنیا کے رنگوں میں رنگا ہوا ظاہر کرنا کتنا مشکل تھا، یہ صرف وہی جانتی تھی۔

"میم۔اس دنیا میں کچھ نہیں رکھا ہے۔میں بس اس کی مشکلات کا حل چاہتی تھی۔" عائشہ کو اپنے اوپر اٹھایا گیا انکشاف اچھا نہ لگا۔نیلوفر نے گہرے سانس لیتے اپنے آپ کو پر سکون کیا۔

"اس زینت سے بولو اگر وہ اس سب میں شامل ہونا چاہتی ہے تو خود میرے پاس آئے۔میں یوں سفارشیں تسلیم نہیں کرتی۔" نیلوفر نے کوفت سے کہا۔عائشہ مسکرادی۔

”اس نے سفارش تو نہیں۔۔“ نیلوفر نے ہاتھ کھڑا کیا تو عائشہ چپ ہو گئی۔نیلوفر کا موڈ بری طرح سے بگڑ چکا تھا۔عائشہ بھی جان گئی تھی۔

”جتنا کہا جائے اتنا کیا کرو۔اب جاؤ۔“ عائشہ سر کو خم دے کے کمرے سے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زینت اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں موجود احمد سے فون پہ بات کر رہی تھی۔

”ہاں عبدالحمید۔مجھے کل نیلوفر نے بلایا ہے۔عائشہ کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے میرے مسائل کا حل بتائے گی۔میرا اندازہ یہ ہے کہ نیلوفر مجھے اس کاروبار میں شامل ہونے کا کہے گی۔“اپنے بوائے کٹ بالوں پہ ہاتھ پھیرتے زینت بولی۔وہ کافی پر جوش تھی۔سب کچھ بالکل پرفیکٹ جا رہا تھا۔

”زبردست۔یہ سب تم نے بہت جلدی کر لیا ویسے۔“ احمد کی کمپیوٹرائیزڈ آواز میں کوئی تاثر نہ تھا۔ زینت زور سے ہنس دی۔

”متاثر ہوئے نہ عبدالحمید؟“ زینت نے نچلا ہونٹ دباتے کہا۔

”ابھی اور امتحانات باقی ہیں زینت۔“ احمد سرد سے لہجے میں بولا تو ایک بار پھر زینت ہنس دی۔کھڑوس عبدالحمید نے بھی بھلا اس کی تعریف کہاں کرنی تھی؟ زینت نے سوچا۔

”شیور شیور۔ویسے قابل تو میں ہوں۔یہ ماننا پڑے گا۔خوش قسمت ہو کہ اس کیس کے لیے تمہیں میں ملی۔“ زینت کا انداز جتانے والا تھا۔احمد اپنے کمرے میں بیٹھا مسکرایا۔سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی زینت کی کارکردگی سے متاثر تھا۔اسے اس سے بہتر پارٹنر نہیں مل سکتا تھا۔

”خیر۔اب اگلا مرحلہ ہے اس کاروبار کے رازوں کو جاننے کا۔ سمجھی نا؟“ احمد بولا۔

کچھ دیر معمول کی باتوں کے بعد احمد نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن زینت بہت ہی اچھے موڈ کے ساتھ ہسپتال گئی تھی۔کتنی آسانی سے وہ اس کاروبار میں شامل ہونے جارہی تھی۔زینت سوچ سوچ کے ہی خوش ہوئے جا رہی تھی۔

وہ ہسپتال پہنچ کے سیدھا نیلوفر کے آفس گئی۔نیلوفر بھی اسی کی منتظر تھی۔نیلوفر کے آفس تک پہنچتے پہنچتے زینت

نے اپنے چہرے پہ اداس سا تاثر طاری کر لیا تھا۔آنکھیں معصومانہ سی کر لی تھیں۔

”بیٹھو۔“ زینت آئی تو نیلوفر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔اس کی آنکھوں میں سرد مہری سوار تھی۔ زینت چپ چاپ کرسی پہ بیٹھ گئی۔

نیلوفر اپنی کرسی پر سے کھڑی ہوئی۔اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پیچھے سے لاک بھی لگایا۔وہ آفس کی کھڑکی تک آئی جہاں سے سورج کی روشنی چھن چھن کے اندر آتی تھی۔نیلوفر نے آفس کی بلائینڈز نیچے گرائی تو سورج کی کرنوں کا راستہ بند ہو ا۔اب بس کمرے کی بتی ہی کمرے کو جگمگائے ہوئے تھی۔کمرے کا ماحول پر اسرار سا ہوگیا تھا۔نیلوفر اب اپنی کرسی پہ پھر سے بیٹھ گئی۔ نظر، بظاہر اداس سی زینت پہ گاڑ کے اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"زینت۔عائشہ سے دوستی ختم کر دو، ورنہ میں تمہیں اس ہسپتال سے فارغ کر دوں گی۔"نیلوفر نے کہا تو زینت بری طرح سے چونک گئی۔اس نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی۔وہ نیلوفر سے اس بات کی توقع دور دور تک نہیں کر رہی تھی۔

"میں سمجھی نہیں میم۔" زینت کو الجھنے کی اداکاری کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی کیونکہ وہ حقیقتاً الجھ گئی تھی۔

"میں تمہیں ہسپتال میں صرف اس لیے ہی کام نہیں دینا چاہ رہی تھی۔میں جانتی تھی کہ اس ہسپتال میں بسا شیطان تمہیں بھی اپنی طرف کھینچ لے گا۔مجھے ترس آتا ہے تمہارے اوپر زینت۔مجھے تمہارے اندر نیلوفر نظر آتی ہے۔تمہاری کہانی، میری کہانی کا عکس ہے زینت۔" نیلوفر آنکھوں میں اپنائیت لیے بولی تھی۔اس کے لہجے میں کچھ بہت غمگین کر دینے والا تھا۔

یہ سب زینت کی سوچ سے بالا تر تھا۔اسے لگا تھا نیلوفر ایک مغرور سی لڑکی تھی مگر یہاں اس کا اندازہ غلط ثابت ہورہا تھا۔نیلوفر یقینا اس کام سے خوش نہیں تھی۔وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھی۔

"میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی ہوں میم۔" زینت بولی۔

"دیکھو۔" نیلوفر نے اپنی دراز سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ٹیبل پہ رکھی۔زینت کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ گئی۔"یہ تم رکھ لو۔مگر میں تمہیں اس سب میں شامل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔تم دوسری نیلوفر

نہیں بننے والی۔ تمہیں آئندہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔" زینت دنگ سی ہو کے نیلوفر کو دیکھتی رہ گئی۔ یہاں تو سب کچھ اس کی سوچ کے بر عکس ہو رہا تھا۔

"میم۔آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟" زینت کی آنکھ میں آنسو جھلکنے لگا۔

"عائشہ سے دوستی ختم کر کے۔اور تم اب جاؤ۔" نیلوفر کے انداز میں کرختگی لوٹ آئی۔وہ زیادہ دیر نرم نہیں رہ

سکتی تھی۔

زینت نے چپ چاپ نوٹوں کی گڈی اپنے پرس میں ڈالی اور وہاں سے اٹھ گئی۔اس کے پاس عبدالحمید کو بتانے کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے وقت، حسب معمول زینت احمد کو پورے دن کا احوال بتانے لگی۔

"تو عبدالحمید اس سب سے تمہیں کیا سمجھ آرہا ہے؟" زینت نے نیلوفر والا واقعہ بتانے کے بعد پوچھا۔

"یہی کہ وہاں کچھ غلط ہورہا ہے۔اور یہ نیلوفر اس میں شریک ہے،لیکن دل سے نہیں۔ہم اس نیلوفر کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔لیکن، فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔تم عائشہ سے ہی سب کچھ دریافت کرنے کی کوشش کرو۔چونکہ نیلوفر نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہاں کچھ ہورہا ہے، تم عائشہ سے سب کچھ ہی سیدھا سیدھا پوچھ سکتی ہو۔عائشہ سے تفصیلات جاننے کی کوشش کرو۔تم کچھ نہ کچھ تو اگلوا سکتی ہو زینت۔" احمد سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔زینت بات کو سمجھ چکی تھی۔

"عبدالحمید۔" زینت کی آنکھوں میں غمگین سا تاثر ابھرا۔ "مجھے پتا نہیں کیوں، آج بہت برا لگا۔ مجھے مجرموں سے نفرت ہے۔ میں قسم کھا چکی ہوں کہ جو بھی مجرم سامنے آئے گا، اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گی۔ لیکن پہلی مرتبہ مجھے ایک مجرم پہ ترس آیا۔ میرا دل چاہا کہ وہ مجرم ایک دفعہ پھر سے اچھی زندگی بسر کرنے لگے۔ وہ مجرم نیلوفر ہے عبدالحمید۔" زینت نے سوچتے ہوئے کہا۔

"دیکھو زینت۔ جذباتیت پرے رکھو۔ ہم جو کام کر رہے ہیں اس میں جذباتیت کسی کام نہیں آئے گی۔ ہمیں کسی سے ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح سے ہم ابھی عائشہ کو استعمال کرتے آئے ہیں، اگر ضرورت پڑی تو نیلوفر کو بھی کریں گے۔ سمجھی؟" احمد تائید والے انداز میں بولا۔ وہ اس کام میں جذباتیت کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سب نے میرے دماغ میں ایک اور زاویہ کھول دیا احمد۔ کہ ضروری نہیں ہر مجرم سزا کا حقدار ہو۔ شاید کچھ ایسے مجرم ہوں جو کہ واقعی اچھا بننا چاہتے ہوں۔ تو کیا انہیں دوسرا موقع نہیں دینا چاہیے؟" زینت بولی۔

"ان سوالات کے جواب بعد میں تلاش کرتی رہنا۔ ابھی کام پہ فوکس کرو۔" احمد نے کال کاٹ دی۔

زینت کے آبرو اٹھ گئی۔ ایجنٹ عبدالحمید، اس کے مطابق دنیا کا سب سے کھڑوس ترین انسان تھا۔ مجال ہے کہ کبھی اس نے کام کے علاوہ اس سے کوئی بات کی ہو۔ زینت منہ چڑاتے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**اگلے دن۔۔۔**

زینت عائشہ کے ساتھ پیشنٹ کے وارڈ میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا۔کچھ بات کی نیلوفر میڈم نے؟" عائشہ نے پیشنٹ کی ایکس رے رپورٹس دیکھتے پوچھا۔

"ہاں، انہوں نے کہا تھا کہ یہاں کچھ غلط ہورہا ہے، لیکن مجھے صاف صاف جواب دے دیا کہ تم اس کام میں حصے دار نہیں بنو گی۔اس کے علاوہ کچھ پیسے دے دیئے تھے۔" زینت کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

"اچھا ہی کیا۔ہماری تو آخرت خراب ہو گئی ہے۔اب تمہاری کیوں کریں؟" عائشہ زینت سے نظریں چراتے بولی۔

"عائشہ کیا تم مجھے نہیں بتا سکتی۔کہ ایسا کیا ہوتا ہے ادھر؟" زینت ایک دم سے چوکنا سی ہوکے بولی۔

عائشہ نے سخت نگاہ زینت پہ ڈالی۔

"کبھی نہیں۔" عائشہ نے سختی سے کہا۔

"دیکھو تم مجھے بتادو۔میں جب جان جاؤں گی کہ یہاں کیا ہورہا ہے، تو یقیناً میں اس میں شامل ہونے کا سوچوں گی بھی نہیں۔ورنہ شاید تجسس کے مارے میں کچھ غلط ہی کر بیٹھوں۔تمہیں میری حفاظت کے لیے یہ کرنا ہوگا۔" زینت نے عائشہ کی دکھتی رگ پہ وار کیا تھا۔عائشہ سوچ میں پڑ گئی۔

"پکا ناں؟ تم یہ سب صرف اسی لیے جاننا چاہتی ہو نا؟" عائشہ سوالیہ نگاہیں زینت پہ ڈالتے بولی۔زینت نے سر اثبات میں ہلایا۔عائشہ کو بیوقوف بنانا ہمیشہ کی طرح بہت آسان تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر سنو۔" عائشہ ٹھہری۔ "ہم لوگ اعضاء کا غیر قانونی کاروبار کرتے ہیں۔" زینت کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں یہ بہت عام تھا، لیکن قسمت تو دیکھو، وہ سیدھا اسی ہسپتال میں داخل ہوئی۔ زینت کو حیرت نے گھیر لیا تھا۔۔

"کہا تھا۔ یہ سب بہت بھیانک ہے۔" عائشہ نے افسوس سے کہتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔ زینت نے چہرے پہ سوچ کا تاثر تھا۔

"اس سب کو کون چلاتا ہے؟" زینت متجسس ہوئی۔

"لیڈی اقتدار۔ بہت ہی خطرناک عورت ہیں وہ۔ کبھی نظر آئے تو قریب بھی نہ جانا ان کے۔ نظروں سے کھا جاتی ہیں وہ۔" عائشہ نے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔

"اور یہ لیڈی اقتدار کب کب آتی ہے ادھر؟" زینت نے پوچھا۔

"اف تم کیا کسی تفتیشی افسر کی طرح سب پوچھے جا رہی ہو۔" زینت کے سر پہ ایک سایہ سا گزرا۔ وہ کچھ زیادہ ہی سوال کر گئی تھی۔ "آتی ہیں روز ہی۔ تمہیں نظر نہیں آتی۔ سیدھا نیچے چلے جاتی ہیں بیسمنٹ میں۔" عائشہ بتانے لگی۔ بیسمنٹ کا سن کے زینت مزید چونکی۔

"بیسمنٹ؟" زینت جانتی تھی کہ اسے مزید سوال نہیں کرنے چاہئے تھے لیکن یہ والا بم پھٹنے کے بعد وہ ایک اور سوال پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

"ہاں۔ بیسمنٹ۔ وہاں پہ ملاقاتی کمرہ بھی ہے۔ جہاں پہ اس کاروبار کو چلانے والے ملتے ہیں۔ دیگر معاملات وہیں پر ڈسکس کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ہم سب کو بھی کسی ضروری کام سے

بیسمنٹ میں مطلوب کیا جاتا ہے۔" زینت کے دماغ میں پوری کی پوری تصویر بننے لگی تھی۔اسے سب کچھ ٹھیک سے سمجھ آگیا تھا۔ہر پہلی کا جواب اسے مل گیا تھا۔آنکھوں میں سوچ کا تاثر لیے وہ ٹیک لگاتے بیٹھی۔

آج عبدالحمید کو دینے کے لیے، اس کے پاس سب سے اہم خبر تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"تو کیا کہنا چاہو گے عبدالحمید؟" ہمیشہ کی طرح اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کر کے وہ اس کی رائے مطلوب کرنے لگی۔احمد دوسری طرف کسی گہری سوچ میں تھا۔وہ زینت کی ہر ایک ایک بات کا باریکی سے جائزہ لے رہا تھا۔

"ملاقاتی کمرہ۔انٹرسٹنگ۔زینت ہمیں اس ملاقاتی کمرے میں جانا ہو گا۔"احمد نے کہا تو زینت اٹھ کے بیٹھ گئی۔"بھلا یہ کیسے ہو گا؟" زینت نے پوچھا۔

"تم عائشہ سے اس ملاقاتی کمرے کا راستہ نکلواؤ۔بس کسی بھی طرح سے، اس سے سیدھا سیدھا ہی پوچھ لینا، ضد کر کے۔مجھے نہیں لگتا اسے شک ہو گا۔وہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ بیوقوف ہے۔لیکن اس سے بس اگلوا لینا۔ٹھیک؟"

"ٹھیک ہے۔میں کوشش کروں گی۔" کہہ کے زینت نے کال رکھ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عائشہ سے کچھ بھی اگلوانا' زینت کے لیے مشکل نہ تھا۔اس نے باتوں باتوں میں اس سے ہر تفصیل اگلوا لی تھی۔وہ رات کے وقت، بیڈ پہ پیٹ کے بل لیٹی احمد کو فون پہ سب کچھ بتا رہی تھی۔

”تو یعنی۔ایک زینا نیچے اترنا ہے۔ایک سٹور روم میں داخل ہونا ہے۔ادھر ایک لفٹ ہے۔وہاں پہ پاسورڈ ہے 1986اور یہ لفٹ ہمیں بیسمنٹ تک رسائی دے گی۔“احمد زینت کی ساری باتیں دہرانے لگا۔

”اس کے علاوہ میں نے عائشہ سے کہا تھا کہ مجھے وہاں لے کر جاؤ تو اس نے بتایا کہ ممکن نہیں کیونکہ اس راستے پہ کیمراز لگے ہوئے ہیں جو کے نیلوفر میڈم کے کمپیوٹرز سے کنیکٹڈ ہیں۔“ زینت فخریہ سے انداز میں سب بتا رہی تھی۔اس کی مغرور ناک مزید اٹھ گئی تھی۔

”یہ عائشہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ بیوقوف نکلی۔اف۔۔!“احمد سے ہنسے بغیر رہا نہ گیا۔

”ٹھیک ہے مطلب کہ ہم جلد ملیں گے۔“احمد ہنسی روکتے ہوئے بولا تو زینت بھرپور مسکرا دی۔

”عبدالحمید۔کیا میں تم سے ایک درخواست کر سکتی ہوں؟“ زینت التجائیہ سے انداز میں بولی۔

”ضرور۔“ احمد کا انداز ہمیشہ کی طرح برفیلا سا تھا۔

”کیا تم اس ملاقات میں اپنا چہرہ مجھے دکھا سکتے ہو؟ میں اس آپریشن کو ختم کرنے سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ زینت آواز میں آس لیے بولی تو احمد مسکرا دیا۔

”تمہیں میرا چہرہ دیکھ کے بھلا کیا ملے گا؟“ احمد نے اپنا لہجہ بے تاثر رکھا۔مسکراہٹ دبا لی تھی۔

کھڑوس عبدالحمید۔ہنہہ۔زینت نے سوچ کے سر جھٹکا۔

”تم سے شناسائی کا احساس ہوتا ہے عبدالحمید۔ تمہارے ہر انداز سے کوئی یاد آتا ہے۔میں بس تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔“ احمد کے چہرے پہ نرم مسکراہٹ بکھری۔

”ٹھیک ہے۔دکھا دوں گا۔اب خوشی کے مارے بہہ نہ جانا۔میرا پورا پلان سنو اب تم۔۔!“ وہ ایک دفعہ پھر سے اپنے عبدالحمید موڈ میں آگیا تھا۔زینت زیر لب ہنس دی۔وہ ہمیشہ کی طرح پلان سننے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**("تمہاری طرف میں ایک یو ایس بی بھیجوں گا۔تمہیں اس یو ایس بی کو کسی بھی طرح سے نیلوفر کے کمپیوٹر میں لگانا ہے۔اور اس میں ایک سافٹ ویئر کو ڈاؤن لوڈ کر دینا جو کہ میں نے بنایا ہے۔اس کے ذریعے میں نیلوفر کے کمپیوٹر کو دور سے کنٹرول کر سکوں گا۔")**

زینت نیلوفر کے آفس کے پاس ہی منڈلا رہی تھی۔نیلوفر بریک کے لیے گئی ہوئی تھی اور اس کے کمرے کی صفائی ہو رہی تھی۔جیسے ہی صفائی والی کمرے سے باہر آئی زینت کمرے میں داخل ہوئی۔اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ تیز تیز ہاتھ چلا رہی تھی۔زینت نے یو ایس بی کمپیوٹر میں لگائی اور سافٹ ویئر انسٹال کرنا شروع کیا۔سافٹ ویئر انسٹال ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا اور وہ فوراً کام ختم کر کے کمرے سے باہر بھی آگئی تھی۔

ایک مرحلہ تو کم سے کم پورا ہوا تھا۔آگے کے مرحلے باقی تھے، جو اس مرحلے سے کئی گنا مشکل تھے۔

("اب تم مجھے بتاؤ یہ نیلوفر کب تک ہسپتال میں رکتی ہے؟" احمد نے زینت سے پوچھا۔

"دس بجے کے بعد وہ اکثر چلی جاتی ہے۔" زینت نے حساب لگاتے ہوئے بتایا۔

"تو میں دس بجے کے بعد ہی آؤں گا۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ یوں آنے سے ہم پکڑے جائیں گے۔"

احمد کچھ فکرمند تھا۔

"نہیں عبدالحمید۔ آج گیارہ بجے کے قریب کسی کا بائی پاس ہونا ہے۔ تم اس ہی وقت آجانا۔ اور وہاں آکے آپریشن تھیٹر والا یونیفارم پہن لینا۔ ٹھیک؟" زینت کو جیسے ہی یاد آیا وہ بولی۔ احمد کو یہ آئیڈیا اچھا لگا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسی وقت میں آؤں گا، اور پھر تم مجھے یونی فارم تھما دینا۔")

احمد، سر پہ کالی پی کیپ پہنے عافیت زندگی کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس نے چہرے پہ فیس ماسک لگایا ہوا تھا۔ ایک کمرے سے زینت نکلی۔ احمد نے بس ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر نظر زینت پر سے ہٹالی۔

زینت ہاتھ میں ایک شاپر لیے تیزی سے احمد کی طرف بڑھی۔ احمد ساکن سا بس وہیں کھڑا رہا۔ زینت احمد کے سامنے سے گزری، اسی میں اس نے احمد کے ہاتھ میں تیزی سے وہ شاپر تھما دیا تھا۔ وہ اب احمد سے دور جانے لگی۔

احمد ہاتھ میں شاپر تھامے واشروم تک گیا۔ اس نے سارا یونی فارم پہنا۔ سر پہ ٹوپی لگائی، چہرے پہ سرجیکل ماسک۔ ہاتھوں میں گلوز اور ایپرن بھی پہن لیا۔

وہ واش روم سے باہر نکلا تو زینت بھی باہر ہی تھی۔اس نے بھی آپریشن تھیٹر کی مناسبت سے لباس پہن لیا تھا۔

"صاف بات ہے عبدالحمید، ڈاکٹر بن کے برے نہیں لگو گے۔" زینت شوخ سے انداز میں اسے دیکھتے تبصرہ کرنے لگی جو کہ آپریشن تھیٹر والے لباس میں بھی کافی پرکشش لگ رہا تھا۔احمد ماسک کے پیچھے سے مسکرایا۔آنکھیں البتہ سرد ہی رکھیں۔

"کام پہ دھیان دو۔" ہمیشہ کی طرح، جواب بدلحاظی سے دیا۔زینت کو جیسے کچھ برا نہ لگا۔اسے عبدالحمید کے کھڑوس سے انداز کی عادت ہونے لگی تھی۔

وہ دونوں اب زینے کی طرف بڑھ رہے تھے۔۔۔مگر تب ہی۔۔۔پیچھے سے انہیں کسی نے پکارا۔

"ارے۔کہاں جارہے ہو؟" احمد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔چہرے پہ گھبراہٹ پھیلنے لگی۔

"پرسکون رہو۔" زینت احمد کے کان میں بولی اور پیچھے مڑ کے نرس کو دیکھنے لگی۔احمد نے بہرحال حرکت نہ کی۔

"سٹور سے کچھ چیزیں لینے۔بائی پاس ہونا ہے۔" وہ عام سے انداز میں بولی۔

"سب لے لیا ہے۔سیدھا آپریشن تھیٹر چلو۔" نرس حکم دینے والے انداز میں بولی۔احمد کی سانسیں بے ربط ہوئیں۔

"ڈیم اٹ!" احمد زیر لب بڑبڑایا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔میرے پیچھے چلو۔" زینت نے کہا تو احمد اس کا پیچھا کرنے لگا۔وہ دونوں پھر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے جہاں پہ ڈاکٹرز اور نرس موجود تھے۔انیس تھیزیا لگا کے پیشنٹ کو بے ہوش کیا گیا تھا۔کمرے میں عجیب و غریب بڑی بڑی سی مشینیں موجود تھیں جن کی احمد کو الف بے تک نہ پتی تھی۔وہ اس سب کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا۔

اچھے سے سینیٹائیز کرنے کے بعد آپریشن شروع ہوا۔احمد زینت کے پیچھے کھڑے ہوکے سب منظر دیکھ رہا تھا۔اسے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا تھا۔۔زینت جب کہ آپریشن میں نرسز کو ہدایات دے رہی تھی، اور ہدایات لے بھی رہی تھی۔وہ اپنا ہوم ورک کر کے آئی تھی۔

"پیڈلز(paddles) دو۔" ڈاکٹر نے پیشنٹ کے سینے پہ کٹ لگاتے کہا۔احمد ایک دم سے بوکھلا گیا۔ تمام

نرسز اور ڈاکٹرز کی نظریں اسی کی طرف تھیں جیسے وہ اس سے ہی یہ کام کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔احمد اندر ہی اندر بوکھلانے لگا۔زینت نے سر پہ ہاتھ مارا۔

احمد سرجیکل اکوپمنٹ کی ٹیبل تک گیا، اس کا ہاتھ جس چیز پہ گیا اسے اٹھا لایا۔دل ہی دل میں خود کو ملامت

کرنے لگا۔اسے بائی پاس کے بارے میں معلومات اکٹھی کرکے ہی آنا چاہیے تھااس نے سوچا۔

"یہ پیڈل ہے؟" ڈاکٹر نے برہمی سے کہا۔روم میں موجود کچھ نرسز ہنسنے لگے۔

زینت اسی وقت تیزی سے ٹیبل تک گئی اور پیڈل اٹھا کے لائی۔

”یہ لیجیے۔یہ نیا ہے، اس لیے کنفوژ ہوگیا۔“ وہ احمد کو سختی سے دیکھتے بولی۔ڈاکٹر پیڈلز تھام کے اب آگے کا آپریشن کرنے لگے۔آخر کار آپریشن مکمل ہوگیا تھا۔احمد کی سانسیں جیسے بحال ہونے لگیں۔وہ عجیب و غریب منظر آخر کار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

زینت اور احمد اب بیسمنٹ کے راستے پہ گامزن تھے۔وہ دونوں زینہ نیچے اترے اور اسٹور روم کے

دروازے

تک پہنچے جو کہ لاکڈ تھا۔

زینت نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک پن نکالی اور دروازے کا لاک کھولنے لگی۔

”یہ سب ہمیں سکھایا جاتا ہے عبدالحمید۔تم خوش قسمت ہو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ لاک کھولتے جتانے والے انداز میں بولی تھی۔کچھ دیر کے بعد لاک کھل گیا۔

”ایک سیکنڈ رکو۔مجھے ایک کام ہے۔“ احمد اندر جانے ہی والا تھا کہ زینت بولی۔وہ سٹور روم کے اندر گئی۔اس نے دروازہ پیچھے سے لاک کیا۔اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی کرتی اوپر کی۔اس نے اپنے جسم پہ ایک فوم لگایا ہوا تھا جس پہ ڈکٹ ٹیپ سے دو گنز چپکائی ہوئی تھیں۔اس نے ڈکٹ ٹیپ کھینچ کے اتارا اور گنز آزاد کیں۔اس نے اسٹور روم کا دروازہ کھولا۔احمد سوالیہ نگاہیں اسی پہ گاڑے ہوئے تھا۔

”اندر آؤ۔“ احمد کے اندر آتے ہی اس نے پستل احمد کو تھما دی۔چہرے پہ شاطر مسکراہٹ تھی۔وہ جانتی تھی یہ چیز تو عبدالحمید کو متاثر کرے گی ہی کرے گی۔

احمد بھی قدرے حیران ہوا۔آنکھیں حیرت چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

"یہ کہاں سے ملیں؟" احمد نے پوچھا۔زینت ہنس دی۔

"جادوگر اپنی ٹرکس کبھی نہیں بتاتا عبدالحمید۔" زینت مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

وہ دونوں اسٹور روم میں سیدھا سیدھا چلتے گئے۔دائیں اور بائیں طرف بڑے بڑے شیلوز تھے۔اب وہ کمرے کی بند دیوار پہ پہنچے جہاں لیڈی اقتدار کی تصویر تھی۔احمد نے وہ تصویر کھسکائی۔

"بڑی ہی کوئی سیلف آبسیسڈ عورت ہے یہ۔" احمد منہ چڑھاتے بولا۔زینت زیر لب ہنس دی۔

عقب میں لگے پینل کو انہوں نے کھولا اور کیز دبائیں۔لفٹ اپنی مخصوص آواز کے ساتھ اوپر آنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں لفٹ اوپر آئی تو لفٹ کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"تم نے کہا تھا اپنا چہرہ دکھاؤ گے۔" زینت نے لفٹ میں سوار ہو کے کہا۔

"ٹھیک ہے۔نیچے چل کے۔" لفٹ رک گئی۔لفٹ کا دروازہ کھلا تو بڑا سا ہال نمایاں ہوا۔وہی، تین دروازوں والا حال۔چھت پہ لگی بتیوں کی وجہ سے وہ چمک رہا تھا۔وہ دونوں اب حال میں چلنے لگے۔

"میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں عبدالحمید۔" زینت سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا۔احمد خوش دلی سے ہنس دیا۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔زینت بھی رک گئی۔وہ اب زینت کی طرف مڑا۔دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

"تم نے کہا تھا تمہیں مجھ سے شناسائی کا احساس ہوتا ہے۔" احمد ماسک کے پیچھے مسکرایا۔"میں وہیں ہوں جو تم سوچ رہی ہو۔" احمد نے اپنا ماسک اتارا۔ماسک کے پیچھے اس کا چہرہ دیکھ کے اس کے لب بے یقینی کے مارے کھل گئے۔

اس کے چہرے پہ خوشگوار حیرت تھی۔

"احمد!" وہ بے اختیار بولی۔"یہ تم تھے؟"

"ہاں مریم۔ہمیشہ سے ہی، یہ میں تھا۔" احمد اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔

"یونیورسٹی کے بعد تم یہ کیسے بن گئے؟ مطلب تم یہ پرائیویٹ ایجنٹ کیسے بنے؟" زینت کو تجسس ہوا۔

"میں کوئی پرائیویٹ ایجنٹ نہیں ہوں۔اس سب کی لمبی کہانی ہے۔ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" احمد نے بس سرسری سا کہا۔زینت کی باچھے کھل اٹھی تھیں۔

احمد، نسٹ میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا، اور اب اتنے سالوں بعد دونوں یوں مل رہے تھے۔وہ دل سے خوش ہوئی تھی۔

"ملاقاتی کمرہ۔" اس نے دائیں جانب بنے دروازے کے اوپر انگلی سے اشارہ کیا۔"وہ والا ہے۔"

احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔دونوں اب اس دروازے کی طرف چل دیئے۔دروازے کے پاس آ کے زینت نے ایک دفعہ پھر سے پنز کا استعمال کیا اور لاک کھولا۔

وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہوئے جو کہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔زینت نے سوئچ بورڈ کے بٹنز دبا ک

ے لائیٹس جلائیں۔وہاں پر چار کرسیاں گول دائرے کی صورت میں لگی ہوئی تھیں۔

”چار کرسیاں۔یہاں چار لوگ ملا کرتے ہیں۔“ احمد نے اپنی تھیوری پیش کی۔زینت نے سر اثبات میں ہلایا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ زینت نے پوچھا۔احمد کمرے میں آنکھیں گھماتے پورے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں لگے اے سی پہ نظریں گاڑ کے اس نے اپنا بیگ اتارا۔ وہ اب اپنے بیگ سے کچھ نکالنے لگا۔وہ ایک چکور سی چیز تھی، جو کہ محض کوئی ڈیوائس لگتی تھی۔

”مجھے یہ ڈیوائز کہیں لگانی ہے۔یہ ایک ٹیپ ریکارڈر ہے۔میں ان لوگوں کی ہر گفتگو سننا چاہتا ہوں۔“زینت ڈیوائس کو غور سے دیکھنے لگی۔

”یہ میں اے سی میں فٹ کردوں گا۔“ احمد نے زینت کو بتایا۔

”اور اس کی چارجنگ؟“ زینت کو عجب ہوا۔

”اس کا انتظام ہے۔میں اس کو اس طرح سے سیٹ کرتا ہوں کہ اے سی کے ساتھ ساتھ اس ڈیوائز کو بھی کنیکشن مل جائے گا۔یوں یہ ہر وقت ہی اپنا کام کرتے رہے گی۔“ احمد سوچتے ہوئے بولا۔

زینت پھر ایک کرسی اے سی کی طرف لے کر آئی۔احمد نے کرسی پہ چڑھ کے کاروائی شروع کی۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے ڈیوائس لگا لی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کام ختم کر کے دونوں چپ چاپ سب چیزیں جگہ پہ لگا کے عافیت زندگی کی عمارت سے چلے گئے۔

اب دونوں احمد کی گاڑی پہ سوار تھے۔احمد اسے اپنے حصے کی کہانی سنا رہا تھا۔

"ویسے احمد۔علی نے بھی کچھ غلط نہیں کیا۔تم ایک بہترین پرائی ویٹ ایجنٹ بن سکتے ہو۔" کہانی سننے کے بعد زینت بولی تھی۔احمد کے چہرے پہ ستائش ابھری۔

"کیا واقعی؟" احمد کا انداز عام سا تھا۔

"بالکل! یہ سب تمہارے پلانز تھے۔تم باریکی سے ہر چیز کا جائزہ لیتے ہو۔تم ایک بہترین پرائی ویٹ

ایجنٹ

بن سکتے ہو۔بس اپنی گھبراہٹ پہ تھوڑا کام کرلو۔جیسے جب وہ نرس آئی تم بالکل بوکھلا گئے تھے۔اپنے اسٹریس پہ کام کرو تو تم سے بہتر کوئی نہیں۔" زینت پرجوش ہو کے بولے جا رہی تھی اور احمد بھی چہرے پے مسکراہٹ سجائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔سالوں بعد پرانے دوست سے بات کرنا کتنا خوش گوار ہوتا ہے نا؟

"اب اس کیس میں میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے احمد۔ہم ضرور تمہارے بھائی اور عثمان کو انصاف دلوائیں گے۔ہم انہیں برباد کر کے ہی دم لیں گے۔" زینت آواز میں عزم لیے بولی۔چہرہ اب سنجیدہ تھا۔احمد کے تاثرات بھی نرم پڑے۔

"تم اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔کیسے ہوگیا یہ یعنی؟" احمد نے اوپر سے نیچے زینت کو دیکھا۔"تم تو نازک سی پری بنے پھرتی تھی۔پھر یہ، اتنی سخت جان، بندوقیں استعمال کرنے والی کیسے بن گئی؟"احمد نے کہا تو زینت کے دماغ میں سایہ سا لہرایا۔ اسے ماضی کے تکلیف دہ منظر یاد آئے۔

"حالات نے مجھے یہ بنا دیا احمد۔" وہ اداس سا مسکرائی۔"تم جانتے ہو میری اماں اور میرے بابا کو کتنی بے دردی سے مارا گیا تھا۔دونوں ایک دلیر وکیل تھے۔انصاف کے لیے ان دونوں نے ہی اپنی جانیں قربان کیں۔قتل کے بعد انہیں کبھی انصاف نہ ملا۔میں انصاف کے لیے دربدر بھٹکی تھی احمد۔مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔میں اس وقت ہی ٹھان چکی تھی کہ مجھے انصاف نہیں ملا تو کیا ہوا، میرے جیسے جتنے بھی لوگ ہوں گے میں انہیں انصاف دلواؤں گی۔میں ان کے لیے جنگیں لڑوں گی۔ اس کے بعد یہ فورس جوائن کرنے کا مجھے موقع ملا۔خدا مجھ پہ مہربان ہوا۔شروع میں بہت مشکل ہوئی۔بہت سخت حالات میں رہنا پڑتا تھا اور بہت ہی سخت ٹریننگ تھی۔مگر اس سب کے بعد میں اپنا سب سے مضبوط ورجن بن گئی احمد۔" زینت مختصر سے الفاظ اور جملوں کا استعمال کر کے اسے سب بتاتے گئی۔اس چیز میں وہ بھی احمد جیسی تھی۔وہ زیادہ بڑی بڑی باتیں نہیں کیا کرتی تھی۔وہ خیالی دنیا میں جینے والی لڑکی نہیں تھی۔اسے اس دنیا میں، اصلی دنیا میں جہاں ہر انسان کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔اسے اس ظالم دنیا میں رہنے کے طریقے آتے تھے۔وہ اس معاشرے کے ہر پہلو کو دیکھ چکی تھی اور وہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ کا سامنا کر سکتی تھی۔زینت سہی معنی میں ایک مضبوط لڑکی تھی۔

"تو ایجنٹ عبدالحمید۔" زینت نے ماحول کا تناؤ گھٹانے کے لئے انداز مزاحیہ بنایا۔"آگے کیا کرنا ہے؟"

احمد نرم سا مسکرایا۔

”میں کچھ وقت ان سب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔تم بس چپ چاپ ہسپتال میں کام کرتی رہو۔جب کچھ کام کا پتا چلے تو مجھے اپڈیٹ کر دینا۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**دو ماہ بعد:**

احمد کو ان سب کی گفتگو سنتے دو ماہ بیت چکے تھے۔ڈیوائس میں کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے آواز پھٹ پھٹ کے آتی تھی، اس کے باعث وہ آوازوں میں تفریق نہیں کر پاتا تھا۔

اسے ان دو ماہ میں بہت کچھ پتا چلا۔سب سے پہلے تو اسے عبداللہ سلطان کے ہیروں والا معاملہ سمجھ آگیا تھا۔اس کے بعد اسے ایک گودام کا ایڈریس بھی مل گیا تھا جہاں انسان قید تھے۔احمد اب اگلا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

اس نے ایک دن زینت کو بھی اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کیا اور اسے کال ملائی۔کچھ ہی دیر میں زینت نے کال اٹھا لی تھی۔

”کیسے ہو ایجنٹ عبدالحمید۔“ زینت دوسری طرف سے چہکی۔

”اب ہم اگلا قدم لینے کے لیے تیار ہیں زینت۔اپنی ایجنسی والوں سے کہو کے وہ سب تیاری پکڑ لیں۔مجھے ان کے ایک گودام کا ایڈریس مل گیا ہے‘ جہاں انسان قید ہیں۔“ احمد کا انداز مصروف سا تھا۔ہمیشہ کی طرح وہ سیدھا مدعے پہ آیا۔۔۔ٹپیکل ایجنٹ عبدالحمید۔۔۔

"یہ تو بہترین ہوگیا احمد۔" زینت کی آواز ہلکی ہوگئی مگر آواز میں دبا دبا جوش تھا۔"یہ ان منحوسوں کے لیے کتنا ہی بڑا دھچکا ہو گا؟" وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔

"بس تم اپنی ایجنسی والوں کو کہہ دینا۔ٹھیک؟" احمد بولا۔

"ہاں۔لیکن اس طرح کے آپریشن کی تیاریاں کرنے میں وقت لگتا ہے احمد۔ہمیں اس وقت تک ان لوگوں کو بھٹکانا ہو گا تاکہ ان کی توجہ ہماری طرف نہ جائے۔عموماً یہ مافیاز بہت طاقت ور ہوتے ہیں، اور اس طرح کے آپریشنز کے لیے تیار رہتے ہیں۔تمہیں اپنی طرف سے کوشش کرنی پڑے گی احمد۔"

احمد کے چہرے پہ سوچ کا تاثر ابھرا۔وہ اپنے دماغ پہ زور دیتے ہوئے کوئی ترکیب سوچنے لگا۔۔۔اور اسی وقت اس کی دماغ میں کچھ سوجنے لگا۔۔۔احمد کے چہرے پہ شاطر مسکراہٹ بکھری۔

"ہوجائے گا۔تم چپ چاپ اپنا کام کرو۔ان کو بھٹکانے کا کام میرا ہے!" احمد پر اطمینان انداز میں بولا اور اس نے فون رکھ دیا۔اب نئے سلسلے سے یہ گیم شروع ہونے والا تھا۔احمد کافی پر جوش نظر آرہا تھا۔اتنے ماہ میں وہ اپنے دشمنوں کو بہت اچھے سے جان گیا تھا۔اس کی ہر چال تیار تھی۔۔۔

اب آئے گا مزہ۔۔۔احمد نے سوچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد راحیلہ صدیقی کے دفتر میں موجود تھا۔راحیلہ کنپٹی پہ ہاتھ رکھے اپنی کرسی پہ براجمان' کچھ بوجھل سی نظر آ رہی تھی۔ڈیسک پہ ایک ریکارڈر رکھا ہوا تھا جس پہ عثمان کی احمد سے آخری گفتگو چل رہی تھی۔

"مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔یہ لوگ دھوکے باز نکلے۔ہمیں بیچ میں چھوڑ کر چلے گئے۔یہاں پر ہر کسی کو مار دیا جارہا ہے۔سب ہلاک ہوگئے ہیں۔ہم کچھ ہی بچے تھے اور اب مجھے لگ رہا ہے صرف میں ہی بچ گیا ہوں۔مجھے نہیں پتا میں زندہ بچوں گا بھی کہ نہیں۔"

عثمان کی کربناک آواز، جس میں خوف تھا، وہ گونج رہی تھی۔دفتر کا ماحول بہت غمگین سا تھا۔

راحیلہ کی برداشت بس ختم ہونے لگی۔اس نے ٹیپ ریکارڈر اگلے لمحے ہی بند کر دیا۔اس سے مزید نہ سنا گیا۔وہ ایسے معاملات کو لے کر بہت حساس تھی۔اس نے کرب کے مارے اپنی آنکھیں میچیں۔ہاتھ کھڑے کیے اور ان کی مٹھی بنائی۔اس کے چہرے پہ شدید نفرت جھلک رہی تھی۔

گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور نظر احمد پہ ڈالی جو کہ پر سکون سا بیٹھا تھا۔

"اس سے پہلے آپ کہاں کہاں گئے تھے؟" راحیلہ کی آواز ڈسٹرب سی تھی۔

"بہت نیوز چینلز کے پاس۔مگر کسی نے نہ سنی۔" احمد نے شانے اچکائے۔

"سب بکے ہوئے ہیں۔" راحیلہ کے لہجے میں کڑواہٹ بھری پڑی تھی۔

"مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔یہ لوگ یقیناً بہت طاقتور ہیں اور ان کے ہاتھ ملک کی ہر طاقت تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

'اس کے گھر والے کیسے ہیں؟" راحیلہ نے دراز سے نوٹ بک اور پین نکالا اور اس میں کچھ لکھنا شروع کیا۔

"بس گزارا کر رہے ہیں۔" احمد کا لہجہ نیم اداس ہوا۔

"تو آپ ان کے اخراجات دیکھ رہے ہیں؟"احمد نے مختصر سا سر اثبات میں ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔میں کچھ این جی اوز کو جانتی ہو ں جو کہ ان کی مدد کر لے گی۔باقی اگر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو آپ بھی دیکھ لیجیے گا۔اور وہ آفس وغیرہ۔وہ اب تک موجود ہیں؟"احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہ وہ آفس ادھر ہے نہ ہی وہ انسٹا گرام اکاؤنٹ۔مگر میں اس آفس کے باہر کی تصویر کھینچ چکا تھا۔ اور اس انسٹاگرام اکاؤنٹ کے سنیپس موجود ہیں میرے پاس۔" احمد نے موبائل میں گیلری میں کچھ تصاویر کھول کے راحیلہ کو دکھائیں۔

"ٹھیک ہے۔کیونکر میں کسی چینل میں کام نہیں کرتی'اس لیے یہ سب ہمیں سوشل میڈیا کے ذریعے کرنا ہوگا۔حالانکہ ہماری آواز شاید زیادہ لوگوں تک نہ پہنچے مگر کم سے کم کچھ لوگوں تک تو پہنچے گی۔ آپ عثمان کے گھر والوں کو تیار کریں۔میں کچھ این جی اوز کی مدد لے کے سوشل میڈیا کیمپین لانچ کروں گی۔" راحیلہ اپنا لائحہ عمل احمد کو بتانے لگی۔احمد کے چہرے پہ پر اطمینا ن مسکراہٹ بکھری۔یہ سب پرفیکٹ تھا۔

یہ اس کا پلان تھا۔اس طرح سے وہ عافیت زندگی میں بسے ان درندوں کو بھٹکا سکتا تھا۔مگر احمد کے دماغ میں اور بھی بہت کچھ تھا جو وہ کرنے والا تھا۔ابھی تو کھیل محض شروع ہی ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

راحیلہ صدیقی نے این جی اوز کے ساتھ مل کے سوشل میڈیا پہ ایک کیمپین لانچ کی۔ کیمپین کو شہرت ملی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں۔اس کے باوجود یہ شہرت اس مافیا کو کچھ عرصے کے لیے اپاہج کرنے میں کامیاب ہوئی۔سوشل میڈیا کیمپین کے بعد ان سب نے اپنے آفسسز بند کر دیئے اور اپنے سارے سوشل میڈیاز اکاؤنٹ بھی ڈلیٹ کر دیئے۔اور یہی ان سب کی کامیابی تھی۔جو نقصان ان طاقتوں تک پہنچنا تھا، وہ پہنچ گیا تھا۔

یہ راحیلہ سے احمد کی ملاقات کے ایک ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔۔۔

احمد آفس میں اپنے کیبن میں بیٹھا کام کر رہا تھا جب اس کا ایک کالیگ اس کے پاس آیا۔کالیگ نے اسے کہا تھا کہ باس اسے بلا رہے تھے۔

احمد نے اپنا کام سمیٹا اور باس کے کمرے تک گیا۔

آفس میں، اپنی کنٹرول چیئر پہ احمد کے باس براجمان تھے۔ان کے سامنے، احمد سے پشت کیے شمس کھڑا تھا۔احمد نے شیشے میں اس کا عکس دیکھ لیا تھا۔وہ ایک دم سے چونک گیا۔

دفعتاً احمد کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔۔۔مختصر سی معنی خیز مسکراہٹ۔۔۔

"بہت شکریہ اکرام صاحب۔اب آپ مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیں۔" احمد کے باس اپنی کرسی سے اٹھے۔ان کے چہرے پہ برہمی پھیلی ہوئی تھی۔انہوں نے احمد کے اوپر "یہ سب تمہاری وجہ سے

ہو رہا ہے" والی نظر ڈالی، اور کمرے سے رخصت ہو گئے۔دروازہ ٹھپ کی زور دار آواز کے ساتھ بند ہوا۔

شمس اور احمد اب کمرے میں اکیلے تھے۔

کمرے کی فضا تناؤ سے دوچار تھی۔۔۔

احمد چہرے پہ اطمینان لیے کھڑا تھا۔اس کا ہر انداز پرسکون تھا۔وہ شمس کی آنکھوں میں سرد سی نگاہ ڈالے ہوئے تھا۔تناؤ شدید ہوتا گیا۔خاموشی کا بسیرا اس کمرے میں وحشت گھول رہا تھا۔۔۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اس سب سے دور ہو جاؤ! مگر تم اپنی جان کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو لڑکے؟" شمس چبا چبا کے ہر لفظ ادا کرتے بولا۔اس کا کام احمد کو ڈرانا تھا۔

لیکن احمد نہیں ڈرا۔وہ اب بھی پر سکون سا کھڑا رہا۔آنکھوں کی سرد مہری شدید ہوئی۔

"میرا نام۔" احمد نے قدم شمس کی جانب بڑھائے۔شمس تعجب سے اسے دیکھتا رہ گیا۔"احمد یوسف ہے!" وہ ہر لفظ پہ زور دے دے کے بولا۔شمس لاجواب سا رہ گیا۔وہ لڑکا۔۔۔وہ اس سے ڈرتا، اس سے دبتا دکھائی نہ دیتا تھا۔شمس کا حلق تو کیا معدہ بھی کڑوا ہو گیا تھا۔

"دیکھو میں تمہیں۔۔" شمس کہنے ہی والا تھا کہ احمد زور سے ہنس دیا۔شمس متذبذب سا ہو کے ہنستے ہوئے احمد کو دیکھنے لگا۔اس کے الفاظ اس کے حلق میں ہی رہ گئے تھے۔

"تم چپ ہو جاؤ۔تم اپنے وہی گھسی پٹی باتیں کہہ کے ڈرانے کی کوشش کرو گے۔میں تمہارا اور اپنا وقت بچاتا ہوں۔میں نہیں ڈرنے والا۔نہ ہی تم یہاں پہ اپنی مرضی سے آئے ہو، تم مجھ سے اس لیے

مل رہے ہو کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں تمہارا بہت دنوں سے انتظار کر رہا تھا شمس۔" احمد کا انداز تمسخرانہ تھا۔ شمس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔ چہرے کا ہر زاویہ بگڑتا چلا گیا۔ گال سرخ ہو گئے۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" شمس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ احمد کے اوپر تھپڑ برسا دے۔

"میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے ملو شمس۔ بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ اس بات کا اندازہ لگانا تم لوگوں کے لیے مشکل تو نہیں ہو گا کہ راحیلہ صدیقی کو وہ ٹیپ میں نے دی تھی۔ آخر اس آڈیو میں صاف صاف بیچارے عثمان نے احمد بھائی کہا تھا۔ وہ ٹیپ بھلا میں نے کیوں لیک کی شمس؟ کیونکہ میں ان سے بات کرنا چاہتا تھا جن کے احکام تم مانتے ہو۔ میں تمہارے مالکوں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا پیغام ان تک پہنچانا چاہتا تھا۔" احمد کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے کہے جا رہا تھا۔ شمس کے ماتھے پہ نا جانے کتنی سلوٹیں در آئیں۔ اسے سمجھ نہ آیا وہ کیا بولے۔ اس نے بے ساختہ سے انداز میں دو قدم پیچھے بڑھائے۔ اس کے کندھے شل سے ہو گئے تھے۔

"اب تم میری بات چپ چاپ سنو۔ تم یہاں سے جا کے اپنے مالکوں کو سب کچھ بتانا جو میں کہہ رہا ہوں۔ ان سے کہنا کہ۔ احمد سب جانتا ہے! احمد تم لوگوں کے اعضاء کے اس کالے کاروبار کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔" شمس کے اوپر جیسے پہاڑ آ کے گر گیا۔ اس نے دو قدم مزید پیچھے بڑھائے۔ اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

"اور بھی بہت کچھ ہے جس کے بارے میں، میں واقف ہوں۔" احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"اپنے مالکوں سے کہنا کہ' وہ ہیرے بہت ہی خوبصورت تھے۔"شمس کی رنگت سفید سے اب زرد ہوئی۔ہونٹ کپکپانے لگے۔خون خشک ہونے لگا۔۔۔نا ممکن۔۔۔وہ یہ کیسے جانتا تھا؟ شمس کی سانسیں بے ربط ہونے لگی۔

"اگر عبداللہ چوری نہ کرتا تو شاید میں ہی انہیں چوری کر لیتا۔چچ چچ۔" احمد نے مصنوعی افسوس سے سر جھٹکا۔۔۔اوہ خدایا، یہ کیا ہورہا تھا؟ شمس کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔اس کے سر پہ جیسے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔سامنے کھڑا لڑکا اس کی سوچ سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔پہلے شمس کے چہرے پہ خوف ابھرا، اسے واقعتہً اس پچیس سالہ لڑکے سے خوف آرہا تھا۔

وہ الٹے قدم کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد احمد کے باس اندر آئے جو چہرے پہ برہمی لیے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے کچھ کہنے سے پہلے۔" احمد چہرے پہ طمانیت لیے مدھم سی آواز میں بولا۔"میں یہ جاب چھوڑ رہا ہوں۔اللہ حافظ۔" وہ کہتے ہوئے آفس سے نکل گیا۔احمد کے باس کے لب کھلے کے کھلے ہی رہ گئے۔

خس کم جہاں پاک۔۔۔انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لیڈی اقتدار نیلوفر اور شمس کے ساتھ نیلوفر کے آفس میں موجود تھی۔نیلوفر اپنی سربراہی کرسی پہ براجمان تھی جب کہ لیڈی اقتدار اس کی مخالف سمت پوری شان سے بیٹھی ہوئی تھی۔شمس لیڈی

اقتدار کے عقب میں کھڑا ان سب کو کچھ دیر پہلے ہونے والی' احمد سے ملاقات کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

نیلوفر کے چہرے پہ سایہ سا در آیا۔وہ اندر ہی اندر کافی سہم گئی تھی جب کہ لیڈی اقتدار بالکل پر سکون تھی۔چہرے پہ رتی برابر بھی تناؤ نہ تھا۔چہرا برفیلا، انداز بھی برفیلا۔

"اوہ گاڈ! اس کو یہ سب کیسے پتا چلا' لیڈی؟" نیلوفر بالکل کانپ اٹھی تھی۔لیڈی اقتدار نے آبرو اچکائے۔

"بہت عرصے بعد ایک طاقتور فریق ملا ہے۔" وہ برفیلے بے،تاثر سے لہجے میں بولی۔نیلوفر چونک گئی۔ اسے لیڈی اقتدار سے اس طرح کی بات کی امید نہ تھی۔

"وہ صرف اور صرف اپنے بھائی کی وجہ سے ہمارے پیچھے ہے شمس۔خیر تم درانی کو کال کرو اور اسے یہاں آنے کا کہو۔" لیڈی اقتدار نے شمس کے اوپر احکام جاری کیے تو وہ سر کو خم دے کے کمرے سے چلا گیا۔لیڈی اقتدار اور نیلوفر اب کمرے میں اکیلے تھے۔لیڈی اقتدار نے اب گردن نیلوفر کی طرف موڑی۔سرد نگاہیں نیلوفر کی آنکھوں میں گاڑیں۔آنکھیں نیلوفر کا اندر تک ایکس رے لے رہی تھیں۔

"اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس لڑکے کو یہ سب پتا کیسے چلا' نیلوفر۔" لیڈی اقتدار اپنے دماغ میں ہر زاویے پر نظر دہرانے لگی تھی۔"یہ ساری خبریں تو ہسپتال کی بہت حساس خبریں ہیں۔اس ہسپتال میں

داخل ہوئے بغیر یہ خبریں کسی کو مل نہیں سکتیں۔" سرد سی نظریں اب تک نیلوفر کا جائزہ لے رہی تھیں۔نیلوفر ان نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

"میں سمجھی نہیں لیڈی۔"

"بات صاف ہے۔اب وہ خود تو ہسپتال آنے سے رہا۔مجھے شک ہے کہ اس نے ہسپتال کے کسی فرد کو خریدا ہے' جس کے ذریعے وہ یہ کام کر رہا ہے۔" لیڈی اقتدار نے اپنا دائیاں ہاتھ نیلوفر کی ڈیسک پہ رکھا اور گردن نیلوفر کی جانب بڑھائی۔

"مگر پھر بھی لیڈی، یہ ہیروں والا معاملہ ہسپتال کے کسی بھی ایمپلائی کو نہیں معلوم۔" نیلوفر متذبذب سے انداز میں بولی۔

"یہی تو دیکھنے والی چیز ہے نیلوفر۔" لیڈی اقتدار کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ تھی۔"کہ ایسا کون ہے ہمارے درمیان جو اس تک یہ تمام خبریں پہنچارہا ہے۔" نگاہوں میں گھلی سختی میں اضافہ ہوا۔نیلوفر اب کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔۔۔اور جیسے ہی اسے سمجھ آیا، وہ تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"لیڈی۔آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔یہ میں نہیں ہوں۔" نیلوفر نے زور دیتے ہوئے کہا۔وہ جانتی تھی کہ دغابازوں کا یہاں کیا حال ہوتا ہے، اس لیے قدرے خوفزدہ تھی۔لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ برقرار رہی۔

"نیلوفر، اگر کوئی احمد تک خبریں پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔میں تمہیں پڑھ چکی ہوں نیلوفر۔تم سے ہمیشہ مجھے دھوکے کی بو آتی تھی۔تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔" نیلوفر کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار پکڑ لی۔اس نے حلق سے تھوک نگلا۔آنکھوں میں لیڈی اقتدار کے لیے وحشت نمایاں تھی۔

"میں وعدہ کرتی ہوں' یہ میں نہیں ہوں لیڈی۔" نیلوفر گڑگڑانے والے انداز میں گویا ہوئی۔لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا اور کھڑی ہوئی۔

"پانچ دن ہیں تمہارے پاس۔ثابت کرلو کے تم معصوم ہو۔" بس اتنا ہی کہہ کر وہ کسی ملکہ کی طرح وہاں سے چلے گئی۔اس نے نیلوفر کو آگے کچھ بھی بولنے کا موقع نہ دیا۔وہ اسے صفائی دینے کا تو موقع دے دیتی۔۔۔نیلوفر نے سوچا۔

نیلوفر بالکل دنگ رہ گئی تھی۔وہ اتنے مختصر وقت میں اپنی معصومیت کیسے ثابت کر سکتی تھی؟ یہ تو طے تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔وہ بے قصور تھی، اسے اپنی بے قصوری ثابت کرنی تھی۔۔۔نیلوفر سوچنے لگی۔۔۔ہر زاویے پہ نظر دہرانے لگی۔اپنے اوپر منڈلاتی آفت کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔کچھ کچھ تصویر اس کے دماغ میں بھی بن گئی تھی۔۔۔یہ پہیلی اتنی مشکل نہ تھی جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**اگلی رات:**

زینت اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت والی گلی میں چلتے آرہی تھی۔چہرے پہ تھکان تھی اور کندھے بھاری محسوس ہوتے تھے۔بوائے کٹ بالوں پہ جہاں بھر کی گرد تھی۔

یوں ہی گلی میں چلتے چلتے اس کی نظر ایک سفید گاڑی پہ پڑی جو کہ ایک ہی جگہ پہ کھڑی تھی لیکن گاڑی کا انجن کھلا ہوا تھا۔زینت چوکنا سی ہوگئی۔اندر ہی اندر وہ اضطراب میں مبتلا ہوگئی لیکن اس نے اپنا ہر انداز نارمل رکھا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر آئی اس نے ساری کھڑکیاں بند کیں اور پردے برابر کیے۔چہرے پہ اب واضح گھبراہٹ تھی۔اس نے اپنے موبائل پہ تیزی سے انگلیاں چلاتے احمد کو کال ملائی۔کچھ ہی دیر میں احمد نے کال اٹھالی۔

"ہیلو احمد۔ضروری بات کرنی ہے۔" اس کی آواز میں نیم گھبراہٹ تھی۔

"کیا ہوا۔خیریت؟" احمد کی آواز میں تشویش تھی۔

"دیکھو احمد۔مجھے لگ رہا ہے میرا پیچھا کیا جارہا ہے۔بلکہ صرف لگ نہیں رہا،یقین ہے۔" زینت مضطرب سے انداز میں بولی تو احمد کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

"اتنی جلدی؟ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ ایک نہ ایک وقت تعاقب کریں گے مگر اتنی جلدی زینت۔یہ ٹھیک نہیں لگ رہا مجھے۔تمہیں کیا یقین ہے کہ تمہارا تعاقب ہورہا ہے؟" احمد کی آواز میں بوکھلاہٹ تھی۔شروع سے لے کر اب تک سب کچھ اتنا پرفیکٹ جارہا تھا کہ اب کچھ غیر متوقع ہونے پر' دونوں ہی بالکل بوکھلا کے رہ گئے تھے۔

”دیکھو احمد۔اس سب میں میں تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔مجھے یقین ہے میرا تعاقب ہو رہا ہے۔مجھے کوئی پانچویں مرتبہ یہی احساس ہوا ہے۔یہ صرف اتفاق نہیں ہو سکتا۔“ زینت کو احمد کا اس کی بات پر شک کرنا اچھا نہ لگا اس لیے قدرے برہم ہو کے اس پہ برس پڑی۔

”اپنی ایجنسی والوں کو جلد از جلد آنے کا بول دو۔اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”احمد! میں بول دوں گی لیکن ان لوگوں کو وقت ہی لگنا ہے۔اگر میں یہاں سے چلی جاؤں تو؟“

”دیکھو زینت۔تمہارا جانا بھی آسان نہیں ہوگا۔اگر یہ لوگ تم پہ شک کر رہے ہیں تو تمہارا جانا مشکل ہے۔وہ لوگ تمہیں جانے سے پہلے ہی ختم کر دیں گے۔تم فی الحال بس نارمل رہو اور خود کو نارمل ظاہر کرو۔“ زینت بس ٹھنڈی سانسیں لیتے رہ گئی۔اسے اپنے سر کے اوپر واضح خطرہ منڈلاتا نظر آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ زینت نے کہہ کے کال کاٹی اور موبائل بیڈ پہ اچھال دیا۔وہ اب بھی کافی پریشان تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ساری چیزیں کس طرف جا رہی تھیں۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اور اسی طرح سے چار دن مزید گزرے۔۔۔

عافیت زندگی کا ہسپتال رواں رہا۔۔۔

نیلوفر نے اپنی تفتیش جاری رکھی۔۔۔

عافیت زندگی میں بسے باغی کی کھوج جاری رہی۔۔۔

زینت نے بھی یہ پانچ دن بے چینی میں کاٹے۔۔۔

اور اب وہ دن آگیا تھا۔۔۔

لیڈی اقتدار کی طرف سے دی جانے والی ڈیڈ لائن کا دن۔۔۔

لیڈی اقتدار اور نیلوفر ملاقاتی کمرے میں ملے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر اور لیڈی اقتدار بیسمنٹ میں بنے اس ملاقاتی کمرے میں موجود تھے۔نیلوفر گردن جھکائے کرسی پہ براجمان تھی جب کہ لیڈی اقتدار اس کے سامنے گردن اکڑا کے بیٹھی ہوئی تھی۔چہرے پہ سختی تھی۔آنکھیں جیسے برف کی بنی ہوئی ہوں۔

**(احمد بھی اپنے کمرے میں بیٹھے کانوں میں ایئربڈز لگائے، ساری گفتگو سننے میں مصروف تھا۔)**

"میں نے کہا تھا نیلوفر کہ تمہارے پاس صرف پانچ دن ہیں۔تو کیا اتنی مہلت کے بعد تم اپنی معصومیت ثابت کر سکتی ہو؟"لیڈی اقتدار کھنکاری تو نیلوفر نے گردن اٹھائی۔اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔

"لیڈی اقتدار۔میں اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔مگر اس بات نے مجھے بہت تکلیف دی ہے، کہ آپ مجھ پہ بھروسہ نہیں کرتی۔" نیلوفر کا انداز اسپاٹ تھا۔

(احمد غور سے سب سن رہا تھا۔کیا امکان تھا کہ وہ لوگ زینت تک اتنی جلدی پہنچ سکتے تھے؟ کیا اس نے اپنے دشمنوں کو انڈرایسٹیمیٹ کرنے کی خطیر غلطی کی؟ احمد کے دل میں طرح طرح کے خدشات ابھرنے لگے تھے۔دل مزید بے چین ہوتا گیا۔)

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میں واقعی تمہیں دھوکے باز سمجھتی ہوں نیلوفر؟" لیڈی اقتدار استہزائیہ انداز میں کہہ کے ہنسنے لگی۔"اگر میں اس وقت وہ سب نہ کہتی تو تم اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیتی اور نہ ہی اس پورے کھیل کے نچوڑ تک اتنی جلدی پہنچتی جتنا پہنچی ہو۔میں جانتی تھی کہ اگر کوئی اس غدار کو پکڑ سکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔کیونکہ تم اس ہسپتال میں کام کرنے والے ہر ورکر کی باس ہو۔میری حکمت عملی سمجھ آئی؟" نیلوفر کا دل ہلکا ہونے لگا تھا۔وہ لیڈی اقتدار کی بات سے مطمئن ہونے لگی۔ اس نے مسکرا کے سر اثبات میں ہلایا۔

"اب بتاؤ۔کیا تم اس غدار کو پکڑنے میں کامیاب ہوئی؟"

(احمد نے یہ سنتے ہی اپنے آنکھیں بند کیں۔

"زینت نہیں پلیز۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

"پلیز زینت نہیں کہنا۔" وہ ایک مرتبہ پھر بڑبڑایا۔

دل جیسے اندر ہی اندر نچڑ رہا تھا۔۔۔)

ملاقاتی کمرے میں بیٹھی نیلوفر نے اپنے لب کھولے۔۔۔

"زینت۔" نیلوفر کے لبوں سے زینت کا نام ادا ہوا۔

(احمد کے سر پہ سیٹیاں بجنے لگیں۔یہ نام اس کے دل پہ کانٹوں کی طرح چبھا۔ماتھے پہ اس کے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔۔۔اتنی جلدی اس کا بھانڈا کیسے پھوٹ گیا؟ اف۔۔۔وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

اس نے اپنا موبائل نکالا اور زینت کو کال ملائی۔موبائل اسپیکر پہ رکھا۔زینت کو رنگ گئی۔۔۔لیکن اس نے کال نہیں اٹھائی۔احمد کے وجود میں انتشار پھیل گیا تھا۔

"اف مریم کال اٹھاؤ۔" اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔۔)

"صرف سادہ نام کافی نہیں نیلوفر۔مجھے دلیل چاہیے۔" لیڈی اقتدار کی سرد آواز گونجی۔

(احمد اپنے بستر سے اٹھا۔اس نے موبائل جیب میں ڈالا۔وائرلیس ایئر بڈز کی مدد سے، وہ اب بھی دونوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔اس نے دراز سے چابیاں نکالیں اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔وہ زینت کو بچانے خود ہسپتال جانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلا۔۔۔)

"زینت ایک بہت ہی انٹرسٹنگ مُہرا تھی لیڈی اقتدار۔مُہرا اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ' میرا ماننا ہے کہ احمد نے اسے صرف استعمال کیا ہے۔"

(احمد اپنی گاڑی میں بیٹھا اور زینت کو کال ملانے لگا۔وہ اب بھی اس کی کال نہیں اٹھا رہی تھی۔)

"وہ ایک دن اچانک سے ہسپتال آئی تھی، مجھ سے کام مانگنے۔اس کے مطابق اس کے ماں باپ قتل کر دیے گئے تھے۔جس کے بعد وہ انصاف کے لیے تڑپتی رہی۔اور پھر جب اسے انصاف نہ ملا تو اسے انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔اس کی ایم بی بی ایس کی ڈگری بھی آدھی مکمل تھی۔میں نے اس وقت

اس پہ چھان بین کروائی تو اس کی ہر بات سچ ثابت ہوئی۔ میں نے اسے کام دے دیا۔" نیلوفر نے ایک وقفہ لیا۔

"میں نے ایک چیز نوٹس کی تھی لیڈی۔ شمس کو پیٹنے کے بعد احمد نے ہم سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ اس نے کچھ بھی کرنے کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ کچھ تو کرنا چاہئے تھا اسے۔ میں نے اس کلیو کا استعمال کیا۔ احمد اور شمس کے ٹریکر والے واقعے کو چھ ماہ سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اور تقریباً چار ماہ پہلے زینت آئی۔ یہ ممکن تھا کہ زینت کو احمد نے ہی پلانٹ کیا ہو لیڈی۔ مگر اس وقت صرف یہ امکان تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ شاید اس نے کسی پرانے اسٹاف کو خریدا ہو مگر اس کا امکان مجھے کم لگا، پرانے اسٹاف کو خریدنا زیادہ مشکل ہے۔ زینت کچھ مشکوک سی تھی، اپنے آپ کو غریب ظاہر کرنے کے باوجود اس کے بال اتنے پرفیکٹلی بوائے کٹ میں کاٹے گئے تھے۔ یہ کوئی عام بوائے کٹ نہیں تھا، بلکہ بہت مشکل والا تھا جو کہ اچھے سے اچھا ہیئر اسٹائیلسٹ ہی کر سکتا ہے۔ یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے زینت پہ ایک دفعہ پھر سے تفتیش شروع کروائی۔ مگر اس بار کچھ الگ طریقے سے۔" نیلوفر کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔ لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں نیلوفر کے لیے متاثر کن سا تاثر ابھرا۔ وہ جانتی تھی نیلوفر اسے مایوس نہیں کرے گی۔

"اور اس بار تمہیں ایسا کیا ملا نیلوفر؟" لیڈی اقتدار کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

"لیڈی، اس نے کچھ غلطیاں کی تھیں۔ وہ جانتی تھی اس کے بارے میں تفتیش کی جائے گی اس لیے وہ جو ہمیں بتانا چاہتی تھی اس نے وہ سب بہت کھلا چھوڑ دیا۔ جیسے اس کے ماں باپ کے قتل کا کیس۔ اس کا میڈیا میں جانا۔ یہ سب اس نے جیسے ہمارے لیے پلیٹ میں سجایا۔ مجھے اس چیز کا اندازہ ہوا اور

اب کی بار میں نے گہری چھان بین کروائی۔ اور پھر مجھے کیا پتا چلتا ہے کہ زینت چار ماہ پہلے امریکہ سے پاکستان آئی تھی۔ یہ جاننا بہت مشکل تھا۔ وہ ڈیٹا کلین کر چکی تھی مگر کچھ سی سی ٹی وی فوٹیجز کا شکریہ کہ وہ پکڑی گئی۔" نیلوفر نے خوشدلی سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

**("اوہ خدایا۔" احمد گاڑی کا ایکسلریٹر زور سے دباتے بولا۔ وہ لوگ واقعی بہت آگے پہنچ چکے تھے۔ اس نے سوچا۔)**

"یہ ایک بڑا ثبوت تھا لیڈی۔ جس نے زینت کا کردار مشکوک کر دیا تھا۔ مگر میں نے وہاں بس نہ کی۔ میں نے اس کے بعد اور بھی چھان بین کی۔ اب کی بار میں نے زینت کے بجائے احمد کی چھان بین کی۔ میں نے دونوں کا تعلق دریافت کرنا چاہا۔ مجھے یہ بھی شک ہونے لگا تھا کہ اس کی ایم بی بی ایس والی بات بھی جھوٹ تھی۔ میں نے ہر زاویے پہ چھان بین کی۔ مجھے احمد کی یونیورسٹی سے کچھ ڈیٹا ملا، زینت کا اصل نام مریم تھا اور وہ احمد کی یونی ورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کی پرانی تصویروں سے میں نے اسے پہچان لیا۔ اس وقت بھی اس کے بال ایسے ہی تھے، چھوٹے چھوٹے۔" نیلوفر اب خاموش ہوگئی۔ اس نے ہر دلیل پیش کر دی تھی۔ اس کا کام ختم تھا اور ساری بات صاف تھی۔ لیڈی اقتدار مسکرا کے سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"اور تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا تعلق ہے دونوں کا؟" لیڈی اقتدار کو نیلوفر کی تھیوری سننی تھی۔

"یقیناً دونوں گہرے دوست ہوں گے۔ اس ہی لیے وہ احمد کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔" لیڈی اقتدار نے گردن نفی میں ہلائی۔

"اہاں! اس سے بھی بڑھ کے ہے نیلوفر۔ مگر فی الوقت یہ اہم نہیں۔ ابھی یہ اہم ہے کہ اسے' اس دھندے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟ اور وہ احمد تک یہ خبریں کیسے پہنچا رہی تھی۔" لیڈی اقتدار سوچ میں پڑ گئی۔

"اس کے بارے میں بھی میں نے بہت سوچا تھا۔ اور مجھے اس کا صرف ایک ہی جواب نظر آیا: وہ ہے عائشہ۔ وہ زینت کی سب سے پکی دوست تھی۔ مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوگی اگر عائشہ جیسی بے وقوف عورت نے اسے ہر ایک راز بتا دیا ہو۔ اس سے ایسی امید کی جا سکتی ہے۔" نیلوفر الفاظ میں کڑواہٹ لیے بولی تھی۔

"اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے پتا چل گیا ہو کہ اس ملاقاتی کمرے تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور پھر یہاں پہ آکے اس نے کچھ کیا ہو۔ کوئی ڈیوائیز وغیرہ سیٹ کی ہو۔" لیڈی اقتدار کے دماغ میں تصویر بننے لگی تھی۔ "احمد ایک سافٹ ویئر ڈیولپر ہے۔ مجھے حیرت نہیں ہو گی' اگر وہ ٹیکنالوجی کا استعمال کرے۔ اگر ہم سو فیصد درست نہیں تو کچھ حد تک تو ہمارا اندازہ درست ہو گا ہی۔ اور اس زینت کو ہمیں ختم کرنا ہو گا۔" لیڈی اقتدار اٹل سے انداز میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے نیلوفر کے چہرے پہ سایہ سا گزرا۔ دل میں کچھ ہل چل سی مچی۔ لیکن اس نے ہر ہل چل کو نظر انداز کیا۔ واپسی نا ممکن تھی، واپسی نا ممکن تھی۔۔۔ وہ خود کو یاد دلانے لگی۔

"عائشہ کو بلواؤ نیلوفر۔" حکم جاری کر کے لیڈی اقتدار نیلوفر کو دیکھنے لگی جو کہ فون پہ کسی کو ہدایات دینے لگی تھی۔

کچھ دیر میں عائشہ ملاقاتی کمرے میں آئی۔اس کے چہرے پہ گھبراہٹ تھی اور وہ اندر سے ڈری بھی ہوئی تھی۔وہ بغور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔عائشہ کو دیکھتے ہی لیڈی اقتدار کی نظروں میں حقارت ابھری۔اس نے اوپر سے نیچے تک پچاس سالہ عائشہ کا سرسری جائزہ لیا۔

"میں اس کو دیکھ کے ہی بتا سکتی ہوں کہ اسی نے سب کچھ باہر نکالا ہے۔" لیڈی اقتدار نے نیلوفر سے تبصرہ کیا۔عائشہ لا سمجھی سے لیڈی اقتدار کو دیکھنے لگی۔

"تم جانتی ہو زینت کو؟" لیڈی اقتدار عائشہ کی طرف مڑی۔اس کے چہرے پہ نمکین سا تاثر تھا۔عائشہ نے سر اوپر نیچے ہلایا مگر بولی کچھ نہیں۔"دوست تھی تمہاری؟" عائشہ ایک بار پھر سر اثبات میں ہلا گئی۔

لیڈی اقتدار گہری سانس لیتے کھڑی ہوئی۔وہ ہاتھ باندھ کے سیدھا عائشہ کو دیکھنے لگی۔آنکھوں میں تپش بھری ہوئی تھی۔عائشہ کی نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔وہ ملکہ کا سامنہ نہیں کر سکی۔

"کیا تم نے اسے بتایا تھا کبھی' کہ ہمارا کاروبار کس چیز کا ہے؟ کیا تم نے کبھی اسے اس ملاقاتی کمرے کے بارے میں بتایا؟" عائشہ کے ماتھے پہ لکیریں ابھریں۔کیا اس نے کچھ غلط کیا تھا؟ اس کا سر مزید جھک گیا۔

"دیکھو اگر تم نے اسے کچھ بتایا بھی ہے تو صاف صاف بتا دو۔میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔" لیڈی اقتدار نے انداز بالکل نرم کر دیا۔عائشہ کچھ بے چین ہونے لگی۔اس نے سست روی سے گردن اوپر نیچے ہلائی۔لیڈی اقتدار کے نرم تاثرات فنا ہوئے۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عائشہ کو گردن

سے دبوچ لے۔اس کی روح پہ جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔وہ عائشہ کو اسی وقت زمین میں گاڑ دینا چاہتی تھی۔

ملکہ نے گہری سانس لیتے اپنے آپ کو نارمل کیا۔فی الحال جذباتی ہونے کا وقت نہیں تھا، اور وہ یہ جانتی تھی۔

"تمہاری دوست تمہیں دھوکہ دیتی رہی ہے عائشہ۔" عائشہ کی آنکھیں چھوٹی ہوئیں۔وہ لیڈی اقتدار کو نا سمجھی سے دیکھنے لگی۔"اتنے عرصے سے وہ تمہیں استعمال کرتے آئی ہے۔بس استعمال۔" عائشہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔زینت کبھی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔اور وہ جانتی تھی۔

"نہیں لیڈی۔زینت ایسی نہیں ہے۔" عائشہ پورے اعتماد سے بولی۔لیڈی اقتدار کے چہرے پہ حقارت بھری مسکراہٹ پھر سے بکھری۔"اس نے تمہاری معصومیت کا فائدہ اٹھایا عائشہ۔" عائشہ تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔ناممکن۔۔۔ناممکن۔۔۔یقینا انہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔عائشہ نے سوچا۔

"نہیں لیڈی۔آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" عائشہ کو اپنی دوست کے اوپر اٹھایا جانے والا انکشاف اچھا نہیں لگا۔

"وہ ہمارا کاروبار برباد کرنے آئی ہے عائشہ۔وہ تم سے ساری معلومات لے کے کسی اجنبی کو پکڑاتی رہی ہے، جو کہ ہم سب کو برباد کرنے کا عزم رکھتا ہے۔تم پچھلے کئی ماہ سے اس کے ہاتھوں بیوقوف بنتی رہی ہو۔" عائشہ کو اپنا دل بکھرتا محسوس ہو رہا تھا، وہ قطعاً اس سب پہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔

زینت ایسا نہیں کر سکتی تھی۔وہ تو اس کی پکی دوست تھی۔وہ اسے دھوکا کیسے دے سکتی تھی۔عائشہ نے سوچ کے سر جھٹک دیا۔

"ہاں عائشہ یہ سچ ہے۔" نیلوفر بھی اب بول اٹھی۔"ہمارے پاس ثبوت ہیں۔وہ کسی اور کے لیے کام کر رہی ہے۔اس نے آپ کی معصومیت کا صرف فائدہ اٹھایا ہے۔" نیلوفر کے انداز میں تھکان تھی۔ عائشہ کا چہرہ بالکل بجھ گیا۔اس کا دل اس بات پہ یقین کرنے سے قاصر تھا۔وہ آنکھوں میں کرب لیے اور بھی زور سے سر نفی میں ہلانے لگیں۔دائیں آنکھ سے ایک اور آنسو نکلا۔

"تم اپنی بیوقوفی کی وجہ سے اس لڑکی کے ہاتھوں استعمال ہوتی رہی۔" لیڈی اقتدار نے تالی پیٹی اور زور سے ہنسنے لگی۔عائشہ کے کانوں میں یہ ہنسی چبھنے لگی۔وہ لوگ بھلا کیسے اس کی پکی دوست پہ یہ الزام لگا سکتے تھے؟ زینت اسے استعمال کیوں کرے گی؟ اس کا دل سوچ سوچ کے مرجھانے لگا۔

"تم سب چھوڑو عائشہ۔جا کے زینت کو یہاں لے کے آؤ۔اور خود دیکھ لینا کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔" لیڈی اقتدار دوبارہ سے کرسی پہ آ کے بیٹھ گئی۔عائشہ اب بھی بالکل بوجھل تھی۔

دوست سے دھوکہ کھانے کا کرب بہت گہرا تھا، یہ زخم بھی مہلک تھا۔۔۔لا علاج سا۔۔۔اسے اپنا دل ان گنت حصوں میں بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔جیسے کسی کانچ کی شے پہ ہتھوڑے برسائے ہوں۔

"جاؤ۔" لیڈی اقتدار نے دوبارہ کہا تو عائشہ چونک گئی۔وہ مڑ کے ملاقاتی کمرے سے باہر نکلی۔

وہ لفٹ کے ذریعے اسٹور روم میں واپس لوٹی۔اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔وہ چلتے چلتے بغیر آواز کے روئے جا رہی تھی۔اس نے ایک شیلف کا رخ کیا اور اس میں سے ایک ڈبا اپنے ہاتھ میں تھاما۔

ڈبے میں سرجکل سرنج تھیں جو کہ بہت ہی نوکیلی تھیں۔وہ سرنج کو آنکھوں کے سامنے رکھے انہیں گھورنے لگی۔آنکھوں میں گہرا کرب جھلکتا تھا۔اس نے اب ایک دوسرے شیلف کا رخ کیا۔ہاتھ بڑھا کے ایک بوتل نکالی۔بوتل کا ڈھکن کھول کے سرنج کے نوکیلے حصے کو اس میں ڈبویا۔بوتل میں موجود مادہ زہر کا تھا۔۔۔بہت ہی طاقتور زہر۔عائشہ نے سرنج اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی۔چہرے پہ پھیلی نمی ہاتھوں سے رگڑی۔آنکھوں میں جنونیت اور'دنیا سے الگ جست لیے وہ اسٹور روم سے باہر جانے لگی۔

"اگر واقعی تم نے مجھے استعمال کیا ہے زینت، تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔اس کے انداز سے انگارے برستے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"اور اس زینت کو ہمیں ختم کر دینا ہوگا۔"

احمد یہ سنتے ہی بری طرح سے بوکھلا گیا تھا۔اسے اپنا پورا پلان فلاپ ہوتا دکھائی دینے لگا۔وہ اس سب کی امید نہیں کر رہا تھا۔مگر اب وہ کیا کرے۔اس نے اپنے ایئربڈز کھینچ کے اتارے اور ایک بار پھر سے زینت کو کال ملانے لگا۔وہ بار بار زینت کو کال ملائے جارہا تھا۔مگر زینت کال ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔وہ اس وقت اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔کوئی بھی شہ اس کے ہاتھ میں نہ تھی، جو تھا وہ بھی پھسلے جا رہا تھا۔

احمد نے ایک دفعہ پھر سے کال ملائی۔اب کی بار' خوش قسمتی سے زینت نے کال اٹھا لی۔وہ اتنی دیر سے آپریشن تھیٹر میں مصروف تھی اس لیے اس کی کال نہیں اٹھا سکی۔اس نے جب دیکھا کہ احمد اسے اتنی کالز کر چکا تو وہ بھی کافی پریشان ہو گئی تھی۔

"زینت تمہیں وہاں سے بھاگنا ہو گا'اسی وقت!" احمد نے اپنا ہر انداز عام رکھنا چاہا لیکن چاہ کر بھی وہ اپنی آواز میں فکرمندی اور وحشت نہ چھپا سکا۔

"آخر کیوں؟" زینت بری طرح سے الجھ گئی۔احمد کا انداز اسے لال جھنڈے دکھا رہا تھا۔

"ان لوگوں کو ہر ایک چیز پتا چل گئی ہے زینت۔میں کب سے کالز کر رہا تھا۔میں بس عافیت زندگی پہنچنے ہی والا ہوں، تم بس باہر نکلو۔میں تمہیں کسی محفوظ مقام پہ لے جاؤں گا۔" زینت کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلنے لگیں۔اس سے پہلے تو احمد کے الفاظ ہضم نہ ہوئے۔لیکن پھر دور سے اسے عائشہ نظر آئی جو اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔زینت عائشہ کا ہر ایک انداز پہچان سکتی تھی۔۔۔یقیناً گڑبڑ تھی۔وہ فوری سمجھ گئی تھی۔

"اف احمد۔میں کہاں بھاگوں؟" زینت پریشان ہو گئی تھی۔

"کہیں بھی۔بس چھپ جاؤ۔میں بس پہنچنے ہی والا ہوں۔" احمد نے کال کاٹ دی۔عائشہ اب زینت کے بالکل سامنے کھڑے ہو کے اسے گھوری سے نواز رہی تھی۔زینت نے فون اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔عائشہ کی آنکھوں میں شکایت، غصہ، اور غم۔۔۔زینت کو بہت کچھ بتا رہا تھا۔۔۔

"تمہیں لیڈی اقتدار بلا رہی ہیں۔وہ نیچے تمہارے انتظار میں ہیں۔" زینت ایک دم سے برف کی بن گئی۔

وہ اب کیسے بھاگتی؟ بھاگ کے کہاں جاتی؟ اور وہ اس ساری صورتحال سے کیسے نکلتی۔زینت اپنے دماغ پہ زور دینے لگی۔اس نے جبراً مسکرا کے عائشہ کو دیکھا۔

"تم چلو میں آرہی ہوں۔" زینت نے کہا۔عائشہ نے گردن نفی میں ہلائی اور ایک جھٹکے میں زینت کا بازو تھام لیا۔اس کے چہرے پہ تکلیف بھرا تاثر تھا۔زینت بالکل دنگ رہ گئی۔عائشہ کے اندر یہ تبدیلی اسے سب کچھ بتا رہی تھی۔ان لوگوں نے یقینا عائشہ کو بھی اس کے خلاف کر لیا تھا۔وہ جان گئی تھی۔

"تم میرے ساتھ جاؤ گی۔" عائشہ نے چبا چبا کے زینت کے کان میں سرگوشی کی۔زینت نے آنکھیں میچ لیں۔اس کو سب دروازے بند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

"واشروم میں میرے ساتھ جا کے، بس ایک دفعہ میری بات سن لو۔میں وہاں سے کہیں نہیں بھاگ سکوں گی۔" زینت کو بس یہی ایک راستہ نظر آیا۔

وہ عائشہ کو ایک بار پھر سے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔عائشہ نے کوئی احتجاج نہ کیا اور اسے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔زینت چلنا شروع ہوئی اور عائشہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔دونوں واش روم میں داخل ہوئے۔واش روم کا ہر کیبن خالی تھا۔زینت نے آتے ہی دروازہ لاک کیا اور نلکا کھول دیا تاکہ ان کی آواز باہر نہ جا سکے۔

عائشہ اور زینت بالکل آمنے سامنے تھے۔ایک دوسرے کے عین مقابل۔زینت کے چہرے پہ واضح خوف و پریشانی تھی، جب کہ عائشہ کے چہرے پہ صرف کرب۔۔۔صرف اور صرف کرب۔

”تم سچ سچ بتاؤ۔کیا تمہیں کسی نے بھیجا ہے زینت؟ کیا واقعی تم کسی اور کے لیے کام کر رہی ہو؟“ عائشہ نے اپنے شک کی تصدیق چاہی۔وہ دل ہی دل میں اسی چیز کی خواہش رکھتی کی زینت ناں کہہ دے۔زینت نے کچھ دیر کے لیے گردن جھکا لی اور پھر سے گردن اٹھائی۔

”ہاں میں واقعی کسی اور کے لیے کام کر رہی ہوں۔مگر عائشہ ہم یہاں سے جا سکتے ہیں۔تمہیں مجھے لیڈی اقتدار کے پاس لے کے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ عائشہ نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔اس کی آنکھوں سے ایک اور آنسو نکلا۔تو وہ لوگ واقعی سچ کہہ رہے تھے۔زینت واقعی اسے استعمال کرتی آئی ہے۔زینت اس کے حساس جذبات کا استعمال کرتے آرہی ہے۔عائشہ کو اس وقت خود سے نفرت ہونے لگی، خود سے زیادہ زینت سے نفرت ہونے لگی۔وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگی۔اس کے ہونٹ اندر کی طرف مڑ گئے۔

”میرا یقین کرو عائشہ۔تم بھی اس ہسپتال سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لو گی۔تم میرے ساتھ چلو۔پلیز۔“ زینت اسے منانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔لیکن عائشہ اس وقت گہرے غبار میں تھی۔غصے نے اسے کے وجود کو گھیر لیا۔اس کی روح جیسے کانٹوں کے بیچ میں آگئی ہو۔اس کا تنفس مزید تیز ہوا۔غصہ اس کی روح کو جکڑتا گیا۔۔۔جسم کا درجہ حرارت بڑھنے لگا اور چہرہ سرخ پڑنے لگا۔

عائشہ ٹھان چکی تھی کہ وہ۔۔۔وہ کرکے ہی دم لیگی۔

اس کی آنکھیں سرخ پڑی۔۔۔چہرے پر جنونیت گھیرے ہوئے تھی۔

زینت اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے گئی۔۔۔جو وہ کرنے والی تھی، وہ اس چیز کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

عائشہ کے ہاتھ اس کی کوٹ کی جیب میں گئے۔

اور وہ تیزی سے زینت کی طرف بڑھی۔

اس نے مٹھی میں بھینچی قینچی سے زینت کے پیٹ پہ پوری قوت سے وار کیا۔

زہر آلود قینچی نے زینت کے کپڑوں کو چیرا۔۔پھر اس کی کھال کو۔۔۔پھر اس کے گوشت کو۔

قینچی کی نوکیلی دھار اس کے جسم کی زینت بنی۔

وہ اس کے جسم کا جیسا حصہ بن گئی تھی۔وہ اس کے جسم میں زہر کے ذرات چھوڑ گئی تھی۔۔۔

زینت کا سر چکرانے لگا تھا مگر پھر بھی وہ اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھی۔

عائشہ نے قینچی زینت کے جسم سے نکالی۔تکلیف کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔دونوں خون میں نہانے لگی تھیں۔ایک دفعہ پھر سے عائشہ' زینت کے اوپر وار کرنے لگی۔زینت تکلیف کی شدت کے باوجود ٹوٹی نہیں، وہ اپنے جسم میں دوڑتی ان تکلیف بھری لہروں کو مقابلہ کرتے عائشہ کے وار کو روکنے لگی۔ اس نے عائشہ کا قینچی والا ہاتھ تھام لیا۔وہ آخری وقت تک مقابلہ کرنا جانتی تھی۔

زینت نے عائشہ کے ہاتھ سے قینچی چھینی۔دانت پیستے پوری قوت سے عائشہ کی گردن پہ وار کیا۔قینچی اب عائشہ کی گردن پہ بھڑکتی نسوں کو چیرتی گلے کے اند داخل ہوئی۔عائشہ کے حلق سے عجیب و غریب سی آوازیں آنے لگیں۔خون کا ایک فوارہ اس کی گردن سے پھوٹا۔وہ وار ایسا تھا کہ اگلے لمحے ہی عائشہ کی جان نکل گئی۔تڑپتا جسم ساکن ہوا اور وہ زمین پہ ڈھیر ہو گئی۔

زینت پھولتی سانسوں کے ساتھ سب دیکھ رہی تھی۔اس کے وجود میں شدت بھری تکلیف سوار تھی۔آنکھوں کے سامنے ہر سو ہر دم دھند چھا رہی تھی مگر وہ اپنے آپ کو گرنے نہیں دے سکتی تھی۔وہ جانتی تھی جس وقت وہ گر گئی اس وقت وہ یہ جنگ ہار جائے گی۔وہ اتنی جلدی ہارنے والوں میں سے نہ تھی۔زینت کے کوٹ میں موجود موبائل تھرتھرایا۔اس نے خون آلود ہاتھوں سے کال اٹھائی۔

"میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔" احمد نے کہا اور کال کاٹ دی۔

زینت کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ یہاں سے ہسپتال کے باہر تک کا سفر کیسے طے کرتی۔ہمت جمع کرتے وہ واشروم سے باہر نکلی۔سب کی نظریں اس کی طرف بڑھی۔وہ خون میں لت پت تھی۔زینت جتنا تیز ہو سکتا تھا اتنا تیز جانے لگی۔اس کی چال بہت کمزور تھی۔کمر نیچے کی طرف جھکنے لگی تھی۔وہ اپنے آپ کو بار بار گرنے سے روک رہی تھی۔

راہداری کی دوسری طرف سے نیلوفر آنے لگی۔وہ زینت کی زخمی حالت دیکھ کے فوراً سمجھ گئی تھی کہ یہاں کیا ہوا۔وہ حواس باختہ سے عالم میں واشروم تک بڑھی جہاں ہسپتال کا سارا اسٹاف موجود تھا۔عائشہ کی لاش دیکھ کے نیلوفر کے چہرے پہ افسوس در آیا۔

اسے زینت ہسپتال کے دروازے تک جاتی نظر آئی۔ہسپتال کا کچھ اسٹاف زینت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”زینت کو جانے دیا جائے۔کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“ نیلوفر نے چلا کے حکم جاری کیا تو اسٹاف اپنی جگہ تھم گیا۔

زینت نے پیچھے مڑ کے نیلوفر کی آنکھوں میں دیکھا۔وہ نیلوفر کی گہری آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔وہ انہیں پڑھ سکتی تھی۔وہ آنکھیں جیسے اس سے معافی مانگ رہی تھیں۔

زینت اب مڑ کے واپس باہر جانے لگی۔اس کی ترجیح اپنی جان بچانا تھی۔اسے بس احمد کی گاڑی تک پہنچنا تھا۔

نیلوفر کا موبائل بجا تو اس نے کال اٹھائی۔

”نیلوفر اتنی دیر کیوں ہو گئی۔“ فون کے اس پار سے لیڈی اقتدار کی آواز گونجی۔

”آپ فکر نہ کریں لیڈی۔وہ نہیں بچ سکے گی۔عائشہ نے اسے ایسے گھاؤ لگائے ہیں کہ وہ فوراً ہی مر جائے گی۔وہ ہمیں پریشان نہیں کرے گی۔“ وہ بے تاثر لہجے میں بول کے ایک دفعہ پھر سے عائشہ کی لاش کی طرف متوجہ ہوئی۔چہرے پہ بے پناہ افسوس تھا۔آنکھیں جیسے معذرت خواہ تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زینت جب باہر آئی تو احمد اپنی کلٹس کے باہر مضطرب سا کھڑا تھا۔وہ زینت کے جسم سے خون بہتا دیکھ کے اندر تک تڑپ اٹھا۔وہ زینت کی طرف تیزی سے لپکا۔اس کا ہاتھ تھام کے اسے اپنی گاڑی تک لے کر آنے لگا۔اس نے پچھلی نشست کی سیٹ کھولی اور زینت کو گاڑی میں بیٹھایا۔

زینت کی گاڑی تک پہنچتے پہنچتے بس ہو گئی تھی۔اس کا وجود نچوڑنے لگا تھا۔اس کے اندر تکلیف کی لہریں ابھر رہیں تھیں اور اس کی توانائی ختم ہونے لگی تھی۔احمد آگے والی نشست پہ بیٹھا اور گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔دل سے ایک آواز آرہی تھی کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔یہ آواز اسے اندر تک ملامت کرنے میں کامیاب ہورہی تھی۔وہ ہر گزرتے وقت کے ساتھ مزید بے چین ہوتا گیا۔

زینت سے' دوسری طرف تکلیف برداشت نہیں ہو رہی تھی۔خون بہت بہہ گیا تھا اور اب اس کی توانائی ختم ہونے لگی تھی۔زہریلا مادہ اس کے اعضاء کو ناکارہ کرنے لگا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا میں بچ پاؤں گی احمد۔"ایسے لگتا تھا جیسے وہ بہت جد و جہد کرکے بول رہی تھی۔اس کے ہونٹ بھی سفید پڑنے لگے تھے۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ہم تمہیں قریب کے ہسپتال لے کے جائیں گے۔" احمد نے انداز عام رکھا۔مگر اندر اس کا دل اچھل کود کر رہا تھا۔

"میں خوش ہوں احمد۔میں اپنے انجام سے مطمئن ہوں۔مجھے خوشی ہے کہ میں ایک عظیم مقصد حاصل کرتے مروں گی۔" احمد کا دل اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔وہ چہرے پہ بے چینی لیے وقتاً فوقتاً فرنٹ مرر سے اس پہ نظر ڈالتا رہتا۔زینت کی گزرتے وقت کے ساتھ حالت بگڑتے جا رہی تھی۔احمد کی امیدیں بھی مندمل ہونے لگی تھیں۔

کچھ ہی دیر کے سفر کے بعد گاڑی ہسپتال پہنچ گئی تھی۔احمد نے پاؤں سے زور دیتے بریک دبایا۔گاڑی مخصوص آواز کے ساتھ ہسپتال کے باہر رکی۔احمد تیزی سے اپنی سیٹ سے اترا۔اس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔زینت اونچی اونچی سانسیں لے رہی تھی، لیکن اس کا چہرہ۔۔۔وہ پر سکون تھا۔

"چلو زینت۔ہسپتال آگیا ہے۔" احمد نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔زینت یوں ہی اسے دیکھتے گئی۔اور یوں ہی وہ مسکرا دی۔۔۔مسکراہٹ میں اس کے اندر بسی تکلیف نمایاں ہو رہی تھی۔احمد کے دل پہ خنجر برسنے لگے۔

"میرا وقت آرہا ہے احمد۔سب نا سد ہے۔میں جا رہی ہوں۔" زینت کی آواز اب اور بھی کمزور پڑی۔

"سب چھوڑو'اور چلو۔" احمد زور سے بولا۔زینت کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔اس کے اندر ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔وہ اس دنیا سے دوسری دنیا کا سفر طے کرنے کے لیے تیار تھی۔

"مجھے یاد تو کرو گے ناں، عبدالحمید؟" وہ بولی۔احمد آنکھوں میں بے یقینی لیے اسے دیکھنے لگا۔

اور پھر زینت کی آنکھیں بڑی ہونے لگیں۔وہ تکلیف سے سسکنے لگی۔ اس کے چہرے پہ شدت بھری تکلیف نمایاں ہونے لگی۔وہ لمحے بھر کو تڑپی، اس کا جسم لرزا۔اس کی آواز لڑکھڑائی۔اور پھر وہ ساکن پڑ گئی۔وہ ڈھیلی پڑ گئی۔اس کے جسم نے حرکت کرنا بند کر دیا۔وہ جا چکی تھی۔۔۔بہت دور۔۔۔

وہ جو آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے کا عزم رکھتی تھی۔۔۔

وہ آج آسمانوں سے اونچی اڑان بھر چکی تھی۔۔۔

احمد کی آنکھیں خوف سے لبریز تھیں۔اس کا دل کپکپا رہا تھا۔

وہ ایسے نہیں مر سکتی تھی۔وہ یوں اس کے دل پہ یہ بوجھ چھوڑ کے نہیں جا سکتی تھی۔وہ سوچ سوچ کے سر نفی میں ہلانے لگا۔۔۔یہ بوجھ۔۔۔یہ دباؤ۔۔اسے جیسے کھانے کو دوڑ رہا تھا۔۔۔وہ تڑپ اٹھا تھا۔۔وہ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ایک اور انسان کو اس دنیا سے جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔وہ یوں اپنے آپ کو ہارتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔۔وہ ٹوٹنے لگا تھا۔۔آنکھوں کے سامنے اس کے اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔۔

ہار نہ مانو۔۔

خوفزدہ نہ ہو۔۔

تم اب تک ڈر کو مات دیتے آئے ہو۔۔،

تم اب تک اپنے زخموں کا مرہم خود بنتے آئے ہو،

اس عدم یقینی کے باوجود بھی تم ٹوٹے کبھی نہیں،

تم تھکے کبھی نہیں۔۔

ہاں! تم اپنے پیروں پہ کھڑے ہو سکتے ہو،

امید کی کرنیں مندمل ضرور ہوئی ہیں۔۔،

لیکن سرے سے ختم نہیں ہوئیں۔

ہار نہ مانو۔۔،

خوفزدہ نہ ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ماضی کی داستان کو' فی الحال کے لیے ادھورا چھوڑ کے حال کے وقتوں میں واپس آتے ہیں۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔وہ سادگی سے اسٹیئرنگ وہیل کو دیکھے جارہا تھا۔چہرے پہ خالی پن تھا

اور آنکھیں ویران تھیں۔

دوسری طرف مہر اپنی آنکھوں میں شاق اور حیرانی لیے احمد کو دیکھ رہی تھی۔اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔اسے بھی اس کی تکلیفیں سن کے تکلیف ہورہی تھی۔گاڑی کے ماحول میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔ اے سی کے باعث ٹھنڈی فضامیں گہرا رنج مغموم تھا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"احمد نے خاموشی کو توڑنا چاہا۔آواز بے تاثر تھی۔"میں صرف اس لیے یہ سب بتا رہا ہوں تاکہ تم مجھے سمجھ سکو۔میں اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، نہ ہی میں کبھی چاہوں گا کہ تم مجھے مظلوم تصور کرو۔میں اپنی نظروں میں بہت معتبر ہوں۔" آواز اب بھی ویران تھی۔مہر نے سر اثبات میں ہلایا۔اسے واقعی کسی کے تسلی بخش الفاظ کی ضرورت نہیں تھی، اور مہر جانتی تھی۔

”اور یہ کیمرا؟ یہ فشنگ۔ یہ سب کیا ہے؟“ مہر نے اپنے گلے پہ لگے نیکلیس کو چھوا۔ اب کی بار احمد مسکرایا۔ وہ کافی دیر بعد مسکرا رہا تھا۔ مہر بھی جواباً مسکرائی۔

”مناج۔ اس نے ہماری مدد کی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ نظر مہر پہ ڈالی جس کی نگاہیں اس سے مزید تفصیلات طلب کر رہی تھیں۔ احمد نے بھی، اسے سب کچھ بتانا شروع کیا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم اسی رات میں واپس جاتے ہیں، مہر اور احمد کی دبئ میں پہلی رات۔۔۔ احمد پول ایریا سے واپس اپنے کمرے میں آیا تھا۔۔ منظر کو اس سے آگے سے جاری رکھتے ہیں۔۔۔

وہ جب پول ایریا سے واپس آیا تو اس کا دماغ تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ اب آگے کا لائحہ عمل بنانے کے لیے تیار تھا۔ اسی میں اس کے دماغ میں کچھ سوجنے لگا۔ اس نے سب کچھ جھڑک کے در فشاں کو ایک بار پھر سے کال ملائی۔ وہ جانتا تھا۔۔ وہ اس سے تمیز سے بات نہیں کرنے والی تھی اور اس کے صبر کو بھی بلا شبہ آزمائے گی لیکن مہر کے لیے' اسے در فشاں کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی در فشاں نے کال اٹھا لی۔

”مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ بڑی بہن ہوں تمہاری۔ بات کرنے کی تمیز سیکھو' احمد۔“ در فشاں نے فون اٹھاتے ہی احمد کو سنا دی۔ احمد کو تپ چڑھنے لگی تھی مگر فی الحال اسے درے سے ایک کام نکلوانا تھا' اس لیے اپنے آپ پہ قابو رکھا۔

"آپا مجھے اپنی لائر دوست کا نمبر دو۔ جلدی۔" احمد نے انداز ایسا بنایا جیسے دونوں کا ایک گھنٹے پہلے کوئی جھگڑا ہوا ہی نہ ہو۔ درے کا غصہ لیکن اب بھی نہ اترا تھا۔

"میں تم سے بات تک نہیں کرنے والی احمد۔ تمہیں بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز آنی چاہئے۔" در فشاں برہم ہو کے پھر سے برس پڑی۔ احمد ٹھنڈی سانس لیتا رہ گیا۔ اس کے اچھے موڈ کو در فشاں نے اچھی طرح سے غرق کر دیا تھا۔

"پلیز آپا۔ تھوڑا ضروری ہے' دے دو۔" احمد نے نرمی اختیار کی۔ درے اب کچھ کڑوا نہیں کہہ سکی۔ اس نے غصے سے تلملا کے کال کاٹ دی۔ اس حرکت پہ احمد کے اعصاب تن گئے۔

"یہ سمجھتی کیا ہے خود کو؟" احمد غصے سے زیر لب بڑبڑایا۔ وہ درے کو اوپر سے لگی لپٹی سنانے کا ارادہ کر کے اسے کال کرنے ہی لگا تھا کا اسے درے کا واٹس ایپ پہ میسج موصول ہو گیا۔ وہ تھم گیا۔ وہ اسے مناج کا نمبر دے چکی تھی۔ احمد مدھم سا مسکرایا اور بے اختیار ہنس دیا۔ اس کی آپا کبھی نہیں سدھر سکتی تھی۔ اس نے سوچا۔

احمد نے اب سیدھا مناج کو کال ملائی۔ کچھ ہی دیر میں مناج نے کال اٹھا لی۔

"السلام و علیکم مناج۔ میں احمد، در فشاں کا بھائی۔" مناج اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک دم سے چوکنا

ہو گئی۔

"مجھے نمبر درے آپا سے ملا تھا۔ دراصل بہت ضروری بات کرنی تھی میں نے۔" احمد کا انداز موؤدب تھا۔

مناج نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی بولئے۔ میں کیسے مدد کر سکتی ہوں۔" مناج خوشدلی سے بولی۔ درے اس کی لائف سیور تھی۔ وہ اس کے بھائی کے لیے، کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

"اگر کوئی منی لانڈرنگ کرے۔ تو کن صورت حال میں اسے سزا نہیں ہو گی؟" احمد کا دماغ تیزی سے کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہر زاویہ جاننا چاہتا تھا، اور زاویے کو سمجھ کے ایک پراپر پلان تیار کرنا چاہتا تھا۔

"اگر کورٹ میں ثابت ہو جائے کہ اس نے منی لانڈرنگ نہیں کی۔ یا اگر بلیک میلنگ انوالوڈ ہے تو بھی سزا سے بچا جا سکتا ہے۔" مناج نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔ صرف بلیک میلنگ کافی نہیں۔ کوئی اور ایسی صورت جس سے ایک بندا منی لانڈرنگ کرے مگر اسے کچھ نہ ہو۔ اور پولیس بھی اس کے ساتھ کچھ نہ کرے۔" احمد محتاط انداز میں، ٹھیک الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے اپنا جملہ بول رہا تھا۔ مناج کو کچھ حد تک صورتحال سمجھ آگئی۔

"ہاں ایک صورت میں بچا جا سکتا ہے کہ منی لانڈرنگ کرنے والا بندا، یعنی کیریئر'فشنگ موہم کا حصہ ہو۔ وہ محض ایک والنٹیئر ہو۔ یعنی پولیس کی سوپر وین میں وہ یہ کام انجام دے۔ اس طرح سے منی لانڈرنگ اس کے لیے لیگل مانی جائے گی۔" احمد کے دماغ میں گھنٹی بجنے لگی۔

”کیا آپ میرے لیے کچھ کر سکتی ہیں مناج؟ شاید مشکل ہو۔شاید کسی پولیس والے کو خریدنا پڑے۔ آپ بہتر جانتی ہوں گی پولیس والوں کو کیسے منایا جاتا ہے۔مگر میں چاہتا ہوں کہ یہ ہو۔کیونکہ یہ بہت ضروری ہے۔کسی کی زندگی کا سوال ہے مناج۔کیا آپ میری مدد کرنا چاہیں گی؟“ احمد ٹھنڈے برفیلے لہجے میں بولا۔دماغ میں منصوبہ تیار تھا۔

”آپ فکر نہ کریں۔میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گی۔بے جھجک ہو کے بتائیں۔“ مناج سنجیدہ ہو کے بولی۔

احمد نے بھی اسے اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد میں چھائی اس خوشگوار صبح میں ہم ایک پولیس اسٹیشن کا رخ کرتے ہیں۔۔۔

پولیس اسٹیشن کی بوسیدہ عمارت پہ سورج کی کرنیں وار کر رہی تھیں لیکن سورج کی کرنوں میں گرمی کی آمیزش کافی کم تھی۔

پولیس اسٹیشن کے اندر کسی واہیات سے گانے کی گونج تھی۔پولیس انسپیکٹر یونس اپنی سربراہی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ڈیسک کے دوسری طرف ایک بوڑھا مرد بیٹھا تھا جس سے وہ باتوں میں مگن تھا۔

کونے میں ہی یونس کے چیلے، پولیس کے لباس میں ملبوس، چہروں پہ معنی خیز مسکراہٹ سجائے بیٹھے تھے۔وہ یونس کو گفتگو کرتے دیکھ رہے تھے۔ایک کا نام کاشف تھا اور ایک کا نام مراد۔

”کیا لگتا ہے، مراد باس کتنے نکلوالیں گے؟ مجھے لگتا ہے کہ ہزار سے زیادہ نہیں۔“ کاشف نے مراد کے کان میں سرگوشی کی۔

”میں بڑی بازی لگاتا ہوں آج۔ باس آج پانچ ہزار نکلوائیں گے۔“ دونوں متجسس سے ہو کے کسی تماشائی کی طرح یونس کو بوڑھے مرد سے بات کرتے دیکھنے لگے۔

”بھئی سیٹھ صاحب۔ آپ کے کام بھی تو کتنے ٹیڑھے ہیں۔ اتنی آسانی سے تھوڑی ہوں گے۔“ یونس نے مسکا لگانے والا انداز اختیار کیا۔ چہرے پہ میٹھی مسکراہٹ سجائی ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش شکل مرد تھا جس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس کی آنکھیں چاندنی کے رنگ کی تھی، اور رنگت صاف تھی۔

”یہ تو تم لوگوں نے تماشا لگا دیا ہے۔ ہر ہفتے آؤ کام ہوتا نہیں۔ میری گاڑی اب تک پھنسی ہوئی ہے۔“ سیٹھ نے برہمی سے کہا۔ یونس نے چہرے پہ مصنوعی سی اداسی طاری کی' جیسے اسے سیٹھ کی بات سن کے دلی افسوس ہوا ہو۔

”آپ تو ناراض ہو گئے سیٹھ صاحب۔“ یونس کا اندازایسا تھا جیسے اس کا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا ہو۔ ”اب آپ دیکھئے سیٹھ۔ کتنا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ اب تھوڑا بہت' ادھر ادھر ہاتھ تو مارنا ہوگا نا؟“ سیٹھ نے اپنے ہاتھ مٹھی میں بند کر لیے۔ وہ جیسے بہت کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔ اس نے اپنا بٹوا نکالا۔ یونس، مراد اور کاشف۔۔۔ تینوں کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

”ہزار۔“ کاشف نے سیٹھ کے بٹوے میں ڈلتے ہاتھوں کو دیکھتے تبصرہ کیا۔

”دیکھنا پانچ ہزار دے گا۔“ مراد نے سرگوشی کی۔

اور سیٹھ نے اپنے بٹوے میں سے پانچ ہزار کا نیا نوٹ نکالا۔ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھری۔

"یہ آخری بار ہے۔" اکھڑ سے انداز میں کہتے سیٹھ کھڑا ہوگیا اور وہاں سے چلا گیا۔ جاتے جاتے پولیس والوں کو اور پاکستان کے نظام کو لعن طعن سے نوازنا نہیں بھولا۔

یونس نے پانچ ہزار کا بے شکن نوٹ لہرایا اور نظر مراد اور کاشف پہ ڈالی۔ آنکھوں میں جتاتا تاثر تھا، جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو کہ "دیکھا میرا کمال؟۔"

"پچیس پچیس فیصد تمہارا اور پچاس میرا۔" یونس نے کہہ کے لاپرواہی سے نوٹ مراد کو تھما دیا۔ وہ ٹیبل پر ٹانگیں لمبی کر کے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لیے جھپکی لینا چاہ رہا تھا۔

اور تب ہی موبائل بجا۔ یونس نے نظر اٹھا کے موبائل کو دیکھا۔ میڈم اٹارنی کالنگ۔ یونس چونک کے سیدھا ہوگیا اور چہرے پہ سنجیدگی طاری کی۔

"بند کر!" اس نے زور دے کے کہا۔ مگر کچھ بند نہیں ہوا۔

"ابے بند کرو یہ گانا۔" اس نے اب اور زور دیتے ہوئے کہا تو مراد نے بوکھلا کے گانا بند کر دیا۔

"لو جی آگئی مس مناج کی کال۔ اب ایک اچھے خاصے مرد کو عورت کے پیچھے تباہ و برباد ہوتے دیکھنا۔" مراد نے مزے لینے والے انداز میں کاشف کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی میڈم۔" یونس کا لہجہ اور ساتھ ساتھ ہر انداز بالکل بدل گیا تھا۔ وہ بالکل میٹھے سے لہجے میں بات کرتا تھا۔ یہ میٹھا لہجہ سیٹھ والے سے مختلف تھا کیونکہ یہ مصنوعی نہ تھا۔

"یونس کیا ہم مل سکتے ہیں؟ میں نے کچھ ضروری بات کرنی ہے؟ آپ کے پولیس سٹیشن کے پاس جو ریسٹورانٹ ہے وہیں پر۔" مناج نے اپنی مشینی انداز میں کہا۔یونس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہو۔وہ شرمسار سا ہنس دیا۔گال سرخ ہونے لگے۔

"جی میڈم۔ابھی پہنچ رہا ہوں۔" اور کال کٹ گئی۔یونس نے اپنے موبائل کا فرنٹ کیمرا کھولا اور بال درست کیے۔گریبان درست کیا۔اس کا حلیہ اب لا پرواہ سا نہیں تھا۔وہ اٹھ کے جانے لگا۔

"ارے باس۔وہ منہ تک نہیں لگاتی اور آپ ان کے حکم پر منہ اٹھا کے جارہے ہیں۔" مراد نے پیچھے سے مزے لینے والے انداز میں کہا۔یونس نے اس کو مسکرا کے دیکھا۔اس کے دماغ میں ایک تگڑا جواب تیار تھا۔

"آج سمجھ آیا کہ اتنی عمر کے باوجود تمہیں کوئی ملا کیوں نہیں۔" یہ حملہ مراد پر بہت ذاتی تھی۔"ایک بات یاد رکھو۔شریف آدمی ہی کامیاب زن مرید ہوتا ہے۔" وہ سادگی سے کہتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

"ملی تو ویسے آپ کو بھی کوئی نہیں۔" یونس کے جاتے ہی مراد برہمی سے زیر لب بڑبڑایا۔کاشف اس کے اوپر زور سے ہنس دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”میں چاہتی ہوں آپ ایک ایف آئی آر کاٹیں۔مہر بنت عبداللہ سلطان کے نام سے۔اپنے ڈیٹا میں ایسا دکھایئے گا جیسے وہ کئی ماہ پرانی ہو۔“ مناج اور یونس اس ریسٹورانٹ میں بیٹھے تھے۔یونس نے ایسی شکل بنائی ہوئی تھی جیسے اس سے زیادہ شریف انسان اس دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں۔

”ہو جائے گا میڈم۔اور کچھ؟“ یونس نے مناج کو دیکھتے ہوئے کہا۔آنکھوں میں خواب والا تاثر تھا۔

”اور یہ کہ مہر بنتِ عبداللہ سلطان اس وقت منی لانڈرنگ مافیاکو ایکسپوز کرنے کے لیے فشنگ مہم کا حصہ ہے۔آپ نے اس چیز کو راز رکھا کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کے بڑی آتھوروٹیز‘جو کہ اس مافیا کے ساتھ ہیں وہ اس فشنگ موہم کو ہونے سے روکیں۔“ اور یونس ایک دم چونک گیا۔یہ فشنگ موہم کہاں سے آگئی تھی؟

”میں سمجھا نہیں۔“ یونس نے کہا۔مناج کے تاثرات تن گئ۔اس نے اپنے لب بھینچ کر برہمی سے سانس خارج کی۔

”اس لیے سادہ سودہ ہاں جی ہاں جی کہنے سے بہتر ہے کہ آپ غور سے میری بات سن لیا کریں۔۔“ مناج کا لہجہ سخت تھا۔یونس کے چہرے پر شرمندگی سی چھاگئ۔

”اب آپ بتایئے۔میں سن رہا ہوں۔“ یونس اب سیدھا ہو کر بیٹھا۔مناج نے اسے سب بتایا جو احمد نے اسے بتایا تھا۔

”اوہ۔مشکل ہے۔مگر میں کر لوں گا۔ایک دفعہ میں سب دہرا رہا ہوں۔مہر بنت عبداللہ سلطان نے کمپلین کی۔ہم نے ان کا ساتھ دیا اور ایک فشنگ موہم تیار کی۔ہم نے کیمراز پرووائڈ کئے تا کہ ان

چوروں کے چہروں کو دیکھ سکیں۔اور مہر بنت عبداللہ سلطان نے یہ سب پولیس کی سپر ویجن میں کیا۔ اور اس کے لیے ہم نے دبئ پولیس سے بھی مدد لی۔درست؟" یونس نے دماغ میں تمام نقاط جمع کرتے کہا۔مناج نے پر سکون سانس خارج کی۔

"بالکل۔اور ہاں کسی کو نہ پتا چلے۔ٹھیک وقت آنے پر ہم اسے استعمال کریں گے۔ٹھیک ہے نا یونس؟ مجھے اس معاملے پر صرف آپ پر ہی بھروسہ تھا۔آپ میرے کام آئیں۔میں آپ کے آؤں گی۔" مناج کے چہرے پر تکلفانہ مسکراہٹ تھی۔یونس جیسے اس کے انداز پہ پگھلنے لگا۔اس کا یہی اکھڑ اسا انداز اس کی کمزوری تھا جیسے۔

"جیسا آپ کہیں۔"یونس نے مسکا لگانے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گاڑی میں بیٹھی مہر، چہرے پہ خوشگوار حیرانی لیے سب سن رہی تھی۔تو وہ اب تک اپنے دشمنوں کے خلاف ثبوت جمع کر رہی تھی اور اسے خود بھی علم نہ تھا۔مہر تو اندھیروں میں کبھی جکڑی ہی نہ تھی۔

"مہر تم سمجھ نہیں رہی یہ کتنی بڑی کامیابی ہے۔دبئ پولیس والوں کو بس ایک اشارہ دینا ہوگا اور وہ بینک سیل ہو جائے گا۔اس لیڈی اقتدار کے خزانے ڈوب جائیں گے۔اف مہر۔ان کا پیسہ برباد۔لیڈی اقتدار بالکل دنگ رہ جائے گی۔" احمد چہرے پہ پرجوش مسکراہٹ لیے مہر کو سب بتا رہا تھا۔مہر کے سر پہ سایہ سا گزرا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہوا تو میں ان کے کسی کام کی نہیں رہوں گی' احمد۔ وہ میری ماں کو مار دیں گے۔“ مہر سر نفی میں ہلاتے بولی۔ احمد کے چہرے پہ چھایا جوش فنا ہوا۔

”کیا آپ واقعی ایسا کرنے کا تو نہیں سوچ رہے؟“ مہر دل میں امید لیے بولی۔ احمد نے اپنی گردن جھکا لی جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

”وہ خود غرض انسان ہے مہر۔ اسے تمہاری اور تمہاری ماں کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ صرف ہمیں برباد کرنا چاہتا ہے اور بس۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے، اگر اسے تمہیں قربان کرنا پڑے تو وہ بے جھجک کر دے گا۔ اسے اگر تمہاری ماں کو قربان کرنا پڑے تو وہ یہ بھی کر گزرے گا مہر۔ وہ ایسا کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگائے گا، اور تم کیا کر رہی ہو۔“ لیڈی اقتدار کا وہ فقرہ مہر کے دماغ میں لہرانے لگا۔ اس کے چہرے پہ احمد کے لیے تشویش در آئی۔ وہ احمد کو بس دیکھتی ہی رہ گئی، جو کہ اب تک جواب نہیں دے سکا تھا۔

احمد نے اپنا سر اٹھایا اور مہر کو دیکھا۔

”اگر میرے پاس یہ آخری آپشن بھی ہوا' تب بھی نہیں۔“ مہر نرمی سے مسکرا دی۔ اسے احمد کی نیت پہ کبھی شک نہیں کرنا چاہئے تھا۔

اگلے لمحے مہر کی مسکراہٹ پھر سے فنا ہوئی۔ اسے لیڈی اقتدار سے کی گئی وہ ڈیل یاد آئی۔ وہ ڈیل جس نے دبئی میں اسے کتنا ستایا تھا۔ وہ ڈیل جس نے اب تک اس کے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

”مگر احمد۔ مجھ سے کچھ ہو گیا ہے۔“ مہر بولی تو احمد چونکا۔ اب کیا کیا ہے اس نے بھلا؟ احمد نے سوچا۔

مہر نے پھر احمد کو اس ڈیل کے بارے میں بتایا۔احمد بھی سنتا گیا۔ڈیل سننے کے بعد، چہرہ بالکل بجھ گیا تھا۔

”کاش یہ کرنے سے پہلے تم پوچھ لیتی۔“ احمد بولا تھا۔اس کا چہرہ بے تاثر سا تھا۔وہ کچھ خفا سا نظر آرہا تھا۔

”کیا آپ کو برا لگا؟“ مہر نے پوچھا تو احمد نے سر نفی میں ہلایا۔

”تم نے اس وقت اپنے بارے میں سوچا مہر۔اس میں کچھ غلط نہیں۔مگر اگر تم مجھ پہ بھروسہ کرتی تو میں تمہارے سارے مسئلے خود ہی حل کر دیتا۔مگر خیر۔“ احمد نے مایوسی سے سر جھٹکا۔مہر کا دل ڈوبنے لگا۔

”اور اب کیا؟“ مہر کی آواز روہانسی ہونے لگی۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ہمیں ملنا بند کرنا ہوگا۔“ مہر کے دل پہ ضرب آکے لگی۔”جب تک میں اپنا انتقام نہ لے لوں' اور ان سب کو اپنے انجام تک نہ پہنچا دوں۔ہمیں ملنا بند کرنا پڑے گا۔“ احمد بالکل سنجیدہ تھا۔مہر نے مایوسی سے سر اثبات میں ہلایا۔

”اور یہ سب ختم ہونے کے بعد؟ کیا ہمارے راستے ایک بار پھر ملیں گے احمد؟“ مہر کی آواز میں لرزش تھی۔وہ جانتی تھی اگر جواب ناں میں ہوا'تو وہ ایک بار پھر سے مر جائے گی۔احمد نے مہر کے اوپر نرم سی نظر ڈالی۔

"ہم ضرور ملیں گے۔" مہر کے دل پہ لگا پھندا جیسے کھل گیا۔وہ اپنی ان دیکھیں زنجیروں سے آزاد ہونے لگی۔

"لیکن میں اب اپنا انتقام پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔کیا تم انتظار کرنے کے لیے تیار ہو؟" احمد کے چہرے پہ مدھم مسکراہٹ تھی۔مہر بھی جواباً مسکرائی۔اس نے اپنا پرس کندھے پہ ٹانگا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"میں خوشی سے انتظار کرنے کے لیے تیار۔میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔میں اس سارے کھیل کے ختم ہونے کا انتظار کروں گی احمد۔" کہتے ہوئے مہر گاڑی سے نکلی۔نظروں کی تکرار ہوئی اور پھر گاڑی کا دروازہ نظروں کے راستے میں آگیا۔

مہر کے دل میں اب بھی خلش سی تھی۔اس سب کے باوجود بھی اگر اس کی کہانی نامکمل رہ گئی تو؟ وہ جانتی نہیں تھی۔وہ اس بھیانک کھیل کے انجام سے واقف نہ تھی۔۔۔

اس کھیل کے انجام میں، سب کچھ بدل جانے والا تھا۔۔۔ہر چیز۔۔۔وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد جب اپنے گھر پہنچا تب رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔وہ جب دبئی سے واپس اسلام آباد آیا تھا تو بھی اپنے گھر گیا تھا لیکن بہت رات ہو رہی تھی۔اس کے پاس گھر کی چابی تھی وہ چپ چاپ ہی گھر میں داخل ہوگیا۔اگلے دن در فشاں سے ملے بغیر ہی وہ گاڑی لے کے صبح صبح ہی نکل گیا تھا۔وہ در فشاں سے ملنا نہیں چاہتا تھا، وہ دل ہی دل میں اس سے خفا تھا، اس سے ناراض تھا۔اس کے کندھوں کا بوجھ اس نے بڑھایا ہوا تھا۔اب بھی وہ یہی ارادہ رکھتا تھا۔چپ چاپ گھر میں آجانا چاہتا تھا۔

گاڑی کی ہل چل درفشاں تک پہنچ گئی تو وہ غنودگی کے عالم میں ہی احمد کے لیے دروازہ کھولنے آ گئی۔ اس کے چہرے کا ہر زاویہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں بے جان تھیں۔ وہ اب تک اپنے دل پہ عمارہ کی موت کا بوجھ لیے ہوئے تھی۔ وہ بھی احمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے احمد کی ضرورت تھی۔

احمد نے گاڑی کار پورچ میں پارک کی۔ وہ درے سے کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس کی طرف ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ درفشاں کا چہرہ جب کہ جھکا ہوا تھا۔ چہرے پہ شرمندگی چھائی ہوئی تھی۔ دو اسٹیپس چڑھ کے وہ اب گھر کے اندر داخل ہوئے۔ احمد نے آخر کار اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اب مجھے بتاؤ گی تم' کہ کیا گل کھلا رہی ہو میری پیچھے؟" درے کے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے قدم زنجیر ہوئے۔ اس نے مڑ کر احمد کو دیکھا۔ احمد نے اس کے چہرے کو دیکھا، کچھ تھا اس کے چہرے پہ جو بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے احمد کو چلا چلا کے بتا رہے تھے کہ وہ راتوں سے سوئی نہیں تھی۔ درفشاں کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا اٹکا۔ وہ ویسے تو اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں ماہر تھی لیکن آج وہ یہ کر نہ سکی۔

"تم نے جینا عذاب کر رکھا ہے آپا۔ تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟ کیوں ایسی حرکتیں کرتی ہو؟" احمد کی آنکھوں میں غصہ بھرا تھا اور ایک اور بھی جذبہ تھا جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ جذبہ خوف کا تھا۔۔۔ درفشاں کے کھو جانے کا خوف۔ اس دنیا میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے، اور وہ جیسی بھی تھی، تھی تو اس کی ہی بہن۔ وہ ایک مشکل کھیل کھیل رہا تھا اور اس کا اثر وہ درے پہ پڑنے نہیں دے سکتا تھا۔ اسے بے اختیار زینت کی یاد آئی۔ وہ بھی یہی مشکل کھیل کا حصہ بن کے

مار دی گئی تھی۔وہ ایک بار پھر سے اکیلا نہیں رہ جانا چاہتا تھا۔وہ ایک اور انسان کو یوں جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

درے کا دل بالکل بھاری ہونے لگا۔آنسو آنکھوں کی سمت سے بہنے کی ضد کر رہے تھے۔اس سے بھی اپنا دل قابو نہ ہو ا اور وہ رونے لگی۔وہ تیزی سے احمد کی طرف بڑھی اور اس کے سینے پہ سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔اپنے اندر کے طوفان کو وہ اپنے بھائی کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں نکال سکتی تھی۔آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کے احمد کی شرٹ کو بھگوتے گئے۔

احمد اس لمحے بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔غصہ پوری طرح سے اتر گیا۔ہر شکوہ دور ہو گیا۔اس نے نظر اٹھا کے درے کو دیکھا جو کہ تکلیف سے بلک کے رو رہی تھی۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔

"میں برباد ہو گئی ہوں احمد۔میری وجہ سے کسی کی جان چلی گئی ہے۔میں اپنے آپ سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی ہوں۔" درے نے بلکتے ہوئے کہا۔احمد الجھا۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" در فشان نے اپنا سر اٹھایا۔اس نے اپنے آنسو پونچھے۔

وہ احمد کے ساتھ لاؤنج کے صوفوں پہ بیٹھی۔

وہ اسے سب کچھ بتانے لگی۔شروع سے۔حرر کے بارے میں۔لیڈی اقتدار سے اپنی دو ملاقاتوں کے بارے میں۔اور پھر اس قتل کے بارے میں۔احمد بس اپنا سر پکڑتے رہ گیا۔ یہ در فشاں کیا کر بیٹھی تھی۔یہاں وہ اسے جن لوگوں سے تحفظ دینے کی کوشش کررہا تھا وہ ان ہی کے ساتھ چھپن چھپائی

کھیل رہی تھی۔ درے نے احمد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دم بخود سا ہو کے بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ غصہ ایک بار پھر سے لوٹ آیا تھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے آپا۔ تم پاگل خانے چلی جاؤ۔“ احمد نے غصے میں کہا۔ درے بس روتے گئی۔

”خیر جہاں تک اس قتل کی بات ہے۔“ احمد نے اپنے آپ کو ٹھنڈا کیا۔ ”وہ تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اس لیے تم اب ان لوگوں کے ساتھ کوئی کھیل نہیں کھیلو گی۔ چپ چاپ اپنی سائکولاجی پے دھیان دو گی۔“ اسے درے کو اس سب سے روکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ملا۔ اسے یہی ایک ترکیب سمجھ آئی، کہ شرافت سے درفشاں اپنے آپ کو قاتل سمجھتی رہے اور احمد آرام سے اپنا حساب برابر کر لے گا۔

”میں گھر نہیں بیٹھ سکتی احمد۔ میں ان لوگوں کو اب نہیں چھوڑ سکتی۔“ درفشاں نے سر نفی میں ہلاتے کہا۔

احمد کے ماتھے پر بل پڑے۔

”کیوں کر رہی ہو ایسی حرکتیں آپا۔“ احمد کی آواز میں بے بسی سی تھی۔

”کیونکہ احمد۔۔۔“ درے کی آنکھ سے ایک اور موٹا آنسو نکلا۔ ”میں ان سب سے فیروز بھائی کی موت کا

حساب لینا چاہتی ہوں۔" احمد کے سر میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ درفشاں جانتی تھی؟ اسے جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہ ہوا۔

"میں بھی ان سب کو مرتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں بھی ان سب کو برباد ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں احمد۔ یہ وہی لوگ ہیں جو بھائی کے مجرم ہیں۔ میں یہ سب جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھ سکتی۔" وہ آنکھوں میں تپش لیے بولی۔ احمد ششدر سا اسے دیکھتا رہا۔

"اور تم بھی مجھے نہیں روک سکتے۔" درفشاں کا انداز اٹل سا تھا۔ وہ کھڑے ہو کے اپنے کمرے میں جانے لگی۔ احمد کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ اس کی گردن بے اختیار جھک گئی۔ اس کے اندر اچانک سے ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔

"رکو۔" احمد نے کہا تو درے الجھ کے پیچھے مڑی۔ احمد کے اندر اسے کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں نے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" احمد کہہ کے کھڑا ہوا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ درفشاں بس

نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے گاڑی گھر سے باہر نکالی۔ درفشاں بھی احمد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں احمد۔" درفشاں کو تجسس ہوا۔

"قبرستان۔" آواز بے تاثر تھی اور وجود ویران۔ درفشاں کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔اس سے آگے اس سے کچھ بھی پوچھا نہ گیا۔وہ جیسے سب کچھ جان چکی تھی۔۔۔

احمد گاڑی چلاتے ہوئے مارگلہ کی پہاڑی تک پہنچا۔وہاں تو کوئی قبرستان نہیں تھا؟ درے نے سوچا۔

احمد نے گاڑی سے اتر کے فلیش لائیٹس نکالیں اور درے کے ساتھ پہاڑی پہ بنے راستہ کو پھلانگنے لگا۔

انہوں نے کالے آسمان تلے، پہاڑی کی اس ناہموار سطح پہ چلنا شروع کیا۔ٹھنڈی ٹھنڈی سی نم ہوائیں ان دونوں کے وجود سے ٹکراتیں جو کہ ہڈیوں تک ٹھنڈ اتار دیتی تھیں۔جنگلی جانوروں کی عجیب و غریب آوازیں ماحول میں پھیلی' وحشت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ہوا کے جھونکوں کی درخت سے ٹکرار ہوتی، تو پتوں کے لہرانے کی آواز سارے احاطے میں گونجتی۔دل بالکل حلق میں آگیا تھا۔ماحول میں کچھ پر اسرار سا تھا۔در فشاں حواس باختہ سے عالم میں بس احمد کے پیچھے چلتے گئی۔

بالآخر منزل آگئی تھی۔وہی خالی میدان جس میں نہ ہونے کے برابر سبزہ زار تھا، اور چار درخت۔ درختوں کے بیچ و بیچ فیروز کی وہ تنہا قبر۔در فشاں پھٹی ہوئی آنکھیں لیے اس قبر کو دیکھے گئی۔یہ قبر کس کی تھی؟ اس کے دل میں سوال در آیا۔

"فیروز بھائی۔" احمد قبر سے کافی دور ایک درخت کے سرہانے کھڑے ہو کے بولا۔آواز اب بھی بے تاثر تھی۔

اس لمحے درفشاں کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے

لگیں۔اس کے وجود پہ کانٹے چبھنے لگے۔

وہ اس قبر تک سست روی سے قدم بڑھانے لگی۔ہر ایک قدم اسے اس قبر سے قریب تر قریب کرتے گیا۔اور آخر کار وہ اس قبر تک پہنچ گئی۔

"میں نے کوشش کی کسی طرح سے بتادوں۔اور میں جانتا ہوں کہ مجھے بہت پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔اور یہ میری غلطی ہے۔مجھے معاف کر دو۔" درے اس قبر کے سرہانے بیٹھ کے، اس قبر کو دیکھنے لگی۔اس نے آنکھیں بند

کر لیں۔ایک آنسو آنکھ سے نکلا اور گال پر دستک دیتے ہوئے بنجر زمین کا مہمان بنا۔

"کاش تم پہلے بتا دیتے احمد۔" درے کی آواز میں شکایت نہیں تھی۔بس غم تھا۔اداسی تھی۔وہ اپنے بھائی کو سمجھ سکتی تھی۔"کاش تم مجھے پہلے بتا دیتے تو اتنے سال میں یوں ہی بے چین راتیں نہ کاٹتی۔اتنا وقت میں اس بے قراری کا شکار نہ رہتی احمد۔" درے کی آنکھ سے ایک اور آنسو نکلا۔ہوا کا جھونکا دونوں کے وجود سے ٹکرایا تو بال اڑنے لگے۔

"اللہ فیروز بھائی کو جنت نصیب کرے۔" درے نے فاتحہ پڑھنے کے بعد کہا۔احمد نے آمین کہا۔اپنے کپڑوں سے دھول جھاڑتی وہ کھڑی ہوئی۔اس قبر کو اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"مجھے امید ہے کہ فیروز بھائی بہتر حال میں ہوں گے۔جہاں بھی ہوں گے پر سکون ہوں گے۔مرنے والے کو صرف دعا کی ضرورت ہوتی ہے، کسی کے آنسو کی نہیں۔اس لیے میں صرف انہیں دعا دوں گی۔" درے نے سر اٹھا کے اس کالے آسمان پہ جگمگاتے ہلال کو دیکھتے کہا۔دل دھاڑے مار مار کے رو رہا تھا۔

"میرے بھائی کو بہترین سے بہترین دینا یا اللہ۔وہ اس کے حقدار ہیں۔" درے کی آواز گیلی تھی۔اس نے مڑ کے احمد کو دیکھا جو کہ بے تاثر چہرہ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔اس کے اندر بھی کچھ غمگین سا تھا۔

"اب میں سکون میں ہوں احمد۔میرا اطمینان لوٹ آیا ہے۔مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔میں تمہیں سمجھ سکتی ہوں۔۔" وہ آواز میں محرومی لیے بولی تھی۔آنکھیں اب بھی نم تھیں۔وہ اب احمد کی طرف بڑھی۔

دونوں اب وہاں سے جانے لگے۔۔۔

اس اندھیری رات میں وہ قبر ایک بار پھر تنہا رہ گئی تھی۔۔۔

وہ باریک ہلال ہی تھا، اس قبر کی رات کا ساتھی۔۔۔

وہ قبر اس دفعہ بھی خاموش رہی۔۔۔

اپنے اندر دفن ان تاریک رازوں کو۔۔۔

آج بھی اس نے عیاں نہ ہونے دیا۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# باب نمبر ۱۱: عزم کی پہیلی

سچ سامنے آتا ہے۔۔۔

سچ کی کشش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔۔۔

سچ انسانوں کو برباد کر سکتا ہے۔۔۔

اور آباد بھی۔۔۔

سچ انسانوں کو جوڑ سکتا ہے۔۔۔

ضرورت پڑنے پر توڑ بھی سکتا ہے۔۔۔

سچ اگر ظالم ہے تو۔۔۔

سچ رحم بخش بھی ہے۔۔۔

سچ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھیر سکتا ہے تو۔۔۔

سچ آنکھوں کی ویرانگی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔۔۔

سچ یاد رہ جانے والا ہے تو۔۔۔

سچ کو جھٹلانا بھی آسان ہے۔۔۔

سچ وجود کی ان دیکھی زنجیروں کو کھول بھی سکتا ہے تو۔۔۔

سچ قید میں پابند بھی کر سکتا ہے۔۔۔

سچ سامنے ضرور آتا ہے۔۔۔

یاد رکھنا۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اور ہماری کہانی کے کرداروں کی زندگیوں میں کچھ وقت کے لیے ٹھہراؤ سا آگیا۔ ٹھہراؤ، جو کہ خود میں ہی خطرے کی علامت ہوتا ہے۔۔۔۔ ٹھہراؤ، جو کہ طوفان کی پیشگوئی کرتا ہے۔۔۔۔ ٹھہراؤ، جو بربادی کے ظہور سے پہلے ہر سو ہر دم پھیلا ہوتا ہے۔۔۔۔

عافیت زندگی کا ہسپتال دن کے اس پہر سورج کی کرنوں تلے جگمگا رہا تھا۔ جس طرح سے خزاں کا موسم قریب تر قریب ہوتا جارہا تھا سورج اپنی کرنوں میں سے کشش کھوتا چلا جارہا تھا۔ ماحول میں ویرانگی اور فضامیں اداسی تھی۔

نیلوفر اپنے آفس میں، اپنی سربراہی کرسی پہ براجمان تھی۔ چہرہ بجھا ہوا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ' اس کے چہرے کی رونق دم توڑتے جا رہی تھی۔ وہ زندگی سے بیزار ہونے لگی تھی۔ اس کا دل ہر شے سے اٹھ گیا تھا۔ اب اسے دنیا کی یہ چیزیں، دنیا کی یہ آسائشیں' تسکین نہیں دیتی تھیں۔

وہ اپنے سامنے موجود اسکرین پہ کسی نادیدہ نقطے کی تلاش میں تھی۔۔۔اس کا بس جسم ہی ہسپتال کے آفس میں موجود تھا۔۔۔در حقیقت تو وہ کہیں اور تھی۔۔۔وہ کھو گئی تھی۔۔۔دو دن پہلے کے اس منظر میں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس ہری بھری پہاڑی پہ،وہ دو منزلہ لکڑی کی عمارت آج بھی کھڑی ہے۔سورج کی کرنیں کھڑکیوں کی حدت پار کرکے اس عمارت میں داخل ہورہی ہیں۔لکڑی کی وہ دو منزلہ عمارت سورج کی کرنوں کے باعث سنہرے سے رنگ کی نظر آرہی ہے۔

نیلوفر، ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھامے اس عمارت کی طرف چلے آرہی ہے۔عمارت کے ارد گرد فینسز لگی ہوئی ہیں اور ان فینسز کے ساتھ ہی کالی شرٹس میں ملبوس مرد پہرا دے رہے ہیں۔نیلوفر کی چال قدرے بجھی ہوئی ہے۔چہرہ بے رونق سا ہے۔

وہ سست سی چال چلتے اس عمارت میں داخل ہوتی ہے اور اس کمرے میں جاتی ہے جہاں شمائلہ قید تھیں۔دروازے پہ دستک ہوتی ہے تو شمائلہ، جو کہ سنگل بیڈ پہ بیٹھی ہیں، نیلوفر کو نظر اٹھا کے دیکھتی ہیں۔ان کے چہرے پہ، نیلوفر کو دیکھتے ہی خوشی در آتی ہے۔وہ جیسے اسی کے ہی منتظر تھیں۔

نیلوفر مصروف سے انداز میں اپنا ہینڈ بیگ ٹیبل پہ رکھتی ہے اور اس میں سے دوائیوں کا ایک تھیلا نکالتی ہے۔وہ دوائیاں ہاتھ میں ٹول کے دراز میں ڈال دیتی ہے۔کمر پہ ایک ہاتھ باندھے وہ شمائلہ پہ نظر ڈالتی ہے اور اپنی بات کا آغاز کرتی ہے۔

"شکر ہے آپ دوا وقت پر لے رہی ہیں۔ اگلے دو ہفتوں کی دوائیاں بھی ایک ساتھ ہی لے آئی ہوں۔" وہ بجھے ہوئے سے انداز میں کلام کرنے لگی۔

"نیلوفر، آپ کا دوسرا ساتھی اب تو نہیں آئے گا؟" شمائلہ نے معصومیت سے پوچھا تو نیلوفر زیر لب ہنس دی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ان کا دوسرے ساتھی سے مراد، شمس کا تھا۔

"کیوں؟ کیا وہ آپ کو اتنا برا لگتا ہے؟" نیلوفر نے شریر سی مسکراہٹ دباتے پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ زیادہ محفوظ رہتی ہوں۔" شمائلہ نے طمانیت بھرے انداز میں کہا تو نیلوفر کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ قدرے پھیکی پڑ گئی۔

"کیا آپ ہماری مہر سے بات کروا سکتی ہیں؟ انہوں نے ایک ہفتے سے کوئی بات نہیں کی۔" شمائلہ غمگین سے لہجے میں نیلوفر سے درخواست کرنے لگی۔

"آپ کی بیٹی آپ کو بھول گئی ہے شمائلہ۔ وہ دوسرے مسائل میں الجھ گئی ہے۔" چہرے پہ افسوس لیے وہ ہمدرد سے لہجے میں استفسار کرتی ہے۔ نیلوفر کو لگتا ہے کہ شمائلہ کا چہرہ مایوسی کے رنگوں میں ڈھلے گا لیکن خلاف توقع وہ اسے چہرے پہ نرمی لیے ہی دیکھتی رہیں۔

"یہ دو الگ چیزیں ہیں بیٹی۔ مسائل میں الجھ جانا اور بھول جانا۔ مہر ہمیں نہیں بھول سکتیں۔ بس وہ مسائل میں الجھ گئی ہیں۔ ہم ان کے مسائل ختم ہونے کی دعا کریں گے، تو وہ ہم سے بات کرلیں گی۔" شمائلہ آسودہ سے انداز میں کہہ اٹھتی ہیں تو نیلوفر کے چہرے پہ کڑواہٹ پھیلتی ہے۔ وہ متعجب

سی نگاہیں شمائلہ پہ مرکوز کیے انہیں بس دیکھتے رہتی ہے۔کوئی انسان اتنا صابر کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔

"آپ کیسے اتنی مطمئن ہو سکتی ہیں؟ کیوں مطلب کیسے؟" نیلوفر کی آواز میں برہمی ہے۔وہ اس طرح سے، دماغ میں سوار اس گہری الجھن کا آشکار شمائلہ پہ کرنے لگ جاتی ہے۔وہی الجھن جس کا وہ کافی وقت سے شکار ہے۔

"یہاں میرے پاس دولت کے خزانے ہیں۔۔" وہ ہاتھ اٹھا کے تنبیہ کرتی ہے۔"لیکن پھر بھی میں مطمئن نہیں ہوں؟" اس کی آواز میں جہاں بھر کی تکلیف ہے، خود پہ غصہ ہے۔وہ آنکھوں میں دکھ و درد لیے شمائلہ کو دیکھتی ہے جو کہ محض آسودہ سا مسکرا دیتی ہیں۔ان کے پاس ہمیشہ کی طرح اس کی ہر الجھن کا جواب تھا۔

"کیونکہ آپ جن چیزوں میں اپنا سکون تلاش کر رہی تھیں۔جن چیزوں کے ذریعے اطمینان حاصل کرنا چاہ رہی تھیں وہ چیزیں ہمیں سکون اور اطمینان دینے کے لیے تخلیق ہوئی ہی نہیں ہیں نیلوفر۔" شمائلہ چہرے پہ نرم مسکراہٹ سجائے کہتی ہیں۔ان کے چہرے پہ چمک سی در آتی ہے۔ نیلوفر کی الجھن میں اضافہ ہوتا ہے۔

"مطلب؟"

"ہم سب انسانوں کی روح کو خدا کے سامنے حاضر کیا گیا تھا۔حضرت آدمؑ،ہمارے والد کے سامنے۔ اس وقت خدا نے حضرت آدم کو وہ روح دکھائیں جو جنت میں جائیں گی۔تو وہ خوشی سے چہک اٹھے۔

اور پھر وہ روح' جو دوزخ کی آگ میں جلیں گی' تو وہ رونے لگے۔اس سب کو بتانے کا مقصد یہ ہے' کہ ہم سب کی روح خدا ذوالجلالِ وَالاکرام کے سامنے حاضر ہو چکی ہیں۔وہ اپنے خالق سے قرب کا مزہ چکھ چکی ہیں، انہیں اسی قرب کی طلب ہوتی ہے۔وہ خالق سے قرب کے لیے تڑپتی ہیں۔وہ اپنے رب سے قربت میں سکون واطمینان حاصل کرتی ہے۔جب ہم اللہ سے قریب ہوتے ہیں' خلوص کے ساتھ اس کی عبادت کرتے ہیں' قرآن پڑھتے ہیں' تو ہماری روح اللہ سے قریب ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو عبادت کرتے ہوئے سکون ملتا ہے، کیونکہ وہ اخلاص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں۔دنیا خوبصورت ہے' بے شک' یہ دولت' یہ خوبصورتی' سب بہت اچھا ہے۔لیکن انسان جب اپنے اصل مقصد سے پیچھے ہٹتا ہے۔اپنے مقصد حیات سے لاتعلق ہوجاتا ہے' تو وہ اسی طرح بے چین و بے قرار پھرتا رہتا ہے۔اس کا دل مرجھا جاتا ہے۔وہ جیتے جیتے مر جاتا ہے۔" شمائلہ کہے جا رہی تھیں جب کہ نیلوفر کے آنسو تھے جو رک ہی نہیں رہے تھے۔وہ اشک بار آنکھیں لیے ان پہ نظر ڈالتی ہے۔

"مقصد حیات کیا ہے ہمارا؟" نیلوفر کے اندر ٹھہراؤ سا حائل ہے۔

"اپنے اللہ کی عبادت کرنا۔اس کی تعریف کرنا۔اس کی بنائی گئی دنیا پر خوشحالی پھیلانا۔دین کی پیروی کرنا۔حضور ﷺ کی نصیحتوں پر چلنا۔یہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔"نیلوفر کا دل بھاری سا ہونے لگ گیا تھا۔دل اتنا وزنی ہوگیا تھا کہ اسے لگنے لگا کہ وہ اسی وقت زمین میں دھنس جائے گی۔

"اگر میں یہ کروں،تو مجھے کیا سب کچھ مل جائے گا؟" نیلوفر نے استفسار کیا تو شمائلہ نے سر نفی میں ہلادیا۔

"یہ سب آپ کو دنیا میں کوئی سامان لا کر نہیں دے سکتا۔وہ تو اللہ، ہمارے رب پر منحصر ہے۔جس کو دولت ملنی ہوتی ہے اسے مل جاتی ہے۔چاہے حرام طرز اختیار کرے یا نہیں، جتنی دولت لکھی ہوتی ہے وہ ملنی ہی ملنی ہے۔یہ چیزیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی۔وہ رازق ہے نیلوفر۔وہ تنگی دیتا ہے' اور خوشحالی بھی۔وہ صحت دیتا ہے' اور بیماری بھی۔ہم اس کے کارناموں پہ سوال نہیں اٹھا سکتے۔کیونکہ خدا زوالجلال کی حکمت تک پہنچنا' ہم حقیر انسانوں کے بس کی بات نہیں۔مگر ہم اس کی مرضی پر کھلے دل سے سر جھکا سکتے ہیں۔اور پھر دیکھیئے گا آپ کو تنگی بھی سکون بخشے گی؛کیونکہ آپ جانتی ہوں گی یہ تنگی آپ کے رب کی دین ہے۔آپ بیماری میں بھی خوشی محسوس کریں گی؛کیونکہ آپ کو علم ہو گا کہ یہ بیماری آپ کے رب کی طرف سے ہے۔زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے جب ہم اللہ کی ذات میں پناہ لیتے ہیں، اور اپنی تمام خواہشات کا حصول چھوڑ دیتے ہیں۔"

"کیا واقعی میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ باقی ہے؟ کیا میں واقعی جنت میں جا سکتی ہوں شمائلہ؟ کیا وہ رب مجھے معاف کر سکتا ہے؟" نیلوفر رو کے ہی کہتی ہے، جیسے وہ اس احساس کے لیے ترس رہی ہو، جیسے وہ اندر سے ٹوٹ رہی ہو۔

اس کے دل میں بسی محرومی جوش لے اٹھتی ہے۔

"وہ تو آپ کا رب بہتر جانتا ہے نیلوفر۔لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟"

یہ سنتے ہی نیلوفر کسی گہری سوچ میں کھو جاتی ہے، کسی گہرے خیال میں جیسے گم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"وہ تو آپ کا رب بہتر جانتا ہے نیلوفر۔ لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" وہ فقرہ نیلوفر کے دماغ میں گھومے جارہا تھا۔ وہ نم آنکھیں لیے اب بھی اسکرین کو گھورے جارہی تھی۔ وہ بھی ایک دفعہ کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اپنی ماضی میں کی گئی غلطیوں کو درست کرنا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن کیسے؟ نیلوفر یہی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پہ کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔ نیلوفر جیسے گہرے خواب سے جاگی۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھوں میں پھیلی نمی رگڑی اور چہرہ نارمل کیا۔ چہرے پہ اب ازلی کرختگی اور سختی طاری تھی۔ وہ اپنے اندر پیدا ہوتی اس تبدیلی کو کسی پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کم ان۔" وہ روکھے سے انداز میں بولی۔ آنکھوں کی بے نیازی لوٹ آئی تھی۔

شمس اندر چلتا ہوا آیا۔ چہرے کا ہر زاویہ مرجھایا ہوا تھا، کندھے شل تھے۔ چال کافی سست تھی۔ نیلوفر اسے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی بری خبر ساتھ لایا تھا۔ آج کل، ان کی ہر بری خبر احمد کے ارد گرد ہی گھومتی تھی، نیلوفر کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ بری خبر بھی احمد کے متعلق ہی ہوگی۔

شمس نیلوفر کی مخالف سمت رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔

"نیلوفر۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔" شمس اداس سے لہجے میں بولا تو نیلوفر نے اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

"ہاں بتاؤ؟" وہ متعجب سی ہو کے بولی۔

”میں نے کچھ بہت غلط کر دیا ہے نیلوفر۔ لیکن میرا یقین کریں‘ میں دغا باز نہیں ہوں۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔ وہ بس ایک کمزور لمحہ تھا، میں نے اس کے بعد ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔“ شمس اداسی سے بولا۔ نیلوفر کی دلچسپی اب انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ شمس نے ایسا کیا کیا تھا؟ اسے بھرپور تجسس ہو رہا تھا۔

”میں سن رہی ہوں۔“ وہ متجسس ہو کے بولی۔

”احمد دبئی گیا تھا‘ اور میں جانتا تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔“ یہ سنتے ہی نیلوفر نے کرنٹ سا کھایا۔ آنکھوں میں بے یقینی سی پھیلنے لگی۔ ان سب نے کام اتنا صفائی سے کیا تھا‘ پھر کیسے وہ دبئی پہنچ سکتا تھا؟ اس نے سوچا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ وہ نیم برہم ہو کے بولی تھی۔

”میں مجبور تھا نیلوفر‘ اس لمحے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے میری کمزور کڑی ڈھونڈ نکالی تھی نیلوفر۔ اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔“ یہ سنتے ہی نیلوفر چونک اٹھی۔ اس نے اوپر سے نیچے شمس پہ استہزا انگیز نظر ڈالی۔ یہ موٹی ناک والا‘ لمبا چوڑا مرد بھی کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہو سکتا تھا؟ اس نے سوچا۔

”کیا مطلب؟ کیسے کیا اس نے بلیک میل؟“ وہ الجھ کے بولی تھی۔ شمس کا چہرہ مزید بجھ گیا۔ نیلوفر کو تو کچھ لمحے ایسا لگا جیسے وہ رونے ہی لگ جائے گا۔ شمس کے پاس بھی اب سچ بتانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔۔۔ لیکن یہ سچ۔۔۔ اس کی بربادی کا سبب بن سکتا تھا۔

”اس کے پاس میری ایک ویڈیو ہے نیلوفر۔جب وہ چار ہیرے میں نے دیکھے تھے تو میرے دل میں لالچ آگیا تھا۔وہ ہیرے تھے ہی اتنے خوبصورت‘ کیا واقعی اس میں میرا قصور ہے؟ میں نے وہ ہیرے ہتھیانے ہی ہتھیانے تھے۔اس لیے‘ میں نے عبداللہ کو انکرپٹڈ موبائل سے کال کی۔میں اس دن ہمارے پارٹی پلیس والے فارم ہاؤس میں تھا اور نشے میں دھت تھا۔میرا دھیان کیمرے پہ گیا بھی نہیں۔میں نے اسے بیسمنٹ کی چابیاں فراہم کرنے کی آفر دی،بدلے میں دو ہیرے وہ رکھ لے اور دو میں۔میرا ارادہ تھا کہ میں اسے ہسپتال سے واپسی پہ ہی ختم کرکے سارے ہیرے ہتھیا لوں گا۔ لیکن وہ بہت چالاک نکلا۔اس نے میری آفر قبول نہ کی‘ اور ہوشیاری سے وہ ہیرے بھی چرا لیے۔احمد کے پاس وہ ویڈیو موجود ہے۔اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کے دبئی جانے کا بتایا تو وہ ویڈیو لیڈی اقتدار کو دے دیگا۔میں ڈر گیا تھا نیلوفر، میں جانتا تھا کہ وہ میرا حال خراب کر دیں گی۔میں واقعتہً مجبور تھا۔“ نیلوفر ہکا بکا بس شمس کو سنتے گئی۔ ماتھے پہ پھیلی شکن ڈھیلی ہوتی گئیں۔ اس کے دماغ میں اس وقت کچھ اور چلنے لگا تھا۔اس کا دماغ‘ اس سب صورتحال میں ایک نیا زاویہ دکھانے لگا تھا۔

”جان لو نیلوفر جب تک ہم سب میں اتحاد ہے،تب تک ہمیں کوئی نہیں توڑ سکتا۔اور جس وقت ہمارے درمیان ہلکی سی بھی دراڑ آئی، ہم اس ہی وقت برباد ہو جائیں گے۔“ کچھ ماہ پہلے کہا گیا لیڈی اقتدار کا وہ جملہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔وہ گہرے خیال میں جیسے کھوگئی تھی۔۔۔ایک دراڑ۔۔۔بس ایک دراڑ ہی تو ڈالنی تھی اسے۔۔۔نیلوفر نے نظر شمس کے اوپر ڈالی جو کہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔چہرہ اب بھی نادم تھا۔

”میں واقعی بہت شرمندہ ہوں نیلوفر۔ پلیز مجھے لیڈی اقتدار سے بچا لیں۔ میں واقعی اپنی ہر حرکت درست کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ گیلے لہجے میں التجائیہ انداز میں بولا۔ نیلوفر نے چہرے کے تاثرات نرم کیے۔

”تم فکر نہ کرو۔“ وہ گلا صاف کرتے بولی۔ ”تم وفا دار ہو‘ اسی لیے تم نے مجھے سب کچھ درست وقت پہ بتا دیا۔ میں یقیناً تمہیں بچا لوں گی۔ فکر نہ کرو۔“ وہ نرمی سے مسکراتے بولی۔ شمس کا چہرہ اچانک سے کھل اٹھا۔ وہ جانتا تھا وہ نیلوفر پہ اعتماد کر سکتا تھا۔

”میں جانتا تھا نیلوفر‘ آپ مجھے ضرور سمجھیں گی۔“ شمس بولا تو نیلوفر کی آنکھیں ممنون سے تاثر میں ڈھلنے لگیں۔ چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ بکھری۔

”تم نے میرے اوپر کتنے احسانات کیے ہیں شمس۔ اتنا تو میں کر ہی سکتی ہوں۔“ وہ بظاہر خوشدلی سے بولی۔ شمس نے ایک پر سکون سی سانس خارج کی اور کھڑا ہو گیا۔ وہ مڑ کے کمرے سے جانے لگا۔ نیلوفر اسے جاتے ہوئے دیکھتی گئی۔ اور جیسے ہی وہ گیا نیلوفر کے چہرے پہ پچھلی نرمی زائل ہوئی۔ خوشگوار مسکراہٹ دم توڑتی گئی۔ ممنون سی نگاہیں شعلہ باز ہونے لگیں۔ چہرے پہ ہر طرف تناؤ سا پھیل گیا تھا۔

”میرا جرائم کی اس دنیا سے الوداع کہنے کے وقت ہوا جاتا ہے۔“ وہ آواز میں لگن لیے بولی۔

دماغ میں منصوبہ بھی تیار تھا۔۔۔

لیکن کیا صرف منصوبے کا بن جانا ہی کافی تھا؟

ہر منصوبہ کامیاب تھوڑی نا ہوتا ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مغرب قضاء ہوتے ہی اسلام آباد کو کالے بادلوں نے گھیر لیا تھا۔دفعتاً بادل برس پڑے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی

آسمان سے جاری ہوئی۔رات جیسے ہی گہری ہوتی گئی اس بارش نے طوفان کی صورت اختیار کرلی۔دل خراش سا طوفان،جس میں ہوا کے زور دار تھپڑوں کی آمیزش تھی۔

احمد اپنے بستر کے کنارے اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔کمرے کی کوئی بھی بتی نہیں جل رہی تھی، جس کے باعث کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔آسمان پہ بجلی چمکتی تو کچھ لمحوں کے لیے کمرہ بھی چمک اٹھتا۔کمرہ چمک اٹھتا تو اس کے چہرے کے تاثرات ہمیں نظر آتے۔اس کے چہرے پہ بے چینی سی تھی۔جیسے اندر سے کوئی شے اسے کھل رہی ہو۔کچھ تھا جو اسے بے قرار کر رہا تھا۔

تیز بارش کی کھڑکی سے ٹکرانے کی آواز اس کے کمرے میں گونج رہی تھی۔تیز ہواؤں کے باعث جھومتے درختوں کی آواز بھی گونج رہی تھی۔یہ موسم، یہ آوازیں، اس کے دل میں بسی بے چینی کو مزید بڑھاوا دے رہی تھیں۔

"کیا ہو اگر میں اب بھی نہ جیت سکا؟" اس کے دل سے ایک آواز آئی۔ایک خوف تھا، ایک خدشہ تھا۔جو ایک بار پھر سے آنکھوں کے سامنے منڈلایا۔سالوں پرانی جنگ نہ جیتنے کا خوف۔۔۔یہ خوف اندر ہی اندر اسے بے حد بے چین کیے ہوئے تھا۔وہ کیا کچھ نہیں کھو چکا تھا۔۔۔اس نے اپنے سامنے

کتنی اموات ہوتے دیکھیں تھیں۔۔۔اس سب کے باوجود بھی اگر وہ ہار گیا؟ اس سب کے باوجود بھی‘ اگر وہ طاقتیں غالب رہیں؟

”اس سب کے بعد بھی اگر مجھے انصاف نہ ملا؟ اگر وہ ساری جانیں بھی رائگاں چلے گئی تو؟ تو میں کیا کر لوں گا؟“ اس کے دل سے ایک اور آواز ابھری۔احمد کا دل ڈوبنے لگا۔

ٹھیک اسی وقت اس کے عقب میں پڑا موبائل تھرتھرایا۔کسی کا واٹس ایپ پہ میسج آیا تھا۔احمد کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا تو وہ موبائل کی جانب متوجہ ہوا۔یہ میسج ان نون نمبر سے آیا تھا۔اس کی آنکھوں میں مشکوک سا تاثر ابھرا۔اس نے بہرحال واٹس ایپ چیٹ کھولی۔

”میں نیلوفر۔کیا ہم مل سکتے ہیں؟“ احمد وہ میسج پڑھتے ہی چونک گیا۔یہ اس سے ملنا کیوں چاہ رہی تھی؟اس نے سوچا۔

”میں تم لوگوں کے اوپر بھروسہ کیوں کروں؟“ احمد نے یہ میسج ٹائپ کیا۔نیلوفر کا جواب فوراً ہی آگیا تھا۔

”دیکھو احمد۔میرا ملنا تم سے بہت ضروری ہے۔تم جگہ اور وقت،اپنی تسلی کے لیے، اپنی مرضی کا ہی بتا دو۔میں پہنچ جاؤں گی۔لیکن میں تم سے ضرور ملوں گی۔“ نیلوفر کا یہ میسج پڑھ کے احمد کے ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے پڑے۔کیا ہوگا اگر یہ صرف ایک کھیل ہو؟ یہ سب ایک ٹریپ ہو؟ لیکن پھر وہ اسے اپنی مرضی کی جگہ کیوں بلوارہی تھی؟ احمد کو پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ یہ سب کوئی ٹریپ نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کی سنی اور نیلوفر کو آفس کے پاس ایک ریسٹورانٹ میں بلا لیا۔وہ اپنے آپ کو ذہنی

طور پہ اس ملاقات کے لیے تیار کرنے لگا۔دل میں طرح طرح کے سوال تھے۔تجسس بھی تھا کہ آخر وہ اس سے ملنا کیوں چاہ رہی تھی۔

موبائل بند کرکے وہ پھر سے اسی طرح سے بیٹھ گیا۔روح میں بسی بے چینی لوٹ آئی تھی۔بارش کی رفتار میں اضافہ ہورہا تھا اور بادل ٹکرانے کی آوازیں اب وقفے وقفے کے بعد جاری تھیں۔وہی خوف' ایک دفعہ پھر سے اس کے دل میں لوٹ آیا۔یہ جنگ ہار جانے کا خوف۔۔۔انصاف نہ حاصل کرنے کا خوف۔۔۔اس جنگ میں مزید کچھ کھو جانے کا خوف۔۔۔

ایک دفعہ پھر سے آسمان پہ بجلی کی گرج چمک ہوئی تو احمد کا کمرہ بھی جگمگایا۔اب اس روشنی میں ہمیں احمد اپنے بستر سے کھڑا ہوتا نظر آیا۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا۔اس نے کمرے کی بتیاں جلائیں۔کمرے کی بتیاں جلیں' تو اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔اس نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔وہ اپنے غسل خانے تک گیا اور وضوکرکے کمرے میں لوٹا۔اس کی شرٹ کی آستینوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور داڑھی بھی بھیگ چکی تھی۔وہ اب اپنی اسٹڈی ٹیبل تک گیا۔اپنا ترجمے والا' کالے سرورق والا مصحف اس نے کھولا۔نرم و ملائم صفحے پہ اس نے ایک دفعہ ہاتھ پھیرا۔ اس نے وہیں سے پڑھنا شروع کیا جہاں سے آخری مرتبہ چھوڑا تھا۔اس کے سامنے سورہ احقاف کی آیات کھلی ہوئی تھیں۔ تلاوت شروع کرتے ہی وہ اس دنیا سے لاتعلق ہونے لگا تھا۔ اپنی ساری فکریں بھلاتا گیا۔۔۔

تلاوت کے بعد اس نے اگلے صفحے پہ لکھا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

”دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا“

ترجمہ پڑھنے کے بعد وہ چہرہ سیدھا کرکے سامنے دیوار کو دیکھنے لگا۔یہ آیت جیسے اس کے ہر ڈر، اور ہر خوف کا جواب دے چکی تھی۔دل میں بسی بے چینی دم توڑتی گئی۔وجود میں سکوت بڑھتا گیا۔

”یا اللہ، اور میں یہ سمجھا تھا، کہ میں واقعی اس دنیا میں انصاف لے سکوں گا۔مجھے نہیں بھولنا چاہئے تھا کہ اصل انصاف تو بنا ہی دوسری دنیا کے لیے ہے۔اگر ہم ہار بھی جاتے ہیں، تو یہ اصل انصاف تھوڑی ہوگا، اصل انصاف تو اسی دنیا میں ہونا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے کہے جا رہا تھا۔”اس آیت کی سب سے خوبصورت خوبی‘میری نظر میں توازن ہے۔اس آیت میں زبردست سا توازن قائم ہے اللہ۔پہلے تو ہمارے رب نے اعمال کے حساب کی بات کی۔ہر کسی کو اس کے درجے کے حساب سے انعام دیا جائے گا۔بدکاروں کو برا انجام اور نیک لوگوں کو بہتر انجام۔پھر فرمایا گیا‘یا اللہ کہ اس دن کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔یعنی جو لوگ تیرے خاطر قربانیاں دیتے آئے ہیں، نیک اعمال کرتے آئے ہیں، ان کی کوئی بھی قربانی کوئی بھی نیک عمل رائگاں نہیں جانے والا۔اور ہم میں سے جو برائی کرتے ہیں، انہیں ان کی برائی کے عین مطابق ہی سزا دی جائے گی۔اس آیت سے ہماری یہ یاددھیانی بھی ہوتی ہے کہ انصاف اس دنیا میں ملنے والی شے ہے ہی نہیں۔حق اور انصاف کے لیے تو دوسری دنیا ہے۔مجھے یہ نہیں بھولنا چاہئے تھا‘ یا اللہ۔“

بارش کی رفتار میں کمی آتے گئی‘ اور ساتھ ساتھ احمد کے دماغ میں مچی ہلچل بھی دم توڑتے گئی۔سکون اس کی روح پہ سوار تھا۔اس نے اسی میں آگے کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔

”پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا، اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں اُن کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا"

ترجمہ پڑھ کے اس نہ اپنی گردن اٹھائی اور سامنے دیوار کو دیکھا۔

”اس آیت میں ان مشرکین کی بات کی جارہی ہے جو کہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول ﷺ میں ایمان لائیں گے، اسلام پہ عمل کرتے ہوئے' صدقہ خیرات کریں گے' تو ان کی عزت پہ بٹہ لگ جائے گا۔ وہ اپنے تکبر میں اتنے جھلس گئے تھے کہ ان کو یہ سب اپنی شان میں گھٹاتا محسوس ہوتا تھا۔اس آیت میں اس طرح کے ہر انسان کا تکبر توڑا گیا ہے۔جو اس دنیا میں فساد پھیلاتا ہے، وہ بھی خدا کی اجازت سے ہی پھیلاتا ہے۔اللہ ظالمین کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس بات سے اپنی تکبر کو ہوا دیتے ہیں۔مگر پھر اس دن انہیں صرف عذاب نہیں دیا جائے گا،بلکہ ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ انھیں روزِحشر رسوا کیا جائے گا ان کے تکبر کو چکنا چور کیا جائے گا۔تکبر صرف خدا کی ذات پہ سجتا ہے، یہ اسی کی ذات تک محدود رہنا چاہیئے۔۔“

رات گہری ہوتی گئی۔بارش کی رفتار میں بھی کمی آ گئی، وقتاً فوقتاً بجلی کا زمین پہ وار ہوتا تو پورا شہر چمک اٹھتا۔اس سب سے بے خبر، احمد یوسف کی محویت اپنے مصحف میں تھی۔اس وقت اس کی زندگی میں صرف وہ تھا اور اس کا کالا سرورق والا مصحف۔باقی سب کچھ اس کے لیے جیسے بے معنی ہوگیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کی شام' موسم کافی سہانا سا ہوگیا تھا۔ ہلکے پھلکے بادل اسلام آباد کے آسمان پہ سوار تھے۔رات کی بارش کی وجہ سے فضا میں ٹھنڈ کی آمیزش کافی بڑھ گئی تھی۔

احمد اس ریسٹورانٹ کی طرف چلتا آرہا تھا جہاں پہ اس نے نیلوفر کو بلایا تھا۔ ریسٹورانٹ اس کے آفس سے کافی قریب تھا'اس لیے وہ ریسٹورانٹ تک پیدل ہی سفر کر رہا تھا۔اس نے کالی، پوری آستین کی ٹرٹل نیک شرٹ پہنی ہوئی تھی اور جینز کی پینٹ تھی۔ہاتھوں میں مہنگی گھڑی سج رہی تھی۔بال نفاست سے سیٹ کیے ہوئے تھے۔وہ ریسٹورانٹ میں داخل ہوا تو نیلوفر وہاں پہلے سے ہی موجود تھی۔اس نے دانستہ طور پہ بیچ والی ٹیبل چنی تھی۔

احمد کے آتے ہی نیلوفر چوکنا سی ہوگئی۔وہ موبائل استعمال کر رہی تھی، اس کے آتے ساتھ ہی اس نے اپنا موبائل پرس میں ڈال دیا۔وہ اپنے آپ کو اس ملاقات کے لیے سنجیدہ ظاہر کرنے لگی۔احمد لاپرواہ سے انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔نیلوفر اسے دیکھتے ہی تکلفانہ سا مسکرائی۔

"کچھ کھانا پسند کرو گے؟" نیلوفر نے آنکھوں سے سن گلاسز اتارتے پوچھا۔احمد نے اب اس کی آنکھوں میں دیکھا جو کہ ویران لگتی تھیں۔وہ اسے دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ وہ اندر سے ڈسٹرب تھی۔

"بس ڈرنکس منگوالیتے ہیں۔" احمد نے انداز مصروف رکھا۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نیلوفر اس سے کیا بات کرنے آئی تھی۔

نیلوفر نے ویٹر سے کہہ کے دو سموديز منگوائیں۔احمد کی طرف مخاطب ہو کے اس نے بات شروع کی۔

”میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنے آئی ہوں احمد۔“ اس نے گردن جھکائی۔وہ جیسے الفاظ تلاش کر رہی تھی۔اب اس نے اپنی گردن اٹھائی۔اس کے چہرے پہ اداس سی مسکراہٹ بکھری۔احمد بظاہر پرسکون تھا مگر اندر سے وہ نیلوفر کے ہر انداز کو بغور جانچ رہا تھا۔

”تم حافظ ہو احمد۔کیا میں تم سے ایک سوال کر سکتی ہوں؟“ نیلوفر کی آواز لڑکھڑائی تھی۔احمد ذرا سا چونکا۔

یہ بات اسے چونکا گئی تھی کہ وہ اس کے حفظ کے بارے میں جانتی تھی۔

”میرے حفظ کے بارے میں تمہیں کیسے پتا چلا؟“ وہ حیران ہو کے بولا تو نیلوفر استہزائیہ سے انداز میں ہنس دی۔

”ہم تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں احمد۔بہت کچھ' جس سے شاید تم خود بھی واقف نہیں۔“ وہ نرمی سے مسکرا کے بولی۔یہ سن کے احمد کے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ بکھری۔

”ایسا کیا ہے؟ وہ کون سا راز ہے جس سے میں بھی آشنا نہیں ہوں؟ وہ راز جس کی وجہ سے تم لوگ مجھے نہیں مارتے؟ میرا تم سب سے آخر کیا تعلق ہے؟“ احمد نے سوالیہ نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔یہ سوال وہ ایک مدت سے خود سے کر رہا تھا، وہ ان سوالات کا جواب' بس تلاش کرنا چاہتا تھا۔نیلوفر کا چہرہ اچانک سے بجھ سا گیا۔

"میں تمہیں۔" اس نے حلق میں تھوک نگلا۔ "تمہیں نہیں بتا سکتی۔" اس کی آواز ایک بار پھر لڑکھڑائی تھی۔ احمد نے بے یقینی سے نیلوفر کو دیکھا۔ اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"تم کیا پوچھنا چاہ رہی تھی؟" اس نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔ نیلوفر نے سر اوپر نیچے ہلایا۔ آنکھوں کی ویرانی، آنکھوں کی اداسی لوٹ آئی۔

"احمد۔" نیلوفر نے نظر احمد پہ ڈالی۔ "میں نے بہت غلط کام کیے ہیں۔ قتل کیے ہیں۔ لوگوں کے کاروبار جلائے ہیں۔ انسانوں پہ ظلم ڈھائے ہیں۔ میں نے درندگی کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔" نیلوفر کی آنکھیں مزید اداس ہوئیں۔ ان میں پچتاوا واضح تھا، بے چینی بھی واضح تھی۔ "تم کوئی سے بھی برے عمل کا نام لو گے، وہ میں نے کیا ہو گا۔ میری برائی اس درجے کی ہے احمد۔ کیا اس سب کے باوجود بھی اگر میں معافی مانگوں؟ میں اپنے رب کی اتنی خطیر نافرمانی کے بعد بھی اگر معافی مانگوں' تو کیا مجھے معاف کیا جائے گا؟ کیا اب بھی میرے لیے کوئی امید باقی ہے؟" وہ آواز میں ڈھیروں آس لیے بولی تھی۔ احمد بھی نیلوفر کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بالکل ہے۔ ہر گناہ گار کے لیے امید ہوتی ہے نیلوفر۔ میرے لیے بھی ہے، آپ کے لیے بھی ہے، ہم سب کے لیے ہے۔" وہ نرمی سے بولا تھا۔ نیلوفر کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"اس سب کے باوجود بھی؟ میں نے کوئی عام سے گناہ تو نہیں کیے احمد؟" نیلوفر حیران ہوئی۔

"یہی فرق ہے بندے اور خدا میں نیلوفر۔ وہ کسی خاص وجہ کی بنا پہ خدا کہلایا جاتا ہے، ہم سب کا رب کہلاتا ہے۔ آپ خدا کو انسان کے اسکیل پہ رکھ کے جج کر رہی ہیں جب کہ خدا تو خدا ہے۔ وہ ہم سب سے بڑا ہے۔ یہ بڑائی یہ بزرگی ہی اسے خدا بناتی ہے نیلوفر۔ وہ رحمٰن ہے نیلوفر، وہ رحیم بھی ہے۔ وہ غفور ہے، مجھے نہیں لگتا کہ اگر آپ اپنے اعمال درست کریں گی اور سچے دل سے توبہ کریں گی تو وہ آپ کو رسوا چھوڑ دے گا یا وہ آپ کو معاف نہیں کرے گا۔" وہ تحمل سے بولا تھا۔ نیلوفر کی آنکھ سے ایک آنسو پھوٹ کے نکلا۔ اور وہ اسی رب سے بد ظن تھی، وہی رب جو احمد کا تھا، وہی رب جو شمائلہ کا تھا۔ وہ دونوں اس کے سامنے تھے، اور وہ کیا تھی؟ وہ کیوں اس رب کو پہچان نہ سکی؟

"سورۃ زمر میں خدا نے فرمایا ہے نیلوفر:

(اے نبی ﷺ) کہہ دو کہ' اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پہ زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقینا سارے گناہ اللہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔

نیلوفر یہ ہے ہمارا رب۔ اس کے در کبھی بند نہیں ہوتے ہیں۔ آپ انہیں کھٹکھٹا کے تو دیکھیں؟" احمد کے چہرے پہ آسودہ سی مسکراہٹ ابھری۔ نیلوفر کی آنکھ سے بے اختیار آنسو بہہ نکلا۔ اسے جیسے ہی اندازہ ہو اس نے اپنا آنسو پونچھا اور شرم سے سر نیچے جھکا لیا۔ اس نے گیلی سانس اندر کھینچی اور اپنا گلا صاف کیا۔ ایک دفعہ پھر سے اس نے نظر اٹھا کے احمد کو دیکھا۔

"کیا مجھے گرفتاری دینی چاہئے احمد؟" آواز اب بھی گیلی تھی۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ گرفتاری دینے سے آپ کے اعمال درست ہوسکتے ہیں' تو آپ کو دے دینی چاہئے۔اسی میں بہتری ہے۔لیکن ہاں، آپ کو ایک دفعہ اپنے اعمال درست کرنے کی کوشش کرنی چاہئے نیلوفر۔" نیلوفر نے سوچتے سمجھتے سر اثبات میں ہلایا۔اس نے ایک دفعہ پھر سے گلا کھنکارا۔

"میں وہی کرنے یہاں آئی ہوں۔یہ سمجھ لو کہ اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتی ہوں آج۔میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں احمد۔" نیلوفر مسکرا کے بولی۔احمد کی آنکھیں پھیلیں۔اس نے اچنبھے سے نیلوفر کو دیکھا۔

"کس طرح؟" اس کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔

"تمہارے پاس شمس کی ایک ویڈیو ہے احمد۔عبداللہ سے گفتگو والی، اس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔تم وہ ویڈیو مجھے دے دو۔اس کے بدلے میں تمہیں کچھ بہت خاص دوں گی۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے نیلوفر معنی خیز سا مسکرائی۔احمد کو استعجاب نے گھیر لیا۔

"کیاخاص؟" اس نے سرگوشانہ انداز میں پوچھا۔نیلوفر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک بھورا لفافہ نکالا۔لفافے میں کچھ تھا، کچھ چھوٹا سا۔لفافے کے اوپر کالے موٹے مارک سے کچھ لکھا ہوا تھا۔وہ لفافہ نیلوفر نے احمد کی طرف بڑھایا۔احمد نے اس لفافے کو تھام لیا۔اس لفافے پہ لکھے چند سطور پڑھ کے پہلے تو اس کے چہرے پہ بے یقینی پھیلی۔پھر ایک خوشگوار مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بکھری۔وہ زور زور سے ہنسنا چاہ رہا تھا، اس سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”کیا یہ وہی ہے جو میں سوچ رہا ہوں؟“ نیلوفر اور احمد کی معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔نیلوفر نے ایک ادا سے سر کو خم دے کے احمد کے اندازے کی تصدیق کی۔احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔اس کے دماغ میں لائحہ عمل تیار تھا۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسی خوشگوار شام میں ہم اپنا رخ تحریک حرر کے آفس کی طرف موڑتے ہیں۔

لال کارپٹ اور کالی دیواروں والے بنکر کی طرف آئیں‘تو ادھر در فشاں، حسام اور مناج نظر آتے تھے۔تینوں کے چہرے پہ خوشگوار سا تاثر اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ ان کا دماغ بھی کچھ بُن چکا تھا۔

”اس کا خیال پہلے آجانا چاہئے تھا۔کتنی ہی بیوقوف عورت تھی وہ جو کیمراز کے سامنے ہی قتل کر بیٹھی۔“ در فشاں چہک کے بولی۔وہ عمارہ کے قتل کے بوجھ سے بالآخر خود کو بری کرنے لگی تھی اور آج کل کافی خوش باش ہی رہتی تھی۔

”ہم اس ویڈیو کو وائرل کر دیں گے اور پھر لیڈی اقتدار کا اقتدار ختم۔“ حسام جوش میں آکے بولا۔ مناج بھی پھیکا سا مسکرائی۔دل کو لیکن یقین نہیں آرہا تھا کہ لیڈی اقتدار اتنی بڑی حماقت بغیر سوچے سمجھے کر دے گی۔وہ ایک کولڈ بلڈڈ کرمنل تھی‘ پھر یوں کیمراز کے سامنے قتل کیوں کرے گی؟ مناج کو سمجھ نہیں آرہا تھا، تصویر کا کوئی زاویہ تھا جو اس نے دیکھا نہیں تھا، وہ جانتی تھی۔

درفشاں، حسام اور مناج اب کمپیوٹر کی طرف والی کرسیوں پہ براجمان ہو گئے۔ حسام نے لیپ ٹاپ کھولا۔

لیپ ٹاپ کی ونڈوز کچھ دیر بعد کھل گئیں۔اس نے اب عمارہ والی پوری ویڈیو لیپ ٹاپ پہ ڈھونڈی۔ کچھ دیر بعد انہیں وہ ریکارڈنگ مل گئی۔ مناج کا دل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ دل سے ایک آواز آتی تھی کہ۔۔۔اتنی آسانی سے؟۔۔۔نہیں۔۔۔!

حسام نے وہ ریکارڈنگ کھولی۔کچھ دیر لوڈنگ ہوئی۔اور پھر ایک ایرر میسج اسکرین پہ آیا۔ریکارڈنگ کی فائل کرپٹ تھی۔پوری ریکارڈنگ بے کار ہو گئی تھی۔سب کے چہروں کی خوشگوار مسکراہٹیں فنا ہوئیں۔مناج جب کہ پرسکون تھی۔اسے اندازہ تھا آخری وقت میں کچھ غلط ضرور ہونا تھا۔

"حسام۔" مناج مشینی انداز میں کھنکاری۔"یو ایس بی چیک کرو' اس میں سارا بیک اپ تھا۔" مناج نے بات مکمل کی تو حسام کھڑا ہوا۔بنکر میں ہی ایک کمپارٹمنٹ تھا جو کہ بظاہر دیوار کا ڈیزائن ہی لگتا تھا۔ حسام نے ڈیسک سے ایک میگنیٹ کا ٹکڑا اٹھایا۔درفشاں مضطرب سی ہو کے حسام کو دیکھ رہی تھی۔مناج اب بھی پرسکون سی سیدھی بیٹھی تھی۔نگاہیں سرد تھیں۔

"اف مناج۔بس اب یو ایس بی میں وہ ریکارڈنگ موجود ہو۔" درفشاں ہارے ہوئے انداز میں بولی۔

مناج نے کوئی جواب نہ دیا۔

حسام اس کمپارٹمنٹ تک پہنچا۔اس نے میگنٹ کمپارٹمنٹ کے قریب کیا تو وہ خود بخود باہر آنے لگا۔ اس

کمپارٹمنٹ میں کچھ فائلز تھیں اور ایک نیلی یو ایس بی بھی۔اس نے یو ایس بھی نکالی اور واپس اپنی کرسی پہ آیا۔

اس نے یو ایس بی لیپ ٹاپ پہ لگائی۔یو ایس بی کی فائل اب وہ کھولنے لگا۔دل میں اندر ہی اندر وہ تینوں دعائیں پڑھ رہے تھے کہ وہ ویڈیو انھیں مل جائے۔

وہ یو ایس بی انہوں نے کھولی۔۔۔مناج نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی خالی ہو گی۔۔۔لیکن وہ خالی نہیں تھی۔۔۔

درفشاں کے چہرے پہ خوشی پھیلی۔

"یقینا انہوں نے کسی طرح سے یہ کمپیوٹر والی ریکارڈنگ کرپٹ کر دی ہوگی لیکن انہیں بیک اپ کا علم نہیں تھا۔"

درفشاں خوشی سے چہکی۔حسام بھی خوش نظر آرہا تھا جب کہ مناج، وہ اب بھی پوری طرح سے مطمئن نہ تھی۔

"اس ویڈیو کو پلے کرو۔" مناج ازلی انداز میں بولی۔حسام نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ویڈیو کھولی۔

ویڈیو لوڈ ہوئی۔اور پھر وہ کھل گئی۔عمارہ کی ٹیکسی والا منظر سب کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوا۔ مناج کے چہرے پہ حیرت در آئی۔درفشاں خوشی کے مارے تالیاں پیٹنے لگی۔حسام بھی خوش ہو کے سب کو دیکھنے لگا۔ایک دم سے حرر کے بنکر میں خوشگواریت پھیل گئی تھی۔

عمارہ کی ٹیکسی اب عافیت زندگی کے ہسپتال کے باہر رکی تھی۔اسکرین پہ وہ منظر واضح تھا۔اور تب ہی اسکرین کالی ہوگئی۔۔۔اسکرین نے پھر رنگ بدلے۔۔۔

اسکرین کے رنگ بدلے، ایک ڈاکیو مینٹری نہ جانے کہاں سے چلنا شروع ہوگئی تھی۔

”لیڈی اقتدار، قدرت کا ایک شاہکار، جنہوں نے پاکستان کے لیے نہ جانے کیا کچھ نہیں کیا۔ہم ذرا اس عظیم ہستی کے کارناموں پر نظر دہراتے ہیں۔“ سب کے چہروں کے زاویے اسی وقت بدل گئے۔سب کی خوشی فنا ہوئی اور آنکھیں پھٹنے لگیں۔

”اس ہستی نے پاکستان کا سب سے جدید ہسپتال بنایا ہے۔“ ڈاکیومینٹری ان سب کے بدلتے جذبات سے لاپرواہ‘ پیچھے چلے جارہی تھی۔سب بت کی طرح ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہے۔ماحول میں خوشگواریت کی جگہ سوگواری نے لے لی تھی۔

”جی ہاں! عافیت زندگی کا یہ ہسپتال جو کہ پاکستان کا سب سے بہترین ہسپتال ہے۔انہوں نے اپنے مرحوم والد کی لیگسی کو قائم و دائم رکھا۔ایک آئڈیل ڈاکٹر تو ہیں ہی لیکن ایک آئڈیل بیٹی۔۔۔“ مناج نے تنگ آکے لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کی۔ حلق تو کیا‘ اس کے تو معدے تک میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ سب کے چہرے پہ ہارا ہوا سا تاثر تھا۔

”ظاہر ہے وہ پکا انتظام کرکے ہی اتنی بڑی چال چل رہی تھی۔اس نے کچھ نہ کچھ کیا ہوگا۔لیکن کیسے؟ اس بنکر تک اور اس یو ایس بی تک‘ اسے رسائی کیسے ملی؟“ وہ آواز میں غصہ اور بے چینی لیے بولی۔

کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔سب ویسے ہی بہت مایوس تھے۔جیت کی خوشی پانی پانی ہونے کا غم الگ سے تھا۔وہ لیڈی اقتدار کو انڈر ایسٹی میٹ کر بیٹھے تھے' اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

وہ ملکہ کسی وجہ سے تھی، اتنی بڑی چال وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے نہیں چل سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن کی صبح' طلوع ہوئی تو گہرے سرمئی بادل ایک دفعہ پھر سے اسلام آباد کے آسمان پہ سوار ہونے لگے۔اور پھر بادل دفعتاً' پھوار کی صورت برس بھی پڑتے۔

اسی خوشگوار سی صبح میں ہم عافیت زندگی کے ہسپتال کا رخ کرتے ہیں۔نیلوفر اپنی سربراہی کرسی پہ براجمان تھی جب کہ لیڈی اقتدار اس کے مخالف بیٹھی ہوئی تھی۔ملکہ کے ہاتھ میں نیلوفر کا موبائل تھا اور ماتھے پہ نہ جانے کتنے بل تھے۔صاف ظاہر تھا کہ اندھیرے اور برائی کی ملکہ کسی بم کی طرح پھٹنے کو تیار تھی۔

نیلوفر آنکھوں میں بے نیازی لیے غصے سے ابلتی لیڈی اقتدار کو دیکھ رہی تھی۔لیڈی اقتدار نے طیش نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔اس کی سانسیں غصے کی شدت کے باعث پھولنے لگی تھیں۔

"اس شمس کی اتنی جرات!" وہ دانت پیستے غصے سے بلبلاتے چلائی تھی۔ عبداللہ کے ساتھ وہ گفتگو والی ویڈیو دیکھ کے ملکہ کا خون کھول گیا تھا۔نیلوفر نے بھی چہرے پہ برہمی طاری کی۔لیڈی اقتدار کھڑی ہوئی۔اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

"وہ میری ناک کے نیچے ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ اتنا بڑا دھوکہ؟ وہ بھی میرے ساتھ؟" انگلی سے اپنے سینے پہ دستک دیتے وہ طیش کے عالم میں بولی۔

"آپ کیا کریں گی اس کے ساتھ؟" نیلوفر نے پوچھا۔ آنکھیں جواب طلب تھیں۔

لیڈی اقتدار نے آگ بگولا نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔

"بے وفاؤں کی سزا۔۔۔ صرف موت!" وہ اس طرح سے چلائی تھی کہ اس کا پورا جبڑا نظر آتا تھا۔ نیلوفر کو لیڈی اقتدار سے خوف آنے لگا تھا، وہ غصے کے عالم میں خوف ناک سی نظر آتی تھی۔ ماتھے اور گردن پہ بھڑکتی نسیں اسے مزید خوف ناک بناتی تھیں۔

"شمس کو تو میں اتنی کربناک موت دوں گی کہ بس!" وہ انداز میں عزم لیے بولی تھی۔ ملکہ کے وبال کو شمس نے خود دعوت دی تھی۔ نیلوفر دل ہی دل میں مسکرائی۔ شمس کا پتا صاف ہوگیا تھا۔ دراڑ پیدا کر دی گئی تھی۔ اب اس دراڑ کو مزید وسیع کرنے کا وقت تھا۔ سب کچھ پلان کے مطابق جارہا تھا۔ احمد اور اس کے پلان کے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مہر بنت عبداللہ سلطان عنایا کے اسکول سے عنایا کے ساتھ ہی باہر آرہی تھی۔ وہ اسکول سے باہر نکلتے ہوئے عنایا سے باتیں کر رہی تھی' اس سے اسکول میں ہونے والے چیزوں کے بارے میں سوالات کر رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مہر اب اپنی گاڑی تک گئی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھولنے لگی تھی تب اس کی نظر فٹ پاتھ پہ بیٹھے ایک بچے پہ گئی۔

وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے تھم گئی۔ عنایا گاڑی میں، جب کہ بیٹھ چکی تھی۔ مہر نے گاڑی کا دروازہ کھول کے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی کا اے سی چلایا۔

"عنایا، میں بس ابھی آئی۔" کہتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے اس بچے تک پہنچی۔ وہ بچہ آٹھ سال کے قریب تھا۔ اس کے عقب میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں جو کہ اس کے اسکول کی کتابیں لگتی تھیں، لیکن وہ اسکول کے یونی فارم میں نہ تھا۔ اس کے کپڑوں پہ، ہاتھ اور منہ پہ دھول اور مٹی تھی۔ مہر اس بچے کے بالکل قریب آ چکی تھی۔

"کیا حال ہے بیٹا؟" وہ نرمی سے بولی۔ اس بچے نے مہر پہ نظر ڈالی۔

"کیا آپ یہ کتابیں خریدنا چاہیں گی؟" وہ لڑکا فوراً سے بولا۔ مہر چونک گئی۔ تو وہ اپنی کتابیں بیچ رہا تھا؟ لیکن کیوں؟ مہر نے سوچا۔

"بیٹا آپ یہ کتابیں کیوں بیچ رہے ہیں؟" مہر نے نرمی سے پوچھا۔ اس لڑکے نے اپنی گردن جھکا لی۔ گردن اٹھائی تو اس کی آنکھیں غمگین تھیں، چہرے پہ رنج بھرا ہوا تھا۔

"میرے بابا کی چار ماہ پہلے ڈیتھ ہو گئی ہے۔ اسکول کب کا چھوڑ دیا ہے، اب خرچہ پورا کرنے کے لیے یہ کتابیں بیچنی پڑ رہی ہیں۔" وہ اداس سا مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کتنی پیاری تھی ناں۔۔۔ یہ ننھی مسکراہٹ اس سب کی حقدار تو نہ تھی۔ مہر نے سوچا۔ وہ بچہ بھی کتنا پیارا تھا۔ معصوم سا۔ مہر کے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ محلوں میں رہنے والی لڑکی تھی، شروع سے لے کر آج تک وہ آسائشوں میں پلی بڑھی، وہ ان مسائل کو کیسے جانتی؟ وہ جھک کے اس بچے کے برابر میں آ کے بیٹھی۔ بچا تھوڑا سا ہچکچایا۔

"کیا آپ اسکول نہیں جانا چاہتے؟" مہر نے نرمی سے پوچھا۔ بچے نے ایک دفعہ پھر سے گردن جھکا لی۔

"جانا چاہتا ہوں۔" وہ اداسی سے بولا۔ مہر مسکرائی۔ اس نے نرمی سے اس بچے کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"نام کیا ہے آپ کا؟" مہر نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پوچھا۔ بچہ اب پرسکون ہونے لگا تھا۔ اسے مہر خاصی اچھی معلوم ہوئی تھی۔ وہ کتنی نرم مزاج تھی، کتنی مہربان تھی۔ اس بچے نے سوچا۔

"ارسلان۔" اس کی ہچکچاہٹ اب مکمل دم توڑ چکی تھی۔

"ارسلان؟" مہر مسکرائی۔ "بہت پیارا نام ہے۔" مہر نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکالا۔ وہ کارڈ اس نے اس بچے کو تھمایا۔ بچہ کنفیوژ سا ہو کے اس کارڈ کو دیکھنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہ آپ اپنی ماما کو دے دینا۔ کہنا کہ اس نمبر پہ کال کر لیں، میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔" مہر نے ایک دفعہ پھر سے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ہزار کے دو نوٹ نکالے۔ تھوڑی دیر اسرار کے بعد ارسلان نے وہ نوٹ لے لیے۔

"یہ بھی رکھ لو۔ آج سے آپ سب' میری ذمہ داری ہو۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔ ارسلان آنکھوں میں ممنون سا تاثر لیے اسے دیکھتا رہا۔ چہرے پہ بے انتہا خوشی تھی۔

"آپ بہت مہربان ہیں باجی۔" وہ جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ مہر زیر لب ہنس دی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"میں مہر ہوں، اور میں تخلیق ہوں اس رب کی، جو کہ مہربان ہے۔" وہ عاجزانہ انداز میں بولی۔اس نے ایک دفعہ پھر سے ارسلان کے بالوں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"یاد سے بیٹا، آپ دے دینا۔" وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ارسلان نے مسکرا کے سر اثبات میں ہلایا۔ مہر دل میں ایک عجیب سا احساس لیے گاڑی میں واپس لوٹی۔عنایا اپنا بچا ہوا لنچ کھانے میں مگن تھی۔ اس نے عنایا پہ نظر ڈالی، وہ خوش تھی، اس کی بچی خوش تھی۔اپنا کھانا پینا کر سکتی تھی۔مگر ایسے بہت تھے جو نہیں کر پاتے تھے۔ایسے بہت بچے ہوں گے جو کہ پڑھنا چاہتے تھے لیکن نہیں پڑھ پا رہے ہوں گے۔ایسے بہت سے والدین ہوں گے جو کہ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہوں گے لیکن پڑھا ہی نہیں پا رہے ہوں گے۔مہر اس وقت یہی سوچ جا رہی تھی۔ارسلان سے اس مختصر ملاقات نے اسے بہت کچھ سوچنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

ایک خیال نے مہر کے دماغ میں جنم لیا۔۔۔ایک انوکھا خیال۔۔۔ایک عزم نے مہر کے دل میں موہر لگائی۔۔۔

اس کی کاروبار میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔اس کو اپنے ڈیڈ کی کمپنی سے دور دور تک لگاؤ نہ تھا۔۔۔شاید وہ کبھی کاروبار کرنے کے لیے، اپنے ڈیڈ کی کمپنی سنبھالنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔۔۔مہر نے اس وقت سوچا۔۔۔ہاں!وہ کبھی اپنے کام سے خوش نہیں تھی کیونکہ وہ یہ کام کرنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔اس نے تو کچھ اور کرنا تھا۔۔۔اپنے حالیہ کام سے لاکھ درجہ بہتر۔۔۔اپنے کام سے لاکھ درجہ تسلی بخش۔۔۔!

"مام' آپ گاڑی کیوں نہیں چلا رہیں؟" چھوٹی عنایا رول کا لقمہ بھرتے بولی تو مہر کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔اس نے اپنا سر جھٹکا اور عنایا کو مسکرا کے دیکھنے لگی۔

"بس' چلتے ہیں۔" مہر نے ایکسلریٹر دباتے گاڑی چلانا شروع کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کے ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے۔چہرے کو ایک موٹے بھاری کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔جسم کا حال خراب تھا۔جگہ جگہ سے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔اس کی ہڈیوں کے اندر تک درد کی پاداش تھی۔یقینا اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

اس کے جسم پہ شرٹ نہیں تھی۔جسم جگہ جگہ سے خون آلود تھا۔لمبی لمبی خراشیں جسم پہ لگی ہوئی تھیں۔ان خراشوں پہ اسے مرچیں لگ رہی تھیں۔وہ درد سے کراہ رہا تھا۔وہ کتنی ہی دیر سے چلائے جارہا تھا مگر اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔

وہ رو رہا تھا۔اسے اس گھٹن ذدہ ماحول سے خوف آرہا تھا۔وہ کپکپارہا تھا۔شدید اے سی کے باعث اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔وہ دو دن سے اس ٹھنڈ کو جھیل رہا تھا۔کھانے پینے کی تو اس نے شکل تک نہیں دیکھی تھی۔اس کا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا۔جسم سے ساری توانائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔بس ایک غلطی کی وجہ سے اس کی پوری زندگی ایک باریک دھاگے پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے دل کو خوف اور دہشت نے گھیرا ہوا تھا۔وہ انجان تھا اپنے انجام سے۔وہ انجان تھا کہ یہ تکلیف اسے کب تک جھیلنی پڑے گی۔وہ چاہتا تھا کہ موت اسے جلد از جلد اپنی لپیٹ میں لے لے۔ لیکن وہ مرنے سے ڈرتا بھی تھا۔

اسے شدید کپکپی چڑھی ہوئی تھی۔آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا خون جمنے لگا تھا۔اور اسی وقت کمرے میں آہٹ ہوئی تو وہ چوکنا ہو گیا۔

"پلیز مجھے چھوڑ دو۔" وہ گڑگڑایا۔وہ دو دن سے یہی تو کر رہا تھا۔۔اس کی ہر چیخ وہ پکار کو دو دن سے نظر انداز کیا جا رہا تھا۔

"چہرہ کھول دو اس کا۔" بھاری بھرکم،نسوانی آواز اس کمرے میں گونجی۔شمس اس آواز کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔۔یہ اس کی لیڈی تھی۔۔اس کی مالکن۔۔لیڈی اقتدار۔وہ جس کے حکم پہ اس نے پوری زندگی سرف کر دی اور آج وہ ایک غلطی پہ اسے یوں تڑپا رہی تھیں۔وہ اسے اس شدت بھری تکلیف سے گزار رہی تھیں۔شمس ایک دفعہ پھر سے رونے لگا۔دل بھاری سا ہونے لگا تھا۔اسے ماضی میں کیا ہر ظلم یاد آنے لگا۔کتنے انسانوں کو وہ یوں ہی باندھا کرتا تھا، انہیں تشدد کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کتنے قتل اس نے اپنی پینتیس سالہ زندگی میں کیے تھے، کتنے لوگوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔۔اسے سب یاد تھا۔۔مجرم اپنے جرائم کبھی نہیں بھولتے۔جس عورت کی خاطر اس نے اپنے نفس کو بیچا، اپنی پاکی پامال کی،وہ عورت ہی آج اس کی جان کی دشمن بنی تھی۔وہ عورت اس کی ایک غلطی بھی بھلانے کو تیار نہ تھی۔کیا اتنی بے معنی تھی اس کی جان؟ اس کی زندگی؟ کیا واقعی؟

اس کے منہ سے وہ بھاری کپڑا اٹھایا۔وہ بھاری کپڑا اٹھا تو وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔اس کمرے میں لال بتی جلی ہوئی تھی۔اس کے سامنے ہاتھ پشت کی طرف باندھے لیڈی اقتدار کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آگ تھی۔وہ آنکھیں ہی شمس کو سب کچھ کہہ رہی تھیں۔شمس نے ایک اداس نگاہ لیڈی اقتدار پہ ڈالی۔اداسی کے ساتھ ساتھ ان نظروں میں شکایت بھی تھی۔

"آپ کے خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا لیڈی؟ آپ میری' ایک غلطی بھی معاف نہیں کرسکتیں؟"وہ شکوہ کن انداز میں گویا ہوا۔غذائیت کی کمی کی وجہ سے اس کی آواز قدرے کمزور تھی۔اس کے لیے بولنا محال تھا۔پورا جسم اس کا سوکھ چکا تھا۔وہ بدحالی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

"تم دھوکے باز ہو! دھوکے باز فطرتاً دھوکے باز ہوتا ہے' اس لیے اسے فوری ختم کردینا چاہئے۔تم ایک دفعہ پیٹ میں چھرا کھوپنے کی جرات کر سکتے ہو تو دوبارہ بھی کر سکتے ہو۔تم اس سب کے حقدار ہو شمس!" وہ غرائی تھی۔اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔شمس اس بھاری بھرکم برائی کی ملکہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔اسے خوف نے گھیر لیا تھا۔

"میری غلطی تھی لیڈی میں جانتا ہوں۔مجھے احمد کا دبئ میں جانا آپ سے نہیں چھپانا چاہئے تھا۔" شمس نے یہ کہا تو لیڈی اقتدار بری طرح چونک گئی۔آنکھوں میں ناسمجھی در آئی۔"میں جانتا ہوں، لیکن میں مجبور تھا۔میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔پلیز بس ایک موقع اور دے دیں۔" شمس گڑگڑایا۔لیڈی اقتدار جیسے سکتے میں آگئی۔احمد دبئ گیا تھا؟ یہ کب ہوا۔اس کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔اس نے تو صرف وہ ویڈیو دیکھی تھی، دبئ والے معاملے کا تو اسے دور دور تک علم نہ تھا۔

لیڈی اقتدار شمس کی طرف بڑھی اور اس کے زخمی چہرے پہ زناٹے دار تھپڑ لگایا۔ شمس کی روح کانپ اٹھی تھی۔۔۔وہ بھی ایسے ہی لوگوں کو بے بس کر کے پیٹا کرتا تھا۔۔۔اسے وہ سب یاد تھا۔۔۔

تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ شمس کا چہرہ ترچھا ہو گیا تھا۔

لیڈی اقتدار نے شمس کے بال جکڑے اور انہیں زور سے کھینچا۔ شمس نے درد بھری کراہ جاری کی۔

”کیا بکواس ہے؟ احمد دبئ گیا تھا؟ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟“ لیڈی اقتدار بولی تو اب چونکنے کی باری شمس کی تھی۔۔۔۔نیلوفر نے لیڈی اقتدار کو اس کے بارے میں نہیں بتایا؟ شمس کا سر چکرانے لگا تھا۔۔۔

وہ آخر کیوں صرف لیڈی اقتدار کو ہیروں والی بات بتائیں گی؟ شمس نے سوچا۔۔۔سر اور بھی شدت سے چکرایا۔۔۔۔دماغ کے کونے میں ایک خیال ابھرا۔۔۔نیلوفر اسے دھوکا دے چکی تھی۔۔۔۔نیلوفر صرف اسے ہی نہیں لیڈی اقتدار کو بھی دھوکا دے رہی تھی۔۔۔۔نیلوفر نے ہی اسے اس حال میں پہنچایا تھا۔۔۔اس نے اسے بچانے کے لیے کوئی بھی کوشش نہ کی تھی۔۔۔ شمس دنگ رہ گیا تھا۔اسے اپنا دل بکھرتا محسوس ہوا۔۔۔

وہی نیلوفر جس کے لیے اس نے نہ جانے کتنے خطرے مول لیے۔۔۔وہ اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ وہ نیلوفر جس کے آگے پیچھے پھرتا تھا، اس کا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا تھا۔۔۔وہ اس کے ساتھ یہ کیسے کر سکتی ہے؟ شمس کو اپنا آپ بیوقوف لگا۔۔۔نیلوف صرف اسے

استعمال کرتی رہی ہے۔۔۔جسمانی تکلیف الگ تھی کہ اب شمس کی روح پہ بھی زخم لگ گئے تھے۔۔۔۔ گہرے زخم۔۔۔دھوکہ کھاجانے کے زخم۔۔

وہ کچھ نہ بولا۔۔۔وہ آگے سے نہ بولا کہ نیلوفر بھی دبئ والی بات جانتی تھی۔۔۔وہ بولنا چاہتا ضرور تھا لیکن۔۔۔وہ نیلوفر کے لیے کچھ بھی نہ بولا۔وہ جانتا تھا یہ بات نیلوفر کو مشکوک کردے گی۔۔۔وہ اسے دھوکا دے چکی تھی تو کیا ہوا' وہ تو اس سے سچی محبت کرتا تھا ناں۔۔۔ایک آخری قربانی ہی سہی۔۔۔ اس لیے شمس بالکل خاموش رہا۔

"میرا کام تمام کر دیں لیڈی۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں بولا۔اس کی اندر سے جینے کی جست ختم ہو گئی تھی۔

"میں موت کا حقدار ہوں۔" اس کا دل بھاری ہونے لگا تھا۔جاتے جاتے وہ نہ جانے کتنے روگ اپنے ساتھ لے کر جارہا تھا۔

"وہی کرنے میں آج آئی ہوں! تم ایک دردناک موت کے حقدار ہو۔۔" لیڈی اقتدار نے شمس کے بالوں پر سے گرفت ڈھیلی کی۔ شمس ڈھیلا ہوگیا۔اس نے اپنا پورا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔یہ آخری زخم اس کی ہر ہمت چٹ کر چکا تھا۔یہ آخری زخم اسے معذور کر چکا تھا۔دل ٹوٹ چکا تھا۔کرچی کرچی ہوگیا تھا۔۔وہ مرنے والا تھا لیکن مرتے مرتے بھی وہ اپنی محبت سے وفا کرنا نہیں بھولا تھا۔۔۔وہ نیلوفر کو کھائی میں جھونک کے نہیں جارہا تھا۔۔

لیڈی اقتدار گہری سانسیں لیتے شمس کو بس دیکھتے ہی رہ گئی۔اس کے دل پہ شمس کے بگڑتے حال نے کوئی اثر نہ کیا۔وہ اب بھی اپنی سفاکی لیے ویسے ہی کھڑی رہی۔

"اندر آؤ۔" وہ بولی تو دو مرد اس لال بتی میں نہائے کمرے میں داخل ہوئے۔دونوں کے ہاتھ میں ایک چکور ڈیوائس تھی اور کروکوڈائل کلپز تھے۔لیڈی اقتدار اسے دیکھ کے مسکرائی۔مسکراہٹ میں انتقام کی آگ جھلکتی تھی۔

"کام تمام کرو اس کا۔" وہ بولی تو ان مرد نے کروکوڈائل کلپ کو اس ڈیوائس سے لگایا۔وہ ایک کرنٹ جنریٹر تھا جو کہ بہت زور دار کرنٹ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔کروکوڈائل کلپ ان مردوں نے شمس کی سیدھی ہاتھ کی ایک انگلی پہ لگائے، اور دوسرا الٹے ہاتھ کی۔ایک پاؤں پہ انگوٹھے پہ بھی۔

"آہستہ آہستہ کرنٹ کو بڑھاؤ، تب تک جب تک اس کے جسم سے دھواں نہ ابھرنے لگا۔" وہ دانت پیستے بولی تھی۔شمس ڈھیلا جسم لیے بس سب سنتے گیا۔اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔وہ پورے دل سے مرنے کے لیے تیار تھا۔

ڈیوائس آن ہوئی۔ہلکا سا کرنٹ کروکوڈائل کلپس سے شمس کے جسم میں داخل ہوا۔اس کی گردن بے اختیار کھڑی ہوئی۔وہ جھٹکے لینے لگا۔جسم کے اندر مڑوڑ اٹھ رہے تھے۔دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کرنٹ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔۔۔جسم میں پیدا ہوتی مڑوڑیں بڑھتی چلی گئیں۔۔۔تکلیف سے وہ تڑپنے لگا۔۔۔یہ تکلیف الگ سی تھی۔۔۔دنیا سے الگ۔۔۔اس کی آنکھیں جیسے پھٹ پھٹ کے باہر آنے لگی تھیں۔۔۔بال سارے کھڑے ہوگئے تھے۔۔۔اس کا چہرہ سیاہ ہونے لگا۔۔۔جسم کے لرزش میں اضافہ ہوا۔۔۔

وہ ایک لمحے کے لیے کہنا چاہتا تھا کہ اس سب کو روک دیا جائے۔۔۔یہ آسان نہ تھا۔۔۔بالکل بھی نہیں۔۔۔لیکن اس سے بولا بھی نہ گیا۔۔۔تکلیف بڑھتے گئی۔۔۔اپنی انتہا کو۔۔۔اس کے بالوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔۔۔۔آنکھیں بالکل پھٹنے لگیں۔۔۔اور ایک جھٹکا اس کے جسم نے کھایا۔۔۔۔گردن ڈھیلی ہوئی۔۔۔مردہ جسم اب کرنٹ کے جھٹکوں پہ اچھل رہا تھا۔۔۔۔

"بند کر دو۔" اس کی سرد آواز اس کمرے میں گونجی۔وہ جانتی تھی شمس کا کام تمام ہوگیا تھا۔ایک اور بے وفا اپنے ٹھکانے پہنچا دیا گیا تھا۔وہ ہاتھ جھاڑتے کمرے سے باہر نکلی۔چہرے پہ اب بھی اطمینان تھا۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ عورت حرر کے آفس کی طرف چلتے آرہی تھی۔اس نے سر ڈوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے۔وہ زیادہ سے زیادہ بتیس سال کی ہی ہوگی۔اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔نہ جانے اس عورت کو کون سے غم ستا رہے تھے؟ وہ حواس باختہ سے عالم میں حرر کے آفس میں داخل ہوئی۔

وہ حرر کے آفس میں داخل ہوئی تو سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔مناج حسام اور در فشاں اس عورت کو دیکھ کے چونک سے گئے۔اس کے چہرے پہ گہری تکلیف صاف واضح تھی۔سب کے چہروں پہ تشویش اور ستائش ابھری۔

"السلام و علیکم، میں آپ کی کیسے مدد کر سکتی ہوں؟" اس عورت کو دیکھتے ہی در فشاں اس کی طرف بڑھی اور نرمی سے بولی۔اس نے اپنے چہرے پہ گرم جوش مسکراہٹ سجائی۔وہ عورت نم آنکھیں لیے در فشاں کو دیکھتے گئی۔

"میں یہاں 'مس مناج سے بات کرنے آئی ہوں۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔مناج چونکی اور اس عورت کی طرف بڑھی۔

"جی، میں ہوں مناج۔" مناج چہرے پہ تشویش لیے مشینی سے انداز میں بولی۔سب کی نظریں مناج اور اس عورت کی طرف مرکوز تھیں جو کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔سب نے اپنا کام چھوڑ دیا تھا۔

دفعتاً عورت نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے، پھر بند کیے، پھر کھولے، پھر بند کیے۔وہ جیسے الفاظ تلاش نہیں کر پا رہی تھی۔جوں ہی اس کے آنسوؤں کا پھندا کھلا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔مناج نے فوراً سے اس عورت کو کندھوں سے تھاما اور صوفے پہ بٹھایا۔در فشاں بھی اس عورت کے برابر بیٹھی اور اس کی پشت تھپتھپانے لگی۔وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، لیکن وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ اس عورت کو کوئی نہ کوئی غم ضرور چمٹ گیا ہے، اور یہی ان کے لیے کافی تھا۔

"میں ادریس کی بیوی ہوں۔" اس عورت نے آخر کار کچھ بولا۔"وہ کل شام سے گھر نہیں آیا ہے۔ میں جانتی ہوں آپ لوگ خطرناک طاقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنے کام کو لے کر بہت سنجیدہ تھا۔لیکن اب وہ اچانک سے کھو گیا ہے۔" یہ خبر سنتے ہی حرر کے پورے اسٹاف کے ہوش اڑ

گئے۔اپنی کرسیوں پہ بیٹھے ایمپلائیز یک دم کھڑے ہوگئے۔سب بوکھلا کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔فضا میں تناؤ پھیلنے لگا تھا۔

”ادریس، آج آفس بھی نہیں آیا ہے۔“ حسام فکرمندی سے بولا۔”پھر وہ کہاں گیا؟“

”آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟“ مناج نے عورت کے گال تھپتھپاتے کہا تو عورت روتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگیں۔

”ہاں جی، کی ہے۔لیکن میں جانتی ہوں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔آپ لوگ جن طاقتوں سے لڑ رہے ہیں‘ ان کے علاوہ یہ کون کرسکتا ہے؟“ وہ عورت سسکیاں لیتے کہہ رہی تھی۔اسے اپنی پوری زندگی اجڑتی نظر آرہی تھی۔ہر
طرف سوگواریت پھیلنے لگی تھی۔

”دیکھیں۔میری ایک تین سال کی بیٹی بھی ہے۔آپ لوگ پلیز ادریس کو ڈھونڈ نکالیں، میرے دل میں پتا نہیں کیسے کیسے ڈر سوار ہیں۔میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔میں اتنی جلدی اسے کھو نہیں سکتی۔“ وہ عورت التجائیہ سے انداز میں بولی۔مناج نے اس عورت کو گلے سے لگایا تو وہ عورت اور بھی زور سے رونے لگی۔درفشاں کی آنکھیں یہ اداس منظر دیکھ کے نم ہوئیں۔

”میں وعدہ کرتی ہوں، میں ادریس کو واپس لے آؤں گی۔آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔وہ زندہ سلامت لوٹ آئے گا۔“ مناج نرمی سے بولی۔عورت روتے گئی۔کچھ مزید تسلی بخش باتیں کہنے کے بعد وہ عورت چلی گئی۔سب نے ہی اس عورت کو دِلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مناج؟" درفشاں آنکھوں میں بے چینی لیے بولی تھی۔ مناج نے اپنی گردن جھکائی۔

"وہ لوگ اپنی اوقات دکھانے لگے ہیں درے، اور کچھ نہیں۔ ان کے علاوہ یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ "

مناج بھی قدرے بے چین نظر آ رہی تھی۔

"شکیل!" حسام ایک دم سے بول اٹھا' جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ "آج شکیل بھی نہیں آیا، بلکہ وہ دو دن سے نہیں آیا ہے۔ اس کے گھر کال کرو ذرا۔" حسام کا دماغ خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ سب مزید بے چین ہونے لگے۔

ریسیپشن میں بیٹھی لڑکی نے پھر شکیل کے گھر کال ملائی۔ کچھ دیر باتوں کے بعد اس نے کال کاٹ دی۔ اس کے چہرے پہ تناؤ سا پھیل گیا تھا۔ فکرمندی بھی بڑھ گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا خبر سنانے والی تھی۔

"شکیل دو دن سے لاپتہ ہے۔" وہ بولی تو سب سر پکڑتے رہ گئے۔ یہ سب ایک بھیانک موڑ لینے لگا تھا۔

ایک نئی آفت ان سب کے سروں پہ منڈلانے لگی تھی۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ سب کبھی یہ رنگ بھی دکھائے گا۔

"اس سب کا تو یہی مطلب ہے۔" درفشاں انداز میں خوف و بے چینی لیے بولی۔ اس نے نظر مناج پہ ڈالی جو کہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

"وہ سب، ایک ایک کر کے ہم سب کو منظر سے ہٹا رہے ہیں۔" مناج نے درے کا جملہ مکمل کیا۔

مناج کی یہ کہنے کی دیر تھی اور پورے آفس میں یک دم انتشار پھیل گیا۔وہ سب ہجوم کی صورت میں مناج کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔سب کے چہروں پہ ڈر اور خوف پھیل گیا تھا۔یہ احساس کہ کسی کی بھی جان اب محفوظ نہ تھی، یہ احساس ان سب کی روح کو ہلا کر رکھ چکا تھا۔

"مس مناج! آپ اتنے آرام سے یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" ایک ایمپلائی تلملا کے بولا۔چہرے پہ واضح گھبراہٹ تھی۔

"کیونکہ یہی سچ ہے۔ہم جو مقصد حاصل کرنے نکلے تھے اس میں ایک نہ ایک دن یہ سب دیکھنا ہی تھا۔" وہ

پرسکون سی سرد نگاہ اس ایمپلائی کی آنکھوں میں گاڑتے بولی تھی۔اس کا انداز مرعوب کرجانے والا تھا۔ایمپلائی سے آگے سے کچھ بھی بولا نہ گیا۔

"ہمیں حرر کے آفس کو کچھ وقت کے لیے بند کردینا چاہئے مس مناج۔کم سے کم جو بچ گئے ہیں وہ تو محفوظ رہیں۔" اب کی بار کوئی اور بولا۔اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے تھے۔سب کو یہی خدشہ تھا کہ اگلا نمبر ان کا بھی ہو سکتا ہے۔مناج نے دھڑلے سر نفی میں ہلایا۔وہ اب بھی بالکل پر اطمینان تھی۔

"نہیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی اور کھڑی ہوئی۔وہ کھڑی ہوئی تو سب دو قدم پیچھے ہوئے۔اس نے ہاتھ باندھے اور سرسری سی نظر پورے ہجوم پہ ڈالی۔

"کسی کو اور کچھ کہنا ہے؟" مناج اونچی آواز میں بولی۔

”آپ کو ہماری جانوں کی پرواہ نہیں ہے کیا؟ آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں؟ ہم سب کو ایک ایک کر کے ختم کیا جارہا ہے۔پہلے شکیل گیا، پھر ادریس، اب اگلا کون؟ آپ ہماری جانوں کے ساتھ نہ کھیلیں!“ اب کی بار کوئی اور بولا۔مناج نے سر اوپر نیچے ہلایا۔

”مجھے اپنی جان سے زیادہ' ان کی جانوں کی فکر ہے جو قید میں ہیں۔یہی کیفیت'جس سے ہم گزر رہے ہیں۔اپنوں کو کھوجانے کی تکلیف، اسی کیفیت سے نہ جانے کتنے لوگ گزر رہے ہیں۔میں ان کے لیے حرر کو کبھی بند نہیں کروں گی۔حرر کھلا رہے گا، ان لوگوں کے لیے جن کو حرر کی ضرورت ہے!“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔انداز میں تپش سی تھی۔

در فشاں اور حسام ایک دوسرے کو بس دیکھتے گئے۔یہ سب کس رخ جا رہا تھا، وہ دونوں اندازہ لگا سکتے تھے۔

”یہ سب بکواس ہے! آپ لوگ بڑے لوگ ہیں! ہماری فیملیز ہیں' ہمیں ان کا سوچنا ہے۔آئی کویٹ!“ ایک ایمپلائی غصے سے بولا اور بد لحاظ سے انداز میں کہہ کر حرر کا دروازہ پار کر گیا۔اس نے ایک دفعہ بھی پیچھے مڑ کے نہ دیکھا۔

حرر کے آفس میں ایک بار پھر سے خاموشی لوٹ آئی۔مناج نے شعلہ باز نگاہ ہر ایک ایمپلائی پہ ڈالی۔

”آپ لوگوں میں سے کوئی بھی اگر جانا چاہتا ہے، تو چلا جائے۔لیکن حرر کا آفس بند نہیں ہو گا۔ہم ڈر کے اپنے مقصد کو چھوڑ نہیں سکتے!“ مناج نے سرد نگاہ ہر ایک ایمپلائی پہ ڈالی۔

"لیکن اگر آپ میں سے کوئی ڈر گیا ہے' تو وہ جا سکتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔انداز جلانے والا تھا۔

سارے ایمپلائیز ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔سب کے سب سوچ میں پڑ گئے تھے۔کچھ تھے جو اپنے حرر جوائن کرنے کے فیصلے پہ پچھتا رہے تھے۔

ایک اور مرد ایمپلائی ہجوم سے دو قدم پیچھے جانے لگا۔

"مجھے اجازت دیں۔" وہ کہہ کر نکل گیا۔اس کے جانے سے تین ایمپلائیز کو بھی ہمت ملی اور وہ بھی خاموشی سے حرر کے دروازے پار کر گئے۔حرر کا آفس اب خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی مس مناج۔میں ان نام کے مردوں کی طرح ڈر پوک نہیں ہوں۔" ریسیپشنسٹ بولی

اور اپنی جگہ پہ چلی گئی۔ڈری ہوئی وہ بھی تھی' لیکن اگر لگن سچی ہو تو سارے ڈر اور خوف بے معنی ہو جاتے ہیں۔

اسی وقت دو اور ایمپلائی ہجوم سے نکلے اور حرر کے دروازے پار کر گئے۔حرر میں اب صرف چار ایمپلائیز ہی

رہ گئے تھے۔درے اور حسام چہرے پہ گہرا افسوس لیے بس اس سب کو دیکھتے رہے۔حرر بکھرنے لگا تھا۔حرر ٹوٹنے لگا تھا۔وہ یہی سوچے جا رہے تھے۔

مناج جب کہ کافی پر سکون تھی۔

"میں یہ سب نہیں چھوڑنے والا۔" ایک ایمپلائی ادب سے بولا اور اپنی جگہ پہ چلا گیا۔باقی جو کھڑے تھے وہ

بھی اپنی جگہ پہ چلے گئے۔سب اپنا دماغ بنا چکے تھے۔

خاموشی اور ویرانی سی حرر میں پھیل گئی تھی۔مناج نے ایک گہری سانس خارج کی۔

"اس سب کا یہ فائدہ ہوا کہ ہمیں علم ہوگیا کہ کون حرر کے ساتھ مخلص ہے اور کون نہیں۔لانگ ٹرم میں یہ چیز ہمارے بہت کام آئے گی۔" مناج درے اور حسام کی طرف متوجہ ہوتے بولی جو کہ اب بھی کسی سوچ میں تھے۔

"لیکن ادریس اور شکیل۔ان کو کیسے ڈھونڈیں گے؟" حسام نے پوچھا۔

"ہم ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے، لیکن دونوں کو واپس لا کر ہی دم لیں گے!" مناج بولی تو درے اور حسام کچھ

سوچ کر سر اثبات میں ہلانے لگے۔ان کا حرر، جس پہ انہوں نے بے پناہ محنت کی تھی، اس تحریک کو ایک ساتھ ہی کتنے لوگ چھوڑ گئے تھے۔۔۔مصیبت آنے پہ سب نے اپنے اصلی رنگ دکھا دیئے تھے۔اپنوں کے اصل رنگوں کا عیاں ہونا' کہاں خوشگوار گزرتا ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیلوفر اپنے آفس میں بیٹھی کچھ فائلز ٹٹول رہی تھی جب لیڈی اقتدار اندر آئی۔اس کے چہرے پہ برفیلا سا تاثر تھا، بالکل ٹھنڈا۔آتے ساتھ ہی وہ ٹھنڈی سانسیں لیتی نیلوفر کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔نیلوفر نے محتاط سی نگاہیں لیڈی اقتدار پہ ڈالیں۔

"احمد دبئی بھی گیا تھا!" لیڈی اقتدار نے ٹیبل پہ زور سے ہاتھ مارتے کہا۔ نیلوفر چونک گئی۔تو لیڈی اقتدار کو علم ہو گیا تھا۔اس نے سوچا۔

"اس شمس نے، ہم سے یہ تک چھپایا تھا۔میں اب تک ایک آستین کے سانپ کو پال رہی تھی۔اف نیلوفر۔" نیلوفر کی آنکھوں میں سائے سے لہرائے۔

"یہ تو بہت غلط ہے لیڈی۔" نیلوفر محتاط سے انداز میں بولی۔وہ اپنے اوپر کسی قسم کے شک کو دعوت نہیں دینا چاہتی تھی۔

"احمد۔۔۔دبئی۔" لیڈی اقتدار نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔یہ ان لوگوں کے لیے ایک بری خبر تھی۔"احمد نے نہ جانے وہاں کیا کیا ہو گا؟ میں سچ کہہ رہی ہوں نیلوفر' مجھے تین سال پہلے ہی اسے ختم کر دینا چاہیئے تھا۔کاش کے میں اس وقت جذباتیت پرے رکھ کے اسے ختم کر دیتی تو ہمیں اتنے بڑے نقصان نہ اٹھانے پڑتے۔" وہ فکرمندی سے بولی تھی۔"لیکن کیا کروں نیلوفر، میں بے بس ہوں۔احمد کے معاملے میں ہمیشہ سے بے بس رہی ہوں۔" لیڈی اقتدار کا حساس روپ سامنے آنے لگا تھا۔اسے اپنی بے بسی یاد آئی۔کاش وہ اتنی بے بس نہ ہوتی، کاش وہ احمد کو بھی وہی انجام دے سکتی جو وہ اپنے ہر دشمن کو دیتے آئی تھی۔۔۔کاش۔۔!

"آپ نے کچھ غلط نہیں کیا لیڈی۔ آپ نے اپنے اس کاروبار کے ساتھ صرف وفا کی ہے۔ صرف وفا۔ آپ کی وفا ہم سب کے لیے قابل فخر ہے۔ آپ نے یکے بعد دیگرے ایک سچے لیڈر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔" نیلوفر دھیمی سی آواز میں بولی۔ لیڈی اقتدار نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں نیلوفر، اب چناؤ کا وقت ہے۔" لیڈی اقتدار کی آنکھوں کی سرد مہری لوٹ آئی۔

"کیسا چناؤ؟" نیلوفر نا سمجھی سے بولی۔ لیڈی اقتدار کے نرم تاثرات اب سخت پڑے۔

"ایک طرف یہ کاروبار ہے تو ایک طرف میری وفا۔ عظیم چناؤ کا وقت آگیا ہے جو میں نے پچھلے تین سال سے نہیں کیا۔" لیڈی اقتدار کا چہرہ تن سا گیا۔ ماتھے کی نسیں پھڑکنے لگیں۔ نیلوفر کو سرخ جھنڈے نظر آنے لگے۔

"نہیں لیڈی۔ آپ احمد کو نہیں مار سکتیں۔ آپ انہیں کھو دیں گی، انہوں نے کتنی قربانیاں دی ہیں آپ کے لیے۔ اس کاروبار کے لیے۔ آپ ہی کہا کرتی تھیں کہ جو وفا کرتے ہیں انہیں سینے سے لگانا چاہئے، ان کی قدر کرنی چاہئے۔ پھر آپ یہ کیسے کر سکتی ہیں؟" نیلوفر ایک دم سے بول اٹھی۔ لیڈی اقتدار تھکی ہوئی سانس خارج کرتے کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ فکرمندی تھی۔ دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ وہ واقعی کسی کے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن۔۔ لیکن شاید اب اس سب کی ضرورت تھی۔

"یہی وجہ ہے کہ یہ چناؤ اتنا مشکل ہے نیلوفر۔" وہ مایوسی سے کہتی کمرے سے باہر نکلی۔ نیلوفر کا چہرہ متفکر ہونے لگا۔ وہ احمد کو مرنے نہیں دے سکتی تھی، یہ تو طے تھا۔ اسے کچھ بھی کر کے لیڈی اقتدار کو یہ سب کرنے سے روکنا تھا۔

لیکن کیسے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا وقت تھا اور وہ اپنے ایریا میں چہل قدمی کر رہا تھا۔موسم کافی خوشگوار تھا اور وہ اسی خوشگوار سے موسم کا

فائدہ اٹھاتے چہل قدمی کر رہا تھا۔ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے وجود سے ٹکراتے۔وہ ہواؤں کو اپنے جسم میں اتار رہا تھا۔اسے یوں ہی قدرت کے ساتھ وقت گزارنے میں مزہ آتا تھا۔

حسام کی جیب میں پڑا موبائل تھرتھرایا تو اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ کال اٹھا کے اس نے موبائل کان سے لگایا۔وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ہی فون کے دوسری سمت سے آتی آواز کو سنتا گیا۔ وہ بات سن کے حسام اچانک سے تھم گیا۔چہرے پہ تناؤ سا پھیلا۔ماتھے پہ سلوٹیں در آئیں۔

"کیا مطلب؟" وہ نا سمجھی سے بولا۔فون کے اس پار سے کوئی اسے کچھ بولا۔ماتھے پہ پھیلی سلوٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔وہ جہاں تھا' وہیں پہ جم گیا۔ منجمد۔۔۔

وہ بے خبر تھا کہ اس کے پیچھے کوئی سست سے قدم بڑھاتے آرہا تھا۔کالے کپڑے پہنے، چہرے پہ ماسک لگائے، وہ کسی ہیولے کی صورت حسام کے قریب ہوتے جارہا تھا۔حسام کو جیسے ہی احساس ہوا وہ پیچھے مڑا لیکن۔۔۔لیکن بہت دیر ہوگئی تھی۔۔۔

کالے لباس میں ملبوس اس ہیولے نے حسام کے اوپر وار کیا۔حسام کا موبائل بے اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے سڑک پہ گر گیا۔اس ہیولے نے حسام کے منہ پہ کستی سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ایک کالی

وین تیزی سے اس طرف بڑھی اور ان کے برابر آ کے کھڑی ہوگئی۔وین کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک اور کالے لباس میں ملبوس مرد نکلا۔

حسام چلانا چاہ رہا تھا لیکن چہرے پہ دباؤ کی وجہ سے اس کی ساری آوازیں دم توڑ رہی تھیں۔وہ مدد کے لیے پکارنا چاہ رہا تھا لیکن ایسا کر نہیں سکا۔اس وقت اس کے ایریا میں ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں اور وہ پھڑپھڑانے لگا۔وہ اندر سے بہت ڈر گیا تھا، بہت سہم گیا تھا۔دوسرے مرد نے حسام کے ہاتھوں کو جکڑا۔

وہ دونوں مرد حسام کو گھسیٹتے اس کالی وین میں لے کر جا رہے تھے۔وہ شدید مزاحمت کر رہا تھا لیکن کسی بھی مزاحمت

کا کوئی فائدہ نہ تھا، وہ مرد بہت طاقتور تھے۔حسام کا ان کی گرفت سے آزادی حاصل کرنا کچھ نا ممکن سا تھا۔حسام کو کالی وین میں کسی جانور کی طرح پھینک دیا گیا۔وین کا دروازہ اب بند ہونے لگا۔

گاڑی میں وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔وہ زور زور سے، جان لگا کے چلانے لگا' لیکن گاڑی کی ساؤنڈ پروف دیواریں اس کی ہر چیخ و پکار دبا دیتی تھیں۔ان میں سے ایک مرد نے انجیکشن نکالا اور انجیکشن کی نب حسام کے ہاتھ میں گھسیڑی۔حسام زور سے چلایا۔تکلیف اس کے جسم میں پھیلنے لگی تھی۔انجیکشن کا مادہ اس کے جسم میں داخل ہوا۔اسے یک دم چکر آنے لگا۔آنکھوں کے سامنے دھند پھیلنے لگی۔جسم مفلوج ہونے لگا اور دماغ سن سا ہونے لگا۔سر پہ تناؤ سا بڑھتا جا رہا تھا۔سارا منظر مندمل ہونے لگا تھا اور پھر حسام کی آنکھیں بند ہوئیں اور اس کا پورا جسم ڈھیلا ہوگیا۔

کالی وین اسلام آباد کی سڑکوں پہ رواں دواں رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

درفشاں اپنے گھر کے چھوٹے سے گارڈن میں موجود پودوں کو پانی دے رہی تھی۔فی الوقت وہ مشک امبر کے پودے کے پاس کھڑی اسے پانی دے رہی تھی۔اس نے پنک شرٹ پہنی تھی اور جینز کی اسکرٹ بھی۔اس کے چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہ کر کے بے حد محظوظ ہو رہی ہو۔وہ اسی طرح سے روز صبح اپنے پودوں کو پانی دیا کرتی تھی۔اس کے پودے اس کے لیے اس مصروف سی زندگی میں فرار کا راستہ بنتے تھے۔

اسی وقت، اسے گھر کے اندر سے موبائل کے بجنے کی آواز آئی۔درے کے چہرے پہ بد مزگی سی پھیل گئی تھی۔اس کو جیسے یوں خلل پیدا ہونا گراں گزرا تھا۔وہ واٹرنگ کین پرے رکھ کے اندر لاؤنج تک گئی۔راحیلہ کی کال آرہی تھی۔درے نے سوچتی نگاہوں کے ساتھ راحیلہ کی کال اٹھائی۔

"درے! شکر ہے تم نے فون اٹھا لیا۔گھر میں ہی ہو نا؟" راحیلہ آواز میں فکرمندی لیے بولی تو درے کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔اسے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔

"ہاں۔کیا ہوا ہے؟" درفشاں متذبذب سی ہو کے بولی۔وہ خبر کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

"وہ لوگ حسام کو بھی لے گئے ہیں درے!" اور یہی کہنے کی دیر تھی کہ درے کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑی۔دل کو جیسے دھڑکا سا لگا ہو۔جیسے کوئی بجلی سی اس کے دل میں چمکی ہو۔جیسے کوئی طوفان

سا اس کے دل میں گر جا ہو۔اس کا موبائل اس کے ہاتھ سے سرک کے زمین پہ گر گیا۔دماغ ماؤف سا ہونے لگا۔آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔

"درے؟ درے؟" راحیلہ کہتی رہ گئی لیکن در فشاں اپنے ہوش میں نہ رہی تھی۔وہ اونچی اونچی سانسیں لیتے اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔بیڈ پر بیٹھ کے، گردن جھکائے وہ زمین کو دیکھنے لگی۔اس کے دل میں چبھن سی ہونے لگی تھی۔ایک الگ سی تکلیف اس کی روح پہ سوار ہونے لگی تھی۔اس تکلیف کی وجہ' وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔تکلیف کی زور دار لہریں اس کے وجود میں ابھر رہی تھیں۔دل کی جانب جیسے تناؤ سا بڑھنے لگا تھا۔

**("کتنا خوب صورت موسم ہے۔" درے نے بادلوں کو دیکھتے کہا تو حسام مسکرایا۔**

**"بس امید ہے کہ یہ آپ کا موڈ بہتر کر سکے۔" حسام کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ بکھری۔**

**"موڈ تو اسی وقت بہتر ہو گیا تھا جب آپ نے ساتھ چلنے کی آفر دی تھی۔" درِّ فشاں نے نرمی سے کندھے اچکا دیے۔حسام خود میں ہی ہنسنے لگا۔**

**"اوہ۔یعنی مجھے آپ کو یہاں لا کر اپنا پیٹرول ضائع نہیں کرنا چاہیئے تھا۔" دونوں مدھم سا ہنس دیئے۔)**

درِّ فشاں کا ہاتھ بے اختیار اس کے سینے تک پہنچا۔آنسوؤں کا پھندا اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔وہ اس پھندے کو

پی جانا چاہتی تھی لیکن تکلیف اس کے وجود میں اس حد تک لبریز تھی کہ وہ ایسا نہ کر سکی۔موٹے موٹے آنسو، گرم آبشار کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"نہیں۔نہیں نہیں!" وہ گردن نفی میں ہلاتے ہوئے کہتی گئی۔اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں جکڑا۔

اس کا دل

جیسے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔کیونکہ اس کا ہر تجربہ اسے یہی سکھا گیا تھا کہ کھویا ہوا انسان واپس نہیں لوٹتا۔۔۔

**(بوٹ اب سیدھا سیدھا پانی میں اپنا راستہ بنانے لگی۔اور جس طرح سے بوٹ اس نیلے پانی میں اپنی راہ بناتے چلے گئی درے کی گھبراہٹ میں بھی کمی آتے گئی۔کچھ لمحے بعد گھبراہٹ منظر عام سے غائب ہو گئی، اب وہ پرسکون سی ہونے لگی تھی۔اسے چپو گھمانے میں مزہ آنے لگا۔ ایک الگ ہی مزہ تھا بیچ ندی میں چپو اس طرح سے گھمانے کا۔چپو پانی سے ٹکراتا تو ایک خوبصورت سی نرم صحبت کی حامل آواز پیدا ہوتی تھی۔آواز کانوں میں رس گھولتی تھی اور دل کو بھی قرار بخشتی تھی۔بے پناہ سکوت ماحول میں چھایا ہوا تھا۔**

**"بس شروع میں تھوڑا مشکل تھا۔"درفشاں بالکل پرسکون ہو کے بولی۔"اور پھر جب اس کی عادت ہو گئی تو یہ**

**بہت اچھا لگنے لگا۔بہت حسین۔"**

**"سچ میں بہت حسین۔" حسام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔وہ کسی گہرے خیال میں تھا۔)**

درے نے ایک دفعہ پھر سے لاؤنج کی طرف دوڑ لگائی جہاں اس کا موبائل گرا پڑا تھا۔اس نے موبائل اٹھا کے تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے مناج کو کال ملائی۔اس کی انگلیاں کپکپارہی تھیں۔دل اب بھی بھاری ہورہا تھا۔مناج حرر کے باقی اسٹاف کے ساتھ آفس میں موجود تھی۔اس نے فوراً ہی درے کی کال اٹھالی۔

”درے وہ لوگ حسام کو لے گئے۔“کال اٹھاتے ساتھ ہی مناج پریشان سے انداز میں بولی۔

”مل جائے گا حسام۔مجھے یقین ہے۔وہ مل جائے گا۔“ درے بولی۔وہ امید دلانے لگی۔۔۔مناج سے زیادہ خود کو۔لیکن سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ حسام ملے گا بھی یا نہیں۔اسے اپنے ماما بابا کی یاد آئی جو کار ایکسیڈینٹ میں فوت ہوئے۔اسے اپنے فیروز بھائی یاد آئے جو کہ ایک رات لاپتہ ہوگئے اور واپس نہ لوٹے۔۔۔اور اب حسام۔۔۔جو کہ کہیں کھو گیا تھا۔درے کا دل مزید بھاری ہونے لگا۔اس سے پہلے مناج کچھ بولتی اس نے کال کاٹ دی۔

**("اور اس پینٹنگ میں میری بہت سی حسین یادیں مقید ہیں درے۔شاید اس ہی وجہ سے،میرے لیے یہ پینٹنگ بہت خاص ہے۔یہ پینٹنگ میں نے پہلی دفعہ اس آرٹ سٹوڈیو میں بنائی۔اسی دن میرے ڈیڈ نے مجھے آرٹ اسٹوڈیو کا سرپرائیز دیا تھا۔میں کبھی وہ دن نہیں بھولنا چاہتا۔اور یہ جو تصویر میں آپ کو نظر آرہا ہے یہ میرا پہلا بلا ہے۔شیر خان۔اور یقین مانیں آج تک نہ جانے کتنی بلیاں پالی ہیں' مگر شیر خان جیسا بلا آج تک نہیں ملا۔میں نے یہ پینٹنگ پہلی دفعہ پروفیشنل آرٹ کٹ کا استعمال کر کے بنائی تھی۔یہ پہلا تجربہ تھا۔اس پینٹنگ کو بناتے ہوئے میں نے پہلی مرتبہ خود کو آرٹسٹ محسوس کیا**

تھا۔اس پینٹنگ کو دیکھتے ہی جیسے وہ ساری خوبصورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔میں ان یادوں کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔" حسام کے چہرے پہ اداس مسکراہٹ تھی۔

"بہت خوب۔" درے نے سادگی سے آنکھیں جھپکاتے کہا۔"ایک عام انسان اس پینٹنگ کو محض ایک بلی کی پینٹنگ سمجھے۔

مگر یہ صرف ایک بلی کی پینٹنگ ہو کے بھی کتنی گہری ہے نا؟ کتنی یادیں اس معصوم پینٹنگ سے منسلک ہیں۔یہ پینٹنگ آپ کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔مجھے اچھا لگا جان کے۔"حسام نے اپنی گردن جھکا لی، اس کے گال سرخ پڑنے لگے تھے۔

کچھ تھا درے میں، درے کی صحبت میں جو وہ بالکل خوش ہو جاتا تھا۔اسے لگتا تھا جیسے وہ درے کی باتیں یوں ہی گھنٹوں سن سکتا تھا۔کیا درے بھی اس سے اسی طرح کی وابستگی رکھتی تھی؟ وہ فی الحال جانتا نہ تھا۔

اس نے آگے بڑھ کے دیوار سے ایک اور پینٹنگ اتاری۔

"یہ آپ رکھ لیجئے۔" حسام نے درے کو وہ پینٹنگ تھمائی۔)

درے دل میں گہرا رنج لیے، آنکھوں میں اداسی لیے اس پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے کمرے میں ہی لگی ہوئی تھی۔ایک دفعہ پھر آنسوؤں کا پھندا اس کے حلق میں آ کر پھنسا۔تکلیف کی لہر اس کے وجود میں دوڑی تو وہ ایک دفعہ پھر سے رونے لگی۔دل کی تکلیف میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

آخر ہر کوئی اس کی زندگی سے کیوں چلے جاتا تھا؟ مما، بابا، فیروز بھائی اور اب حسام۔آخر جس سے وہ دل لگاتی تھی وہ کیوں اسے چھوڑ کر چلے جاتا تھا؟ آخر کیوں؟ یہی سوچ سوچ کے وہ رونے لگی۔خالی پن اور محرومی کا احساس اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔آخر کیوں وہ اکیلی رہ جاتی تھی؟ یہی خیال اس کی روح کو جھنجھوڑے ہوئے تھا۔

اور یہ وہ وقت تھا جب در فشاں کو احساس ہوا کہ وہ حسام کو اپنا دل دے چکی تھی۔وہ تو اس سے محبت کرنے لگ

گئی تھی۔۔۔

اف۔۔یہ دل بھی ناں!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لیڈی اقتدار اپنے قصر کے لاؤنج میں صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی ہوئی تھی۔جدید آسائشوں سے آراستہ لاؤنج میں خوبصورت سی مہک گھلی ہوئی تھی۔وہ کالا جوڑا پہنے ہوئے تھی جس پہ سلور سا کام تھا۔وہ کچھ ہی دیر میں بس ہسپتال جانے ہی والی تھی۔

ملازمہ لاؤنج میں چلتے ہوئے آئی۔لیڈی اقتدار نے شان بے نیازی سے ملازمہ کے اوپر نظر ڈالی۔

”میم، تحریک حرر فاؤنڈیشن کی فاؤنڈر مس مناج قصر کے باہر ہیں۔وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ ملازمہ بولی تو لیڈی اقتدار کے چہرے پہ استہزا پھیلی۔اس کی اتنی جرات؟ اس نے سوچا۔

”بھیج دو‘ اور ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو اسے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔کچھ وقت بیت گیا تو وہ بھی کھڑی ہوئی۔وہ ڈرائنگ روم تک پہنچی تو اسے سانولی رنگت والی لڑکی نظر آئی جس کا چہرہ ہر تاثر سے خالی تھا۔اس لڑکی کی پلکیں بڑی

بڑی سی تھیں۔چہرے پہ رعب سا تھا۔وہ اس لڑکی کو دیکھ کے کچھ ٹھٹک سی گئی۔کچھ تھا اس لڑکی کے انداز میں جو اسے کھل رہا تھا۔

لیڈی اقتدار کے آنے پر وہ لڑکی کھڑی نہیں ہوئی بس اسی طرح سے بیٹھی رہی۔لیڈی اقتدار خاموشی سے اپنے سربراہی صوفے پہ بیٹھ گئی۔اس لڑکی سے نہ جانے کیوں شناسائی کا احساس ہوتا تھا جیسے وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔جیسے وہ کہیں ملے تھے۔۔۔لیکن کہاں؟لیڈی اقتدار کو یاد نہیں آرہا تھا۔

”کیوں آئی ہو۔“ لیڈی اقتدار کھنکاری۔چہرے پہ بے نیازی تھی۔انداز لاپرواہ سا تھا۔اسے جیسے مناج کی آمد سے کوئی بھی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

مناج کی گردن اکڑتی گئی۔مرعوب کردینے والی نگاہیں اس نے لیڈی اقتدار کے اوپر گاڑیں۔

”میرے بندے واپس کرو لویزا!“ مناج چبا چبا کے بولی۔لیڈی اقتدار نے جھٹکا کھایا۔لویزا؟ اس لڑکی کو اس کا نام کیسے پتا؟ اسے اس لڑکی کے اس انداز پہ تپ چڑھنے لگی تھی۔

”زبان سنبھال کے بات کرو لڑکی! تم میرے ہی گھر میں مجھ سے ایسے بات نہیں کر سکتی!“ وہ بلند آواز میں تائید کرنے لگی۔مناج صوفے سے کھڑی ہوئی۔شعلہ باز نگاہ اس نے لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں ڈالی۔

"مجھے میرے بندے واپس کرو لویزا! اگر انہیں کچھ ہوا نا تو میں تمہیں برباد کردوں گی۔" مناج انگلی اٹھاتے لیڈی اقتدار سے بولی۔لیڈی اقتدار کا خون کھولنے لگا۔ایک لمبے عرصے سے کسی نے اس سے اس طرح سے بات نہ کی تھی۔ مناج کے اس رویے نے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی تھی۔

"تمہارا کوئی بندا میرے پاس نہیں ہے۔اپنے ڈرامے بند کرو۔" لیڈی اقتدار دانت پیستے بولی۔مناج نے اپنا موبائل نکالا۔اس پہ ایک ایک ویڈیو کھولی اور موبائل اسکرین لیڈی اقتدار کی طرف موڑی۔موبائل پہ حسام کے اغواء کی پوری ویڈیو تھی' کہ کس طرح سے اسے دو ماسک پہنے مردوں نے کالی وین میں ڈالا۔اسٹریٹ کیمراز وہ منظر قید کر چکے تھے۔لیڈی اقتدار آنکھیں چھوٹی کر کے اس ویڈیو کو دیکھنے لگی۔۔

اس نے ایک سرد سی سانس خارج کی۔مناج کے اوپر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی۔

"تمہیں واقعی لگتا ہے' یہ میں نے کیا ہے؟" لیڈی اقتدار بھی کھڑی ہوئی۔قدم قدم بڑھاتے وہ مناج کی طرف بڑھی۔مناج اور لیڈی اقتدار بالکل آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"تمہارے علاوہ کر بھی کون سکتا ہے؟" مناج نے اچنبھے سے پوچھا۔لیڈی اقتدار کا قہقہہ بلند ہوا۔

"تمہیں پتا ہے لڑکی۔" لیڈی اقتدار نے بلاپرواہی بھری نگاہ مناج پہ ڈالی۔"میں ایک ماسٹر مائنڈ ہوں۔مجھے اگر تمہارے اسٹاف کو اغواء کرنا ہوتا تو میں اس طرح سے کبھی نہ کرواتی۔کسی ایسی جگہ پہ کرواتی جہاں پہ ایک کیمرا بھی نہ ہوتا۔اور میرا کام انتہائی صاف ہوتا ہے۔میں انہیں اگر اغواء کرتی تو تمہیں دور دور تک بھنک نہ پڑتی کہ یہ کام میں نے کیا ہے۔تمہیں کچھ دنوں تک پھر بس اس اسٹاف

کے ٹکڑے ہی مل رہے ہوتے۔ایسا ہوتا ہے میرا کام۔" وہ فخریہ سے انداز میں بولی۔بولتے بولتے اس کا سینہ تن گیا تھا۔"یہ کام دور دور تک میرا ہو ہی نہیں سکتا۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ناگواری سی گزری۔مناج نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔اگر لویزا نہیں تو پھر کون؟ اس نے سوچا۔

"تم یہ سب کہہ کے مجھے بھٹکا نہیں سکتی لویزا۔یہ تمہارے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔" ایک دفعہ پھر سے لیڈی اقتدار ہنسنے لگی۔

"تمہاری وہ ویڈیوز تک میں نے اسی رات اڑوادی تھیں۔اتنا پکا کام ہوتا ہے میرا لڑکی۔وہ چھوٹا سا کام بھی میں نے صفائی سے کیا۔کسی کے پاس عمارہ کے قتل کا ثبوت نہیں۔یہ تو پھر بھی ایک اغواء ہے، وہ بھی اسٹریٹ کیمراز کے بالکل سامنے۔یہ میں کیوں کروں گی؟" لیڈی اقتدار طنزیہ سی ہنسی ہنسنے لگی۔اگر احمد ہوتا تو کبھی اس نتیجے پہ نہیں پہنچتا، اس نے سوچا۔۔۔

"میں تمہیں بتا رہی ہوں لویزا۔مجھے میرے بندے واپس چاہئے ورنہ میں نے تہلکہ مچا دینا ہے۔مجھے اپنی آواز

اٹھانے پہ مجبور نہ کرو۔" مناج کہہ کے مڑ گئی اور جانے لگی۔لیڈی اقتدار نے اس کا ہاتھ کستی سے پکڑا۔ہاتھ کھینچ کے اس نے اسے اپنے قریب کیا۔وہ مناج کا ہاتھ اتنی زور سے دبا رہی تھی کہ مناج کو تکلیف ہونے لگی تھی۔

"اور تم بھی میری سن لو۔" لیڈی اقتدار کی آنکھیں پھیلیں۔"میرے ساتھ تمیز سے پیش آؤ ورنہ تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تمہاری لاش جنگلی گدھ تک کھانا پسند نہیں کریں گے۔تم آگ سے نہ کھیلو لڑکی،

بری طرح سے جل جاؤ گی۔" وہ دہشت زدہ سے انداز میں مناج کو دھمکی دینے لگی۔ مناج نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔شعلہ باز نگاہ لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں گاڑیں۔اس کے اندر ڈر کا ایک عنصر بھی موجود نہ تھا۔

"تم مجھے مار دو گی۔لیکن تم کب تک، کتنے لوگوں کو مارتی رہو گی لویزا؟ میں نہیں تو کوئی اور ہی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرے گا۔تمہارا زوال یقینی ہے۔یاد رکھنا!" مناج غرائی اور بغیر کسی کی پرواہ کیے جانے لگی۔کچھ ہی دیر میں مناج لیڈی اقتدار کی نظروں سے اوجھل ہوگئی جب کہ وہ، وہ بس ہکا بکا سی وہیں کھڑی رہی۔

لیڈی اقتدار اس لڑکی کی ہمت پہ دنگ رہ گئی تھی۔یہ آخر کیا چیز تھی؟ یہ اس کا اصل نام کیسے جانتی تھی؟ یہ کچھ سوال تھے جو لیڈی اقتدار کو ستانے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تحریک حرر کے ان دلیر سپاہیوں کے پاس اب کھونے کو بچا ہی کیا تھا؟

انہوں نے کھلم کھلا جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔۔۔بے خوف۔۔۔نڈر ہو کے۔۔۔

وہ ظالم ملکہ سے نہیں ڈرتے تھے۔۔۔

زیادہ سے زیادہ جان ہی تو جانی تھی؟

اور جان تو جانی ہی ہے؟

تو ایک عظیم مقصد کی تکمیلیت میں جان گنوانے سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟

وہ نڈر ہو کے لڑ رہے تھے۔۔۔

اپنی آواز بلند کر رہے تھے۔۔۔

نعرہ حق بلند کر رہے تھے۔۔۔

اور یہ کرتے کرتے پانچ دن مزید گزر گئے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## پانچ دن بعد۔۔۔

"ہماری ٹیم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کے لیڈی اقتدار کے خلاف ٹھوس ثبوت جمع کیے تھے، لیکن اس نے بہت ہوشیاری سے وہ ثبوت بھی مٹا دیے۔"

لیڈی اقتدار کے لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا جہاں پہ ایک بڑے نیوز چینل میں مناج کا انٹر ویو کھلا ہوا تھا۔وہ بے نیازی سے اپنا ناشتہ کرنے میں مگن تھی۔لیکن کان اس کے اس انٹرویو کی طرف متوجہ تھے۔

"وہ بہت چالاک عورت ہے۔وہ جیسا اپنے آپ کو دکھاتی ہے ویسی نہیں ہے۔وہ اعضاء کا غیر قانونی کاروبار چلاتی ہے۔اس نے ہمارے تین بندے اغواء کیے۔" مناج بولے جارہی تھی۔لیڈی اقتدار شاطر سا مسکرائی۔اس نے اب نظر ٹی وی پہ ڈالی۔

"لیکن اس سب کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ آپ نے اب تک جتنے بھی الزامات لگائے ان کو ثابت کرنے کے لیے آپ ایک ثبوت تک تو نہیں پیش کر سکیں؟ پھر آپ اس عوام سے توقع کیوں کرتی ہیں کہ وہ آپ کی بات پہ بھروسہ کریں؟" اینکر نے کہا۔ مناج کے چہرے کی ہوائیاں اڑیں۔ لیڈی اقتدار زیر لب ہنس دی۔ اس نے ٹوسٹ کا لقمہ اپنے منہ میں بھرا۔

"کام اچھا کیا ہے اینکر نے۔ انعام تو بنتا ہے۔" وہ اپنے آپ میں بولی اور پھر سے مدھم سا ہنس دی۔ اس نے شانے اچکا کے ٹوسٹ کا ایک اور لقمہ اپنے منہ میں ڈالا۔

"کتنے بے وقوف تھے یہ لوگ، بھول گئے کہ یہ میڈیا بھی میرا ہے، یہ اینکرز، یہ چینلز، میری اجازت پہ تم سے انٹرویو لے رہے تھے۔ پچھلے پانچ دنوں سے یہ ایک سے دوسرے چینل میں رسوا ہو رہے ہیں۔ بے عزت ہو رہے ہیں۔ اس سب نے تو حرر کی کریڈیبلیٹی اور بھی گرا دی۔ اس سے بہتر کیا ہوسکتا تھا؟" وہ دل ہی دل میں سوچ جارہی تھی اور مسکرائے جارہی تھی۔ اس کے نزدیک حرر والے بس چیونٹیاں ہی تھے، ان کو ہرانا اس کے لیے بہت آسان تھا۔

"اگر احمد ہوتا، تو اس کھیل کو کبھی بھی اس طرح سے نہ کھیلتا۔ وہ بہت پھونک پھونک کے قدم رکھتا اور میڈیا تک جانے کا تو سوچتا بھی نہیں۔" وہ دل میں ہی سوچ کے مدھم سا ہنس دی۔

ٹھیک اسی وقت اس کے دماغ میں ایک خیال سا آیا۔۔۔ احمد؟ وہ اب تک کہاں تھا؟ اس نے اتنے دنوں سے آخر کچھ کیوں نہیں کیا؟ لیڈی اقتدار ایک دم سے بے چین ہو گئی۔ اس نے کوفت کے عالم میں ٹی وی بند کیا۔ اندر اس کے ہلچل مچ گئی تھی۔ احمد کی خاموشی ہمیشہ سے اس کے لیے مشکوک کن

رہی ہے۔لیڈی اقتدار کا سوچ سوچ کے دل ڈوبا جارہا تھا۔اگر یہ حرر والے بیچ میں پنگا نہ کرتے تو یقینا وہ احمد پہ ہی اپنی توجہ مرکوز کرتی۔۔۔اس نے سوچا۔

لیڈی اقتدار نے نظر اٹھا کے گھڑی کو دیکھا۔اس کا ہسپتال جانے کا وقت ہوگیا تھا۔اس نے ہر خیال کو جھڑکا۔میز سے "جایا پراڈا" کا ڈیزائنر بیگ اٹھایا' اور کہنی پہ لٹکا کے کسی ملکہ کی طرح اپنی سنہری ہیلز پہ چال چلنے لگی۔وہ جیسے ہی چلتی تو آس پاس کی ملازمہ اسے دیکھ کے سر نیچے جھکا دیتیں اور مرعوب ہوکے جگہ سے ہٹنے لگتی۔یہ سب ہمیشہ سے اس کی انا کو تسکین دیتا تھا۔وہ کسی ملکہ سے کم نہیں تھی۔ ہر ملکہ تاج تھوڑی نہ پہنتی ہیں، کچھ بے تاج بھی ہوتی ہیں۔بے تاج ملکہ ہی زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔

وہ اپنے وسیع سے سبزہ زار تک پہنچی۔سومنگ پول سورج کی کرنوں کو انعکاس کر رہا تھا۔موسم البتہ کافی خوشگوار سا تھا۔وہ مزے سے سبزہ زار پہ بنے اس پتھریلی راستے پہ چلتی گئی۔وہ اپنے گھر سے باہر نکلی۔ یکدم اس کی نظر اس پہ پڑی۔اس کی سانسیں تھم گئیں۔جبڑے کے پاس نسیں تن گئیں۔

احمد اپنی کالی کلٹس پر کوئی ٹکائے کھڑا تھا، اور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔آج اس نے کالا چشمہ نہیں پہنا ہوا تھا کیونکہ وہ یہ آنکھیں چھپانا نہیں چاہتا تھا' جن میں جتاتا تاثر تھا۔لیڈی اقتدار تنک کے احمد کو دیکھتی رہ گئی۔اس نے اپنے چہرے کا تناؤ ڈھیلا کیا اور چہرے پہ مسکراہٹ سجائی۔وہ اپنے اندر چلتی اس ہلچل کو احمد پہ عیاں ہونے نہیں دے سکتی تھی۔دماغ خطرے کی گھنٹی مسلسل بجا رہا تھا۔

احمد نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔بال نفاست سے سیٹ تھے۔اس نے لیڈی اقتدار کی طرف چلنا شروع کیا۔لیڈی اقتدار بھی چہرے پہ گرم جوش سی مسکراہٹ سجائے اسے اپنی طرف آتا دیکھتی رہی۔اندر ہی اندر وہ جیسے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

احمد اب بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔لیڈی اقتدار نے بھی اپنا جھریوں زدہ ہاتھ آگے بڑھایا، دونوں بظاہر خوشدلی سے ہاتھ ملانے لگے۔

"کیا حال ہے ملکہ عالیہ؟" احمد ادب سے بولا۔لیڈی اقتدار کی گردن تن سی گئی۔

"تم سے تو بہتر ہی ہوں۔" وہ جلانے والے انداز میں بولی تو احمد زیر لب ہنس دیا۔

"کیا آپ مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟ یا مجھے اپنی بات کھڑے کھڑے کرنی ہوگی؟" یہ جملہ سن کے لیڈی اقتدار کا مسکرانا محال ہوگیا تھا۔وہ حلق میں کرواہٹ اتارتے اسی طرح سے مسکراتی رہی۔

"کیوں نہیں؟ آؤ۔اسے بہانے میں تمہیں اپنا محل دکھاتی ہوں۔" لیڈی اقتدار نے شانے اچکائے اور مڑ گئیں۔

چال شاہانہ تھی۔احمد اس کے پیچھے چلنے لگا۔وہ چلتے چلتے ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا جیسے کوئی خاص مہمان ہو۔

"سبزہ زار کافی خوبصورت ہے۔" احمد نے زیر لب تبصرہ کیا۔لیڈی اقتدار مسکرا دی۔دونوں بظاہر' ایک دوسرے کی صحبت میں کافی آرام دہ سے تھے۔

"یہ گھر آپ کا ہے ملکہ؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس گھر میں کتنا کچھ آپ کا ہے اور کتنا آپ کے مرحوم والد کا؟" احمد عام سے انداز میں بولا۔لیڈی اقتدار نے ایک سرسری سی نظر احمد پہ ڈالی۔

"یہ گھر پورا کا پورا میرا ہے احمد۔میرے بابا اپنی زندگی میں اتنا بڑا گھر نہیں بنا سکے تھے۔یہ گھر میری محنت کا صلہ ہے۔" وہ گردن اکڑاتے جتانے والے انداز میں بولی۔احمد نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔دونوں اب بھی شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

"سیلف میڈ کرمنل ہیں آپ یعنی۔" احمد بے نیازی سے بولا تو لیڈی اقتدار نزاکت سے ہنس دی۔

"کہہ سکتے ہو۔" وہ خوشدلی سے جواب دینے لگی۔اسے جیسے احمد کا یہ کہنا بالکل بھی برا نہ لگا۔

دونوں اب گھر کے اندر داخل ہوئے۔مین حال نہایت خوبصورت تھا۔زمین پہ سفید ٹائلز لگے تھے جو کہ بھرپور چمک رہے تھے۔خوبصورت اور دلفریب ستون جگہ جگہ کھڑے کیے ہوئے تھے۔احمد کے چہرے پہ متاثر کن سا تاثر ابھرا۔

"واہ! حسین!" اس سے بولے بغیر رہا نہیں گیا۔لیڈی اقتدار فخریہ سا مسکرا دی۔

"چلیں۔اب بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" احمد بولا تو لیڈی اقتدار کا دل ڈگمگایا۔بظاہر وہ مسکراتی رہی۔

احمد یہاں کیوں آیا تھا وہ اب تک نہیں اخذ کر پا رہی تھی، لیکن یہ تو طے تھا، کہ وہ کوئی خاص وجہ لے کر ہی یہاں آیا تھا۔

دونوں اب لاؤنج کی جانب شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ سنہری کام والی کرتی اور ہیلز میں ملبوس لیڈی اقتدار اور کالا کوٹ اور پینٹ پہنے احمد اب مخالف صوفوں پہ براجمان ہوئے۔ احمد ٹیک لگا کے لمبا لمبا سا ہو کے بیٹھ گیا جب کہ لیڈی اقتدار کسی ملکہ کی طرح کندھے اور گردن اکڑا کے بیٹھی۔

"کتنی ہی عجیب بات ہے ناں ملکہ عالیہ۔" احمد نے سوچ کے ہونٹ دبائے۔ "ہماری دشمنی پچھلے تین سال سے چلے آرہی ہے، اور دیکھو تو سہی، تین سالوں میں آج ہم پہلی دفعہ مل رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں۔" لیڈی اقتدار مدھم سا مسکرائی اور سر اثبات میں ہلانے لگی۔

"دشمنوں کو کورس کی کتاب کی طرح حفظ کر لینا چاہیے۔ ہم دونوں ہی بہترین فریق ہیں۔ میں حرر کے ان بچوں سے لڑ رہی ہوں، اور یہی سوچتی ہوں کہ یہ بھی کوئی جنگ ہے بھلا؟ ایک مقابل دشمن مل جائے تو ان بچوں سے لڑتے ہوئے مزہ نہیں آتا۔" احمد نے سر اثبات میں ہلایا۔

"تعریف کا شکریہ۔ آپ میں آنر ہے کہ آپ اپنے دشمن کے سامنے ہی اس کی تعریف کر رہی ہیں۔ شاید کسی اور

میں اتنا ظرف نہ ہو۔" احمد نے شانے اچکائے۔

"بالکل! اسی لیے تو میں آج اتنی بڑی ایمپائر کی ملکہ ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم پہلے انسان ہو جس نے میرے ساتھ یہ

سب کیا ہے؟" لیڈی اقتدار اچنبھے سے بولی تو احمد معنی خیز سا مسکرایا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"بالکل نہیں۔ظاہر ہے آپ نے اس سے پہلے اور بھی خطرناک دشمنوں کا سامنا کیا ہو گا۔" وہ رکا، گردن آگے جھکائی۔"لیکن میں وہ پہلا دشمن ضرور ہوں جسے آپ نے آج تک مارا نہیں ہے۔پتا نہیں کیا مجبوری ہے آپ کی؟" احمد طنزیہ سا ہنس دیا۔لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

"فکر نہ کریں۔میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔میں بہر حال ایک سوال ضرور پوچھوں گا۔" احمد مسکرایا۔لیڈی اقتدار کا دل ڈوبنے لگا۔

"آپ کو اپنی اس دولت سے کتنی محبت ہے؟" احمد کا سوال لیڈی اقتدار کے لیے غیر متوقع تھا۔

"اتنی کے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔یہ دولت' یہ طاقت میری روح کا حصہ ہے احمد۔" لیڈی اقتدار سرد سے لہجے میں بولی۔

احمد مسکرایااور سر کو جنبش دینے لگا۔

"بہت خوب۔" وہ بولا۔"ٹی وی کھولیں ملکہ۔" احمد نے ٹانگ کے اوپر ٹانگ جمائی۔لیڈی اقتدار کے سر

پہ

خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔کچھ تھا احمد کے انداز میں، کچھ ٹھنڈا سا، کچھ برفیلا سا، جو وہ اچانک سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔اس نے ٹیبل سے ریموٹ اٹھایا' اور ٹی وی چلایا۔ٹی وی پہ نیوز چینل پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔

"ناظرین ہم آپ کو آگاہ کرتے چلیں کہ دبئی کا معروف بینک، منی لانڈرنگ' فراڈ اور کرپشن کے کیس میں سیل کر دیا گیا ہے۔" نیوز اینکر خبرنامہ پڑھ کے سنا رہا تھا۔

لیڈی اقتدار کی دنیا جہاں تھی وہیں تھم گئی۔اسے جیسے اپنی آنکھوں پہ، اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔اس کا سر چکرانے لگا۔تو احمد نے دبئ میں یہ کیا تھا؟ لیڈی اقتدار ہکا بکا سی ہو کے احمد کو دیکھنے لگی جو کہ زور سے ہنس رہا تھا۔

"دبئ پولیس کی انتظامیہ نے اہم ثبوت و شہادتوں کے پیش نظر بینک کو سیل کر دیا ہے۔ہم آپ سب کو بتاتے چلیں کہ اس بینک کا تمام پیسہ دبئ پولیس نے ضبط کرلیا ہے۔"

اور یہ وقت تھا جب لیڈی اقتدار کو دنیا گول گول گھومتی نظر آئی۔اس کے سر کی پشت پہ ہتھوڑے برسنے لگے۔۔۔اس کا سارا پیسہ۔۔۔بے شمار دولت۔۔۔سب کچھ ایک جھٹکے میں مٹی مٹی ہو گیا تھا۔ سب کچھ چکنا چور۔احمد صوفے پر سے کھڑا ہوا۔وہ میز تک پہنچا اور اس نے ریموٹ اٹھایا۔ تحکم سے اس نے ٹی وی بند کیا۔لیڈی اقتدار ہکا بکا احمد کو دیکھتے گئی۔وہ اب تک اس دھچکے کو پراسس نہیں کر پارہی تھی۔اس کی آنکھیں بے یقینی کے باعث پھیلنے لگی تھیں۔احمد نے اپنے دونوں ہاتھ میز پہ رکھے اور آگے کو جھکا۔

"ملکہ، ہار مبارک ہو۔" وہ کہہ کے سیدھا کھڑا ہوا۔کوٹ جھاڑتے وہ بغیر کچھ بولے لاؤنج سے چلا گیا۔ لیڈی اقتدار کسی بت کی طرح وہیں بیٹھی رہی۔اس کا خون منجمد ہوگیا تھا۔وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ سالوں کی کمائی دولت۔۔۔سالوں کا کمایا پیسہ۔۔۔سب دھول ہوگیا تھا۔اتنی آسانی سے۔۔۔

وہ دم سادھے، دم بخود سی ہو کے گہری سانسیں لینے لگی۔اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا جیسے اس کا دماغ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔اس کی آنکھ سے گرم گرم' موٹے موٹے آنسو روانہ ہوئے۔

"تم گئے احمد!" وہ کپکپاتی آواز لیے بولی۔اس کا وجود غصے سے ابل رہا تھا۔رنگت سرخ ہو گئی تھی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔

"اب تم نہیں بچو گے!" وہ اٹل سے انداز میں بولی تھی۔

"جو کام مجھے تین سال پہلے کر دینا چاہیئے تھا، وہ میں اب کروں گی!" اس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

وہ کھڑی ہوئی۔اس نے میز پہ ہاتھ مار کے ساری چیزیں گرا دیں۔پورے لاؤنج میں شور کی گونج ہوئی۔

لیڈی اقتدار زور زور سے چلانے لگی۔وہ اس وقت جلادی کیفیت میں لگتی تھی۔چلاتے ہوئے اس کا جبڑا تک نظر آتا تھا۔اس کی نسیں پھڑک اٹھی تھیں۔وہ کسی درندے کی مانند نظر آتی تھی۔کوئی اسے یوں چلاتے دیکھ لیتا تو یقینا بری طرح سے ڈر جاتا۔

اس نے اپنا موبائل نکالا، وہ کپکپاتی انگلیوں سے کسی کو کال ملانے لگی۔اس نے فون کان سے لگایا۔کچھ دیر میں کال اٹھا لی گئی۔

"احمد کے قتل کی تیاری کرو۔کل وہ ختم ہو جانا چاہیئے۔"کپکپاتی، غصے سے لبریز آواز میں حکم جاری کرکے' اس

نے کال کاٹ دی۔کوئی طاقت نہیں تھی جو اب اسے یہ سب کرنے سے روک سکتی تھی۔وہ اب اپنے دل کی نہیں سننے والی تھی۔اپنے کاروبار کو مزید کسی نقصان سے بچانے کے لیے، یہ کرنا ضروری تھا۔

وہ ہمت جمع کرتے کھڑی ہوئی۔ تنفس اب بھی تیز تھا۔سانسیں اب بھی پھول رہ تھیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے

اسے کھڑے ہونے میں بھی دقت ہورہی تھی۔ساری دولت کھو جانے کا غم الگ سے تھا۔

"تم اقتدار کو مات نہیں دے سکتے!" وہ کھڑے ہوکے غرائی تھی۔

گردن تننے لگی۔۔کندھے اکڑنے لگے۔۔۔نم آنکھوں میں تکبر کی آمیزش ہوئی۔

ملکہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والی نہیں تھی۔وہ اتنی آسانی سے سب کو چھوڑنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**اگلی صبح۔۔۔**

**(سچ کی کشش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ' سچ انسانوں کو برباد بھی کرسکتا ہے اور آباد بھی)**

وہ اس کمرے میں کسی انگریز سے مسکرا مسکرا کے بات کر رہا تھا۔کمرہ بھرپور چمک رہا تھا اور بہت نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ہر چیز اپنی جگہ پہ تھی۔اس کی ورک ڈیسک پہ ایک تصویر تھی، احمد اور درے کی تصویر۔دونوں اس تصویر میں دس سے بارہ سال کے لگتے تھے۔

**(سچ انسانوں کو جوڑ سکتا ہے، ضرورت پڑنے پہ توڑ بھی سکتا ہے)**

"تو پھر آپریشن کب تک ہو جائے گا؟" اس انگریز شخص نے انگریزی میں کہا۔اس نے جواباً اپنے لب بھینچ لیے

اور ایسا تاثر دیا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

”جیسے ہی ہمیں ڈونر ملتا ہے، ہم کر دیں گے۔“ اس نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت دھڑلے سے کسی نے دروازہ کھولا‘ تو اس نے بدمزہ ہو کے دروازے کی طرف نظر ڈالی۔یہ کون جاہل تھا جو بغیر ناک کیے چلے آرہا تھا؟ اس نے سوچا۔

دروازے سے نیلوفر اندر داخل ہوئی تھی۔اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔اس نے غصیلی نگاہ نیلوفر پہ ڈالی۔

**(سچ اگر ظالم ہے تو، سچ رحم بخش بھی ہے۔)**

”مسٹر درانی، اسے یہاں سے بھگائیں۔“ نیلوفر نے چڑھتی سانسوں کے ساتھ ہی کہا۔درانی کو تپ چڑھنے لگی۔

”کیا کہہ رہی ہو نیلوفر؟ کلائنٹ ہے؟“ درانی چبا چبا کے بولا ساتھ ساتھ وہ مسکرا کے اس انگریز کلائنٹ کو دیکھتا رہا جو کہ نیلوفر کی مداخلت کی وجہ سے خفا سا لگ رہا تھا۔

”جو بات میں کہنے آئی ہوں وہ آپ کے ہر کلائنٹ سے عزیز ہے۔اب اسے بھگائیں۔“ نیلوفر نے اب کلائنٹ کے اوپر غصیلی نگاہ ڈالی۔کلائنٹ کی انا کو جیسے چوٹ سی لگی تھی۔

**(سچ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھیر سکتا ہے، تو سچ آنکھوں کی ویرانگی کا بھی سبب بن سکتا ہے۔)**

”گیٹ اپ۔۔گیٹ اپ!“ وہ انگلی سے اشارہ کرتی سختی سے بولی۔

”بے عزت کرنے کے لیے ہی بلاتے ہو تم لوگ۔“انگریزی میں کہتے ہوئے، ساتھ ساتھ ایک عدد انگریزی

گالیوں سے نوازتے وہ کھڑا ہو گیا۔درانی نے نیلوفر کے اوپر کھا جانے والی نظر ڈالی۔

کچھ دیر کے لیے ماحول میں خاموشی چھا گئی۔

درانی خاموشی سے نیلوفر کو دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی وضاحت سننا چاہ رہا ہو۔وہ نیلوفر کی بھرپور کلاس لینے کا دماغ بنا چکا تھا۔

**(سچ یاد رہ جانے والا ہے تو سچ کو جھٹلانا بھی آسان ہے۔)**

نیلوفر نے ایک گہری سانس لی۔۔۔

"آپ کے بھائی کی جان خطرے میں ہے۔مسٹر فیروز یوسف درانی۔" وقت جہاں تھا اس کے لیے وہیں تھم گیا۔

اس کی آنکھوں میں پھیلا غصہ 'زائل ہونے لگا تھا اور اس کی جگہ خوف در آیا تھا۔اس کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا نیلوفر۔" فیروز عرف مسٹر درانی سر نفی میں ہلاتے بولا۔اس کی لیڈی اقتدار ایسا کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتی تھیں؟ اس نے سوچا۔

"ایسا ہی ہے مسٹر درانی۔لیڈی اقتدار کا پلان تیار ہے۔انہوں نے سنائپر احمد کے آفس کے احاطے میں بیٹھایا ہوا ہے۔وہ اپنے ہسپتال میں ہیں اور براہ راست سارے منظر کی اپ ڈیٹس لے رہی ہیں۔جلدی کریں اور میرے ساتھ چلیں، انہیں یہ سب کرنے سے روکنا ہو گا۔"نیلوفر تیزی سے کہتے کمرے سے نکل گئی۔

فیروز سب کچھ وہیں چھوڑ کے اس کا پیچھا کرنے لگا۔اس کی دائیں ٹانگ نہیں تھی اور اس پہ پراستھیٹک(prosthetic) ٹانگ جڑی ہوئی تھی جس کی مدد سے وہ چلتا تھا۔اس کی چال تھوڑی سست تھی۔وہ نیلوفر کے ساتھ اس کی گاڑی پہ سوار ہوگیا۔

"جلدی چلاؤ۔" فیروز کا صبر ختم ہونے لگا تھا۔اس کی آواز ہلکان سی تھی۔سب کچھ اس کے سامنے بے معنی ہونے لگا تھا۔اسے بس اپنے بھائی کو بچانا تھا۔نیلوفر نے زور سے ایکسیلیٹر دبایا اور گاڑی چلانی شروع کی۔عافیت زندگی سنابل سے زیادہ دور نہ تھا' اور کچھ ہی دیر کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔

**(سچ وجود کی ان دیکھی زنجیروں کو کھول بھی سکتا ہے تو سچ قید میں پابند بھی کر سکتا ہے۔)**

وہ ہسپتال میں داخل ہوئے۔۔۔

وہ گول زینہ عبور کیا۔۔

وہ سٹور روم۔۔۔

وہ لفٹ پہ سوار ہوئے۔۔۔۔

حال میں داخل ہوئے۔۔۔۔

اور اس ملاقاتی کمرے میں داخل ہوئے۔۔۔

وہ چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔۔۔

میز پہ فون سپیکر پہ رکھا ہوا تھا۔۔۔

ان دونوں کو دیکھتے اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔۔

"آپ ایسا نہیں کر سکتی لیڈی۔۔۔" اس کا انداز التجائیہ تھا۔

**(سچ سامنے ضرور آتا ہے، یاد رکھنا!)**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"آپ ایسا نہیں کرسکتی لیڈی اقتدار۔میں آپ کا وفا دار تھا۔آپ سب کے لیے میں نے ان دونوں کو چھوڑا تھا۔آپ انہیں نہیں مار سکتی۔ابھی اسی وقت سب روک دیں۔" فیروز کی آواز میں لرزش تھی۔ لیڈی اقتدار پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔وہ وقت گزر گیا تھا کہ اب اس کا ارادہ بدلتا۔وہ فیصلہ کر چکی تھی۔دنیا کی کوئی طاقت اسے اب یہ کرنے سے روک نہیں سکتی تھی۔

"یاد کریں لیڈی۔اسے روکنے کے لیے میں نے اپنی ٹانگ تک قربان کی۔" فیروز کسی طرح سے لیڈی اقتدار کے پتھر یلے دل کو نرم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن وہ بھول گیا تھا کہ لیڈی اقتدار کا خون سفید پڑ گیا تھا، وہ ایک ہی دن میں اس خون کا رنگ نہیں بدل سکتا تھا۔

"تو نیلوفر تم نے بھی مجھے دھوکا دے ہی دیا۔" لیڈی اقتدار جیسے فیروز کی ہر بات نظر انداز کر گئی۔ فیروز کو اپنا آپ بے معنی لگنے لگا۔سالوں کی وفا کا آخر یہ انجام ہونا تھا۔سالوں کی وفا کے بعد بھی اس کی خواہش کا احترام نہیں کیا جا رہا تھا۔

"یہ غلط تھا لیڈی۔ہم مسٹر درانی کو یوں ہرٹ نہیں کر سکتے تھے۔" نیلوفر نے جواب دیا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔اپنے بھائی کی موت میرے ساتھ دیکھ لو یا یہاں سے چلے جاؤ۔لیکن اس نے جو کیا اس کے بعد یہ سب ہو کے ہی رہے گا۔" لیڈی اقتدار نے غصے سے کہا۔آنکھوں کے گرد سرخی اترنے لگی۔اسے اپنی کل والی' احمد سے ملاقات بھی یاد آئی۔

"دیکھیے لیڈی۔آپ پلیز آرڈرز واپس لے لیں۔پلیز۔وہ میرا بھائی ہے۔میں جیتے جی مر جاؤں گا۔"

فیروز کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا۔وہ یوں اپنے جوان بھائی کو مرنے نہیں دے سکتا تھا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔جو کرنا ہے کر لو۔" لیڈی اقتدار ٹس سے مس نہ ہوئی۔فیروز شکست زدہ سا ہو گیا۔

مایوسی کے کالے بادلوں نے اسے گھیر لیا۔وقت گزرنے لگا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت کو گزرنے سے کیسے روکا جائے۔وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی جان کیسے بچائے۔۔۔

بد قت ٹیبل پہ پڑے موبائل سے زور دار آواز آئی۔فیروز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔وہ بے یقینی کے عالم میں لیڈی اقتدار کو دیکھنے لگا جو کہ فاتحانہ سا مسکرائی۔اس کا انتقام پورا ہوا تھا۔اس کی سب سے بڑی رکاوٹ اس دنیا سے سرکنے لگی تھی۔۔۔

فائر کی ایک اور دل خراش آواز گونجی۔۔۔

ایک اور۔۔۔

اور پھر ایک اور!

دل کو کرچی کرچی کر دینے والی خاموشی اس ملاقاتی کمرے میں حائل تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنی کہانی کو کچھ وقت کے لیے روک کے ڈھائی سال پہلے کے وقتوں میں واپس جاتے ہیں۔زینت کی موت کے ٹھیک آٹھ دن بعد۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سنابل ہسپتال کے مینجر کا یہ وہی کمرہ تھا۔۔۔

فیروز رو رہا تھا۔۔۔بلک بلک کے۔۔۔

لیڈی اقتدار اس کے سامنے کھڑی تھی۔سانسیں پھول رہی تھیں۔ماتھے اور گردن پہ موجود نسیں پھڑک رہی تھیں۔نگاہیں طیش تھیں۔آنکھوں کے گرد سرخی پھیلی ہوئی تھی۔لیڈی اقتدار نے ڈیسک پہ پڑا مگ اٹھایا اور زمین پہ پھینک دیا۔اس نے پورے ڈیسک پہ جنگلیوں کی طرح ہاتھ مارا۔دھڑم دھاڑ آوازیں اس کمرے میں گونج رہی تھیں۔یکے بعد دیگرے ڈیسک سے چیزیں گر کے زمین پہ گرتیں۔کچھ نازک چیزیں ٹوٹ کے کرچی کرچی بھی ہو جاتیں۔

”وہ مرے گا!“ وہ چلائی۔فیروز سر نفی میں ہلانے لگا۔

”یہ ظلم نہ کریں!“ فیروز روتے روتے بولا۔اپنے چھوٹے بھائی کے لیے دل میں بسی محبت ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو فیروز؟ اس نے ہمارا پورا گودام خالی کروادیا! اتنے سارے ڈونر ہمارے ہاتھ سے نکل گئے۔وہ زینت صرف ایک ایجنٹ تھی۔وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔تم جانتے بھی ہو یہ نقصان کتنا بڑا

ہے؟ وہ مردود میری ناک کے نیچے یہ کھیل کھیل رہا تھا۔میرا کاروبار تباہ کر دیا ہے اس نے۔" وہ بلند آواز میں بولی۔غصہ ابل ابل کے دماغ پہ حاوی ہونے لگا۔اس کا پورا وجود شدت بھرے غصے کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔

"میرا بھائی ہے وہ لیڈی! پلیز اسے نہ ماریں۔پلیز قتل کے احکامات واپس لے لیں۔پلیز لیڈی۔میں نے آپ کے خاطر ان سب کو چھوڑا تھا۔میں نے آپ کے خاطر ہر قربانی دی، آپ یہ نہیں کر سکتیں!" وہ گڑگڑایا۔وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔لیڈی اقتدار کا غصہ کچھ حد تک سرکنے لگا۔دل نرم پڑنے لگا۔وہ جیسا بھی تھا، اس کا دائیاں ہاتھ تھا۔وہ جانتی تھی کہ اسے ہر کوئی چھوڑ سکتا تھا، لیکن فیروز نہیں۔

فیروز گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ گیا۔گردن جھکائے ہاتھ آپس میں جوڑ کہ'وہ ایک دفعہ پھر سے گڑگڑانے لگا۔

"میں آپ کے پیر پڑتا ہوں لیڈی! اس کے قتل کا حکم واپس لے لیں۔میں جیتے جی مر جاؤں گا۔درے اکیلی رہ جائے گی۔سب برباد ہو جائے گا۔" فیروز ایک بار پھر سے گڑگڑایا۔لیڈی اقتدا نرم پڑی۔ماتھے پہ پھیلے بل ڈھیلے ہوئے۔ آنکھوں کے گرد پھیلی سرخی بھی منظر عام سے سرکی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے درانی۔اس نے حدیں پار کی ہیں۔وہ آگے اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔" اب کی بار وہ قدرے نرم ہو کے بولی۔

"بس ایک کوشش مجھے کرنے دیں۔بس ایک کوشش۔میں جانتا ہوں اس کے بعد وہ پیچھے نہیں آئے گا۔" وہ کھڑا ہوا۔دل میں امید بھر گئی تھی۔لیڈئی اقتدار کا نرم پڑنا ایک اچھی علامت تھا۔

"کیا کرو گے تم؟" لیڈی اقتدار دل برداشتہ ہو کے بولی۔وہ نیم مان چکی تھی۔

"اسے ایک غم پہلے لاحق ہو گا لیڈی۔اس لڑکی کی موت کا غم۔اسے ایک اور روگ دیں گے۔اس روگ کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکے گا اور وہ تھم جائے گا۔میں جانتا ہوں۔" لیڈی اقتدار نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

"صرف تمہارے لیے۔صرف تمہاری وفا کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پی لوں گی۔اب بتاؤ، کیا کرو گے؟" لیڈی اقتدار پوری نرم پڑ گئی تھی۔وہ گہری سانسیں لیتے کرسی پہ بیٹھی اور درانی کو دیکھنے لگی۔

فیروز کا دل زور سے دھڑکا۔وہ جو کرنے کا سوچ رہا تھا اس میں سب سے زیادہ تکلیف اسے ہی اٹھانی پڑ رہی تھی۔۔

"وہ اپنے بھائی، یعنی میری تلاش میں ہے۔کیا ہو گا اگر اس کا بھائی اس کے لیے مر جائے گا؟" فیروز بول اٹھا۔چہرے پہ وحشت سی تھی۔لیکن احمد کے لیے یہ کڑوا گھونٹ اسے پینا پڑ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" لیڈی اقتدار نا سمجھی سے بولی۔

فیروز نے ایک نظر اپنی دائیں ٹانگ پہ ڈالی، اور پھر ایک نظر لیڈی اقتدار پہ۔ حلق کے اندر ڈھیر سارا تھوک نگلا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ فیروز اور لیڈی اقتدار کی ملاقات کے تین دن بعد کا واقعہ ہے۔ درفشاں اس وقت اپنے کالیگز کے ساتھ پاک ٹوئر پہ گئی ہوئی تھی اور احمد گھر میں اکیلا تھا۔

احمد شل سا وجود لیے صوفے پہ بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور دل بھی جیسے خالی سا تھا۔ اس کے سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ٹی وی پہ نیوز چینل کھلا ہوا تھا۔

"ناظرین ہم آپ سب کو بتاتے چلیں کہ جو آپریشن بین الاقوامی ایجنسی نے تین دن پہلے کیا تھا اس میں ملنے والے پچاس لوگوں کو اپنے گھروں تک پہنچا دیا گیا ہے۔باقی ایک سو پچاس لوگوں کو بھی آتھورٹیز اپنے گھروں تک پہنچانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔" احمد نے بیزار ہو کے ٹی وی بند کر دیا۔

صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھ کے وہ سوچنے لگا کہ یہ تو اس کی فتح کا وقت تھا۔پھر وہ اتنا اداس کیوں تھا؟وہ جیت گیا تھا'لیکن پھر یہ تکلیف کس بات کی تھی؟ دل میں یہ خلش کیوں گھیرے ہوئے تھی؟ سچ تو یہ تھا کا زینت کی موت نے احمد کو تھکا دیا تھا۔وہ ہلکان ہونے لگا تھا۔اندر کہیں نہ کہیں وہ اس کی موت کا الزام خود کو دے رہا تھا۔ہاں وہ اپنے آپ کو ہارا ہوا محسوس کر رہا تھا۔اسے اپنی توانائی ختم ہوتے محسوس ہو رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت احمد کے گھر کی گھنٹی بجی۔احمد نے دروازہ کھولا تو باہر ایک چار فٹ کا لمبا سا باکس رکھا تھا جو کہ زیادہ

چوڑا نہیں تھا۔احمد آس پاس دیکھنے لگا کہ آخر اس باکس کو کون چھوڑ کے گیا تھا'لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا۔اس باکس پہ پرپل ریپ تھا اور پنک ربن۔احمد وہ باکس اندر لے کر آیا۔

احمد نے اس باکس کا ریپ کھولا۔اسے تجسس بھی ہو رہا تھا کہ آخر اس کے اندر کیا تھا۔ریپ اتارنے کے بعد اس نے وہ باکس کھولا۔اس باکس میں جو تھا وہ دور دور تک اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔اس باکس میں ایک کٹی ہوئی ٹانگ تھی۔ٹانگ جو کہ جگہ جگہ سے خون آلود تھی۔احمد آنکھوں میں خوف و وحشت لیے اس کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے رہ گیا۔اس کا دل جیسے ابلنے لگا تھا۔اس نے جھرجھری لے کر باکس چھوڑا تو باکس زمین پہ جاکے گر گیا۔اسے ابکائی آنے لگی تھی۔

ٹھیک اسی وقت احمد کے موبائل پہ رنگ ہوئی۔احمد نے وہ کال اٹھائی۔دل اب تک حلق میں تھا۔

"تمہاری بہن تم تک پہنچ گئی؟" احمد شل سا رہ گیا۔آنکھیں بے یقینی کے باعث پھیلنے لگیں۔یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

فون کے اس پار سے ایک قہقہہ گونجا جو کہ احمد کے کان میں چبھا تھا۔احمد کو لگا جیسے اس کا وجود زمین میں دھنسنے

لگا تھا۔وہ اب اتنا بڑا دکھ نہیں جھیل سکتا تھا۔شدت بھری تکلیف نے احمد کی روح کو گھیر لیا تھا۔

"فکر نہ کرو۔تمہاری بہن ٹھیک ہے۔مگر یہ تمہاری بہن بھی ہو سکتی تھی۔میں نے کہا تھا نا'خبردار ہو جاؤ۔تمہارا بھائی اب تک زندہ تھا۔مگر کیونکہ تم باز نہیں آئے' ہمیں اسے مارنا پڑا۔اس کے گردے'دل' پھیپھڑے' جگر'نکالنے پڑے۔اور ایک ٹانگ ہم نے اپنی ٹرافی کے طور پہ رکھی اور ایک تمہیں بھیج دی۔تمہارا بھائی مر چکا ہے۔تمہاری وجہ سے ہمیں اسے مارنا پڑا۔اپنے بھائی کی موت مبارک ہو مسٹر احمد یوسف درانی۔" شمس نے مزے لیتے ہوئے کہا۔احمد کے وجود میں کانٹے سے چبھنے لگا۔دل

بالکل بھاری ہونے لگا۔اس کے سر پہ گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔تکلیف کی زور دار لہر اس کی روح میں ابھر ابھر کے معدوم ہورہی تھی۔

اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔وہ روتا نہیں تھا، نہ ہی وہ رونا جانتا تھا، لیکن آج ایک الگ سی کیفیت اس کے دل میں سوار تھی۔اس کیفیت کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں واپس ضرور آؤں گا۔" احمد کی آواز غصے کی شدت سے بلبلائی۔"تم سب کو برباد کرنے۔اپنے بھائی کا انتقام لینے۔زینت کا انتقام لینے۔عثمان کا انتقام لینے۔" احمد کی آواز کپکپارہی تھی۔اس کا وجود پورا کا پورا لرز رہا تھا۔وہ اس وقت گہری تکلیف میں تھا۔گہرے رنج میں تھا۔اس نے کال کاٹی اور ڈھیلا ہو کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ایسا لگتا تھا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا اور وہ جیتے جی مر جائے گا۔

کچھ وقت وہ آنکھیں بند کر کے یوں ہی بیٹھا رہا۔دل تھا کہ قابو ہی نہیں ہورہا تھا۔وہ اندر تک ہلا دیا گیا تھا، اندر تک تڑپا دیا گیا تھا۔

کچھ وقت لگا اسے اپنے آپ کو قابو کرنے میں۔اپنے اعصاب کو قابو کرنے میں۔اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور اپنے ایک دوست کو کال ملائی۔کچھ ہی دیر بعد کال اٹھا لی گئی تھی۔

"فرحان کیا آسکتے ہو میرے گھر؟ فوراً۔" اس نے اپنا انداز سرسری رکھا۔

"اوہ۔" فرحان بولا۔وہ احمد کا ایک قریبی دوست تھا جو کہ فارنزک میں کام کرتا تھا۔وہ احمد کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ معاملہ سنجیدہ ہے۔"ہاں، میں آجاتا ہوں۔"

”ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔“ احمد نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔

کال کٹنے کے بعد اس کے وجود میں گھلی بے چینی اوراضطرابیت لوٹ آئی۔وہ اپنے لاؤنج میں ادھر سے ادھر ٹہل کے اپنا وقت کاٹنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

”یہ سب تو بہت ہی ٹیڑھا ہے‘احمد۔“فرحان اس ٹانگ والے باکس کو دیکھ رہا تھا جو کہ فرش میں ویسے ہی پڑا تھا۔”اس سب میں، میں تمہاری کیسے مدد کرسکتا ہوں؟“ فرحان نے ٹھوڑی کھجاتے پوچھا۔وہ احمد کی پوری بات سن چکا تھا۔

”کیا تم اس کی فارنزک نکال سکتے ہو؟ چیک کرواسکتے ہو کہ یہ فیروز بھائی کی ہی ہے؟ مگر راز داری میں؟ پلیز؟“احمد کا لہجہ بے تاثر تھا۔اس نے گردن جھکائے نظریں نیچے رکھے ہی التجا کی۔فرحان نے ایک گہری سانس لی۔

”مشکل ہو گا۔مگر کر لوں گا۔فکر نہ کرو‘سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہنے کے بعد فرحان کھڑا ہوا۔

وہ احمد کے عقب میں گیا۔اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔احمد نے محض سر اوپر نیچے ہلایا، بولا کچھ نہیں۔فرحان وہ باکس ہاتھ میں تھامے وہاں سے چلا گیا۔

دو دن بعد احمد کو فرحان کی کال آئی۔

”احمد۔میں نے فارنزک کر لی ہے۔یہ فیروز بھائی کی ہی ہے۔“ اپنے گھر کے لاؤنج میں موجود احمد نے یہ سنتے ہی کرب کے مارے آنکھیں میچ لیں۔اگر فیروز بھائی کے لیے کوئی امید باقی بھی تھی تو وہ اسی

وقت ختم ہو گئی تھی۔فیروز بھائی کو واقعی اس تکلیف سے گزارا گیا تھا۔۔۔موت کی تکلیف۔۔۔اعضاء نکل جانے کی تکلیف۔۔۔اسے عثمان اور زینت سے بھی زیادہ بدترین انجام دیا گیا تھا۔احمد کو اس وقت یہی لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔مارگلہ پر لے کر پہنچو اسے۔" احمد نے اپنے اندر ابلتے' ان شدت بھرے جذبات کا مقابلہ کرتے کہا۔آواز دھیمی اور بے تاثر تھی۔

اور اس وقت احمد یوسف جان گیا تھا۔۔۔

کہ اس راہ پہ چلنے والوں کو۔۔۔

حق اور انصاف کی اس کٹھن راہ پہ چلنے والوں کو۔۔۔

ان گنت قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔۔

کانٹے دار راستوں پر سے ننگے پیر گزرنا پڑتا ہے۔۔۔

خود کو آگ میں جھونک دینا پڑتا ہے۔۔۔

لیکن، اس سب کے بعد بھی' کیا منزل یقینی تھی؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## باب نمبر ۱۲: زندگی ایک افسانہ....

زندگی عجیب بے تکی کہانی ہے

اتنی جھولدار

اور اتنی عجیب

کہ سنانے بیٹھوں تو ہانپ جاؤں۔

سننے والا یقین ہی نہ کرے۔

اس کہانی کے آخر میں سب،

ہنسی خوشی نہیں رہتے۔

ہنستے بھی ہیں۔۔

روتے بھی ہیں۔۔۔

کامیاب بھی ہوتے ہیں۔۔۔

ناکامی بھی دیکھتے ہیں۔

(دل نا امید تو نہیں کی اللہ رکھی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِکُمۡ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا ٭۫ وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیۡرًا

اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور تمہاری حمایت و مدد گاری کے لیے اللہ ہی کافی ہے

(سورہ نساء آیت ۵۴)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گولیوں کی دل خراش آوازیں تھم گئی تھیں۔۔۔

لیکن وہ آوازیں ان تینو ں کو زیر اثر لیے ہوئے تھیں۔۔۔

ملاقاتی کمرے میں' دل کو چیر دینے والی خاموشی حائل تھی۔

جہاں لیڈی اقتدار بھرپور مسکرا کے اپنی جیت کا جشن منا رہی تھی' جہاں نیلوفر اپنے چہرے پہ بے یقینی اور وحشت لیے لیڈی اقتدار کو دیکھ رہی تھی' وہاں فیروز کسی دوسری دنیا میں کھویا ہوا سا لگتا تھا۔اس کے سر پہ جیسے ہتھوڑے برسنے لگے تھے۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چکرا کہ وہیں گر جائے گا۔اس کی آنکھوں نے بے یقینی اور اداسی کے رنگ اوڑھے ہوئے تھے۔اسے اپنا آپ دھوکا کھایا ہوا محسوس ہوا۔۔۔

نیلوفر نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔اس سے جیسے اب مزید کچھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔وہ الٹے قدم بڑھاتے ملاقاتی کمرے سے باہر جانے لگی۔

"چاروں گولیاں اس کے بھیجے میں اتاری ہیں لیڈی۔" لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں چمک اتری۔وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔۔۔یہ دبی دبی سی ہنسی پر جوش ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔وہ اونچے اونچے قہقہے بلند کر کے اپنی فتح کا جشن منانے لگی۔اسے پرواہ نہیں تھی جو کے دم سادھے' اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس نے لڑکھڑاتے دو قدم پیچھے بڑھائے۔ دل کے گرد تناؤ سا بڑھنے لگا تھا۔ آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ وہ اسی وقت زمین کی تہوں میں گڑ جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ روگ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

لیڈی اقتدار جبڑے پھاڑ کے اسی طرح سے ہنستے گئی۔۔۔ اس کا سب سے بڑا دشمن۔۔۔ ختم!

"وہ اسی وقت مر گیا ہے۔ اس کی لاش اب لاچار و مددگار یہاں پڑی ہوئی ہے۔" یہ الفاظ فیروز کے وجود پہ کانٹوں کی طرح چبھے تھے۔ اس کا وجود تھرتھرانے لگا تھا۔ سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے خوف تھا۔۔۔ اس کا بھائی مار دیا گیا۔۔۔ درے اکیلی رہ گئی۔۔۔ اس کا خاندان کرچی کرچی ہو گیا تھا۔۔۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا لیڈی؟ آپ یہ کیسے کر سکتی ہیں؟" آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے متواتر ٹپکے جا رہے تھے۔ وہ زیادہ رونے والا انسان نہیں تھا، وہ پتھر دل اور سفاک انسان تھا جس میں ہمدردی کا نام و نشان نہ تھا' لیکن آج اس کے سارے جرم جیسے اس کے اوپر لوٹ کے آ رہے تھے۔ وہ بھی دوسروں کو اپنوں سے محروم کرتا تھا' آج اس کا کوئی اپنا اس کی مالکن نے اس سے چھین لیا۔ وہ مالکن جس کے لیے اس نے ان گنت قربانیاں دیں۔ وہ مالکن جس کی وفاداری میں اس نے اپنی زندگی کے دس سال گزارے۔ ہر قربانی رائگاں جا چکی تھی۔۔۔ ہر وفا بے معنی ہو چکی تھی۔۔۔

لیڈی اقتدار کی ہنسی قابو میں آئی۔ چہرے پہ مسکراہٹ لیے اس نے فیروز کے اوپر نظر ڈالی۔

"اگر تم چاہو تو چلے جانا۔ مگر یاد رکھنا' موت کے علاوہ کوئی چیز اب تمہیں اس کاروبار سے جدا نہیں کر سکتی۔" لیڈی اقتدار سخت نگاہیں فیروز پہ گاڑے دھمکی دینے والے انداز میں بولی۔ وہ فیروز کی ہر

کیفیت سے بے حساس تھی۔ اسے اب اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فیروز اب بھی سکتے میں تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

"آپ نے یہ کیسے کر دیا لیڈی۔ میں نے آپ کی وجہ سے ان دونوں کو چھوڑا تھا۔ آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آیا؟ کیا میں نے قربانی اس لیے دی تھی؟" فیروز کی آواز میں غصہ تھا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس دھچکے سے وہ جلد نکلنے والا نہ تھا۔۔۔ شاید وہ نکلنے والا ہی نہ تھا۔۔۔ کچھ زخم مہلک ہوتے ہیں۔۔۔ یہ زخم بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"قربانی؟ تو چلو ایک قربانی اور سہی۔" لیڈی اقتدار نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے اور زیر لب ہنس دی۔ "نہ بھولو درانی تم نے انہیں میری وجہ سے کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ تم نے ان سب کو اپنے لیے چھوڑا تھا۔ تم ان سب کے ساتھ خود رہنا نہیں چاہتے تھے! تم نہ بھولو کہ کس طرح سے تمہیں ان کے درمیان گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ وہ ٹھہرے سفید پوش انسان اور تم' ایک کالے وجود والے مجرم۔ تمہیں ڈر تھا کہ وہ تمہاری اصلیت جان جائیں گے' اور تم سے نفرت کریں گے۔ تمہارے وجود سے بھی گھن کھائیں گے۔ تم نے یہ سب اپنے لیے چنا تھا' اپنی مرضی سے چنا تھا۔ مجھے کوئی الزام نہ دو۔" وہ قطع رحمی اور بے دردی سے بولے جا رہی تھی۔ اس کو اپنے کیے پہ ذرا برابر بھی شرمندگی نہ تھی۔ وہ کھوکلی ہو گئی تھی' حد سے زیادہ طاقت انسانوں کو کھوکلا کر ہی دیتی ہے۔

"آپ کے منہ سے یہ باتیں سننے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ آپ نے کیا کر دیا؟" وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کیا کہتا؟ جو اس کے سامنے بیٹھی تھی وہ برائی کی ملکہ تھی۔ برائی کی وہ سفاک ملکہ جس کی طاقت لازوال تھی۔ وہ مجبور تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ مٹھی میں بھینچے۔۔۔ شکوہ کن نظر لیڈی

اقتدار پہ ڈالتے وہ مڑ کے جانے لگا۔ جاتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں سے بہتے آنسو بھی پونچھے۔

لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ ایک لمحے کے لیے فنا ہوئی۔ وہ جان گئی تھی وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ اپنے دائے ہاتھ کو تو کھو ہی چکی تھی۔ نیلوفر بھی اس کے حصول میں نہیں تھی' اور شمس کو تو وہ پہلے ہی مار چکی تھی۔۔۔ایک دم سے اس کا دل خالی سا ہوگیا۔ اس کی خاص ٹیم ٹوٹ گئی تھی' بکھر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سایہ سا لہرایا۔

اس نے اپنے سر کو جھٹکا جیسے اپنے خیالات جھڑک رہی ہو۔ یہ لوگ چلے گئے تو کیا ہوا؟ کوئی اور ان کی جگہ لے لے گا۔ اس نے سوچا۔ کم سے کم اس کا کاروبار تو محفوظ تھا۔ اس کے لیے یہی کافی تھا۔ کم سے کم وہ جیت گئی تھی۔ اب وہ کسی کمزوری میں پابند تو نہیں تھی ناں۔ اس کے لیے یہی بہت تھا۔

وہ کھڑی ہوئی۔ سینہ پہلے سے بھی زیادہ تن گیا تھا۔ وہ اپنے سب سے بڑے دشمن کو مات دے چکی تھی۔ اس کا اکڑ دکھانا بنتا بھی تھا۔ چہرے پہ تکبر آمیز تاثر اس سے پہلے کبھی اتنا تکبر سے آمیز نہ تھا۔ چال ایسی شاہانہ تھی جتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔

آج جشن کا دن تھا۔ آج تو اسے اپنی فتح کا جشن منانا تھا۔ اس کا کاروبار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا تھا۔ وہ اب کبھی کسی دشمن کو اپنی کمزوری بننے نہیں دے گی' وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

وہ شاہانہ سی چال چلتے لفٹ میں سوار ہوئی۔ وہ اب اپنے قصر جانا چاہتی تھی۔ وہ فتح کے جشن سے پہلے سکون کی نیند سونا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اپنی لینڈ کروزر میں سوار تھی۔اس کا قصر بس آنے ہی والا تھا۔وجود میں ایک طاقت بخشنے والا احساس تھا۔وہ جیت گئی تھی! یہ احساس اس کے وجود میں توانائی بھر رہا تھا۔کیا ہوا اگر یہ جیت اسے سب کچھ کھو دینے کی قیمت ادا کر کے مل رہی تھی؟ کم سے کم وہ جیت تو گئی تھی۔اس کا سب سے بڑا دشمن راستے سے سرک چکا تھا۔اس کے لیے یہی بہت تھا۔ڈرائیور نے بریک دبایا تو گاڑی رک گئی۔ لیڈی اقتدار کا شاندار قصر بالآخر آچکا تھا۔

**(یہی تو دشمن کو ہرانے کا بہترین طریقہ ہے۔۔)**

گاڑی جیسے ہی رکی اس نے ایک جھٹکا کھایا۔اس کے چہرے پہ خوشمگین مسکراہٹ بکھری۔اس نے اپنا پرس کھنگالا اور نوٹوں کی گڈی نکالی اور ڈرائیور کی طرف بڑھائی۔ڈرائیور نے اوپر سے نیچے لیڈی اقتدار پہ متحیر نظر ڈالی۔یہ لیڈی اقتدار اسے اپنی نوٹوں کی گڈی کیوں دکھا رہی تھی؟ اس نے سوچا۔

"رکھ لو! آج تمہاری مالکن بہت خوش ہے۔" وہ متکبر انداز میں بولی۔آنکھوں میں خود پرست سا تاثر تھا۔ڈرائیور نے ادب سے نوٹوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں تھامی۔

لیڈی اقتدار اب گاڑی سے باہر نکلی۔

**(اسے یہ تاثر دو' کہ وہ جیت رہا ہے۔)**

وہ بہت مزے سے چل رہی تھی۔اپنے آپ میں گم۔اپنے خیالوں میں گم۔ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکراتا تو وہ کھل اٹھتی۔وہ اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ہر بوجھ سے

آزاد۔۔۔ہر فکر سے آزاد۔۔۔فتح کے بعد سب کچھ اسے بہت ہی حسین لگ رہا تھا۔زندگی بالکل پر سکون ہونے لگی تھی۔

وہ اپنے قصر کے سبزہ زار پہ پتھروں پہ بنے راستے پے شاہانہ سی چال چل رہی تھی۔دفعتاً اس کی چال سست ہو گئی۔آنکھیں پھیلیں۔مسکراہٹ سمٹی۔دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔اور وہ چلتے چلتے بالکل رک گئی۔ساکن۔وہ چوکناسی ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

گھر میں کوئی گارڈ موجود نہ تھا۔۔۔کوئی بھی نہیں۔داخلی دروازے پہ بھی کوئی گارڈ نہ تھا۔نہ ہی سبزہ زار پہ۔سب کہاں گئے؟ وہ پریشان ہونے لگی۔وہ مضطرب ہونے لگی۔اس عدم یقینی میں' اس نے ایک دفعہ پھر سے چلنا شروع کیا۔دل اچھل کود کرنے لگا تھا۔چال اب بھی سست تھی اور چہرے پہ بے چینی تھی۔دل اور دماغ خطرے کی گھنٹی مسلسل بجا رہا تھا۔وہ اپنے قصر کی پر تعیش عمارت میں داخل ہوئی۔

**(اور پھر پوری کی پوری بساط ہی الٹ دو!)**

اس نے داخلی حال کراس کیا۔وہ بہت محتاط سے انداز میں چل رہی تھی۔دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔دل بے چین سا تھا۔وہ اب مین حال میں داخل ہوئی۔

وہ لاؤنج کی جانب قدم بڑھانے لگی۔چلتے چلتے اس کے قدم سست ہوتے گئے۔کچھ تھا دل میں۔جیسے وہ جانتی ہو کہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔دل بے قابو سا ہونے لگا تھا۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ جو منظر اس کے سامنے تھے اس کی وہ دور دور تک منتظر نہ تھی۔۔۔ آج سے پہلے اسے اتنا زور دار جھٹکا کبھی نہیں لگا تھا۔۔۔

وہ منظر دیکھ کے اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ چہرے پہ حیرانگی چھا گئی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی تھی۔ اسے اپنے آپ پہ یقین نہیں آرہا تھا' اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ سب کیسے ہو سکتا تھا؟ نا ممکن!

وہ سب لاؤنج کے صوفوں کے پاس جمع تھے۔ شمائلہ مہر کے ساتھ لمبے سے صوفے پہ براجمان تھیں۔ چہرے پہ خوشگوار سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی یقینا اپنی بیٹی سے مل کے بہت خوش تھیں۔ حسام، ادریس، شکیل، اور باقی سارے حرر والے صوفوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ مناج ان سب کے آگے کھڑی' لیڈی اقتدار کی آنکھوں میں ہی گھور رہی تھی۔ احمد مناج کے برابر کھڑا' کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے' چہرے پہ شاطر مسکراہٹ سجائے' تپانے والی نظریں لیے' لیڈی اقتدار کو ہی گھور رہا تھا۔

وہاں نیلوفر بھی تھی جو کہ صوفے پہ بیٹھی تھی۔ انسپیکٹر یونس بھی کونے میں کھڑا تھا۔ وہ بھی اس منظر سے محظوظ ہونے لگا تھا۔ درفشاں بھی مہر کے برابر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ سب وہاں جمع تھے۔ اقتدار کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھنے۔۔۔

اقتدار یقینی نہیں ہے۔

زوال یقینی ہے۔ہر ابھرتی شے ایک نہ ایک دن ضرور ڈھلتی ہے۔موت سے' حالات سے' جیسے بھی۔ لیکن ڈھلتی ضرور ہے۔جو اس حقیقت کو بھلا دیتے ہیں وہ اپنے زوال پہ اسی طرح سے ششدر رہ جاتے ہیں۔۔۔

"کیا ہوا لویزا؟" مناج ہاتھ باندھے تمسخرانہ انداز میں بولی۔لیڈی اقتدار اب بھی دم بخود سی ان سب کو دیکھ رہی تھی۔اس نے تو احمد کو مار دیا تھا۔۔۔پھر؟ اس کے لیے یہ پہیلی سمجھ سے باہر تھی۔

"لویزا'ملو مجھ سے۔مناج۔" مناج نے دو قدم آگے بڑھائے۔لیڈی اقتدار پہ تپانے والی نگاہیں مرکوز کیں۔"تم نےthe boy who lived کے بارے میں تو سنا ہی ہو گا۔ملو مجھ سے۔میں ہوں۔۔۔" مناج نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "!the girl who lived" وہ چبا چبا کے بولی۔لیڈی اقتدار کے سر پہ جیسے ہتھوڑا آ کے برس گیا۔وہ لڑکی کون تھی؟اسے اب بھی ٹھیک سے یاد نہ آیا۔

"میں جانتی ہوں' تم مجھے نہیں پہچانتی' نہ ہی میں تمہیں یاد ہوں۔لیکن اگر میں تمہیں یاد رہتی تو شاید تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔شاید اب بھی تم اپنا تخت سنبھال رہی ہوتی۔اپنا برائی کا وہ کالا کلوٹا تخت!" الفاظ تھے کہ لیڈی اقتدار کے دل پہ پتھروں کی طرح برس رہے تھے۔اس کی سانسیں اب بھی بے ترتیب تھیں۔دل اب بھی کسی باریک پتے کی طرح تھر تھرا رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں خوف پھیلنے لگا تھا۔اس لمحے' اسے اس لڑکی سے شدت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"یاد کرو فرزانہ کو۔جو تمہارے اس بگڑے ہوئے بھائی کی بیوی تھی۔میں اسی کی بیٹی ہوں۔میں مناج ہوں، فرزانہ کی بیٹی۔جو کہ تمہارے گھر میں تین سال تک تڑپی تھی۔میں مناج ہوں' وہ چودہ سالہ لڑکی جس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے تم نے اس کی کڈنی چھین لی تھی۔ میں ہوں وہ لڑکی' جس کی

ماں نے تمہارے اکلوتے بھائی کو مار دیا تھا اور تمہارے ظلم سے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دی۔میں ہوں وہ لڑکی اور میں واپس آ گئی ہوں۔" اس کے انداز میں پر تپش سے نادیدہ شعلے برس رہے تھے۔وہ شعلہ لیڈی اقتدار کے جسم کے درجہ حرارت بڑھانے لگے۔اس کا ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔

لیڈی اقتدار نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔اسے سب یاد تھا۔سب کچھ۔مجرم اپنا کوئی جرم نہیں بھولتا۔وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

مناج اب دو قدم پیچھے گئی۔اس کے بولنے کا وقت ختم ہوا تھا۔اب باری احمد کی تھی۔

"مجھے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ملکہ عالیہ۔" احمد نے آنکھوں میں معصومیت لیے اپنے لب دبائے۔ "بلکہ مجھے کہنا چاہئے' ملکہِ خاک!" وہ تپانے والے انداز میں بولا۔لیڈی اقتدار کے دل پہ ضرب سا لگا۔ وہ اس کھیل کو اب تک نہیں سلجھا سکی تھی۔آخر اس سے غلطی کہاں ہوئی تھی؟ اسے اب تک سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"تم اب خاک ہو۔خاک کی طرح' دھتکاری ہوئی۔خاک جو کہ سب کے پیروں کی زینت بنتی ہے۔تم اب صرف وہی ہو۔تمہارا اقتدار ختم ہو گیا ہے لویزا۔یہی حقیقت ہے۔" وہ شعلہ باز انداز میں بولا۔ لیڈی اقتدار کی آنکھیں نم سی ہونے لگیں۔

وہ کیسے ٹوٹ سکتی تھی؟ سالوں کی ایمپائر یہ دو ٹکے کے نوجوان کیسے گرا سکتے تھے؟ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔اس کے لیے اب بھی یہ سب غیر یقینی تھا۔کاش کے بس یہ ایک خوفناک خواب ہو۔۔۔اس کی آنکھ کھلے اور وہ اپنی جیت کا جشن منا رہی ہو۔۔۔کاش۔۔۔

"ٹی وی چلاؤ!" احمد بولا۔درفشاں نے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے ٹی وی چلایا۔لیڈی اقتدار نے اپنی نظریں ٹی وی کی طرف مرکوز کیں۔اصل دھچکا تو اسے اب لگنا تھا۔

"لیڈی اقتدار جو کہ پاکستان کی مشہور و معروف ڈاکٹر ہیں' فیلین تھیروپسٹ اور ہیومین ٹیرین ہیں' ان کی ایک ویڈیو سامنے آئی ہے۔ویڈیو کے ذرائع خفیہ ہیں۔آپ سب خود ہی اس ویڈیو کا ملاحظہ فرمائیں۔" لیڈی اقتدار کے کندھے شل ہوئے۔یہ ویڈیو۔۔۔۔یہ وہ ویڈیو نہیں ہو سکتی تھی۔وہ بے اختیار گردن نفی میں ہلانے لگی۔شاق نے اسے گھیر لیا تھا۔۔۔

ٹی وی پہ اب وہی ویڈیو چل رہی تھی۔لیڈی اقتدار کے ہسپتال والی ویڈیو۔عمارہ کے قتل والی سفاک و بے درد ویڈیو۔سب لیڈی اقتدار کا اصل چہرہ اس ویڈیو میں دیکھ سکتے تھے۔سارے راز فاش ہو گئے تھے۔لیڈی اقتدار کے عزائم پر سے پردہ اٹھا دیا گیا تھا۔۔

"ناظرین ہم آپ کو بتاتے چلیں کے پولیس نے لیڈی اقتدار کے ہسپتال عافیت زندگی میں چھاپا مارا ہے۔سارے ورکرز پولیس کی گرفت میں ہیں اور جلد ہی تفتیش شروع کی جائے گی۔عافیت زندگی کے ہسپتال کے اوپر اِل لیگل آرگن ٹرانس پلانٹ کروانے کے الزامات بھی لگائے گئے ہیں۔پولیس اس معاملے میں مزید تفتیش کرے گی۔فی الحال کے لیے' پاکستان بھر میں جتنے بھی عافیت زندگی کے

ہسپتال ہیں انہیں سیل کر دیا گیا ہے۔" لیڈی اقتدار کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ نا ممکن! نا ممکن! وہ گردن نفی میں ہلانے لگی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگنے لگا تھا۔

"زوال مبارک ہو لویزا۔" احمد بولا۔

لیڈی اقتدار نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کے اپنا موبائل نکالا۔ وہ کسی کو کال ملانے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد کال اٹھا لی گئی۔ لیڈی اقتدار کی رنگت بالکل سفید پڑ گئی تھی۔ چہرے پہ پھیلی جھریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟ تمہارے چینلز پہ یہ ویڈیو کیسے چل سکتی ہے؟" وہ جنونی کیفیت میں چلائی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔ وجود میں غصہ' خوف اور وحشت بھر گئی تھی۔

"معذرت لیڈی' اوپر کی طرف سے آرڈر تھا۔" فون کے اس پار سے صاف گوئی سے جواب موصول ہوا۔ لیڈی اقتدار کے چہرے پہ بے یقینی پھیلی۔ چہرے پہ چھائے غصیلے تاثر نے اپنی شدت اختیار کی۔

"یہ اوپر کی آتھو ریٹیز' میرے ٹکروں پہ پلتی ہیں!" وہ انگلی اٹھا کے دھاڑی تھی۔ بے بسی بھرے غصے کے باعث اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔ "میں تم سب کو دیکھ لوں گی۔ تم سب کو برباد کر دوں گی۔" وہ چلا چلا کے بولی اور پھر اس نے کال کاٹ دی۔

وہ اب کسی اور کو کال ملانے لگی تھی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ کچھ ہی دیر میں کال اٹھا لی گئی۔

"یہ کیا ہے؟ اس سب کو روکو ابھی! نہ بھولو تم نے مجھ سے کتنی فیورز نکالی ہیں۔ میرے ہسپتال کو سیل نہیں ہونا چاہئے۔ بات ختم!" وہ حکم جاری کرنے والے انداز میں بولی تھی۔

لاؤنج میں موجود ہر فرد، کسی تماشائی کی طرح لیڈی اقتدار کا بگڑتا حال دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اتنا کچا کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ یہ ویڈیو سامنے آنے کے بعد مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں اتنی اَن پروفیشنل عورت کے ساتھ قطعی کام نہیں کر سکتا۔ آئندہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔" لیڈی اقتدار کو جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ جن لوگوں کے ساتھ وہ کام کرتی تھی، وہی اسے یوں رسوا کر رہے تھے۔ وہی اسے اس مصیبت سے بچانا نہیں چاہ رہے تھے۔ سب اس کی پیٹ پہ چھرا کھونپ چکے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے اپنے خاص بندوں کی پیٹ میں چھرا کھونپا تھا۔

اسے اپنا ہر جرم یاد تھا۔۔۔ مجرم اپنے جرم نہیں بھولا کرتے۔۔۔

اس نے اب ہاری ہوئی نظر اس ہجوم پہ ڈالی جو کہ یہ سب دیکھ کے قہقہے بلند کرنے لگے تھے۔ لیڈی اقتدار کا یہ حال دیکھنے لائق تھا۔ جو کسی ملکہ کی طرح چلتی تھی، جس میں کسی ملکہ جیسا تکبر تھا، وہ آج خاک کی مانند دھتکاری ہوئی ہو گئی تھی۔ وہ راکھ کی طرح بے معنی ہو گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں اس کا سارا تکبر چکنا چور ہو گیا تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔ اس کا اقتدار ختم ہو گیا تھا۔

"کیسے؟" وہ پہلی مرتبہ اس ہجوم سے مخاطب ہوئی۔ وہ جیسے جاننا چاہتی تھی کہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی۔ وہ ایسے کیسے مار کھا گئی۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

احمد نے دو قدم آگے بڑھائے۔ ہاتھ باندھ کے اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

"بہت آسان تھا۔ہم تمہیں شروع سے سب کچھ سمجھاتے ہیں!" وہ بولا۔باقی سب بھی اپنے حصے کی کہانی سنانے کے لیے تیار تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**(ہم اب ذرا حالیہ منظر کو کچھ وقت کے لیے روک کے اس پہیلی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔)**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ عمارہ کے قتل کے کچھ دیر بعد کا منظر ہے۔۔۔

لیڈی اقتدار نیلوفر کے ساتھ اس کے آفس میں موجود تھی۔دونوں آپس میں کچھ گفتگو کرنے میں مگن تھے۔

"یوں کیمراز پہ قتل کرنا لیڈی' یہ کچھ غلط نہیں ہے؟" نیلوفر آواز میں تشویش لیے بولی تو لیڈی اقتدار حقارت آمیز انداز میں ہنس دی۔

"تمہیں میں کیا اتنی بیوقوف لگتی ہوں؟" وہ بولی تو نیلوفر الجھ گئی۔"تحریک حرر کا آفس حسام نامی آرکی ٹیکچر نے بنایا ہے۔میں نے اس کے آفس کے ایک بندے کو رشوت دے کر وہاں کا ڈیزائن پہلے ہی نکلوا لیا تھا۔وہاں ایک بنکر ہے' جہاں ہر چیز کا بیک اپ رکھا جاتا ہے۔اس نے ساری معلومات مجھے دے دی ہیں۔اور آج رات ہی وہ سب میں صاف کروا دوں گی اور حرر کی چیونٹیوں کے لیے ایک سرپرائز بھی چھوڑ دوں گی۔" وہ ہنس ہنس کے بتاتے گئی۔

یہ سب سن کے نیلوفر کسی گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔کچھ اس کے دماغ میں بھی چلنے لگا تھا۔

**(احمد: عمارہ کے قتل کے بعد تم نے جس بندے کو حرر کے آفس بھیجا تھا اس بندے سے نیلوفر پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ نیلوفر نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ایک اور یو ایس بی میں بیک اپ کروا لیا تھا۔ وہ اس یو ایس بی کا کسی طرح سے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ یہاں سے سارا کھیل شروع ہوا تھا۔)**

احمد اور نیلوفر کی ملاقات۔۔۔

اس بھورے لفافے پہ بڑے سے موٹے مارکر سے لکھا ہوا تھا "عمارہ کا قتل!"۔ احمد در فشاں سے پہلے ہی پوری داستان سن چکا تھا اور وہ بھی اس پیکج کے مقصد کو فوری سمجھ گیا تھا۔ نیلوفر شاطر سا مسکرائی۔

"اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ تم اس کا کیسے استعمال کرنا چاہتے ہو۔" نیلوفر بولی۔ احمد نے سرعت سے سر اثبات میں ہلایا۔ چہرے پہ اب بھی جوش تھا۔

"بہترین! ہم اسے سادہ سا انجام نہیں دیں گے۔ بلکہ ایسا انجام دیں گے جو کہ یاد رہ جائے گا۔ ہم اسے رسوا کر دیں گے نیلوفر۔" وہ لفافہ ہاتھ میں تھامے پر جوش انداز میں بولا۔

"میرے پاس لیڈی اقتدار کی فشنگ مہم بھی ہے۔ ہم اس کا بھی استعمال کریں گے۔ لیکن' وہ وقت بھی دور نہیں جب وہ میرے دبئ جانے کے بارے میں جان جائے۔ مجھے کچھ ایسا کرنا ہو گا کہ اس کا دھیان مجھ پہ نہ جائے۔" احمد سوچتے سمجھتے بولا۔ وہ اپنے دماغ پہ زور دیتے کچھ لائحہ عمل تیار کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن تم یہ کیسے کرو گے؟" نیلوفر بولی۔

"وہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" وہ ایک جھٹکا کھاتے بولا۔اس کے دماغ میں لائحہ عمل بھی تیار تھا۔"بس میں یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی یہ ٹوٹے تب اسے کوئی بچانے والا نہ ہو۔یہ جس کو بھی مدد کے لیے پکارے' وہ جواب میں اسے رسوائی کے علاوہ کچھ نہ دے۔" احمد چہرے پہ سوچ کا تاثر لیے بولا تو نیلوفر مسکرائی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔میں لیڈی اقتدار کی سب سے بڑی سپورٹ کو ان سے دور کر دوں گی۔کوئی انہیں نہیں بچائے گا۔"

**(احمد: وہ ویڈیو میرے پاس تھی۔لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ تم منی لانڈرنگ والا معاملہ سمجھ جاؤ اور اپنا پیسہ کہیں اور منتقل کر لو۔میں پہلے تمہیں دولت کھو جانے کی تکلیف دینا چاہتا تھا' پھر تمہیں اس طرح سے برباد کرنا چاہتا تھا۔اس لیے میں نے حرر والوں کے ساتھ کام شروع کیا۔وہ سارے اغواء' میں نے نیلوفر کی مدد سے کروائے تھے۔لیکن، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔مجھے یہ کھیل رچانے سے پہلے مہر کی ماں کو محفوظ کرنا تھا۔اسی سلسلے میں میں نے مناج سے بات کی۔اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔اس کے جاننے والے پولیس افسر یونس نے ہماری مدد کی۔نیلوفر نے ہمیں اس لکڑی کے قید خانے کا پتہ دیا اور یوں ہم نے تمہارے اس قید خانے میں چھاپا مارا۔)**

انسپیکٹر یونس اپنی پولیس وین میں سوار لکڑی کے اس قید خانے کے راستے پہ گامزن تھا۔اس کے پیچھے اور بھی ویز تھیں جو کہ کافی سست سی رفتار میں اس ناہموار راستے میں رواں تھیں۔

اسے جوں ہی کسی کی کال آئی۔اس نے تھکی ہوئی سانس خارج کرتے وہ کال اٹھائی۔

”جی سر!“ وہ بہت اونچا، خوشگوار سے انداز میں بولا۔

”تم میرے بغیر کیا کیا گل کھلانے لگے ہو یونس؟ یہ سب کیا ہے یونس۔ابھی اسی وقت واپس آؤ۔تم وہاں نہیں جاؤ گے۔اور یہ فشنگ مہم والا کیا نیا ڈراما ہے؟ مجھے اس سب کی خبر اب تک کیوں نہیں ہوئی۔“یونس کا باس رعب دار انداز میں حکم جھاڑنے لگا۔یونس بالکل بھی مرعوب نہ ہوا۔اس نے آنکھیں گھماتے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔اسے بس مناج نے یہ کام کرنے کا کہا تھا' اس کے باس کے آرڈرز اس کے لیے اب بے معنی تھے۔مناج کی بس ایک درخواست ہی اس کے لیے ہر چیز پہ فوقیت رکھتی تھی۔

”آپ مجھے روک نہیں سکتے۔“ یونس نے سیدھے سیدھے انداز میں کہا۔

”اگر تم وہاں پہنچے تو میں نے تمہیں فارغ کر دینا ہے۔“

”آپ ایسا بھی نہیں کریں گے۔نہ ہی آپ اپنے مالکوں کو بتائیں گے کہ میرے کچھ بگڑے ہوئے آفسرز اس قید خانے تک پہنچنے ہی والے ہیں۔“ یونس کے کہتے ہی اس کا باس بالکل خاموش ہو گیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو۔کونسے مالک؟“وہ بوکھلا کے بولا۔

”سر اب ایسے بات نہ کریں' جیسے آپ جانتے نہیں ہیں،یا میں نہیں جانتا۔آپ جانتے ہیں وہاں کیا ہورہا ہے۔اور آپ اپنے مالکوں کو نہیں بتائیں گے کہ میں وہاں جارہا ہوں۔ویسے بھی میں بس وہاں پہنچنے ہی والا ہوں۔ان کو بتانے کے بجائے، اور مجھے نکالنے کے بجائے آپ اس سب کا کریڈیٹ اپنے سر لیں۔کیونکہ میں پکا انتظام کرکے آیا ہوں۔یہ سارے لوگ بہت جلد ہی منظر عام پہ آنے والے

ہیں سر۔ان سے جتنا جلدی ہو سکے، قطع تعلق ہو جائیں۔ جب یہ سارے لوگ اپنے انجام کو پہنچ جائیں تو آپ سینہ تان کر کہیے گا:۔" یونس نے اپنا گلا کھنکارا۔"میرے اوپر بہت دباؤ تھا، لیکن میں نے اپنے جوانون کو حکم دیا، کہ چاہے جو بھی ہو جائے ہم حق اور انصاف کے ان کارندوں کا ساتھ دیں گے!" اس نے اپنے باس کی آواز کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے کہا۔"سب آپ کی واہ واہ کریں گے۔ آپ کو پروموشن مل جائے گی۔زیادہ بڑی گاڑی۔زیادہ بڑا گھر۔زیادہ واہ واہ۔زیادہ شہرت۔زندگی بھر کے لیے یہ کام آپ کا یاد رکھا جائے گا سر۔اب سوچ لیجیے۔کیا واقعی مجھے نکال کر اپنے آپ کو اس کام سے ڈسکریڈٹ کریں گے؟" یونس کی آنکھوں میں معنی خیز سا تاثر ابھرا۔وہ جانتا تھا کہ کام بن چکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔"یونس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری۔اس نے کال کاٹ کے موبائل سائڈ میں رکھا۔وہ کھڑکی سے باہر چہرہ ٹکائے، آنکھوں میں خواب والا تاثر لیے باہر دیکھنے لگا۔

اس سب کے بعد تو اس کی بھی واہ واہ ہونی تھی۔۔۔مس مناج کے ہاتھوں۔وہ سوچ سوچ کے ہی خوش ہوئے جارہا تھا۔

**(یونس: وہاں پہ ہم نے ایک ریڈ کی، لیکن اس ریڈ کو بالکل خفیہ رکھا۔تمہارے سارے بندوں کو چھترول لگائیں۔ہمارے سارے سپاہی پچھلے ہفتے سے ان ہی کے ساتھ اس قید خانے میں پہرا دے رہے تھے۔ان کے سارے موبائل ضبط کر لیے تھے۔جب بھی تمہارے لوگ خبر لینے کے لیے کال**

**کرتے ہم ان کے سر پہ بندوقیں تان کے بات کروایا کرتے تھے۔یوں ہم نے سب کچھ تم سے چھپائے رکھا۔)**

یہ وہی رات تھی جب حسام اغواء ہوا تھا۔اسے مناج کی کال آئی تو اس نے فوراً ہی وہ کال اٹھا لی۔

”حسام' مجھے پہلے بتا دینا چاہئے تھا، لیکن راز داری بھی ضروری تھی۔“ مناج سرگوشی والے انداز میں بولی تو حسام بری طرح سے الجھ گیا۔اس کے قدم سست ہوئے۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھ کے بولا۔

”یہ سارے اغواء' یہ میری اجازت سے ہو رہے ہیں۔“ حسام کے قدم زنجیر ہوئے۔اس کا سر اچانک سے گھومنے لگا تھا۔اسے لگا اس کے ساتھ کوئی مذاق ہو رہا ہے۔ٹھیک اسی وقت اس کے اوپر پیچھے سے وار ہوا۔۔۔

**(مناج: ہم نے حرر کے سارے اسٹاف کو بھی لکڑی کے اس قید خانے میں رکھا۔ سب محفوظ تھے۔ یوں ہم تمہارے اوپر زیادہ بہتر طریقے سے الزام لگا سکتے تھے۔ ہم نے تمہیں بھرپور بھٹکا دیا تھا۔تم ہم سے لڑنے میں اپنا وقت ضائع کرنے لگی' ہمیں رسوا کرنے میں تم نے اپنی توانائی خرچ کی اور تمہارا دھیان فشنگ مہم کی طرف گیا ہی نہیں۔تم نے احمد کے اوپر توجہ دینا چھوڑ دی تھی' اور یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی تھی۔تب تک ہم نے دبئی پولیس سے بات کر لی تھی۔ ان لوگوں نے کچھ وقت تیاریاں کرنے میں لگایا اور پھر وہ بینک سیل ہو گیا۔تم سمجھتی رہی کہ ہم بیوقوف تھے' ہم بیوقوف نہیں تھے بلکہ تم بیوقوف تھی۔ہم تو بس تمہارے زوال سے پہلے تمہیں جیت کا تاثر دینا چاہتے تھے۔)**

احمد اور لیڈی اقتدار کی ملاقات کے بعد۔۔۔

لیڈی اقتدار نے نیلوفر کو کال کی تھی جو کہ اپنے آفس میں بیٹھی تھی۔نیلوفر نے فوراً ہی وہ کال اٹھا لی۔

’احمد کے قتل کی تیاری کرو۔کل وہ ختم ہو جانا چاہئے۔“کپکپاتی، غصے سے لبریز آواز نیلوفر کو سنائی دی تھی۔

لیڈی اقتدار نے یہ کہتے ہی کال کاٹ دی تھی۔نیلوفر بالکل پر سکون تھی۔چہرے پہ اطمینان سا تھا۔وہ جانتی تھی آگے کیا کرنا تھا۔اس نے اپنا موبائل نکالا اور احمد کو کال ملائی۔کال کچھ دیر میں اٹھا لی گئی تھی۔

”ہاں احمد۔قتل کا حکم جاری ہو گیا ہے۔“آنکھیں سوچ کے باعث چھوٹی کرتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”ٹھیک ہے۔وہی پلان فالو ہو گا۔لیڈی اقتدار کا کام کل کے کل ہی تمام ہو جانا چاہئے۔“سرسری سے انداز میں کہہ کے احمد نے کال کاٹ دی۔

**(نیلوفر: وہ سنائپر جو میں نے آپ کے کہنے پہ لگایا تھا وہ در حقیقت میرا وفادار تھا۔اس نے احمد کو گولیاں نہیں ماری تھیں۔وہ بس ہوائی فائرنگ تھیں۔آپ کو جیت کا سراب دینے کے لیے ہمیں یہ کرنا پڑا۔اس طرح سے احمد کی جان کو بھی کچھ نہیں ہوا۔)**

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"تو دیکھا تم نے لویزا۔ اتنی محنت کے بعد ہم تمہیں یہاں تک لا سکے تھے۔" احمد بولا تھا۔ "یہ ہم سب کی محنت ہے۔ مہر کی' جس نے تم سب کے ہاتھوں کیا کچھ نہیں سہا۔ جس نے تم سب کا اتنا زیادہ ظلم برداشت کیا۔ آپا کی' جس نے اپنی جان پہ کھیل کے تمہارا اعتماد جیتنے کی کوشش کی۔ مناج کی' جس نے تمہیں نیچے گرانے کے لیے اپنے آپ کو اتنے دن تک ٹیلی ویژن پہ بدنام کیا۔ تمام حرر کے اسٹاف کی' جو کہ آخری وقت تک مناج کے ساتھ ٹکے رہے اور اپنے مخلص ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔ نیلوفر کی' جس نے اپنی جان پہ کھیل کے تمہاری ناک کے نیچے ہم سب سے رابطہ قائم کیا۔ صرف اور صرف اپنے گناہوں کو سدھارنے کے لیے۔ تمہیں صرف ایک انسان نے نہیں گرایا' تمہیں ہم سب نے مل کر گرایا ہے۔ تمہارا تخت ہم سب نے مل کے پلٹا ہے لویزا!" وہ دانت پیستے' انگلی سے سینے پہ دستک دیتے بولا تھا۔

لیڈی اقتدار سب کچھ سن چکی تھی۔ اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔ وجود جیسے شل ہو گیا ہو۔ سب کچھ اس کی ناک کے نیچے ہوتا گیا اور اسے پتا تک نہ چلا؟ اس کا سر بری طرح سے چکرانے لگا تھا۔

"نہیں!" وہ گردن نفی میں ہلاتے بولی تھی۔ اسے جیسے اپنے اقتدار کے ٹوٹ جانے پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا!" وہ بولی۔ اس کا زوال۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ غیر یقینی۔۔۔ نا ممکن! وہ سر نفی میں ہلانے لگی۔ آنکھوں میں پھیلا خوف اپنی شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پہ دہشت سی تھی۔ وہ اپنے سامنے موجود اس ہجوم سے دہشت زدہ ہو رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت پیچھے سے پولیس کی وردی میں ملبوس عورتیں اور مرد آئے۔ لیڈی اقتدار حواس باختہ ہو کے پیچھے مڑی۔ وہ چہرے پے بے یقینی لیے ان سب کو دیکھنے لگی۔

"لویزا مراد ابراہیم۔ ہم آپ کا اریسٹ وارنٹ ساتھ لائیں ہیں' آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" مرد پولیس آفسر مؤدب سے انداز میں بولا۔ لیڈی اقتدار جنگلیوں کی طرح سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سب پولیس افسران کو دیکھنے لگی۔

"نہیں! تم لوگوں کی اتنی اوقات نہیں کہ مجھے گرفتار کرو۔" وہ چلائی تھی۔ اس کے بال بکھر ہوئے تھے۔ آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔

"ہمارے پاس وارنٹ ہے میم۔ ہمیں زبردستی کرنے پہ مجبور نہ کریں۔" پولیس افسر پھر سے بولا۔ لیڈی اقتدار نے کھا جانے والی نظر اس پولیس افسر پہ ڈالی۔

"تم سب کتے میرے ٹکڑوں پہ پلتے تھے؟ تم لوگوں کی اتنی مجال کیسے ہو گئی کہ مجھے گرفتار کرسکو؟ نمک حرامی تو تم سب کی فطرت میں تھی۔" وہ شانے اٹھا کے سینے پہ انگلی سے دستک دیتے بولی۔ آنکھوں میں طیش بھرا ہوا تھا۔

"ہمیں مجبور نہ کریں میم۔" وہ پھر سے بولا۔ لیڈی اقتدار سن سی وہیں کھڑی رہی۔

وقت نے بھی کیسا پلٹا کھایا تھا۔ جو لوگ اس کے نیچے ہوا کرتے تھے، اس کی پائی پائی کے محتاج تھے' آج وہ ہی اسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔ وہ اپنی طاقت کھو چکی تھی۔ وہ سب کچھ کھو چکی تھی۔ وہ بری طرح سے رسوا ہو چکی تھی۔

"انہیں ہتھکڑی لگائیں۔" پولیس افسر نے اب حکم جاری کیا۔لیڈی اقتدار طیش میں آگئی۔وہ تیزی سے میز کی جانب بڑھی اور میز پہ پڑا اگلدان اٹھا کے زمین پہ پھینک دیا۔

"تم لوگ مجھے کچھ نہیں کر سکتے!" وہ جلادی کیفیت میں چلائی تھی۔سب لوگ دو قدم پیچھے ہوئے۔وہ جنون اور جلاد کی کیفیت میں خوفناک سی لگ رہی تھی۔چہرے پہ سرخی' گردن اور ماتھے پہ بھڑکتی نسیں اسے مزید خوفناک بنا رہی تھیں۔وہ کسی درندے کی مانند لگ رہی تھی۔کسی جنگلی درندے کی مانند جو کہ بغیر کسی جھجک کے خون پینے پہ بھی اتر سکتا ہے۔۔۔

"تم لوگ!" وہ اونچی سانسیں لیتے بولی تھی۔آواز مزید بلند ہوئی۔"تم لوگ مجھے مات نہیں دے سکتے! میری طاقت لا زوال ہے!" وہ اتنی ذلت کے باوجود بھی اپنی گردن اکڑاتے بولی تھی۔لیکن چاہ کر بھی یہ گردن پہلے جتنی نہیں اکڑ رہی تھی۔

پولیس کے لباس میں ملبوس عورتیں اس کی طرف بڑھیں۔اسے ہاتھوں سے پکڑا اور ان میں ہتھکڑی لگائی۔لیڈی اقتدار مزاحمت کرتے گئی' لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔وہ اب پولیس کی گرفت میں تھی۔

"نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں نہیں ہار سکتی!" وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔آنکھ سے آنسو متواتر بہنے لگے تھے۔طاقت کا نشہ ٹوٹ جانے پہ اس کا حال کسی ویسے ہی نشیڑی کی مانند ہی نظر آتا تھا جو کہ کئی دنوں سے نشہ نہیں کر پا رہا ہوتا۔پولیس کی عورتیں اسے ہاتھوں سے پکڑتے ان سب سے دور لے کر جا رہی تھیں۔

"میں تم سب کو کھا جاؤں گی۔" اس کی چیخ و پکار اس لاؤنج میں مندمل ہونے لگیں۔وہ ان سب سے دور جانے لگی تھی۔

"میں واپس آؤں گی!" وہ اپنی روح کی طرح ہی کھوکلی دھمکیوں سے ان سب کو نواز رہی تھی۔وہ اب اس لاؤنج سے جا چکی تھی۔اسے اب آگے بہت مشکل حالات کا سامنا کرنا تھا۔پہلے میڈیا ٹرائل میں رسوا ہونا تھا' پھر کورٹ میں اسے ذلالت برداشت کرنی تھی۔سارا تکبر چکنا چور ہوگیا تھا، ساری شان ایک لمحے میں خاک ہو گئی تھی، طاقت کا زور اس زلزلے میں برباد ہو گیا تھا۔لویزا عرف لیڈی اقتدار پوری طرح سے برباد ہو چکی تھی۔

اس کمرے میں خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ان میں سے کچھ کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔جیت اور فتح کی خوشبو ساری فضا میں مغوم ہونے لگی تھی۔

سب ایک دوسرے کو چہروں پہ فاتحانہ مسکراہٹ لیے دیکھنے لگے تھے۔جیت کا وقت تو ان کا تھا۔فتح تو ان کی تھی۔ایک طویل جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ایک نئی صبح ان پہ طلوع ہونے لگی تھی۔ ایک نئی فجر ان سب کی زندگیوں کو چمکانے لگی تھی۔

وہ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔انصاف آخر کار ان کو مل گیا تھا۔ایک اندھیر طاقت کو وہ گرا چکے تھے۔لیکن اس طاقت کا گر جانے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ برائی کی یہ جنگ ختم ہو گئی تھی۔ابھی بہت سی جنگیں باقی تھیں۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## تین ہفتے بعد۔۔۔

وہ پچھلے تین ہفتوں سے جیل میں قید تھی۔اس کے پرانے ساتھیوں نے ایک آخری احسان اس پہ یہ کر دیا تھا کہ اسے اے کلاس جیل میں جگہ دے دی تھی۔

وہ کسی سے بات نہ کرتی۔بس سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔کمرے میں ہر وہ آسائش تھی جس کا عام انسان حقدار ہے۔ایک نرم و ملائم بستر۔پنکھا۔اکیس انچ کا ٹی وی۔ایک میز۔کتاب۔اخبار۔لیکن وہ کسی بھی چیز کو نہیں چھوتی۔پورا دن بس بستر پہ بیٹھے رہتی۔کھانا کھاتی۔اور سو جاتی۔بس یہی تھی اس کی زندگی، اور نہ جانے ایسی ہی زندگی کب تک رہنے والی تھی۔

وہ ملکہ جیسی چال چلتی تھی' وہ ملکہ جیسی بے نیازی رکھتی تھی' وہ ملکہ کی طرح حکم جھاڑا کرتی تھی۔۔۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔سب مٹی مٹی ہو گیا تھا۔وہ پیر کی دھول سے بھی زیاد گری ہوئی ہو گئی تھی۔ زندگی ختم ہونے لگی تھی۔زندگی بس ایک لکیر پہ آکے رک گئی تھی۔

وہ جیل کے اس کمرے میں بیٹھے ہر وقت اپنی موت کا انتظار کرتے رہتی تھی۔کسی طرح سے بس اسے موت آجائے۔لیکن موت ہم حقیر انسانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہی کہاں ہے؟

وہ کمرے کی بتیاں نہیں جلاتی تھیں۔وہ رات کے وقت بھی کمرے میں اندھیرا رکھتی تھی۔وہ روشنیوں میں سر اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔

اس وقت وہ ویسے ہی اپنے بستر کے سرہانے بیٹھی تھی جب وردی میں ملبوس سپاہی اس کی طرف آئی۔

"ملاقات آئی ہے۔ اٹھو۔" وہ اس طرح سے اس سے مخاطب ہوئی جس طرح سے وہ کبھی اپنے چیلوں سے ہوا کرتی تھی۔ اسے وہ سب یاد تھا۔ سب کچھ۔ ہر ایک چیز۔ کاش اسے کچھ یاد نہ ہوتا۔۔۔ اگر یاد نہ ہوتا تو یہاں پہ وقت گزارنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ ہر ایک چیز سے اسے اپنی پرانی زندگی یاد آتی تھی۔ اپنی پرانی' شان و شوکت سے لبریز زندگی۔۔۔ جو اب اسے کبھی بھی ملنے والی نہ تھی۔

وہ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے تھے۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور بال لا پرواہی سے بندھے ہوئے تھے۔ کپڑوں کا بھی حال خراب تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ وہی تھی۔۔۔ لیڈی اقتدار۔۔۔ ایک وسیع و عریض ایمپائر کی ملکہ۔۔۔ عافیت زندگی کی مالکن۔۔۔ وہ شناخت کے قابل قطعاً نہیں لگتی تھی۔

وہ اس سپاہی کے ساتھ چل رہی تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ ملاقاتی کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ ملاقاتی کمرے میں میز تھی۔ میز کی دوسری طرف احمد بیٹھا ہوا تھا۔ احمد کو دیکھ کے اس نے کوئی رد عمل نہیں دیا۔ اس کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا اور وجود خالی۔ وہ جیسے خود بھی جانتی تھی کہ احمد کے علاوہ اس سے کوئی ملنے نہیں آسکتا تھا۔ کوئی تھا جو نہیں اس کا۔۔۔

دوست بھول سکتا ہے۔۔۔ دشمن نہیں۔۔۔!

وہ چپ چاپ، اس کے سامنے جا کے بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو لویزا؟" احمد شائستگی سے بولا۔ لیڈی اقتدار طنزیہ سا مسکرائی۔

"آج میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں تم سے بہتر ہوں۔" اس نے استہزا انگیز سے انداز میں کہہ کر احمد پہ نظر ڈالی۔ "بھلا کیسی ہو سکتی ہوں میں؟" اس کی آواز میں اس کے اندر کا خالی پن جھلکتا تھا۔ وہ جانتی تھی، لڑنا بے فیض تھا۔ چلانا بے فیض تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ وہ تباہ ہو گئی تھی۔ یہی حقیقت تھی۔ حقیقت کو تو وہ کب کا تسلیم کر چکی تھی۔ مگر یہ کہاں لکھا ہے حقیقت کو تسلیم کر جانے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے؟

"مجھے لگا تھا تم میں غیرت ہو گی لویزا۔ تم مر جاؤ گی۔ لیکن تم تو اب تک زندہ ہو۔ اتنی ڈھیٹ کیوں ہو تم آخر؟" احمد جلانے والے انداز میں بولا۔ لیڈی اقتدار اس دفعہ طنزیہ سا مسکرائی۔

"تمہیں پتا ہے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی احمد۔" وہ کھنکاری۔ احمد کے چہرے پہ ستائش ابھری۔ "میں جانتی ہوں تم آج یہاں مجھ سے وہ راز اگلوانے آئے ہو۔ وہ راز جس نے اب تک تمہاری حفاظت کی تھی۔ وہ راز جو کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دے گا۔ میں چاہتی تھی کہ تم آؤ اور وہ راز مجھ سے پوچھو۔ وہ راز بتانے کے لیے ہی میں نے اپنے آپ کو اب تک زندہ رکھا تھا۔" اس کی آواز ہلکان سی ہو گئی تھی۔ آواز میں سے رعب ختم ہو گیا تھا اور آواز بھرپور لرز رہی تھی۔ احمد کے چہرے پہ نرمی چھانے لگی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"اور میں پورے دل سے تمہیں وہ راز بتانا چاہوں گی، کیونکہ یہ راز میرا تم پہ آخری وار ہو گا۔ اس وار کے بعد تمہاری روح پہ ایسا زخم لگ جائے گا جس کا مرہم تمہیں اپنی موت تک نہیں ملنے والا۔ اب سنو۔" احمد کے چہرے پہ پریشانی سی ابھری۔ اس کی پوری توجہ لیڈی اقتدار کی طرف تھی۔ لیڈی اقتدار بے جان سا مسکرائی۔ پل بھر کے لیے اس کی آنکھوں کی کمینگی لوٹ آئی۔

"تمہارا بھائی زندہ ہے احمد!" اور بس۔ یہ سننے کی دیر تھی اور احمد کو اپنی پوری دنیا چکراتے محسوس ہوئی۔ وہ دم سادھے لیڈی اقتدار کو بس دیکھتا رہ گیا۔ اس کے لیے پلک تک جھپکنا محال ہو گیا تھا۔ دل اچھل اچھل کے حلق تک آنے لگا تھا۔

"وہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کو میرے ساتھ کام کرتے ہوئے دس سال سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔ تمہیں شاید ابھی یقین نہ آئے لیکن تمہیں یقین آجائے گا۔ تم سمجھدار ہو۔ خود ہی سوچو' میں نے اتنے سال تمہیں زندہ کیوں رکھا؟ صرف تمہارے بھائی کی وجہ سے۔ فیروز مجھے بہت عزیز تھا۔ وہ دس سال تک میری خدمت کرتے آیا تھا۔ اسے یوں تکلیف دینا میرے اصولوں کے خلاف تھا۔ تم تیز ہو' سارے ثبوت تمہارے سامنے ہیں۔ فیروز کو ڈھونڈ نکالو۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔ احمد بس آنکھوں میں اداسی لیے اسے دیکھتا رہا۔

ایک ایک کر کے جیسے سارے پزل پیس جگہ پہ آنے لگے تھے۔ اسے اسی لیے نہیں مارا گیا تھا۔ اسی لیے ہی وہ اب تک بچا رہا تھا۔ اپنے بھائی کے کرم پہ۔۔۔ فیروز بھی اپنا نفس بیچ چکا تھا۔ احمد کے لیے جیسے سانسیں لینا محال ہو گیا تھا۔ یہ آخری وار واقعی بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے احمد کی روح پہ زخم سا لگایا تھا۔ ایسا زخم جو کہ جلد بھرنے والا نہیں تھا۔

"مجھے اجازت دو۔ میرا کام پورا ہوا۔" وہ کھڑی ہوئی۔ اس سے کھڑا بھی مشکل سے ہوا جاتا تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے اس کمرے سے باہر نکلی' ششدر و دم بخود سے احمد کو پیچھے چھوڑ کے۔ چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔

وہ سپاہی عورت کے ساتھ واپس اپنے کمرے تک لوٹی۔

کمرے میں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔وہ میز کے برابر میں گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پہ بیٹھ گئی۔یک دم اس کی آنکھوں کے سامنے بہت کچھ لہرانے لگا تھا۔۔ بہت کچھ۔۔۔بہت کچھ جو دل کو بے انتہا تکلیف بخشتا تھا۔

وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔آنکھ سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے تھے۔اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کسی فلم کی طرح چلنے لگی تھی۔۔۔۔

وہ کیسے اپنے باپ کے ساتھ انگلینڈ میں کھیلا کودا کرتی تھی۔۔۔

انہوں نے اسے لڑکوں کی طرح بڑا کیا۔۔گھڑ سواری سکھائی۔۔۔تیر کمان چلانا سکھایا۔۔۔بچپن سے وہ بندوقوں کے سائے تلے کھیلا کرتی تھی۔۔۔اسے اس ایمپائر کو آگے چلانے کے لیے بچپن سے تیار کیا گیا تھا۔۔وہ جانتے تھے کہ اگر کوئی اس ایمپائر کو قائم و دائم رکھ سکتا تھا تو وہ لویزا تھی۔۔۔صرف اور صرف لویزا۔۔!

کوئی اس کے والد مراد ابراہیم سے کہتا تھا کہ آپ اسے کیسے تربیت دے رہے ہیں تو وہ فخریہ سے انداز میں کہتے تھے۔۔۔"میں آنے والے وقتوں کے اقتدار کی پرورش کر رہا ہوں"۔۔۔اقتدار۔۔۔اس نے اقتدار کو اپنا عزم بنایا۔۔۔اس نے اقتدار کو ہی اپنا نام بنایا۔۔۔اور وہ کہلانے لگی تھی "لیڈی اقتدار!"۔لازوال طاقت رکھنے والی لیڈی اقتدار۔۔۔

اس نے اپنے بابا کے انسانوں کے کاروبار کو آگے بڑھایا۔عافیت زندگی کا ہسپتال کھولا۔اسے بھی وسیع و عریض بنایا۔اپنے اچھے کاموں کے ڈھونگ سے عام عوام کے دلوں میں راج کیا۔۔۔وہ اپنی فیلڈ میں ماہر تھی۔۔

اس کمرے کی دیواروں میں اسے اپنی پوری زندگی کسی فلم کی طرح چلتی نظر آرہی تھی۔۔۔

وہ عافیت زندگی کے ہسپتال میں کسی ملکہ کی طرح گھوما کرتی تھی۔۔۔اسے وہ چال یاد آئی۔وہ اب چاہ کر بھی اس طرح نہیں چل سکتی تھی۔۔۔آنسو اس کی آنکھوں سے روانہ ہوئے۔وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔دل میں شدت بھری تکلیف سوار تھی۔وہ روتے گئی۔۔۔۔

اسے سب یاد آرہا تھا۔۔۔۔

اس کی خاص ٹیم۔شمس' درانی' نیلوفر۔اور ان تینوں سے پہلے بھی بہت لوگ تھے جو آئے اور گئے۔اسے سب یاد آئے۔وہ کیسے ان پہ حکم صادر کرتی تھی۔وہ اسے عزت سے نوازتے تھے۔رسوائی کا اس کی زندگی میں نام و نشان نہ تھا۔وہ محلوں میں رہتی تھی' وہ اپنے آپ کو عزت افزائی کے قابل سمجھتی تھی۔

اسے سب یاد تھا۔۔۔فقط یاد ہی تو تھا اسے۔۔۔

وہ دھاڑے مار مار کے روتے گئی۔آنسو تھے کہ رک ہی نہیں رہے تھے۔اسے اپنا اقتدار یاد آیا۔وہ اقتدار جس کو وہ چاہتی تو اچھی طرح سے بھی استعمال کر سکتی تھی۔طاقت صرف برائی کے لیے تھوڑی نہ ہوتی ہے۔اگر وہ دوسری راہ چنتی تو شاید آج اس تکلیف میں مبتلا نہ ہوتی جس میں وہ آج مبتلا تھی۔

شاید واقعی وہ اتنی رسوائی نہ برداشت کرتی جتنی اس نے کی۔وہ شاید ایک بہتر مقام پے ہوتی۔۔۔

شاید۔۔۔مگر اب کیا فائدہ تھا؟ وہ تو سب کچھ ضائع کر چکی تھی۔

موت اس کے اختیار میں نہیں تھی۔اگر ہوتی تو وہ یقینا خود کو ختم کر چکی ہوتی' بغیر کچھ سوچے سمجھے۔ کاش موت ہی اس کے اختیار میں ہوتی۔اب اسے یہی' درد اور تکلیف سے دوچار زندگی گزارنی تھی' نہ جانے کب تک۔۔۔۔یہ پچھتاوے بھری زندگی اب اسے یوں ہی تنہائیوں اور اندھیروں میں کاٹنی تھی۔۔۔نہ جانے کب تک۔۔۔

یہ تھا لیڈی اقتدار عرف لویزا کا انجام۔۔۔

رسوائی۔۔۔ذلت۔۔۔تنہائی۔۔۔اندھیرے۔۔۔تکلیف۔۔۔دکھ۔۔۔درد۔۔۔رنج۔۔۔سب اس کی زندگی میں کسی بلا کی طرح چمٹ گئے تھے۔اسے اب اس بلا کے ساتھ ہی رہنا تھا۔کوئی دوسرا راستہ باقی نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سنابل کا یہ وہی بوسیدہ سا ٹوٹا پھوٹا ہسپتال تھا اور یہ سنابل کا وہی ہشاش بشاش کمرہ تھا جس میں وہ کام کیا کرتا تھا۔

مصروف سے انداز میں' اس وقت وہ کسی سے فون پہ بات کرتے نظر آرہا تھا۔

”وہ دونوں یعنی سیٹ ہیں۔“وہ سرسری سا بولا۔

”ٹھیک ہے۔تمہارا بہت شکریہ۔“ اس نے کہہ کے کال کاٹ دی۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کے اپنے آفس سے باہر نکلا۔باہر ایک نرس اس کا انتظار کر رہی تھی۔وہ نرس کو کچھ ہدایات دینے لگا۔نرس اس کی تمام ہدایات کو ذہن نشین کرتے گئی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ تب کی بات ہے جب فیروز پچیس سال کا تھا۔۔۔

رات کا وقت ہے اور وہ تنہائیوں سے دوچار اپنے بستر پہ لیٹا ہوا ہے۔وہ سونا تو چاہ رہا ہے لیکن سو نہیں پا رہا۔سر پہ منڈلاتے خوف اس کو گراں گزر رہے ہیں۔اس کی آنکھوں سے لگتا ہے جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔۔۔وہ ہمت ہارنے لگا ہو۔۔۔وہ جیسے اب مزید لڑنا نہیں چاہتا ہو۔۔۔

"کوئی راستہ نکال اللہ۔میرے دونوں بہن بھائی ابھی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوئے۔بس کسی طرح سے میں ان دونوں کو اس مصیبت سے نکال لوں۔مما بابا کے ایکسیڈنٹ کے بعد چیزیں بہت مشکل ہو گئی ہیں میرے اللہ۔میری مدد کر۔" اس وقت وہ اپنے رب کو نہیں بھولا تھا اس لیے زیر لب ہی بڑبڑا کے اپنے رب کو پکارتا رہا۔

زندگی کتنی مشکل ہو گئی تھی نا۔وہ اگر کمزور ہوتا تو اب تک رو رو کے ہلکان ہو چکا ہوتا۔اتنے شدید تناؤ کے باجود وہ اپنے اعصاب پہ کیسے قابو کیے ہوئے تھا' یہ صرف وہی جانتا تھا۔

وہ اس قدر تھکا ہوا ہے' کہ خوف و پریشانی کے باوجود بھی آنکھیں بند کیں تو فوراً ہی سو گیا۔

وہ اتنی گہری نیند سو جاتا ہے کہ اسے پتا نہیں چلتا اور صبح بھی ہو جاتی ہے۔اس کی آنکھ اس کے فون پہ رنگ سے کھلتی ہے۔اس کا دماغ بوجھل سا ہے اور سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔کافی دنوں سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے ہلکے ہیں۔اس کا چہرہ سوکھنے لگا ہے۔

وہ اپنا فون اٹھاتا ہے اور اس پہ کالر کا نام پڑھتا ہے۔نظام صاحب کالنگ۔یہ نام پڑھتے ہی اس کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔اس کے چہرے پہ خوف و پریشانی در آتی ہے۔وہ تھک ہار کے کال اٹھا لیتا ہے۔

”جی نظام صاحب۔“اس کی آواز میں واضح گھبراہٹ ہے۔

”فیروز مجھے انتظار کرتے پانچ مہینے ہو گئے ہیں۔لیکن، مجھے میرے پیسے اب تک نہیں ملے۔تم نے کیا سمجھ رکھا ہے اس سب کو؟ تمہارے ماں باپ کو بھی اسی وقت مرنا تھا۔“کڑوے سے انداز میں نظام بولتا ہے۔فیروز کے دل پہ کانٹے سے چبھتے ہیں۔وہ کب تک دنیا کی کڑواہٹ کو یوں ہی اکیلے جھیلتا رہے گا؟ آخر کب تک؟ وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

”نظامی صاحب میں کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ رندھے ہوئے سے انداز میں کہتا ہے۔

”مجھے نہیں پتا۔میری رقم واپس کرو،ایک ہفتے میں۔ورنہ میں نے زبردستی کرنے پر آجانا ہے فیروز۔“ نظام کا لہجہ دھمکی دینے والا ہے۔

”ایک ہفتے میں بھلا کیسے نظام صاحب؟ میں کیسے کروں گا یہ سب۔“ اس کے سر پہ تناؤ بڑھنے لگ جاتا ہے۔کندھے مزید بھاری ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔

”اپنا گھر گروی رکھوالو یا اپنے آپ کو۔ مگر مجھے میرے پیسے چاہئے ہی چاہئے۔“ بے حس نظام کال کاٹ دیتا ہے۔فیروز آخری جملہ سن کے تکلیف کے مارے آنکھیں میچ لیتا ہے۔

گھر کا بڑا ہونا آسان نہ تھا۔۔۔

فیروز اب ٹیک لگا کے بیٹھ جاتا ہے۔سب کچھ ہر گزرتے وقت کے ساتھ خراب ہوتے جارہا ہے۔قرضے پہ قرضہ پہلے سے ہے اور اب یہ دھمکیوں کا سلسلہ بھی شروع ہونے لگا ہے۔یہ سب اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے لگ جاتا ہے۔

اس کے موبائل پر ایک اور رنگ بجتی ہے۔ مبشر کالنگ۔وہ تنگ آکے اپنا موبائل بند کر دیتا ہے۔وہ اس وقت کچھ اور برداشت نہیں کر سکتا ہے۔وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن تک جاتا ہے۔فریج کا دروازہ کھولتا ہے تو اندر صرف دو انڈے دیکھ کے وہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔اگر وہ ایک انڈا کھا لیتا تو اس کے بہن یا بھائی میں سے کوئی ایک بھوکا رہ جاتا۔وہ فریج کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور ہسپتال جانے کی تیاری کرتا ہے۔

ہسپتال جاتے ہوئے ایک نیا خوف اسے ستانے لگتا ہے؛ کیا اب فاقوں کا وقت بھی آ پہنچا تھا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حالیہ فیروز' نرس کو ہدایات دے کر اپنے کمرے میں لوٹا۔ڈیسک کے سرہانے کھڑے ہوکے' اس نے نوٹ بک سے ایک پیج پھاڑا اور پین سے اس پہ لکھنا شروع کیا۔وہ تیزی تیزی اس پہ کچھ لکھتا گیا۔اس کا چہرہ پر اطمینان اور پر سکون تھا۔

اس کی ڈیسک پہ ایک لاکر رکھا تھا جس کے اندر کچھ تصویریں تھیں۔اس نے وہ پیج اس لاکر میں ڈالا۔کمرے میں ہی اس کا سوٹ کیس تیار رکھا ہوا تھا۔وہ لاکر پہ تالا لگا رہا تھا جب نرس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"تم سمجھ گئی ہو نا،تمہیں کیا کرنا ہے؟" فیروز نے لاکر بند کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھا۔ نرس نے سر اثبات میں ہلایا۔لاکر بند ہوگیا تو وہ مڑ کے نرس کو دیکھنے لگا۔

فیروز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور نرس کو تھمادی۔نرس نے نوٹوں کی وہ گڈی اپنے ڈوپٹے میں چھپالی۔نرس کا چہرہ یک دم کھل اٹھا تھا۔

"باقی کام کے بعد۔" اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے وہ ہسپتال سے جانے لگا۔۔

باہر اس کی سیویک اس کا انتظار کر رہی تھی۔وہ اپنی سیویک پہ سوار ہوا اور گاڑی چلاتا ہسپتال سے جانے لگا۔ابھی اسے ایک دو کام اور بھی نبٹانے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پچیس سالہ فیروز عافیت زندگی کے ہسپتال میں اپنے کام میں مصروف ہے۔یک دم اسے قرضے کی فکر ستانے لگ جاتی ہے۔یہ قرضہ جو اس کے والدین نے یہ پیارا گھر بنوانے کے لیے لیا تھا۔یہی قرضہ اب ان کے منہ پہ آرہا تھا۔اسی میں فیروز کچھ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔وہ اس زمانے کے عافیت زندگی کے ہسپتال کے مینجر کے کمرے کا رخ کرتا ہے۔وہ جب کمرے میں داخل ہوتا ہے تو لیڈی اقتدار ارشد صاحب سے بیٹھ کے باتیں کر رہی تھی۔ارشد صاحب اس وقت کے مینجر تھے۔

"تم بعد میں آنا فیروز۔ ابھی ہم مصروف ہیں۔" فیروز کے آتے ہی ارشد صاحب بولتے ہیں۔ فیروز کے چہرے پر مایوسی چھانے لگتی ہے۔ وہ سست سے بجھے بجھے انداز میں باہر کی طرف جانے لگتا ہے۔ لیڈی اقتدار کو پچیس سالہ فیروز کی آنکھوں میں ایک چمک سی نظر آتی ہے۔ ذہانت کا عکس اسے فیروز کی ان آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

"ایک منٹ' رکو۔ تم بتاؤ۔ کیا بات کرنے آئے ہو۔" وہ اس وقت قدرے جوان لگ رہی ہے لیکن صحبت ویسی ہی تھی' ملکہ جیسی رعبدار سی۔

فیروز ایک دفعہ پھر سے مڑتا ہے۔ وہ اپنی بات کا آغاز کرتا ہے۔ چہرے پہ شرمسار سا تاثر ہے۔

"کچھ لون چاہیئے تھا سر۔" اس کی آواز کپکپاتی ہے۔ بس ایک تیر تھا جو وہ چلانا چاہ رہا ہے۔ دل ہی دل میں وہ یہی اخذ کر چکا ہے کہ یہ کام نہیں کرنے والا ہے۔

"کتنے کا، بتاؤ؟" لیڈی اقتدار بولتی ہے۔ فیروز اپنی گردن مزید جھکا لیتا ہے۔ اس کی کسی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہو پاتی ہے۔

"تیس لاکھ۔" جہاں ارشد کا منہ کھلا رہ گیا وہاں لیڈی اقتدار کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی ہے۔

"مل جائے گا۔ اپنی گردن اٹھاؤ اور مجھے دیکھو۔" لیڈی اقتدار حکم جاری کرنے والے انداز میں کہتی ہے تو فیروز اپنی گردن اٹھا لیتا ہے۔ اسے ایک لمحے کے لیے جیسے یقین نہیں آتا ہے۔

”مگر کوئی چیز آسانی سے نہیں ملتی لڑکے۔ تمہیں میں طاقتور بنا سکتی ہوں۔ تمہارے پاس دولت کا ڈھیر ہوگا۔ طاقت ہو گی۔ کیا میرے لیے کام کرنا پسند کرو گے؟“ بوڑھا ارشد لیڈی اقتدار کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ فیروز کے دل میں اس وقت ایک عجیب سا احساس جاگتا ہے۔

”کیسا کام؟“ وہ نا سمجھی سے پوچھتا ہے۔

”کوئی اچھا کام بھلا اتنی بڑی رقم فوراً دے سکتا ہے؟ نہیں! آگے تم خود بھی سمجھدار لگتے ہو۔ خود سمجھ جاؤ۔“ وہ معنی خیز انداز میں کہتی ہے۔ فیروز کا دل اس کے حلق میں آنے لگ جاتا ہے۔ یہ گفتگو آخر کس سمت جا رہی ہے؟ وہ سوچتا ہے۔

”میں کچھ غلط نہیں کر سکتا۔“ فیروز صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے کہتا ہے۔

”مرضی۔ سب کو یہی لگتا ہے کہ وہ کچھ غلط نہیں کر سکتے۔ مگر وہ کرتے بھی ہیں' اور اس غلط کو پورے دل سے اپناتے بھی ہیں۔ میری آفر آنے والے وقتوں کے لیے بھی قائم رہے گی۔“اس نے اس وقت یہی سوچا تھا کہ وہ کچھ الٹا سیدھا نہیں کرے گا۔۔۔ مگر فاقے کا خوف اگلے دن ہی اسے لیڈی اقتدار کے قدموں میں لے آیا تھا۔۔۔

برائی کو جھڑکنا آسان نہیں ہوتا، یہ مضبوط سے مضبوط انسان کو بھی اپنے گھیرے میں لے سکتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے قرآن میں شیطان کو انسان کا کھلا دشمن قرار دیا ہے۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اپنی گاڑی بالکل سست رفتار میں چلا رہا تھا۔ چہرہ بالکل پر اطمینان تھا۔ راستے میں ایک نرسری نظر آئی تو وہ نرسری کے پاس رک گیا۔

وہاں ڈھیر سارے پھول پودے تھے۔ نرسری سے اس نے دو گلاب کے خوبصورت اور خوشبودار پودے لیے' ایک سرخ گلاب اور ایک سفید گلاب۔ گلاب جو کہ اس کی بہن کا پسندیدہ پھول تھا۔۔۔

گلاب کے پودے اس نے اپنی گاڑی میں رکھے۔ وہ اب اپنے پرانے علاقے کی جانب گاڑی بھگا رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی اپنے سابقہ گھر کے باہر روکی۔ چہرے پہ ماسک چڑھایا اور آنکھوں میں کالا چشمہ۔ وہ دو گلاب کے پودے اس نے اپنے گھر کے باہر رکھے اور تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کے وہاں سے جانے لگا۔

اب وہ اپنی اگلی منزل کی طرف رواں تھا۔۔۔ نیلوفر کا قصر۔

وہ نیلوفر کے قصر میں کچھ دیر میں ہی پہنچ گیا تھا۔ نیلوفر کے قصر کے سبزہ زار پہ ڈھیر سارے کارڈ بورڈ باکس رکھے ہوئے تھے۔ فرنیچر سارا کا سارا سبزہ زار میں موجود تھا۔ یہ سب دیکھ کے اس کے چہرے پہ ستائش سی ابھری۔

گاڑی سے اتر کے اس نے نیلوفر کو کال ملائی۔ نیلوفر نے کچھ ہی دیر میں کال اٹھا لی۔

"کیوں کال کی مسٹر درانی؟" کال اٹھاتے ہی وہ بولی تھی۔

"کہیں جا رہی ہو؟" وہ مشکوک سے انداز میں بولا۔

"ہاں مسٹر درانی۔" نیلوفر نے تھکی ہوئی سانس خارج کی۔"میں اپنا قصر اور اپنا سارا سامان بیچ چکی ہوں۔ میں بس اب سب کچھ ختم کر کے خود کو گرفتار کروانے والی ہوں۔" نیلوفر غمگین سے لہجے میں بولی تھی۔

"میں تمہارے قصر کے باہر ہوں۔کیا مل سکتے ہیں؟" فیروز نے پوچھا۔

"ہاں ضرور۔اندر آجائیں۔" نیلوفر جواباً بولی۔

فیروز اب سبزہ زار پار کر کے قصر کی عمارت میں داخل ہوا۔اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے وہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔نیلوفر اس کا انتظار کر رہی تھی۔وہ نیلوفر کو دیکھتے ہی طنزیہ سا مسکرایا۔

"تم اب اچھی بن گئی ہو' تو کیا مجھے بھی لیکچر دو گی اچھائی کے؟" فیروز نے کڑوے سے انداز میں کہا تو نیلوفر زیر لب ہنس دی۔

"نہیں۔" وہ دونوں اب ساتھ ساتھ لاؤنج تک جا رہے تھے۔"میں آپ کو کوئی لیکچر نہیں دینے والی۔ آپ کی مرضی ہے۔نہ ہی میں آپ کو پکڑواؤں گی۔میں جان گئی ہوں کہ طاقت کا زور ایک نہ ایک دن ٹوٹ ہی جاتا ہے۔" وہ ساتھ چلتے چلتے فیروز کو بتا رہی تھی۔وہ دونوں اب لاؤنج کے صوفوں پہ براجمان ہو گئے۔باقی ساری چیزیں لاؤنج میں نہیں تھی۔

"تمہیں یاد نہیں آتیں وہ آسائشیں نیلوفر؟" فیروز نے متعجب ہو کے پوچھا۔"میں تو اس سب کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے بظاہر اپنے شانے اچکائے۔

"سچ بولوں تو۔" نیلوفر کی آنکھوں میں نمی سی آئی۔ "آئی مس اِٹ آ لاٹ!" وہ چہرے پہ اداس مسکراہٹ سجائے بولی تھی۔ فیروز نے افسوس سے چہرے کو جھٹکا۔

"مجھے ابھی سے ہی یہ سب بہت یاد آرہا ہے مسٹر درانی۔ یہ بیگز' یہ کپڑے' یہ بڑا سا گھر' یہ آسائشیں اور آرام۔ یہ اب میری زندگی کا حصہ نہیں رہنے والا ہے۔" نیلوفر کی آنکھ سے ایک آنسو بے اختیار نکلا۔ فیروز کے چہرے پہ افسوس بڑھنے لگا۔

"واپس آجاؤ، میں تمہیں یہاں ایک آخری آفر دینے آیا ہوں۔ اپنی پرانی زندگی میں واپس آجاؤ۔ دفع کرو اچھائی کو۔ اس میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ طاقت اور دولت سے محظوظ ہو۔" فیروز آواز دھیمی کر کے بولا تھا۔ نیلوفر تیزی سے گردن نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں۔ آپ نے چھ سال پہلے مجھے قائل کیا تھا۔ اب نہیں کر سکیں گے۔ میں اب اپنے نفس کے اوپر ظلم نہیں کر سکتی۔ ہاں میرا نفس ان سب آسائشوں کی خواہش کرتا ہے' لیکن میری روح پرسکون ہے۔ وہ خوش ہے۔ میں اپنی روح کے لیے' اپنے رب کے لیے' یہ سب نہیں چھوڑوں گی۔" وہ اداس سا ہی مسکرا کے بولی تھی۔ درانی نے لب دباتے سر نفی میں ہلایا۔ چہرے پہ جیسے مایوسی سی پھیلی۔

"تم ایک ہیرا تھی۔ ایک جیم۔ تم میرے لیے بہت منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی۔ کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" فیروز آواز میں افسوس لیے بولا۔ نیلوفر کے دل کو اس وقت کچھ ہوا تھا۔ دل سے ایک آواز ضرور آئی تھی کہ ان آسائشوں کے بغیر تم نہیں رہ سکتی۔۔۔ وہیں آوازیں۔۔۔ لیکن آج جو اس کے پاس تھا اس سے پہلے وہ اس کے پاس کبھی نہ تھا۔ اس کے پاس اس کا رب تھا۔ اس کا ساتھ تھا۔ وہ اپنے رب سے قرب کا مزہ چکھ چکی تھی۔

اس کے دل میں اس وقت توانائی سی بھرنے لگی تھی۔اس کے اندر انکار کرنے کی ہمت آ گئی تھی۔

”ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے!“ وہ اٹل سے انداز میں بولی۔فیروز مایوسی سی گردن نفی میں ہلاتے کھڑا ہوا۔اس نے اپنے کوٹ کا پٹ درست کیا۔

”تمہارے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا تھا نیلوفر۔“ اس نے آگے بڑھ کے مسکرا کے کہا۔نیلوفر بھی کھڑی ہوئی۔فیروز نے ہاتھ آگے بڑھایا۔نیلوفر بھی اس سے ہاتھ ملانے لگی۔

اسی وقت فیروز کا بائیاں ہاتھ اس کی جیب میں گیا۔اس نے ایک باریک اسکریو ڈرائیور اپنی جیب سے تیزی سے نکالا اور نیلوفر کی گردن پہ اس سے وار کیا۔وار بالکل غیر متوقع تھا۔نیلوفر ششدر رہ گئی۔

تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیلیں۔جسم لرزنے لگا۔وجود آہستہ آہستہ ڈگمگانے لگا۔اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔فیروز مدھم سا مسکرایا۔نیلوفر بس اسے دیکھتی رہی۔اس کا جسم جواب دینے لگا تو وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گئی۔خون اس کی گردن کی سمت سے بہے جارہا تھا۔

”اگر تم مان جاتی تو تم بچ جاتی۔لیکن اب صرف تم ہی اس ملک میں وہ واحد انسان ہو جو کہ میرے راز سے واقف ہے۔میں تمہیں یوں زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔نیلوفر تکلیف سے بلک رہی تھی۔اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔وہ زمین پہ ڈھیر ہوگئی تھی۔وجود اب بھی تڑپ رہا تھا۔

”لیکن مجھے شرمندگی نہیں ہے۔اتنا ہی پیار ہے نا اپنے رب سے‘ تو جاؤ اس کے پاس۔“ وہ نقاہت انگیز لہجے میں بولا۔اس کے چہرے سے اس وقت خباثت ٹپک رہی تھی۔

نیلوفر کے جسم میں تکلیف کی زور دار لہریں ابھرنے لگیں۔ وہ بلکنے لگی' تڑپنے لگی۔ یکدم اس کی آنکھوں میں خوف سا آیا۔ ایک ہچکی اس نے لیے اور گہری سانس باہر خارج کی۔ اس کا جسم ساکن ہونے لگا۔ جسم نے حرکت کرنا بند کردی۔ ساری تکلیف ختم ہوگئی تھی۔

فیروز کے چہرے پہ کڑواہٹ ابھری۔ نیلوفر کی لاش کو ویسے ہی لاچار چھوڑ کے وہ اب قصر سے جانے لگا۔

وہ اب اپنی گاڑی پہ سوار ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ اس وقت بتیس سال کا تھا۔

اس وقت تک عافیت زندگی کے مینجر کا عہدہ وہ سنبھالنے لگا تھا۔

لیڈی اقتدار فیروز کے سامنے اس آفس میں بیٹھی ہے۔ وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں نظر آرہی ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے۔

"میں کچھ سوچ رہی ہوں درانی۔" لیڈی اقتدار سوچ میں کہتی ہے۔ فیروز لیڈی اقتدار پہ نظر ڈالتا ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بجھا بجھا سا ہے۔ کندھے بھی نیچے کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ وہ قدرے بے چین سا نظر آرہا ہے جیسے اندر سے وہ بہت ڈسٹرب ہو۔ یقیناً کوئی چیز اسے پریشان کر رہی ہے۔

"ہاں بولئے۔" فیروز لاتعلق سے انداز میں کہتا ہے۔

"نیلوفر کو عافیت زندگی کا مینجر بنانے کا سوچ رہی ہوں۔وہ بہت ذہین ہے۔ اس کی ذہانت ضائع نہیں ہونی چاہئے۔اور تم ہمارے خفیہ ہسپتال' سنابل کو سنبھالو گے۔اور وہاں پہ تم ساری ڈیلنگز کیا کرو گے۔" وہ کسی گہری سوچ میں بولتی ہے۔

"جیسے آپ کو بہتر لگے۔" فیروز تھکے ہوئے سے انداز میں جواب دیتا ہے۔لیڈی اقتدار کو اس لمحے فیروز کے انداز میں کچھ مختلف سا نظر آتا ہے۔اس کے چہرے پہ تشویش در آتی ہے۔

"کوئی مسئلہ ہے فیروز؟ تم مجھے بتا سکتے ہو۔" وہ آواز میں تشویش لیے پوچھتی ہے۔فیروز ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتا ہے۔

"میں تنگ آ گیا ہوں۔احمد اور درے اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔وہ اچھے سے اچھا کام کر رہے ہیں اور میں؟ میں بھلا کیا کر رہا ہوں۔میں آج کل ان سے نظریں نہیں ملا پا رہا ہوں لیڈی۔بہت عجیب سا لگ رہا ہے مجھے۔ایسا نہیں ہے میں اس دنیا کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔مجھے اس دنیا سے محبت ہو گئی ہے۔مجھے طاقت سے محبت ہو گئی ہے۔مجھے اس کام سے محبت ہو گئی ہے۔مگر پھر بھی زندگی میں کچھ خلش سی ہے لیڈی۔میں اس سب کے بعد پہلے جیسا کام نہیں کر پا رہا ہوں۔میں آخر کیا کروں؟" وہ اپنی مالکن کو ایک جھٹکے میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔لیڈی اقتدار سوچ کے سر اثبات میں ہلاتی ہے۔

"اگر وہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں تو تم انہیں چھوڑ سکتے ہو۔بس اپنے دھندے پہ دھیان دو۔ملک سے ملک سیر کرو۔طاقت حاصل کرو۔دولت کماؤ۔" وہ ہاتھ اٹھا کے اسے تجویز دینے لگتی ہے۔

"میں انہیں ایسے ہی کیسے چھوڑ دوں؟" فیروز پوچھتا ہے۔لیڈی اقتدار کے چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ در آتی ہے۔

"مشکل نہیں ہے۔سب ہو جاتا ہے۔تم ان کو چھوڑ کر زیادہ پر سکون رہو گے۔اگر چاہو تو میں تمہارے سارے انتظامات کروا سکتی ہوں۔" لیڈی اقتدار آفر دے کر شانے اچکا دیتی ہے۔

"کیا کریں گی آپ؟" فیروز پوچھتا ہے تو لیڈی اقتدار اسے سب کچھ بتانے لگ جاتی ہے۔

فیروز کی گمشدگی کے کھیل کا بیج یہاں پہ بو دیا گیا تھا۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فیروز نے اپنی گاڑی ایئرپورٹ کے باہر روکی۔اس کے سر پہ کالی ہیٹ تھی جو کہ ترچھی کر کے اس نے پہنی ہوئی تھی۔اس نے ریسیپشن کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔چہرہ اب بھی پر اطمینان سا تھا۔

"میں نے ایک ٹکٹ بک کروائی تھی' آن لائن۔مجھے وہ دے دیجیے۔" فیروز نے سرگوشانہ انداز اختیار کرتے کہا تو ریسیپشنسٹ تکلفانہ سا مسکرائی۔

"اپنا شناختی کارڈ دیجیئے سر۔" ریسیپشنسٹ نے پوچھا۔فیروز نے جیب سے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے اپنا شناختی کارڈ نکالا۔ریسیپشنسٹ نے شناختی کارڈ کو بغور دیکھا۔پھر وہ کمپیوٹر پہ تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگی تھی۔

"التمش سر' آپ کہاں جارہے ہیں؟" فیروز۔۔۔آج سے التمش تھا۔وہ اب سے اپنی جعلی شناخت استعمال کرنے والا تھا۔وہ فیروز سے جڑی ہر یاد کو مسخ کردینا چاہتا تھا اور التمش بن کے ایک نئ زندگی شروع کرناچاہتا تھا۔

"سری لنکا!" اس نے شاطر سا مسکرا کے جواب دیا۔۔۔

ایک نئ شروعات۔۔۔ایک نئ زندگی۔۔۔اس کے منتظر تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

**دو دن بعد۔۔۔۔**

احمد اس وقت اپنے کمرے میں اپنے بستر پہ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔لیڈی اقتدار سے ایک ہفتے پہلے کی ملاقات کے بعد'نہ وہ ٹھیک سے کھانا کھا پا رہا تھا نہ ہی کوئی کام کر پارہا تھا۔اندر ہی اندر وہ بہت ڈسٹرب سا تھا۔زندگی کا سب سے بڑا سچ عیاں ہو جانے پہ دل جیسے بکھر گیا تھا۔دل یقین کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ سب سچ ہے۔۔۔اس کا بھائی' جو بچپن سے اس کا رول ماڈل رہا وہ یہ سب بھی کر سکتا تھا۔مگر یہی سچ تھا۔۔۔

وہ درے سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کر پاتا تھا۔بظاہر اپنے آپ کو وہ جتنا بھی پر سکون ظاہر کر لیتا' لیکن اندر سے وہ بے حد بے قرار تھا۔

اس وقت گھر کی گھنٹی بجی تھی۔ احمد اپنے کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ آنکھیں خالی سی تھیں اور اندر سے بھی وہ اپنے آپ کو کھوکلا سا محسوس کر رہا تھا۔ جب بھی وہ اپنے بھائی کا سوچتا' دنیا سے الگ تکلیف اس کے دل کو چیرنے لگتی۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔

تب ہی اسے آوازیں آئیں۔ درے کے کچھ اونچا کہنے کی۔ اس کے تیز تیز قدموں کی۔ اس نے متجسس ہوکے اپنی آنکھیں کھولیں۔

کچھ دیر میں درے حواس باختہ سے عالم میں اوپر دوڑتے ہوئے آئی۔ احمد اس کا یہ عالم دیکھتے ہی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے بھنویں سکوڑیں اور چہرے پہ پریشانی لیے درے کو دیکھا جو کہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔ آنکھیں اس کی بھیگی ہوئی تھیں۔ احمد کا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ درے آخر کیا خبر لائی تھی؟ اس نے سوچا۔

درے کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

"یہ سب کیا ہے احمد؟" وہ گہری سانسیں لیتے بولی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ درے نے وہ خط احمد کی جانب بڑھایا۔ احمد نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ خط اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ دل ہی دل میں وہ جانتا تھا وہ خط کس کا تھا۔۔۔

"احمد اور درے،

میں سنابل ہسپتال میں تم دونوں کا منتظر ہوں۔ مجھ سے ملنے آؤ۔

فیروز یوسف درانی"

احمد ہاتھ میں خط لیے کسی بت کی طرح اپنی جگہ پہ منجمد رہا۔درے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے گئی۔

"یہ سب کیا ہے احمد؟ کچھ تو بتاؤ؟" درے زور دے کر بولی تو احمد چونکا۔چہرے پہ تناؤ سا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے بے بسی کے مارے آنکھیں میچیں۔وہ یہ راز مزید اپنے آپ تک محدود نہیں رکھ سکتا تھا۔وہ اس راز کا بوجھ اکیلے قطعاً نہیں اٹھا سکتا تھا اسی لیے اس نے درے کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

"بھائی زندہ ہیں درے!" احمد بولا تو درے سکتے میں آگئی۔اس کی سانس اس کے حلق میں اٹکی۔گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے دو قدم پیچھے بڑھائے۔

"کیا بات کر رہے ہو احمد؟" آنسو درے کی آنکھوں سے روانہ ہوئے۔احمد اپنے بستر سے اٹھا۔

"میرے ساتھ چلو۔سب بتاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے غسل خانے کا رخ کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گاڑی فضا میں ہر سو ہر دم سوگواریت پھیلی ہوئی تھی۔۔۔

خاموشی دونوں کے درمیان حائل تھی۔سچ سننے کے بعد' وہ کچھ بھی نہ بولی نہ ہی اس نے کوئی بات کی۔وہ دونوں سب کچھ جان گئے تھے۔۔۔ضرورت سے زیادہ ہی۔۔۔وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سچ کو جان گئے تھے۔۔۔لیکن کیا صرف سچ جان لینا کافی تھا؟

اتنے سالوں سے درے' جس بھائی کے زندہ ہونے کی دعائیں کرتی تھی' رو رو کے' گڑگڑا گڑگڑا کے۔۔۔آج وہ دل سے تمنا کر رہی تھی کہ کاش وہ مردہ ہی ہو۔۔۔کاش وہ تین سال پہلے ہی مر گیا ہو۔۔۔

سچ۔۔۔ظالم سچ۔۔۔سفاک سچ۔۔!

درے اور احمد نے اپنی گاڑی سنابل کی بوسیدہ عمارت کے باہر روکی۔وہ دونوں سست سے قدم بڑھاتے ہسپتال کی راہداری میں چلنے لگے۔ایک نرس ان دونوں کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکی۔اس نے چابی احمد کی طرف بڑھائی۔

"یہ لیجئے۔اور ادھر چلے جائیں۔" نرس نے فیروز کے آفس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

احمد اور درے نے ایک دوسرے کے اوپر تاسف بھری نگاہیں ڈالیں۔دونوں کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

دونوں نے اب کمرے کی طرف قدم بڑھانا شروع کیے۔آخر اس کمرے کے دروازے کے پار کون سا منظر ان کا منتظر تھا؟ کونسا نیا انکشاف ان کا منتظر تھا؟ کیا فیروز ان کو ادھر ملنے والا تھا؟ وہ اس سے مل کر کیا کریں گے بھلا؟ ان ہی سوچوں میں گم سم وہ یہ مختصر سا سفر طے کرنے لگے۔

سنابل کے اس میلے فرش پہ چلنا کانٹوں پہ چلنے کے مانند محسوس ہوتا تھا۔۔۔

کمرے کا دروازہ مخصوص آواز کے ساتھ کھلا۔کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر فیروز وہاں نہیں تھا تو انہیں ادھر کیوں بلایا تھا؟ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔دونوں متعجب ہو کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ڈیسک پر ایک لاکر رکھا تھا۔احمد نے اس لاکر میں چابی گھسائی اور اسے کھولا۔اس لاکر کے اندر ان دونوں کو اب وہ سب نظر آیا۔

ادھر تصویریں تھی۔بہت ساری۔فیروز اور ان سب کی۔کچھ میں وہ چھوٹے بچے تھے۔۔۔خوش باش۔کچھ میں بالغ۔ایک میں درے فشاں اپنے گریجویشن گاؤن میں تھی۔وہ صرف تصویریں نہیں تھی بلکہ ان کی زندگی کا ایک مخصوص حصہ تھا جو کہ اس لاکر میں قید تھا۔فیروز ساری یادیں اس لاکر میں قید کر کے جا چکا تھا۔احمد کی نظر پھر اس خط پہ پڑھی جو فیروز نے ان دونوں کے لیے چھوڑا تھا۔احمد نے وہ خط در فشاں کو تھمایا۔

"اونچا پڑھنا۔" احمد بولا۔درے نے سر کو جنبش دے کر وہ خط پڑھنا شروع کیا۔

"احمد اور درے۔

میں فیروز۔تم دونوں کا بھائی۔مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ میری حقیقت سے واقف ہو کہ نہیں۔بہر حال میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔میں کبھی نہیں مرا تھا۔میں بس تم لوگوں کی زندگیوں سے دور جانا چاہتا تھا کیونکہ میں غلط کام کرتا تھا۔تم دونوں کی موجودگی میں میرا دم گھٹتا تھا۔میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگ جاتا تھا۔میرا آپ مجھے تم دونوں کے سامنے بہت چھوٹا سا لگتا تھا اسی لیے میں تم دونوں کو چھوڑ کے چلا گیا۔

یہ سب قرضوں سے شروع ہوا تھا۔معاشرے سے موصول ہوتی طعن و تشنیع سے شروع ہوا تھا۔لوگوں کے تلخ رویوں سے شروع ہوا تھا۔اور ان ہی کی کڑوی باتوں سے شروع ہوا تھا۔فاقوں کے خوف سے شروع ہوا تھا۔مالی تنگی کے ڈر سے شروع ہوا تھا۔اس سب نے مجھے یہ راستہ اختیار کرنے پہ مجبور کیا' جس کا میں آج تک مسافر ہوں۔میں کوئی جسٹی فکیشن نہیں دوں گا۔میں غلط تھا۔غلط تو غلط ہی سہی۔مگر اب میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھنا۔

اتنے سال تم سب لوگوں سے دور رہنے کے باوجود بھی تم لوگوں کو چھوڑ نہ سکا۔میں ہمیشہ ہی تم دونوں کے ساتھ تھا۔تم دونوں پر نظر رکھواتا تھا۔ایک دفعہ درے کے ہسپتال میں دو لڑکوں نے اسے ہراساں کیا تھا تو میں نے ان کا بھی علاج کر دیا تھا۔میں ہر پل تم دونوں کے ساتھ تھا۔ان تصویروں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔جب یاد آتے تو ان تصویروں کو دیکھا کرتا تھا اور اپنا یہ دل بہلایا کرتا تھا۔کیا کرتا، میرے بہن بھائی تھے، بچوں کی طرح عزیز تھے، یاد تو آتے تھے ناں!

مگر اب میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا۔میں واقعی تم دونوں کی زندگیوں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔میں ان تمام یادوں کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔اسی لیے میں ان تصویروں' اور ان سے منسلک تمام یادوں کو چھوڑ کے جا رہا ہوں۔سری لنکا۔اپنی کمائی دولت کے ساتھ۔وہی کام کرنے جو ادھر کرتا تھا۔میں اب اس کام کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔مرتے دم تک یہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔

اب تمہارا بھائی واقعی مر چکا ہے احمد اور درے۔اب میں واقعی تم دونوں کے لیے مر چکا ہوں۔تم دونوں سے کوسوں دور ہوں۔اب تمہارے خیال مجھے پریشان نہیں کریں گے۔اور میں نہیں چاہتا کہ میرا خیال تم دونوں کو پریشان کرے۔یہ سمجھ لو جیسے میں تم دونوں کی زندگیوں میں کبھی تھا ہی نہیں۔فیروز مر چکا ہے۔جان لو یہ بات۔

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔اگر نہیں بھی' تو بھلا یہ چیزیں اب کون سا معنی رکھتی ہیں؟"

آنسو اس کے گال کی حد پار کر کے اس خط پہ ٹپک رہے تھے۔احمد ششدر سا' سن دماغی میں درے کے ان لڑکھڑاتے لفظوں کو سنتا رہا۔دونوں کے دلوں میں چبھن سی ہو رہی تھی۔تکلیف سی ہو رہی

تھی۔بے قراری اور بے چینی دونوں کے دلوں پہ سوار تھی۔اس کمرے میں دم بخود سے ہو کے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے گئے۔۔۔

غم اور رنج ان سے چمٹ چکا تھا۔شدت بھری تکلیف دونوں کی روح پہ سوار تھی۔

اور جس تکلیف میں دونوں مبتلا تھے' اس تکلیف سے وہ جلد نکلنے والے نہ تھے۔۔۔

دونوں کے لیے زندگی اب پہلے جیسی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## چھے مہینے بعد:

بہار کا موسم آ چکا تھا۔آسمان پہ بادل پھیلے ہوئے تھے جو کہ اسلام آباد کی سورج کی پر تپش کرنوں سے حفاظت کر رہے تھے۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسلام آباد کے احاطے پہ سوار تھے۔پیڑ' پودے' پتے' چرند پرند سب ہی اس خوشگوار موسم سے محظوظ ہوتے نظر آرہے تھے۔رات بھر بارش کی وجہ سے مٹی گیلی تھی اور گیلی مٹی کی مہک سارے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔

گیلی مٹی کی یہ خوشگوار سی مہک ان تینوں کے نتھنوں سے ٹکرائی۔عنایا، مہر اور شمائلہ۔مہر شمائلہ کی وہیل چیئر گھسیٹتے لے کر آرہی تھیں۔وہ کافی تر و تازہ اور خوشحال سی نظر آرہی تھیں۔ان کے چہرے پہ رونق تھی۔بیٹی کے سالوں بعد مل جانے سے وہ مکمل ہوگئی تھیں۔ان کی ساری محرومیاں ساری تکلیفیں ان کی زندگی سے جا چکی تھیں۔

وہ تینوں قبرستان میں اپنا راستہ بنا رہے تھے۔ جلد ہی وہ اس قبر کے پاس پہنچ گئے۔ نیلوفر کاشف کی قبر کے پاس۔ شمائلہ نے ہاتھ اٹھا کے دعا کی اور پھر سورہ فاتحہ کی تلاوت کی۔ وہ اب تک نیلوفر کو نہیں بھولی تھیں۔ انہوں نے اسے تڑپتے دیکھا تھا، اسے اپنے نفس سے جنگ لڑتے دیکھا تھا۔ وہ ان کے لیے بہت خاص تھی۔ ان کے دل میں اس کے لیے بے پناہ عزت و احترام تھا۔

"میری اللہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ ان کے سارے گناہ معاف کر دے۔" شمائلہ عاجزی کے انداز میں بولیں۔

"آمین۔" مہر نے کہا۔ عنایا نے بھی اپنی ماں کی دیکھا دیکھی آمین کہہ دیا۔ عنایا کو یوں کرتے دیکھ کے شمائلہ اور مہر ہنس دیئے۔

وہ لوگ اب قبرستان سے واپس جا رہے تھے۔ اسی طرح سے۔۔۔ ساتھ ساتھ۔۔۔ باتیں کرتے ہوئے۔۔۔ چہکتے ہوئے۔۔۔

"سب کتنا اچھا چل رہا ہے ماں۔" مہر کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔ شمائلہ نرمی سے مسکرائیں۔

"جب تک چل رہا ہے بیٹی' اس پہ شکر ادا کریں۔ ایک وقت تھا جب سب کچھ اتنا خوبصورت نہ تھا۔" شمائلہ بولیں۔ مہر کی آنکھوں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا۔

"اب آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں ناں۔" مہر اداس سے لہجے میں بولی تو شمائلہ ہنس دی۔

"پچھلے چھے ماہ میں آپ نے ہم سے یہ کوئی دو ہزار مرتبہ پوچھا ہو گا مہر۔ چھوڑ دیجئے سب کچھ۔ ہم اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتے ہیں۔ اور ویسے بھی' ہم نے شکایتیں کرنا چھوڑ دی ہیں!" وہ مسکرا کے بولیں۔ عنایا بھی مسکرا کے اپنی نانی اور ماں کو گفتگو کرتے دیکھ رہی تھی۔

وہ اب قبرستان سے باہر آ گئے تھے اور گاڑی میں سوار ہونے لگے تھے۔ عنایا پچھلی نشست پہ بیٹھ گئی تھی۔

"آپ وہ غزل پڑھ سکتی ہیں۔ دل نا امید تو نہیں۔ میرا آپ کی آواز سننے کا دل چاہ رہا تھا۔" مہر نے انہیں گاڑی میں بٹھاتے پوچھا۔ عنایا ستائش سے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

"آپ ہمارے ساتھ پڑھیں گی؟" شمائلہ بولیں۔ مہر نے سر اوپر نیچے ہلایا اور ڈِگی میں وھیل چیئر رکھی۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی۔

"کیوں نہیں۔" مہر بولی۔ شمائلہ مسکرا کے دیکھنے لگی۔

"دل نا امید تو نہیں۔۔" شمائلہ نے مہر کو دیکھا جو کہ ان کے پیچھے پڑھنا شروع ہوئی۔

"دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے۔" وہ دونوں آواز سے آواز ملا کر پڑھ رہی تھیں۔ آسمان پہ چھائے کالے بادلوں کے ٹکرانے کا عمل جاری ہوا اور وہ ایک دفعہ پھر سے برسنے لگے تھے۔

"لمبی ہے غم کی شام' مگر شام ہی تو ہے۔" سطور ختم کر کے دونوں زور سے ہنسنے لگیں۔ عنایا بھی ان دونوں کے ساتھ ہنسنے لگی تھی۔ سب کچھ حسین تھا۔۔۔ سب کچھ مکمل تھا۔۔۔ وہ تینوں۔۔ ایک پرفیکٹ تصویر کی طرح جو کہ ہر زاویے سے ہی خوبصورت نظر آتی تھی۔۔۔

زندگی،ایک حسین داستان۔۔۔زندگی ایک افسانہ۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

درفشاں حسام کے بنگلے کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔یہ وہی بنگلہ تھا جس میں شادی ہونے کے بعد وہ مہر کے ساتھ رہا کرتا تھا۔درفشاں سے شادی کے بعد وہ لوگ واپس ادھر آگئے تھے۔لیکن پچھلی بار کے برعکس اب مرینا بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔وہ اپنی پرانی غلطی دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔

”کہاں جا رہی ہو درے۔“ درے نیچے اتری تو مرینا بولیں۔وہ کافی کمزور سی نظر آرہی تھیں۔

”حرر۔آج کلنک کی چھٹی ہے اس لیے جلدی جا رہی ہوں۔“مرینا کے چہرے پہ شریر سی مسکراہٹ بکھری جو انہوں نے فوراًہی دبا لی۔

درفشاں باہر نکلی تو حسام اس کا گاڑی سے باہر انتظار کر رہا تھا۔چہرے پہ گرم جوش مسکراہٹ لیے وہ اس کا استقبال کر رہا تھا۔دونوں ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔حسام نے گاڑی چلانا شروع کی۔دفعتاًاس کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھری جو کہ وہ دبا گیا۔دل میں اس کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔

”ارے یہ حرر کا راستہ تو نہیں ہے۔“بیچ راستے میں درِّفشاں کو اندازہ ہوا تو وہ بولی۔

”مجھے پتا ہے۔“حسام کا انداز شرارتی سا تھا۔درے نے حسام کو ایک گھوری سے نوازا۔

”پھر کہاں جا رہے ہیں۔“

حسام نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ایک لفافہ نکال کے درے کو تھمایا۔درے نے آنکھوں میں ستائش لیے اس لفافے کو کھولا۔اندر سے دو کاغذ نکالے اور بغور انہیں دیکھنے لگی۔وہ دو کاغذ دیکھتے ہی اس کے چہرے پہ خوش گوار مسکراہٹ پھیلی۔

"سوئٹزر لینڈ؟ سچی؟" درے خوشگوار سے انداز میں بولی۔حسام پر جوش سا ہو کے سر اثبات میں ہلانے لگا۔

در فشاں ہاتھ مٹھی میں بھینچ کے زور سے ہنسنے لگی۔اس کے وجود میں یک دم سے خوشی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

"دنیا کو بچانا تو چلتا رہے گا۔اس سے پہلے ایک بریک کیوں نہ لے لیا جائے؟" حسام بولا تو درے بھرپور مسکرانے لگی۔

"بہترین"!

زندگی دنیا کے عجائب خانوں کو دریافت کرنے کا نام۔۔۔زندگی ایک افسانہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"آپ کو کیا لگتا ہے۔آپ مجھے دھمکیاں دیں گے اور میں اسے واپس کردوں گی۔کبھی نہیں۔اب ہم سیدھا سیدھا کورٹ میں ملیں گے۔اس بچی سے اپنا تعلق کورٹ میں ثابت کیجئے گا۔" مناج حرر کے آفس میں کسی سے فون میں بات کر رہی تھی۔اس کے ماتھے پر بل تھے۔چہرے پہ برہمی سی پھیلی ہوئی تھی۔

”میڈم۔آپ کو پیسے چاہئے ہم وہ بھی دے دیں گے۔آپ اس منیرا کو واپس دے دیں۔“ فون کے اس پار سے کسی مرد کی آواز گونجی تھی۔مناج کے چہرے پہ غصیلا سا تاثر ابھرا۔آنکھیں شعلہ باز ہوئیں۔

”منیرا حرر کے محفوظ ہاتھوں میں ہے۔اب کوئی طاقت اسے حرر کے ان ہاتھوں سے نکال نہیں سکتی۔“مناج دھاڑی تھی۔اس نے کھٹ سے کال کاٹ دی۔

حرر کا یہ آفس اب زیادہ بڑا تھا اور کسی اور جگہ پہ تھے۔یہاں کام کرنے والے بھی پہلے سے زیادہ تھے۔

”منیرا کیسی ہے ویسے؟“ مناج نے مڑ کر ایک ایمپلائی سے پوچھا۔

”بہتر ہے۔مگر بہت سہمی ہوئی ہے۔“ اس ایمپلائی نے جواب دیا۔مناج نے افسوس سے گہری سانس خارج کی۔

”ٹھیک ہے۔کوشش کرو کہ وہ جلد نارمل ہو جائے۔درفشاں واپس آجائے تو میں اسے بھی اس کی مدد کرنے کا کہوں گی۔“ مناج کہہ کے حرر کے آفس سے باہر جانے لگی۔اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہو گئی تھی۔ مصروف سی۔وہ اپنے کام کو مخلص ہو کر سر انجام دیتی۔وہ اپنے کام میں ہی خوشی محسوس کرتی تھی اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔

وہ حرر کے آفس سے باہر آئی تو نیلی وردی میں ملبوس یونس اس کی راہ تک رہا تھا۔وہ بھی اسی کی منتظر تھی۔اسے دیکھتے ہی وہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے اس کی طرف بڑھی۔یونس ایک دم چوکنا سا ہو گیا۔

"جن گواہان کو ڈھونڈنے کا کہا تھا وہ مل گئے یونس؟" مناج نے پوچھا۔یونس نے ادب سے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔مناج مسکرائی۔

"یہ ایک فائل ہے۔اس میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو ہماری مدد کریں گی۔آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں کیا؟ میں جانتی ہوں میں بہت تنگ کر رہی ہوں لیکن۔۔۔" مناج کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔یونس نے اس کے ہاتھ سے وہ فائل جھپٹ لی۔مناج ذرا سا چونک گئی۔

"آپ درخواست نہ کیا کریں میڈم۔بس حکم دیا کریں۔" وہ ایک ادا سے بولا اور سادگی سے مسکرا دیا۔ مناج بھی جواباً مسکرا دی۔وہ اب اپنی گاڑی کی جانب جانے لگی۔یونس اسے دیکھنے لگا۔

مناج کی محبت نے اسے بدل کے رکھ دیا تھا۔وہ اس سے بہت متاثر تھا۔وہ انصاف پسند تھی تو وہ بھی انصاف پسند بننا چاہتا تھا۔وہ رشوت لینا چھوڑ چکا تھا۔لیکن یہ محبت بیچ میں کہیں نامکمل سی تھی۔مناج اب تک اسے اپنا دل نہیں دے سکی تھی۔وہ ابھی اس سب کے لیے تیار نہ تھی۔لیکن یونس کو بھی کوئی حرج نہ تھا۔وہ پوری زندگی بھی اس کے انتظار میں گزار سکتا تھا۔۔۔

زندگی محبت کے مختلف رنگوں کا نام۔۔۔زندگی ایک افسانہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## یہ دبئی کے ایک پولیس اسٹیشن کا منظر ہے۔

بھوری موچھوں والا' گوری رنگت والا پولیس افسر اپنی سربراہی کرسی پہ براجمان تھا۔

مخالف سمت میں کوئی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا کیا جائے عبداللہ؟“ بڑی عمر کا پولیس افسر اس نوجوان سے بولا تھا۔آواز میں پریشانی تھی۔”یہ کیس تو ہماری سوچ سے بھی باہر جارہا ہے۔“

”مسٹر جلیل۔ہم ایک پرائیویٹ انویسٹی گیٹر کی مدد لے سکتے ہیں۔“ عبداللہ بولا تھا۔جلیل صاحب نے خفگی سے سر نفی میں ہلایا۔

”ان لوگوں کے بہت نخرے ہوتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”لیکن شاید ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا سر۔ہمیں اس سب سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“ وہ بولا۔جلیل صاحب نے ہاری ہوئی سانس خارج کی۔

”کس کی بات کر رہے ہو تم؟“

”گھوسٹ۔ “(ghost)عبداللہ بولا تو جلیل صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ترحم ہو کے بولے۔

”کوڈ نیم ہے سر۔تین سال پہلے اس نے پاکستان میں ایک آپریشن کیا تھا۔اور ایک گودام بھی اس نے پکڑوایا تھا جس میں انسان قید تھے۔اس نے یہ کام ایجنٹ عبدالحمید کا نام استعمال کر کے کیا تھا۔وہ کوئی ایجنٹ نہیں ہے بس ہر کام کے لیے ایک نیا نام استعمال کرتا ہے۔پاکستان میں پچھلے سال جو آرگن مافیا پکڑا گیا ہے وہ بھی اسی نے پکڑوایا ہے۔ہم اسے اس لیے جانتے ہیں کیونکہ اس نے منی لانڈرنگ میں ملوس بینک کو بے نقاب کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔“ عبداللہ،جلیل صاحب کو بتائے جا رہا تھا۔جلیل صاحب غور سے اس کی پوری بات سن چکے تھے۔

"کیا پاکستانی ہے وہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں جانتا وہ کہاں سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے بارے میں ہم صرف ایک ہی چیز جانتے ہیں کہ اس کا جامہ نام گھوسٹ ہے اور وہ ہر مشن سے پہلے اپنی شناخت بدل دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔گھوسٹ سے رابطہ قائم کرو اور اسے سب کچھ سمجھاؤ۔ہم اسے بھی آزما لیتے ہیں۔" جلیل صاحب اٹل سے انداز میں فیصلہ سنانے لگے۔

"ٹھیک ہے سر!" عبداللہ نے ادب سے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ دونوں ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر داخل ہوئے۔عمارت کسی اسکول کی لگتی تھی۔وہ عمارت تین منزلہ تھی اور کافی پر تعیش نظر آتی تھی۔فی الحال عمارت کی دیواروں پہ پینٹ کیا جارہا تھا۔احمد کے چہرے پہ فخریہ مسکراہٹ تھی اور مہر بھی کافی خوش نظر آرہی تھی۔

"کچھ مہینے اور بس' یہ جگہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھر جائے گی جو کہ تعلیم حاصل تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پا رہے۔" مہر بولی۔احمد شرارتی سا مسکرایا۔

"چورنی سے سیدھا پرنسپل بن گئی تم تو۔" وہ بولا۔مہر مصنوعی سا خفا ہوئی۔

"آپ بھی نہ بار بار یاد دلاتے رہتے ہیں۔" وہ بولی۔احمد زیر لب ہنس دیا۔

وہ دونوں اب عمارت کے اندر داخل ہوئے۔مزدور جگہ جگہ کام کر رہے تھے۔

وہ دونوں اب مہر کے مستقبل کے آفس میں جا رہے تھے۔ کمرے میں فنشنگ کا کام باقی تھا۔ کمرہ کافی خوبصورت اور پر تعیش سے طرز پہ بنا ہوا تھا۔

"ارے واہ! یہاں کام کرو گی؟" احمد پورے کمرے کا جائزہ لیتے بولا تھا۔ مہر نے مسکرا کے سر اثبات میں ہلایا۔

"بالکل۔ اور اس بار' میں پورے دل سے کام کروں گی۔" وہ مسکرا کے بولی۔ احمد پھر سے شرارتی سا مسکرایا۔ وہ کچھ شریر کہنے ہی لگا تھا کہ اس کے موبائل پہ کال آنے لی۔ یہ موبائل چھوٹا موبائل تھا۔ انکرپٹڈ موبائل۔ جس پہ اس کی آواز پہ بہت سارے فلٹرز لگ جاتے تھے اور اصل آواز دوسری طرف پہنچ نہیں پاتی تھی۔

احمد نے اپنا موبائل نکالا اور کان سے لگایا۔ مہر کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھری۔ "گوسٹ؟ کیا یہ گوسٹ بات کر رہے ہیں؟" دوسری طرف سے تکلفانہ سی آواز گونجی۔ بات انگریزی میں کی جارہی تھی۔

"جی۔ کون ہے یہ؟" احمد نے اکھڑ سے انداز میں جواب دیا۔ مہر سے اپنی مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"ہم دبئی پولیس سے بات کر رہے ہیں۔ ایک کیس کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔" قدرے نرمی سے جواب آیا تھا۔

”رات آٹھ بجے کال کر لینا۔ ابھی مصروف ہوں۔“ اکھڑ سے انداز میں کہہ کے احمد نے کال کاٹ دی۔ مہراب احمد کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ چہرے پہ شریر مسکراہٹ سجائے وہ اسے دیکھنے لگی تو احمد بھی مسکرا دیا۔ اس نے اس کے کندھے سے نادیدہ دھول جھاڑی۔

”ایک نئے ایڈونچر کے لیے تیار‘ پروگرامر صاحب؟“ وہ معنی خیز انداز میں بولی تو احمد کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”ہمیشہ سے!“ وہ خوشدلی سے بولا۔ ایک نیا ایڈونچر اس کا منتظر تھا۔

زندگی کبھی نہ ختم ہونے والے ایڈونچر کا نام۔۔۔ زندگی ایک افسانہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اور اس پوری کہانی میں۔۔۔

صرف یہ ہیروں کا معاجرہ تھا جو کہ آج تک نہ سلجھ سکا۔۔۔

وہ چار ہیرے۔۔۔ جنہوں نے اپنی چمک دمک سے سب کی عقل پہ بٹہ لگا رکھا تھا۔۔۔

وہ چار ہیرے۔۔۔ جو آج اس اندھیری جگہ میں قید تھے۔۔۔

اس اندھیرے میں وہ بس عام سے پتھر کی مانند ہی دکھائی دیتے تھے۔۔۔

مشعل سے قرب کا جواز انہیں مل جاتا۔۔۔

اور بس تم ان کے رنگ بدلتے دیکھتے۔۔۔

ان کے پیچھے انسانوں کے رنگ بدلتے دیکھتے۔۔۔

ان کو اپنی عقل سے ہاتھ دھوتے دیکھتے۔۔۔

نہ جانے اب یہ اپنی چمک دمک سے کس کے ہوس کو دعوت دینے والے تھے؟

☆☆☆☆☆تمت بالخیر☆☆☆☆☆